منازل العرفان

فی تفسیر القرآن الکریم

تالیف

شیخ التفسیر والحدیث
حضرت مولانا سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جلد چہارم

سورۃ النساء تا سورۃ المائدہ

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ
نیلا گنبد سرکی روڈ کوئٹہ

نحمده بسم الله الرحمن الرحيم ونصلي

منازلُ العرفان
في
تفسيرِ القرآنِ الكريم

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا

سیّد عبد السّتار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ ۞ کوئٹہ

نام کتاب: منازل العرفان في تفسير القرآن الكريم

تالیف: شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہ

قیمت:

سن اشاعت: ۱۴۴۴ھ 2023ء

تعداد: 1100

ملنے کے پتے

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ، نیلا گنبد، سرکی روڈ، کوئٹہ

جامعہ فرقانیہ، سریاب روڈ، کوئٹہ

مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ

اور ملک کے تمام بڑے کتب خانے

ضروری گزارش

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآن مجید احادیث اور دیگر دینی کتب میں عمداً غلطی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ سہواً جو غلطیاں ہوگئی ہوں ان کی تصحیح کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ تاہم انسان، انسان ہے، اگر اس اہتمام کے باوجود کسی قسم کی بھی غلطی پر آپ مطلع ہوجائیں، تو برائے مہربانی ہمیں مطلع فرمائیں، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہوسکے۔ اور آپ ''تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى'' کے مصداق بن جائیں۔ شکریہ

واٹس ایپ نمبر: 03022999778-03128588383

ناشر

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ، نیلا گنبد، سرکی روڈ، کوئٹہ

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین منازل العرفان جلد چہارم

سورۂ نساء

سورۂ مائدہ

سُورَةُ النِّسَآءِ

مدنيةٌ آياتها ۱۷۶ رکوعاتها ۲۴

سورۂ نساء مدنی ہے، اس میں ایک سو چھتر (۱۷۶) آیتیں، اور چوبیس (۲۴) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۂ نساء ہے، سورت کی پہلی آیت میں لفظِ نساء مذکور ہے اس سے یہ نام ماخوذ ہے۔ یہ ترتیبِ تلاوت میں چوتھے نمبر پر ہے، اور ترتیبِ نزول میں ۹۲ نمبر پر ہے، اس سورت میں کُل رکوع ۲۴ ہیں، آیات ایک سو چھتر ہیں (۱۷۶)۔

کلمات:

تین ہزار نو سو چالیس (۳۹۴۰) ہیں، اور حروف سولہ ہزار تیس (۱۶۰۳۰) ہیں، تقریباً۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مدنی ہے، اس سورت کے نزول کا آغاز شوال سنہ ۳ ھ جنگ اُحد کے بعد ہوا، جبکہ ستر (۷۰) مسلمانوں کی شہادت کے بعد بیواؤں اور یتیموں کی کفالت اور ورثہ پر میراث کی تقسیم کے مسئلہ نے بڑی اہمیت اختیار کرلی تھی۔ اسی موقع پر اس کے نزول کا آغاز ہوا، اور سلسلۂ نزول سنہ ۵ ھ تک جاری رہا، جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔

فضائلِ سورت اور ربط:

پچھلی سورت آل عمران کا اختتام تقویٰ پر ہوا، اس سورت کی ابتداء بھی تقویٰ ہی پر ہے۔ مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سورۃ النساء میں پانچ آیتیں ایسی ہیں کہ اگر ساری دنیا مجھے مل جائے

تب بھی مجھے اس قدر خوشی نہ ہوتی جتنی کہ ان آیتوں سے ہے، پہلی آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ [النساء: ۴۰] (اللہ تعالیٰ کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کرتا) جس کسی کی جو نیکی ہوتی ہے اس کا ثواب بڑھا چڑھا کر دیتا ہے، اور اپنی طرف سے بطورِ انعام جو اجر عطا کرے وہ جداگانہ ہے۔

دوم: صغیرہ گناہ خود ہی معاف فرما دیں گے، اور تمہیں عزّت والی جگہ جنت میں داخل فرمائیں گے۔ تیسری آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ﴾ [النساء: ۴۸] (یعنی اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شرک کرنے والوں کو نہیں بخشتا، باقی جس گناہگار کو چاہے بخش دے) چوتھی آیت: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴾ [النساء: ۶۴] (اور اگر یہ لوگ گناہ سرزد ہو چکنے کے بعد آپ کے پاس آجائیں، اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی بخشش طلب کریں، اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ان کے لئے استغفار طلب کریں، تو بیشک وہ اللہ تعالیٰ کو معاف کرنے والا، مہربان پائیں گے)۔

امام عبد الرزاق رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت میں آیت: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا﴾ کے بدلے ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [النساء: ۱۱۰] والی آیت ہے، یعنی جس شخص سے کوئی برائی کا کام ہو جائے، یا کوئی اپنے نفس پر ظلم کر گزرے، پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہنے لگ جائے تو بیشک وہ اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔ [ابن کثیر]

دونوں آیتوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ ایک آیت کا بیان کرنا پہلی حدیث میں کسی راوی سے رہ گیا ہے، اور اس کا بیان دوسری حدیث میں ہے، تو چار آیتیں پہلی حدیث کی اور پانچویں آیت اس حدیث کی ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا﴾ مل کر پانچ ہو گئیں۔ یاد رہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ ہی پر آیت پوری ہے، اور ﴿وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً﴾ کو الگ آیت شمار کیا ہے، تو دونوں حدیثوں میں پانچ پانچ آیتیں ہو گئیں۔

مختصر موضوع و مطالب:

سورۂ بقرہ اور آل عمران کی طرح یہ سورت بھی سبع طِوال میں شمار ہے، سورۂ بقرہ میں کلام کا زیادہ تر رخ تقویٰ اور توحید کے ساتھ یہود کی اصلاح کی طرف تھا، اور سورۂ آل عمران میں انہی چیزوں کے بیان کے ساتھ کلام کا رخ نصاریٰ کی طرف رہا، سورۂ نساء میں اہلِ عرب کی اصلاح کا پہلو ذرا زیادہ نمایاں ہے، اور در حقیقت یہ سورت گزشتہ

دونوں سورتوں کا تفسیری خلاصہ بھی ہے۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلامی معاشرہ کافی حد تک وسیع ہو چکا تھا، مختلف قبائل کے اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے معاشرتی مسائل پیدا ہو چکے تھے۔ جنگ اُحد میں مسلمانوں کے جانی نقصان کی وجہ سے یتیموں بیواؤں کے مسائل بھی سامنے آئے، وراثت کی تقسیم اور نکاح وطلاق جیسے اہم معاملات پر احکام کی ضرورت محسوس ہوئی، تو اس سورتِ کریمہ میں تہذیبِ نفس سے لے کر سیاستِ مدن ملکی سیاست معاشرتی مسائل اور دیگر بہت سے مسائل پر سیر حاصل بحث وتمحیص ہو رہی ہے۔

یتیموں کے مسائل اور ان کی کفالت وسرپرستی، اور ان کے اموال کی نگرانی اور نگہبانی اور حقوق کا مفصل بیان، اس کے ساتھ عورتوں کے حقوق کی نگہداشت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا بیان ہے۔ یہ صنفِ نازک تمام شفقتوں، مرحمتوں، وراثتوں سے محروم، جسے مرد جوے میں داؤ پر لگا کر فروخت کرتے تھے، بچپن میں زندہ درگور کر کے سکون محسوس کرتے تھے، عیسائی وراثت میں انہیں کیا دیتے، بھیڑ بکریوں کی طرح بولی دے کر فروخت کرتے تھے۔ ہندوؤں کے معاشرہ میں خاوند کی لاش کے ساتھ اسے زندہ جلا کر راکھ کرتے تھے۔ یہ سارے مسائل اسلام نے خوش اسلوبی کے ساتھ حل فرما دیئے۔ حقوق کے تمام احکام، میراث کے مسائل، محرمات اور عقائد، تیمم اور نماز کے احکام، جہاد بِالسَّیف، صلوٰۃِ خوف، صلوٰۃِ سفر، حدود وقصاص، یہود ونصاریٰ کی شرارتوں اور ان کے مکر وخیانت، اور منافقین کے طرزِ عمل، انبیاء ورُسل علیہم السلام اور معاد پر ایمان، اور دیگر بہت سے احکام کی اس سورتِ کریمہ میں تفصیل کے ساتھ ہدایات دیدی گئی ہیں۔

الغرض! یہ سورت عبادات اور باہمی معاملات، اور غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کی ایک خاصی اچھی تفصیل ہے، اور عورتوں، بچوں اور یتیموں کے حقوق کی مکمل نشاندہی پر مشتمل ہے۔ شروعِ سورت میں انسانی خلقت و پیدائش پر تنبیہ ہے، کہ سارے انسان، کالے گورے، چھوٹے بڑے، عربی عجمی سب ایک ہی نسل کی بندھنوں میں باندھے ہوئے رشتہ میں منسلک ہیں، کسی کو کسی پر نسلی فضیلت وبرتری حاصل نہیں ہے۔ سب آپس میں رشتہ دار بھائی بھائی ہیں، اسی کے پیشِ نظر تمہیں آپس میں ایک ہو کر رہنا چاہئے، اور اپنے خالق ومالک جل شانہ سے ہدایات و رہنمائی حاصل کر کے اس کے حکموں پر زندگی گزارنی چاہئے، اور ہر قسم کی تفریق واختلاف سے بچنا چاہئے۔ ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ [النساء:۶۵] (نہیں، آپ کے پروردگار کی قسم! یہ لوگ

اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے باہمی جھگڑوں میں آپ کو فیصل نہ بنائیں)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا وَ بَثَّ مِنۡہُمَا
رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَ الۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡبًا ①

ترجمہ: اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو، جس نے تمہیں پیدا کیا ایک ہی نفس سے، اور پیدا کیا ہے اس نے اس نفس سے اس کا جوڑا، اور پھیلا دیا ہے ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو، اور اس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ تم سوال کرتے ہو اس کے واسطے سے، اور قرابتوں سے (خبردار رہو) بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر نگہباں ہے ①

معارف ومنازل

نِساء اور نِسوَۃ جمع کے صیغے ہیں، اور ان کا واحد اَلْمَرْءَۃ ہے، مِنْ غیر لَفْظِہٖ۔ اپنے لفظ سے اس کا واحد نہیں ہوتا۔ وجہ تسمیہ گزر چکی، کہ اس سورت میں بکثرت عورتوں کے مسائل ہیں۔ سورت کی ابتداء اللہ تعالیٰ نے اجتماعی احکام سے کی ہے، اور اجتماعی احکام میں اہم ترین حکم تقویٰ ہے، جو کہ اسی پہلی آیت میں دو مرتبہ مذکور ہے، اس کے ساتھ تمام انسانیت کی اوّلین تخلیق (حضرت آدم وحواء علیہما السلام) کا بیان ہے، گویا تذکیر بنعمۃ اللہ کے ضمن میں توحیدِ باری تعالیٰ کا اثبات ہے۔ گویا کہ تمام انسانوں کو ان کے خالق و مالک اور پرورش کرنے والے سے ڈرنے کا حکم فرمایا۔

اور یہ حکم قرآن کریم میں جگہ جگہ موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ شانہ سے ڈرنا ہی تمام کامیابیوں اور بلندیوں کی کنجی ہے، کوئی شخص خلوت میں ہو یا جلوت میں اپنے ربّ تعالیٰ شانہ سے ڈرے گا، اور خوف وخشیت کی صفت سے متصف ہوگا، تو دنیا وآخرت دونوں میں اس کے لئے کامیابی ہی کامیابی ہے، دنیا وآخرت کی بربادی گناہوں میں مبتلا ہونے سے ہوتی ہے، اور خوف وخشیت دل میں جگہ پکڑنے سے تو گناہ چھوٹتے چلے جاتے ہیں، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے وصیت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: عَلَیْکَ بِتَقْوَی اللّٰہِ فَاِنَّہٗ اَزْیَنُ لِاَمْرِکَ کُلِّہٖ کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کو اپنے اوپر لازم کرلو، کیونکہ اس سے تمہارے ہر کام میں زینت آجائے گی۔ [مشکوٰۃ]

پھر ربّ تعالیٰ کی ایک صفتِ جلیلہ بیان فرمائی، اور وہ یہ کہ ربّ العزّت نے تمہیں ایک جان سے پیدا فرمایا، اور اس جان سے اس کا جوڑا پیدا فرمایا، پھر اس جوڑے سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔ ایک جان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام، اور جوڑے سے مراد حضرت حواء علیہا السلام ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ نے انہیں روئے زمین کی مٹی سے پیدا فرمایا، فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کا حکم ملنے پر تمام روئے زمین سے مٹی لے کر وادی نعمان جو کہ میدانِ عرفات کے ساتھ ہے، میں جمع کی، اور اس سے خمیر بنائی، اور اسے گوند کر حضرت آدم علیہ السلام کا مجسمہ بنایا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونکی، جس کی پوری تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

جس طرح زمین کے مختلف حصوں کی مٹی مختلف ہے، کوئی سخت، کوئی نرم، کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی سیاہ، کوئی چکنی وغیرہ، اسی طرح نسلِ انسانی کے افراد کے مزاج بھی مختلف ہیں، کوئی نرم مزاج، کوئی سخت، کوئی طیب و پاکیزہ، کوئی خبیث، کوئی سفید، کوئی سیاہ و سرخ۔ مطلب یہ ہے کہ مٹی کا اثر کسی نہ کسی صورت میں ہر انسان میں ظاہر ہوتا ہے، اور جہاں سے کسی کی مٹی اٹھائی گئی وہیں اس کی تدفین ہوگی، یہ زمین کی امانت کی واپسی کہلائے گی، جیسے پہلے بیان ہوا۔

جب حضرت آدم علیہ السلام کو تنہائی میں ایک قسم کی وحشت محسوس ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں لکھی ہوئی حکمت کے تحت ان کی پسلی سے حضرت حوا رضی اللہ عنہا کو پیدا فرمایا۔ ان کو دیکھ کر حضرت آدم علیہ السلام کو انس حاصل ہوا، اور وہ بہت خوش ہوئے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، وہ کسی طرح تمہارے لئے سیدھی نہیں ہوسکتی، پس اگر تو اس سے نفع حاصل کرنا چاہے تو اس کی کجی ٹیڑھے پن کے ہوتے ہوئے نفع حاصل کرسکتا ہے، اور اگر تو اسے سیدھا کرنے لگے گا تو توڑ ڈالے گا، اور اس کو توڑنا طلاق دینا ہے۔ [رواہ مسلم وبخاري أيضاً]

جب عورت کی پیدائش بائیں اور اوپر کی ٹیڑھی پسلی سے ہو، تو وہ اپنے مزاج فطری کی بنیاد پر ہمیشہ ٹیڑھی اور کج رہے گی۔ یہ فطرت وخصلت کبھی نہ تبدیل ہوسکتی ہے، اور نہ اس میں کمی آسکتی ہے، آپ اسے ہزار تعلیم دیں، ولایت وعلوم کی وارث بنا دیں، مگر اصلاح ہرگز ممکن نہیں۔ لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَىٰ إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ۔ [متفق علیہ]

پس مردوں کو چاہئے کہ صبر وتحمل اور برداشت کے اصولوں پر گزارہ کریں، اور اس سے نبھا کر رکھیں، کیونکہ

ان کا ضرر بہت ہی خطرناک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر شریف خوش اخلاق شوہر اپنی بیوی کی بداخلاقی اور بے مروتی پر صبر کرے گا، تو اس کی موت شہادت کی ہوگی، اور شہید ہو کر مرے گا۔ اس کی تفصیل سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔

﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً﴾ کہ ان دونوں، یعنی حضرت آدم و حضرت حواء علیہما السلام سے بہت سارے مرد اور عورتیں پیدا کئے، روئے زمین پر پھیلا دیئے۔ اس وقت دنیا میں بارہ ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں، کالے گورے، سرخ و سفید انسانوں کی آبادی ساڑھے چھ ارب نفوس پر مشتمل ہے، اور جو مر چکے ہیں یا آئندہ قیامت تک پیدا ہوں گے، ان کا حساب خالق و مالک عزّ شانہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، وہ اس تعداد کے علاوہ ہیں۔

ان سب کی نسل انہی دونوں سے چلی آرہی ہے، اور ان سب کا خالق و ربّ اور روزی رساں حق تعالیٰ شانہ ہی ہے، چاہئے کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرے کہ صفتِ ربوبیت و پرورش اور رہنے سہنے، کھانے پینے وغیرہ ذرائع سب ہی اسی قادرِ مطلق کے خزانوں سے مفت مہیا ہوتے رہے ہیں، اور یہ تکوینی ہمہ گیر نظام اسی کے حکم سے چل رہا ہے۔ اسی حقیقت پر ایمان لانے اور شکر بجالانے کا نام ہی تو تقویٰ ہے، جسے آیت کریمہ میں دو مرتبہ لایا گیا ہے:

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ﴾ کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جس کے نام کا واسطہ دے کر آپس میں ایک دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتے ہو۔ اگر کسی نے کسی کا حق مار لیا ہو، یا حق دینے میں دیر لگا دی ہو، اس سے کہا کرتے ہو کہ تو خدا سے ڈر اس کا حق دیدو، اور حقوق مانگنے کے سوا دوسری ضروریات کے لئے بھی ایک دوسرے سے یوں کہتے ہو کہ: اللہ تعالیٰ کے لئے میرا یہ کام کر دو، خدا کے لئے مجھے یہ چیز دو، خدا کے لئے یہ کام نہ کرو۔ تم سارا دن خدا کے نام پر اپنا کام چلاتے ہو، اور ہر چیز میں اس کا واسطہ پیش کرتے ہو، پھر فرمایا:

﴿وَالْأَرْحَامَ﴾ ارحام رحم کی جمع ہے، عربی میں رحم بچہ دانی کو کہتے ہیں، جس کے اندر بچے کی نشو و نما ہوتی ہے، پھر اس کلمے کا استعمال رشتہ داری کے تعلقات کے لئے ہونے لگا۔ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلرَّحِمُ شَجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ۔ قرابتداری رشتہ ناطہ حضرت رحمٰن جل شانہ کی رحمت کی ایک شاخ ہے، رشتے ناطے نے پیدا ہونے پر رحمٰن جل شانہ کا پہلو (حقو) پکڑ لیا، اور عرض کیا: یا ربّ العزّت! یہ تیری پناہ پکڑنے والا مقام ہے، هٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِ بِكَ مِنَ الْقَطِيعَةِ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مطمئن رہو مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهُ۔ جو تجھے جوڑے گا میں اسے جوڑوں گا، اور جو تجھے قطع کر کے توڑے گا میں اسے توڑوں گا۔ [بخاري]

اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی پر بڑے اجر وثواب کا وعدہ فرمایا ہے، اور قطع رحمی پر بڑی وعیدیں بیان فرمائی ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ رشتوں اور قرابتوں سے ڈرتے رہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جسے پسند ہو کہ اس کا رزق زیادہ ہو، اور اس کی عمر بڑھا دی جائے تو اسے چاہئے کہ صلہ رحمی کرے [بخاري]

اپنے قرابتداروں سے ملنا جلنا اور شریعت کے قوانین کی پابندی کرتے ہوئے آنا جانا لینا دینا یہ سب صلہ رحمی میں شامل ہے۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس قوم میں کوئی بھی شخص قطع رحمی کرنے والا ہو، ان پر رحمت نازل نہیں ہوتی۔ [مشکوٰۃ]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ [مشکوۃ]

سنن اَبو داؤد میں ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں، میں رحمٰن ہوں، میں نے لفظِ رحم کو اپنے نام سے نکالا ہے، جو شخص صلہ رحمی کرے گا میں اسے اپنے سے ملالوں گا، اور جو شخص قطع رحمی کرے گا میں اسے اپنے سے کاٹ دوں گا۔

آج کل اللہ رحم کرے قطع رحمی کو لوگ گناہ ہی نہیں سمجھتے، اور یہ مرض عام ہوتا جا رہا ہے جو لوگ دینداری کے مدعی ہیں، نمازوں کے پابند ہیں، تہجد گزار ہیں، وہ بھی اس مہلک گناہ میں مبتلا رہتے ہیں، کسی کا بہن کے گھر آنا جانا نہیں ہوتا، کوئی بھائی سے ناراض ہے، کوئی دوسرے رشتہ داروں سے لاتعلق ہے، کسی نے والدین کے ساتھ قطع تعلق کیا ہوا ہے، ترش روئی اور بے مروتی اور غم و غصے میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ عام لوگوں کا غیر شرعی بے رحمانہ مزاج بنا ہوا ہے کہ غیروں کے ساتھ اچھے ہیں، اور اپنوں کے ساتھ برے ہیں۔ یہ سب کچھ ربّ العزّت سے اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے دوری کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ گناہوں کی نحوست نے پورے معاشرے کو سنگدل بے رحم اور بے دین بنایا ہوا ہے۔ آپ کے رشتہ دار نہتے غریب عزیز، اور آپ کے والدین بہن بھائی آپ کی بیوی بچے خاص کر آپ کی بچیاں، بلکہ پورا کنبہ آپ کی ایک ایک شفقت وتبسم کے لئے ترس رہے ہوتے ہیں۔ اگر آپ محض اپنے پروردگار کی رضا کی خاطر ان کے سامنے ایک آدھ تبسم کا اظہار کرتے ہیں تو خوشی سے ان کی دنیا بدل جاتی ہے اور ان کے سارے دکھ ختم ہو جاتے ہیں۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است ☆ از ہزاران کعبہ یک دل بہتر ست
دل گزرگاہ جلیل اکبر ست ☆ کعبہ معمار خلیل آزر ست

آنحضرت رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنی بچیوں پر شفقت کرے، اور ان کی صحیح کفالت کا حق ادا کرے، وہ جنت میں میرا رفیق بنے گا۔ [أبو داؤد وغیرہ]

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے حضور رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، اور عرض کیا: یا رسول اللہ! (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک پکڑ کر عرض کیا) مجھے فضیلت والے اعمال بتا دیجئے! آپ نے فرمایا: یا عُقْبَۃ صِلْ مَنْ قَطَعَکَ وَاعْطِ مَنْ حَرَمَکَ وَاعْفُ عَنْ مَنْ ظَلَمَکَ۔ کہ اے عقبہ! جو شخص تمہارے ساتھ قطع رحمی کا معاملہ کرے، اس سے تعلقات جوڑے رکھو، اور جو تمہیں کچھ نہ دے اسے سب کچھ دیتے رہو، اور جو شخص تم پر ظلم کرے اسے معاف کر دو۔ [الترغیب والترھیب]

اور جو شخص یوں کہتا پھرے کہ: رشتہ دار میرے ساتھ اگر اچھا سلوک کریں گے تو میں بھی کروں گا، ایسا شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہوگا، وہ سودا بازی کرنے والا اور بدلہ اتارنے والا شمار ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تعلق جوڑنے والا وہ نہیں ہے جو بدلہ اتار دے، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کے ساتھ قطع رحمی کا برتاؤ کیا جائے تب بھی وہ صلہ رحمی کرے۔ [بخاري]

عمدہ اخلاق، بلکہ اُحسن الاخلاق یہ ہے کہ برائیوں کے عوض محض یہ نہیں کہ انہیں معاف کیا جائے، بلکہ احسان اور نیکیوں و بخششوں کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ فارسی کہاوت مشہور ہے:

نیکی بہ نیکی کار خران ست ☆ نیکی بہ بدی کار مردان است

﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اعمال پر نگراں ہے، اور ہر چیز اس کی نظر میں ہے، تمام احوال سے باخبر ہے، لہٰذا تم کبھی بھی اس کی اطاعت سے روگردانی نہ کرو، اور اس سے ظاہراً و باطناً ڈرتے رہو، اس سے ڈرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔

....

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

ترجمہ: اور دے دو یتیموں کو ان کے مال، اور نہ تبدیل کرو خبیث مال کو طیب مال کے ساتھ، اور نہ کھاؤ ان

کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ، بیشک یہ بڑا گناہ ہے ②

معارف ومنازل

یہاں سے حقوق کی تفصیل بیان ہورہی ہے، اس سلسلے میں یتیموں کے حقوق کو مقدم رکھا گیا ہے، کیونکہ یتیم کمزور اور بے بس ہوتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے انہی کا تذکرہ ہوا، اموالِ یتامیٰ کے بارے میں تین حکموں کا بیان ہورہا ہے، پھر ان کے اولیاء کو حکم دیا گیا کہ تم ان کے مال ان کو بخوشی دیدو، اور اچھے مال کو برے مال سے تبدیل نہ کرو، اور اپنے مال کو ان کے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، ان تینوں باتوں کی تفصیل یہ ہے:

اول: جو یتیم بچے تمہاری پرورش میں ہیں ان کے مال جو انہیں میراث میں ملے ہیں، یا کسی نے انہیں بطورِ بخشش کوئی مال دیا ہے، یہ مال ہر حال میں ان کی ملکیت شمار ہوگا، جن کی نگہداشت تمہارے ذمہ واجب ہے، ان کے بالغ ہونے تک ان کے مالوں کو محفوظ رکھو، اور بقدرِ ضرورت ان کے مالوں میں سے ان پر خرچ کرتے رہو، پھر جب وہ بالغ ہوجائیں تو ان کے مال ان کے سپرد کردو۔ اور ایسا نہ کرو کہ جب وہ بالغ ہوجائیں تو ان کا مال بلا وجہ اپنی تحویل میں روکے رکھو، اور ان کو دینے سے منع کرو۔

اسبابِ نزول میں ہے کہ یہ آیت قبیلۂ بنی غطفان کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی، اس کی پرورش میں ایک یتیم بچہ تھا، جو اس کے بھائی کا لڑکا تھا، جب یتیم بالغ ہوگیا تو اس نے اپنا مال طلب کیا، چچا نے اس کا مال اس کے سپرد کرنے سے انکار کیا، اس پر دونوں چچا اور بھتیجے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، جس پر یہ آیت نازل ہوئی، چچا نے جب یہ آیت سنی تو کہا کہ: ہم اللہ تعالیٰ و رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بسر و چشم حکم مانتے ہیں، اور بڑے گناہ ﴿حُوۡبًا كَبِيۡرًا﴾ سے پناہ مانگتے ہیں، یہ کہا اور یتیم کا مال اس کے حوالے کردیا۔

دوم: یہ فرمایا کہ اچھے مال کو برے مال سے تبدیل نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یتیم بچے جو تمہاری پرورش اور نگرانی میں ہیں، جن کا مال تمہارے قبضہ میں ہے، ان کے اچھے مال کو خود اپنے حصے میں، اور اپنا گھٹیا مال اس کے عوض ان کے حصے میں نہ لگاؤ، ان کا جو عمدہ اور اچھا مال ہے اس کو اپنا نہ بناؤ، اور اپنے گھٹیا ردّی مال کو اس کے عوض اس کے حساب میں لگا کر حساب پورا نہ کردو۔

آج کل بہت سے لوگ یتیم کے اچھے مکان یا عمدہ پلاٹ اپنے نام کرتے ہیں، اور اپنا ردّی اور گھٹیا مکان،

اور رڈی پلاٹ یتیم کے نام پر رجسٹری کراتے ہیں، یہ گناہ کبیرہ اور ظلم ہے۔ اَلْعِبْرَۃُ لِعُمُوْمِ الْاَلْفَاظِ لَا لِخُصُوْصِ الْاَسْبَابِ۔ جس طرح کسی یتیم کے مال میں بے جا مداخلت اور تبدیلی حرام ہے، اور اسے قرآن حکیم نے اَلْخَبِیْث سے تعبیر فرمایا ہے، خبیث کے معنی ہیں: حرام، خبیث صرف مردار کتے، گدھے خنزیر کو نہیں کہتے، بلکہ غیر شرعی طریقوں سے جو بھی مال حاصل کیا جائے وہ باطل اور خبیث ہی کہلائے گا۔ اسی بنیاد پر قرآن کریم نے ہر حرام مال کو باطل اور خبیث کہا ہے، کہ مال فی نفسہٖ حرام اور مردار نہیں ہے، بلکہ جس غیر شرعی طریقہ سے اس کا اکتساب ہوا ہے، وہ اکتساب ہی حرام تھا، جس سے حلال مال حرام اور خبیث ہوا۔ مثلاً کوئی سونا، چاندی، کپڑے، شرعی طریقہ پر مذبوحہ حلال جانور کا گوشت، یا خود حلال جانور اونٹ گھائے، بکری یہ سب حلال ہیں، مگر مالِ غیر ہونے کی وجہ سے، یا غلط غیر شرعی طریقہ، مثلاً رشوت، جوئے، غبن، چوری وغیرہ سے حاصل کیا گیا ہو، یہ سب حرام اور خبیث ہی شمار ہوں گے۔

قرآن کریم نے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾[البقرۃ:۱۸۸] (ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ)۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا یحل لامرئٍ مسلمٍ ان یا کل مال اخیه الا بطیب نفس منه [مشکوٰۃ] کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کا مال ناجائز طریقے سے کھائے، سوائے خوشی اور رضامندی کے۔ اس مسئلہ کی تفصیل آیت ۲۹ میں آنے والی ہے۔

آج کل بڑے بڑے ادارے اور تنظیمیں غریبوں، یتیموں، زلزلہ زدگان، سیلاب زدگان، مجاہدین وغیرہ کے نام پر فنڈ جمع کرتے ہیں، اور پھر خود کھا جاتے ہیں، وہ مستحقین تک نہیں پہنچاتے ہیں۔ روزِ قیامت یہ مال ان کے گلے کا طوقِ لعنت بن کر انہیں جہنم کے طبقۃ اَلْھَاوِیَة میں پہنچائے گا۔ یہ سب غلول اور غبن ہی کے زمرے میں آجائے گا، جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

بعض مفسرین کرام نے ﴿وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ﴾ کے یہ معنی بھی بتائے ہیں کہ اپنے حلال مال کو چھوڑ کر یتیموں کا مال نہ کھاؤ، جس کا کھانا تمہارے لئے حرام ہے۔ اگر ایسا کرو گے تو طیب کو چھوڑ کر خیانت کر کے دوسرے کا حرام مال کھانے والے بن جاؤ گے، اور یہ مال چونکہ تمہارے لئے حرام ہوگا، اس لئے خبیث ہوگا، جیسے ابھی بیان ہوا کہ مال خبیث دراصل مال حرام ہی کو کہتے ہیں، جس کا کھانا مؤمن کی شان نہیں ہے۔

تیسرا یہ کہ ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ﴾ اور یتیموں کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ۔ یتیم بچے جن لوگوں کی پرورش میں ہوتے ہیں ان میں جن کا مزاج خیانت والا ہوتا ہے، ایسے لوگ مختلف

طریقوں اور تدبیروں سے یتیموں کا مال اپنے مالوں میں ملا کر کھا جاتے ہیں، کچھ لوگ غفلت اور لا پرواہی میں ایسا کر گزرتے ہیں، کہ گھر کی مشترکہ ضرورتوں میں مشترکہ مال خرچ کرتے ہیں، اور یہ نہیں دیکھتے کہ یتیم بچوں پر اس کے اپنے ذاتی مال میں سے کتنا خرچ ہوا، اور اس کے مال میں سے مشترکہ ضروریات میں دوسروں پر کتنا خرچ ہوا ہے؟ اور کچھ لوگ قصداً وارادۃً ایسا کرتے ہیں، کہ یتیم بچوں کے بالغ ہونے سے پہلے ہی ان کے مال کو کسی نہ کسی طرح اپنے نام میں یا اپنی اولاد کے نام میں لکھوا دیتے ہیں، پھر جب وہ بالغ ہوجاتے ہیں تو انہیں اپنے مال میں سے تھوڑا بہت ملتا ہے، یا بالکل ہی محروم ہوجاتے ہیں۔

یتیم بچوں کا کھانا اپنے کھانے میں ملا کر پکانے کے متعلق ضروری ہدایات سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى﴾ [البقرة: ۲۲۰] کے تحت بیان ہو چکا ہے، وہاں دیکھا جائے۔ آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا﴾ یعنی یتیم کے مال میں خیانت کرنا بڑا گناہ، جرم عظیم ہے۔ عام طور پر شرعاً ہر قسم کی امانت میں خیانت گناہ کبیرہ اور جرم ہے، جس کا شمار منافقوں کی علامات میں ہے، لیکن یہاں مستقل طور پر یتیم کے مال میں خیانت کرنے پر تنبیہ فرمائی، اور صرف یہی نہیں فرمایا کہ گناہ ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ بڑا گناہ ہے۔ جو لوگ یتیموں کے متولی اور سرپرست ہیں انہیں اس آیت کریمہ اور آنے والی آیت کریمہ ۱۰ پر خوب غور کرنا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: سات تباہ کن گناہوں سے پرہیز کرو، ان کے قریب تک نہ جاؤ، ان سات گناہوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم کا مال کھانے کو شامل فرمایا۔ [متفق علیه] اس کے برعکس یتیم کی کفالت اور اس کی سرپرستی اور اس کی خدمت اور اس کے مال میں انصاف کرنے والے لوگوں کے لئے بہت بڑے ثواب واجر عظیم اور جنت میں اپنی رفاقت وقرب کا وعدہ فرمایا۔ [متفق علیه]

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۳

ترجمہ: اور اگر تم کو ڈر ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے، تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو عورتیں تم کو پسند ہوں، دو دو، تین تین، چار چار، سو اگر تم کو ڈر ہو کہ انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی عورت سے نکاح کرلو،

یا ان لونڈیوں پر بس کرو جو تمہاری ملکیت ہوں، یہ اس سے قریب تر ہے کہ تم زیادتی نہ کرو ۳

معارف ومنازل

آیت کریمہ کا مطلب سمجھنے سے پہلے سببِ نزول ذہن نشین کرلینا چاہئے۔ صحیح بخاری میں متعدد مقامات پر حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس آیت کریمہ کا مطلب دریافت کیا، تو سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اے میری بہن کے بیٹے! (حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن ہیں) اس آیت میں ایسی یتیم بچیوں کا ذکر ہے جن کا باپ فوت ہو جاتا تھا، اور جو مال میراث میں ملتا تھا وہ ان کے اور ولی کا مشترک مال ہوتا تھا، جسے تقسیم کرنا لازمی ہوتا تھا۔

ہوتا یہ تھا کہ جو شخص اس بچی کا ولی وسرپرست ہوتا تو اگر یہ لڑکی صاحب جمال خوبصورت ہے، اور متروکہ جائیداد میں اس کا حصہ بھی ہے، اور وہ مالدار ہے، اور اس پر مستزاد یہ اس کا ولی یا اس کا کوئی لڑکا اس کا غیر محرم بھی ہے، تو ایسی صورت میں سرپرست کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ایک تیر میں تین شکار ہوں:

(۱) اس لڑکی سے خود شادی کرلے۔

(۲) اس کی جائیداد، یعنی مال پر قبضہ کرلے۔

(۳) اور اس کے لئے کم سے کم حق مہر برائے نام مقرر ہو۔ پھر جب یہ تینوں مقصد پورے ہوتے تو گھر کی مرغی دال برابر، تو اس کے ساتھ بہتر حسنِ معاشرت اور اچھی ازدواجی محبتوں سے اس کو محروم رکھتے۔ اسی پر آیت کریمہ کا نزول ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے مضبوط تنبیہ کے ساتھ انہیں منع فرمایا کہ اگر تم ایسی لڑکیوں کا پورا حق مہر ادا نہیں کرسکتے، اور نکاح محض اس کے مال پر قبضہ جمانے کیلئے کرتے، اور ان سے بہتر سلوک کے روادار نہیں ہوسکتے، تو پھر ان سے نکاح بھی نہ کرو، جس طرح اس کی بدصورتی کی صورت میں، یا اس کے پاس مال نہ ہونے کی صورت میں نکاح نہیں کرتے ہو۔

اس زمانے میں یتیم لڑکیوں سے یہ زیادتی بھی ہوتی تھی، کہ لڑکی اگرچہ صاحب مال ہے، مگر صاحبِ جمال نہیں ہے، سرپرست خود تو اس سے نکاح کی خواہش نہیں رکھتا، مگر دوسری جگہ بھی نکاح کرنے سے پس وپیش کرتا ہے کہ لڑکی اگر کسی سے نکاح کرے تو اس کے مال سے سرپرست محروم ہوجائے گا، اسی ظلم وزیادتی کو ختم کرکے اللہ تعالیٰ نے حکم جاری فرمایا کہ اگر ان یتیم بے سہارا لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتے تو انہیں تنگ نہ کرو، ان کے علاوہ اپنی

پسند کی دوسری عورتوں سے نکاح کرلو۔ دوسری عورتوں سے نکاح کریں گے تو چونکہ وہ خود سوچ سمجھ والی ہوں گی، اور پہلے سے ان پر قابو نہ ہوگا تو حسب منشاء جتنا حق مہر چاہیں گی مقرر کریں گی، کیونکہ ان پر کوئی دباؤ نہ ہوگا۔

اگر کوئی شخص یتیم لڑکی سے نکاح کرنا چاہے، اور حق مہر اس کو پورا پورا انصاف کے ساتھ دیدے، تو یہ بھی درست ہے، اسی لئے ﴿وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا﴾ فرمایا: ''تفسیر در منثور'' میں بحوالہ ابن جریر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہی منقول ہے۔

خلاصہ:

سببِ نزول سے یہ معلوم ہوا کہ یتیم لڑکیاں جو صاحب مال ہوتی تھیں ان سے نکاح تو کرلیتے تھے، لیکن حقِ مہر پورا نہ دیتے تھے، اور سلوک اچھا نہ رکھتے تھے، ان کا مہر اتنا کم دیتے تھے کہ نہ ہونے کے برابر، لہٰذا ان کو حکم دیا گیا کہ اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ یتیم بچیوں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو دوسری عورتوں سے نکاح کرلو، جو تمہیں پسند ہوں۔

چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت، اور عدل کرنے کا حکم:

آیت کریمہ میں دوسری پسندیدہ عورتوں کے ساتھ نکاح کے حکم کے ساتھ عورتوں کی تعداد کے بارے میں بھی ارشاد فرمایا، کہ جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرسکتے ہو، اور اگر یہ ڈر ہو کہ ان میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی عورت سے نکاح کرلو، یا باندیوں پر کفایت کرکے بس کرو۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اول تو ہر شخص کو بیک وقت دو، یا تین، یا چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دیدی، اور فرمایا کہ جو تمہیں اچھی لگیں ان سے نکاح کرلو، ایک سے زائد نکاح کرنا جائز ہے، فرض اور واجب نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات مستحب و پسندیدہ بھی نہیں، چہ جائیکہ ضروری ہو۔ اور جائز بھی اس شرط پر ہے کہ جتنی بیویاں ہوں ان سب کے درمیان عدل و انصاف رکھے۔ قلبی تعلق غیر اختیاری پر تو کوئی مواخذہ (گرفت) نہیں ہے، البتہ اختیاری چیز میں عدل و برابری نہ کی تو مواخذہ ہوگا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس دو عورتیں ہوں، اور وہ ان دونوں عورتوں کے درمیان عدل، یعنی برابری نہ کرتا ہو، تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا، یعنی فالج زدہ معلوم ہوگا، جتنی راتیں ایک کے پاس رہے اتنی ہی راتیں

دوسری کے پاس رہے، تقسیم جس طرح چاہے کرے، یہ اس کے اختیار میں ہے۔ [ترمذی]

بہت سے لوگ پیسہ زیادہ ہونے کی وجہ سے یا خواہ مخواہ شوق میں آکر، یا پہلی بیوی پرانی ہونے کی وجہ سے، یا نئی بیوی مالدار ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کر لیتے ہیں، لیکن پھر برابری نہیں کرتے، اور کسی ایک کے ساتھ ظلم و زیادتی بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ شرعاً حرام ہے، اور بدترین ظلم بھی ہے۔ اگر کسی کو برابری پر قدرت نہ ہو تو ایک ہی بیوی رکھے، تاکہ ظلم وزیادتی سے محفوظ رہے۔

البتہ اگر کسی معقول مجبوری کی بناء پر دوسری یا تیسری شادی کرنی ضروری ہو تو شرعاً کوئی پابندی نہیں ہے، مگر عدل و برابری پھر بھی ضروری ہے۔ اگر ایک بیوی بطیب خاطر بغیر کسی جبر و اکراہ کے اپنا حق شب باشی معاف کر دے تو پھر برابری استحباب کے درجہ میں متصور ہوگی۔ تفصیل کے لئے کتب فقہ کا مطالعہ کیا جائے۔

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا﴾ یہ اس سے قریب تر ہے کہ تم زیادتی نہ کرو، یعنی نکاح کے بارے میں جو تفصیل اوپر بیان کی گئی ہے اس کے مطابق عمل کرو گے تو ظلم وزیادتی سے محفوظ رہ سکو گے، مذکورہ ہدایات پر عمل کرنا ظلم سے بچانے کے لئے بہت زیادہ قریب تر ہے، کہ ایک طرف جھک نہ پڑو گے، یعنی ترازو کے دونوں پلڑے برابر رہیں گے، بغیر کسی جھکاؤ کے۔

تعدّدِ ازواج فطرت کے خلاف نہیں ہے:

شریعت اسلامیہ میں بیک وقت صرف چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ شیعوں نے اہل سنت والجماعۃ کے برخلاف یہ کہا ہے کہ چار سے زائد بیویوں سے نکاح بیک وقت درست ہے۔ پھر ان کا ایک قول یہ ہے کہ صرف نو تک، دوسرا قول یہ ہے کہ اٹھارہ تک، چونکہ ان کے مذہب میں متعہ جیسے گناہ محض جائز تو کیا، بلکہ تمام نیکیوں سے افضل نیکی ہے، جیسے وہ کہتے ہیں کہ ایک متعہ کرنے سے ستر مرتبہ عمرہ کرنے کا ثواب ملتا ہے، اور ایک متعہ کرنے والا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ تک درجہ میں برابر ہوگا، دو متعہ سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ تک، تین مرتبہ سے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا تک، چار سے حضرت ابوالحسن حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک، پانچ مرتبہ متعہ کرنے سے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تک کا شرف حاصل ہوگا۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

ایسے لوگ اگر اٹھارہ بیویوں سے بیک وقت نکاح کی اجازت دیں، تو کوئی تعجب و حیرانی نہیں ہے، جیسا مذہب ویسے اس کے احکام، قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ اب پانچ سے زائد متعہ کرنے والے کو معلوم نہیں کس ہستی

کا مقام ملے گا؟ یہ ان سے پوچھو، شاید ان کے پاس اس کا جواب ہو۔

بہر حال! اہلسنت والجماعۃ کے نزدیک نصِ قرآن اور احادیث و اجماع امت کی رُو سے بیک وقت چار بیویوں سے نکاح کی اجازت ہے، مگر مذکورہ بالا شرط سے مشروط ہو کر۔ البتہ دوسری قوموں میں اس کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اس کے بدلے ان کے یہاں یہ جائز بلکہ پسندیدہ ہے کہ بہت سی دوستانیاں آشنائیں (گرل فرینڈز) رکھ لے۔

یورپی اقوام میں جس مرد کی جتنی زیادہ دوستانیاں ہوں، یا جس عورت کے جتنے زیادہ یار دوست ہوں، وہ معزز اور قابلِ احترام سمجھے جاتے ہیں، اور یہ چیز ان کے لئے باعثِ افتخار ہے۔ زنا کاری ان کے نزدیک کچھ عیب کی بات نہیں ہے۔ البتہ زنا بالجبر جرم سمجھا جاتا ہے، جبکہ خوشی اور رغبت کے ساتھ جائز اور مستحسن ہے۔

حتیٰ کہ ہندوؤں میں یہ بھی رواج ہے کہ بھانجی اور بھتیجی کے ساتھ نکاح روا ہے، اگر چھ بھائیوں میں سے کسی ایک کی بیوی ہو، تو سارے بھائیوں کے لئے قابلِ استعمال ہے۔ اسی بنیاد پر ایک عورت نے اپنی ساس سے معصومانہ انداز میں دریافت کیا کہ: اماں جی یہ بتاؤ کہ تمہارے سات بیٹوں میں سے میرا شوہر کون ہے؟ اماں جی نے کہا بیٹی! تم کو کیا ہوا؟ تم جوان ہو، میرے بال سفید ہو گئے، ابھی تک مجھے اپنے شوہر کا پتہ نہیں کہ کون ہے۔ [خطبات]

ایک یورپی مؤرخ نے لکھا ہے کہ ہماری یورپی آبادی اس وقت پینتالیس کروڑ کے قریب ہے، جبکہ مجھے یقین ہے کہ اس پوری آبادی میں کوئی پینتالیس افراد بھی حلالی نہیں، سب کے سب حرامزادے ہیں۔ [معالم العرفان: ج ۳]

یورپی اقوام نے حد کر دی کہ زنا اور اغلام بازی کی تو عام اجازت ہو، اور ایک سے زائد منکوحہ رکھنا ممنوع ہو۔

اسلام پر ان عیسائیوں کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اسلام تعددِ ازواج کی کیوں اجازت دیتا ہے؟ یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اوّل تو چار تک کی اگر اجازت ہے، یہ کوئی واجب اور ضروری نہیں ہے۔ دوسرے دنیاوی احوال کے اعتبار سے اس اجازت کی لازمی ضرورت ہے، اول تو اس میں نسل بڑھانے کا فائدہ ہے، اور دوسرا عظیم فائدہ یہ ہے کہ جب کسی وجہ سے مردوں کی قلت ہو جائے، جیسا کہ جہاد اور جنگوں میں مرد شہید ہو جاتے ہیں، تو جو عورتیں بیوہ ہو جائیں، تحفظ آبرو کے ساتھ ان کی کفالت اور ان کے اخراجات کا انتظام ہو جائے، اور پھر عورتوں کی کثرت ہو، اور مردوں کی قلت، جیسا کہ ہمارے موجودہ دور کا حال ہے، تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ عورتیں بنسبت مردوں کے کہیں زیادہ ہیں، تو عورتوں کی عفت و عصمت اور شریفانہ معیشت کا انتظام اسی میں ہے کہ مرد ایک سے زیادہ نکاح کریں۔

موجودہ زمانے میں خود یورپی دانشور اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مرد بنسبت عورتوں کے کم پیدا ہوتے ہیں،

اور مرتے زیادہ ہیں۔ لاکھوں مرد لڑائیوں میں مرتے ہیں، اور ہزاروں کشتیوں اور پانی کے جہازوں میں ڈوب جاتے ہیں، اور بکثرت مرد کانوں میں دب جاتے ہیں، اور بے شمار مرد تعمیراتی کاموں میں مرتے ہیں، قومی جنگوں اور قبائلی لڑائیوں، ڈاکہ، چوریوں اور دوسرے مواقع میں بکثرت مارے جاتے، اور مرتے ہیں، جبکہ عورتیں پیدا زیادہ ہوتی ہیں، اور مرتی کم ہیں۔ پس اگر ایک مرد کو تین چار شادیوں کی اجازت نہ دی جائے، تو ان زائد اور فاضل عورتوں کی زندگی اجیرن ہو جائے گی، اور وہ معاش کی خاطر بھکاری بن کر اپنی عصمت وعفت کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جائیں گی، نہ ان کا کوئی رہائشی گھر ہوگا، اور نہ ہی کوئی سہارا، وہ عصمت فروشی پر مجبور ہو جائیں گی، اور رات کو سڑکوں پر اوباش لوگوں کے ساتھ رات گزاریں گی، جیسے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور اور ترقی یافتہ ملک امریکہ میں ہو رہا ہے۔

اسلام دینِ فطرت اور اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا پاکیزہ اور باغیرت دین ہے، وہ ہرگز اس قسم کے مخربِ اخلاق اور جنسی زیادتیوں کی اجازت نہیں دیتا، اور نہ ہی ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اور یہ عقل کے مارے عیسائی یورپی ہیں جن کے ہاں تعددِ نکاح کی اجازت نہیں، مگر زنا کی اجازت ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

یورپ کا سیاح دانشور محقق سروے کرنے والا ببانگ دہل کہتا ہے، اور یہ اقرار کرتا ہے کہ مسلمان ممالک میں عورت کا جو مقام وشرف اور عصمت وعفت قائم ہے، یورپ کی عورت کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں۔ یورپ کی عورت مردوں کی ہوس کا نشانہ بنی ہوئی ہے، جبکہ مسلم ممالک کی عورت کو خاتونِ خانہ کا درجہ حاصل ہے۔ تو اسلامی تعلیمات پر اعتراض کرنے والے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ جنہوں نے عورت کو گھر سے نکال کر بازاروں، گلیوں، دفتروں اور ہوس خانوں میں لا کر اس کا بیڑا غرق کر دیا، آج وہ خود حواس باختہ پریشان ہیں، مگر خود کردہ را علاج نیست، بات ان کے قابو سے نکل چکی ہے۔ مزید آئندہ، ان شاء اللہ

نکاح کے لئے دیندار، شریف اور اچھی عورت کا انتخاب ضروری ہے:

باندیوں، لونڈیوں کا زمانہ گزر گیا، اب موجودہ زمانہ میں ان کا وجود ہی نہیں ہو سکتا ہے، حضرت مہدی علیہ السلام آخر زمان کے بعد یہ سلسلہ پھر لوٹ آئے گا۔ واللہ اعلم

البتہ! نکاح کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، قرآن کریم نے ﴿مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ سے اس کی اہمیت اور بنیادی عنصر کو واضح فرما کر اپنے ماننے والوں کو خبردار کیا کہ اندھا دھند شادیاں نہ کریں، سمجھ، سوچ، مشوروں کے بعد شریکِ حیات بیوی کا انتخاب کریں۔ آیت کریمہ سے اشارۃُ النص کے طور پر یہ بھی معلوم ہوا کہ

عورت کو بھی چاہئے کہ اپنے شریک کے انتخاب میں احتیاط اور مشورہ کرے، محض کسی کے مال اور سرمایہ کو دیکھ کر اپنی زندگی داؤ پر نہ لگائے۔

آیت کریمہ نے ﴿مَا طَابَ لَكُمْ﴾ فرما کر یہی ہدایت جاری فرمائی کہ پسندیدہ عورتوں سے شادی کرلو، اب پسند آنے کے بہت سارے اسباب ہیں، اور لوگوں کے مزاجوں کے اختلاف سے اسباب مزید مختلف ہو سکتے ہیں۔ کسی کا رجحان اگر کسی سبب کی طرف ہو شاید کہ دوسرے کے نزدیک اس کی چنداں اہمیت نہ ہو۔ مثلاً مال، جمال، دینداری، خاندانی شرافت، تعلیم دینی، دنیوی تعلیم، عمر و جوانی وغیرہ بہت سے اوصاف ہیں جو عورتوں میں ہوتے ہیں۔ آیت کریمہ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ پسندیدہ عورتیں تلاش کرنا غلط کام نہیں ہے، بلکہ مستحسن اور فائدہ مند ہے۔ ان تمام خوبیوں اور پسندیدہ اوصاف کو دیکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے، مگر دینداری سب پر مقدم اور سرفہرست ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً روایت کیا کہ چار چیزوں کی وجہ سے عورت سے نکاح کیا جاتا ہے: اس کے مال کی وجہ سے، اس کے صاحبِ مرتبہ خاندان کی وجہ سے، اس کے جمال وخوبصورتی کی وجہ سے، اور اس کی دینداری کی وجہ سے۔ پس آپ دین والی عورت کو حاصل کرو، اللہ تعالیٰ تیرا بھلا کرے۔ [مسلم]

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا ساری کی ساری نفع کی چیز ہے اور دنیا کے منافع میں سب سے بہتر چیز نیک عورت ہے۔ [مسلم]

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تقویٰ کے بعد جو چیزیں بندہ کو حاصل ہوں، ان میں نیک بیوی سے بڑھ کر کوئی بہترین نعمت نہیں ہے، پھر نیک بیوی کے اوصاف بیان فرمائے، وہ یہ ہیں: (۱) اگر شوہر اسے کوئی حکم دے تو فرمانبرداری کرے۔ (۲) اگر اس کی طرف دیکھے تو خوشی محسوس کرے۔ (۳) اگر شوہر کوئی قسم کھائے جو بیوی کے عمل کرنے سے متعلق ہو تو اس کی قسم پوری کرے۔ (۴) اگر شوہر کہیں چلا جائے تو اپنی جان اور شوہر کے مال کی حفاظت کرے۔ [ابن ماجة]

جس طرح عورتوں میں دینداری کو دیکھ کر نکاح کو ترجیح دیجاتی ہے، اسی طرح اپنی بچیوں کے لئے نیک دیندار شوہر کا اہتمام کرنا بھی ضروری ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص پیغام بھیجے جس کی دینی اور اخلاقی حالت تمہیں پسند ہو، تو اس سے نکاح کردو، اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ ہوگا، اور لمبا چوڑا فساد ہوگا۔ [ترمذي]

نکاح ایک اہم عبادت بھی ہے، اور تسکینِ قلب کا ذریعہ بھی ہے۔ اور نکاح سے مرد وعورت دونوں کی شخصیت بنتی ہے، اور نیک اولاد سے ہزاروں مشکلات بھی حل ہو جاتی ہیں۔ سلسلۂ نسب مضبوط ومحکم ہو جاتا ہے، فطری تقاضے سارے پورے ہو جاتے ہیں، نیک اولاد سے آخرت کے درجات بلند ہو جاتے ہیں، نظر اور خیالات درست ہو جاتے ہیں، حیاء اور رزق روزی میں برکت آجاتی ہے، نمازیں اور دیگر طاعات قبول ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں چار چیزوں کو انبیاء ومرسلین علیہم السلام کی سنت بتایا گیا ہے: حیاء، خوشبو، مسواک اور نکاح۔ [ترمذي]

بہر حال! نکاح میں دینی اور دنیوی فوائد بہت ہی زیادہ ہیں، اور نقصان نہ ہونے کے برابر۔ بیویوں اور اولاد کی کثرت میں قیامت کی فلاح اور کامیابی مضمر ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗـــــًٔـا مَّرِيْۗـــــًٔـا ۝۴

ترجمہ: اور تم عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کردو، سو اگر وہ تمہارے لئے اس میں سے نفس کی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو اس سے مبارک طور پر خوشگواری کے ساتھ کھاؤ ۝۴

معارف ومنازل

شریعتِ مطہرہ میں عورت کی ایک حیثیت ہے، جب کوئی مرد اس سے نکاح کرے تو اس کا مہر مقرر کردے۔ اگر مہر کے بغیر نکاح پڑھا گیا نکاح تو ہو جائے گا، مگر پھر بھی مہر مثل ادا کرنا ضروری ہوگا۔ عام طور پر حقِ مہر عورت کا سرپرست مقرر کرتا ہے، عورت کو معلوم ہی نہیں ہوتا۔ تو حق مہر مقرر کرنے میں ولی کو اختیار ہوتا ہے، مگر پھر تمام حقِ مہر یا اس کا کچھ حصہ معاف کرنے کا ولی کو بدونِ اجازتِ عورت کے معاف کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔

آج کل عورتوں پر دو طرف ظلم ہو رہا ہے: ایک طرف سے تو ولی وارث کی بے جامداخلت، دوسری طرف سے شوہر کی طرف سے ادائیگی میں حیلے بہانے۔ اور کچھ وارث ایسے بددیانت بھی ہوتے ہیں کہ حقِ مہر لے کر اپنی جیب میں ڈال دیتے ہیں، عورت بیچاری شرم کے مارے خاموش رہتی ہے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہوگا، جس کا حساب قیامت کے دن دینا پڑے گا۔ تو جاننا چاہئے کہ حقِ مہر کا ادا کرنا شوہر کے ذمہ فرض عین ہے، بصورت دیگر عورت کو حق پہنچتا ہے کہ عدالت سے رجوع کرے، اور اپنا حق شوہر سے وصول کرے، اگر شوہر حق مہر کی ادائیگی میں حیلہ بہانہ

کرے یا عورت کو دھوکہ دے کر معاف کرائے، یا زبردستی معاف کرائے، یا دھمکی دے کر جان چھڑا لے، ان تمام صورتوں میں حقِ مہر ادا نہیں سمجھا جائے گا، اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ادا کرنا ہوگا، وہاں چونکہ کوئی روپیہ پیسہ نہیں ہوگا، تو شوہر کی نیکیوں سے حق ادائیگی ہوگی۔ بصورت دیگر عورت کے گناہوں کو شوہر پر رکھ کر اسے جہنم کی طرف چلتا کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ تمام حق خوروں پر لاگو ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سب پر رحم فرمائے، اور کسی مسلمان کو ایسی مصیبت سے بچائے۔ اس مسئلے کی تفصیل آخری پارے کی تفسیر میں ملاحظہ ہو۔

عورت سارا حق مہر، یا اس کا کچھ حصہ معاف کرنے کی مجاز ہے:

اگر عورت پورا حق مہر، یا اس کا کچھ حصہ معاف کردے، یا کچھ حصہ، یا پورا مہر وصول کرنے کے بعد واپس کردے، تو شوہر کے لئے رکھنا جائز ہوگا، مگر شرط یہ ہے کہ عورت نے جو کچھ معاف کیا ہو، یا واپس دیا ہو، وہ اس نے طیبِ نفس (بخوشی ورضامندی) کے ساتھ دیا ہو، یا معاف کیا ہو۔ طیب نفس کے معنی یہ ہیں کہ اچھی طرح خوب خوشی سے دل کی گہرائی سے دیا ہو، یا معاف کیا ہو۔ اگر کوئی زبردستی ہوئی، یا شوہر نے اسے بلیک میل کر کے معاف کرایا ہو، یا دھوکہ دیا، یا اسے مجبور کیا ہو، تو باوجود معافی کے مہر معاف نہیں ہوگا، اور آخرت میں ادا کرنا ہوگا۔

قرآن کریم نے معافی کو جو طیبِ نفس کے ساتھ مشروط کیا ہے، اس میں یہ بتایا ہے کہ جب تک سچ مچ اندر کے جذبات سے، بغیر دباؤ اور بلا جبر واکراہ معاف نہ کیا گیا ہو، اس وقت تک معاف نہ سمجھا جائے۔ بغیر طیبِ نفس کے معاف سمجھ لینا غلط ہے۔ قرآن کریم نے طیبِ نفس کا لفظ استعمال فرمایا، طیبِ قلب نہیں فرمایا، اس میں یہ نکتہ ہے کہ انسان جب سوچنے بیٹھتا ہے تو بہت کچھ سوچ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے، رشوت دینے والے سوچ سمجھ کر جان بوجھ کر رشوت دیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ایک ہزار روپیہ دے کر پچاس ہزار روپیہ بچیں گے، یہ قلب اور دماغ کا کام ہے، لیکن نفس کبھی بھی اپنا حق چھوڑنے، یا بے جگہ پیسہ خرچ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔

جب شوہر بیوی سے مہر معاف کرواتا ہے تو اسے پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اگر میں معاف نہ کروں تو کتنے نوٹوں کے بنڈل میری ملکیت میں آئیں گے، اور ان کے خرچ کرنے کے بارے میں مجھے پورا پورا اختیار ہوگا، وہ ہر طرح خالی الذہن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب لوگ معاف کرانے لگتے ہیں تو عورت دور دور تک سوچتی ہے کہ اگر میں نے معاف نہ کیا تو شوہر مجھ سے ناراض ہوجائے گا، اگر یہ مجھ سے ناراض ہوگیا تو کیا کروں گی؟ کہاں جا کر رہوں گی؟ ماں باپ

کب تک مجھے سہارا دیں گے؟ بھائی ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ نہیں سکتے، ایسی باتیں سوچ کر اور یہ سمجھ کر کہ ملتا تو نہیں، لاؤ معاف ہی کر دو، اور سکون سے رہوں۔ لہٰذا اوپر کے دل سے تو معاف ہی کر دیتی ہے، مگر اندر کے نفس سے معاف نہیں کرتی، تو شرعاً بددلی کی معافی کا کوئی اعتبار نہیں، اور جو چیز بددلی کے ساتھ لی جائے وہ حلال نہیں ہوتی۔ حدیث شریف میں قاعدہ کلیہ کے طور پر فرمایا کہ خبردار! کسی کا مال حلال نہیں ہے مگر اس کے نفس کی خوشی کے ساتھ۔ [مشکوٰۃ]

بہت سے لوگ کسی کا مال لے لیتے ہیں، وہ لحاظ سے یا شرافت یا کسی دباؤ میں خاموش رہتے ہیں، مگر اندر سے ان کی مرضی نہیں ہوتی، اس کی خاموشی سے حلال سمجھنا غلط ہے۔ بعض مذاق و دل لگی میں کسی کی چیز لے لیتے ہیں، پھر واپس نہیں کرتے، شرعاً یہ بھی حلال نہیں ہوتی ہے۔ آیت کریمہ میں حق مہر پر لفظِ صدقات کا استعمال اس لئے ہوا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا ایک صدقہ و بخشش ہے، جس سے عورت کی دلجوئی اور احترام مقصود ہے، اور کلمہ نحلۃ کے معنی ہیں: بخشش اور عطیہ، جسے شوہر خوشدلی اور محبت سے ادا کرے۔

حق مہر احناف کے مذہب میں ضروری ہے کہ دس درہم سے کم نہ ہو۔ درہم چاندی کا سکہ ہوتا ہے، ہر زمانے میں اس کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، وزن کے اعتبار سے دس درہم کے ساڑھے اکتیس ماشے بنتے ہیں، کیونکہ ہر درہم تین ماشے ایک رتی کے برابر ہوتا ہے، اور تولہ بارہ ماشے کا ہوتا ہے، اور ماشہ میں آٹھ رتی، پس دس درہم کم از کم دو تولے ساڑھے سات ماشے چاندی کے برابر ہوئے۔ ہر زمانے میں چاندی کے نرخ میں کمی بیشی سے مہر کا تعین سکۂ رائج الوقت کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔

حق مہر جتنا کم ہوا تنا ہی بہتر ہے، جسے ہر شخص بخوشی ادا کر سکتا ہے۔ بہت زیادہ حق مہر بہتر نہیں جسے ہر شخص ادا نہیں کر سکتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ لوگوں کو پانچ سو درہم سے زیادہ حق مہر مقرر کرنے سے منع فرماتے تھے، اور کہتے تھے کہ اگر مہر کی زیادتی کسی عزت و شرف کا باعث ہوتی، تو اللہ تعالیٰ یقیناً سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ حق مہر مقرر کریں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیویوں اور بیٹیوں کا حق مہر پانچ سو درہم سے زیادہ مقرر نہیں کیا، سوائے امّ المؤمنین حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا بنت ابوسفیان کے، کہ ان کا نکاح حبشہ میں حضرت نجاشی نے کرایا تھا، اور چار ہزار درہم اپنی طرف سے ادا کیے تھے۔

یہ وہ اصحمہ نجاشی ہیں جن کی نمازِ جنازہ مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادا فرمائی تھی، عیدگاہ میں چار تکبیروں کے ساتھ، جیسے پہلے بیان ہوا تھا۔ آج کل ہمارے زمانہ میں جو لاکھوں، بسا اوقات کروڑوں روپے حق مہر مقرر کرنے کا

عام رواج چل پڑا ہے، اور لوگ بڑے فخر واعزاز کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہیں، یہ سب خلاف شریعت وخلاف سنت ہے، کسی کی بیٹی، یا بہن حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے پاؤں کے گردوغبار تک نہیں پہنچتی، جن کا مہر پانچ سو درہم مقرر ہوا تھا، اگر ان کے ناخن کی قیمت لگائی جائے، تو قیامت تک آنے والی عورتیں ان کی قیمت نہیں بن سکتیں۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۤءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّ
ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۵﴾

ترجمہ: اور نہ دو بیوقوفوں کو اپنے مال، جو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے قیام اور زندگی گزارنے کا ذریعہ بنایا ہے، اور ان کو کھلاتے رہو ان مالوں سے، اور پہناتے رہو، اور کہو ان سے معقول بھلی بات ﴿۵﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ کی سلف سے دو تفسیریں منقول ہیں: پہلی تفسیر حضرت مجاہد اور اکثر مفسرین حضرات رحمہم اللہ سے منقول ہے، کہ یہ آیت کریمہ بدستور سابق یتامیٰ کے بارے میں ہے، کہ نابالغی کی حالت میں تو ان کا مال ان کے حوالے نہیں کیا جاسکتا، لیکن بلوغ کے بعد حکم یہ ہے کہ ان کے اموال ان کے حوالے کئے جائیں، جیسا کہ آئندہ آنے والا ہے۔ لیکن اس آیت میں قرآن کریم کا منشاء یہ ہے کہ اگر یتیم بالغ ہو جائے، اور بلوغت کے باوجود وہ سفیہ، بے عقل ہو، لین دین اور مال کی حفاظت کا اس میں سلیقہ اور دانشمندی نہ ہو، اگر مال اس کے سپرد کرنے کے بعد مسلسل یہ خطرہ ہو کہ وہ مال کو غلط کاموں میں، غلط سوسائٹی میں لگا کر ضائع وتباہ کرے گا، تو ایسی صورت میں باوجود بلوغ کے مال اس کے حوالہ نہ کرنے کا حکم ہے، کہ چند وقت مزید انتظار کرو، جب اس میں مال رکھنے اور خرید وفروخت وتحفظ مال کا سلیقہ پیدا ہوگا، اور طبیعت کی لاابالی پن اور لاپرواہی ختم ہوگی، تب مال ان کے حوالہ کیا جائے۔

البتہ اس درمیان میں ان کے کھانے پینے، لباس وعلاج وغیرہ اسی مال سے پورا کرتے جاؤ۔ اگر وہ تقاضاء کریں، یا کسی پریشانی کا اظہار کریں، کہ ہمارا مال کیوں ہمارے سپرد نہیں کیا جارہا، تو انہیں قول معروف، پیار ومحبت سے سمجھاؤ، کہ یہ مال تمہارا ہی ہے، ہر حال میں تمہیں ملے گا، ہم اس کے محافظ ہیں، ان شاء اللہ سمجھ اور سلیقہ آنے پر بلا چون وچرا تمہارے ہاتھوں میں آجائے گا، تو وہ مطمئن ہو جائیں گے، اور مال بھی نقصان سے بچ جائے گا۔

رہا یہ کہ اَمْوَالِهِم کی جگہ یہاں اَمْوَالَكُمْ کیوں کہا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادنیٰ مناسبت کا لحاظ رکھا گیا، اور اولیاء کو خبر دار کیا گیا کہ جس طرح تم اپنے مال کی دیکھ بال کرتے ہو، اسی طرح یتیم کے مال کو اپنا مال سمجھ کر اس کی حفاظت اپنے مال کی طرح کرتے رہو، اور سمجھو کہ یہ تمہارا ہی مال ہے۔

﴿جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ میں ایک بہت بڑے مسئلے کی نشاندہی فرمائی، کہ یہ مال کوئی بری چیز نہیں ہے، کہ جس کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہ ہو، بلکہ یہ تمام لوگوں کے لئے سرمایہ حیات ہے، دنیا کا سارا انظام، قوموں کی ترقی و خوشحالی اور ہزاروں نیک کام اسی مال پر موقوف ہیں۔ سرور عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ۔ [مشکوٰۃ]

جائز طریقے سے کمایا ہوا مال اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور نیک بندے اسی مال کے ذریعہ ہزاروں دینی خدمات انجام دیتے ہیں، اور ہزاروں غریبوں، مسکینوں، محتاجوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ مساجد، مدارس اور خانقاہ تعمیر کرتے ہیں۔ سید الانبیاء ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر فرمایا: مَنْ جَهَّزَ جَيْشَ الْعُسْرَةِ فَلَهُ الْجَنَّةُ۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے نوسو اونٹ اور گھوڑے ضروری سامان کے ساتھ حاضر کئے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اسی ہزار درہم پیش کئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گھر کا سارا سامان پیش فرمایا، عورتوں کی سوئی تک۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گھر کا نصف اثاثہ پیش فرمایا۔ مختلف اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نے حسب توفیق جو کچھ پاس تھا حاضر کیا۔ ایک تڑپتی ہوئی صحابیہ عورت رضی اللہ عنہا نے شیر خوار بچہ پیش کیا، کہنے لگی: میرا سرمایہ یہی ہے، میرے پاس اور کچھ نہیں ہے، میں نہیں چاہتی کہ کارِ خیر میں پیچھے اور محروم رہوں، یہ بچہ قبول کریں۔ کوئی مجاہد اپنے ہاتھ کا ڈھال بنا کر اپنا قیمتی بازو بچا سکتا ہے۔ [فضائل جہاد]

الغرض! مال اگر حلال ہو، اور مالک اچھا صالح ہو، تو کیا کہنا۔ اگر مال حرام یا مشکوک ہو، تو مالک بھی مشکوک ہی ہوگا، ایسا مال قدرتی طور پر نیک کاموں میں صرف نہیں ہوگا، بلکہ جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو اس کو اپنے گھر مسجد میں آنے کی توفیق نہیں دیتا، اور اس کے مال کو اپنی رضامندی کی جگہ لگانے کو پسند نہیں فرمائے گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی مالدار غنی تھے، اور قارون بھی بڑا مالدار غنی تھا، اول نے جنت الفردوس حاصل کی، جبکہ دوم نے ابدی جہنم کو پالیا۔

آیت کریمہ کی دوسری تفسیر حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے یہ منقول ہے کہ

بعض لوگ اپنی زندگی میں بیوی، بچوں اور بچیوں کو میراث دیتے ہیں، اور اپنی حیات میں ان کا حصہ نکال کر انہیں سپرد کرتے ہیں، تاکہ مورثِ اعلیٰ کی موت اور وفات کے بعد ورثاء میں کوئی اختلاف اور ظلم و زیادتی وغیرہ کا سدِ باب ہو۔ اسی طرزِ تقسیم اور مال حوالہ کرنے پر پابندی عائد کی گئی، کہ ایسا کرنا اس لئے بہتر نہیں کہ ورثاء میں عورتیں، بالغ اور نابالغ بچے بچیاں، سفہاء اور ناتجربہ کار، بے عقل اور ناداں ہر قسم کے لوگ ہیں، اگر انہیں ان کے حصے کا مال سپرد ہوگا تو سوائے تباہی اور زوالِ مال کے کچھ نہ ہوگا۔

ہاں! ان کے حصص اگر ابھی زندگی میں مقرر و معلوم کرنا ہو، تو کوئی قباحت نہیں ہے۔ مگر مال ان کے سپرد نہ کرو، اور مال میں تصرف کرنے سے انہیں منع کرو، تاکہ یہ مال ضائع نہ ہو۔ اس تفسیر میں اَمۡوَالَکُمۡ میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہو گی۔ علماء کرام نے دونوں تفسیروں کو سراہا، اور پسند فرمایا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں باتیں نہایت صحیح ہیں۔ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی تفسیر کو پسند کیا ہے، کیونکہ یہ اپنے عموم کے اعتبار سے یتیم و غیر یتیم دونوں پر منطبق ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تمہاری اولاد ہو، یا یتیم بچے محض بلوغ کے ساتھ ان کے اموال ان کے سپرد نہ کرو، جب تک ان میں سلیقہ، عقل و شعور اور معاملہ فہمی و فراست پیدا نہ ہو، انہیں ضروریاتِ زندگی کے لئے اخراجات فراہم کرتے جاؤ، اور قولِ معروف کے ساتھ حوصلہ افزائی کرتے رہو۔

.......❁.......❁.......❁.......

وَابۡتَلُوا الۡيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ ۚ وَلَا تَاۡكُلُوۡهَاۤ اِسۡرَافًا وَّبِدَارًا اَنۡ يَّكۡبَرُوۡا ؕ وَمَنۡ كَانَ غَنِيًّا فَلۡيَسۡتَعۡفِفۡ ۚ وَمَنۡ كَانَ فَقِيۡرًا فَلۡيَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَيۡهِمۡ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيۡبًا ۝۶

ترجمہ: اور یتیموں کو آزماتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، پس اگر تم ان سے سمجھ معلوم کرو تو ان کے مال ان کو دے دو، اور نہ کھاؤ یتیموں کے مالوں کو حد سے بڑھتے ہوئے، اور جلدی کرتے ہوئے کہ کہیں وہ بڑے نہ ہو جائیں، اور جو شخص غنی ہو اس کو چاہیئے کہ وہ یتیم کے مال سے بچتا رہے، اور جو شخص فقیر ہو وہ دستور کے مطابق کھائے پس جب تم ان کے مال ان کو دیدو تو ان پر گواہ بناؤ اور اللہ تعالیٰ کافی ہے حساب لینے والا ۝۶

معارف ومنازل

پہلی آیت میں جب یہ معلوم ہوگیا کہ جب تک معاملات میں نابالغوں کی ہوشیاری ثابت نہ ہوجائے، اس وقت تک ان کو اموال سپرد نہ کئے جائیں، اس لئے دوسری آیت میں بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام، اور پھر امتحان کر کے ان کی صلاحیت معلوم کرنے کے لئے احکام دے گئے، تو ارشاد ہوا:

﴿وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ﴾ یعنی بالغ ہونے سے پہلے ہی چھوٹے چھوٹے معمولی معاملات خرید وفروخت ان کے سپرد کر کے ان کی صلاحیت وسوچ کا امتحان لیتے رہو، اور رہنمائی بھی کرتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کے قابل، یعنی بالغ ہوجائیں، تو اب خاص طور سے اس کا اندازہ لگاؤ، کہ وہ اپنے معاملات میں ہوشیار ہوگئے ہیں یا نہیں، جب ہوشیاری محسوس کرلو تب ان کے اموال ان کے سپرد کرلو۔

خلاصہ یہ کہ بچوں کی مخصوص طبیعت، اور ان میں عقل وہوش کی نشو ونما کے اعتبار سے ان کے تین درجے کردیئے گئے: ایک بلوغ سے پہلے، دوسرا بلوغ کے بعد، تیسرا ہوشیاری کے بعد۔ بلوغ سے پہلے بچوں کے اولیاء کو یہ حکم ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت کی کوشش کریں، معاملات میں ان کو ہوشیار کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے معاملات خرید وفروخت کے ان کے ہاتھ سے کرائیں، آیت کریمہ کا یہی مطلب ہے۔ اس سے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ نابالغ بچے جو معاملات خرید وفروخت اپنے ولی کی اجازت سے انجام دیں، وہ صحیح اور نافذ ہیں۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ جب وہ بالغ اور نکاح کے قابل ہوجائیں تو اب معاملات اور تجربہ کے اعتبار سے ان کے احوال کی جانچ کرو، اگر دیکھو کہ وہ اپنے نفع ونقصان کو سمجھنے لگے ہیں، اور معاملات سلیقہ سے کرتے ہیں، تو ان کے مال ان کے حوالہ کردو، اور یہ بھی واضح ہو کہ ملک وطن، قوم وقبیلہ، تعلیم وتربیت، ذہانت وغباوت کے اختلاف سے، نیز معاشرہ کی وجہ سے سارے بچے ایک جیسے نہیں ہوتے، چنانچہ خاص کر ہمارے اس زمانے میں بلوغ سے پہلے کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں کہ بڑے تجربہ کار لوگ ان کے سامنے کچھ نہیں ہوتے، اور کچھ غبی مزاج سادہ لوح ایسے بھی ہیں کہ بلوغ تو کیا، بیس سال کی عمر میں بھی غبی اور نکمے رہتے ہیں، شہری بچے بنسبت دیہاتیوں کے ہوشیار ہوتے ہیں۔

بلوغ کی عمر:

اس آیت کریمہ میں جہاں بلوغ کا حکم بیان فرمایا گیا، وہاں قرآن کریم نے اس بارے میں کہ بچے کا بالغ

ہونا کس عمر میں سمجھا جائے گا؟ ﴿فَإِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ﴾ فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ اصل بلوغ کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں ہے، خوشحال گھرانے کے بچے جلدی بالغ ہو جاتے ہیں، جبکہ نانِ شبینہ کے محتاج بچے دیر سے بالغ ہو جاتے ہیں۔ صفرائی مزاج والے فوراً بالغ ہو جاتے ہیں، جبکہ بلغمی مزاج والے دیر سے۔ اسی طرح ملکی اور علاقائی لحاظ سے بعض علاقے گرم ہوتے ہیں، بعض سرد ہوتے ہیں، کوئی تر اور کوئی خشک، علی ھذا القیاس۔

چونکہ بلوغت کیلئے کچھ علامات و آثار بھی ہیں، انہی پر بلوغت کا دارومدار ہوگا، ان آثار کے اعتبار سے جس وقت بھی وہ نکاح کے قابل ہو جائیں، بالغ سمجھے جائیں گے، خواہ عمر تیرہ چودہ سال ہی کی ہو۔ البتہ اگر کسی بچے میں آثارِ بلوغ نمودار ہی نہ ہوں، تو عمر کے اعتبار سے اس کو بالغ قرار دیا جائے گا، جس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض نے لڑکے کے لئے اٹھارہ سال، اور لڑکی کے لئے سترہ سال مقرر کئے ہیں۔ اور بعض نے دونوں کے لئے پندرہ سال مقرر کئے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں فتویٰ اس قول پر ہے کہ لڑکی اور لڑکا دونوں پندرہ سال پورے ہونے پر شرعاً بالغ قرار دیئے جائیں گے، خواہ آثارِ بلوغ پائے جائیں یا نہیں، آثارِ بلوغ کی لڑکی کے لئے حمل اور حیض ہے، اور لڑکے کے لئے احتلام اور زیر ناف کے بال اور داڑھی ہے۔

اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا کی تشریح ومطلب:

حکمِ قرآنی یہ ہے کہ جب تم بچوں میں ہوشیاری محسوس کرو، اس وقت ان کے اموال ان کو سپرد کرو۔ اس ہوشیاری کی کیا میعاد ہے؟ قرآن کریم نے اس آخری میعاد کی کوئی صراحت نہیں فرمائی، اس لئے بعض فقہاء اس طرف گئے کہ جب تک پوری ہوشیاری محسوس نہ کی جائے اس وقت تک ان کے اموال ان کے سپرد نہ کئے جائیں، بلکہ بدستور سابق ولی کی حفاظت وامانت میں رہیں گے، خواہ ساری عمر اسی میں گزر جائے، کیونکہ سپردگی کے لئے ہوشیاری شرط ہے، جو کہ موجود نہیں ہے۔

اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ اس جگہ عدمِ ہوشیاری سے وہ مراد ہے جو بچپن کے اثر سے ہو، اور بالغ ہونے کے دس سال بعد تک بچپن کا اثر ختم ہو جاتا ہے، اس لئے پندرہ سال بلوغ اور دس سال سن رشد و ہوشیاری یہی کُل پچیس سال کی عمر ہو جانے پر وہ رشد و ہوشیاری ضرور حاصل ہوگی، جس کے حاصل ہونے میں بچپن اور کم عمری حائل تھی، اور قرآن کریم نے لفظ رُشْدًا نکرہ لا کر اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے کہ مکمل ہوشیاری اور دانشمندی شرط نہیں ہے، کسی قدر ہوشیاری بھی اس کے لئے کافی ہے، کہ ان کے اموال ان کو دیدیئے جائیں، اس لئے پچیس سال

تک انتظار کر کے اگر مکمل ہوشیاری نہ بھی آئے تب بھی ان کے اموال ان کو دیدئے جائیں گے۔ رہی مکمل ہوشیاری اور دانشمندی، سو یہ بعض لوگوں میں عمر بھر نہیں آتی، وہ ہمیشہ سیدھے بھولے بھالے رہتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کو اپنے مال سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

ہاں! اگر کوئی بالکل پاگل اور مجنون ہے، سو اس کا حکم علٰحدہ ہے، کہ وہ ہمیشہ نابالغ بچوں کے حکم میں رہتا ہے، اور اس کے اموال کبھی اس کے حوالہ نہ کئے جائیں گے، جب تک اس کا جنون زائل نہ ہوجائے، اگرچہ ساری عمر اس جنون میں گزر جائے۔

یتیموں کا مال بے جا خرچ کرنے کی ممانعت:

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے اس آیت میں اس بات کی واضح ہدایت دی گئی ہے کہ یتیموں کا مال اس وقت تک ان کے حوالہ نہ کرو جب تک ان میں کسی قدر ہوشیاری اور تجربہ نہ آجائے، اور اس کے لئے ظاہر ہے کہ مزید کچھ عرصہ انتظار کرنا ہوگا۔ اس حالت میں یہ امکان تھا کہ اولیاء یتیم کی طرف سے کوئی ایسی زیادتی ہو، جس سے یتیم کا نقصان ہو، اس لئے آگے اس آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَأْكُلُوهَآ إِسْرَافًا وَّبِدَارًا أَن يَّكْبَرُوا﴾ یعنی ان اموال کو ضرورت سے زائد اٹھا کر، اور اس خیال سے کہ یہ بالغ ہوجائیں گے تو ان کا مال ان کو دینا پڑے گا، جلدی جلدی اڑا کر مت کھاڈالو۔ اس میں اولیاء یتیم کو دو چیزوں سے روکا گیا: ایک یہ کہ ان کے مال میں اسراف، یعنی ضرورت سے زائد خرچ کرنے سے، اسی طرح بے جا اور بلاضرورت خرچ کرنے سے۔ دوسرے اس بات سے روکا گیا کہ ان کا مال ضرورت پیش آنے سے پہلے جلد جلد خرچ کیا جائے اس خیال سے کہ عنقریب یہ بڑے ہوجائیں گے، تو ان کا مال ان کو دینا پڑے گا، ہمارا اختیار ختم ہوجائے گا، بدنیت لوگوں کا یہی شعار ہے۔

یتیم کا ولی اس کے مال سے ضرورتاً کچھ لے سکتا ہے:

آخرِ آیت میں اس کا ضابطہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی یتیم بچے کی تربیت، اور اس کے مال کی حفاظت و خدمت میں اپنا وقت اور محنت خرچ کرتا ہے، کیا اس کو یہ حق ہے کہ یتیم کے مال میں سے اپنا حق الخدمت (مزدوری) کچھ لے لے؟ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ﴾ یعنی جو شخص حاجت مند نہ ہو اپنی ضروریات دوسرے ذرائع سے پورا کر سکتا ہو، اس کو چاہئے کہ یتیم کے مال میں سے حق الخدمت نہ لیا کرے، کیونکہ یہ خدمت اس کے ذمہ فرض ہے، اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے، یہ خدمت فی سبیل اللہ انجام دے، بغیر معاوضہ کے۔ ہاں! اگر:

﴿وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ یعنی یتیم کا ولی اگر فقیر و محتاج ہو، اس کا کوئی ذریعۂ معاش نہ ہو، تو وہ یتیم کے مال میں سے ایک مناسب مقدار دستور کے مطابق کھا سکتا ہے، تا کہ اس کی حاجت روائی ہو۔

پھر اس کے متعلق علماء کرام یہ کہتے ہیں کہ اس میں تین قول ہیں: اول یہ کہ پہلے ضرورت مند ولی کو یتیم کے مال میں سے کچھ کھانے کی اجازت تھی، بعد میں آیت کریمہ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ﴾ [النساء: ١٠] نے اس کو منسوخ کر دیا۔ یہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یتیم کا ولی جو فقیر ہو بقدرِ ضرورت بطورِ قرض اس کے مال سے کھا سکتا ہے، جب مال ہاتھ میں آجائے تو ادائیگی کر دے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر، مجاہد، عبیدہ سلمانی، ابو العالیہ رحمہم اللہ اور حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یتیم کا ولی جو ضرورت مند ہو اس کے مال کی نگرانی اور متعلقہ امورِ ضروریہ کی مشغولیت کے عوض بطورِ اجرت و مزدوری اس میں سے کھا سکتا ہے، مگر یہ دستور کے مطابق ہو، نہ کہ زیادہ، تا کہ یتیم کا نقصان نہ ہو۔ [روح المعانی ج ۴]

اسی آخری قول کو صاحبِ ہدایہ نے مختار کہا، واللہ اعلم

﴿فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا﴾ جب یتیموں کو ان کے مال سپرد کرنے لگو تو اس پر گواہ بنا لیا کرو، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ بعد میں وہ یہ نہ کہہ سکیں گے کہ ہم نے مال نہیں لیا، اور آئندہ کوئی تنازعہ بھی نہ ہوگا۔ اور مقدارِ مال بھی معلوم ہوگی۔ جس طرح عام معاملات میں گواہوں کا اہتمام رہتا ہے، یہ بھی ایک قسم کا معاملہ ہے، کہ اس میں امانت کی ادائیگی ہو رہی ہے۔ آخری جملہ:

﴿وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا﴾ اتنا عظیم جامع جملہ ہے کہ زندگی کا کوئی ایسا عمل نہیں جو اس پر منطبق نہ ہو۔ اگر ایک مسلمان صرف اس جملہ پر عامل رہے شاید اس کو روزِ قیامت کوئی مشکل درپیش نہ ہو۔

فائدہ:

دینی مدارس کے مہتمم و منتظمین حضرات کو چاہئے کہ اگر ان کا اپنا کوئی ذریعۂ معاش ہو، تو وہ اپنی خدمات کے عوض مدرسہ کے مال سے کچھ نہ لیں، اس خالص دینی کام کو مفت فی سبیل اللہ انجام دیدیں۔ ہاں! اگر وہ فقیر و حاجتمند

ہوں، تو پھر تنخواہ بقدرِ ضرورت وگزارہ لیا کریں، زیادہ مالداری اور خوشحالی سے پرہیز کریں۔ واللہ ولی التوفیق وعلیہ التکلان وحسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

.......✿.......✿.......✿.......

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ
مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝۷

ترجمہ: مردوں کے لئے اس مال میں سے حصہ ہے جو ان کے ماں باپ نے اور رشتہ داروں نے چھوڑا، اور عورتوں کے لئے اس مال میں سے حصہ ہے جو ان کے ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا، وہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ مقرر کیا ہوا ہے ۝۷

معارف ومنازل

اسلام سے پہلے عرب وعجم کی قوموں میں صنفِ ضعیف (یتیم بچے بچیاں) اور صنفِ نازک (عورت) ہمیشہ طرح طرح کے ظلم وستم کا شکار رہی ہیں۔ اول تو ان کا کوئی حق ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، اور اگر کوئی حق مان بھی لیا گیا، تو مردوں سے اس کا وصول کرنا اور اس کا محفوظ رکھنا کسی کی قدرت میں نہ تھا۔

اسلام نے سب سے پہلے ان محروم طبقات کی دستگیری کی، اور انہیں حقوق دلائے، اور پھر ان حقوق کا مکمل انتظام وتحفظ کیا۔ قانونِ وراثت میں بھی عام اقوامِ دنیا نے معاشرہ کے ان دونوں ضعیف اجزاء کو ان کے فطری اور واجبی حقوق سے محروم کیا ہوا تھا۔ عرب نے تو اصول ہی یہ بنالیا تھا کہ وراثت کا مستحق صرف وہ ہے جو گھوڑے پر سوار ہو، تیر چلاتا ہو، تلوار ونیزہ سے لڑتا ہو، جنگوں میں دادِ شجاعت لیتا ہو، دشمنوں سے مقابلہ کرتا ہو، مال غنیمت جمع کرتا ہو، ایسے بہادر ہی وراثت کے حقدار ہوں گے۔ تو ظاہر ہے کہ صنفِ نازک اور صنفِ ضعیف اس معیار پر نہیں اتر سکتے، تو وراثت سے لازماً محروم رہتے۔

اس قانون کے تحت نابالغ لڑکا اور لڑکیاں اور عورتیں سب محروم رہتے۔ دنیا کی دیگر اقوام میں بھی یہی رسمِ بد جاری رہی۔ ہندوؤں میں اور عیسائیوں میں بھی عورت کا میراث میں کوئی حصہ نہیں۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے چند ایام بعد مدینہ منورہ میں صحابی رسول حضرت اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کا

انتقال ہوا، پسماندگان میں دو بچیاں، ایک نابالغ لڑکا اور بیوہ رہ گئے۔ عرب کے دستور کے مطابق مرحوم کے دونوں چچا زاد بھائیوں عرفطہ اور سوید نے پورے ترکہ پر قبضہ جما کر مرحوم کے چاروں پسماندگان کو ترکہ سے بے دخل اور محروم کردیا۔ حضرت اوس رضی اللہ عنہ کی بیوہ نے نہایت پریشانی کے عالم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر اپنی اور بچوں کی درد بھری داستان سنائی۔ اس موقع پر اس آیت کریمہ کا نزول ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرحوم کے دونوں چچازاد بھائیوں عرفطہ اور سوید کو بلا کر انہیں سمجھایا، یہ دونوں حکمِ الٰہی تسلیم کرتے ہوئے پورا مالِ متروکہ چاروں پسماندگان کے حوالہ کر کے دستبردار ہوگئے۔ اسی کے ساتھ دیگر آیاتِ فرائض کا نزول ہوا، جو آئندہ دوسرے رکوع میں بیان ہوں گی۔ اس کے ساتھ وہ ظالمانہ دستور ہمیشہ کے لئے دفن ہوگیا۔ اور اسلام کا عادلانہ قانونِ وراثت آب وتاب کے ساتھ پورے عالم میں جاری ہوا۔ الحمد للہ

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ﴾ مرنے کے بعد والدین اور دیگر قرابتدار جو کچھ چھوڑ جائیں اس میں مردوں کا حصہ ہے، اور اسی طرح والدین اور اقرباء کے ترکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے۔

جہالت کے قانون کے تحت عورتوں کو محروم رکھنا سراسر بے انصافی اور ظلم ہے۔ پھر وراثت میں چھوٹے بڑے، بالغ نابالغ کا کوئی فرق نہیں، بیوی کا حصہ موجود ہے، بیٹے چھوٹے ہوں یا بڑے حصہ سب کا برابر ہے، بیٹیاں بھی اسی طرح چھوٹی بڑی کا فرق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر میت کی بیوی حاملہ ہو تو حمل کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے چھوٹے بڑے کی تفریق ہمیشہ کے لئے ختم کر کے انصاف کے سارے تقاضے پورے کئے۔ ورثاء کے حصوں کی تفصیل آئندہ رکوع میں بیان ہوگی۔

﴿مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ﴾ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ سب کے سب کو ورثاء پر تقسیم کرنا ضروری ہے۔ نقدی ہوں یا زیورات، یا سامان، کپڑے، برتن، دکان، مکان، زمین، باغ یا کارخانہ، سب تقسیم ہوں گے۔

﴿نَصِيبًا مَّفْرُوضًا﴾ اللہ تعالیٰ نے یہ حصے اپنی حکمتِ تامہ سے مقرر فرمادئے ہیں۔ ان میں نہ کسی کمی کی گنجائش ہے، نہ زیادتی کی۔ یہ حتمی قانون ہے، جسے قانونِ الٰہی کہا جاتا ہے، اس میں نہ کوئی حاکم مداخلت کرسکتا ہے، نہ کوئی بڑے سے بڑا قانون دان یا وارث، یہاں تک اجمال کا بیان ختم ہوا۔

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا
لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٨﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا
خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ
أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾

ترجمہ:۔ اور جب وراثت کی تقسیم کے وقت قرابتدار اور مسکین حاضر ہوں، تو اس میں سے ان کو بھی کھلا دو، اور ان کو دستور کے مطابق معقول بات کہو ⑧ اور ان لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ جاتے تو ان کا کتنا خوف کھاتے، پس چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں، اور سیدھی بات کہیں ⑨ بیشک وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں بیشک وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے ⑩

معارف ومنازل

میت کے ترکہ میں سب رشتہ دار حقدار نہیں ہوتے، مگر وراثت کی تقسیم کے وقت وہ بھی موجود ہوتے ہیں، اور طبعی طور پر ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے بھی کچھ ملے، مگر یہ معلوم ہونے پر کہ وہ حقدار نہیں ہیں ملول وافسردہ ہوتے ہیں، بالخصوص جبکہ ان میں یتیم ومسکین وحاجت مند بھی ہوں، آیت کریمہ:

﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ﴾ میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا جارہا ہے۔ یعنی دور کے رشتہ دار، یتیم اور مساکین، جو اگر چہ وراثت کے مستحق نہیں ہیں، مگر جب وہ آکر موجود ہوں، تو وراثت پانے والوں کا اخلاقی فرض ہے کہ خوش اخلاقی کے ساتھ اپنے حصہ میں سے کچھ ان کو دے کر ان کی حوصلہ افزائی کریں، اور ان کی آمد سے تنگدل نہ ہوں، اور نہ ان سے بیزار ہوں، اور نہ ہی کوئی تلخ وسست بات کہیں، اور ان کو مناسب طریقہ پر نرمی کے ساتھ سمجھائیں، کہ شرعاً تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے، اور یہ ہم اپنے پاس سے تم کو پیش کر رہے ہیں، آپ یہ قبول کریں، اور دلگیر نہ ہوں۔ اس طرح کہنے سے ان کی حوصلہ افزائی ہوگی، اور آپ ان کی دل شکنی سے محفوظ رہیں گے۔

سبحان اللہ! کیسی پیاری نصیحت ہے، اور آپ اسلامی نظام کی خوش اخلاقی اور خوش اسلوبی کا اچھی طرح اندازہ لگائیں۔ ایک طرف تو اپنے عادلانہ ضابطہ کے مطابق قریبی رشتہ دار کے ہوتے ہوئے دور کے رشتہ دار کو محروم رکھا، اور دوسری طرف ان کی دل شکنی سے بچانے کے لئے میراث پانے والے قرابتداروں کو حسنِ سلوک اور حوصلہ

افزائی کی ترغیب دی۔

یعنی مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ حکم ابتداء میں اس وقت کے لئے تھا جب تک وراثت کے مفصل احکام نازل نہیں ہوئے تھے، جب یہ احکام نازل ہو گئے، اور وارثوں کے حصے مقرر ہو گئے، تو پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ تاہم امام بیضاوی اور دیگر بعض مفسرین رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت حبر الامت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کی رُو سے یہ حکم بطورِ استحباب اب بھی باقی ہے، اگرچہ فرض یا واجب نہیں ہے۔

﴿وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا﴾ ان سے معقول بات کہیں۔ اس قسم کے امیدواروں کے ساتھ سختی سے پیش نہ آنا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مال بغیر محنت کے دیا ہے، تو اس میں سے یتیم و مساکین کو اگر کچھ دیں گے تو تمہارے لئے ثواب کے علاوہ باعثِ برکت بھی ہوگا۔ البتہ یہ یاد رکھو کہ اس قسم کا تبرّع مجموعی ترکہ سے دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں غائب اور نابالغ اور یتیموں کا حق مشترک ہے، اور اچھے اور برے سب کی مشترک میراث ہے، لہٰذا احتیاط ضروری ہے۔

﴿وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا﴾ چاہئے کہ وہ لوگ اس بات سے خوف رکھیں کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ جائیں تو انہیں کتنی پریشانی ہوتی، وہ فکر مند ہو جاتے کہ ان کے بعد ان کے بچوں کے ساتھ لوگ کیسا سلوک کریں گے؟

اللہ تعالیٰ یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ جو چیز تم اپنے لئے پسند کر رہے ہو، یا کرتے ہو، وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرو، اور جو چیز اپنے لئے ناپسند کرتے ہو، وہی دوسروں کے لئے بھی ناپسند کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے بعد تمہارے چھوٹے بچوں کے ساتھ بہتر سلوک ہو، تو تم خود بھی دیگر یتیموں اور کمزوروں کے ساتھ ہمدردانہ، خیر خواہانہ سلوک کرو۔ یہ قدرتی بات ہے جو کوئی دوسروں کے ساتھ اچھا یا برا سلوک کرے گا اس کے پسماندگان کے ساتھ بعینہٖ وہی ہوگا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: تم اس وقت تک کامل الایمان نہیں ہو سکتے جب تک تم اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ [متفق عليه وترمذي]

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا﴾ یتیموں کے اموال کھانا یا ان کے اموال میں ناجائز مداخلت اور تصرف کرنا، یہ سب اس میں آ گئے، جو شخص ایسا کرے گا تو سمجھو کہ وہ جہنم کی آگ سے اپنا پیٹ بھر رہا ہے۔ یہ بات مجاز اور تمثیل نہیں ہے، بلکہ مبنی بر حقیقت ہے۔ سرور عالم

ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز کچھ لوگ قبروں سے اس حالت میں اٹھیں گے کہ ان کے منہ سے آگ کے شعلے اٹھ رہے ہوں گے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا﴾ [ابن أبي شيبة، ابن حبان، ابن أبي حاتم]

جب عالمِ آخرت میں اچھے اور برے اعمال کا پردہ چاک ہوگا، تو نماز وروزہ، زکوٰۃ وحج، تلاوتِ قرآن و صدقات، حور وقصور وغلمانوں کی صورت میں ظاہر ہوں گے، اور برے اعمال وگندے کردار لعنتی طوق سلاسل وزنجیروں اور سانپ وبچھو کی شکل وصورت میں نمایاں ہوجائیں گے۔ اللہ پاک اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا: شب معراج میں میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ اونٹ کے لبوں کی طرح تھے، بالائی لب سکڑا ہوا دونوں نتھنوں پر تھا، اور نچلا ہونٹ سینہ پر لٹکا ہوا تھا، جہنم کے کارندے ان کے منہ میں دوزخ کے انگارے اور پتھر بھر رہے تھے۔ میں نے جبریل (علیہ السلام) سے دریافت کیا: یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل (علیہ السلام) نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال بیجا طور پر کھاتے تھے۔ [مظهري]

یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولادوں کے بارے میں حکم دیتا ہے: مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے، اور اگر وہ عورتیں ہوں دو، یا دو سے زیادہ، پس ان کے لئے دو تہائی ہے، اور اگر ایک ہی ہو تو اس کے لئے آدھا حصہ ہے۔

معارف ومنازل

گزشتہ آیات کے اجمال سے صرف مردوں، عورتوں، بچوں، بچیوں کے مالِ میراث میں استحقاق کا بیان ہوا، کہ یہ ہر طرح کے سارے لوگوں کا شرعاً استحقاق ثابت ہے، اب اس اجمال کی تفصیل کا بیان ہو رہا ہے۔

جاننا چاہئے کہ زمانۂ جاہلیت میں وراثت کی بنیاد تین چیزوں پر رکھی گئی تھی: ایک تو نسب تھا، جس کی بنیاد پر صرف جوان بیٹوں کو باپ کی وراثت کا حقدار سمجھتے تھے، فقط، اور باقی عورتیں بچے محروم رہتے تھے۔ دوسرا سبب

وراثت کا تبنّی ہوتا تھا، جس کی بڑی اہمیت ہوتی تھی، وہ لوگ جس طرح کسی کو منہ بولا بیٹا بناتے تھے، اسے بھی وراثت میں حصہ دیتے تھے۔ اور وراثت کی تیسری بنیاد ولاء تھی، یعنی دوستی، جب دو شخص آپس میں قسم کھا کر ہاتھ ہاتھ میں ڈال کر دوستی کا معاہدہ کرتے تھے، تو وہ ایک دوسرے کے وارث شمار ہوتے تھے۔

انہی تینوں بنیادوں پر وہ لوگ مالِ وراثت کی تقسیم کرتے تھے، جب دینِ الٰہی اسلام آیا، جس طرح زمانۂ جاہلیت کے تمام رسم ورواج ختم کئے گئے، تو وراثت کے حق وانصاف پر مبنی قواعد وضوابط نے زمانۂ جاہلیت کے طور وطریقے کو یکسر منسوخ کر کے رکھ دیا۔ البتہ ولاء کے مسئلہ کو چند وقت کے لئے باقی رکھا گیا، پھر ایک عرصہ بعد لَاوَلَاءَ فِي الْإِسْلَامِ سے اسے بھی مکمل ختم کیا گیا۔

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ شروع ہجرت میں مکہ سے لوگ ہجرت کر کے مدینہ آئے، تو وہ نہایت غربت ومسکنت کے عالم میں تھے۔ سرور عالم ﷺ نے مہاجرین وانصار میں مواخات قائم کر کے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی، چنانچہ اس ابتدائی دور میں یہ بھائی بھائی ایک دوسرے کی وراثت کے حقدار ہوتے تھے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے: يَرِثُ الْمُهَاجِرِيُّ الْأَنْصَارِيَّ وَيَرِثُ الْأَنْصَارِيُّ الْمُهَاجِرِيَّ۔ یعنی مہاجری انصاری کا وارث بنتا تھا، اور انصاری مہاجری کی وراثت میں حقدار ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب وراثت کے مستقل قوانین نازل ہوگئے، تو سورۂ انفال کی آیت: ﴿وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ﴾ [الأنفال:۷۵] (اور رشتہ دار بعض بعض کے زیادہ حقدار ہیں اللہ کی کتاب میں) سے مواخات کی وراثت منسوخ ہوگئی، اور صرف نسبی قرابت وراثت کے لئے باقی رہ گئی، چنانچہ وراثت کا سب سے پہلا سبب نسب قرار پایا، گویا قانونِ وراثت سے ولاء، مواخات اور تبنّی کے تینوں ذرائع ختم اور کالعدم ہوگئے، اب ان لوگوں کے ساتھ محبت ودوستی اور وصیت کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے، مگر وراثت میں ان کا حصہ واستحقاق نہیں ہوتا۔

اب اسلام میں وراثت کی بنیاد صرف تین چیزوں پر ہے: پہلا نسب، دوسرا نکاح، تیسرا ولاء۔ یہ ولاء جاہلیت والے ولاء سے مختلف ہے، عنقریب اس کا بیان آئے گا۔

قسمِ اول نسب کا قانون یہ ہے کہ اَقْرَبْ کی موجودگی میں اَبْعَدْ محروم ہوگا، جیسے باپ کی موجودگی میں دادا محروم ہے، اور بیٹے کی موجودگی میں پوتا محروم ہے۔ علی ھذا القیاس

وراثت کا دوسرا سبب نکاح ہے، جب دو اجنبی لوگ، یعنی مرد وعورت رشتہ ازدواج میں منسلک ہوجاتے ہیں،

تو یہ رشتہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ رحمت وعنایت پر مبنی ہوتا ہے، تو بقاءِ نکاح کے ساتھ میاں بیوی ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں۔ دوصورتیں مرد کے لئے، دوعورت کے لئے حصص کے طور پر مقرر ہیں۔

وراثت کا تیسرا سبب ولاء ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: اول ولاءِ عتاقہ، ہمارے اس زمانہ میں تقریباً اس کا وجود باقی نہیں رہا۔ دوم ولاءِ موالات، یعنی ولاءِ اسلام، اس کا شاذ ونادر شاید وجود ہو، مگر اس پر عمل نہیں ہوتا۔ ان دونوں کی تفصیل کتبِ فرائض میں دیکھی جاسکتی ہے۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان

فی الحال وراثت کے دو ہی سبب باقی رہے ہیں: نسب اور نکاح۔ آیت کریمہ سے انہی دو کے احوال کی ابتدا ہورہی ہے۔ نسب میں پہلے اولاد کے، پھر ماں باپ کے، پھر بھائیوں کے احوال کا بیان ہے۔ چوتھے نمبر پر زوجین کے احوال کا بیان ہے۔ علم فرائض نصف العلم ہے، اس کی تفصیلات کتبِ فرائض میں مذکور ہیں، یہاں صرف چند اجمالی احکام کا تذکرہ ہورہا ہے۔

شانِ نزول آیت کریمہ:

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ (یہ وہ خوش قسمت جلیل القدر صحابی ہیں جن کی مواخات حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوئی، اور یہ بڑے مالدار تھے، انہوں نے اپنی جائیداد کے نصف حصہ کی ابن عوف کو پیشکش کی تھی، جنہوں نے منظور نہیں کیا، اللہ تعالیٰ دونوں سے راضی ہوئے) غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے، تو ان کی بیوی رحمۃ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، اور عرض کیا کہ میری دو بیٹیاں ہیں، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے دونوں چچازاد بھائیوں نے سارے مال پر قبضہ کرلیا ہے، ان بچیوں کو اور مجھے کچھ نہ ملا، بغیر مال کے ان کی شادی کیسے ہوگی؟ تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کے نازل ہونے کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بھائیوں کو بلاکر لڑکیوں کو دو تہائی، اور بیوی کو آٹھواں حصہ، اور بقیہ مال بطورِ عصبہ دونوں چچازاد بھائیوں کو دے دیا۔ [ترمذي]

چند اہم ضروری ہدایات ومسائل:

اتباعِ شریعت زندگی کے تمام شعبوں میں ہر مسلمان پر فرض ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے غیر شرعی کام کرنا اور شرعی مسائل سے پہلوتہی کرنا مسلمانوں کی شان نہیں ہے، اور کمالِ ایمان کے لئے سخت ضرر رساں ہے، رسم ورواج اور لوگوں کی خوش فہمیوں اور خواہشات پر چلنا۔ درحقیقت خداوند تعالیٰ کے احکام پر لوگوں کے خیالات اور منگھڑت باتوں

کو ترجیح دینے کے مترادف ہے۔ حضرت امام مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ نفسانی خواہشات اور لوگوں کے خیالات کو شرعی احکام پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ انہوں نے شریعت کا عملاً انکار کیا، وہ اپنی عقل اور لوگوں کے خیالات پر ایمان لائے، ایسے لوگوں کا ایمان خطرے میں ہوگا۔ [مکتوبات]

ایمان صرف اللہ تعالیٰ کو ماننے کا نام نہیں ہے، بلکہ ظاہری و باطنی انقیاد و تسلیم کا نام ہے۔ اکثر لوگ فوتگی اور بیاہ شادیوں کے موقع پر شرعی احکام کو نظر انداز کر کے حدودِ شرعیہ سے تجاوز کرتے ہیں، اگر یہ تجاوز شادی بیاہ کے موقع پر ہو، تو آنکھیں بند کر کے ایک حد تک اسے برداشت کیا جاسکتا ہے، اس میں شادی والوں کی اپنی حق تلفی اور مالی نقصانات کا گناہ لازم ہوگا، مگر میت کے معاملہ میں یہ فضول خرچی اور بے اعتدالی نہایت خطرناک ہوگی، کیونکہ مرنے والے کا تمام منقولہ و غیر منقولہ ترکہ، حتیٰ کہ اس کے ذاتی استعمال کے کپڑے، کوٹ، واسکٹ، گھڑی، بستره، سواری، چپل، بوٹ، ٹوپی تک میں پسماندگان کا حق وابستہ اور منسلک رہے گا۔ جبکہ پسماندگان میں یقیناً چند ایک غائب ہی رہیں گے، آٹھ دس کے قریب نابالغ بچے بچیاں بھی ہوں گے۔

پس میت کا بھائی اور بڑا لڑکا ان مستعمل اشیاء میں کوئی تصرف کرنے کا ہرگز مجاز نہ ہوگا، اس کو شرعاً ہرگز اختیار حاصل نہیں ہے، کہ وہ یتیموں کے مال میں تصرف کرے، اور جہنمی ہو جائے، اور نابالغ بچے اس کے اہل ہرگز نہیں کہ وہ اپنے سربراہ کو کسی تصرف کی اجازت دیدیں، اگر یتیم کے مال کے کھانے پر جہنم کی سخت وعید آئی ہوئی ہے، تو اس وعید میں بلاشبہ وہ سربراہ شامل ہی رہے گا جس نے کھایا کچھ نہیں، مگر غیر شرعی ظالمانہ تصرف تو کیا ہوا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے سارے گناہ گاروں کو معاف کرسکتا ہے تو یہ اس کی شان و عظمت کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

مگر چار مجرم ایسے ہیں کہ ان کی مغفرت نہیں ہوسکتی: پہلا وہ شخص جو سنتوں کی جگہ بدعات کی ترویج کرتا ہو، دوم وہ شخص جو سودی کاروبار کرتا ہو، سوم وہ شخص جو کمزور یتیموں کا مال تلف کرتا ہو، چہارم وہ شخص جس نے ایک بالشت زمین پر ناجائز قبضہ جمایا ہو۔ [الرسائل الغزالي]

جب کوئی شخص وفات پا جاتا ہے تو اس کے مال کے ہر ہر حصہ اور ہر چھوٹی بڑی چیز کے ساتھ ہر وارث کا حق متعلق ہو جاتا ہے۔ اس کے نابالغ بچے یتیم ہو جاتے ہیں۔ ان بچوں کے ساتھ عموماً ہر گھر میں ظلم و زیادتی کا برتاؤ ہوتا ہے، اور ہر وہ شخص جو ان بچوں کے باپ کی وفات کے بعد مال پر قابض ہوتا ہے، خواہ ان بچوں کا چچا ہو یا بڑا بھائی ہو یا والدہ ہو یا اور کوئی ولی وصی ہو، اکثر ان امور کے مرتکب ہو جاتے ہیں جن کی ممانعت اس رکوع میں کی گئی ہے۔

اول تو سالہا سال مال کو تقسیم کرتے ہی نہیں، ان بچوں کی روٹی کپڑے پر تھوڑا بہت خرچ کرتے رہتے ہیں، پھر بدعات، رسومات اور فضولیات میں اسی مالِ مشترک سے خرچ کئے چلے جاتے ہیں، اپنی ذات پر بڑے زور شور سے خرچ کرتے ہیں، اور حج وعمرہ، شادیاں کرتے ہیں، خوب بلا خوف وخطرہ کھاتے پیتے ہیں، اور اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے سب کچھ کر کے عیش کرتے ہیں، یتیموں کو گزارہ خرچ پر راضی کر کے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی گرفت سے مطمئن اور نڈر و بے خوف رہتے ہیں۔ اللہ بچائے۔

اسی طرح مدرسوں، مسجدوں، یتیم خانوں میں جو چندہ یتیموں بے کسوں کے لئے جمع ہوتا ہے، ان کو صحیح مصرف پر خرچ نہ کرنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے، کہ دوسروں کا مال ہضم کرو کھاؤ اور جہنم خریدلو۔

مسئلہ:

میت کے بدن کے مستعمل کپڑے بھی ترکہ میں شامل ہوتے ہیں، ان کو حساب میں لگائے بغیر یوں ہی صدقہ کردیتے ہیں۔ بعض علاقوں میں تانبے پیتل کے برتن مال کو تقسیم کئے بغیر فقیروں کو دیدیتے ہیں، حالانکہ ان سب میں نابالغوں اور غیر حاضر وارثوں کا بھی حق ہوتا ہے۔ پہلے مال بانٹ لیں، جس میں سے مرنے والے کی اولاد، والدین، بیوی، بہنیں جس جس کو شرعاً حصہ پہنچتا ہے اس کو دیدیں، اس کے بعد اپنی خوشی سے جو شخص چاہے مرنے والے کی طرف سے خیرات کرے، یا مل کر کریں، تو صرف بالغین اپنے حصے سے کریں، نابالغوں کی اجازت کا اعتبار نہیں ہے۔ اور جو وارث غیر حاضر ہو اس کے حصے میں اس کی اجازت کے بغیر بھی تصرف جائز نہیں ہے۔

مسئلہ:

میت کو قبرستان لے جاتے وقت جو چادر جنازے پر ڈالی جاتی ہے، وہ کفن میں شامل نہیں ہے، اس کو میت کے مال سے خریدنا جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ مالِ مشترک ہے۔ کوئی شخص اپنی طرف سے خرچ کرے تو جائز ہے۔ بعض علاقوں میں نماز جنازہ پڑھانے والے امام کے لئے کفن ہی کے کپڑے میں سے مصلیٰ تیار کیا جاتا ہے، اور پھر یہ مصلیٰ امام کو دیا جاتا ہے، یہ خرچ بھی کفن کی ضرورت سے زائد ہے، ورثہ کے مشترک مال میں سے خریدنا جائز نہیں ہے۔

مسئلہ:

بعض جگہ میت کے غسل کے لئے نئے برتن خریدے جاتے ہیں، پھر ان کو توڑ دیا جاتا ہے، یا صدقہ کرتے ہیں۔ اول تو نئے برتن خریدنے کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ گھر کے موجودہ برتنوں سے غسل دیا جاسکتا ہے، اور اگر

خریدنے کی ضرورت پڑ جائے، تو توڑنا جائز نہیں۔ اول تو اس میں مال ضائع کرنا ہے، اور پھر ان سے یتیموں کا اور غائب وارثوں کا حق وابستہ ہے۔ اسی طرح مشترک مال سے صدقہ بھی جائز نہیں، اس کا ثواب نہیں، گناہ ہے۔

مسئلہ:

ترکہ کی تقسیم سے پہلے اس میں سے مہمانوں کی خاطر تواضع اور صدقہ وخیرات کچھ بھی جائز نہیں۔ اس طرح کے صدقہ وخیرات کرنے سے میت کو کوئی ثواب نہیں پہنچتا، بلکہ ثواب سمجھ کر دینا اور بھی سخت گناہ ہے، اس لئے کہ مورث کے مرنے کے بعد اب یہ سب مال تمام وارثوں کا حق ہے، اور ان میں یتیم بھی ہوتے ہیں۔ اس مشترک مال میں سے دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کا مال چرا کر میت کے حق میں صدقہ کیا جائے۔ پہلے مال کو تقسیم کر دیا جائے، اس کے بعد اگر وہ وارث اپنے مال میں سے اپنی مرضی سے میت کے لئے صدقہ وخیرات کریں تو اس کو اختیار ہے۔

مسئلہ:

تقسیم سے پہلے بھی وارثوں سے اجازت لے کر مشترک ترکہ میں سے صدقہ خیرات نہ کریں، اس لئے کہ جو ان میں یتیم ہیں ان کی اجازت تو شرعاً معتبر ہی نہیں، اور جو بالغین ہیں وہ بھی ضروری (یقینی) نہیں کہ طیبِ خاطر سے اجازت دیں، ہوسکتا ہے وہ لحاظ کی وجہ سے اجازت دینے پر مجبور ہوں، یا لوگوں کے طعنوں کے خوف سے، کہ اپنے مردے کے حق میں دو پیسے بھی خرچ نہ کئے۔ اس عار سے بچنے کے لئے با دلِ نخواستہ حامی بھر لے، حالانکہ شریعت میں صرف وہ مال حلال ہے کہ دینے والا طیبِ خاطر سے دے رہا ہو، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

یہاں ہم ایک بزرگ کا واقعہ نقل کرتے ہیں، جس سے مسئلہ اور واضح ہو جائے گا۔ یہ بزرگ ایک مسلمان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، تھوڑی دیر مریض کے پاس بیٹھے تھے کہ اس کی روح پرواز کر گئی، اس موقع پر جو چراغ جل رہا تھا انہوں نے فوراً اسے بجھا دیا، اور اپنے پاس سے پیسہ دے کر تیل منگایا اور روشنی کی۔ لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا، تو فرمایا کہ جب تک یہ شخص زندہ تھا یہ چراغ اس کی ملکیت میں تھا، اور اس کی روشنی استعمال کرنا صحیح تھا، اب یہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا، تو اس کی ہر چیز میں وارثوں کا حق ہو گیا، لہٰذا سب وارثوں کی اجازت ہی سے ہم یہ چراغ استعمال کر سکتے ہیں، اور وہ سب یہاں موجود نہیں ہیں، لہٰذا اپنے پیسوں سے تیل منگا کر روشنی کی۔ [معارف القرآن]

عوام الناس بیچارے مذہب کے ابجد سے واقف نہیں ہوتے، وہ ہزاروں غیر شرعی رسومات میں مبتلا ہیں۔

اہل علم کا فرض بنتا ہے کہ انہیں حقیقت سے مطلع کریں، کسی دباؤ اور لحاظ میں آکر کتمانِ حق کے مرتکب نہ ہوں، کہیں خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ روزِ قیامت ان کے گناہوں کا بوجھ ہم پر نہ ڈالا اور رکھا جائے۔

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں، وہ یہ کہ ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے برابر ہے۔ یہ ایک ایسا قاعدہ کلیہ ہے جس نے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو میراث کا مستحق بنا دیا، اور ہر ایک کا حصہ بھی مقرر کر دیا، اور یہ اصول معلوم ہو گیا کہ جب مرنے والے کی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان کے حصہ میں جو مال آئے گا، اس طرح ان کے درمیان تقسیم ہوگا کہ ہر لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا مل جائے گا۔ مثلاً اگر لڑکا ایک ہو اور لڑکیاں دو ہوں، تو مال کو چار حصوں پر تقسیم کریں، لڑکے کو دو، لڑکیوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک۔ اگر لڑکا ایک اور لڑکی بھی ایک، تو تین حصہ میں سے دو لڑکے کیلئے اور ایک لڑکی کیلئے۔

﴿فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾ اگر عورتیں ہوں، دو سے زیادہ، تو ان کے لئے ترکہ کی دو تہائیاں ہیں۔ یعنی اگر نرینہ اولاد نہ ہو، صرف لڑکیاں ہوں، اور ایک سے زائد ہوں، زائد کی حد متعین نہیں کی گئی۔ اگر بالفرض سو تک ہوں، تو بھی یہی حکم ہے، کہ ان کو ثلثان، یعنی کل مالِ موروث سے دو تہائی مال ملے گا، جس میں سب لڑکیاں برابر کی شریک ہوں گی، اور باقی ایک تہائی دوسرے ورثاء کے لئے ہوگا، جیسے والدین، بیوی، شوہر وغیرہ۔ یاد رکھنا چاہئے کہ لڑکیاں ذوی الفروض ہیں، عصبہ نہیں ہیں۔ البتہ بیٹا عصبہ ہے، ذوی الفروض نہیں۔ تفصیل آئندہ آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

﴿وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ اگر ایک لڑکی ہو تو اس کے لئے آدھا ہے۔ یعنی اگر مرنے والے نے اپنی اولاد میں صرف ایک ہی لڑکی چھوڑی، اور کوئی اولاد نہ ہو، تو اس لڑکی کیلئے والدین کے تمام ترکہ میں نصف کا استحقاق ہوگا، باقی نصف دوسرے ورثاء کے لئے ہوگا۔

پہلی صورت میں جب بھائی کے ساتھ لڑکیاں ہوں، وہاں یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک یا دو یا تین یا بیس ہوں، جو بھی ہوں ان کا حصہ بھائی کے حصے کا آدھا ہوگا۔ دوسری اور تیسری صورت میں جہاں ان کو دو تہائی، یا ایک کیلئے نصف ہے، یہ وہ دو صورتیں ہیں جہاں ان کے ساتھ بھائی نہیں ہوتا۔ اگر فرض کرو کہ اور کوئی وارث ذوی الفروض اور عصبات میں سے نہ ہو، تو پہلی صورت میں باقی ثلث، اور دوسری صورت میں باقی نصف بھی ان پر رد ہوگا۔

اس کے بعد میت کے والدین باپ اور ماں کے حصوں کا بیان ہے، چنانچہ ارشاد ہے......

وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾

ترجمہ: اور مرنے والے کے ماں باپ میں سے ہر ایک کیلئے چھٹا حصہ ہے، اس میں سے جو اس نے چھوڑا ہے، اگر اس کی اولاد ہے، پس اگر اس کی اولاد نہیں ہے، اور اس کے وارث ماں باپ ہیں، تو اس کی ماں کیلئے ایک تہائی ہے، پس اگر اس کے بھائی ہیں تو اس کی ماں کیلئے چھٹا حصہ ہے، بعد وصیّت کے جو وہ کرتا ہے، یا قرضہ ادا کرنے کے بعد۔ تمہارے باپ اور بیٹے تم نہیں جانتے کہ کون زیادہ قریب ہے تمہارے لئے نفع پہنچانے کے اعتبار سے، یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر کیا ہوا فریضہ ہے، بیشک اللہ تعالیٰ علیم ہے، حکیم ہے ﴿۱۱﴾

معارف ومنازل

بیٹے اور بیٹیوں میں وارثت کی تقسیم نسب کے اعتبار سے تھی، اب والدین کا حصہ بھی نسب کے اعتبار سے ہے، ماں باپ کے متعلق تین حالتیں ہیں:

پہلی حالت یہ ہے کہ: ﴿وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ یعنی ماں باپ میں سے ہر ایک کیلئے چھٹا حصہ ہے، جو کچھ مرنے والے نے چھوڑا ہے، یہ اس صورت میں ہے کہ مرنے والے کی اولاد موجود ہو۔ اولاد میں خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، ایک ہو یا زیادہ۔ اگر والدین دونوں زندہ ہیں، اور مرنے والے کی اولاد بھی ہے، تو باپ کو بھی چھٹا حصہ ملے گا، اور ماں کو بھی چھٹا حصہ، چھ میں سے دو حصے ان دونوں کیلئے، باقی چار اولاد کیلئے۔

اس کے برخلاف دوسری صورت یہ ہے: ﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ﴾ یعنی اگر مرنے والے کی اولاد کوئی نہ ہو، نہ بیٹا اور نہ کوئی بیٹی، اور وارث صرف ماں باپ ہوں، تو ماں کو ثلث، یعنی تیسرا

حصہ ملے گا، اور تین میں سے باقی دو ثلث باپ کو ملیں گے۔ گویا اولاد کی غیر موجودگی میں میت کی ماں کا حصہ چھٹے سے بڑھ کر تیسرا، یعنی دوگنا ہوگیا، اور باقی دو حصے باپ کو ملیں گے۔ یہاں پر بھی وہی قانون لاگو ہوگا جو کہ ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملتا ہے، جبکہ ماں کو ایک تہائی ملا، اور باپ کو دو تہائی کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ یہاں بھی ''مِمَّا تَرَكَ'' ہر ادنیٰ و اعلیٰ نقدی اور سامان وغیرہ کو شامل ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ: ﴿فَإِنْ كَانَ لَهٗٓ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ﴾ اور اگر میت کے بھائی ہوں، تو اس کی ماں کے لئے چھٹا ہے۔ میراث میں بسا اوقات ایک وارث کی موجودگی سے دوسرا وارث مکمل محروم ہوتا ہے، یہ حجبِ حرمان کہلاتا ہے، جیسے باپ کی موجودگی میں دادا محروم ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک وارث کی موجودگی سے دوسرا وارث محروم نہیں ہوتا۔ البتہ اس کا حصہ ذرا کم ہوجاتا ہے، یہ حجبِ نقصان سے جانا جاتا ہے، جیسے میت کی اولاد نہ ہونے کی صورت میں ماں کو ثلث ملتا تھا، جبکہ اولاد کی صورت میں ماں کو چھٹا، یعنی سُدس ملے گا، یہ حجبِ نقصان ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ میت کے بہن بھائیوں کی موجودگی سے ماں کا حصہ جو ثلث تھا وہ کم ہوکر سُدس ہوگیا، حالانکہ بہن بھائیوں کا حصہ کوئی نہیں، باپ کی موجودگی سے وہ محروم ہی رہیں گے۔ مگر ان کی موجودگی نے ماں کا حصہ کم کردیا۔

تیسری صورت یہی ہے کہ مرنے والے کی اولاد تو کوئی نہیں ہے، مگر اس کے بھائی زندہ ہیں، بھائیوں میں حقیقی (ماں باپ کی طرف سے) علاتی (صرف باپ کی طرف سے) اور اخیافی (صرف ماں کی طرف سے) سب شامل ہیں۔

اگر میت کے کوئی بھی بھائی ہو، ایک یا زیادہ، اس حالت میں ماں کا حصہ ثلث سے گھٹ کر سُدس ہوجائے گا، گویا میت کے بھائیوں نے ماں کو تیسرے حصے سے نکال کر چھٹے حصے میں شامل کردیا۔ مگر یہ مسئلہ اس طرح ہے کہ ماں کے حصے سے جو چھٹا حصہ بچ گیا، وہ ان بھائیوں کو نہیں ملے گا، جن کی وجہ سے ماں کا حصہ کم ہوگیا، بلکہ یہ چھٹا حصہ بھی باپ ہی کو مل جائے گا، کیونکہ باپ بنسبت بھائیوں کے اقرب ہے، اور اقرب کی موجودگی میں ابعد محروم رہے گا۔ یہی جمہور علماء کا مذہب ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے یہ ہے کہ باپ کی وجہ سے بھائی محروم نہیں ہوں گے، بلکہ یہی ماں کے حصہ سے بچ جانے والا چھٹا حصہ ان بھائیوں کو ملے گا، جن کی وجہ سے ماں کا حصہ کم ہوگیا۔

﴿مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ يُوصِي بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ﴾ میت کی طرف سے کی ہوئی وصیت اور اس پر دین ادا کرنے کے بعد۔یعنی وارثوں کے جتنے حصے اب تک بیان ہوئے، یہ سب حصے بعد اداء وصیت جو میت نے کی ہے، بعد اداء قرض کے۔یعنی متروکہ مال میں جو پہلا حق متعلق ہوتا ہے، وہ میت کی تجہیز وتکفین اور تدفین کا ہے، اور پھر میت کے قرض کا ہے، تیسری مرتبہ اس کی وصیت کو ثلث مال سے پورا کیا جائے، اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو، ان تینوں کے بعد اگر کوئی مال بچ گیا ہو تو وارثوں پر تقسیم ہوگا۔

﴿ءَابَآؤُكُمۡ وَأَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُونَ أَيُّهُمۡ أَقۡرَبُ لَكُمۡ نَفۡعٗا﴾ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم نہیں جانتے کہ باعتبارِ نفع رسانی کے ان میں سے کونسا تم سے زیادہ قریب ہے۔یعنی تم نہیں جانتے کہ تمہارے اصول و فروع میں سے دنیا وآخرت میں تمہارے لئے کون زیادہ نفع رسان اور فائدہ مند ہے، اور جب تمہیں یہ خبر نہیں ہے تو تقسیمِ میراث میں تم اپنی عقل اور رائے کو ہرگز دخل نہ دو، صرف اللہ تعالی کے حکم پر عامل رہو، جسے تمام فوائد ومصالح کا پورا پورا علم ہے، اور اس کا ہر حکم ہزاروں مصلحتوں اور مخفی حکمتوں پر مبنی ہے، تو ربِّ عزّت سبحانہ کی طرف سے جو حصہ کسی وارث کے لئے مقرر کیا گیا، اس کی مطلقاً پیروی کرو، بیشک حق سبحانہ وتعالی تمہاری مصلحتوں کو جاننے والا ہے اور بڑی حکمت والا ہے، لہٰذا تمہیں اس کے حکموں کے ماننے اور ان پر عمل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت کرنے کی اجازت نہیں، اور یہی تمہاری مکمل بندگی کا تقاضا ہوگا کہ "اٰمنا وصدقنا وسلّمنا" کہو۔

تمہاری عقل ناقص ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم پختہ ہے۔

اس سلسلے میں صرف دو مثالیں عقلمندوں کیلئے کافی ہیں۔

(۱) **پہلی بات:** تمہاری عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ عورت کمزور ہے، اور مرد قوی ہے، عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ کمزور کا حصہ دوگنا ہو، اور قوی کا ایک گنا، حالانکہ ﴿لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ ٱلۡأُنثَيَيۡنِ﴾ میں معاملہ برعکس ہے، قوی کو زیادہ ملا، اور ضعیف کو اس کا نصف ملا، تو سنئے: یہی حکمتِ الٰہی کے عین مطابق ہے، اور یہی فطرت کا تقاضا بھی ہے، اول وجہ یہ ہے کہ عورت بالآخر لازمی طور پر بیاہی جائے گی، اور اس کا نان ونفقہ، رہائش وغیرہ اس کے خاوند کے ذمہ ہوگا، اور یہ چیز شرعاً وعرفاً مسلم ہے۔بخلاف بیچارے مرد کے کہ وہ اس سہولت سے محروم ہے۔

دوم: عورت کو اپنی شادی پر کسی کو مہر دینے کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ اس کو شوہر مہر دے کر حوصلہ افزائی کرے گا۔بخلاف مرد کے کہ اس کو اپنے گھر آباد کرنے کے لئے حق مہر دینے کے علاوہ اپنی بیوی کی تمام حاجتوں نان

ونفقہ، رہائش وغیرہ پورے کرنے پڑیں گے۔

سوم: اگر مرنے والے کے پیچھے چھوٹے یتیم بچے ہوں، اور بیوہ ہو، اور میت مقروض ہو، اور غربت کی وجہ سے جائیداد اور مالِ متروکہ کچھ بھی نہ ہو، تو یہ سارا بوجھ مرد اٹھائے گا، نہ کہ عورت۔

چہارم: یہ کہ ربّ العزّت سبحانہ نے عورت کا حصہ میراث جس طرح ماں باپ کے ترکہ میں رکھا ہے اسی طرح اس کا حصۂ میراث اس کے خاوند کے ترکہ میں بھی رکھا ہے۔ اس طرح عورت ماں باپ اور خاوند دونوں طرف سے وراثت کی حقدار ہے، برخلاف مرد کے کہ اس کو والدین کے ترکہ سے حصہ تو ملے گا۔ مگر بیوی کی طرف سے مشکوک ہے، شاید اسے کچھ نہ ملے، کیونکہ عورتیں اکثر غریب ہوتی ہیں، ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا، تو شوہر (مرد) کو کیا ملے گا۔

پنجم: بسا اوقات قومی معاملات میں خاص کر قتل کے معاملات کو شرعاً دیت وغیرہ کا پوری قوم سے پورا کرنا ہوگا، وہاں چندہ مردوں نے دینا ہے، نہ کہ عورتوں نے، وغیرہ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اگر مردوں کا حصہ دوگنا فرمایا، تو انہی چیزوں کی بنیاد ہر کہ ان پر بوجھ بہت زیادہ ہے۔

(۲) دوئم مسئلہ باپ اور اولاد کا ہے، کہ باپ کو حصہ کم ملا اور بیٹے کو زیادہ۔ باپ ضعیف اور کمزور ہے، اور بیٹا صحت مند اور قوی ہے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ضعیف کا حصہ زیادہ ہو اور قوی کا کم۔ تو جواب یہ ہے کہ باپ کا حق اگرچہ اولاد سے بہت زیادہ ہے، اور وہ ضعیف بھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی جب صاحبِ اولاد ہو کر مرتا ہے تو عادۃً اس عمر میں اس کا باپ بوڑھا ہوتا ہے، اور اس کی عمر کا کم حصہ باقی ہوتا ہے، تو ان کو زیادہ مال کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ بخلاف اولاد کے، کہ وہ کم عمر ہونے کی وجہ سے زیادہ حاجت مند ہوتے ہیں۔ نیز ماں باپ کے پاس اکثر اپنا جمع کیا ہوا مال کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہوتا ہے، اور میت کی اولاد کا سارا سرمایہ صرف یہی باپ کی کمائی ہوتی ہے، نہ اور کچھ، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اولاد کا حصہ زیادہ رکھا۔ اگر کوئی شخص ان مسائل میں صحیح غور و فکر کرے تو بہت سے مصالح ان کے علاوہ بھی معلوم ہو جائیں گے۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ
مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ

وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ

ترجمہ: اور تمہارے لئے آدھا ہے جو چھوڑا تمہاری بیویوں نے، اگر ان کی اولاد نہیں ہے، پس اگر ان کی اولاد ہے تو تمہارے لئے چوتھا حصہ ہے اس میں سے جو انہوں نے چھوڑا وصیت کے بعد جو وہ کرتی ہیں، یا قرضہ ادا کرنے کے بعد، اور ان عورتوں کے لئے چوتھا حصہ ہے جو تم نے چھوڑا، اگر تمہاری اولاد نہیں ہے، پس اگر تمہاری اولاد ہے تو ان عورتوں کے لئے آٹھواں حصہ ہے جو تم نے چھوڑا، وصیت کے بعد کہ تم وصیت کرتے ہو، یا قرضہ ادا کرنے کے بعد۔

معارف ومنازل

سلسلۂ نسب کے بعد میراث کے دوسرے سبب جو کہ نکاح ہے، اس کا بیان ہو رہا ہے۔ یہ سلسلہ مختصر ہے، جس کا تعلق صرف دو فریقوں زوج اور زوجہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ زوج اور زوجہ میں سے ہر ایک کے میراث کی دو صورتیں ہیں: یہ کل چار صورتیں ہوں گی: (۱) میت اگر زوجہ ہو اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو تو شوہر کو نصف مال ملے گا۔ (۲) اور اگر زوجہ کی کوئی اولاد ہو تو شوہر کو چوتھائی حصہ ملے گا۔ اسی طرح زوجہ کا حال بھی دو طرح ہے، یعنی میت اگر زوج ہو۔

(۱) زوج کی کوئی اولاد نہ ہو تو زوجہ کو چوتھائی حصہ ملے گا۔ (۲) زوج کی کوئی اولاد ہو تو زوجہ کو آٹھواں حصہ ملے گا۔

یہاں اولاد سے مراد مطلق، یعنی لڑکا لڑکی دونوں مراد ہیں، تعداد شرط نہیں ہے۔ ان صورتوں میں بھی وہی سابق شرط کا اثبات ملحوظ ہے، کہ تجہیز و تکفین اور اداء قرض و اداء وصیت من الثلث کے بعد جو مال باقی رہے گا، اسی سے حقوق دیئے جائیں گے۔ اگر بیویاں ایک سے زائد ہوں تو اسی ربع اور ثمن کو آپس میں تقسیم کریں گی، ہر ایک کو مستقل ربع یا ثمن نہیں ملے گا۔ زوج و زوجہ کے حصوں میں بھی وہی مرد وعورت یا ضعیف وقوی والا قانون جاری ہوگا، جیسے پہلے گزر چکا۔ عورت چونکہ مہر بھی پاتی ہے۔ اور شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے شخص سے نکاح بھی کر سکتی ہے، اس لئے اس کا حصہ ہر حال میں شوہر کے حصہ سے نصف ہوگا۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهٗٓ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا
السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوْٓا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
يُّوْصٰى بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللهِ ۗ وَاللهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: اگر مرنے والا کوئی مرد یا کوئی عورت ہو جس کو مورث بنایا جارہا ہو، اور حال یہ ہے کہ اس کے ماں باپ میں سے کوئی نہ ہو، اور نہ کوئی بیٹی بیٹا ہو، اور نہ پوتی پوتا ہو، اور اس نے کوئی بھائی یا بہن چھوڑی ہو، تو ان میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا چھٹا حصہ ہے، سو اگر بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب تہائی مال میں شریک ہوں گے، اس وصیت کے نافذ کرنے کے بعد جس کی وصیت کی گئی ہو، اور اداء قرض کے بعد، اس حال میں کہ نقصان پہنچانے کی نیت نہ کی ہو، یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اللہ علیم ہے، حلیم ہے ﴿۱۲﴾

معارف و منازل

یہاں پر کلالہ کی میراث کا حکم بیان فرمایا ہے۔ کلالہ وہ مرد یا عورت ہے جس کی نہ ماں زندہ ہو، نہ باپ، نہ دادا، نہ بیٹی ہو، نہ بیٹا، نہ پوتی ہو، نہ پوتا (یعنی جس کے اصول بھی نہ ہوں، اور فروع بھی نہ ہوں)۔ کلالہ مرجائے، اور اس کے سگے بہن بھائی ہوں، یا علاتی بہن بھائی ہوں، تو ان کا حصہ سورۂ نساء کی آخری آیت: ﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾ میں بیان فرمایا ہے، یہ مسئلہ وہاں مذکور ہوگا، اور یہاں بھی۔

اور اگر ایسے مرد اور عورت کا کوئی بہن بھائی اخیافی ہو، تو ان کا حصہ اسی آیت میں بیان ہو رہا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مرد یا عورت کلالہ ہو، یعنی اس کے اصول اور فروع میں سے کہیں بھی وارث زندہ نہ ہو، اور اس کا ایک بھائی خیفی یا بہن خیفیہ موجود ہو، تو ان میں سے ہر ایک کو کلالہ کے مال میں سے چھٹا حصہ ملے گا۔ یہ اس صورت میں ہے جب صرف ایک بہن یا صرف ایک بھائی ہو۔ اور اگر یہ لوگ ایک سے زیادہ ہوں، یعنی دو بھائی ہوں، یا دو بہنیں ہوں، یا ایک بھائی اور دو بہنیں ہوں، یا دو بہن اور ایک بھائی ہو، یا اس سے بھی زیادہ ہوں، تو وہ سب کلالہ کے تہائی مال میں برابر کے شریک ہوں گے، ان میں مذکر و مؤنث کا حصہ برابر ہوگا۔ "قال الإمام القرطبي رحمه الله: وليس في الفرائض موضع يكون فيه الذكر والأنثى سواء إلا في ميراث الإخوة والأخوات للأم"۔

"فرائض میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں مذکر و مؤنث کا حصہ برابر ہو، سوائے خیفی بہن بھائیوں کے"۔

اور باقی دو تہائی مال دوسرے وارثوں کو دے دیا جائے گا۔ ان کو دونوں صورتوں میں جو حصہ ملے گا وہ اداءِ قرض اور نفاذِ وصیت کے بعد دیا جائے گا۔ یہ تفصیل اخیافی بہن بھائیوں کے حصوں کے بارے میں ہے۔

کلالہ کے عینی اور علاتی بہن بھائیوں کا حصہ:

اگر کوئی ایسا شخص فوت ہو گیا جو کلالہ ہے، اور اس کی ایک حقیقی یا علاتی بہن ہے، تو اس کو مرنے والے کا آدھا مال دیا جائے گا۔ اور اگر کوئی عورت مرگئی جو کلالہ ہے، اور اس کا ایک حقیقی یا علاتی بھائی ہے، تو یہ بھائی اپنی بہن کی کُل مال کا وارث ہوگا۔ اگر مرنے والا کلالہ ہے، اور اس کی دو بہنیں ہیں، خواہ حقیقی ہوں یا علاتی، تو یہ دونوں بہنیں کلالہ کے کُل ترکہ سے دو تہائی مال لیں گی۔ اگر یہ بہنیں دو سے زیادہ ہوں تب بھی سب اس دو تہائی میں شریک ہوں گی۔ اگر کوئی کلالہ فوت ہو گیا، اور اس نے حقیقی اور علاتی بہن بھائی مخلوط چھوڑے ہوں، تو ان میں مرنے والے کی میراث ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ کے اصول پر تقسیم ہوگی، یعنی ہر لڑکے کو ہر لڑکی سے دوگنا حصہ دیا جائے گا، مثلاً ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہوں، تو مال کو چار حصوں پر تقسیم کریں گے، لڑکے کو دو حصے، اور ہر ایک لڑکی کو ایک ایک حصہ دے دیا جائے گا۔ کلالہ کی میراث کا یہ خلاصہ جو نبھی یہاں بیان ہوا سورۃ النساء کے آخر میں اسی ترتیب سے مذکور ہے، اِن شاء اللہ وہاں معلوم ہو جائے گا۔

فائدہ:

میراث کے جو حصے پہلے بیان ہوئے، خواہ اولاد کے ہوں یا والدین کے، یا میاں بیوی (زوجین) کے، یا کلالہ کے، یا آئندہ دیگر ورثاء کے، یہ سب اداءِ قرض اور تنفیذِ وصیت کے بعد بقیہ مال سے دے دیئے جائیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ تم لوگ یہ آیت پڑھتے ہو: ﴿مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ﴾ جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وصیت دین سے مقدم ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصیت نافذ کرنے سے پہلے قرضے کی ادائیگی کا فیصلہ فرمایا۔ [ترمذي، ابن ماجه، مشكوٰة]

فوائد نافعہ متعلقہ بأحکام المیراث:

(۱) مرنے والے کے چھوڑے ہوئے مال میں ورثاء کے لئے جو حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں خود مرنے والے کو قبل از موت یا بذریعۂ تحریر بعد از موت، یا کسی حکومت یا کسی حاکم یا عدالت کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ ان میں ردّ و بدل کرے۔

(۲) بہت سے لوگ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو عاق کرتے ہیں، اور دستاویز لکھ کر اس کو محروم کرتے ہیں، یہ حرام ہے، اور ہر طرح وہ شخص میراث میں حقدار رہے گا، خواہ ہزاروں دستاویز اس کے خلاف کیوں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کو کوئی نہ ٹال سکتا ہے، نہ بدل سکتا ہے۔

(۳) میت کے مال میں سے جو حصے تقسیم ہوں گے وہ قرضوں کی ادائیگی اور وصیت نافذ کرنے کے بعد جاری ہوں گے، ہاں! اگر وصیت اور قرض نہ ہوں تو پھر مسئلہ صاف ہے۔

(۴) اکثر طاقتور وارث کمزور وارثوں کا حق کاٹ دیتے ہیں، یا بیوہ کو میراث میں حصہ نہیں دیتے ہیں، یا بہنوں کو بھائی صاحبان حق نہیں دیتے ہیں، یا تھوڑا دیدیتے ہیں، یا ان کے ساتھ کوئی وعدہ کر کے انہیں محروم کردیتے ہیں، یا میت کی وصیت کو نظر انداز کر کے چھوڑ دیتے ہیں، یہ سب گناہ کبیرہ اور حرام ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہے: جو شخص کسی وارث کی میراث سے کچھ کاٹ دے تو اللہ تعالیٰ جنت سے اس کی میراث کاٹ دے گا، اور وہ محروم رہے گا۔ [رواه ابن ماجة من حديث أنس رضي الله عنه]

(۵) بسا اوقات لوگ میراث کے حصے کے علاوہ بیوی کیلئے، یا کسی اور وارث کے لئے وصیت کرتے ہیں، ایسی وصیت صحیح نہیں ہے، اور اس کا نفاذ نہیں ہوگا۔ البتہ! ثلث مال کے اندر غیر وارث کے حق میں وصیت صحیح ہوگی۔

(۶) مال کی تہائی سے وصیت کا نفاذ ہوگا، جو شخص تہائی سے زیادہ کی وصیت کرے گا تو تہائی سے اوپر کی وصیت کا نفاذ نہیں ہوگا۔

(۷) اگر کسی غیر شرعی ناجائز چیز کے بارے میں وصیت ہو تو اسے نافذ نہیں کیا جائے گا۔

(۸) اگر کوئی اپنے سارے مال کی وصیت کرے کہ صدقہ کیا جائے، تو یہ درست نہیں ہے، اور ایسی وصیت کو لغو سمجھا جائے گا، ثلث سے زائد کی وصیت صحیح نہیں ہوگی۔

(۹) اگر کسی پر حج فرض تھا، اور اس نے وصیت کردی کہ میری طرف سے حج کرادیا جائے، تو یہ وصیت بھی تہائی مال سے نافذ ہوگی، وارثوں پر فرض ہوگا کہ اس کے تہائی مال میں سے حج بدل کرادیں۔

(۱۰) اگر کوئی شخص تندرستی کے زمانے میں اپنے مال میں سے کسی کو کچھ ہبہ یا بخشش کردے، یا کوئی خرید و فروخت کرے، تو اس کی موت کے بعد اس کے وارث ایسے تصرفات کو فسخ یا مسترد کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے۔

(۱۱) مسلمان کافر کا، اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا۔

(۱۲) میت سے میراث پانے والے وارث تین قسم کے رشتہ دار ہوتے ہیں:

اول: اَصحاب الفرائض، جن کے حصے قرآن کریم نے مقرر کئے ہیں۔ یہ کُل بارہ لوگ ہیں، ان میں سے چار مرد ہیں، اور آٹھ عورتیں ہیں۔ چار مرد یہ ہیں: (۱) میت کا باپ۔ (۲) میت کا دادا۔ (۳) خیفی بھائی۔ (۴) میت کا شوہر۔

اور آٹھ عورتیں یہ ہیں: (۱) میت کی بیوی۔ (۲) میت کی بیٹی۔ (۳) میت کی پوتی۔ (۴) میت کی حقیقی بہن۔ (۵) میت کی علاتی بہن۔ (۶) میت کی خیفی بہن۔ (۷) میت کی والدہ۔ (۸) میت کی دادی، جس کی نسبت میں کوئی نانا شامل نہ ہو۔

دوم: عصبات۔ عصبہ بنفسہ، عصبہ لغیرہ، عصبہ مع غیرہ۔ یہ تین قسمیں ہیں۔ اصل عصبہ قسم اول، یعنی عصبہ بنفسہ ہے، اس کی چار قسمیں ہیں: (۱) میت کی اصل، یعنی باپ، دادا، پردادا، وغیرہ۔ (۲) میت کا جزء، یعنی بیٹا، پوتا، پڑپوتا وغیرہ۔ (۳) میت کے باپ کے جزء، یعنی بھائی، بھتیجا، وغیرہ۔ (۴) میت کے دادا کے جزء، یعنی چچا، تایا، اور ان کے بیٹے وغیرہ۔

سوم: ذوی الارحام، یہ بہت دور کے ورثاء ہیں۔

مختصر تفصیل:

فرائض کے مقررہ حصے ذوی الفروض کیلئے ہیں، جو کہ بارہ ہیں۔ اگر اصحاب الفروض میں سے کوئی نہ ہو، یا ان کے حصے دینے کے بعد کچھ مال بچ جائے، تو عصبات کو دے دیا جائے گا۔ عصبات میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ وہ ذوی الفروض بھی تھے، جیسے والد اور دادا وغیرہ۔ اگر بالفرض عصبات میں سے کوئی نہ ہو، تو اصحاب الفرائض سے جو مال بچ جائے وہ ان کے حصوں کے مطابق دوبارہ انہی اصحاب فرائض کو دے دیا جاتا ہے، اور علم الفرائض کی اصطلاح میں اس کو ردّ کہتے ہیں۔ البتہ دو لوگوں پر، یعنی شوہر اور بیوی پر ردّ نہیں ہوتا۔

اور اگر بالفرض اصحاب الفروض میں سے کوئی نہ ہو، اور عصبات میں سے بھی کوئی نہ ہو، تو دور کے ورثاء ذوی الارحام تک میراث پہنچ جاتی ہے۔ ذوی الارحام کی فہرست طویل ہے، جیسے میت کے نواسے، نواسیاں، بہنوں کی اولاد، پھوپھیاں، ماموں، خالہ، یہ سارے لوگ ذوی الارحام کی فہرست میں آتے ہیں، یہ سارے مسائل بہت پیچیدہ ہیں، ان کی تفصیلات بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

(۱۳) اگر کسی شخص نے کچھ اولاد چھوڑی، اور بیوی کے پیٹ میں بھی بچہ ہے، تو یہ بچہ بھی وارثوں کی فہرست میں شامل ہوگا۔ لیکن چونکہ یہ معلوم نہیں کہ بچہ ایک ہے، یا ایک سے زائد، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ لڑکا ہے یا لڑکی یا دونوں، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ زندہ پیدا ہوگا یا مرا ہوا، ان میں سے ہر ایک کے احکام مختلف اور حصے بھی مختلف ہیں، تو بہتر یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے تک میراث کی تقسیم کو ملتوی رکھیں، اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو سر دست ایک لڑکا فرض کر کے اس کا حصہ موقوف رکھیں، پیدائش کے بعد جو ہوگا اسی پر عمل کریں، یہ مسئلہ قدرے تفصیل طلب ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: یہ اللہ تعالیٰ کی حد بندیاں ہیں، اور جو شخص اطاعت کرے اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی اسے اللہ تعالیٰ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے ﴿۱۳﴾ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے، اور اس کی حدود سے آگے نکل جائے، وہ اسے آگ میں داخل فرمائے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کے لئے ہے عذاب ذلیل کرنے والا ﴿۱۴﴾

معارف ومنازل

''احکام یتامیٰ'' یتیموں کے اموال کے متعلق احکام بیان ہوئے، پھر میراث کے مسائل، اور ذوی الفروض نسبی، اولادِ میت اور والدین کے حصے، پھر زوجین کی میراث، اسی طرح حصوں کا بیان، مثلاً نصف، ربع، ثمن، ثلث، ثلثان، اور سدس کا ذکر مختلف آیات میں مختلف وارثوں کے لئے بیان ہوئے، اسی کے ساتھ وصیت اور دین، یعنی قرضوں کا ذکر تین مقامات پر ہوا، پھر وصیت کے ساتھ غَيْرَ مُضَآرٍّ کی قید کا ذکر ہوا، اس کے ساتھ کلالہ کی میراث کا بیان ہوا۔

اب آخر میں تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ سے ان سارے امورِ مذکورہ کی طرف اشارہ کر کے بتادیا کہ ساری چیزیں حدود اللہ، یعنی اللہ تعالیٰ کی حد بندیاں، قواعد وضوابطِ شرعیہ ہیں، ان کی اطاعت وفرمانبرداری اور نگہداشت تمہارے

او پر فرض ولازم ہے، اور ان حدود سے تجاوز کرنا اور خلاف ورزی سراسر سرکشی اور بغاوت ہے۔ پھر نتیجہ واضح فرما کر اعلان کیا کہ اطاعت شعار فرمانبرداروں کیلئے جنت اور اس کی ابدی نعمتیں ہیں، جبکہ حدود سے تجاوز کرنے والوں اور نافرمانوں کے لئے جہنم کی آگ اور ابدی ذلتوں کا عذاب ہے، تو فرمایا:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰہِ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حد بندیاں ہیں، ان حدود اللہ کی پاسداری اور پاسبانی کرنا، اور ان کی اشاعت وحفاظت کرنا اللہ تعالیٰ کی رضامندی، اور اس کے عظیم انعامات حاصل ہونے کا سبب ووسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حدود کے محافظ وفرمانبرداروں کے لئے باغات ہیں چشمے ہیں، جَنّٰتُ النَّعِیم وَ دار السَّلام کی ابدی راحتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جنت عدن میں دیدار وزیارت کے فیوض والطاف اور برکات ہیں، وہ ہمیشہ ابدُ الآباد ان نعمتوں میں رہیں گے، اور یہ عظیم فوز وفلاح اور کامیابی ہے۔

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدوں کی پاسداری نہیں کرتے ہیں، اور حدود اللہ کو توڑتے ہیں، حدود اللہ سے تجاوز کرتے ہیں، یا سرے سے اللہ کے دین کو نہیں مانتے ہیں، حدود اللہ کا مذاق اڑاتے ہیں، یا جھوٹے منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن حدود اللہ اور قوانینِ اسلام کو غلط قرار دیتے ہیں، اور انہیں ظالمانہ قانون کہتے ہیں، ان کے لئے دائمی، ابدی، ذلّت آمیز اور تباہ کن سزا ہے، اور جہنم کی آگ ہے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور انہیں دوزخ سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔

اور جو لوگ ایمان رکھتے ہوئے حدود اللہ سے تجاوز کرتے ہیں، اور حدود اللہ کا مذاق اڑاتے ہیں، جیسے آج کل کے مغرب زدہ یورپی ذہنیت رکھنے والے مسلمان، تو سزا وعذابِ جہنم کے وہ بھی مستحق رہیں گے، مگر جب اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی تو دوزخ سے نجات پائیں گے، اور ایمان کی وجہ سے دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ پوری تفصیل آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

تکملہ احکام میراث:

❶ ﴿مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ﴾

ان دو لفظوں نے وراثت کے دو بنیادی اہم اصول بتلادیئے: ☆ ایک رشتۂ ولادت، جو اولاد اور ماں باپ کے درمیان ہے۔ ☆ دوم رشتۂ قرابت ورشتہ داری۔ اس میں تمام ”ذوی الفروض“ درجہ بدرجہ اور تمام عصبات ”اَقْرَبْ فَالْاَقْرَبْ“۔ اسی طرح تیسرے درجے کے ”ذوی الارحام“ سارے آجاتے ہیں۔ قرآن کریم نے

اجمال کے ساتھ اور احادیث نے تفصیل کے ساتھ سب بیان فرمائے، کہ کسی قسم کا کوئی ابہام باقی نہیں رہا۔ اگر چند ایک جزئیات میں کوئی ابہام باقی رہا، تو انہیں ائمہ مجتہدین نے قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کر کے ساری کمی پوری کردی، اور ''علم الفرائض'' کی تالیف سے ساری الجھنیں ختم ہوگئیں۔

البتہ! یہ بات قابلِ توجہ ضرور ہے کہ مطلق اُقربیت کو استحقاقِ میراث میں چنداں دخل نہیں ہوگا، جب تک رشتہ داروں میں سب سے نزدیکی کا اہتمام نہ ہو، اسی چیز کے اعتبار سے باپ کی موجودگی میں دادا اور ''ابن'' کی موجودگی میں ''ابن الابن'' اور ''بھائی'' کی موجودگی میں ''ابن الاخ'' وغیرہ محروم رہیں گے۔ علی ھذاالقیاس۔

❷ وراثت ایک جبری اور غیر اختیاری ملکیت ہے۔ اس کی بنیاد کسی وفاداری یا خدمت پر نہیں ہے، جس طرح ایک وفادار بیٹا وارث بن سکتا ہے، اسی طرح بے وفا اور بے عمل اور والدین کی نافرماں اولاد بھی برابر کا استحقاق رکھتی ہے۔ ماں باپ اپنی زندگی میں اور بعداز موت کسی وصیت کے ذریعہ کسی مستحق کے استحقاق کو عاق کر کے سلب نہیں کر سکتے۔ جب وراثت جبری ہوئی تو اس میں وارث کا قبول کرنا بھی شرط نہیں، اور اس کی چاہت وراضی ہونا بھی ضروری نہیں۔ اگر کوئی وارث یہ کہے کہ: ''میں مالدار ہوں، مجھے باپ کی میراث کی ضرورت نہیں ہے، تب بھی شرعاً اس کا استحقاق برقرار رہے گا، اس کی اجازت اور سپردگی کے بغیر دوسرے ورثاء اس کے حصے پر قبضہ کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے، جب تک زبانی اقرار کے ساتھ اپنا حصہ ان پر ہبہ نہ کرے، اور تملیک نہ کردے۔

❸ تجہیز وتکفین کے بعد کا درجہ میت کے ذمہ لوگوں کے قرض کی ادائیگی کا ہے۔ اس سلسلے میں یہ ضرور دیکھنا چاہئے کہ اس کی بیوی کا مہر ادا ہوگیا ہے یا نہیں، کیونکہ اکثر لوگ اس بارے میں لاپرواہی کرتے ہیں، اگر بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو تو دوسرے قرضوں کی طرح اولاً کل مال سے مہر کی ادائیگی ضروری ہے، اس کے بعد پھر وصیت کا نفاذ تہائی مال سے ہوگا، پھر بقیہ مال کو حسبِ استحقاق ورثاء پر تقسیم کیا جائے گا۔ اگر قرض اور وصیت کے ثلث کے بعد اتنا مال بچ گیا کہ بمشکل مہر کی ادائیگی ہوسکتی ہے، اور ورثاء کیلئے کچھ بھی نہیں بچے گا، تو مہر کی ادائیگی ضروری ہے، کیونکہ مہر میت کے ذمہ قرض ہے، اور ادائیگی قرض سارے امور پر مقدم ہے۔

❹ ''غَيْرَ مُضَآرٍّ'' کی تفسیر یہ ہے کہ اس کلمہ کا تعلّق تینوں مقامات کے ساتھ ہے، جہاں ﴿مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ﴾ کے الفاظ مذکور ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کیلئے وصیت یا دَین کے ذریعہ وارثوں کو ضرر ونقصان پہنچانا جائز نہیں ہے، وصیت کرنے، یا اپنے اوپر فرضی قرض کا اقرار کرنے میں وارثوں کو محروم

کرنے کا ارادہ کرنا، اور اس پر عمل کرنا سخت گناہ ہے۔

قرض یا وصیت کے ذریعہ ضرر پہنچانے کی کئی صورتیں ممکن ہیں، مثلاً یہ کہ قرض کا جھوٹا اقرار کرلے، کسی دوست وغیرہ کو دلانے کیلئے، یا اپنی مخصوص ذاتی مال کی بابت یہ اقرار کرے کہ میرے سالے کی امانت ہے، ورثاء سے بیزاری کی وجہ سے اپنے خاص دوست کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قرض کا اقرار کرے، بیوی سے محبت ہے، اس کو کچھ دلانے کے بہانہ یہ کہے کہ ایک لاکھ روپیہ اس کا حق مہر میرے ذمہ باقی ہے، ایک تہائی سے زائد کی وصیت کرے، کسی کو قرض دیا ہوا ہے، اب جھوٹ بول کر کہے کہ میں نے وصول کیا ہے، یا اور کوئی ایسی تدبیر کرے جس سے مقصد ورثاء کا ضرر ہو۔ انسان اگر بے رحمی پر عمل کرے تو سب کچھ کرسکتا ہے، اسے چاہئے کہ زندگی کے آخری ایام میں ہر طرح پاکیزگی اور تقویٰ اختیار کرکے، غلط ہتھکنڈوں سے پرہیز کرکے مرے۔

❺ جس شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی، اور طلاق رجعی ہو، اور عدت ختم ہونے سے پہلے وہ وفات پاگیا ہو، تو نکاح باقی ہونے کی وجہ سے مطلقہ میراث میں حقدار ہے۔ اگر مرض الوفات کے اندر طلاق دی، اور مغلظہ یا بائن طلاق ہو، اور عدّت کے اندر وفات پائی ہو، تو عورت کو میراث کا حصہ ملے گا، اس کو **طلاق الفارّ** کہتے ہیں۔ البتہ یہ بات، یعنی طلاق عورت کی خلع کی صورت میں ہو، تو عورت میراث سے محروم رہے گی۔

❻ دور حاضر کے جاہل کہتے ہیں کہ مرنے والے کا مال جو اس کے بیٹوں پر برابر تقسیم ہوتا ہے، اس میں یہ بھی ہونا چاہئے کہ اگر کوئی بیٹا باپ سے پہلے مرگیا تو اس کا حصہ اس کے بیٹوں کو، یعنی میت کے پوتوں کو ملنا چاہئے۔ یہ بات ملحدوں اور زندیقوں نے نکالی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تقسیمِ میراث میں اُقربیت کو بنیاد بنایا ہے، وہ اپنے بندوں پر تم سے زیادہ مہربان ہے، جب مرنے والے کے بیٹے موجود ہوں گے، تو پوتے ہر حال میں محروم رہیں گے۔ اسی طرح مرنے والے کے بعض بیٹے دوسرے بھائیوں کے ساتھ دست بگریباں ہوتے ہیں، کہ مرنے والے باپ نے تمہاری شادیاں کی ہے، اور تمہیں حج بھی کرایا ہے، ابھی باپ کے ترکہ سے پہلے ہمارے شادیوں اور حج کیلئے حصہ الگ کرکے ہمارے سپرد کرو، تب باقی مال کو تقسیم کرو، ورنہ ہم تقسیم نہ ہونے دیں گے۔ یہ سراسر جہالت اور گمراہی کی بات ہے۔

باپ نے اپنی زندگی میں اگر کسی کو حج کرایا، شادی کرائی، کوئی بخشش کی، اس کو کوئی وارث چیلنج نہیں کرسکتا۔ البتہ اگر سارے وارث حقدار موجود ہوں، اور ان میں کوئی بھی نابالغ نہ ہو، تو یہ سارے اتفاق سے بطیبِ خاطر کسی بھائی کے لئے کچھ زیادتی کا فیصلہ کرلیں، تو یہ الگ بات ہے، شرعاً اس پر پابندی نہیں ہے، بشرطیکہ یہ متفقہ ہو، اور ان

میں کوئی وارث نابالغ یا غیر حاضر نہ ہو۔

❼ بعض علاقوں میں اس میراث کے مشترک مال سے دفن کے بعد قبرستان میں کھجوریں، بتاشے، مٹھائیاں، روٹیاں، یا کوئی اور چیز تقسیم کی جاتی ہے، بعض وقت دفن کے بعد فقیروں، یا شرکاء جنازہ کو میت کے گھر بلا کر چائے بسکٹ، شربت، یا کھانا کھلایا جاتا ہے، اور یہ سب اسی مال مشترک میں سے مولانا صاحبان کی موجودگی اور رضامندی سے خرچ کیا جاتا ہے۔ یہ رسم بدعتِ قبیحہ اور غیر شرعیہ بھی ہے، اور اس میں مشترک مال میں سے خرچ کرنے کا وبال بھی ہے۔ کھانے والوں کو ہوش نہیں ہے کہ ہم کیا کھا رہے ہیں؟ ورثاء میں موجود یتیموں کا مال کھا کر اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں۔

❽ پھر اسی مشترک یتیموں کے مال سے رسم قل، تیجا، دسواں، گیارھواں، چالیسواں کیا جاتا ہے، اور سال بھر کی برسی بھی کی جاتی ہے۔ اچھے خاصے دیندار حاجی، تبلیغی، علماء کرام پہلی صف میں بیٹھ کر ہاتھوں میں تسبیح لئے ہوئے جھومتے، اور ذکر و تہلیل پڑھتے ہوئے، یہ ہرگز محسوس نہیں کرتے ہیں کہ ہم خدا اور رسول سے بغاوت کر کے یتیموں کو لوٹ رہے ہیں، اور بدعتِ سیئہ کی ترویج کرتے ہوئے سنت نبوی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لَا حَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ

میت کے گھر میں جاؤ قیامت کا منظر ہے، اس کی ماں دس گھنٹے سے بیہوش ہے، بیوی صدمے سے پاگل ہے، بیٹیوں پر دل کے دورے پڑ رہے ہیں، چھوٹے بچوں کے منہ سے خون ٹپک رہا ہے، سارا ماحول بگڑ رہا ہے، جب باہر مہمان خانہ میں آؤ، تو کچھ لوگ شربت و چائے نوشی میں، اور کچھ لوگ گوشت پلاؤ کھانے میں مصروف ہیں، لگتا ہے کہ میت کی شادی ہوئی ہے، لوگ دعوت ولیمہ کھانے میں مصروف ہیں، یہ وہ ہندوانہ غلط رسوم و بدعات ہیں، جن کا ادنیٰ ثبوت پورے قرآن کریم، اور دس لاکھ حدیثوں کے ذخیرے میں نہیں ملتا، جسے سرمایہ داروں، سود خوروں، اور نام نہاد انگریزوں کے پروردہ تنخواہ خور علماء سوء نے اسلام کے خلاف ایجاد کیا، جنہیں برطانیہ نے مجدد، مجتہد، شمس العلماء، اعلیٰ حضرت اور سر کا خطاب دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اسی رسمِ بد کا ذکر کر کے حالیؒ نے مسدس لکھا۔ ؎

یہ دین جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے ☆ پردیس میں آج غریب الغرباء ہے

پھر بہت سے مرد اور عورتوں، اماموں، حفاظ کرام، اور دینی مدارس کے طلبہ کو ایصالِ ثواب کی خاطر میت کے گھر بلایا جاتا ہے، اور کچھ لوگوں کو قبر پر چالیس دن تک قرآن خوانی پر مقرر کیا جاتا ہے، اور ان کو میت کے گھر سے باقاعدہ خوراک اور عمدہ کھانا اور نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ محض منگھڑت اور بے بنیاد ہے، اس کا شرعاً نہ کوئی

ثبوت ہے، اور نہ ہی وجود۔

یہ بے چارے دنیوی لالچ میں شکرانہ اور نذرانہ وصولی کی خاطر بدعت جانتے ہوئے پڑھتے ہیں کہ انہیں کچھ تو معاوضہ ملے گا، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جو شخص دنیوی لالچ کی خاطر قرآن مجید پڑھے گا، اسے خود ہی ثواب نہیں ملتا، وہ دوسروں کو کیا ثواب بخشے گا؟

بعض علاقوں میں برائے نام دشمنانِ سنّت ومحبانِ بدعت علماء سوء نے اسی مقصد کے لئے کمیٹیاں بنائی ہیں، اور پوری ٹیم تیار کی ہوئی ہے، جو ہر وقت تیار اور انتظار میں ہیں کہ کہیں سے ختمِ قرآن کی خوشخبری آجائے، جوں ہی کہیں سے اطلاع پہنچتی ہے تو پہلے سرپرست اعلیٰ آنے جانے کے کرایہ اور کھانے کے، اور اس کے ساتھ نذرانے کا فیصلہ کرکے منظوری کے بعد پوری جماعت کو لے کر روانہ ہوجائے گا۔ بعض اوقات وہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں مسجد والے دس ہزار روپیہ پر راضی ہوئے، جبکہ آپ پندرہ ہزار کہتے ہیں، لہٰذا ہم وہاں رابطہ کرتے ہیں، تو ٹھیکدار کہتا ہے: کوئی بات نہیں، آپ بارہ ہزار ہی دیدیں، خوب اندازہ لگائیں۔

آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ یہ لوگ بظاہر دستار وعمامہ، قبہ وجُبّہ پہنے ہوئے ہوتے ہیں، اور شکل وصورت کے اعتبار سے صالحین ومتقین معلوم ہوتے ہیں، مگر اندر سے مذہب فروش سوداگر ہوتے ہیں۔ کسی کا کوئی بھی بڑے سے بڑا عمل اگر سنّت نبوی کے خلاف ہوگا، تو وہ عمل جہنمی ہی ہوگا، اگر کسی کا ادنیٰ کردار وعمل سنّت نبوی کے عین مطابق ہوگا تو وہ نورانی اور جنتی عمل ہی ہوگا۔ حضور انور سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل وسنّت ایک اعلیٰ بنیادی کسوٹی ہے، اسی پر اعمال کو پرکھ کر فیصلہ کیا جائے گا کہ کون سنّت پر ہے، اور کون بدعت وضلالت پر؟

بمصطفیٰ برسان خویش را کہ دین ہمہ اوست ☆ وگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

(سعدیؒ)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنت کی روشنی اور چمک سورج، چاند، ستارے، یا برق وبجلی کی وجہ سے نہیں ہے، وہاں کی روشنی تجلّیات ربّانی اور ایمان واعمالِ صالحہ کی روشنی ہے۔ اور جہنم کی ظلمت وتاریکی کفر وبدعات اور اعمالِ سیئہ کی ہے، پس جس کا عمل نورانی اور مطابقِ سنّت ہوگا اسے جنت تک پہنچائے گا، اور بدعات کی ظلمت لامحالہ دوزخ تک پہنچا کر دم لے گی۔ [مکتوبات]

☆☆☆

مسئلہ میراث انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام:

انبیاء کرام علیہم السلام انوار و برکات کے درخشندہ مینار ہیں، جن کے وجودِ مسعود اور فیوض و تعلیمات سے کائنات اسی طرح روشن ہے جس طرح آفتاب عالمتاب سے کوہ وصحراء روشن ہیں۔ حقیر دنیا کے تمام مادیات اور فانی نزاکتوں، مال ومنال، سے ان کی فطرت سراسر پاک ہے۔ حقیر مال سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بچایا، اور دور رکھا ہے۔ جس طرح کوئی اپنے مریض کو مضرّ اشیاء سے پرہیز کرائے، ان کا سارا سرمایہ وحی الٰہی اور دین الٰہی ہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا: نَحْنُ مَعْشَرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نُوْرَثُ۔ انبیاء کرام کی جماعت نہ وارث بنتی ہے، اور نہ مورث۔

یعنی وہ کسی کا وارث بنتے ہیں، اور نہ کوئی ان کا مورث۔ وہ دنیوی میراث، مال، جائیداد، اور ہر قسم کے مادی سرمایہ سے مستغنی ہیں، آیت کریمہ ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ﴾ کے متعلق شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ترکہ میں سے (جو ان کو اپنے والد محترم کی طرف سے پہنچتا تھا) کوئی حصہ نہیں دیا، اور عذر یہ کیا کہ میں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خود سنا ہے کہ فرمایا ہم لوگ (گروہ انبیاء علیہم السلام) نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں، اور نہ کوئی ہمارا وارث ہوگا، حالانکہ یہ حدیث صریح نصِ قرآنی: ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ﴾ کے خلاف ہے۔ اور یہ آیت عام ہے، اس میں نبی اور غیر نبی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی وارث نہیں اس آیت کی تکذیب ہے۔ نیز یہ حدیث دوسرے نصوص کے بھی خلاف ہے، یعنی ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ﴾ [النمل:۱۶] (اور سلیمان (علیہ السلام) نے داؤد (علیہ السلام) سے میراث لی) اور آیت: ﴿وَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ﴾ [مریم:۶] (مجھے اپنی طرف سے ایک ایسا وارث عطا فرما جو میرا بھی وارث ہو، اور یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد سے بھی میراث پائے)۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام وارث ہوتے ہیں، اور ان کی اولاد ان کے وارث ہوتی ہے، اور سلسلۂ وراثت ان کے درمیان بھی جاری رہتا ہے، یہاں تک روافض کا اعتراض تھا، آگے جواب آرہا ہے۔

(۱) جواب: آیت کریمہ ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ﴾ عام مخصوص منہ البعض ہے، جس سے بحکمِ حدیثِ نبوی "لَا نَرِثُ وَلَا نُوْرَثُ"۔ انبیاء کرام علیہم السلام مخصوص ہیں، اور چونکہ یہ حدیث حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بلا واسطہ سماعت کیا، اس لئے علم قطعی اور یقینی کو مفید ہے۔ اور جو چیز سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

بلاواسطہ سُنی اس پر عمل کرنا قطعاً فرض ہے، خواہ کسی اور سے یہ حدیث سنے یا نہ سنے، اور اسی پر شیعہ اور سنی تمام اہل اصول کا اجماع ہے۔

اور متواتر اور غیر متواتر حدیث کی تقسیم ان لوگوں کے اعتبار سے ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو نہیں دیکھا، اور دوسروں کے واسطہ سے حدیث سنی، اور جس شخص نے خود اللہ تعالیٰ کے رسول کو دیکھا اور بلا واسطہ سنی تو یہ حدیث اس کے حق میں متواتر سے بھی بالا اور برتر ہے، بلکہ مشاہدہ عینی سے بھی زیادہ قطعی اور یقینی ہے۔ چونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو بلاواسطہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سماعت کیا تھا، اس لئے انہیں دوسروں سے تحقیق و تفتیش کی حاجت نہ تھی۔

نیز اس حدیث کے راوی صرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی نہیں، بلکہ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ، حضرت حذیفہ، حضرت زبیر، حضرت ابوالدرداء، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عباس، حضرت عثمان غنی، اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین نے بھی روایت کیا ہے۔ غرض یہ کہ یہ حدیث تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں معروف ومشہور تھی، اور درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی تھی، اور حدیث متواتر سے قرآن کریم کی تخصیص بالاجماع جائز ہے۔

اور آیت میراث میں حدیث نبوی سے تخصیص ایسی ہے، جیسے آیت ﴿إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ﴾ [التوبۃ: ۶۰] (بیشک صدقات فقراء اور مساکین کے لئے ہیں) کے عموم سے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے موالی مخصوص ہیں، کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے موالی کو باوجود فقر و فاقہ کے زکوٰۃ وصدقات کا لینا حرام ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے زکوٰۃ اور صدقہ حلال نہیں ہے۔

آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان فقیری ضرب المثل ہے، مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ آیت صدقات کے عموم سے مخصوص اور مستثنیٰ ہیں، اور آیت صدقات کے عموم کی تخصیص انہی احادیث سے ثابت ہے جن میں زکوٰۃ و صدقات کا آلِ رسول پر حرام ہونا مروی ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ جن احادیث میں یہ آیا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ترکہ میں وراثت جاری نہیں ہوتی، وہ تمام احادیث آیت میراث کی مخصص ہوں گی۔ (ھدیۃ الشیعۃ، نانوتویؒ)

(۲) جواب: نیز آیت ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ﴾ کا سیاق وسباق اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حکم امتیوں ہی کے لئے ہے، جیسا کہ گزشتہ آیتوں میں چار عورتوں کی تحدید اور مہر اور عدل بین النساء کا واجب ہونا، یہ سب امتیوں کا حکم ہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان میں سے کوئی چیز واجب نہیں۔ آیت ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ

﴿مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ [النساء:۳] (ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں اچھی لگے، دودو، تین تین، اور چار چار) اگرچہ عام ہے، مگر بحکمِ آیت احزاب: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ﴾ [الأحزاب: ۵۰] (اے نبی! ہم نے آپ کے لئے حلال کردی ہیں آپ کی وہ بیویاں جن کو آپ نے ان کا مہر دیا ہے)۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس چار کی تحدید سے مستثنیٰ ہیں۔ سورۂ احزاب کی یہ آیت صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے چار عورتوں سے زیادہ نکاح بھی جائز ہے۔

اور ﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ بظاہر اگرچہ عام ہے، علی العموم سب پر مہر کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے، لیکن سید انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حکم سے الگ اور مستثنیٰ ہیں، جیسا کہ سورۂ احزاب کی یہ آیت: ﴿وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ﴾ [الأحزاب: ۵۰] (اور مؤمنہ عورت، اگر اپنے آپ کو ہبہ کردے نبی کے لئے) اس پر دلالت کرتی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کسی بھی قسم کا مہر واجب نہیں ہے۔

اور آیت نساء بظاہر اگرچہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ عدل بین النسآء سب پر واجب ہے، مگر حسبِ ارشاد خداوندی: ﴿تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ﴾ [الأحزاب: ۵۱] (ان بیویوں میں سے تم جس کی باری چاہو ملتوی کردو، اور جس کو چاہو اپنے پاس رکھو) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ پس اسی طرح اگر حکم میراث سے بھی انبیاء کرام علیہم السلام مستثنیٰ ہوں، تو کیا تعجب ہے؟

مال وجائیداد میں میراث کا جاری ہونا صرف اور صرف امتیوں کا حکم ہے، نہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا، وہ سارے حضرات علیہم السلام والتسلیمات حکمِ میراث سے مستثنیٰ ہیں۔

(۳) جواب: نیز آیت ﴿یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ﴾ میں باتفاقِ فریقین اور بہت سی تخصیصات ہوئی ہیں، چنانچہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا، قاتل مقتول کا وارث، عبد آزاد کا وارث نہیں ہوتا، اور ان تخصیصات پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ آیت کریمہ سے نہ متصل مذکور ہے، نہ منفصل، بجز اس کے کہ احادیث سے ان لوگوں کی تخصیص کی گئی، تو پھر حدیث "مَاتَرَكْنَا صَدَقَةٌ" کا کوئی قصور نہیں کہ وہ آیت میراث کے لئے اگر مخصص ہو۔

شیعہ حضرات قرآن کریم کی تخصیص کرنے کی وجہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر معترض ہیں، لیکن اپنے لئے اس کو جائز کہتے ہیں، خود ان کے نزدیک اخبار آحاد سے قرآن کریم کی تخصیص ثابت ہے۔ ان کا مذہب ہے کہ زمین میں زوجہ کو شوہر سے میراث نہیں ملتا، اور میت کے ترکہ میں سے قرآن پاک اور تلوار اور انگشتری اور لباس کا

وارث صرف بیٹا ہے، نہ کوئی اور۔

نیز اگر آیت: ﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ﴾ متروکہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی شامل ہو، تو اسی متروکہ کو تو شامل ہوگی جو مملوکۂ نبوی بھی ہو، کیونکہ میراث تو مملوکہ اشیاء ہی میں جاری ہوتی ہے، اور وقف کے اموال میں میراث جاری نہیں ہوتی۔ اور سب کو معلوم ہے کہ "فدک" اموال وقف کا حصہ تھا، مملوکہ نبوی نہ تھا۔ آیت: ﴿مَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾ [الحشر: ۷] الخ (اللہ اپنے رسول کو بستیوں سے جو مال فیئ کے طور پر دلوا دے) اس پر صاف دلالت کرتی ہے کہ اموالِ بنی نضیر و فدک وغیرہ سب کے سب من جملہ فئی کے تھے، اور سب وقف تھے، اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی حیات طیبہ میں ان میں جو تصرف تھا، وہ محض متولیانہ ہی تھا، نہ کہ مالکانہ، کیونکہ ﴿مَا أَفَاءَ اللّٰهُ﴾ آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ مال فئی میں ذوی القربیٰ اور یتامیٰ و مساکین اور فقراء مہاجرین و انصار اور قیامت تک آنے والے مسلمان سب شریک اور حقدار ہیں، جن کی تعداد کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ کے، پس اموالِ فئی کے مملوک ہونے کی کوئی صورت نہیں، اور کتب شیعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ فدک منجملہ اموال فئی تھا۔

پس جب فدک ہی مملوک نہ ہوا، تو وہ آیت ﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ﴾ کے عموم میں کیسے داخل ہوگا؟ اور جس طرح مالِ غیر مملوک میں میراث جاری نہیں ہوسکتی، اسی طرح اس میں عطیہ اور ہبہ بھی جاری نہیں ہوسکتا۔ معلوم ہوا کہ اہلِ تشیع جو ہبۂ فدک کی روایت نقل کرتے ہیں وہ قطعاً غلط ہے، اور بلا شبہ شیعوں کی خودساختہ اور پرداختہ و بے بنیاد ہے۔

نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ جب خلیفہ ہوئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ترکہ ان کے قبضہ میں آیا، تو انہوں نے اس میں سے نہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا حصہ دیا، اور نہ ہی ان کے بعد ان کے بیٹوں کو، اور نہ ہی ازواج مطہرات کو۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری ہوتی تو یہ سب حق میراث سے محروم نہ رہتے، جس طرح حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ترکہ کی حقدار تھیں، اسی طرح یہ سب حضرات بھی اس کے حقدار تھے۔

اہل تشیع اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ائمہ اہلِ بیت غصب شدہ چیزوں کو واپس نہیں لیتے، اور باغ فدک چونکہ غصب ہو چکا تھا اس لئے حضرت امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس میں تصرف مناسب نہ سمجھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے نزدیک جیسا کہ باغ فدک غصب ہو چکا تھا، اسی طرح آپ کے نزدیک خلافت بھی تو غصب ہو چکی تھی، تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک ادنیٰ درجہ کی غصب شدہ (فدک) کو تو چھوڑ دیا، اور خلافت جیسی کارآمد غصب شدہ چیز کو قبول کرلیا، جس کے پیٹ میں لاکھوں باغ فدک سما جائیں، اور

پتہ بھی نہ چلے، اور آیت: ﴿وَوَرِثَ سُلَيۡمَٰنُ دَاوُۥدَ﴾[النمل:١٦] (اور سلیمان (علیہ السلام) نے داؤد (علیہ السلام) سے میراث لی) اور آیت: ﴿وَهَبۡ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيّٗا﴾[مریم:٦] (مجھے اپنی طرف سے ایک وارث عطا فرما جو) اس قسم کی آیات میں علم اور حکمت اور منصب نبوت کی وراثت مراد ہے، دنیاوی ولی عہدی اور مالی وراثت مراد نہیں ہے۔[اجوبہ اربعین نانوتویؒ]

باتفاقِ اہلِ تاریخ حضرت داؤد علیہ السلام کے انیس (۱۹) بیٹے تھے، جو مالی وراثت میں سب برابر مستحق تھے، پس اگر آیت کریمہ میں مالی وراثت مراد ہوتی تو حق تعالیٰ حضرت داؤد علیہ السلام کے سب بیٹوں اور وارثوں کے ذکر کو چھوڑ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخصیص نہ فرماتے، اس لئے کہ مالی وراثت میں سب بیٹے برابر ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی کوئی خصوصیت نہیں۔

نیز مالی وراثت میں دنیا کے سارے اچھے برے اپنے باپ کے مال کے وارث ہوتے ہیں، اس میں کوئی فضیلت و برتری نہیں ہوتی، جس کو حق تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مناقب وفضائل میں بطور مدح ذکر فرمایا، اللہ تعالیٰ کو ایسی کیا ضرورت پیش آئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کے مناقب وفضائل میں باپ کی مالی وراثت کا ذکر کیا، جس میں دنیا کے تمام نیک و بد شریک ہیں۔

غرض یہ کہ آیت مذکورہ میں وراثت سے مالی وراثت مراد لینے کی صورت میں نہ تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخصیص کا کوئی فائدہ معلوم ہوتا ہے، اور نہ اس سے ان کا کچھ فضل وکمال ظاہر ہوتا ہے۔ بخلاف وراثت علمِ نبوت کے، کہ اس میں ان کا فضل وکمال بھی ظاہر ہوتا ہے، اور تخصیص کی وجہ بھی، کہ انہیں علم ونبوت اور حکمت خصوصی عطا ہوئی۔

اور آیت: ﴿يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنۡ ءَالِ يَعۡقُوبَ﴾[مریم:٦] (جو مجھ سے میراث پائے، اور اولاد یعقوب (علیہ السلام) سے میراث پائے) میں بھی وراثتِ مالی مراد نہیں ہے، بلکہ علمِ نبوت کی وراثت مراد ہے۔ اگر وراثت سے وراثتِ مالی مراد ہو تو اس کا مطلب غلط ہوگا، کیونکہ آلِ یعقوب (علیہ السلام) سے اگر مراد نفس یعقوب علیہ السلام ہو، تو لازم آئے گا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا مال حضرت زکریا علیہ السلام کے زمانہ تک بغیر تقسیم کے باقی رہا، اور یہ کسی طرح صحیح نہیں، اسے کوئی عاقل تسلیم نہیں کرسکتا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت زکریا علیہ السلام سے دو ہزار سال پہلے گزرے ہیں، اتنے بڑے عرصے تک اس مال کا غیر منقسم ہونا عرفاً، عادتاً، شرعاً، اور عقلاً ممکن ہی نہیں۔ اور اگر آل یعقوب (علیہ السلام) سے مراد ان کی اولاد اور اسباط ہو، تو لازم آئے گا کہ حضرت یحیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے تمام زندہ ومردہ لوگوں کے وارث ہوں، اور

یہ بات پہلی بات سے بھی زیادہ غیر معقول اور ناممکن بات ہوگی۔

اور اگر شیعہ یہ کہتے ہیں کہ آل یعقوب (علیہ السلام) سے زندہ لوگ مراد ہیں تو اندازہ نہیں کہ اس بڑی قوم کے وہ زندہ لوگ جو حضرت یحیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہوں، شاید لاکھوں کیا، بلکہ کروڑوں میں ہوں گے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کروڑوں انسانوں کے اموال کا وارث ہو، اور کس بنیاد پر وارث ہو استحقاق وراثت کی جہت کیا ہوگی۔ پھر اگر بعض لوگ مراد ہوں گے تو ان کی تعیین نہیں، لہٰذا وراثت سے مالی وراثت کا کوئی مطلب واضح نہیں ہوتا، تو واضح ہے کہ علمی اور نبوتی وراثت مراد ہے۔

نیز حضرت زکریا علیہ السلام جیسے پیغمبر، پاکباز ہستی، جس کی نظر و سوچ میں پوری دنیا اور متاع دنیا کی پوری حیثیت ایک مچھر کے برابر بھی نہیں، اس کے علاوہ انبیاء کرام علیہم السلام کی پہلی ذاتی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ اول درجہ کے تارک الدنیا ہوتے ہیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ایک بیٹا ایسا مانگتے ہیں کہ ان کے بعد وہ ان کے اور آل یعقوب علیہ السلام کے اموال و متاع اور دنیائے حقیر کا وارث بن سکے؟ یہ کسے پیغمبر کی شان کے کھلم کھلا خلاف ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام نے کبھی بھی ایسی کسی مہمل و بے مقصد سوال کی اللہ تعالیٰ کے حضور جرأت نہیں کی۔ (علیہم الصلوٰۃ والسلام)

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

ترجمہ: اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بے حیائی کا کام کریں، سو ان پر چار آدمیوں کی گواہی طلب کرلو، جو تم میں سے ہوں، سو اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں روکے رکھو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں موت دیدے، یا ان کے لئے کوئی راہ تجویز فرمادے ﴿۱۵﴾ اور جو بھی دو شخص تم میں سے بے حیائی کا کام کریں، ان کو اذیت پہنچاؤ، پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو ان سے اعراض کرلو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا ہے ﴿۱۶﴾

معارف ومنازل

اسلام اللہ تعالیٰ کا مقبول و پاکیزہ دین ہے، جس میں فواحش و منکرات پر اتنی سخت پابندی ہے کہ زنا تو درکنار

زنا کے اسباب ودواعی کے پاس جانے کی بھی اجازت نہیں۔ کسی مرد کو اجازت نہیں کہ غیر محرم عورت پر نظر اٹھا کر دیکھے، نہ کسی عورت کو اس کی اجازت ہے کہ کسی مرد کو دیکھے، یا اس سے کوئی بات کرے، یا کوئی اشارہ کرے، ان دونوں آیتوں میں بدکاروں کے بارے میں بعض احکام بتائے ہیں۔

اول تو یہ ارشاد فرمایا کہ جو عورتیں فاحشہ کام کرگزریں، ان کے اس برے عمل پر چار گواہ طلب کرلو، جب کسی عورت کے بارے میں یہ بات سنی جائے کہ اس نے ایسا غلط کام کیا ہے، تو خبر چونکہ کانوں کان محلہ اور بستی میں گونج جاتی ہے، اور عام ہوجاتی ہے، اگرچہ معمولی ہی ہو، اور یہ عورت کے لئے اور اس کے خاندان کے لئے باعث ننگ وعار بن جاتی ہے، اس لئے شریعت اسلامیہ نے چار گواہ طلب کرنے کا حکم دیا۔

اس قسم کے امور بغیر گواہ کے ثابت نہیں ہوتے، جب حاکم وقاضی یا پنچائیت کے پاس معاملہ چلا جائے، تو وہ گواہ طلب کرے، یہ گواہ صرف مرد ہوں گے، اس سلسلے میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں، اور گواہ بھی چار ہوں گے، اور مسلمان ہوں گے۔ دیگر امور میں چونکہ دو مردوں کی، یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر ہوجاتی ہے، لیکن چونکہ یہ ننگ وناموس اور عزت وآبرو کا معاملہ ہے، اس لئے اس میں سختی کی گئی کہ جب تک چار مرد گواہی نہ دیں، اس وقت تک کوئی سزا نہیں دی جاسکتی۔

اگر چار گواہ نہ ملیں تو جن لوگوں نے یہ بات اڑائی ہے، وہ سب اور خود گواہ جو چار سے کم رہ گئے، ان سب پر حد قذف، یعنی تہمت لگانے کی سزا نافذ کی جائے گی، حد قذف کی سزا اسی (۸۰) کوڑے ہیں۔ سورۂ نور کے پہلے رکوع میں حد قذف بیان فرمادی ہے۔

اگر کسی عورت پر زنا کی تہمت لگائی گئی، اور چار مرد مسلمان گواہ قائم نہ ہوسکے، تو عورت پر سزا نافذ نہیں کی جائے گی۔ البتہ! اگر واقعی اس نے ایسا کام کیا ہو جسے وہ جانتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرلے، اور یہ نہ سمجھے کہ چونکہ قاضی کے پاس ثابت نہ ہوسکا، اور مجھ پر سزا نافذ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، تو میں یہ کام کرتی ہی رہوں۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے، بندوں کو علم ہو یا نہ ہو وہ گناہوں پر سزا دے گا۔ لہٰذا ہر گناہ سے توبہ لازم ہے کہ گزشتہ سے توبہ ہو، اور آئندہ ترک گناہ ہو۔

اگر چار مسلمان مرد گواہی دیدیں کہ فلاں عورت نے زنا کیا ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ شادی شدہ کو رجم کیا جائے، یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کردیا جائے۔ اور اگر شادی شدہ نہ ہو تو سو کوڑے مارے جائیں۔ یہ شریعت کا حکم ہے،

جو مرد و عورت دونوں کے لئے ہے، جو سورۂ نور میں مذکور ہے۔

اس سورۂ نور کے نزول سے پہلے یہ حکم تھا کہ ان عورتوں کو گھروں میں قید رکھیں، کیونکہ ان کے باہر نکلنے ہی سے عموماً زنا کاری کے واقعات پیش آئیں گے، اب جو یہ حکم سورۂ نساء میں مذکور ہے، ارشاد ہے:

﴿فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلًا﴾ یعنی ان کو گھروں میں قید رکھو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو موت دیدے، یا ان کے لئے کوئی راستہ نکال دے۔ وہ راستہ بعد میں نازل ہوا، جس نے اس قید والے حکم کو منسوخ کر دیا۔ راستہ سے مراد سورۂ نور والا حکم ہے، (یعنی شادی شدہ کا رجم اور غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑے)۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلًا﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے یہی فرمایا: "الرَّجْمُ للثَّيِّبِ و الجلدُ للبِكر"۔ یعنی شادی شدہ زنا کار کو سنگسار کرنا، اور غیر شادی شدہ کو کوڑے لگانا، یہ سزا مرد و عورت دونوں کیلئے ہے۔ مزید تفصیل وہاں آئے گی۔ إن شاء اللہ تعالیٰ

دوسری آیت: ﴿وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوهُمَا﴾ میں یہ حکم دیا کہ جو مرد و عورت اگر بدکاری کریں تو ان کو ایذاء دو، ایذاء دینے میں زبان سے عار دلانا، اور زجر و توبیخ کی باتیں کرنا بھی شامل ہے۔ اور اس آیت میں مار پیٹ کی صورت میں کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی، اور اس کو حکام کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ لیکن سورۂ نور کی آیت میں سزا مقرر کر دی گئی، تو اب اُس پر عمل کرنا لازم ہو گیا۔ ایذاء دینے کا حکم دے کر فرمایا:

﴿فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا﴾ اگر وہ توبہ کر لیں، اور اصلاح کر لیں، تو ان سے اعراض کرو، یعنی چھوڑ دو، اور درگزر کرو، اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اب یہ حکم باقی نہیں منسوخ ہے، کیونکہ یہ حکم اور سابق حکم، یعنی گھروں میں قید رکھنا ابتداء اسلام کے سے متعلق تھے، جب سورۂ نور نازل ہوئی، تو یہ دونوں حکم منسوخ ہو گئے [درمنثور]

آیت: ﴿وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا﴾ الخ جمہور علماء کے نزدیک زنا کے بارے میں ہے، مذکر کا صیغہ تغلیباً ہے، جیسے شمسین، قمرین کہتے رہتے ہیں۔ بعض علماء اس کو غیر فطری (لواطت) عمل پر حمل کرنے کے قائل ہیں۔

بہر حال! جو بھی معنی مراد لیا جائے اس کی گنجائش ہے۔ لفظ فاحشۃ کا اطلاق دونوں پر بآسانی ہو سکتا ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾

ترجمہ: پس اللہ تعالیٰ کے ذمہ ان لوگوں کی توبہ قبول کرنا ہے جو نادانی کے ساتھ گناہ کر لیتے ہیں، پھر قریب ہی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں، سو یہ وہ لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا، اور اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے ﴿١٧﴾ اور اُن لوگوں کی توبہ نہیں جو برے کام کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کے سامنے موت حاضر ہوجائے تو کہتا ہے: بیشک میں نے اب توبہ کی، اور نہ اُن لوگوں کی توبہ ہے جو کافر ہونے کی حالت میں مرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کیا ہے ﴿١٨﴾

معارف ومنازل

توبہ کے معنیٰ ہیں: رجوع کرنا، پشیمانی کا اظہار۔ جب توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یا یہ کہیے کہ انسان گناہ کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دور ہوجاتا ہے، تو پشیمانی کے بعد جب وہ دوبارہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی طرف رجوع کرتا ہے، تو اسے توبہ کہتے ہیں۔ توبہ ہر مسلمان پر بلا انقطاع فرض ہے، جس طرح مسلمان کا کھانا پینا صبح شام جاری رہتا ہے، اسی طرح چاہئے کہ اس کی توبہ کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ چھوٹے صغیرہ گناہ نیکیوں سے معاف ہوتے رہتے ہیں، بڑے گناہوں کی معافی کے لئے توبہ شرط ہے۔

بار بار توبہ کرنے سے گناہ ایسے بکثرت جلدی معاف ہوجاتے ہیں جیسے موسمِ خزاں میں درختوں کے پتے گر جاتے ہیں۔ بار بار توبہ کرنے سے آدمی گناہوں سے ایسے پاک ہوجاتا ہے جیسے سفید کپڑا دھونے اور صابن لگانے سے صاف ستھرا چمکدار ہوجاتا ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا: "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لاَّ ذَنْبَ لَہٗ"۔ [ابن ماجة] توبہ کے بعد گناہگار آدمی گناہوں سے ایسا پاک ہوجاتا ہے جیسے اس نے گناہ ہی کیا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اتنا زیادہ خوش اور راضی رہتا ہے جیسے تم اپنے گمشدہ سامان کے ملنے سے خوش ہوجاتے ہو۔ [متفق علیه] جو شخص صبح وشام توبہ کا سلسلہ جاری رکھتا ہے، اس کے رزق وروزی میں کبھی کمی نہیں

آتی۔ اور توبہ کرنے سے قحط سالی اور ہر قسم کے مصائب دور ہو جاتے ہیں۔ توبہ کرنے سے تمام مشکلات اور پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں، اور راحت وخوشیاں لگاتار متوجہ اور دستیاب ہو جاتی ہیں۔ جو شخص توبہ سے محروم رہا تو پھر یقین کرو کہ وہ ہر خیر و بھلائی، حتیٰ کہ جنت سے بھی محروم اور دور رہا، وغیرہ وغیرہ۔

توبہ کی قبولیت کے لئے چار شرائط ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾ [التحریم:۸] (اے ایمان والو! اللہ کے حضور سچی توبہ کرو)۔ یہ پہلا درجہ اور پہلی شرط ہے، کہ دل کی توبہ ہو، یعنی شوق و رغبت اور اخلاص کے ساتھ ہو، محض کسی مجبوری و جبر کا نتیجہ نہ ہو۔ اگر حاکم کسی مجرم سے کہے کہ فوراً توبہ کرو، ورنہ تو یہ ہوگا وہ ہوگا، تو مجرم اقرار کر کے یہ کہتا ہے: میری توبہ ہے، تو یہ توبہ نصوح نہیں ہے، کیونکہ اس پر جبر ہوا، اس نے اپنے دل کی گہرائیوں سے توبہ نہیں کی۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اپنے گناہ پر مکمل ندامت و پشیمانی اور شرمساری ہو، کیونکہ توبہ نام ہی ندامت کا ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ جس گناہ کا ارتکاب کیا ہے اسے فوراً چھوڑ دے، اور آئندہ کو بھی اس سے باز رہنے کا پختہ عزم وارادہ کرے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ تلافی مافات کی فکر کرے، یعنی جو گناہ سرزد ہو چکا ہے اس کا جتنا تدارک اس کے قبضہ اور اختیار میں ہے، اس کو پورا کرے، مثلاً نماز، روزہ فوت ہوا ہے، تو اس کی قضاء کرے۔ اگر فوت شدہ نمازوں اور روزوں کی صحیح تعداد یاد نہ ہو، تو غور وفکر سے ہفتوں، مہینوں اور سالوں کا حساب لگا کر تخمینہ متعین کرے، پھر ان کی قضاء کرنے کا پورا اہتمام کرے۔ بیک وقت اگر قضاء نہیں کر سکتا، تو ہر نماز کے ساتھ ایک ایک نماز قضاء عمری کی پڑھ لیا کرے۔ یہ صرف فرض نمازوں کا معاملہ ہے، نوافل اور سنتوں کی قضاء نہیں ہوتی۔ اسی طرح متفرق اوقات میں روزوں کی بھی قضاء کرتا رہے۔ زکوٰۃ مفروضہ اگر تمام سالوں کی یکمشت ادا نہیں کر سکتا، تو تدریجاً وقفے کے ساتھ ادائیگی کا اہتمام کرے۔

یہ تھے حقوق اللہ، اب حقوق العباد کا معاملہ اس سے بھی اہم ہے، اگر کسی کا مال کھایا ہے تو اس کی ادائیگی کرے، یا معاف کرائے۔ اسی طرح اگر کسی سے جھگڑا کیا ہو، یا کسی کو ستایا ہو، یا مارا ہو، یا گالی دی ہو، تو لازم ہے کہ ان سے معاف کرائے۔ اگر کسی طرح بیوی بچوں پر ظلم کیا ہو، اس کی بھی معافی ضروری ہے۔ اگر کسی کو تکلیف دی ہو، اور وہ مر گیا ہو، تو اس کے لئے دعا کرے، اور صدقہ کر کے ایصال ثواب کرے۔

اور یہ اچھی طرح یقین کرو کہ توبہ اس وقت مکمل ہوگی جب اس کی مذکورہ چاروں شرائط مکمل ہوں، اور یہ مذکورہ چیزیں بھی ادا ہوں، ورنہ ان شرائط کے بغیر زبانی توبہ اور کثرت کے ساتھ استغفار پڑھنے کا خاطر خواہ فائدہ نہ ہوگا۔

آج کل غفلت کے ساتھ توبہ کی جاتی ہے، جو کہ صرف زبان کی حد تک ہوتی ہے، اور دل میں اس کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوتا، دل کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ میری زبان سے توبہ کے الفاظ نکل رہے ہیں۔ اسی کو حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا نے فرمایا: "اِسْتِغْفَارُنَا یَحْتَاجُ اِلیٰ اِسْتِغْفَارٍ کَثِیْرٍ"۔ یعنی ہمارا استغفار بھی ایک قسم کا گناہ ہے، (کیونکہ غفلت کے ساتھ ہے) اس کے لئے بھی استغفار کی ضرورت ہے۔

ع　　　ہست استغفار ما محتاج استغفار ما......

جب سچے دل سے پوری شرطوں کے ساتھ توبہ کی جائے گی تو ضرور قبول ہوجائے گی، ان شاء اللہ

توبہ کی حقیقت کے متعلق حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے "احیاء العلوم" میں فرمایا کہ گناہوں پر اقدام کے تین درجے ہیں:

☆ پہلا یہ کہ کسی گناہ کا کبھی ارتکاب ہی نہ ہو، یہ تو فرشتوں کی خصوصیت ہے یا انبیاء علیہم السلام کی۔

☆ دوسرا درجہ یہ ہے کہ گناہوں پر دوام کرے، اور پھر اُن پر اصرار جاری رہے، کبھی اُن پر ندامت اور ان کے ترک کا خیال نہ آئے۔ یہ درجہ شیاطین کا ہے۔

☆ تیسرا مقام بنی آدم کا ہے، کہ گناہ سرزد ہو، تو فوراً اس پر ندامت ہو اور آئندہ اس کے ترک کا پختہ عزم ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سرزد ہونے کے بعد توبہ نہ کرنا یہ خالص شیاطین کا کام ہے، اس لئے باجماع امت توبہ فرض ہے۔

﴿یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ﴾ فرمایا اس میں جہالت حماقت کے معنی میں ہے، جو شخص گناہ کرتا ہے، وہ حماقت ہی سے کرتا ہے، کیونکہ یہ شخص اپنے آپ کو عذابِ آخرت میں مبتلا کرنے کا راستہ اختیار کرتا ہے، گناہ میں جو ذرا سا مزہ ہے اس مزہ کیلئے آخرت کے بڑے عذاب کے لئے اپنی جان کو تیار کرنا حماقت نہیں ہے تو کیا ہے؟

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جہالت کے یہی معنیٰ منقول ہیں، لہٰذا آیت کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ اگر عمداً گناہ کو گناہ جانتے ہوئے کوئی شخص گناہ کرے، تو توبہ قبول نہ ہوگی۔ گناہ عمداً ہو یا سہواً ہو، یا خطاءً، یا جہلاً ہو، توبہ سے سب معاف ہوجاتے ہیں، مگر شرط وہی ہے کہ توبہ اصول وشرائط کے مطابق ہو۔

﴿ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ﴾ پھر گناہ کے سرزد ہونے کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ کتنی جلدی؟ اس کی تفصیل بھی احادیث میں موجود ہے۔ بعض روایات میں موت سے ایک سال پہلے، یا ایک مہینہ پہلے، یا ایک ہفتہ پہلے، یا ایک دن، یا ایک گھڑی بھر پہلے بھی انسان اگر توبہ کر لے تو وہ قابلِ قبول ہوتی ہے، یہاں تک کہ جب غرغرہ کی حالت طاری ہو جاتی ہے، تو پھر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، چونکہ انسان کی زندگی بالکل قلیل مدت کے لئے ہے، اس لئے مذکورہ تمام حالتوں پر قریب ہی کا اطلاق ہوتا ہے۔

انسان کو چاہئے کہ وہ زندگی میں بقائمی ہوش وحواس تائب ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ اپنی بے پناہ رحمت وشفقت کے ساتھ توبہ قبول فرماتا ہے۔ "اَلتَّوَّاب" اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اور اس کے معنیٰ: بہت رجوع کرنے کے ہیں۔ اور بندہ کو گناہ ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف انابت کے ساتھ رجوع کرنا چاہئے۔ سرورِ عالم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: "اَلتَّائِبُ حَبِيبُ الله"۔ یعنی گناہ سے صحیح طور پر توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوتا ہے۔ اور قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿وَاَنِيبُوا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوا لَهٗ﴾ [الزمر: ۵۴] یعنی رجوع کرو اپنے ربّ کی طرف فرمانبرداری، اطاعت، اور انابت کے ساتھ رجوع کرو۔ اور ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا:

﴿فَاُولٰٓئِكَ يَتُوبُ اللهُ عَلَيْهِمْ﴾ پس اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کے ساتھ رجوع فرماتا ہے، اور ان کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

﴿وَكَانَ اللهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ اور بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ وہ انسان کی ہر بات اور ہر ارادہ کو اچھی طرح جانتا ہے، اور اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں، وہ اپنے بندوں کے حال سے بھی خوب واقف ہے، اور وہ انہیں ہر صورت معاف کرنا چاہتا ہے، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان اس کی طرف رجوع کرے، اور اپنے گناہوں پر ندامت وشرمساری کے ساتھ معافی طلب کرے۔

موت کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی:

جب موت کے آثار وعلامات شروع ہوں، اور فرشتے ظاہر ہوں، امورِ غیبیہ کا کشف وظہور ہو، تو توبہ کے دروازہ کے بند ہونے کی وجہ سے نہ عاصی گناہگار کی توبہ قبول ہو سکتی ہے، نہ کافر کے ایمان کا اعتبار ہوگا۔ البتہ! مرض موت میں جب مریض کے مکمل ہوش وحواس برقرار ہوں، اور علامات موت شروع نہ ہوں، تو ایسے وقت میں توبہ کے دروازے بند نہ ہونے کی وجہ سے توبہ کی قبولیت اور کافر کے ایمان کی قبولیت کے واضح امکانات ہیں۔ سید عالم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب کو ایسے وقت ہی میں ایمان کی ترغیب دی، اور نجات پانے کا اور اپنی شفاعت کا وعدہ فرمایا۔ [بخاری]

دوئم یہ کہ ایک یہودی لڑکا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کرتا تھا، بیمار ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کی عیادت فرمائی، دوسری طرف اس کا یہودی باپ بھی حاضر ہوا۔ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودی لڑکے کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، لڑکے نے اپنے باپ کی طرف دیکھ کر گویا اس کی رائے معلوم کرنا چاہی، لڑکے کے باپ نے لڑکے کو مشورہ دے کر کہا: "يَا بُنَيَّ اَطِعْ اَبَا الْقَاسِمْ"۔ اے بیٹے! ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات مانو، ان کی دعوت قبول کرو۔ لڑکے نے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا۔ [متفق عليه] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر آ کر حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے فرمانے لگے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْقَذَهٗ مِنَ النَّارِ"۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس لڑکے کو جہنم سے بچالیا، اور اسے ایمان نصیب فرمایا۔

ابو طالب کے مقدر میں ایمان نہیں تھا، اس لئے وہ ایمان نہیں لائے، اور اپنی بے مثال تمام قربانیوں کو ضائع کر دیا۔ اس بارے میں آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جب موت کا وقت آجائے، اور دوسرے عالم کے حالات نظر آنے لگے، اس وقت جو کوئی توبہ کرے تو وہ توبہ قبول نہیں ہوگی۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے: "اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَالَمْ يُغَرْغِرْ بِنَفْسِه"۔ [رواه أحمد] کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک کہ غرغرہ کی حالت نہ ہو جائے۔ جب روح نکلنے لگے، اور اندر سے جان نکلنے کی آواز آنے لگے، اس وقت کو غرغرہ کہا جاتا ہے، اس وقت چونکہ عالمِ غیب کی چیزیں سامنے آجاتی ہیں، اور فرشتے نظر آنے لگتے ہیں، اور جان کنی کی تکلیف برابر شروع ہوجاتی ہے، مزید زندہ رہنے کی امید منقطع ہوجاتی ہے، اس طرح دوسرے عالم سے تعلق ہوجاتا ہے، اور ایمان بالغیب کا مرحلہ ختم ہوجاتا ہے، اس لئے اس حالت میں توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اس وقت نہ مؤمن کی توبہ قبول ہوتی ہے، جو گناہوں سے توبہ کرے، اور نہ کافر کی توبہ قبول ہوتی ہے، جو کفر سے توبہ کرنے لگے۔

فرعون نے اسی کشمکش میں چیخ کر کہا تھا: ﴿آمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [یونس: ۹۰] (میں نے مان لیا کہ جس خدا پر بنو اسرائیل ایمان لائے ہیں اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں)۔ حق تعالیٰ سبحانہ نے فرمایا: ﴿آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ﴾ [یونس: ۹۰] (اب ایمان لاتا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا)۔ یعنی اب نہیں، ایمان لانے کا وقت

گزر گیا، تو بڑا سرکش غنڈہ تھا، بڑا فساد پھیلایا تھا، اب تم اپنے انجام کو پہنچ چکے ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ ایمان وہ معتبر ہے جو ایمان بالغیب ہو، جب عالمِ برزخ کی چیزیں نظر آنے لگیں، اور ان کا مشاہدہ کرلیا، تو اب ایمان بالغیب نہ رہا، اس لئے اس وقت کسی کا ایمان معتبر نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے، بروایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان نے عرض کیا، تیری عزّت وجلال کی قسم! میں لوگوں کو برابر گمراہ کرتا رہوں گا، جب تک ان کے اندر جان ہوگی''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''مجھے اپنی عزّت وجلال کی قسم! میں بھی ان کو ہمیشہ بخشتا رہوں گا، جب بھی وہ مجھ سے معافی کے طلبگار رہوں گے''۔ [رواه أحمد وأبو يعلى، مظهري، درمنثور]

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ فرمایا سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے: ''کہ اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کا گنہگار توبہ کرلے، اور دن کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات کا گنہگار توبہ کرلے، اور یہ سلسلہ بند نہیں ہوگا یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع کرے، جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا، تو توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا''۔ [رواه مسلم]

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ، اور تم ان عورتوں کو اس غرض سے مقیّد مت کرو کہ جو مال تم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے کچھ واپس لے لو، مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح فحش کام کربیٹھیں، اور تم ان کے ساتھ اچھے طریقے پر زندگی گزارو سو، اگر وہ تم کو ناپسند ہیں تو ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو، اور اللہ تعالیٰ اس میں زیادہ خیر رکھ دے ﴿۱۹﴾

معارف ومنازل

جاہلیت کا زمانہ ایک بھیانک سیاہ دور گزرا ہے، جہاں انسانی شرافت واخلاق پامال ہوکر دفن ہوچکے تھے،

لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے تھے، عام عورتوں کی ننگ و عزّت کے ساتھ بازاروں میں کھیلتے رہتے تھے، عورت کو میراث کیا دیتے خود عورت کو شوہر کی وفات کے بعد میراث کا حصہ بنا کر ہوس کا نشانہ بناتے تھے، اور زور و زبردستی کے ساتھ بغیر کسی حق مہر کے اسے تختۂ مشق بنا کر طرح طرح کی اذیت دیتے تھے۔ حضرت ابو قیس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، ان کی بیوی کبشہ رضی اللہ عنہا پر وارثوں نے پابندی لگادی، اور انہیں زبردستی قید میں رکھا، تاکہ ان کے مال پر قبضہ کر کے انہیں کسی وارث کا حصہ بنادیں۔ اس عورت نے سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں آکر اپنی درد بھری داستان سنائی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مشورہ دیا کہ تم اپنے گھر جا کر انتظار کرو، ان شاء اللہ اللہ ربُّ العزّت کسی وقت تمہارا یہ مسئلہ حل فرمائے گا، چنانچہ یہ آیتیں اتریں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں عورتوں پر لوگ طرح طرح سے ظلم و زیادتی کرتے تھے۔ یہ ظلم ان کی ذاتوں اور جانوں پر بھی ہوتا تھا، اور ان کے مالوں پر بھی۔ ان کی جانوں پر اس طرح ظلم ہوتا تھا کہ جب کسی عورت کا شوہر مرجاتا تو اس عورت کو میت کے مال کی طرح اپنی میراث سمجھتے تھے، عورت کو اپنی جان میں کوئی اختیار نہ ہوتا تھا، اور خود سے کہیں اپنا نکاح نہیں کرسکتی تھی۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد اس شخص کا جو بڑا بیٹا ہوتا تھا، یعنی کسی دوسری بیوی سے، نہ کہ اس عورت سے، وہ یا اس کے نہ ہونے کی صورت میں کوئی اور (مردہ کا قریبی رشتہ دار) آکر اپنا کوئی کپڑا اس عورت پر، یا اس کے خیمے پر ڈال دیتا تھا، بس وہی اس کا شوہر بن جاتا تھا، اس عورت کو اپنی ذات پر کوئی تصرف کا اختیار نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ شخص اگر چاہتا تو بغیر کسی جدید مہر کے صرف مردہ باپ یا مردہ رشتہ دار کے مہر پر اس سے نکاح کرلیتا تھا۔ اگر خود نکاح کرنا نہ چاہتا، تو کسی دوسرے سے نکاح کرادیتا، یعنی کسی دوسرے پر بیچ دیتا، اس کو مالک بنالیتا، اور مہر یا قیمت پر قبضہ کرلیتا۔ اگر یہ بھی نہ چاہتا تو اپنے پاس مقید رکھتا، اور باندیوں کی طرح اس سے خدمت لیتا، تاکہ عورت مجبور و بیزار ہو کر وہ مہر واپس کردے جو اس نے مردہ شوہر سے لیا تھا۔ انتہی۔

جاہلیت کی رسم کے مطابق اگر کوئی کسی عورت کو مہر دے کر نکاح کرتا، تو اس کا مالک بن جاتا (یہ رسمِ بد اب بھی بعض قوموں اور مسلمان خاندانوں میں موجود ہے)۔ عورتوں کا مال زبردستی وصول کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ عورت کو طرح طرح سے تکلیفیں دیں، ایذائیں پہنچائیں، اور جب وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے طلاق طلب کرے تو اس سے مال لے لیں، تو وہ مصیبت زدہ مجبور ہو کر اپنے پاس سے یا کہیں دوسرے ذرائع سے مال دیدیتی

ہے، یا حق مہر معاف کر کے جان چھڑا لیتی ہے۔

یہ رواج اب بھی بعض مسلمان ممالک میں ہے، یہ مہر لے کر شوہر اس سے دوسری شادی کر لیتا ہے، نیا مزہ، نئی بیوی، عیش کر کے چند ایک ماہ بعد اس دوسری بیوی کو بھی ستانا شروع کر لیتا ہے، پھر اسی طرز پر عورت سے دیا ہوا مہر لے کر تیسری شادی کر لیتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ایک سال میں چار، پانچ لڑکیوں سے شادی کرتا رہتا ہے، لَاحَوْلَ وَ لَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللہِ۔

آیت کریمہ کے عمومی الفاظ سے مسلمانوں کو اس طرح کی تمام غیر شرعی حرکتوں سے منع فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ تمہارے لئے ایسا کرنا ہرگز حلال نہیں ہے، البتہ ﴿اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ فرما کر یہ بتلا دیا کہ اگر عورتیں کوئی صریح نازیبا حرکتیں کر لیں، تو ان سے دیا ہوا مال واپس لیا جا سکتا ہے، اور اس صورت میں جرم وزیادتی عورت کی طرف سے ہے، نہ کہ شوہر کی طرف سے، بلکہ شوہر مجبور ہے۔

صریح نازیبا حرکت سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے عورت کی زبان درازی، بدخُلقی، اور نافرمانی مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر عورت ایسی حرکتیں کرے تو شوہر اپنا مال جو مہر کی صورت میں دیا تھا وہ بطورِ خلع لے سکتا ہے، اور اس صورت میں یہ مال لینا جائز ہوگا۔ اور بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ العیاذ باللہ اگر عورت نے زنا کا ارتکاب کیا، تو خاوند اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس لے لے، اور اس کو طلاق دے کر جدا کر دے۔ یہ حکم ابتدائے اسلام میں حدود نازل ہونے سے پہلے تھا۔ اب جب زنا کی حد نازل ہوگئی، تو یہ حکم باقی نہ رہا، لہٰذا عورت کے زنا کرنے سے مہر کا وجوب ساقط نہیں ہوگا۔ كما في حديث البخاري في بحث اللعان۔

عورتوں کے ساتھ حسنِ معاشرت کا حکم:

پھر ارشاد فرمایا: ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ تا خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ اور تم عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک رکھو، اور خوش اخلاقی سے پیش آؤ، اور اچھی زندگی گزارو، نان ونفقہ، پوشاک اور دیگر ضروریات کی خیر وخبر گیری کا اہتمام رکھو۔ اگر تمہیں ان سے کسی بداخلاقی پر طبعی طور پر کوئی ادا ناپسند ہو، تو صبر کر کے اسے برداشت کرو۔ اور یہ پہلے گزر چکا کہ ان کی خِلقت ٹیڑھی پسلی سے ہے، اگر اسے سیدھا کرنے کا ارادہ کرو تو ٹوٹ جائے۔ پس اسی کیفیت کے ساتھ گزارہ کر کے اس سے فائدہ حاصل کرتے رہو، کیونکہ ان کی فطرت ہرگز بدل نہیں سکتی۔ اور ان سے اگر کوئی چیز تمہیں ناپسند معلوم ہو، تو ہو سکتا ہے کہ اس میں تمہارے لئے کسی منفعت کا کوئی پہلو موجود ہو۔

بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ شکل وصورت اور رنگ وروپ کے لحاظ سے عورت دل میں نہیں سماتی، لیکن خدمت گزاری، اور خوش لسانی اور مال وعزت کی حفاظت اور مہمان نوازی، یا دینداری وتقویٰ اور بچوں کی نگرانی و تربیت۔ اور دیگر پسندیدہ کردار کے لحاظ سے بہتر اور پسندیدہ ہو، اور اس کے عیوب پر اس کے محاسن نے پردہ ڈالا ہو۔ پس یہ تو خیر کی صورتیں ہیں، تھوڑی سی طبعی ناگواری کو اس طرح کے محاسن وگرانقدر منافع کیلئے برداشت کرنا چاہئے۔

اور یہ بات واضح ہے کہ دیندار اور سمجھدار مرد ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں، دنیا میں کوئی بھی انسان مرد ہو یا عورت، جامع المحاسن نہیں ہے۔ اسی طرح برے سے برے انسانوں میں بھی چند محاسن ضرور ہوتے ہیں۔ البتہ! انبیاء کرام علیہم السلام تمام محاسن وکمالات کے جامع ہیں، اور ہر قسم کے ظاہری وباطنی عیوب سے پاک ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''کوئی مرد کسی مؤمنہ (بیوی) سے بغض نہ رکھے، اگر اس کی ایک خصلت ناپسند ہوگی، تو دوسری خصلت پسندیدہ ہوگی''۔ [رواہ مسلم]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''کامل ایمان والوں میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی بیوی کے ساتھ سب سے اچھے اخلاق والے، اور سب سے زیادہ مہربان ہوں''۔ [مشکوۃ] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''تم میں سے سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنے اہل کیلئے سب سے بہتر ہیں، اور میں تم میں اپنے اہل کیلئے سب سے زیادہ بہتر ہوں''۔ [متفق علیه، ترمذي]

درحقیقت بات یہ ہے کہ بیویوں کے ساتھ معاشرت ہو، یا دوسرے لوگوں کے ساتھ مصاحبت ومرافقت ہو، سو فیصدی ہر ایک کا ہر ایک کے ساتھ دل مل جائے، اور ذرا سی بھی طبعی وعقلی اذیت نہ پہنچے، اس دارُ المصائب جہاں میں عموماً ایسا ہوتا ہی نہیں۔ فوائد ومنافع کو دیکھ کر ناگواریوں کو برداشت کرنے ہی سے مصاحبت اور مرافقت باقی رہ سکتی ہے۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا طلبگار رہتا ہے، مؤمن طعنہ دینے والا اور لعنت کرنے والا، نیز بداخلاقی اور عیب جوئی کرنے والا نہیں ہوتا، یہ اس کی ذاتی مخصوص صفت ہے کہ وہ صابر وبرداشت کرنے والا، اور بیوی بچوں کی زیادتیوں سے درگزر کرنے والا ہوتا ہے۔ یہی کمال ایمان وتقویٰ ہے، خَيْرًا كَثِيْرًا کی تفسیر اکثر مفسرین نے نیک اولاد سے کی ہے، اور یہی راجح ہے۔

وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ زَوۡجٍ ۙ وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا
تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـــًٔا ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ۝۲۰ وَكَيۡفَ تَاۡخُذُوۡنَهٗ
وَقَدۡ اَفۡضٰى بَعۡضُكُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ وَّاَخَذۡنَ مِنۡكُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ۝۲۱

ترجمہ: اور اگر ایک بیوی کو دوسری بیوی کی جگہ بدلنا چاہو، اور تم ان میں سے ایک کو بہت سے (ڈھیر جتنا) مال دے چکے ہو، تو اس میں سے کچھ بھی نہ لو، کیا تم اس کو واپس لو گے بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کا ارتکاب کر کے؟ ۝۲۰
اور تم اس کو کیسے لیتے ہو حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے ہو، اور انہوں نے تم سے خوب پختہ عہد لے لیا ہے؟ ۝۲۱

معارف ومنازل

ابھی پچھلی آیتوں میں بیان ہوا کہ اگر عورت کی طرف سے کوئی کھلا ہوا ناشائستہ براعمل سرزد ہو جس کی وجہ سے شوہر طلاق دینے پر مجبور ہو، تو ایسی صورت میں کوئی مضائقہ نہیں کہ شوہر اس وقت تک طلاق نہ دے جب تک عورت شوہر کا دیا ہوا مہر وغیرہ واپس نہ کرے، یا واجب الاداء مہر کو معاف نہ کرے، کیونکہ قصور اور زیادتی عورت کی طرف سے ہے، کہ اس نے خیانت کی ہے، اور مرد بے گناہ ہے۔

البتہ! اگر عورت کی طرف سے کوئی سرکشی یا بے حیائی کا کام سرزد نہ ہو، مگر شوہر محض اپنی طبعی خواہش اور خوشی کے لئے موجودہ بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے، تو اس صورت میں اگر وہ ڈھیروں مال (یعنی بہت مال) بھی اس کو دے چکا ہے، اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اس سے دیے ہوئے مال کا کوئی حصہ طلاق کے معاوضہ میں واپس لے لے، یا واجب الاداء مہر کو معاف کرائے، جو کہ سراسر ظلم ہے، کیونکہ عورت کا کوئی قصور نہیں۔

اور جس سبب سے مہر واجب ہوتا ہے وہ سبب بھی پورا ہو چکا ہے، یعنی عقد نکاح بھی ہو گیا، اور عورت نے ننگ وناموس شوہر کے سامنے بلا تکلف پیش بھی کیا، اور خود کو بے حجاب کر کے اُسے استفادہ اور ہمبستری کا بھی موقع فراہم کیا۔ اب اگر ان تمام اقدار کے ہوتے ہوئے مرد اس سے دیا ہوا مال، یا اس کے کچھ حصے کی واپسی کا مطالبہ کرے گا، تو یہ خدائی قانون کے لئے چیلنج سے کم نہیں ہوگا، اور سراسر ظلم ہوگا۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب سے ڈرنا چاہئے، جس کی گرفت بہت ہی سخت ہے۔

یہ عورتیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور باندیاں ہیں، اور وہی ان کا مالک وسرپرست ہے۔ اس کے بعد اس مال کی

واپسی کے ظلم وگناہ ہونے کو تین مرحلوں میں بیان فرمایا گیا۔

اوّل: یہ کہ ﴿اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا﴾ یعنی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ بیوی پاکدامن پر زنا وغیرہ کے بہتان لگانے کا کھلا گناہ کر کے اپنا مال واپس لینے کا ناجائز راستہ نکالو۔ یعنی جب یہ معلوم ہو چکا کہ دیا ہوا مال صرف اس وقت جائز ہے جب کہ بیوی کسی ناشائستہ حرکت کی مرتکب ہو، تو اب اس سے مال واپس لینا درحقیقت اس کا یہی اعلان واظہار کرنا ہے کہ اس نے کوئی ناشائستہ حرکت، بے حیائی وغیرہ کی ہے، اس لئے میں اپنے مطالبۂ مال میں حق بجانب ہوں، خواہ زبان سے اس پر زنا اور بدچلنی کی تہمت لگائے یا نہ لگائے۔ بہرحال! مال کی واپسی کا مطالبہ یہ ایک صورت تہمت اور بہتان کی ہے، جس کا اثم مبین اور گناہ عظیم ہونا ظاہر ہے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا: ﴿وَكَیْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ یعنی اب تم اپنا مال ان سے کیسے واپس لے سکتے ہو؟ جبکہ صرف عقدِ نکاح ہی نہیں، بلکہ خلوت اور ایک دوسرے سے بے حجابانہ قربت وجماع بھی کر چکے ہو، کیونکہ اس صورت میں اگر دیا ہوا مہر، یعنی مال اگر حق مہر کا ہے تو عورت اس کی مکمل مستحق اور مالک ہو چکی ہے، خواہ یہ مہر معجّل ہو یا مؤجل، کیونکہ اس نے اپنے نفس کو شوہر کے سپرد کیا، بلکہ اپنے نفس کا اس کو مالک بنا دیا، لہٰذا یہ مہر اس کے نفس وعزّت کا معاوضہ ہے، اس کی واپسی کا کوئی معنیٰ نہیں۔

اور اگر دیا ہوا مال ہدیہ، تحفہ، اور بخشش کا ہے، تو بھی اب اس کی واپسی ممکن نہیں، کیونکہ میاں بیوی جو آپس میں ایک دوسرے کو ہبہ کریں، اس کی واپسی نہ شرعاً جائز ہے، اور نہ اخلاقاً، اور نہ قانوناً نافذ کی جاتی ہے، کیونکہ ازدواجی تعلق واپسی سے مانع ہے۔ اور اسی مضمون کو تیسرے جملہ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا﴾ یعنی ان عورتوں نے تم سے پختہ اور مضبوط عہد لے لیا ہے۔ اس سے مراد عقدِ نکاح کا عہد ہے، جو زندگی بھر کے لئے ہے۔ خطبۂ نکاح میں اللہ تعالیٰ کا نام مجمع کے سامنے لیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس ازدواجی عہد ومیثاق، اور باہم بے حجابانہ ملنے کے بعد دیا ہوا مال واپس کرنے کے لئے عورت کو مجبور کرنا سراسر ظلم وزیادتی اور کھلا جور ہے، مسلمانوں کو ایسی بے رحمی سے اجتناب لازم ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِیْلًا ﴿۲۲﴾

ترجمہ: اوران عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں، مگر جو پہلے گزر چکا، بیشک یہ بے حیائی کا اور غصہ (تباہی) کا کام ہے، اور برا راستہ ہے ﴿۲۲﴾

معارف ومنازل

جاہلیت کی قبیح رسومات میں سے ایک رسم یہ تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا اپنے باپ کی بیوی (سوتیلی ماں) سے شادی کرتا تھا۔ اسود بن خلف، صفوان بن امیہ، اور بھی کئی لوگوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ حصن بن ابی قیس نے اپنے باپ کی وفات کے بعد اس کی بیوی، یعنی اپنی سوتیلی ماں کو نکاح کا پیغام دیا، تو وہ کہنے لگی کہ: میں تجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہوں، تجھ سے کیسے نکاح کروں؟ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر دریافت کروں گی، چنانچہ وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، اور بات سامنے رکھی، اس پر اللہ تعالیٰ یہ آیت نازل فرمائی۔ [اسباب نزول]

چونکہ زمانۂ جاہلیت میں یہ رسمِ بد عام تھی، اور اس کی قباحت کو جہالت کی وجہ سے محسوس ہی نہیں کرتے تھے، تب اللہ تعالیٰ نے اس فعلِ قبیح کو ہمیشہ کے لئے حرام قرار دیا۔ واضح رہے کہ ایک شخص کے صرف نکاح کر لینے سے ہی وہ عورت اس کے بیٹوں پر حرام ہوگئی، باپ کے ساتھ اس عورت کی خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، فرق نہیں ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے ماموں حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ میرے پاس سے گزرے، ان کے ہاتھ میں ایک جھنڈا تھا، میں نے پوچھا آپ کہاں جا رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کی طرف بھیجا ہے، جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا ہے، اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کا سر کاٹ کر لاؤں۔ [ترمذی، أبو داؤد، نسائی، ابن ماجہ]

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ اُمَّهٰتُكُمۡ وَبَنٰتُكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ وَعَمّٰتُكُمۡ وَخٰلٰتُكُمۡ وَبَنٰتُ الۡاَخِ
وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ
نِسَآئِكُمۡ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىۡ فِىۡ حُجُوۡرِكُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِىۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَاِنۡ لَّمۡ
تَكُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ وَحَلَآئِلُ اَبۡنَآئِكُمُ الَّذِيۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۲۳﴾

ترجمہ: حرام کی گئی ہیں تم پر تمہاری مائیں، اور تمہاری بیٹیاں، اور تمہاری بہنیں، اور تمہاری پھوپھیاں، اور تمہاری خالائیں، اور بھائی کی بیٹیاں، اور بہن کی بیٹیاں، اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا، اور تمہاری دودھ شریک بہنیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جن بیویوں سے دخول کر چکے ہو، جو تمہاری گودوں میں ہیں، سو اگر تم نے ان بیویوں سے دخول نہ کیا ہو، تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ ان کی لڑکیوں سے نکاح کرلو۔ اور حرام ہیں تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پشت سے ہیں۔ اور یہ حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو اپنے نکاح میں جمع کرو، مگر جو گزر چکا بیشک اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے ﴿۲۳﴾

﴿اَلْجُزْءُ الْخَامِسُ﴾

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ
فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۲۴

ترجمہ: اور حرام ہیں وہ عورتیں جو کسی مرد کے نکاح میں ہوں، سوائے ان عورتوں کے جن کے تم مالک ہوجاؤ، اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو تم پر فرض فرمایا ہے۔ اور تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں وہ عورتیں جو ان کے علاوہ ہیں، کہ تم اپنے مالوں کے بدلہ طلب کرو، اس حال میں کہ تم پاک دامنی اختیار کرنے والے ہو، پانی بہانے والے نہ ہو، سو ان میں سے جن عورتوں سے نفع حاصل کرلو، ان کے مہر دیدو جو مقرر ہو چکے ہیں۔ اور تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ مقرر مہر کے بعد آپس کی رضامندی سے کسی بات پر راضی ہوجاؤ، بیشک اللہ تعالیٰ علیم ہے، حکیم ہے ۝۲۴

معارف ومنازل

یہ دونوں آیات کریمہ اپنے مضامین ومطالب کے اعتبار سے نہایت جامع ہیں۔ ان آیات میں تفصیل کے ساتھ اولاً محرّمات کا عمدہ ترتیب کے ساتھ بالاستیعاب تذکرہ ہے۔ محرّمات سے مراد وہ عورتیں ہیں جن سے نکاح جائز نہ ہو۔ پہلے محرّماتِ ابدیہ اور محرّماتِ سببیہ کا بیان ہے، پھر ان کے علاوہ محلّلات کا بیان ہے، یعنی محرّمات کے علاوہ جن عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ پھر نکاح کی اصلی غرض وغایت کے بیان کے ساتھ حقِ مہر کا بیان ہے۔

محرّمات کی اقسام:

محرّمات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ابدی، دائمی۔

(۲) عارضی، بروقتی، یعنی سببی، غیر ابدی۔

☆ قسمِ اول محرّماتِ ابدیہ، جن سے کبھی نکاح درست نہیں، تین طرح کی ہیں:

اوّل محرّ مات نسبیہ، جونسب کے رشتے کی وجہ سے حرام ہیں۔

دوئم محرّ مات رَضاعیہ، جودودھ پینے کے رشتے کی وجہ سے حرام ہیں۔

- سوئم محرّ مات بالمُصاہرۃ، جوسسرالی رشتے کی وجہ سے حرام ہے ہیں۔ ان تینوں اقسام کی تفصیل یہ ہے:

محرّمات نسبیہ کا بیان:

محرّماتِ نسبیہ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ أُمَّهَٰتُكُمۡ﴾ حرام کی گئیں ہیں تم پر تمہاری مائیں۔ اس کے عموم میں مائیں اور ماؤں کی مائیں اوپر جہاں تک سلسلہ چلا جائے سب کی حرمت آ گئی۔

﴿وَبَنَاتُكُمۡ﴾ اور حرام کی گئیں تمہاری بیٹیاں۔ اس کے عموم میں بیٹیاں اور بیٹوں کی بیٹیاں، اور ان کی بیٹیاں، جہاں تک سلسلہ چلا جائے سب داخل ہوگئیں۔

﴿وَأَخَوَٰتُكُمۡ﴾ اور حرام کی گئیں تمہاری بہنیں۔ اس کے عموم میں سگی بہنیں، باپ شریک بہنیں، اور ماں شریک بہنیں، اور ان کی بیٹیاں، اور ان کے بیٹوں اور بیٹیوں کی بیٹیاں سب آ گئیں، آخر تک۔

﴿وَعَمَّٰتُكُمۡ﴾ اور حرام کی گئیں تمہاری پھوپھیاں۔ اس کے عموم میں باپ کی سگی بہنیں، اور باپ شریک بہنیں، اور ماں شریک بہنیں، سب آ گئیں۔ فقط

﴿وَخَٰلَٰتُكُمۡ﴾ اور حرام کی گئیں تمہاری خالائیں۔ اس کے عموم میں بھی ماں کی سگی بہنیں، اور باپ شریک بہنیں، اور ماں شریک بہنیں سب داخل ہوگئیں۔

﴿وَبَنَاتُ ٱلۡأَخِ﴾ اور حرام کی گئیں بھائی کی بیٹیاں۔ اس کے عموم میں سگے بھائی کی بیٹیاں، باپ شریک بھائی کی بیٹیاں، اور ماں شریک بھائی کی بیٹیاں سب آ گئیں۔

﴿وَبَنَاتُ ٱلۡأُخۡتِ﴾ اور حرام کی گئیں بہن کی بیٹیاں۔ اس کے عموم میں سگی بہن، باپ شریک بہن، اور ماں شریک بہن، سب کی بیٹیاں جہاں تک سلسلہ چلا جائے، سب داخل ہیں۔

محرّمات بالرَّضاع کا بیان:

محرّماتِ نسبیہ کے بعد محرّماتِ رضاعیہ کا درجہ ہے، جو کہ دودھ کی اہمیت کے اعتبار سے نسبی رشتہ کی طرح پختہ و محکم ہے۔ ارشاد فرمایا: ﴿وَأُمَّهَٰتُكُمُ ٱلَّٰتِيٓ أَرۡضَعۡنَكُمۡ﴾ اور حرام کی گئیں تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا۔

﴿وَاَخَوٰتُکُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ اور حرام کی گئیں تمہاری بہنیں جو تمہاری دودھ شریک ہیں۔ قرآن کریم میں رضاعت کے رشتہ کو حرمات کا سبب بیان فرماتے ہوئے رضاعی ماں اور رضاعی بہن کی حرمت پر اکتفاء فرمایا ہے۔

اس اجمال اختصار کی تشریح فرماتے ہوئے سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اَلرَّضَاعَةُ تُحَرِّمُ مَا تُحَرِّمُ الوِلَادَةُ''۔ [بخاري] حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو عورت ولادت کے رشتہ سے حرام ہے، وہ رضاعت کے رشتہ سے بھی حرام ہے۔ یہ حدیث ''صحیح مسلم'' میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: ''یَحرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا یَحرُمُ مِنَ النَّسَبِ''۔ (بلاشبہ رضاعت کی وجہ سے وہ سب رشتے حرام ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں)۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ: ''شرعی حجاب (پردہ) کے حکم نازل ہونے کے بعد میرے رضاعی چچا حضرت ابوالقعیس رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے، جنہوں نے اندر آنے کی اجازت چاہی، میں نے اجازت نہ دی، اور جواب میں کہہ دیا کہ جب تک سرور عالم ﷺ سے دریافت نہ کرلوں گی، اجازت نہ دوں گی۔ جب آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا وہ تمہارا رضاعی چچا ہے، اُسے اندر آنے کی اجازت دیدو۔ میں نے عرض کیا: مجھے تو عورت نے دودھ پلایا ہے، مرد نے تو دودھ نہیں پلایا، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ تمہارا چچا ہے، وہ تمہارے گھر میں اندر آسکتا ہے۔ [رواه البخاري و مسلم]

صاحب ہدایہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جب کوئی عورت کسی بچی کو دودھ پلادے، تو یہ بچی اس عورت کے شوہر پر، اور اس کے باپوں پر، اور اس کے بیٹوں پر حرام ہو جائے گی۔ اور جس شوہر کے ذریعہ دودھ پلانے والی عورت کا دودھ اترا ہے وہ اس دودھ پینے والی بچی کا رضاعی باپ ہو جائے گا، اور جس کسی عورت کا دودھ کسی لڑکے نے پی لیا، اور اس عورت کا دودھ کسی لڑکی نے بھی پی لیا، تو ان دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا، اور جس لڑکی نے کسی عورت کا دودھ پی لیا اس لڑکی کا دودھ پلانے والی کے لڑکے سے نکاح نہیں ہوسکتا، اور دودھ پلانے والی کے پوتے سے بھی اس دودھ پینے والی لڑکی کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پی لیا، تو اس بچے کا نکاح دودھ پلانے والی عورت کے شوہر کی بہن سے نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ اس کی رضاعی پھوپھی ہے۔ رضاعی باپ (جس کی بیوی کا دودھ پیا ہو) کی بیوی سے دودھ پینے والے بچے کا، اور رضاعی بیٹے کی بیوی سے دودھ پلانے والی عورت کے شوہر کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ یہ تھے چند جزئیات، باقی تفصیل تقریباً وہی ہیں جو کہ محرماتِ نسبیہ کے ضمن میں بیان ہوئیں۔

البتہ! کتب فقہ میں چند استثنائی صورتیں بھی ہیں، مثلاً فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ رضاعی بھائی یا رضاعی بہن کی نسبی ماں سے نکاح جائز ہے۔ اسی طرح حقیقی بہن کی رضاعی ماں سے بھی نکاح ہوسکتا ہے۔ رضاعی بہن کی نسبی بہن کے ساتھ بھی نکاح جائز ہے۔ یہ بعض استثناءات ہیں، اس کے علاوہ رضاعی بھتیجی یا بھانجی یا خالہ یا پھوپھی وغیرہ سے اسی طرح نکاح نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ حقیقی نسبی رشتوں کی طرح ہی حرام ہیں۔

از جانب شیر دہ ہمہ خویش شوند ☆ واز جانب شیر خوردہ زوجان وفروع

مسئلہ:

دو سال (چاند کے حساب سے) کی مدّت کے اندر حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے، اس پر سب ائمہ کا اجماع ہے، لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دودھ پلانے کی مدت ڈھائی سال ہے، اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ ڈھائی سال کے اندر کوئی بچہ یا بچی دودھ پی لے تو اس دودھ پینے کی وجہ سے حرمت کا فتویٰ دیا جائے۔ اکثر اماموں کے نزدیک دو سال کے بعد دودھ پینے سے اور حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ڈھائی سال کے بعد دودھ پینے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

مسئلہ:

ذرا سا دودھ (اگرچہ ایک ہی قطرہ ہو) اگر بچہ کے حلق میں صرف ایک ہی بار اتر جائے، تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔

مسئلہ:

محض کسی ایک عورت یا چند عورتوں کے کہنے سے کہ فلاں عورت نے فلاں لڑکے یا لڑکی کو دودھ پلایا ہے، حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی، بلکہ اس کے ثبوت کے لئے دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی دینا شرط ہے۔ البتہ! احتیاط اسی میں ہے کہ اگر ایک عورت بھی کہہ دے کہ میں نے فلاں لڑکے اور لڑکی کو دودھ پلایا ہے، تو ان کا آپس میں نکاح نہ کیا جائے، تو بہتر ہے۔ اور حلال وحرام کے معاملہ میں احتیاط ضروری ہے۔ ان مسائل کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے۔ لہٰذا تفصیلات کے لئے کتب فقہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

محرمات بالمصاہرۃ کا بیان:

اس کے بعد محرمات بالمصاہرہ کا بیان فرمایا۔ ﴿وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىٕكُمْ﴾ یعنی تمہاری بیویوں کی مائیں تم پر

حرام کی گئیں، ان سے نکاح نہیں ہوسکتا۔ کسی عورت سے نکاح ہوجانا ہی اس کی ماں سے نکاح ہونے کی حرمت کے لئے کافی ہے، بیوی سے خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

﴿وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ یعنی جن عورتوں سے تم نے نکاح کیا ان کے پہلے شوہر سے جو بیٹیاں تمہارے پرورش میں ہیں، جنہیں تم گودوں میں لیتے ہو، اور کھلاتے پلاتے ہو، ان لڑکیوں سے نکاح بھی حرام ہے، بشرطیکہ تم نے ان لڑکیوں کی ماؤں سے جماع کیا ہو۔ اگر کسی عورت سے نکاح تو کرلیا، لیکن جماع نہ کیا، پھر اسے طلاق دیدی، یا وہ مرگئی، تو اس عورت کی پہلے شوہر والی لڑکی سے نکاح جائز ہے۔

﴿فِيْ حُجُوْرِكُمْ﴾ قیدِ احترازی نہیں ہے، جس بیوی سے نکاح کرکے جماع کرلیا اس کی بیٹی سے نکاح درست نہیں ہے، اگرچہ وہ کسی دوسرے رشتہ دار کے پاس پرورش پاتی ہو، اور اس کی گود میں پلتی ہو۔

﴿وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ یعنی تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پشتوں سے ہیں، وہ بھی تم پر حرام ہیں۔ اس میں عموم ہے، حرمت کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ بیٹے نے کسی عورت سے نکاح کرلیا ہو، نکاح کے بعد جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو ہر حال میں لڑکے کے باپ پر وہ عورت حرام ہوگئی۔ اسی طرح پوتوں کی بیویوں سے بھی نکاح حرام ہے، اور رضاعی بیٹے کی بیوی سے بھی نکاح حرام ہے۔

﴿مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ کی قید کا ذکر فرما کر واضح فرمایا کہ منہ بولے بیٹے کی بیوی اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ وہ کسی صورت میں بیٹا نہیں ہوسکتا، لہٰذا اس کی بیوی سے نکاح جائز ہے، جیسے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمّ المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا، جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبنیٰ بیٹے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی مطلقہ بیوی تھیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح فوق السمٰوٰت طے ہوگیا، جیسے ارشاد ربانی ہے: ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ﴾ [الأحزاب:۳۷] (پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کرلی ہم نے اس کا آپ سے نکاح کرادیا، تاکہ (آئندہ) مسلمانوں پر کوئی تنگی نہ رہے) اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے کے بارے میں، جبکہ وہ اپنی حاجت پوری کرچکیں۔ جب دشمنانِ اسلام نے اس نکاح پر شور مچایا، تو یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

☆☆☆

فائدہ:

جس طرح منہ بولا بیٹا اصلی بیٹا نہیں ہوتا، اسی طرح منہ بولا باپ، یا منہ بولا بھائی، یا بہن یا ماں، یا بیٹی، یا پھوپھی، یا خالہ وغیرہ سب کا یہی حکم ہے، کہ اس طرح کہنے سے نہ نسب ثابت ہوتا ہے، اور نہ حرمت، اور نہ ہی محرم کے احکام ثابت ہوتے ہیں، اور نہ ہی شرعی پردہ معاف ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے ان کو ﴿مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا﴾ [المجادلة: ۲] (بہت بری اور جھوٹی بات) سے تعبیر فرما کر فتنہ وفساد کا ہمیشہ کے لئے دروازہ بند فرمایا، جیسا کہ ظاہر ہے۔

محرماتِ غیر ابدیہ کا بیان:

﴿وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ﴾ یہ بھی تم پر حرام کیا گیا کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ اپنے نکاح میں جمع کرو۔ جب ایک بہن سے کسی نے نکاح کرلیا تو جب تک اسے طلاق نہ دیدے، یا وہ فوت نہ ہوجائے، اور اس کی عدّت گزر نہ جائے، اس وقت تک اس کی کسی بہن سے نکاح نہیں ہوسکتا۔ ایک بہن کے نکاح میں ہوتے ہوئے دوسری بہن سے نکاح کرلیا تو شرعاً یہ دوسرا نکاح نہیں ہوگا، اور یہ حرام ہے۔ البتہ! یہ حرمت ابدی نہیں ہے، اگر پہلا نکاح طلاق یا فوتگی کی وجہ سے ختم ہوگیا، تو پھر کوئی حرمت نہیں ہوگی، بلکہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص نے یکے بعد دیگرے چار پانچ بہنوں سے شادی کی، لہٰذا یہ سب کچھ صرف اجتماعی صورت میں ممنوع ہے، نہ اور کچھ، جیسے "اَنْ تَجْمَعُوْا" کا کلمہ اس پر دلیل ہے۔

البتہ! جو اس سے پہلے ہوچکا وہ جہالت اور کفر کی وجہ سے تھا، اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ حضرت ضحاک بن فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دو سگی بہنیں تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ہدایت دی کہ ایک کو چھوڑ دو، ایک کو رکھو، انہوں نے ایسا ہی کیا۔ یہ صحابی فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ فارسی النسل تھے، جنہوں نے اسود عنسی مردود کو یمن میں جہنم رسید کیا۔ اسی طرح حضرت غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دس عورتیں تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ ان عورتوں میں سے چار کو رکھ لو، باقی چھوڑ دو، انہوں نے ایسا ہی کیا۔

اس مقام پر یہ مسئلہ بھی واضح ہوا کہ جس طرح دو بہنوں کو ایک مرد کے نکاح میں بیک وقت جمع نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ایک عورت اور اس کی پھوپھی اور خالہ، اور بھتیجی اور اس کی بھانجی بھی ایک مرد کے نکاح میں بیک وقت جمع نہیں ہوسکتیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کہ کسی عورت کا

اس کی پھوپھی، یا اس کی خالہ یا بھانجی اور بھتیجی کے ساتھ جمع کرنا ممنوع ہے، نہ بڑی کا چھوٹی پر، نہ چھوٹی کا بڑی پر نکاح کیا جائے۔ [أبو داؤد، ترمذي]

حضرات فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ جن دو عورتوں میں ایسا رشتہ ہو کہ ان میں سے کسی ایک کو اگر مرد فرض کیا جائے تو دونوں کا آپس میں نکاح نہ ہو سکے، ایسی دو عورتیں بھی بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس کی پوری تفصیل کتب فقہ میں دیکھ لیں۔

﴿وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ محرّمات بالسبب کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ عورتیں جو کسی مرد کے نکاح میں ہوں، اگرچہ رخصتی نہ ہوئی ہو، محض ایجاب وقبول اور نکاح ہی کافی ہے۔ ''مُحْصَنَة'' بمعنیٰ پاکدامن، اور شریف و بے گناہ کے ہیں، یہاں منکوحہ غیر ہی مراد ہے۔ یہاں تک محرّمات کا بیان ہوا۔ آگے ان عورتوں کا بیان ہے جو کہ محرّمات سے مستثنیٰ اور حلال ہیں، خواہ مِلکِ یمین کی بنیاد پر، یا نکاح و تزویج کے راستے سے، تو فرمایا:

﴿اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ ہاں! تمہارے لئے حلال ہیں وہ عورتیں جن کے مالک ہو جائیں تمہارے ہاتھ، وہ دارالحرب سے لائی ہوئیں قید شدہ عورتیں، جنہیں مال غنیمت کے طور پر مجاہدین میں تقسیم کریں، اور انہیں مالک بنائیں، وہ عورتیں اگرچہ کفار کی منکوحہ ہیں، مگر ان کا وہ نکاح ختم ہو جاتا ہے، اور یہ عورت بدونِ نکاح مجاہدین کے لئے حلال ہو جاتی ہے، استبراء کے بعد اس کے ساتھ ہمبستری کر سکتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہمبستری سے پہلے انہیں مسلمان کر دیں۔ تفصیلات کا یہ مقام نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہ سلسلہ بھی باقی نہ رہا۔ واللہ اعلم

﴿كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا نوشتہ قانون ہے، تمہارے لئے، اس پر عمل کرنا فرض ولازم ہے۔

﴿وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ﴾ بیان شدہ محرّمات کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں، مثلاً خالہ اور چچا کی لڑکی، ماموں زاد اور پھوپھی زاد بہن، یا فوت شدہ ماموں اور چچا کی بیوی، یا ماموں اور چچا کی مطلقہ بیوی وغیرہ۔ البتہ! جو عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں ان کے لئے چند شرائط و ہدایات بھی ہیں:

پہلی شرط یہ ہے: ﴿اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ﴾، یہ پہلی شرط طلب کی ہے۔

دوسری شرط حقِ مہر کی ہے۔

تیسری شرط احصان و پاکدامنی کی ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ شہوت رانی، اور دوسرے اغراض سے کنارہ کشی ہو۔

پانچویں شرط سورۂ مائدہ میں آنے والی ہے۔ ﴿وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ﴾ [المائدۃ:۵] محض دوستی اور آشنائی ''داشتہ'' کے طور پر نہ ہو، جیسا کہ دوسری گمراہ اقوام کا طور وطریق ہے، بلکہ باقاعدہ علی الاعلان ایجاب وقبول ہو، مجمع عام میں ہو، اور غیر موقّت ہو، (شیعوں کی متعہ اور داشتہ جیسی نہ ہو) جس میں کتاب وسنّت کے احکام کی مکمل پیروی ہو۔

﴿مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ﴾ کہ مال کے ذریعہ جو عورت تلاش کی جائے اس سے عفت وعصمت کو باقی رکھنا، اور پاکدامن رہنا مقصود ہو، محض شہوت رانی پیش نظر نہ ہو۔ مؤمن کے ہر عمل میں للّٰہیت اور جذبۂ ایمانی کار فرما ہوتا ہے۔ نکاح ایک خالص عبادت ہے، چاہئے کہ اس کا مقصد تکثیرِ نسل اور نفس ونظر کی حفاظت اور عفت وعصمت کے ساتھ زندگی گزارنا ہو۔ لوگ زنا کرکے بہت مال خرچ کرتے ہیں، مگر دین وایمان اور اخلاق سارے تباہ کرجاتے ہیں، پس کیا اچھا اور کتنا فائدہ مند وباذوق ہوگا کہ اسی مال کو نکاح جیسے کارخیر میں لگایا جائے، اور ایک رفیقۂ حیات کو اپنے تصرف میں لاکر اس کے ساتھ سکون وخوشی کی زندگی کے ساتھ اولاد صالح کی تسکین ولطف حاصل کیا جائے فرمایا: ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ [الروم:۲۱] (اور اللہ نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھی ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائنات کی تمام مخلوقات پر فضیلت وبرتری عطا کی ہے۔ نکاح جیسی نعمت سے اُسے نوازا ہے، اسے قبائل واقوام پر تقسیم فرماکر اس کی شناخت کو متعارف کرایا ہے، اور اس کو اپنی نسل جاری رکھنے کے لئے نسب وحسب کی کرامت عطا کی ہوئی ہے۔ پس اگر یہ ناداں وبے شعور ہوکر جس طرح جانوروں کی نسل نہیں ہوتی، یہ اپنی نسل وشناخت کو تباہ کردے، اور بامِ عروج سے پستی میں گرکر گدھے، کتے، اور گائے کی طرح بن جائے، تو یہ اس کا اپنا قصور ہوگا، جیسے یورپ کا طرزِ زندگی ہمارے سامنے ہے، کہ لاکھوں انسانوں میں کوئی حلالی نہیں ہوتا۔ وہاں کے سارے لوگ حرامی ہی ہوتے ہیں، جہاں شادیوں پر پابندی ہوتی ہے، اور زنا کی کھلی اجازت ہے، اور ہم جنس پرستی کے دلدل میں غرق ہیں۔

اس آیت کریمہ میں متعہ کی حرمت کی طرف بھی اشارہ ہے، جس کا بعض گمراہ فرقوں میں رواج ہے۔ متعہ ایک قسم کا ماڈل زنا ہے، جو مخصوص وقت کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے عفت وعصمت کیا حاصل ہو، بلکہ انسانی شرافت وپاکیزگی تباہ ہوکر ختم ہوجاتی ہے۔ سورۂ مؤمنون کی آیت: ﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾

[المؤمنون: ۷] (اور جس نے ان کے علاوہ کو تلاش کیا تو وہ (حد سے) تجاوز کرنے والے ہیں) اسی حرام متعہ کی حرمت کے بارے میں ہے، کہ اپنی شرمگاہوں کو صرف بیویوں اور باندیوں میں استعمال کرنا جائز ہے، ان کے علاوہ کوئی جگہ تلاش کرنے والا حلال کی حدود سے آگے بڑھ جانے والا ہے۔

جو لوگ متعہ کرتے ہیں، وہ لوگ بھی متعہ والی عورت کو منکوحہ بیوی کی حیثیت نہیں دیتے، نہ اس کو بیوی شمار کرتے ہیں، اور نہ اس کو میراث دیتے ہیں، اور نہ اس سے پیدا شدہ بچے کو اپنا بچہ سمجھتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک بھی ان کا شمار ازواج میں نہیں ہے۔

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ سو ان میں سے جس عورت سے نفع حاصل کرو، تو ان کے مہر دے دو، جو مقرر ہو چکے ہیں۔ اس آیت میں ادائیگی مہر کی تاکید ہے، نکاح کرنے کے بعد خلوتِ صحیحہ ہو گئی تو جو مہر مقرر ہوا تھا شوہر کو ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور اگر خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دیدی تو نصف مہر ادا کرنا واجب ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو میاں بیوی بن کر رہتے سہتے ہیں، لیکن بیوی کے مہر کی ادائیگی کی فکر نہیں کرتے، اور بیوی لحاظ میں شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کچھ نہیں کہتی، کئی سال اسی طرح گزر جاتے ہیں۔ آیت کریمہ نے زوردار الفاظ میں واضح فرمایا کہ شوہر کو ادائیگی مہر میں غفلت و بے اعتنائی نہیں کرنی چاہئے، اور بیوی کے مطالبہ کے بغیر مہر ادا کرنا لازم ہے، مزید بیوی کی شرافت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ﴾ البتہ! اگر میاں بیوی بطیبِ خاطر دوستی ومحبت کی بنیاد پر ہمدردی ورواداری کے ساتھ کچھ اس طرح فیصلہ کریں کہ شوہر اپنی طرف سے مہر میں کچھ اضافہ کرے، یا بیوی پورا مہر، یا اس کا کچھ حصہ معاف کردے، تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہوگا، بلکہ حسنِ معاشرت کی طرف اچھا اقدام ہوگا، اور مزید اُلفت ومحبت میں اضافہ وزیادتی کا سبب ہوگا۔ اکثر اوقات میں ایسا کرنا ہر دو جانب کے لئے فائدہ مند رہا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ بیشک اللہ تعالیٰ علیم ہے، حکیم ہے۔ اس نے اپنے علم وحکمت کے مطابق اپنے بندوں کے لئے احکام مقرر فرمائے ہیں۔ اس کے تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں، اس کے باوجود اگر کوئی اس کے حکموں کی خلاف ورزی کرے گا علم وحکمت کے موافق سزا پائے گا۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: اور تم میں سے جس شخص کو اس کا مقدور نہ ہو کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرے، تو آپس کی مسلمان باندیوں سے نکاح کر لے، جو تمہاری مملوکہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے تمہارے ایمان کو، تم سب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہو، سو تم مذکورہ باندیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کر لو، اور انہیں ان کے مہر بہتر طریقہ پر دے دو، یہ مذکورہ باندیاں (یعنی منکوحہ باندیاں) نہ علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں، اور نہ خفیہ طریقہ پر دوست بنانے والی ہوں، پس جب وہ نکاح میں آجائیں تو اگر کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں تو ان پر اس کی آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں پر ہے، یہ اس کے لئے ہے جو تم میں سے زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رکھتا ہو، اور یہ بات کہ صبر کرو (باندیوں سے نکاح نہ کرو) بہتر ہے تمہارے لئے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہے، رحیم ہے ﴿۲۵﴾

معارف ومنازل

پہلے گزر چکا کہ نکاح ایک عبادت ہے، نکاح کا مقصد عفت اور طلبِ ولد ہے، نکاح کوئی شہوت رانی کے لئے نہیں ہے۔ نکاح کے لئے بہتر سے بہتر عورت کا انتخاب ضروری ہے، آزاد، حرّہ، اور مؤمنہ عورت اگرچہ حق مہر، نان ونفقہ اس کا زیادہ ہے، مگر دیگر صفات کے اعتبار سے باندیوں پر اس کی برتری مسلّم ہے۔ باندیوں کے نان ونفقہ اور مہر اگرچہ کم ہے، مگر ان کے دیگر نقائص بہت زیادہ ہیں۔

اگر کسی کے پاس استطاعت ہو تو آزاد مؤمنہ عورتوں سے شادی بہتر ہے۔ البتہ! اگر استطاعت کی کمی ہو، اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، تو بامرِ مجبوری خانہ پُری کر کے اگر باندیوں سے نکاح کر لے تو اس کی اجازت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اپنی مملوکہ باندی سے تو بلا نکاح جماع جائز ہے، اور جو بچہ پیدا ہوگا وہ حرّ اور ثابت النسب ہی ہوگا، کیونکہ بچے کا باپ حرّ ہے، اور باندی اس کی اپنی ملکیت ہے۔ اسی وجہ سے اپنی باندی سے نکاح درست

نہیں، اور نہ ہی اس کی حاجت ہے۔

البتہ! اگر کوئی دوسرا مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی باندی سے نکاح کرنا چاہے، تو یہ نکاح درست ہے، اور اس نکاح کی صحت کے لئے باندی کے مالک کی اجازت شرط ہے، اور جو مہر مقرر کر دیا جائے وہ بلا چون و چرا ادا کر دیا جائے۔ اس مہر کا مالک اس باندی کا آقا ہی ہوگا، اور باندی بدستور مالک کی ملکیت میں رہے گی، اور مالک کی خدمت کرتی رہے گی۔

البتہ! نکاح کی وجہ سے مالک کو کسی ہمبستری کی اجازت نہیں ہوگی۔ اگر باندی کی کوئی اولاد ہوگی تو وہ بھی مالک کا مملوک شمار ہوگی، نہ کہ باپ کا۔ باندی کا شوہر محض برائے نام ہی ہوگا، وہ اپنی منکوحہ باندی پر کسی قسم کا تصرف نہیں رکھ سکتا، سوائے مجامعت کے، اس لئے فرمایا:

﴿وَمَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ﴾ مطلب یہ ہے کہ جو شخص آزاد عورت سے نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو، وہ باندی سے نکاح نہ کرے، چونکہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مفہوم شرط اور مفہوم وصف معتبر ہے، اس لئے ان کے نزدیک آزاد، مسلمان عورت سے نکاح کرنے کی قدرت ہوتے ہوئے کسی بھی باندی سے نکاح کرنا درست نہیں۔ اگر آزاد، مسلمان عورت سے نکاح کرنے کی قدرت نہ ہو، تو پھر ان کے نزدیک باندی سے نکاح کرنا درست ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آزاد عورت سے نکاح کرنے کی قدرت ہوتے ہوئے بھی باندی سے نکاح کرنا درست ہے، بشرطیکہ وہ باندی کافرہ نہ ہو، مسلمہ یا کتابیہ ہو۔ مگر ایسا کرنا مکروہ ضرور ہے، کیونکہ باندی کے نکاح کے فوائد نہایت کم اور کمزور ہیں، جبکہ نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ تو اگر آزاد، مؤمنہ عورت سے نکاح کی قدرت ہو تو باندی سے نکاح نہ کرے، اور اگر قدرت کے باوجود باندی سے نکاح کرے تو مؤمنہ باندی تلاش کرے۔ [البحر الرائق، مظهري]

دراصل بات یہ ہے کہ شادی کا مقصد پاکدامن رہنا، اور اولاد طلب کرنا ہے۔ اور اولاد کی تربیت میں ماؤں کا بہت زیادہ دخل ہوتا ہے، جس طرح بچہ ماں کی زبان سیکھتا ہے (اسی لئے اس کی زبان کو مادری زبان کہتے ہیں) اسی طرح سے دین و ایمان، اخلاق و آداب، اور عادات و اطوار بھی ماں سے سیکھتا ہے۔ اوّل تو یہی کوشش رہے کہ آزاد

مسلمان عورت سے نکاح کیا جائے، پھر مسلمان عورتیں اکثر و بیشتر صالحہ، دیندار، فرمانبردار، اور مخلص و مشفق ہوا کرتی ہیں، جبکہ باندیوں میں یہ صفات اکثر نہیں ہوتیں، اِلّا ماشاء اللہ۔ اور یہ بات تجربہ کے ساتھ ثابت اور واضح ہے کہ حرّہ مؤمنہ عورت شوہر اور اپنے بچوں کے لئے ایک نعمت عظیمہ سے کم نہیں ہے، جبکہ باندی اس مقام کو ہرگز حاصل نہیں کر پاتی۔

زن خوب فرمان برو پارسا ☆ کند مرد درویش را بادشاہ

(سعدیؒ)

﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمہارے ایمان کا بخوبی علم ہے، اور ایمان ہی وجہ فضیلت و برتری ہے، بعض مرتبہ مؤمنہ باندی مرتبہ ایمانیہ میں آزاد عورت کے مقابلہ میں بڑھی ہوئی ہوتی ہے، اس کے نکاح میں شرم نہ کریں، اور اس کے آقا و مالک کی اجازت سے اس سے نکاح کریں، اور جنسِ انسانیت کے اعتبار سے سب حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کی اولاد ہیں، اگر کسی نے باندی سے نکاح کیا تو اپنی جنس سے نکاح کیا، شاذ و نادر ایسا ہوا بھی کہ باندیوں کو آزاد عورتوں پر برتری حاصل ہوئی۔

فائدہ:

مدینہ طیبہ کے فقہائے سبعہ میں سے حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر، حضرت عروہ بن زبیر، اور حضرت قاسم بن محمد ابن ابی بکر رضوان اللہ علیہم اجمعین تینوں کی مائیں باندیاں ہیں، آپ اندازہ لگائیں کہ اللہ تعالیٰ نے باندیوں سے کیسے کیسے علماء و فقہاء پیدا کئے۔ [البدایۃ والنہایۃ]

﴿مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ﴾ یعنی مؤمنہ باندیوں سے نکاح کرلو جو پاکدامن، نیک سیرت ہوں، علانیہ بدکاری کرنے والی نہ ہوں، اسی طرح خفیہ طریقہ پر آشنا اور دوست تلاش کرنے والی نہ ہوں۔ عورت آزاد ہو یا باندی اس کی بنیادی فضیلت و برتری ایمان کے بعد طہارت و تقویٰ اور پاکدامنی ہی میں ہے۔ باندیاں اکثر بے حجاب ہوتی ہیں، اور مردوں تک کی خدمت کرتی ہیں، بازاروں میں خرید و فروخت کے لئے جاتی ہیں، اس لئے آیت کریمہ نے یہ تینوں اوصاف ذکر کر کے لوگوں کو خبردار اور تنبیہ کی تاکہ احتیاط کریں۔

﴿فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾

مطلب یہ ہے کہ جب باندیاں نکاح میں آجائیں اور اس کے بعد اگر (العیاذ باللہ) بدکاری کا ارتکاب کریں، تو ان کو

آدھی سزا ملے گی بمقابلہ اس سزا کے جو آزاد عورتوں کے لئے مقرر ہے، اگر وہ بدکاری کر بیٹھیں۔

یہاں آزاد عورتوں سے غیر شادی شدہ آزاد عورتیں مراد ہیں، غیر شادی شدہ آزاد عورت اگر زنا کرے تو اس کی سزا سو کوڑے ہیں، اس اعتبار سے اگر باندی زنا کرے تو اس کو پچاس کوڑوں کی سزا ملے گی۔ شادی شدہ مرد یا آزاد عورت اگر زنا کرے تو اس کی سزا رجم ہے، یعنی پتھروں سے مار مار کر ہلاک کرنا ہے، چونکہ رجم میں نصف نہیں ہوسکتی، اس لئے باندی یا غلام اگر شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اس سے زنا سرزد ہو جائے تو پچاس کوڑے ہی لگیں گے۔ تفصیل سورۂ نور کے پہلے رکوع میں اِن شاء اللہ آنے والی ہے۔ آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ فرمایا: باندیوں سے نکاح کرنا اس شخص کے لئے ہے جو زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رکھتا ہو۔ البتہ! اگر صبر کر کے باندیوں سے نکاح نہ کیا جائے تو بہتر ہے، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے اپنے بندوں پر مہربان اور درگزر کرنے والا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۚ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ
اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ بیان فرمائے تمہارے لئے، اور تم کو بتلا دے طریقے ان لوگوں کے جو تم سے پہلے تھے، اور یہ کہ وہ تمہاری توبہ قبول فرمائے، اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے، حکمت والا ہے ﴿۲۶﴾ اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول فرمائے، اور جو لوگ خواہشات نفسانیہ کے پیچھے چلتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ ﴿۲۷﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ تخفیف کا ارادہ فرماتا ہے، اور انسان ضعیف و کمزور پیدا کیا گیا ہے ﴿۲۸﴾

معارف و منازل

نکاح کے بہت سے احکام بیان فرمانے کے بعد ان آیات میں مزید ذرّہ نوازی فرما کر ایک دو نعمتوں کا تذکرہ فرما رہے ہیں، اور دشمنانِ اسلام باطل فرقوں کے مکر و خیانت اور برے ارادوں پر تنبیہ فرما رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ واضح طور پر خوب کھول کر تمہیں احکام بتاتے ہیں۔ اور انبیاء کرام علیہم السلام اور صالحین عظام

جو پہلے گزرے ہیں ان کے طریق و آداب تمہیں سمجھا رہے ہیں۔ تم یہ نہ سمجھو کہ یہ حرام وحلال کی تفصیلات صرف ہمارے ہی لئے ہیں، بلکہ تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں ان کو بھی اس طرح کے احکام، بلکہ ان سے بھی کچھ سخت احکام بتائے گئے تھے، جنہوں نے عمل کر کے قربِ الٰہی حاصل کیا، اور جو لوگ شہوتوں اور شیطانی اعمال کے متبع، زنا کار، بداعمال، بدعقیدہ، اور بد خلاق قومیں ہیں، مثلاً یہود، نصاریٰ، مجوس، فارسی، ہنود، اور صابی خواہ کوئی بھی باطل فرقہ ہو، وہ حرام وحلال، جائز وناجائز کی پابندیوں سے مادر پدر آزاد ہیں، وہ جس طرح خود گمراہ ہیں تمہیں بھی راہِ حق اور صراطِ مستقیم سے ہٹانے اور دور کرنے کی کوششوں میں مسلسل لگے ہوئے ہیں۔ وہ یہی چاہتے ہیں کہ تمہیں کسی بھی طرح راہ حق سے ہٹا کر اپنے جیسے گمراہ بنائیں، ''فَتَكُونُوا مِثْلَهُمْ'' کہ تم بھی ان کی طرح بے راہ بن جاؤ۔ لہٰذا تم اپنے احکام کی مکمل پابندی کرتے ہوئے ان سے ہوشیار رہو۔

ان میں سے بعض نے محرّمات ابدیہ کے ساتھ نکاح کو جائز رکھا، اور بعض تو وہ ہیں کہ بالکل نکاح کا سلسلہ ختم کر کے زنا کو معاشرہ کا عام مشغلہ بنایا، محرّمات وغیر محرّمات کی تفریق ہی ختم کردی۔ مرد مرد کے ساتھ، عورت عورت کے ساتھ جس طرح چاہیں جنسی خواہشات پوری کریں کھلی چھٹی ہے، اور ایک عورت جتنا چاہے یار و آشنا بنائے آزادی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عورت کا مقام معاشرہ میں متاعِ مشترک کا ہے، جس سے ہر شخص کو تسکین شہوت کا پورا حق حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، آج اسلام کا کلمہ پڑھنے والے بعض ضعیف الایمان لوگ جو ان ملحدوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، یا تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کی باتوں میں آ کر اپنے دین کو (العیاذباللہ) فرسودہ، یا ناقابلِ عمل خیال کرنے لگتے ہیں، اور اس بے حیا معاشرہ کو حقیقت کے برخلاف انسانی فطرت تصور کرتے ہیں، اور اس کافرانہ آزادی اور خودسری کو ترقی وتہذیب کا نام دیتے ہیں، اور نادانستہ طور پر اس خام خیالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جیسے یہ لوگ ماڈرن نظریات کے حامی ہیں کاش ہمارا دین بھی اس کی اجازت دیتا۔ (العیاذباللہ)

یہ بیوقوف یہ سمجھتے ہیں کہ اصلی ترقی اسی بے حیائی کی پیداوار ہے، اور یہی انسانی ترقی بھی ہے، کانے کی نظر میں ایک چیز دو معلوم ہوتی ہے، جبکہ اسلامی اصولوں کی رو سے یہ کوئی ترقی نہیں، بلکہ سراسر تنزل اور پستی ہے، کہ اشرف المخلوقات انسان اپنے عروج و بلندی سے گر کر جانوروں میں شامل ہو گیا، بلکہ ایک درجہ جانوروں سے بھی نیچے گر گیا، گائے بھینس خاص کر اونٹ جیسے جانور اپنی ماں اور بہن کے ساتھ جفتی نہیں کرتے، لوگ ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر

ان کو جفتی کراتے ہیں، جب آنکھوں کی پٹی کھول دیتے ہیں اگر نر اونٹ یا نر بھینس کو معلوم ہوا تو اپنا سر دیوار یا درخت سے ٹکرا کر خودکشی کرے گا۔ کتنا برگشتہ اور ظالم ہے وہ انسان جسے اونٹ اور بھینس جتنا شعور نہیں ہے؟

اس لئے ربّ العزّت سبحانہ نے تنبیہ فرمائی ہے کہ تم لوگ ایسے بدطینت، بے شرم و بے حیا لوگوں کے طور و طریق اور کردار واطوار سے مکمل اجتناب کرو، اور ان کی تہذیب سے دور رہو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف انابت اور رجوع کرو، توبہ کرو، بیشک وہ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرنے والا غفور ورحیم ہے، اور علیم وحکیم ہے۔ وہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے، تمہیں جو احکام وہدایات دیتا ہے وہ سب حکمت کے تحت، جس میں تمہاری دنیوی واخروی ہر قسم کی فوز و فلاح مضمر ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے، تمہاری مغفرت کا فیصلہ فرمائے، اسی لیے تمہارے واسطے حلال وحرام کے احکام جاری فرمائے، تاکہ تم اس کے قرب ورضا تک رسائی حاصل کرو، مگر یہ ہوشیار رہو کہ تمہارے ربّ کی خیر خواہی کے خلاف تمہارے دشمن اور بدخواہوں نے جو محاذ کھولا ہے، اس سے آگاہ رہو، اور بچو وہ یہ ہے:

﴿وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا﴾ وہ لوگ جو نفسانی خواہشات کے بندے اور پجاری ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم کو راہِ حق سے ہٹا کر پھر گمراہی کی طرف پھیر دیں، اور حق سے دور پھینک دیں۔ موجودہ وقت میں مغرب جو کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ہے، سینکڑوں این جی اوز کے ذریعہ مسلمانوں کی کردارکشی میں چاق وچوبند ہے، اور پوری مادی قوت کے ساتھ اسلامی اقدار کے خلاف نبرد آزما ہے۔ آگے فرمایا:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ تم سے تخفیف کرنا چاہتا ہے، وہ تمہاری خواہشات کو یک لخت ختم نہیں کرنا چاہتا، تاکہ دشمن کو اسی بہانہ تمہاری صفوں میں گھسنے کا موقع نہ ملے، اور وہ تمہیں تمہاری شریعت سے دور رکھنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری خواہشات کے لئے ضوابط وحدود جاری کر کے تمہیں ان پر چلنے کے حکم کے ساتھ تمہارے لئے تخفیف وآسانی کا حکم جاری فرمایا، اس لئے کہ تم بنسبت دوسرے اقوام کے بدنی، جسمانی، اور قلبی قوتوں کے اعتبار سے کمزور ہو۔ (كما ورد في حديث المعراج)۔ اور جوں ہی قیامت قریب آئے گی تمہارا ضعف مزید نمایاں ہوتا رہے گا۔

گزشتہ امتوں پر جو اعمال واحکام شاقہ کا التزام رہا وہ سب اس امت پر سے اٹھائے گئے، اور معاف

ہوئے، جس کا بیان سورۂ انفال میں آئے گا۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔ فرمایا:

﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ یعنی انسان پیدائشی طور پر ضعیف و کمزور ہے، تنگ دل بھی ہے، اور بے حوصلہ و بے صبر بھی ہے۔ اسی وجہ سے اس کے لئے اعمالِ شاقہ کا التزام نامناسب رہا، اور مہربان ارحم الراحمین نے اس پر آسانی فرمائی، حتیٰ کہ اسے باندیوں کے ساتھ نکاح کرنے کی بھی اجازت دی، تا کہ وہ ہر قسم کے گناہوں سے بچنے کی تدبیر کر سکے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مالوں کو ناحق طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ کوئی تجارت آپس کی رضامندی سے ہو۔ اور مت قتل کرو اپنی جانوں کو، بیشک اللہ تعالیٰ تم پر بڑا مہربان ہے ﴿۲۹﴾ اور جو شخص زیادتی اور ظلم اختیار کرے گا سو عنقریب ہم اُسے دوزخ میں داخل کر دیں گے، اور یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے ﴿۳۰﴾

معارف و منازل

ابتدائے سورت میں تخلیق انسانی اور حقوق کا بیان ہوا، پھر جبری ملک وراثت اور یتیموں کے حقوق بیان ہوئے، معاملات کا اہم رکن نکاح کے حقوق و مسائل بیان فرما کر محرمات و حلال عورتوں کے احکام کے بیان کے بعد دیگر معاملات بیع و اموال کے بیان کے ساتھ نفس انسانی کی حفاظت و تحفظ کا بیان شروع فرمایا، اور آئندہ معاصی و گناہوں سے اجتناب کا تذکرہ فرما کر ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ﴾ (الآیۃ) آیت کریمہ کا پہلا حصہ اس اہم بات پر مشتمل ہے، کہ ناجائز ذرائع سے ایک دوسرے کا مال مت کھاؤ، خواہ رضامندی سے ہو یا جبر و خیانت کے ساتھ، یعنی غیر شرعی طور پر کسی کا مال نہ کھاؤ، اور نہ ہی کسی کے مال میں، یا خود اپنے مال میں غیر شرعی تصرف کرو۔

آیت کریمہ کا دوسرا حصہ لین دین بیع و شرا کے اصول شرعیہ کے بیان میں ہے، کہ جتنے بھی حقوقِ مالیہ کی

اقسام ہیں ان میں اصول شرعیہ کے تحت کاروبار جاری رکھو۔آیت کریمہ میں تجارت کاذکرخصوصیت کے ساتھ اس لئے ہے کہ اگرچہ تجارت کے علاوہ حصولِ مال کے دیگر ذرائع بھی موجود ہیں،مگرتجارت اُن سارے ذرائع پر محیط بھی ہے،اوراس کی اہمیت ایک اعتبار سے عمومی اور بین الاقوامی بھی ہے۔ایک اندازے کے مطابق پوری دنیا میں کُل مالی تصرف کا(۸۰)اسی فیصد حصہ تجارت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے،اور باقی (۲۰) بیس فیصد دیگر ذرائع سے۔

تجارت انسانی تمدن میں سب سے بڑا ذریعۂ مبادلہ ہے۔تجارتی لین دین مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک علاقوں پر محیط وحاوی ہے۔ایک ملک سے دوسرے ملک تک،ایک خطہ سے دوسرے خطے تک،ایک شہر سے دوسرے شہر تک،الغرض مختلف مقامات سے دوسرے مقامات تک تجارت کا سلسلہ مختلف ذرائع سے شب وروز بغیر کسی انقطاع کے جاری رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح نکاح کے متعلق پاکیزہ اصول وقوانین وضع فرمائے ہیں،اسی طرح اس عمومی تجارت کے لئے زرّین وگرانقدر احکامات جاری فرمائے ہیں۔اگرلوگ ان دونوں معاملات میں اسلامی اصولوں پر کاربند ہوکر عمل کریں تو یقیناً دنیا امن وسلامتی اور خوشحالی کا گہوارہ بن جائے،اور انسانی معاشرہ جنت نظیر بن جائے۔کسی کو کسی سے نہ تکلیف پہنچے،نہ شکایت،جیسے قرونِ اولیٰ میں لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا،اور نظارہ دیکھا،کیونکہ ناجائز اورغیر شرعی تجارت وتصرف سے شرّ وفساد اور بدامنی پھیلنے،اور بے اعتمادی کا خطرہ یقینی ہوتا ہے۔حرص،لالچ،طمع،خودغرضی،نفس پرستی،اور تعیّش سب ناجائز اورغیر شرعی معاشرے کی پیداوار وثمرہ ہیں۔

اب بھی دنیا کے جن ممالک میں اگر جزوی طور پر شرعی احکام جاری ہیں تو وہاں نسبتاً فتنہ وفساد کم ہیں،اور دبے ہوئے ہیں،اور حلّت وحرمت کی واضح پہچان موجود ہے۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل غیر شرعی طریقہ پر نہ کھاؤ۔اس باطل کے اندر چوری،خیانت،دھوکہ،ڈکیتی،سود،قمار،جوا،لاٹری،اور رشوت وغیرہ سب آجاتے ہیں۔بیوعِ فاسدہ،غیر شرعی لین دین یہ سارے آجاتے ہیں۔اسی طرح شراب،مردار،مجسمے اور تصاویر،آلات لہو ولعب،غیر شرعی رسوم،کھیل کود،وغیرہ سارے آجاتے ہیں،اور یہ سب باطل اورغیر شرعی اور ممنوع وحرام ہیں،کیونکہ لفظِ باطل بہت عام ہے،مال حاصل کرنے کا ہر وہ طریقہ جو شرعاً جائز نہ ہو وہ سب باطل کے عموم میں داخل ہے۔

﴿اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ﴾ مگر وہ مال جو کہ تجارت کے راستے شرعی طریقہ پر

باہمی رضامندی کے ساتھ ہو، یعنی خریدار اور صاحبِ مال دونوں کسی جائز معاملہ پر راضی ہوجائیں، اور یہ رضامندی خالص خوشدلی کے ساتھ ہو۔

کتبِ فقہ میں بیع کی تعریف جو لکھی ہوئی ہے وہ یہ ہے: "مُبَادَلَةُ الْمَالِ بِالْمَالِ بِالتَّرَاضِیْ"۔ یعنی مال کا تبادلہ مال کے ساتھ ہو، فریقین اس عقد پر راضی ہوں۔ فقہاء و علماء نے کہا ہے کہ باہمی رضامندی اسی صورت میں روا ہے جب کہ تجارت شرعی حدود کے اندر ہو۔ اگر کاروبار سودی ہو، یا رشوت کا معاملہ ہو، تو ایسی صورت میں فریقین کی رضامندی کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، کیونکہ لوگوں کی رضامندی سے اللہ تعالیٰ کا حرام کیا ہوا مال و معاملہ ہرگز جائز نہیں ہوسکتا۔ بائع و مشتری کیا، دنیا کے سارے دانشور و فیلسوف کسی حرام کو حلال یا کسی حلال کو حرام نہیں کرسکتے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ کسی مسلمان کا مال اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ بطیبِ خاطر خود اس کی اجازت نہ دے۔ [أحکام القرآن، أبو داؤد]

فائدہ:

کرایہ پر مکان یا دکان لینا، اور دینا بھی ایک قسم کی تجارت ہے، اس میں بھی باہمی رضامندی شرط ہے۔ بہت سے لوگ کسی کے مکان یا دکان کو خالی دیکھ کر قبضہ کرلیتے ہیں، پھر صاحبِ مکان کو مجبور کرتے ہیں کہ کرایہ لے لو، اگر وہ کرایہ لینا منظور کرے تو اپنا منہ بولا کرایہ دینے پر مجبور کرتے ہیں، وہ مجبور ہوکر بددلی کے ساتھ تھوڑا کرایہ منظور کرلیتا ہے۔ یہ بھی حرام ہے۔ اور بعض لوگ حکومتوں کے غیر شرعی قانون کی آڑ لیتے ہیں، حکومتوں کا قانون ہے کہ کرایہ دار سے مکان یا دکان خالی نہیں کراسکتے، کرایہ بھی نہیں بڑھا سکتے۔ اگر خواہ مخواہ مالک مکان یا دکان کرایہ دار کو کہے کہ میرا مکان یا دکان خالی کردے، تو یہ اس وقت ممکن ہوگا جبکہ مالک مکان ہزاروں یا لاکھوں روپیہ کرایہ دار کو ادا کرے، تب کرایہ دار مکان خالی کرنے پر رضامند ہوجائے۔

بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کرایہ دار کرایہ کے مکان یا دکان کو آگے منافع پر دوسروں کو کرایہ پر دیتا ہے، مالک مکان دیکھتے ہوئے کچھ نہیں کرسکتا۔ یہ سلسلہ کئی کرایہ داروں تک چلتا رہتا ہے۔ یہ سراسر ظلم اور حرام ہے۔ اس میں اور چوری ڈکیتی میں کوئی فرق نہیں، ایسا کام مسلمان کے لئے بدترین خیانت اور جرم ہے، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی عنایات و بخشش سے محروم رہیں گے، اور جہنم میں جائیں گے۔

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ اپنی جانوں کو قتل نہ کرو۔ اس کی تفسیر میں بعض مفسرین نے یوں فرمایا ہے کہ

حلال کو چھوڑ کر حرام مال کھا کر اپنی جانوں کو قتل و برباد نہ کرو، کیونکہ آخرت کا عذاب دنیاوی قتل کے عذاب اور اس کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہے۔ اور بعض حضرات نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: وَ لَا یَقْتُلْ بَعْضُکُمْ بَعْضًا، کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس میں خود کشی کی ممانعت ہے۔ [بغوي] چونکہ الفاظ میں عموم ہے، اس لئے آیت کا مفہوم تینوں معانی کو شامل ہے۔

سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایک وقت ایسا آئے گا کہ علم کی قلت اور جہالت کی کثرت ہوگی، مرد کم ہوں گے، عورتیں زیادہ اور قتل و قتال کا بازار گرم ہوگا''۔ [متفق عليه] آج وہی زمانہ آیا ہوا ہے، بات بات پر لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں، ایک ہی دن لوگ سینکڑوں کی تعداد میں بلا وجہ قتل ہو رہے ہیں۔ گزشتہ زمانوں میں جتنے لوگ سالوں میں قتل ہوتے تھے اب گھنٹوں میں اسی کے برابر قتل ہو رہے ہیں۔ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان کا قتل پوری دنیا کے زوال سے بھاری ہے''۔ [ترمذي، ابن ماجة]

اور یہ واضح ہو کہ انسان کی جان اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، کوئی شخص اپنی جان یا اپنی اولاد کی جان کا ہرگز مالک نہیں، پس کسی کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی بھی طرح سے خود کشی کر کے اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں دخل اندازی کرے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کہ جس شخص نے پہاڑ سے گر کر خود کشی کر لی وہ دوزخ کی آگ میں ہوگا، ہمیشہ ہمیشہ اس میں چڑھتا اور گرتا رہے گا، اور جس شخص نے زہر پی کر خود کشی کر لی اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا، دوزخ کی آگ میں وہ ہمیشہ ہمیشہ اس کو پیتا رہے گا، اور جس شخص نے کسی لوہے کی چیز سے خود کشی کر لی اس کا وہ لوہا اس کے ہاتھ میں ہوگا، دوزخ کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ اس لوہے کو اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا۔ [بخاري]

دنیا کی مصیبتوں سے تنگ آ کر بعض لوگ خود کشی کر لیتے ہیں، اور بعض ناعاقبت اندیش کالجوں، سکولوں کے طلباء امتحان میں فیل ہو کر اکثر ایسے غلط اقدام کرتے ہیں، خصوصاً ہندوستان میں یہ بہت بری عادت ہے، اور سراسر حماقت و نادانی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ آخرت کا عذاب دنیوی تکلیف سے بہت ہی زیادہ اور ناقابل برداشت ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا﴾ بیشک اللہ تعالیٰ تم پر بہت مہربان ہے، کہ تمہیں حلال و حرام کے قواعد و احکام بتلا دیے، اور جان و مال کی حفاظت کے قوانین مرحمت فرمائے، جن پر عمل کرنے سے تمہیں دنیوی سکون و امن اور اخروی سعادت حاصل ہو۔

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا﴾ جو شخص زیادتی وسرکشی اور ظلم کے طور پر لوگوں کے مال پر قبضہ کرے، اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکام کی خلاف ورزی کرے، حلال وحرام کی حدود کو نظر انداز کر کے حدود اللہ سے آگے نکلنے کی کوشش کرے، یا ظلم وتعدّی کے ساتھ قتل وقتال جیسے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرے، یا خود اپنی جان کا دشمن بن کر خودکشی کرلے تو ہم اس کو دوزخ میں داخل کریں گے۔

﴿وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا﴾ مجرم وظالم کو دوزخ میں داخل کرنا، اور جہنم کی سزا دینا اللہ تعالیٰ کے لئے بڑا آسان ہے، وہ ذات پاک ہر چیز پر قادر وتوانا ہے، نہ اس کو کوئی عاجز کرسکتا ہے، اور نہ اس کے حکم کو کوئی ٹال سکتا ہے۔ پس تمہارے لئے ایک ہی سبیل ہے، اور وہی سببِ نجات وفلاح ہے، کہ اس کے احکام پر عمل کرو، اور خلاف ورزی سے بچو، فرمانبردار بنو۔

اللّٰهم لک الحمد کما ینبغي لجلال وجهک وعظیم سلطانک، لا إله إلا أنتَ فاغفر لنا، وارحمنا، وأدخِلنا في جنتک، وأجِرنا من سخطک وعِقابک۔ اٰمین

إِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

ترجمہ: اگر تم بچتے رہو گے ان بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تمہیں منع کیا جارہا ہے، تو ہم معاف کردیں گے تم سے چھوٹے گناہ تمہارے، اور داخل کریں گے تم کو عزّت کے مقام میں ﴿۳۱﴾

معارف ومنازل

ربطِ آیات:

گزشتہ آیات میں چند بڑے بڑے گناہوں کا ذکر اور ان میں مبتلا ہونے والوں پر شدید عذاب کا بیان تھا، ان آیات میں ترہیب کے بعد ایک خاص ترغیب کا بیان ہے، کہ اگر تم ان بڑے گناہوں سے کلّی اجتناب کرو گے تو ہم تمہارے سارے چھوٹے گناہ معاف کردیں گے، اور عزّت کے مقام جنت کے اعلیٰ درجات میں تمہیں داخل کریں گے۔

گناہوں کی حقیقت:

گناہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو۔ اس کی ضد ہے نیکی، اور حسنات اس اعتبار سے اس میں چھوٹے

بڑے کا اسی طرح فرق ملحوظ ہے جس طرح حسنات میں چھوٹے بڑے کا فرق مراتب ملحوظ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ: "كُلُّ مَانَهَى اللهُ فَهُوَ كَبِيْرَة"۔ معصیت جو بھی ہو اُسے کبیرہ سمجھنا چاہئے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی واضح ہے۔ امام الحرمین اور بہت سے علماء رحمۃ اللہ علیہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی کبیرہ ہی ہے۔ یہی مذہب صوفیاء کرام کا بھی ہے۔

مگر محققین حضرات فرماتے ہیں کہ سارے معاصی پر ایک طرح کا عذاب چونکہ نہیں ہوتا، اور بکثرت احادیث میں گناہوں کے متعلق کبیرہ کے ساتھ صغیرہ گناہوں کا تذکرہ بھی ہے، اور سارے گناہوں پر ایک جیسا مؤاخذہ بھی نہیں ہوتا، اور آیت کریمہ میں لفظِ کبائر جو مذکور ہے اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں صغائر بھی ہیں۔ جب نیکیوں میں فرق مراتب واضح اور مسلَّم ہے، اور جنتی درجات کا تفاوت وفرق اس پر شاہد عدل ہے، اسی طرح جہنم اور اس کے درجات بھی گناہوں کے مراتب کے لحاظ سے متفاوت ہیں۔ اور بعض گناہ نیکی وحسنات سے بھی معاف ہوتے ہیں، جبکہ کچھ گناہوں کے لئے توبہ شرط ہے۔ اسی طرح کچھ گناہوں کے لئے علاوہ توبہ کے کفارہ کی ادائیگی بھی لازم ہے، جبکہ کچھ گناہ صرف نیکیوں سے معاف ہوجاتے ہیں۔ نیز بعض گناہوں پر بہت سخت وعید ولعنت کا اطلاق ہے، جبکہ دوسرے گناہوں پر لعنت وغیرہ کا اطلاق نہیں، وغیرہ۔

تو لازمی طور پر کہنا پڑے گا کہ گناہ بحیثیتِ مجموعی ایک جیسے برابر نہیں ہیں، ان میں کچھ کبائر اور باقی صغائر ہی ہوں گے۔ سورۂ نجم میں ارشاد ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ [النجم: ۳۲] (وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی سے بچتے ہیں، مگر چھوٹے گناہ) لَمَم سے مراد صغائر ہیں، اور مشاہدہ وتعامل اور ہر زمانہ میں عرف وتعامل بھی یہی فیصلہ کنندہ رہا ہے کہ گناہ کی کئی اقسام ہیں، مثلاً صغیرہ اور کبیرہ، اور اکبر الکبائر وغیرہ۔ تو واضح ہوا کہ پہلی قسم صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ، اور دوسری قسم کبیرہ، یعنی بڑے گناہ۔

گناہوں کی دو قسمیں ہیں:

بعض علماء کرام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں میں اضافی فرق کے قائل ہیں، یعنی ہر گناہ اپنے سے بڑے گناہ کے اعتبار سے صغیرہ ہے، اور اپنے سے چھوٹے گناہ کے لحاظ سے کبیرہ ہے۔ اگر صغیرہ گناہ کو صغیرہ سمجھ کر لاپرواہی اور غفلت سے معمولی سمجھ کر اس کا ارتکاب کیا جائے، یا اس پر دوام واصرار ہو، تو صغیرہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے، جیسے مشہور ہے: "قطرہ قطرہ دریا"۔ اسلاف کرام فرماتے ہیں کہ ہر گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ کفر کا قاصد ہوتا ہے، یعنی گناہ کی لاپرواہی دل پر

سیاہ دھبہ پیدا کرتی ہے، اور بدونِ توبہ تدریجاً (العیاذ باللہ) کفر کی طرف لے جاتی ہے۔ علماء کرام نے فرمایا ہے کہ بچھو، سانپ چھوٹا ہو یا بڑا، ہر حال میں خطرناک ہوتا ہے۔ آگ کا انگارہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہر حالت میں تکلیف دہ اور مضر ہے۔

دوسرے علماء کرام فرماتے ہیں کہ جو گناہ حسنات اور نیکیوں سے معاف ہو، جیسے ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ [ھود: ۱۱۴] (بیشک نیکیاں برائیوں کو ختم کردیتی ہیں)۔ تو وہ گناہ صغیرہ کہلائے گا، اور اگر حسنات سے معاف نہ ہو، بلکہ اس کی معافی توبہ پر موقوف ہو، تو کبیرہ ہوگا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ قرآن وحدیث اور اقوال سلف کی تشریحات کے بموجب کہ جس گناہ پر قرآن کریم میں کوئی شرعی حد، یعنی کوئی سزا دنیا میں مقرر کی گئی ہے، یا جس پر لعنت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، یا جس پر جہنم کی وعید آئی ہے، وہ سب گناہ کبیرہ شمار ہوں گے۔ اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفاسد اور برے نتائج کسی کبیرہ گناہ کے برابر، یا اس سے زائد ہوں۔ اسی طرح جو گناہ صغیرہ جرأت وبیباکی کے ساتھ کیا جائے، یا جس پر مداومت کی جائے، تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے کسی نے کبیرہ گناہوں کی تعداد سات بتلائی تو آپؓ نے فرمایا کہ سات نہیں، سات سو کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الزواجر" میں ان تمام گناہوں کی فہرست، اور ہر ایک کی مکمل تشریح بیان فرمائی ہے، جو مذکور الصدر تعریف کی رُو سے کبائر میں داخل ہیں، اُن کی اس کتاب میں تعداد چار سو سرسٹھ (۴۶۷) تک پہنچی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے۔

بعض نے بڑے بڑے ابواب معصیت کو شمار کرنے پر اکتفاء کیا ہے، تو تعداد کم لکھی ہے، جیسے کہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الکبائر میں۔ اور بعض نے ان کی تفصیلات اور انواع واقسام کو پورا لکھا ہے، تو تعداد زیادہ ہوگئی۔ اس لئے یہ کوئی اختلاف وتعارض نہیں ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات میں بہت سے گناہوں کا کبیرہ ہونا بیان فرمایا، اور حالات کی مناسبت سے کہیں تین، کہیں چھ، کہیں سات، کہیں اس سے بھی زیادہ بیان فرمائے ہیں۔ اسی لئے علماء امت نے یہ سمجھا کہ کسی عدد میں انحصار کرنا مقصود نہیں ہے۔

بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "کبیرہ گناہوں میں جو سب سے بڑے ہیں تمہیں ان سے خبر دیتا ہوں، وہ تین ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک کرنا۔ (۲) ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ (۳) اور جھوٹی گواہی دینا، اسے بار بار تکرار سے فرمایا۔

حافظ ذھبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں ستر گناہ لکھے ہیں، اور ان کے بارے میں جو وعیدیں ہیں وہ بھی درج کی ہیں، اجمالی طور پر ہم ان کی فہرست لکھ دیتے ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) شرک، اور دیگر شرکیہ اعمال۔ (۲) قتل عمد، خودکشی۔ (۳) جادو کرنا۔ (۴) فرض نمازوں کو ترک کرنا۔ (۵) زکوٰۃ نہ دینا۔ (۶) ترکِ صوم۔ (۷) استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا۔ (۸) والدین کی نافرمانی۔ (۹) رشتہ داروں سے قطع رحمی۔ (۱۰) غیر فطری عمل کا ارتکاب۔ (۱۱) سودی کاروبار کا حصہ بننا۔ (۱۲) یتیم کا مال کھانا۔ (۱۳) زنا یا لواطت کا ارتکاب۔ (۱۴) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر جھوٹ بولنا۔ (۱۵) میدانِ جہاد سے بھاگنا۔ (۱۶) حاکم اور قوم کے سربراہ کا عوام کے حقوق میں خیانت و سستی کرنا۔ (۱۷) تکبر و غرور کرنا۔ (۱۸) ناحق یا جھوٹی گواہی دینا۔ (۱۹) منشیات، شراب اور نشہ آور چیزوں کا استعمال کرنا۔ (۲۰) شراب اور دیگر کسی حرام چیز کی تجارت کرنا۔ (۲۱) جوآ، لاٹری اور سٹہ کھیلنا۔ (۲۲) کسی پاکدامن مرد یا عورت پر بہتان لگانا۔ (۲۳) مالِ غنیمت یا عام لوگوں کے مشترکہ مال میں خیانت کرنا۔ (۲۴) چوری کرنا۔ (۲۵) ڈاکہ ڈالنا۔ (۲۶) جھوٹی قسم کھانا۔ (۲۷) کسی بھی مخلوق پر ظلم کرنا۔ (۲۸) ٹیکس وصول کرنا۔ (۲۹) حرام مال کا کسی بھی طرح استعمال کرنا یا کھانا۔ (۳۰) جھوٹ بولنا۔ (۳۱) رشوت لینا۔ (۳۲) خلافِ شریعت فیصلہ کرنا۔ (۳۳) عورتوں یا مردوں کا غیر جنس مشابہت یا وضع قطع لباس وغیرہ کا استعمال کرنا۔ (۳۴) اپنے عزیزوں کی بے حیائی اور فحش حرکات پر خاموش رہنا۔ (۳۵) مطلَّقہ مغلَّظہ کا حلالہ کرنا، یا کرانا۔ (۳۶) بدن اور کپڑوں کی صفائی اور پاکیزگی سے غافل رہنا۔ (۳۷) دکھاوے اور ریاکاری کا ارتکاب کرنا۔ (۳۸) دنیا کی خاطر علمِ دین حاصل کرنا۔ (۳۹) علمی مسائل کو بیان نہ کرنا، حق بات کو چھپانا۔ (۴۰) نیکی کر کے احسان جتلانا۔ (۴۱) کسی بھی چیز میں خیانت کرنا۔ (۴۲) تقدیر کو جھٹلانا۔ (۴۳) لوگوں کے درمیان تجسس و جاسوسی کرنا۔ (۴۴) خبر رسانی اور چغل خوری کرنا۔ (۴۵) کسی مخلوق پر لعنت کرنا۔ ہاں کفار و بدکار اور شیاطین مستثنیٰ ہیں۔ (۴۶) وعدہ خلافی اور غدر کرنا۔ (۴۷) عہد و میثاق کی پاسداری نہ کرنا۔ (۴۸) کاہن اور نجومی کی تصدیق کرنا۔ (۴۹) شوہر کی نافرمانی کرنا۔ (۵۰) تصویر بنانا، یا گھر میں لٹکانا۔ (۵۱) کسی کی موت پر نوحہ کرنا، منہ پیٹنا، کپڑے پھاڑنا، سر منڈانا، واویلا کرنا۔ (۵۲) شرارت و فتنہ کرنا، سرکشی و بغاوت کرنا۔ (۵۳) مخلوق پر دست درازی کرنا۔ (۵۴) پڑوسیوں کو ایذاء دینا۔ (۵۵) گالی گلوچ بکنا، بدزبانی کرنا۔ (۵۶) مزدوروں، کارکنوں کا حق ادا نہ کرنا۔ (۵۷) لوگوں کو عبادت گاہوں سے منع کرنا۔ (۵۸) اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں کو تکلیف دینا۔ (۵۹) شعائر اللہ کی

بے احترامی کرنا۔(۶۰)ٹخنوں سے نیچے پاجامہ قمیص، ازار بند چادر لٹکانا۔(۶۱)مردوں کا ریشم یا سونا پہننا۔(۶۲)
غلام کا آقا سے بھاگ جانا۔(۶۳)غیر اللہ کے لئے جانور ذبح کرنا۔(۶۴)اپنا نسب، قوم وغیرہ یا باپ تبدیل کرنا۔
(۶۵)محلّوں، بازاروں، اور گلیوں میں شور مچانا اور جھگڑہ کرنا۔(۶۶)بچت پانی پر بخل کرنا، پانی سے لوگوں کو منع کرنا۔
(۶۷)ناپ تول میں کمی کرنا۔(۶۸)کھانے کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرنا۔(۶۹)اللہ تعالیٰ سے خوف نہ کرنا، اور
اس کی گرفت سے بے غم ہو جانا۔(۷۰)غیبت وعیب جوئی کرنا۔(۷۱)اولیاء اللہ اور بزرگوں کو تکلیف دینا، یا ان کی
مذمت و برائی بیان کرنا۔(۷۲)قرآن کریم اور احادیث کے حکموں میں تحریف کرنا، احکام شریعت میں ردّ و بدل
کرنا۔(۷۳)حُر اور خاندانی لوگوں کو غلام بنانا، اور فروخت کرنا۔(۷۴)منکوحہ عورت یا مطلّقہ معتدّہ سے عدّت
کے اندر شادی کرنا۔(۷۵)نماز باجماعت کا اہتمام نہ کرنا۔(۷۶)بغیر شرعی عذر کے نماز جمعہ چھوڑ دینا۔(۷۷)ایسی
وصیت کرنا جس سے وارثوں کی حق تلفی ہو۔(۷۸)کسی شرعی وارث کو میراث سے محروم کرنا، یا اس کا حق دبانا یا کم
کرنا۔(۷۹)لوگوں کے پوشیدہ اسرار و حقائق اور رازوں کی تشہیر کرنا۔(۸۰)مسلمان ملکوں کے مخفی فوجی راز دشمن کو
بتانا۔(۸۱)کسی صحابی کو گالی دینا، اور سلف صالحین وائمہ اسلام کی تنقیص وسب وشتم کرنا۔(۸۲)اولوالامر بادشاہ یا
حاکم وقضاۃ کے احکام ماننے سے بغاوت کرنا۔(۸۳)کسی ظالم کا مددگار بننا، اور اس کے ظلم کو حق بجانب ماننا، یا اس کی
تائید کرنا۔(۸۴)جادو سیکھنا سکھانا، یا کسی پر جادو کا عمل کرنا۔(۸۵)قرآن مجید کو بھول جانا۔(۸۶)کسی جاندار کو
زندہ جلانا۔(۸۷)اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو جانا۔(۸۸)خنزیر یا کسی حرام کو کھانا(بغیر اضطرار کے)۔(۸۹)
کھانے پینے اور عام استعمال کی چیزوں میں ملاوٹ کرنا۔(۹۰)باوجود استطاعت اور قدرت کے لوگوں کا قرض ادا نہ
کرنا۔(۹۱)صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنا۔(۹۲)کسی گناہ اور خلاف شرع بات پر کسی کی مدد کرنا۔(۹۳)گانے کا پیشہ
اختیار کرنا۔(۹۴)بے حیائی، بے حجابی اور بے پردگی اختیار کرنا۔(۹۵)کسی گناہ کو دیکھ کر استطاعت کے باوجود امر
بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کرنا۔(۹۶)ناچنا، ڈھول وسارنگی بجانا۔(۹۷)دنیا کی محبت ورغبت کرنا، اور
اسے اچھا کہنا۔(۹۸)علماء امت کے خلاف محاذ بنانا، اور ان کی مذمت کرنا۔(۹۹)مسلمانوں کی بدخواہی کرنا، اور
اپنے بڑوں کی بے احترامی کرنا، ماتحت لوگوں پر ظلم کرنا، کمسن بچوں کو شفقت سے محروم رکھنا۔(۱۰۰)کسی کے نسب میں
طعن کرنا۔(۱۰۱)بدعت کرنا، پختہ قبر بنانا، اور قبروں پر میلہ لگانا۔(۱۰۲)اہلِ بدعت کا احترام اور توقیر وحوصلہ افزائی
کرنا۔(۱۰۳)جب کسی کا حق ضائع ہو رہا ہو باوجود علم رکھنے کے گواہی نہ دینا۔(۱۰۴)لوگوں کو برائی کی دعوت دینا۔

(۱۰۵) مُحرّمات سے شادی کرنا۔ (۱۰۶) مسلمان بھائی پر ہتھیار سے اشارہ کرنا۔ (۱۰۷) حرم شریف میں اِلحاد کرنا۔ (۱۰۸) فیصلہ میں بے انصافی یا لحاظ کرنا۔ (۱۰۹) داڑھی منڈانا۔ (۱۱۰) جس لہو ولعب پر شریعت نے پابندی لگادی اس کو اختیار کرنا۔ (۱۱۱) ہیروئن، چرس، بھنگ و دیگر منشیات کا کاروبار کرنا، یا پینا۔ (۱۱۲) کسی کا مال غصب کرنا، زمین غصب کرنا، مغصوب زمین پر گھر بنانا، مسجد تعمیر کرنا، مدرسہ بنانا، مسافر خانہ تعمیر کرنا، عیدگاہ بنانا وغیرہ۔ (۱۱۳) کسی مسلمان کی تکفیر کرنا۔ (۱۱۴) بیویوں میں عدل و برابری نہ کرنا۔ (۱۱۵) مشت زنی کرنا۔ (۱۱۶) اہل وعیال کے حقوق پورا نہ کرنا۔ (۱۱۷) حالت حیض میں بیوی سے جماع کرنا۔ (۱۱۸) محرّمات کے ساتھ چھیڑ خانی کرنا۔ (۱۱۹) عالم کا اپنے علم پر عمل نہ کرنا، اورحق بات چھپانا۔ (۱۲۰) علمِ دین و تعلیمِ قرآن کو ذریعۂ معاش بنانا۔ (۱۲۱) اتباعِ سنّت پر استہزاء اور اتباعِ شہوات پر رضامند ہونا۔ (۱۲۲) یہود و نصاریٰ کے طریقوں کو اچھا سمجھنا۔ (۱۲۳) اسلامی اعمال کی سبکی اور خفت پر راضی رہنا۔ (۱۲۴) کھانے کی چیزوں پر عیب لگانا۔ (۱۲۵) کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونا، یا نظر ڈالنا۔ (۱۲۶) عورتوں کو شوق و شہوت کی نگاہ سے دیکھنا۔ (۱۲۷) سرکاری اور عوام الناس کے مال کو ہڑپ کرنا۔ (۱۲۸) تکبر وغرور کی چال چلنا۔ (۱۲۹) سونے چاندی کے برتن استعمال کرنا۔ (۱۳۰) کسی مسلمان سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرنا۔

اگر مزید کبائر کا پتہ لگانا اور معلوم کرنا درکار ہو تو "الزواجر، رسالة علامة ابن نجيم، كتاب الكبائر، رسالةمهلكات، فهرست كبائر" وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔

﴿إِن تَجۡتَنِبُوا۟ كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنكُمۡ سَيِّـَٔاتِكُمۡ﴾ اگر تم بڑے گناہوں سے اجتناب کروگے تو ہم تمہارے گناہوں کا کفارہ کردیں گے۔ آیت کریمہ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ صغیرہ گناہ اس وقت معاف ہوں گے جب کبیرہ گناہوں سے اجتناب ہو۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اَلصَّلَوٰتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ اِلٰى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ اِذَا اجْتَنَبَتِ الْكَبَائِرَ"۔ [مسلم] اس حدیث میں بھی تکفیر سیئات کے لئے کبائر سے اجتناب ضروری قرار پایا، جیسے آیت کریمہ کا مفہوم تھا۔ اسی طرح ایک اور حدیث مرفوع میں ارشاد ہے: "مَامِنِ امْرِئٍ مُسْلِمٍ تَحْضُرُهٗ صَلٰوةٌ مَكْتُوْبَةٌ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهَا وَخُشُوْعَهَا وَرُكُوْعَهَا اِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوْبِ مَالَمْ يُؤْتَ كَبِيْرَةً"۔ [مسلم] یعنی جس مسلمان کی موجودگی میں فرض نماز کا وقت ہوگیا، اور اس نے اچھی طرح وضو کیا، اور اس کا

رکوع وسجود اچھی طرح ادا کیا، تو اس سے اس کے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا، جب تک کہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ ہو۔

ان حدیثوں میں بھی بظاہر وہی بات ہے کہ جب بڑے گناہوں سے پرہیز کیا جائے گا تو نیکیوں سے گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا۔ لیکن علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں: "معناہ ان الذنوب کلها تغفر الا الکبائر فانها لاتُغفرُ [الا بالتوبۃِ] ولیس المرادُ ان الذنوب تغفر مالم تکن کبیرۃً۔ (یعنی مغفرت صغائر کے لئے ترکِ کبیرہ شرط ضروری نہیں ہے) فان کانت لا یغفر شئی من الصغائر فانّ ھٰذا وان کانت مَحتمِلاً فسیاق الحدیث یاباہُ"۔

ظاہر حدیث سے اگرچہ اشتراط یہی معلوم ہورہا ہے، مگر سیاق حدیث میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ سیاق حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مغفرتِ ذنوب ترکِ کبائر کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ آگے فرماتے ہیں: "قال القاضی عیاض ھٰذا المذکور فی الحدیث من غُفران الذنوبِ مالم یؤتَ کبیرۃٌ ھو مذھب اھل السنة وان الکبائر یغفرھا التوبۃ ورحمۃ اللہ تعالیٰ وفضلہ واللہ اعلم [شرح صحیح مسلم ج اول]

مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے ذریعہ جو گناہوں کے معاف ہونے کا وعدہ ہے، یہ صغیرہ گناہوں سے متعلق ہے، کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوں گے۔ اور یہ مطلب نہیں ہے کہ بڑے گناہ نہ ہوں تب چھوٹے گناہ معاف ہوں گے۔ ظاہری الفاظ میں اس معنیٰ کا احتمال تو ہے، لیکن حدیث کا سیاق اس سے انکار کرتا ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ شارحِ مسلم فرماتے ہیں کہ یہ جو حدیث میں گناہوں کی مغفرت کا ذکر ہوا کہ جب تک کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ ہو صغائر معاف کردیے جائیں گے، یہ اہلسنت والجماعۃ کا مذہب ہے، اور کبائر صرف توبہ سے یا صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل سے معاف ہوں گے۔

خلاصہ:

بظاہر آیت کریمہ اور احادیث صحیحہ سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ بڑے گناہوں کے ہوتے ہوئے چھوٹے گناہوں کا کفارہ نہیں ہوتا۔ لیکن علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں، اگرچہ محتمل ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو بات فرمائی ہے، اور جو بات قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کی ہے، ان کو سامنے رکھتے ہوئے آیت اور حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ہم چاہیں گے تو تمہارے سارے گناہوں کا

کفارہ کردیں گے، بشرطیکہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ ہو، یعنی نیکیوں سے کبیرہ گناہوں کا کفارہ نہ ہوگا، کیونکہ ان کی مغفرت وکفارہ کے لئے توبہ شرط ہے۔ یہی مطلب ہے آیت کریمہ: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ [ھود: ۱۱۴] (بیشک نیکیاں برائیوں کو ختم کردیتی ہیں) کا۔ گویا کہ ضابطہ یہ مقرر کیا کہ تمہارے چھوٹے گناہ حسنات سے معاف ہوں گے، بشرطیکہ ان صغائر کے ساتھ کبائر کا اختلاط نہ ہو، جن کے لئے یہ ضابطہ نہیں ہے، بلکہ ان کی مغفرت کا قانون الگ ہے، یعنی توبہ اور ندامت، اور آئندہ کے لئے ترکِ گناہ کا عزمِ مصمّم۔ واللہ اعلم

فائدہ:

"حُبّ الدُّنیَا رَأسُ کُلِّ خَطِیئَۃٍ"۔ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے، اور طالبِ دنیا کبھی قربِ الٰہی کے گرد وغبار تک نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ اس پر شیطان مسلّط رہتا ہے۔ یہ فرق ضرور سمجھو کہ مالدار ہونا برا نہیں ہے، بلکہ مال کی محبت میں گرفتار ہونا برا اور خطرناک ہے۔ [مثنوی]

فائدہ:

آیت کریمہ میں ایک جزوی مغفرت کا بیان تھا، جو کہ جزوی ضابطہ کے مطابق ہے، کہ نیکیوں میں سبقت اور جدوجہد کرو، جن سے تمہارے صغیرہ گناہ معاف ہوجائیں گے، اور کبائر کے لئے توبہ نصوح اختیار کرو، ورنہ مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت اور بے پناہ رحمت وکرم پر موقوف ہے، وہ اگر چاہے تو سارے جہاں کے سارے گناہوں پر (شرک کے علاوہ) عفو ومغفرت کا قلم پھیر دے۔ یہ سب کچھ مغفرتوں کا ظہور قیامت کے روز ہوگا، جہاں بے شمار مجرموں کی مغفرت کا فیصلہ ہوگا۔ وہاں توبہ کہاں، اور کیا ہے؟ توبہ کا مقام تو دنیا ہی ہے۔ وہاں کیا توبہ ہوسکتی ہے؟ اسی عمومی مغفرت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ [الزمر: ۵۳] (کہہ دیں: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں، اللہ سارے گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے، بیشک وہ معاف کرنے، والا مہربان ہے)۔ یہ مغفرتِ عامّہ غیر مشروط ہے، یہ کسی حسنات اور کسی توبہ پر ہرگز موقوف نہیں ہے۔

إن تغفر اللّٰھم تغفر جمًا ★ وای عبدٍ لک ما المّا

کار زلف تست مشک افشانی ما عاشقان ☆ مصلحت را تہمت بر آہوئے چین بستہ اند

اسی بے پناہ عمومی مغفرت کو دیکھ کر ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے سخت گیر محقق نے کہا لگتا ہے کہ کافر ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے، ہوسکتا ہے کہ مدتِ مدید کے بعد ان پر بھی عنایات و بے پناہ شفقتوں کا دروازہ کھل جائے۔ یہ بات تمام نصوصِ قرآنیہ کے اگرچہ خلاف ہے، اور ایک شاذ اور غیر واضح قول ہے، مگر مقام کی مناسبت سے میں نے ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ شانہ ہم پر اور ساری امتوں کے مسلمانوں پر اپنی مغفرت کا دروازہ کھول دے۔ آمین

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا
اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ
عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾

ترجمہ: اور تم کسی ایسی چیز کی تمنا نہ کرو جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، مردوں نے جو اعمال کیے ان کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ہے، اور عورتوں نے جو اعمال کیے ان کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ہے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۳۲﴾ اور ہر ایک کے لئے ہم نے اس مال میں وارث مقرر کردیے ہیں، جو والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ ہوا ان کو ان کا حصہ دے دو، بیشک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کی اطلاع ہے ﴿۳۳﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ کے شانِ نزول کے بارے میں امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! مرد جہاد کرتے ہیں، اور ہم جہاد نہیں کرتے، اور جہاد میں ان کو مالِ غنیمت سے حصہ ملتا ہے، اور ان کا میراث میں دوگنا حصہ ہے، اگر ہم مرد ہوتے تو ہم بھی جہاد کرتے، مالِ غنیمت میں حقدار ہوتے، اور میراث میں زیادہ حصہ پاتے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

پھر بعض حضرات سے یوں نقل کیا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے میراث کے حصے بیان فرماتے ہوئے ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ فرمایا، تو عورتوں نے کہا کہ ہم زیادہ حصہ کی مستحق ہیں، کیونکہ ہم ضعیف ہیں، اور مرد قوی

ہیں، اور وہ روزی حاصل کرنے پر ہم سے زیادہ قدرت رکھتے ہیں۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ جب ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ نازل ہوئی، تو بعض مردوں نے کہا کہ ہم امید رکھتے ہیں کہ نیکیوں کے اعتبار سے عورتوں سے بڑھ جائیں، اور ہمارا ثواب عورتوں سے دوگنا ہوگا، جیسا کہ دنیا میں میراث کا حصہ دوگنا ہے، اس پر یہ آیت ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا﴾ نازل ہوئی۔ [معالم]

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے، حکیم ہے، تشریعاً اور تکویناً اس کے سب کام اور سب فیصلے اور احکام حکمت پر مبنی ہیں، اس نے جس انداز پر پیدا فرمایا ہے، اور جس کو جس حال پر رکھا ہے، اور جتنی قوت دی ہے، اور جس کام کا اہل بنایا ہے، اور جس کام پر لگایا ہے، یہ سارے حکمت کے مطابق ہیں۔ کائنات میں اوپر نیچے، دائیں بائیں، آگے پیچھے، اقوامِ عالم اور دیگر افراد کو اگر بغور وفکر دیکھا جائے تو طرح طرح کے ہزاروں رنگ و روپ، شکل وصورت، قدوقامت، علم و دانش، قوت وضعف، اور سیاہ وسفید نظر آئیں گے۔ اس اختلاف میں ہزاروں حکمت و مصلحت کارفرما ہیں، اور سب اس کی وحدانیت والوہیت پر گواہ ہیں۔

اگر یہ تمام مخلوقات وموجودات ایک جنس کے ہوتے، اور سب برابر ہوتے، کوئی اختلاف ان میں نہ ہوتا، تو یہ نظام کائنات شاید درہم برہم ہوجاتا، اور معیشت ومعاشرت کا بیڑا غرق ہوجاتا۔

رہا آخرت کا معاملہ، وہ صرف اعمال واخلاص پر مبنی ہے، جو شخص مرد ہو یا عورت اپنی فطری قوت وتوانائی کے اعتبار سے جو عمل کرے گا تو وہ اپنے اخلاص وصفائی کا پورا پورا ثواب وصلہ پائے گا۔ صرف مرد ہونے کی وجہ سے یا عورت ہونے کی وجہ سے کسی کے اجر وثواب میں اضافہ یا نقصان نہ ہوگا، یہ سارے اختلافات غیر اختیاری تکوینی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس کو کوئی فضیلت وبرتری دی ہے، دوسرا اس کا آرزو نہ کرے، کیونکہ وہ اس کو آرزو اور کوشش کی بنیاد پر نہیں پاسکے گا، اگر کوئی اپنی توانائی صرف کرکے ان کی تحصیل کا خواہاں ہوگا تو سوائے ناکامی کے کچھ بھی نہیں پائے گا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

امورِ اختیاریہ اور غیر اختیاریہ میں تمنا کرنا:

مطلب یہ ہے کہ امورِ غیر اختیاریہ میں تمنا نہ کرو، کیونکہ یہ تمہارے اختیار سے باہر اور بے مقصد ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جب اپنے آپ کو دوسروں سے مال ودولت، عیش وعشرت، مال، اولاد، حسن، خوبی، عزت، اقتدار، اور علم وہنر وغیرہ میں کم پاتا ہے، تو فطرتاً اس کے دل میں ایک مادۂ حسد اُبھرتا ہے، جس کا تقاضا کم سے کم یہ ہوتا ہے کہ

میں بھی اس کے برابر یا زیادہ ہو جاؤں۔ اور بسا اوقات اس پر قدرت نہیں ہوتی، کیونکہ بہت سے کمالات اور خوبیاں ایسی ہیں جن میں انسان کی سعی وعمل کو کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ محض قدرت کے انعامات ہوتے ہیں، جیسے کسی کا مرد ہونا، یا کسی اعلیٰ خاندان میں پیدا ہونا، یا خوبصورت وحسین وجمیل پیدا ہونا، وغیرہ۔ اگر کوئی عمر بھر اس کی کوشش کرے، وہ ان امورِ غیر اختیاریہ کو حاصل نہیں کر سکے گا، اور نہ ہی یہ چیزیں کسی جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہو سکتی ہیں۔ پس وہ لاچار حسد کا شکار ہو کر یہی تمنا کرے گا کہ دوسروں سے یہ نعمت چھن جائے، سلب ہو جائے، تاکہ وہ اس کے ساتھ برابر ہو جائے۔ یہ حسد ہے، جو کہ حرام ہے، اور انسانی اخلاق میں انتہائی شرمناک اور ناپسندیدہ وضرررساں خصلت ہے، اور زندگی بھر پریشانیوں کی آگ میں جلنے اور گھلنے کی مترادف ہے۔

پس چاہئے کہ کوئی شخص بجائے حسد وناشکری کے اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے، اور شکرگزار بن جائے، کسی دوسرے کے ساتھ برابری کے غم میں زندگی برباد نہ کرے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی یہ محرومی دین ودنیا کے لحاظ سے اس کے حق میں مفید ہو۔

ہاں! اگر یہ چیزیں مثلاً علم وہنر، فضل وکمال، اور شرافت ونجابت وغیرہ امورِ اختیاریہ لوگوں میں دیکھے، پس اعمالِ صالحہ، تحصیلِ عزّت وشرافت، اور علم وفضل کے حصول کی خاطر کمربستہ ہو کر جدوجہد اور محنت کرے، اور یہ مقام حاصل کرے، اور کسب واکتساب میں لگ جائے، اور اللہ تعالیٰ کا فضل طلب کرتا رہے، جیسے حدیث میں وارد ہے کہ دو شخصوں پر غبطہ کرنا جائز ہے، اور یہ دونوں امورِ اختیاریہ میں سے ہیں، جو اکتساب سے حاصل ہو سکتے ہیں: ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہو، اور وہ اس کی خدمت کرتا ہو، اور رات دن اس کی تلاوت وتعلیم میں مشغول رہتا ہو۔ اور دوسرا وہ شخص کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو، اور وہ اس مال کو رات دن پانی کی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا رہتا ہو۔ [بخاری]

یہ دونوں عمل بہت ہی عمدہ اور باعثِ خیر وبرکت بھی ہیں، اور اکتساب وکوشش سے بآسانی حاصل بھی ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم نے ایک طرف اگر امورِ غیر اختیاریہ میں تمنا کرنے سے منع فرمایا، تو دوسری طرف امورِ اختیاریہ میں مسابقت واکتساب کے ذریعہ امورِ اختیاریہ میں اجازت بھی دیدی، فرمایا: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ [البقرة: ۱۴۸] یعنی نیکیوں میں ایک دوسرے پر سعی وعمل کے ذریعہ سبقت کرو۔

تو آیت کریمہ نے ایک حکیمانہ اور عادلانہ ضابطہ بتلا دیا کہ جو کمالات وفضائل غیر اختیاری ہیں، اور ان میں

انسان کا کسب وعمل موثر نہیں، تو ایسے کمالات وفضائل کو تقدیر کے حوالہ کرکے جس حالت میں بھی کوئی ہے اسی پر اس کو راضی رہنا، اور اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرنا چاہئے، اور کسی زائد کی تمنا نہیں کرنی چاہئے، جو کہ لغو اور فضول بھی ہے، اور زندگی بھر کے لئے ایک رنج وغم کے علاوہ آخرت کے لئے تباہ کن بھی ہے، کیونکہ حسد حرام ہے۔

اور جو فضائل وکمالات اختیاری ہیں، اور کسب وعمل سے حاصل ہوسکتے ہیں، ان کی تمنا فائدہ مند ہے، بشرطیکہ تمنا کے ساتھ کسب وعمل اور جدوجہد بھی ہو۔

اور آیت کریمہ نے یہ بھی وعدہ کیا کہ سعی وعمل کرنے والے کی محنت ضائع نہیں کی جائے گی، بلکہ ہرایک کو بقدر محنت وعمل حصہ ملے گا، خواہ مرد ہو یا عورت۔ یہ نہیں ہوگا کہ مرد کا حصہ میراث کی طرح دوگنا ہو، اور عورت کا ثواب مرد کے ثواب کے آدھے کے برابر ہو، کیونکہ آخرت کا ثواب عمل کے ساتھ وابستہ ہے، نہ کہ ذکورت وانوثت کے ساتھ، تو فرمایا:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ......تا......بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت عطا فرمائی ہے، تم اس کی آرزو، یعنی تمنا مت کرو کہ میں وہاں تک رسائی کرسکوں، کیونکہ امور غیر اختیاریہ تکوینی میں تمہاری رسائی نہیں ہوسکتی۔ مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ مقرر ہے، اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا۔ پس مردوں کو جہاد، مالِ غنیمت، اور میراث کی زیادتی، اسی طرح جہاد کا اجروثواب اور شہادت کا ملنا یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہی ہے، جو انہیں نصیب ہوں گے۔

عورتوں کے لئے امورِ خانہ داری، خدمتِ شوہر، اور بچوں کی تربیت ونگہداشت، وغیرہ کا ثواب یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہی ہے، اور امورِ آخرت واعمالِ صالحہ کا ثواب جو قیامت کے روز ملنے والا ہے، وہ ہر فریق کے لئے متعین ہے، جو کوئی جیسا عمل کرے گا ویسا ہی اس کو بدلہ وثواب ملے گا۔ وہاں مرد وعورت میں کوئی امتیاز نہیں ہوگا۔ اور تم کو یہ ہدایت ہے کہ ہر کسی کے ساتھ برابری کی تمنا چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا سوال کرو، کیونکہ فضلِ خداوندی ساری چیزوں سے افضل بھی ہے، اور ہر شخص کے لئے الگ الگ بھی ہے۔ تمہیں کیا پتہ کہ تمہارے لئے عزت ومال بہتر ہے، یا فقر واحتیاج۔ اسی طرح تمہارے لئے علم وکمال بہتر ہے، یا بے علمی وکسمپرسی؟ تمہارے لئے کثرت اولاد بہتر ہے یا بے اولادی؟ تمہارے لئے حسن وخوبصورتی بہتر ہے یا موجودہ بدصورتی؟

پس ہوسکتا ہے کہ مطلوبہ چیزیں تمہارے لئے معز ونقصان دہ ہوں، اور ملنے کی صورت میں تم اس کا حق ادا نہ

کرسکو، اور خسارہ میں پڑو۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا فضل مانگا کرو، اور ﴿وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰهِؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ﴾ [الغافر:۴۴] (اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردیتا ہوں، بیشک اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے) پر عامل رہو۔

حکایت:

ایک بستی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا گزر ہوا، اس بستی کے کسی کونے میں ایک فقیر پڑا ہوا تھا، دونوں پاؤں اور آنکھوں سے معذور تھا۔ بستی والوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ اس کے لئے دعا فرمائیں، یہ بیچارہ ذلیل ہے۔ حضرت علیہ السلام نے فرمایا یہی ذلت وخواری اس کے لئے بہتر ہے، اللہ تعالیٰ کا انتخاب برحق و مبنی برحکمت ہے، اگر یہ تندرست ہوگیا تو اور خوار ہوجائے گا، بہتری اسی ذلت میں ہے۔ مگر لوگ نہ مانے، اور اصرار کیا۔ حضرت علیہ السلام نے دعا فرمائی، وہ شخص تندرست ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں سے رخصت ہوکر چلے گئے۔ ایک ماہ بعد پھر وہاں تشریف لائے، لوگوں سے دریافت فرمایا کہ وہ فقیر کہاں ہے؟ اور کیسا ہے؟ لوگوں نے کہا: حضرت! وہ بڑا بد بخت نکلا، شراب پی، چوری کی، بدکاری کی، پس پکڑا گیا، لوگوں نے اس کو پکڑ کر اس کا منہ کالا کیا، پھر گدھے پر سوار کیا، بازاروں میں پھرا پھرا کر خوار کیا، اور قید خانہ میں بند کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے یہی کہا تھا کہ یہی ذلت اس کے لئے بہتر ہے، اور تندرستی میں یہ مزید خوار ہوجائے گا، تم لوگ نہیں مانے، اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں میں مداخلت کی۔ پہلے اس کی دنیا خراب تھی، اب دنیا و آخرت دونوں تباہ ہوئیں۔ کسی کو کیا پتہ کہ بہتری کس چیز میں ہے، پس قدرت نے تمہارے لئے جو فیصلہ کیا ہے اسی پر راضی رہو، کسی بلندی کی تمنا نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ کے حکم و فیصلہ پر خوب راضی رہو۔ [مثنوی] ؎

آنکس کہ تونگرت نمی گرداند ☆ او مصلحت تو از تو بہتر داند

(سعدیؒ)

تو فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا﴾ بیشک ہر ہر چیز اور ذرہ ذرہ کو اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، اور یہ تقسیم سراسر عین حکمت و مصلحت ہے، اور مبنی بر عدل و انصاف ہے، تمہارا فرض یہ بنتا ہے کہ راضی بہ رضا و تقدیر پر رہو، عواقب و انجام کو اسی ذات پاک پر چھوڑو۔ ﴿وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ﴾ [البقرۃ:۲۰۷] (اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے)۔ وہ تم پر تم سے زیادہ مہربان ہے، وہ اگر سانپ و بچھو کو دفائی زہر نہ دیا ہوتا تو تمہارے بچے اسے گلی

کوچوں میں گھسیٹ کراس کا خانہ خراب کرتے۔

پس یقین کرو کہ اس کائنات میں اگر کسی کو کچھ ملا ہے تو استحقاق پر ملا ہے، اگر کسی کو کچھ نہ ملا تو حکمت کے تحت نہ ملا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب بھی کوئی مسلمان تین مرتبہ اللہ تعالیٰ سے جنت کی دعا کرتا ہے، تو جنت کہتی ہے: اے اللہ! اسے جنت میں داخل فرما، اور جب بھی مسلمان تین مرتبہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ مجھے دوزخ سے بچا، تو دوزخ کہتی ہے کہ: اے اللہ! اس کو دوزخ سے پناہ دے۔ [مظهري]

﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ......تا ...... عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا﴾

اور ہر ایک کے لئے، خواہ مرد ہو یا عورت، ہم نے وارث مقرر کئے ہیں (جو پہلے بیان ہوئے: اول ذوی الفروض، دوئم عصبات، سوئم ذوی الارحام) اس مال میں سے جس کو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں، ہم نے اپنے علم وحکمت سے ہر ایک کا حصہ مقرر کر دیا ہے، اور جن لوگوں سے تمہارا عہد و پیان ہو چکا ہے، یعنی تمہارے حلیف ہیں، یا اسلامی بھائی چارے کے لوگ، جن کے ساتھ تمہارا مواخات کا عقد ہو چکا ہے، یعنی مدینہ میں ہجرت کے ابتدائی دنوں میں تو تم ان کو حصہ دیدو، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

شروع اسلام میں حلیف کو میت کے مال کا چھٹا حصہ ملتا تھا، پھر جب آیت: ﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ [الأنفال: ۷۵] (اور رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں اللہ کی کتاب میں) نازل ہوئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ ہاں! اگر بطور وصیت من الثلث برائے احسان و ہمدردی کچھ دینا چاہو تو وہ الگ بات ہے، اور اس کا حکم اب بھی باقی ہے۔ وصیت بالثلث یا من الثلث کے لئے ہر طرح کی گنجائش ہے۔ واللہ اعلم

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ
اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ
وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ
فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۳۴

ترجمہ: مردنگران (حاکم) ہیں عورتوں پر، اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے فضیلت بخشی ہے ان میں سے بعض (مردوں) کو بعض (عورتوں) پر، اور اس واسطے کہ وہ اپنے مالوں میں سے خرچ کرتے ہیں، پس نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں، اور پس پشت حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں، اس چیز کی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا حکم دیا ہے (عزت وآبرو مال) اور وہ عورتیں کہ تم ان کی نافرمانی کا خوف کھاتے ہو ان کو نصیحت کرو، اور جدا کر دو ان کو خوابگاہوں میں اور ان کو مارو، پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو پس نہ تلاش کرو ان پر کوئی راستہ بیشک اللہ تعالیٰ بلند اور بڑا ہے ﴿۳۴﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں خاص کر عورتوں کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اس قسم کی خواہش نہ کریں کہ وہ مرد ہوتیں تو وہ بھی بڑے بڑے کام انجام دیتیں۔ فرمایا ایسی تمنا نہ کیا کرو، کیونکہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر فضیلت دی ہے، ان آیات میں اس فضیلت کا تذکرہ ہے۔ دلائل کی روشنی میں ان آیات کا شان نزول یہ ہے کہ زید بن ابی زہیر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا، ان کے آپس میں کچھ اختلاف پیش آئے، (سعد رضی اللہ عنہ کی دوسری بیوی بھی تھی) شوہر سعد رضی اللہ عنہ نے حبیبہ رضی اللہ عنہا کو ایک طمانچہ مارا، حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد سے شکایت کی، والد ان کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیدیا کہ حبیبہ رضی اللہ عنہا کو حق حاصل ہے کہ جس زور سے سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے ان کے طمانچہ مارا ہے، وہ بھی اتنے زور سے انتقاماً سعد رضی اللہ عنہ کو طمانچہ ماریں۔ اس پر آیت کریمہ کا نزول ہوا، کہ مرد کو حق پہنچتا ہے کہ اپنی بیوی کو نافرمانی کرنے پر مارے، اور بیوی کو کسی انتقام کی اجازت نہیں ہے۔ نزول آیت کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے باپ بیٹی کو بلا کر حق تعالیٰ کا حکم سنایا، اور انتقام لینے کا پہلا حکم منسوخ فرمایا۔

میاں بیوی کے فرائض اور زوجین کے اپنے اپنے حقوق:

سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [البقرة:۲۲۸] یعنی عورتوں کے حقوق مردوں کے ذمہ ایسے ہی واجب ہیں جیسے مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمہ ہیں۔ اس میں دونوں کے حقوق کی مماثلت کا حکم دے کر اس کی تفصیلات کو عرف کے حوالہ سے بیان فرمایا۔ جاہلیت اور تمام دنیا کی ظالمانہ رسموں کا یکسر خاتمہ کر دیا۔ ہاں! یہ ضروری نہیں کہ دونوں کے حقوق صورت کے اعتبار سے برابر ہوں، بلکہ عورت پر ایک قسم

کے کام لازم ہیں، تو اس کے مقابل مرد پر دوسری قسم کے کام لازم ہیں۔ عورت امورِ خانہ داری اور بچوں کی تربیت و حفاظت کی ذمہ دار ہے، تو مرد ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کسبِ معاش کا ذمہ دار ہے۔ عورت کے ذمہ مرد کی اطاعت وخدمت ہے، تو مرد کے ذمہ اس کا مہر اور نفقہ، یعنی تمام ضروری اخراجات کا انتظام ہے۔ غرض یہ کہ اس سورۂ بقرہ کی آیت کریمہ نے عورتوں کو مردوں کے مماثل حقوق اور فرائض دیدیے، تاکہ یہ سفر بآسانی طے ہو۔

لیکن ایک چیز ایسی بھی ہے جس میں مردوں کو عورتوں پر برتری اور ایک خاص فضیلت وشرف حاصل ہے۔ اس لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ [البقرة:۲۲۸] یعنی مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت کا حاصل ہے۔

ان آیات میں اسی درجہ کا بیان قرآن کریم کے حکیمانہ طرزِ بیان کے ساتھ اس طرح کیا گیا ہے کہ مردوں کی یہ فضیلت اور برتری خود عورتوں کی مصلحت اور فائدہ کے لئے، اور عین مقتضائے حکمت ہے۔ اس میں عورتوں کی نہ کسر شان ہے، نہ ان کا کوئی نقصان ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ قَوَّامٌ، قَيَّامٌ، قَيِّمٌ، عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام یا نظام کا ذمہ دار اور چلانے والا ہو۔ آیت الکرسی کے شروع میں ﴿اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ میں تفصیل گزر چکی ہے۔ یہاں قَوّٰم کا ترجمہ حاکم صحیح ہے، یعنی مرد عورتوں پر حاکم ہیں، کیونکہ ہر اجتماعی کام کے لئے عقلاً وعرفاً یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سربراہ یا امیر اور حاکم ہو، جو انتظام چلائے، اور اس کی نگرانی کرے، جس طرح ملک یا سلطنت یا کارخانہ یا فیکٹری یا تعلیمی ادارہ وغیرہ کے لئے حاکم، سربراہ یا مسئول ضرور ہوتا ہے، جس کے بغیر وہ نظام نہ چل سکتا ہے، اور نہ ترقی کرسکتا ہے۔ قبائل و اقوام میں اس کے لئے رئیس یا سردار کا ہونا بھی اسی قانون کے تحت لازمی ہوتا ہے۔ اسی طرح گھر کے عائلی نظام کے لئے ضروری ہے کہ اس کا بھی کوئی سربراہ وامیر ہو۔

عورتیں اور بچے اس منصب کے لئے موزوں نہیں ہوتے، اور نہ ہی وہ اس عائلی نظام کی خوشحالی اور ترقی کے لئے کام کرسکتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس نظام کے لئے مردوں کو منتخب فرماکر انہیں قواموں کا منصب سونپا، کیونکہ مردوں کی صلاحیت اور استعداد، نیز علمی وعملی وانتظامی غور وفکر عورتوں سے کہیں زیادہ ہے، جس کا ہر کس وناکس اعتراف کرتا ہے، اور خود عورتیں بھی اس کو تسلیم کرتی ہیں۔

دنیا کے فلاسفر، سیاستدان، حکماء، عقلاء، اور بلغاء سب تسلیم کرتے ہیں کہ عورت ہزار درجہ ہوشیار، تعلیم یافتہ،

اور سنجیدہ ہو، مگر مرد کے مقابلے میں کمزور وضعیف اور ناتوان ہے، جبکہ وہ اپنے دفاع کے معاملہ میں کمزور و عاجز ہے۔ شرعی نقطہ نگاہ میں جو برتری مردوں کو حاصل ہے صنف نازک (عورتوں) کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہے۔ مثلاً عقل، دین، تعلیم، قوت، عزت، عزم، حزم، نبوت، خلافت، امامت، قضاء، جہادی جذبہ، خطابت، آذان، خطبہ جمعہ، عید، قیادت، اور فوجی کمان، مزدوری مشقت، محنت و جفاکشی، تجارت، ملازمت وغیرہ، انہیں امور کی بنا پر ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ اور ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ فرمایا گیا۔

یہ وہ فضائل و کمالات اور برتری کے اسباب ہیں جو کہ مردوں کے اپنے کسب واختیار سے باہر ہیں۔ خلاقِ کائنات جلّ جلالہ نے نظامِ دنیا کے چلانے کی خاطر برتری کے تمام اسباب و ذرائع مردوں میں پیدا کردیئے، اور انہیں عورتوں پر فضیلت و کرامت عطا فرمائی۔ اسی طرح مردوں کی دوسری فضیلت وتفوّق جو انہیں حاصل ہے، وہ کسبی اور اختیاری ہے، مثلاً مردوں میں جفاکشی زیادہ ہے، وہ سفر وحضر میں تجارت و کاروبار انجام دیتے ہیں، جفاکشی پر انہیں مشق حاصل ہے، قوت جسمانی اور قوت ارادی کی بنیاد پر زیادہ رزق وروزی اور مال کما کر اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرتے ہیں، اپنے فیملی کے لئے رہائشی مکان تیار کرتے ہیں، اہل وعیال کے نان ونفقہ علاج و معالجہ اور تمام عائلی ضروریات کا انتظام کرتے ہیں، بیوی کا حق مہر ادا کرتے ہیں۔ یہ وہ امور ہیں کہ جنہیں عورت ذات ہرگز انجام نہیں دے سکتی، یہی مطلب ہے آیت کریمہ کا کہ: ﴿بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾۔

موجودہ دنیا میں روز مرّہ کا مشاہدہ ہے کہ ننانوے فیصد کمائی مردوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے، اور تمام گھریلو اخراجات مرد ہی پورا کرتے ہیں، شاید اسی نکتہ کے تحت اللہ تعالیٰ نے میراث میں مردوں کا حصہ دوگنا کردیا، تاکہ وہ اپنے مالی فرائض کی انجام دہی سے عاجز نہ ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں وجوہات سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مردوں کی حاکمیت عورتوں پر قیامت تک مسلّم اور قائم رہے گی، اور مفضول ہر زمانہ میں افضل کا تابع رہے گا۔ اگر کوئی اس خدائی فیصلہ کے خلاف اقدام کرے گا، جیسے یورپ نے کیا، اور مغرب نواز مسلمان ممالک نے کیا، اور کر رہے ہیں، تو انہیں بے شمار نقصانات اور تباہ کن نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا، جیسے وہ لوگ آج اس کی سزا بھگت رہے ہیں، نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ ان کا پورا معاشرہ حیوانوں کے رنگ میں رنگا ہوا ہے، ان کی نسلیں تباہ ہو چکی ہیں، ان کی عورتوں کو معلوم نہیں کہ ان کے حقیقی شوہر کون ہیں۔ جنسی بیہودگیوں میں مبتلا لاکھوں حرامی بچے پیدا ہو رہے ہیں، پوری فوج حرامزادوں پر مشتمل ہے۔

دنیا کے اطراف واکناف میں ظلم وبربریت کا دور دورہ ہے، اولادِ آدم انسانیت وشرافت سے محروم تباہی کے بھیانک راستوں پر بھٹک رہے ہیں۔ شناختی کارڈوں میں صرف ماں، وہ بھی مشکوک وغیر معلوم کے نام کے ساتھ گھوم رہے ہیں۔ باپ کا خدا حافظ، معلوم نہیں کہ کون ہے، اور کتنے ہیں۔ ساری کائنات کا تحفظ وبقاء اور انسانیت کا وجود الحمدللہ صرف اسلام کے نام سے روشن ہے۔ جن ملکوں میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہیں وہاں بھی بہت سے لوگ یورپ اور امریکا کے حیوانوں کی طرح جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے متوالے ہیں، یہ لوگ نہ صرف یہ کہ خود بے حیائیوں، فحاشیوں، اور بدکاریوں میں مبتلا ہیں، بلکہ باقاعدہ ان کی سوسائٹیاں بنی ہوئی ہیں، جن کی برابر اور مستقل یہ کوشش ہے کہ نکاح اور حیاء وشرم کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔

ایسے جرائد، ہفت روزہ، یک روز، اور ماہنامے جاری ہیں جن میں بے حیائی کے کاموں کو اچھالا جاتا ہے، ننگی تصویریں شائع کی جاتی ہیں، جذباتِ انسانیہ کو ابھارا جاتا ہے، اور ایسی انجمنیں بنی ہوئی ہیں جو عامۃ المسلمین کو بے حیائی اور زناکاری کے غار میں دھکیلنے کی پوری کوشش کررہی ہیں۔ ننگے لوگوں کے کلب ہیں، زناکاری کے اڈے ہیں، ان کی پوری سرپرستی کی جاتی ہے، فاحشہ عورتوں کو حکومتیں لائسنس دیتی ہیں۔ پہلے تو اتنا ہی تھا کہ سینما ہال میں معاشقہ کے نظارے کئے جاتے تھے، اور سینما ہال بازاروں میں ہوتے تھے، اب تو ٹیلیویژن نے ساری کسر پوری کردی۔ فحش فلموں کی بھرمار ہے، چوبیس گھنٹہ مسلسل حیا سوز وغیرت کش فلمیں چلتی ہیں، نوے فیصد مسلمان گھرانے پابند صوم وصلوٰۃ، دینی علوم کے دلدادے، خبروں کے بہانے ابلیسی کارنامے دیکھ دیکھ کر محظوظ ہورہے ہیں۔

چو پیرش جام می نوشد مریدش راچہ میخوانی ☆ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

ٹی وی، وی سی آر، گندی حیا سوز فلمیں چلا کر بچوں سے بوڑھوں تک نوجوانوں سے لے کر نوجوان لڑکیوں تک بے حیائی کے سیلاب میں بہہ رہے ہیں۔ بے حیا ماں باپ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آدھی رات تک لطف اندوز ہورہے ہیں۔ رات چار بجے جب سوجاتے ہیں تو صبح نو دس بجے اٹھتے ہیں، کہاں گئی نماز؟ اور کہاں رخصت ہوا اسلام؟ جن حکومتوں کے سربراہوں کا بلند بانگ یہ دعویٰ ہے کہ ہماری حکومت اسلامی ہے، ان کے ٹی وی پروگراموں میں اور یورپ وامریکہ برطانیہ وغیرہ کے ٹی وی پروگراموں میں ذرّہ برابر فرق نہیں ہوتا۔

ع برایں عقل وایمان بباید گریست

تعجب یہ ہے کہ دیندار لوگ بھی اس بے حیائی کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، وہ بھی اپنے بچوں کو آزاد چھوڑے ہوئے ہیں۔ پرانے قسم کے جو کچھ لوگ باقی ہیں، وہ نئی نسل کے نوجوانوں کو کیا سمجھائیں، نئی نسل کے نوجوان تو انہیں ایک طرح کا بد دماغ اور جانور سمجھتے ہیں، اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔

آج کے نوجوان قرآن وسنت کی عصمت وعفت کی مقدس تعلیم کو پسند نہیں کرتے، یہود ونصاریٰ کی بے حیائی پُر فریفتہ اور نازاں رہتے ہیں۔ بے حیائی کے داعیوں نے عامۃ الناس کو اس سطح پر لا کھڑا کیا ہے کہ پیچھے مڑنے اور حیاء وشرم اختیار کرنے کے لئے بہت بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ گزشتہ زمانوں میں کوئی شخص بدکاری کرتا تو چھپ چھپا کر کرتا تھا، اور بدکار عورتوں کو بھی معاشرہ میں بری نظروں سے دیکھا جاتا تھا، معاشرہ میں ان کی کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن آج تو عفت وعصمت اور حیاء وشرم عیب بن گئی ہے، حیاداروں کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے، وہ معاشرہ میں معتوب اور انتہاء پسندی کے طعنوں کے نشانہ بنے ہوئے ہیں، اور بے حیائی کو ہنر وعقلمندی اور کمال سمجھا جارہا ہے، اور اُسے معاشرہ کا جزو اعظم سمجھا جاتا ہے۔

بدبختی کہئے یا بدنصیبی، پورے کرۂ ارض پر ایک اسلامی ملک ایسا نہیں ہے جو یورپی گندی تہذیب سے کنارہ کش اور پاک ہو، یا اسلامی تعلیمات اور مذہبی اقدار سے سرشار ہو۔ مگر تصویر کا دوسرا رخ اگر دیکھا جائے تو کروڑوں مسلمان اب بھی مذہب وشریعت اور قرآن وسنت پر الحمد للہ عمل پیرا اور مستحکم ہیں۔ اگر لادین طبقہ دنیا کے ہر حصے پر بکثرت براجماں ہیں، تو دیندار طبقہ بھی ایک حد تک اسلام پر کاربند ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ☆ چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

حدیث شریف میں ارشاد ہے: روزِ قیامت اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیں گے کہ اپنی اولاد میں سے جہنم کا حصہ الگ کردیں، وہ عرض کریں گے جہنم کا حصہ کیا ہوگا؟ ربّ العزّت ارشاد فرمائیں گے: ہزار میں سے نوسو ننانوے دوزخ کیلئے الگ کردیں، جنت کیلئے صرف ایک باقی رکھیں۔ [بخاری]

اگر ہر زمانہ میں تقویٰ وطہارت اور حیاء واعمال صالحہ کا عروج ہو، تو قیامت کا معاملہ مزید پیچیدہ ہوگا، اور اس کی آمد میں تاخیر ہوگی۔ پس ضروری ہے کہ دنیا میں بے دینی، بے حیائی اور بے شرمی بکثرت جلدی پھیل جائے، تاکہ قیامت کی آمد میں مزید دیر نہ ہو، کیونکہ نیکوکاروں اور پرہیزگاروں پر قیامت نہیں آئے گی، وہ صرف برائیوں اور برے لوگوں پر آئے گی۔ تو قیامت کی آمد کی خاطر برائیوں کی کثرت کی اشد ضرورت ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا: ''کہ ہر دین کا ایک خاص مزاج ہے، اور دین اسلام کا مزاج حیاء ہے''۔ [مشکوٰۃ]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کہ حیاء و ایمان دونوں ساتھ ساتھ ہیں، جب ان میں سے ایک چھین لیا جاتا ہے تو دوسرا بھی چلا جاتا ہے''۔ [مشکوٰۃ] اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: ''جہاں حیاء نہ ہو وہاں ایمان نہیں رہے گا''۔ [مشکوٰۃ] اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: ''حقیقی مؤمن ہرگز بے حیاء نہیں ہوتا''۔ [مشکوٰۃ]

مطلب واضح ہے کہ بے حیاء مؤمن نہیں ہوتا، کیونکہ ایمان وحیاء لازم وملزوم ہیں، جیسے آگ اور اس کی حرارت، یا پانی اور اس کی برودت۔ اگر آگ میں حرارت نہ ہو تو وہ آگ نہیں، اسی طرح پانی میں برودت نہ ہو تو وہ پانی نہیں، اگر مؤمن میں حیاء نہ ہو تو وہ مؤمن نہیں رہے گا، کوئی یہودی یا نصرانی یا ہندو ہی ہوگا۔

نیک اور فرمانبردار بیوی:

آیت کریمہ میں پہلے نیک صالح اور فرمانبردار بیوی کا تذکرہ ہے، پھر نافرماں بیوی کا ذکر ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ یعنی نیک عورتیں وہ ہیں جو مرد کی حاکمیت کو تسلیم کر کے ان کی اطاعت کرتی ہیں، اور مردوں کی غیر حاضری میں پیٹھ پیچھے بھی اپنے نفس اور ان کے مال واولاد کی حفاظت ونگہداشت کرتی ہیں۔ یعنی اپنی عصمت و پاکدامنی اور گھر کے اثاثے سامان، اور دیگر اموال کی حفاظت جو امورِ خانہ داری میں سب سے اہم وضروری ہیں، ان کے بجالانے میں مردوں کے سامنے اور پیچھے کے حالات بالکل مساوی ہیں۔

الغرض! مرد موجود ہو یا غیر حاضر ان کی خیالداری میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سرور عالم ﷺ سے دریافت ہوا کہ عورتوں میں بہتر کون سی عورت ہے؟ ارشاد فرمایا: ''وہ عورت بہتر ہے کہ جب شوہر اس کی طرف دیکھے تو اُسے خوش کرے۔ یعنی شکل وصورت اچھی ہو، صاف ستھری پاکیزہ ہو، جب شوہر اُسے دیکھے تو خوشی محسوس کرے، اور فرمانبرداری کا یہ عالم ہو کہ جب اسے کسی کام کا حکم دیدے تو فوراً تعمیل کرے، اور امانتداری کا یہ عالم ہو کہ اپنی جان (عصمت وعفت) اور شوہر کے مال کی پوری حفاظت کرے، خیانت نہ کرے۔ یعنی ایسے کام نہ کرے جو شوہر کو ناگوار ہو''۔ [مشکوٰۃ، نسائي]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''جس کو چار چیزیں

مل گئیں اس کو دنیا وآخرت دونوں کی خیر مل گئی: (۱) شکر گزار دل (۲) ذکر کرنے والی زبان (۳) مصیبت پر صبر کرنے والا بدن (۴) ایسی بیوی جو اپنی جان میں اور شوہر کے مال میں خیانت نہیں کرتی"۔ [مشکوۃ و بیهقي شعب الإيمان]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "جو عورتیں اونٹوں پر سواری کرتی ہیں (عرب کی عورتیں) ان میں سب سے بہتر قریش کی نیک عورتیں ہیں، جو بچوں پر ان کی چھوٹی عمر میں بہت زیادہ شفقت کرنے والی ہوتی ہیں، اور شوہر کے مال کی خوب حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں"۔ [صحیح بخاري] سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "جو عورت اپنے شوہر کی تابعدار اور مطیع ہو اس کیلئے استغفار کرتے ہیں پرندے ہوا میں اور مچھلیاں دریا میں اور فرشتے آسمانوں میں اور درندے جنگلوں میں"۔ [البحر المحيط]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں آئی، اور کہنے لگی: یارسول اللہ! مجھے بتایئے: خاوند کا حق بیوی پر کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "خاوند کا حق بیوی پر یہ بھی ہے کہ اگر اس کے ناک سے خون یا پیپ بہہ رہا ہو، اور عورت اس کو اپنی زبان سے چاٹ لے تب بھی اس کا حق ادا نہ ہوگا، اور اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم کرتا کہ اپنے شوہروں کا سجدہ کریں۔
[درمنثور، حاکم، بزار، بیہقی وغیرہ]

چونکہ شوہر کے حقوق اور اس کی خدمت اور اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کوئی آسان کام نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے محسنہ و پاکیزہ عورتوں کیلئے اپنی حفاظت و توفیق شامل حال کر کے فرمایا:

﴿بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ یعنی اس حفاظت میں اللہ تعالیٰ عورت کی مدد فرماتے ہیں، اور اُسے توفیق دیدیتے ہیں، کہ وہ ان خدماتِ شاقہ کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہو سکیں، ورنہ نفس و شیطان کہاں گوارا کرتے ہیں کہ کمزور وناتواں عورت شوہر کے حقوق اَحسن طریقہ سے ادا کر سکے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی توفیق کا ثمرہ ہے کہ کم عقل و بے کس عورت ان تمام حقوقِ شاقہ کو بخوبی پورا کر رہی ہوتی ہے۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبدالرحمن بن زہری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا کہ نیک عورت کی مثال جو نیک آدمی کے پاس ہو اس تاج کی طرح ہے جو سونے کا بنا ہوا ہو، اور بادشاہ کے سر پر ہو، اور بری عورت کی مثال نیک آدمی کے پاس اس بھاری بوجھ کی مانند ہے جو بوڑھے آدمی کے سر پر ہو۔ [درمنثور]

زن خوب و فرمان بر و پارسا ☆ کند مرد درویش را بادشاہ (سعدیؒ)

پارسا، فرمانبردار اور خوش اخلاق بیوی ایمان کی نعمت کے بعد بہت بڑی نعمت ہے، اور جنت کی طرح راحت وسکون اور لذتوں و مسرتوں کا پیغام ہے، جبکہ بد اخلاق، زبان دراز، اور ناشکر گزار عورت دنیا ہی میں جہنم اور جہنم کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے بھرپور عذاب ہے۔ [خلاصۃ درِّ منثور]

عورتوں کی تین قسمیں:

ابن ابی شیبہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ عورتیں تین قسم کی ہیں:

(۱) وہ عورت جو پاکدامن، مسلمان، نرم مزاج، سنجیدہ، خاوند سے محبت کرنے والی، بہت بچے جننے والی ہو، اور خاوند کی مدد کرنے والی ہو، ایسی عورتیں بہت کم ہیں۔ (۲) وہ عورت جو کہ مثل برتن کے ہے، بچہ جننے کے سوا کچھ نہیں کرتی، اور نہ جانتی ہے۔ (۳) وہ عورت جو سراسر خیانت کرتی ہو، اللہ تعالیٰ جس کی گردن میں چاہتے ہیں ڈال دیتے ہیں، جب نکالنا چاہتے ہیں نکال دیتے ہیں۔ [درِّ منثور]

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"عورتیں تین قسم پر ہیں: ایک قسم برتن کی طرح ہے، تو اٹھاتا ہے اور رکھ دیتا ہے (بے ہمت و بے حوصلہ ہے)۔ دوسری قسم خارش زدہ اونٹ کی طرح ہے۔ تیسری قسم خاوند سے محبت کرنے والی، اور بہت بچے جننے والی، وہ اپنے خاوند کی مدد کرنے والی، اس کے ایمان پر (نیکیوں پر معاون و مددگار) یہ عورت اپنے خاوند کے لئے خزانہ سے بہتر ہے۔ [درمنثور]

فائدہ:

تجربہ شاہد ہے، اور بہت کم اس کی مثال ملتی ہے کہ میاں بیوی دونوں میں حسن وخوبصورتی، تقویٰ وطہارت، دینداری، سخاوت، عقل وعلم وغیرہ اوصاف میں برابری ہو۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ میاں بیوی کے اعمالِ حسنہ، اسی طرح عیوب ونقائص کے اعتبار سے مماثلت نہیں ہوتی۔ اچھے لوگوں کی بیویاں اکثر وبیشتر اچھی نہیں ہوتیں، الا ماشاء اللہ ۔ اور بُرے وبے دین لوگوں کی بیویاں اکثر وبیشتر اچھی اور فرمانبردار ہوتی ہیں، الا ماشاء اللہ۔

یہ ایک قدرتی فیصلہ ہوتا ہے، جس کی حکمتیں اور مصلحتیں اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے بار بار صبر اور شکر کی، نیز عفوو درگزر کی تعلیم دی ہے، فرمایا:

﴿فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـٴًـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ [النساء: ۱۹]

(اگر تم ان (بیویوں) کو ناپسند کرتے ہو تو عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو، اور اللہ اس میں تمہارے لئے بہت بڑی خیر رکھے)۔

تم صرف بیویوں کی خامیوں کو مت دیکھا کرو، کوئی بھی انسان تمام خوبیوں کا اور اسی طرح تمام نقائص کا جامع نہیں ہوتا، ہر انسان میں کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں، اور نقائص وعیوب بھی، کسی کے عیوب پر اس کی خوبیوں کا پردہ ڈال کر صبر کرو، اور اس کے چند ایک عیوب کو اس کی خوبیوں کی وجہ سے برداشت کر کے شکر ادا کرو، کوئی انسان سرتاپا نہ خوبیوں کا مجموعہ ہوسکتا ہے، نہ نقائص کا، بلکہ تِلْکَ بِتِلْکَ۔

اور جہاں عورتوں کی خوبیوں اور نقائص پر کڑی نظر رکھتے ہو، وہاں اپنے نقائص وخوبیوں پر بھی نظر رکھا کرو، کہ تم کس پایہ کے شوہر ہو، کہیں ایسا تو نہیں کہ نیک عورت کیلئے تم ایک ناقابلِ برداشت شوہر ہو۔ امام جاحظ رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی بدصورت تھے ان کی بیوی ایک وزیر کی بہت خوبصورت بیٹی تھی، میاں بیوی دونوں کہا کرتے تھے: ان شاء اللہ ہم دونوں جنتی ہیں، بیوی صبر کی وجہ سے کہ بدصورت شوہر پر صابر ہے، اور شوہر شکر کی وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حسین عورت نصیب کی ہے۔ پس چاہئے کہ ہر مسلمان اسی پر کاربند ہو، صبر وشکر کا دامن تھام لے۔ واللہ اعلم

فرمانبردار عورتوں کے ذکر خیر کے بعد نافرمان عورتوں کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ کہ جن عورتوں کی نافرمانی اور ناک چڑھانے کا خوف ہو، جن کے مزاج بگڑے ہوئے ہوں، اوّل تو انہیں ناصحانہ طور پر سمجھاؤ، تاکہ بدمزاجی چھوڑ دیں، اگر وہ مرغی کی ٹانگ پکڑ کر (جیسے ضدی عورتوں کا شیوہ ہے) تمہاری نصیحت نہ مانیں، اور بدستور سرکشی پر اڑی رہیں، تو ان کے ساتھ بستروں اور خوابگاہوں میں لیٹنا ہی چھوڑ دو، اور انہیں الگ کردو، جو کہ ایک سمجھدار عقلمند عورت کیلئے اچھی تدبیر اور فائدہ مند سزا ہے۔

اگر یہ طریقہ کارآمد نہ ہو، تو پھر مناسب زدوکوب کرلو، اور مارپیٹ کرسکتے ہو۔ حجۃ الوداع کے موقعے پر میدانِ عرفات میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عالمی خطبہ ارشاد فرمایا اس میں یہ کلمات ارشاد فرمائے: "فاتقوا اللہ فی النساء فانکم اخذتموھن بامان اللہ واستحللتم فروجھن بکلمۃ اللہ تعالیٰ ولکم علیھن ان لا یؤطئن فروشکم احداً تکرھونہ فان فعلن ذٰلک فاضربوھن ضرباً غیر مبرّح ولھن علیکم رزقھن وکسوتھن" [رواہ مسلم] کہ عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیونکہ تم نے ان کو ایسے عہد کے ذریعہ لیا ہے جو تمہارے اور اللہ تعالیٰ

کے درمیان ہے اور تم نے ان کی شرمگاہوں کو اللہ تعالیٰ کی شریعت کے مطابق حلال کیا ہے، ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ تمہارے بستروں پر کسی کو نہ آنے دیں، جسے تم غیرت ایمانی کی وجہ سے ناگوار سمجھتے ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو ایسا مارنا مارو کہ جس سے ہڈی، پسلی، دانت نہ ٹوٹے، اور تم پر ان کی خوراک اور پوشاک واجب ہے، جسے اچھے مناسب طریقہ پر حسبِ استطاعت ادا کرو۔

معلوم ہوا کہ جن صورتوں میں مارنے یا سزا دینے کی اجازت ہے اس میں یہ بھی شرط ہے کہ سخت مار نہ مارے، جس سے ہڈی پسلی ٹوٹ جائے، یا اس طرح کا کوئی اور شدید صدمہ اور تکلیف پہنچ جائے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ: اول نصیحت کرنا، پھر ساتھ لیٹنا چھوڑ دینا، پھر مارنا ترتیب کے ساتھ ہے۔ عقل وعرف کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اضعف سے اشد کی طرف رجوع اور انتقال، یعنی **انتقال من الادنیٰ الی الاعلی** ہو۔ برعکس بے ترتیب نہ ہو۔

سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے اصلاحِ زوجہ اور میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات کے استحکام کے لئے کیسے بہتر شریفانہ حکیمانہ تدابیر بتلا دیں؟ سرورِ عالم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: اول و دوئم تدبیر اگر بالفرض کارگر نہ ہوئی تو بامرِ مجبوری معمولی مار پیٹ کی اجازت ہے، مگر ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مار پیٹ اچھے لوگوں کا شیوہ نہیں ہوتا، اور میں اسے پسند نہیں کرتا، فرمایا: **ولن یضرب خیار کم**۔ تمہارے اچھے لوگ اس کو ہرگز پسند نہ کریں گے، اور ساتھ شفقتاً یہ بھی ارشاد فرمایا: اگر تم بمجبوری مارنا چاہو تو: **ولا تضرب الوجه ولا تقبح ولا تهجر الا فی البیت** [مشکوۃ]

چہرے پر مت مارو (انسان کی شرافت وحسن کا مرکز) اور برا کہنے اور گالم گلوچ سے پرہیز کرو، اور اسے گھر ہی میں رکھو، بسترہ علیحدہ کر کے گھر سے مت نکالو، کہیں بجائے اصلاح کے مزید فتنہ پیدا نہ ہو، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ اگر مرد میں جوش زیادہ پیدا ہوا، اور مار پیٹ میں اعتدال نہ رہا، اور مرد نے اخلاقی اقدار پامال کئے، تو خاندانی دار و گیر تک نوبت پیدا ہوگی، اور سارے تعلقات ہی ختم ہو جائیں گے، اور خاندانی جنگ وجدال تک معاملہ پہنچ جائے گا، جو بہت ہی برا ہوگا، اور بسا اوقات قتل وقتال کی بھی نوبت آئیگی، جس سے کئی قیمتی جانیں ضائع ہو جائیں گی۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا﴾ یعنی اگر عورتیں شرارت چھوڑ کر تمہاری فرمانبرداری پر آمادہ ہو گئیں، تو مزید انہیں تکلیف دینے کا راستہ تلاش نہ کرو، اور ان پر مزید کوئی زیادتی نہ کرو، ظلم سے پیش نہ آؤ،

گزشتہ را صلوٰت آئندہ را احتیاط پر عمل کرو، اور طعن و تشنیع سے بھی باز آجاؤ، اور اچھی طرح سے انہیں معاف کرو۔

اس میں ان لوگوں کو نصیحت ہے، جو بیویوں کو خواہ مخواہ ساس اور دیگر عورتوں کے اکسانے اور کہنے پر، اور شوہر کے خاندان کی عورتوں کی جھوٹی شکایتوں پر سزا دیتے ہیں، کیونکہ باہر کی لڑکی جب شوہر کے گھر کی زینت بنتی ہے، اور شوہر اس سے محبت کرتا ہے، اور اس کی فرمائشوں کو پورا کرتا ہے، تو شوہر کی ماں اور بہنوں پر ناگوار گزرتی ہے، پس اس بیچاری کی عزّت وحرمت گرانے کی خاطر منصوبہ بندی ہوتی ہے، جھوٹی شکایتوں کی بھرمار شروع ہو جاتی ہے۔ ایک بھولی بھالی بے گناہ لڑکی پر ناجائز تہمت لگا لگا کر اسے تنگ کیا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باہر سے آئی ہوئی شریف لڑکی پریشانیوں سے تنگ آکر ناشزہ بن جاتی ہے۔

جو لوگ ضعیفوں پر ظلم کرتے ہیں، اول تو انہیں سوچنا چاہئے کہ ایسا روز بد ان کے لئے بھی کبھی آنے والا ہے، **کما تدین تدان**، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ دوئم یہ کہ روزِ محشر کا حساب بہت سخت اور ناقابلِ برداشت ہے، وہاں ضعیفوں کا حق پورا پورا ظالم سے لیا جائے گا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: شب معراج میں نے دیکھا کہ ایک عورت جہنم میں جل رہی ہے، حضرت جبریل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یہ کس گناہ کی پاداش میں سزا کاٹ رہی ہے؟ فرمایا: اس نے ایک بلی پر ظلم کیا تھا، اسے باندھے رکھا، اور کھانے کو کچھ نہ دیا۔ [رواه البخاري]

جب بلی پر ظلم وزیادتی کا یہ ماجرا ہے، تو عورتوں پر ظلم کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ جانے کیا سزا ہوگی؟ سارا دن خدمت کر کے تھک جاتی ہیں، پیار و محبت کی ایک بات کے لئے ترستی ہیں، سارا خاندان کھاتے پیتے عیش کرتے ہیں، اور دستر خوان پر بیٹھ کر ہنسی مذاق کے ساتھ کھاتے رہتے ہیں، جبکہ پکانے والی خادمہ دور بیٹھ کر رو رہی ہوتی ہے، اور کسی بچت کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ کتنے سنگدل ہیں لوگ؟ جن سے روزِ قیامت ایسا سخت محاسبہ ہوگا شاید انہیں تباہی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ظالم کا عذاب کافر کے عذاب کے برابر ہوگا، یہ ہمارے پیشوا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، جن پر کھربوں صلوٰۃ وسلام ہوں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا﴾ اللہ تعالیٰ برتر ہے، اور بڑا ہے، اس کو سب پر قدرت حاصل ہے، تم جس طرح اپنے ماتحت ضعیفوں پر قدرت رکھتے ہو، اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر بھی قدرت رکھتا ہے، اس کی قدرت و گرفت سے بچو، اور اس کے ضعیف بندوں پر ظلم کرنے سے اجتناب کرلو، کیونکہ وہ اپنی ضعیف مخلوقات کا وکیل وحمایتی بھی ہے، لہٰذا محتاط رہو۔

عورتوں کو مارنے کے بارے میں تنبیہ:

یہ جو ارشاد فرمایا کہ ان کو پہلے نصیحت کرو، اور ان کے بستروں میں لیٹنا چھوڑ دو، اس سے معلوم ہوا کہ گھر چھوڑ کر نکل نہ جائیں، خود بھی گھر میں رہو، اور بیوی بھی گھر میں رہے، اور نافرمانی کی سزا کے طور پر ساتھ لیٹنا چھوڑ دیں۔ اگر گھر چھوڑ کر چلے گئے، تو اس میں اور بہت سے خطرات ہیں۔ حضرت معاویہ قشیری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! بیوی کا ہم پر کیا حق ہے؟ فرمایا حق یہ ہے کہ جب تو کھائے تو اسے بھی کھلا، اور جب تو پہنے تو اسے بھی پہنا، اور چہرہ پر نہ مار، اور برے الفاظ منہ سے نہ نکال، اور اس سے تعلق ختم نہ کرو، مگر گھر میں رہتے ہوئے۔ [أبو داؤد]

حضرت ایاس بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کی باندیوں کو نہ مارو (چند دن کے بعد) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے، اور عرض کیا: یارسول اللہ! عورتیں تو دلیر ہو گئیں، یعنی جب انہیں پتہ چل گیا کہ مارنے کی ممانعت ہے تو سر پر چڑھ گئیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بقدرِ ضرورت مارنے کی اجازت دے دی۔ اب تو عورتیں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں پہنچیں، اور شوہروں کے مارنے کی شکایتیں کرنے لگیں، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محمد کے گھر والوں کے پاس بہت سی عورتیں آئی ہیں، جو اپنے شوہروں کی شکایتیں کر رہی تھیں، یہ لوگ تم میں اچھے لوگ نہیں ہیں۔ [رواہ أبو داؤد]

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ: عورتوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف کو برداشت کریں، اور صبر سے کام لینا مارنے سے افضل ہے۔ ہاں! اگر کہیں بہت ہی مجبوری پیش آجائے تو مار پیٹ سے کام چلا لو، اور مارنے میں اعتدال رکھو، زیادہ تجاوز نہ کرو، جیسے پہلے بیان ہوا۔

حضرت عبد اللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اپنی بیویوں کو ایسے نہ مارو جیسے غلام کی پٹائی کی جاتی ہے، کیونکہ اس کے بعد دن کے آخری حصہ میں اس سے ہمبستری کرنے لگو گے۔ [بخاري]

مطلب یہ ہے کہ مرد کو عورت کی حاجت ہے، اس سے مطلب نکلتا ہے، ابھی تو مار بجائی، پھر چند ساعت بعد ساتھ لیٹنے لگیں گے۔ اس وقت شریف الطبع شوہر کو ندامت آئے گی کہ ابھی تو اس کو مارا تھا، اور اب اسے محبوبہ بنا کر ساتھ لٹا لیا، پس شرمندگی ضرور محسوس ہوگی، تو چاہئے کہ شوہر ہرگز ایسا کام نہ کرے جس سے اسے خفت ہو، اور عورت کو

بھی افسوس ہوگا، اور اس کے دل میں شوہر کی عزّت کم ہوگی، وہ کہے گی: یہ کیسا مردود انسان ہے، ذرا سے وقت میں کچھ ہے، اور ذرا سے میں کچھ، یہ صرف اپنے مفاد کا غلام ہے، اس کے دل میں نہ میری محبت ہے، اور نہ لحاظ۔ پھر فرماتے ہیں کہ مرد چار باتوں پر عورت کو مارنے کا مجاز ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) بناؤ سنگھار چھوڑنے پر، جبکہ شوہر اس چیز کو چاہتا ہو۔

(۲) شوہر کے پاس آنے سے انکار پر، جبکہ وہ ہمبستری چاہتا ہو، اور اسے بلاتا ہو۔

(۳) فرض نماز وروزہ، فرض غسل چھوڑنے پر۔

(۴) گھر سے باہر نکلنے پر، جبکہ نکلنے کے لئے کوئی شرعی مجبوری نہ ہو۔

ان چار چیزوں جیسی کوئی اور بات ہو، تو اس پر بھی سزا دی جاسکتی ہے۔

اگر میاں بیوی میں شدید مخالفت ہوجائے، تو دو آدمی مصالحت کیلئے بھیجے جائیں:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ
اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

ترجمہ: اور اگر تم کو شوہر اور بیوی کے آپس کے اختلاف کا ڈر ہو تو مقرر کرو ایک آدمی فیصلہ کرنے والا مرد کے خاندان سے، اور ایک آدمی فیصلہ کرنے والا عورت کے خاندان میں سے، اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا فرمائے گا، بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے ﴿۳۵﴾

معارف ومنازل

پہلے ارشاد ہوا کہ جن عورتوں کی طرف سے نافرمانی کا خوف ہو، تو ان کی اصلاح کا طریق کار بالترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے عورتوں کو نصیحت وفہمائش کرو، اگر حالات درست نہ ہوں تو ان کو خواب گاہوں سے علیحدہ کردو، اگر اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہ ہو تو پھر انہیں اعتدال کے ساتھ جسمانی سزا دے دو، اور مار پیٹ کرو۔ اگر یہ بھی کارآمد نہ ہو تو پھر پنچائیت کے ذریعے فیصلہ صادر کرو، یا مصالحت یا افتراق، جو بھی فیصلہ ہوگا اس پر عمل کراؤ۔

اس چوتھے مرحلے میں یہ ضروری نہیں کہ ناچاقی اور غلطی ہمیشہ عورت کی ہو، بعض اوقات مرد کی طرف سے بھی زیادتی کا امکان ہوسکتا ہے، اور اس طرح ہوتا بھی ہے۔

غرض یہ ہے کہ ان دوآیتوں میں انسان کی خانگی اور عائلی زندگی کا ایک ایسا جامع اور مکمل نظام ترتیب دیا گیا ہے کہ اگراس پر پورا عمل ہوجائے تو دنیا کے اکثر عائلی اور غیر عائلی جھگڑے اور جنگ وجدال ختم ہوجائیں گے، اور مرد وعورت سب مطمئن ہوکر اپنی خانگی زندگی کو ایک جنت کی خوشحال زندگی محسوس کرنے لگیں گے، اور خانگی جھگڑوں سے جو قبائلی اور پھر جماعتی خاندانی اور ملکی وشہری جنگیں شروع ہوجاتی ہیں، ان سب کا خاتمہ ہوجائے گا، اور امن وامان کا دوردورہ ہوگا۔

اس قرآنی نظام کی ترتیب وافادیت جو بے مثل وبے نظیر ہے، اس محکم نظام پر اجمالی نظر ڈالنے سے کئی عقدے جو حل ہوسکتے ہیں، اس کا مختصر بیان یہ ہے:

(۱) عورت کو پیار ومحبت سے نصیحت کی جائے، اور سمجھایا جائے۔

(۲) بستروں خواب گاہوں سے الگ دور رکھا جائے۔

(۳) تادیباً اعتدال کے ساتھ مار پیٹ کی جائے۔ مگر حدود کے اندر۔

(۴) گھر کا جھگڑہ گھر ہی میں تدریجاً گھریلو خاندان کے افراد کے ذریعہ حل کیا جائے۔

(۵) بصورتِ مایوسی برادری کے لوگ دوحکموں کے ذریعہ مصالحت کرادیں، تاکہ گھر میں نہیں تو دونوں خاندانوں کے لوگ جھگڑہ ختم کرائیں، ایک مرد کی طرف سے، ایک عورت کی طرف سے۔

(۶) اگر یہ بھی ممکن نہ ہوتو پھر حکام وعدالت کی طرف رجوع کیا جائے۔

فائدہ:

بہتر یہ ہے کہ مصالحت کنندہ دونوں شخص غیر جانبدار ہوں، کسی طرف ان کا جھکاؤ نہ ہو، عقلمند نبض شناس ہوں، لالچی یا ڈرپوک نہ ہوں، مرد وعورت دونوں کے مزاج اور حالات سے واقف ہوں، ان کا ارادہ اور نیت خالص ہو، تب وہ ایک اجتماعی مصالحت یا بجبوری کسی تفریقی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مدد ان کو حاصل رہے گی، جیسے ارشاد ہے: ﴿اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا﴾۔ اگر وہ اصلاح کا ارادہ کریں تو اللہ ان کے درمیان موافقت پیدا فرمائے گا۔

اور یہ بھی ضروری ہے کہ مصالحت کنندگان بااختیار ہوں، اور وہ جو فیصلہ غور وخوض کے بعد جاری کریں گے اس کے نفاذ پر انہیں قدرت حاصل ہو۔ اسی طرح کا واقعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی عدالت میں پیش آیا، حضرت علی

رضی اللہ عنہ نے تصفیہ کی خاطر دو حَکَم فیصلہ کنندہ مقرر فرمائے، عورت نے کہا کہ میں ان دونوں منصفوں کو اختیار دیتی ہوں کہ جو بھی فیصلہ کریں، خواہ میری مرضی کے موافق ہو، یا خلاف، مجھے قبول ہے، جبکہ مرد نے ایسا نہیں کیا، اور کہا: مجھے جدائی کا فیصلہ قبول نہیں ہوگا، اور مصالحت پر راضی رہوں گا، اور قبول بھی کروں گا، اگر کوئی مالی جرمانہ ہو تو اس پر بھی راضی رہوں گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ نہیں ہو سکتا، بلکہ تمہیں بھی ان دونوں حَکَمین (فیصلہ کنندگان) کو ایسا ہی اختیار دینا ہوگا جیسے عورت نے دیا ہے۔ [ابن کثیر]

پس معلوم ہوا کہ حَکَمین کا با اختیار ہونا ضروری ہے، اور یہ مرد و عورت پر ضروری ہے کہ وہ فیصلہ کنندگان کو اجتماع و تفریق دونوں کا اختیار تفویض کریں، ورنہ فائدہ نہ ہوگا۔ اگر اجتماع کا اختیار دیا گیا، اور تفریق کا نہ دیا گیا، یا عورت نے دونوں باتوں کا اختیار دیدیا، اور مرد نے ایک کا دیا، دوسری بات کا اختیار نہ دیا، جیسے ابھی گزرا، تو صحیح نہیں ہوگا۔ اسی طرح بالعکس بھی، کہ مرد نے مکمل اختیار دیدیا، اور عورت نے نہیں دیا، تو کام نہیں چلے گا۔

دیگر تمام نزاعات اور جھگڑوں میں حَکَم کے ذریعہ مصالحت کرائی جائے:

حضرات فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ باہم صلح کرانے کے لئے دو حَکَموں کے بھیجنے کی یہ تجویز صرف میاں بیوی کے جھگڑوں تک محدود نہیں، بلکہ دوسرے نزاعات میں بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے، اور ضرور لینا چاہئے، اور خصوصاً جبکہ جھگڑنے والے آپس میں عزیز و رشتہ دار ہوں، کیونکہ عدالتی فیصلوں میں ایک بڑی الجھن یہ ہوتی ہے کہ سالہا سال تک فیصلے نہیں ہوتے، مال کا ضیاع، وقت کا ضیاع اس کے علاوہ ہے۔ نیز کافی انتظار بھی پریشان کن ہے۔ پھر عدالتی فیصلے سارے غیر شرعی ہوتے ہیں، آج کل ہمارے ملک میں انگریزوں کا بنایا ہوا غیر شرعی قانون نافذ ہے، جو کہ سراسر ظالمانہ ہے۔

اس کے علاوہ عدالتی فیصلوں سے وقتی جھگڑہ تو ختم ہو جاتا ہے، مگر وہ فیصلے دلوں میں کدورت و عداوت کے جراثیم چھوڑ جاتے ہیں، جو بعد میں نہایت ناگوار شکلوں میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے قاضیوں کے لئے یہ فرمان جاری فرمادیا تھا کہ رشتہ داروں کے مقدمات کو انہی میں واپس کردو، تاکہ وہ خود برادری کی امداد سے آپس میں صلح کی صورت نکال لیں، کیونکہ قاضی کا فیصلہ دلوں میں کینہ و عداوت پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ [معین الحکام]

اس فرمانِ فاروقی کو ایسے پنچایتی فیصلوں کی خاص بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے جن کے ذریعہ ہر دو فریق کی رضا

مندی سے صلح کی کوئی صورت نکالی جاسکتی ہے، اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اگر چہ فاروقی فرمان میں دلوں کی کدورت کا تذکرہ ہے، مگر یہ عام ہے کہ رشتہ دار اور غیر رشتہ دار سب کے لئے ہے، کہ عدالتی فیصلے اکثر ایسا ہوا کرتے ہیں، اس لئے حکام وعدالتوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ مقدمات کی سماعت سے پہلے اس کی کوشش کرلیا کریں کہ کسی صورت سے فریقین کی آپس میں رضامندی کے ساتھ مصالحت ہوجائے۔

آج کل بعض خیر خواہ دیندار جج صاحبان بھی ایسا ہی کرلیا کرتے ہیں کہ مقدمات کی پہلی پیشی میں فریقین کے موقف سننے کے بعد انہیں مشورہ اور ہدایات دیتے ہیں کہ بجائے عدالت کے تم اپنے خاندان اور رشتہ داروں کی پنچایت کے ذریعہ جاکر مصالحت کراؤ، اور عدالتی پریشانیوں سے بچ جاؤ۔ ہم کہتے ہیں کہ عدالت کی طرف سے ایسے مشورے برحق اور صحیح ہوتے ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا﴾ بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا باخبر ہے، اس کو ہر چیز کا علم ہے۔ اگر کوئی بدنیتی یا کسی ظلم وزیادتی کا ارتکاب کرے، یا بے انصافی وکج روی اختیار کرے تو علیم وخبیر اس کا روزِ قیامت محاسبہ کرے گا، اور اسے سزا دے گا، لہٰذا محتاط رہو، اور کسی بے انصافی سے پرہیز کرو۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بناؤ، اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اور قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں اور پاس والے پڑوسی اور دور والے پڑوسی اور پاس بیٹھنے والے ساتھی کے ساتھ، اور مسافر کے ساتھ، اور اپنے غلام باندیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، بیشک اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو بڑائی کرنے والا ہے، فخر کرتا ہے۝

☆☆☆

توحیدِ باری تعالیٰ تمام عبادات وطاعات کی بنیاد اور جڑ ہے، اگر توحید ہے تو سمجھو سب کچھ ہے، اگر توحید نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ توحید درختِ طوبیٰ کی مانند ہے، دنیا میں سارے اعمالِ صالحہ اور جنت میں تمام راحتیں اور نعمتیں اس کی شاخیں ہیں۔ خوش قسمت لوگ صرف وہ ہیں جنہیں توحید عطا ہوئی، اور بدقسمت ومحروم وہ لوگ ہیں جنہیں توحید نصیب نہیں ہوئی۔ توحید آخرت کا سورج ہے، اور سارے اعمال اس کے اردگرد سیاروں کی طرح گھوم رہے ہیں۔ یہی وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کا تذکرہ ہو رہا ہے، اور اس کی ضد شرک سے خبردار کیا جا رہا ہے، کیونکہ شرک سے توحید ختم ہو جاتی ہے۔

اگر کسی کے اعمال پہاڑوں کے برابر ہوں، ایک ادنیٰ شرک کی وجہ سے سارے ضائع ہو جائیں گے، اور مشرک پر جنت ہمیشہ کے لئے حرام ہے۔ ایک بے عمل مسلمان اگر توحید کی نعمت سے مالا مال ہو، تو اس پر ابدی جہنم حرام ہوگی۔ توحید جنت کی چابی ہے، جبکہ شرک جہنم کی کنجی ہے۔ ایمان اور توحید شرک کے ساتھ کبھی جمع نہیں ہو سکتے، تو فرمایا:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا﴾ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بناؤ، وہ واحد لاشریک اکیلا وتنہا ہے، ذات اور صفات دونوں حیثیتوں میں شریک سے پاک اور منزہ ہے۔ جب بندہ توحید کا صدق دل سے اقرار کرے، اور خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت قولاً فعلاً اعتقاداً بجالائے، تو اس کے لئے تمام اعمالِ بدنیہ ومالیہ کی ادائیگی آسان ہو جائے گی، اور تمام حقوق اللہ وحقوق العباد اس کے لئے سہل ہو جائیں گے۔

عبادت کے معنی ہیں: أَقْصَى غَايَةِ التَّذَلُّلِ وَالْخُضُوْعِ۔ یعنی انتہائی درجے کی عاجزی اور نیازمندی کا اظہار، اور یہ عمل کبھی نیت سے ہوتا ہے، کبھی قول سے، کبھی عمل سے، کبھی مال سے۔ اور انتہائی عاجزی ونیازمندی مافوق الاسباب ہستی کا تصور رکھتے ہوئے محض اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ مختص ہے، اور اس کے علاوہ کسی کے لئے ہرگز جائز نہیں، کیونکہ کائنات کا مالک وخالق محسن ومربی صرف وہی ہے، اسی کی تاکید واستحکام کے لئے فرمایا:

﴿وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا﴾ اس عظیم ہستی مالک الملک کے ساتھ کسی بھی چیز (غیر اللہ) کو شریک نہ بناؤ۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے اور واجب الوجود ہونے میں تو کسی مذہب کے ماننے والوں کو شبہ وشک نہیں، اور نہ ہی ان دو صفات کا سوائے دہریہ کے کوئی منکر ہے، اور نہ ہی ان دو صفات میں کوئی شرک کرتا ہے۔ البتہ شرک ہوتا ہے عبادت اور تدبیر وتصرف میں۔ یہاں سے دوسرے مذاہب

کے ماننے والے اہلِ اسلام سے الگ ہو جاتے ہیں۔ پوری نوع انسانی میں سے دہریہ کی قلیل تعداد کے علاوہ تمام مذاہب کے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کے علاوہ اس عالم میں کوئی خالق نہیں۔ کافر، مشرک، یہودی، نصرانی، عیسائی، ہندو، سکھ، چینی، بدھ، مجوسی، غرض کسی سے بھی پوچھ کر دیکھ لو کہ کائنات اور اس کی ہر چیز کا خالق کون ہے؟ یہ سب کہیں گے کہ: خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، ﴿ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴾ [الزمر: ۶۲] (اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، وہ ہر چیز کا رکھوالا ہے)۔

انسان، حیوان، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے سب کو کس نے پیدا کیا؟ اللہ تعالیٰ نے۔ پھر یہ زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ سب کہیں گے: اللہ تعالیٰ ہے۔ تو خالق تمام کائنات کا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہوا، جس پر سب کا اتفاق ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود ہونے کا تعلق ہے، اس میں بھی سب لوگ متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کا پیدا کردہ نہیں، اس کا وجود خود بخود ہے، یہ کسی دوسری ہستی کا عطا کردہ نہیں، اس کے علاوہ کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جس کا وجود ضروری ہو، اور جو واجب الوجود ہو لفظ "اللہ" کا معنیٰ ہی یہ ہے: وَاجِبُ الْوُجُوْدِ الْمُسْتَجْمِعُ لِجَمِيْعِ صِفَاتِ الْكَمَالِ الْمُنَزَّهُ عَنِ النَّقْصِ وَالزَّوَالِ۔ یعنی وہ واجب الوجود ہے، اور تمام صفاتِ کمال کا جامع ہے، وہ نقص اور زوال سے پاک ہے۔

جب لفظ "اللہ" بولا جاتا ہے، تو یہ ساری حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ فارسی میں اللہ کا ترجمہ "خدا" ہے، جس کا مفہوم بھی یہی ہے، یعنی واجب الوجود، جس کا وجود خود بخود ہے، کسی اور ہستی کا عطا کردہ نہیں ہے، اور کسی کا محتاج بھی نہیں ہے، بلکہ سب اس کے محتاج ہیں، لہٰذا واجب الوجود بھی متفقہ طور پر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

البتہ! شرک عبادت اور تدبیر و تصرف میں ہوتا ہے، اور یہ متفق علیہ نہیں ہے، بلکہ اختلافی ہے۔ اسی سے مسلم وغیر مسلم میں امتیاز ہو جاتا ہے، کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کی عبادت کرتے ہیں، اور دوسروں کو مدبر و متصرف گردانتے ہیں۔ کچھ بتوں کی پوجا کرتے ہیں، کچھ چاند، سورج، ستاروں کی پرستش کرتے ہیں، کچھ لوگ آگ کی عبادت کرتے ہیں، کچھ مسیح علیہ السلام کی پرستش کرتے ہیں، کچھ لوگ گائے کی۔ اور ہمارے زمانہ کے بدنصیب لوگ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کے قبور و مزارات پر میلہ لگا کر ان کا سجدہ کرتے ہیں، اور چادریں چڑھاتے ہیں، نذر و نیاز پیش کرتے ہیں، اور جانور ذبح کرتے ہیں۔ اولیاء کرام کو نفع و نقصان کا مالک سمجھتے ہیں، جو کہ بدترین کفر و شرک ہے۔

آیت کریمہ میں جن گیارہ باتوں کا حکم ہے، دو باتوں کا مختصر بیان ہوگیا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بناؤ، آئندہ دیگر باتوں کا اختصار کے ساتھ بیان ہوگا، جن میں پہلی بات والدین کے متعلق ہے، فرمایا:

﴿وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا﴾ یعنی ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک اور احسان کیا کرو۔ لفظ حسنِ سلوک میں سب باتیں آجاتی ہیں، جس کو سورۂ بقرہ آیت ۸۳ میں، اور یہاں سورۂ نساء میں، اور سورۂ انعام آیت ۱۵۱، اور سورۂ اسراء آیت ۲۳، سورۂ لقمان آیت ۱۴، سورۂ عنکبوت آیت ۸ میں ذکر فرمایا ہے۔ یعنی ماں باپ کی فرمانبرداری، خدمت گزاری، راحت رسانی، شفقت و مرحمت، دل جوئی و خدمت احسان کے اندر عمومی معنی کی وجہ سے سب آجاتی ہیں۔ مزید تشریح سورۂ اسراء کے دوسرے رکوع میں ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

انسان پر ظاہری و باطنی، مادی و روحانی نعمتوں کی بارش اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، فرمایا: ﴿وَاَسۡبَغَ عَلَيۡكُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾ [لقمان: ٢٠] (اور اللہ نے تمہارے اوپر مکمل کردی ہیں اپنی نعمتیں، ظاہری و باطنی)۔ لیکن ظاہری اسباب کے تحت بہت سی نعمتوں کا تعلق والدین کے وجود کے ساتھ منسلک ہے، اور وہی اولاد کے وجود من العدم کے قریبی سبب ہیں، اگر والدین نہ ہوں تو اولاد کا وجود کہاں سے اور کیسے؟ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے سرور عالم ﷺ نے دس باتوں کی وصیت فرمائی، ان میں سے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اگرچہ تجھے قتل کیا جائے، یا آگ میں جلا دیا جائے، دوسرے یہ کہ اپنے والدین کی نافرمانی یا دل آزاری نہ کرو، اگرچہ وہ یہ حکم دیں کہ تم اپنے مال اور عیال کو چھوڑ دو۔ [مسند أحمد]

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے رزق اور عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے، یعنی اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے، سب سے پیش پیش والدین ہیں۔ [متفق علیه]

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا باپ کی رضا میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے کہ سرور عالم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے والدین کے مطیع و فرمانبردار ہو، جب وہ اپنے والدین کو عزت و محبت کی نظر سے دیکھتا ہے، تو ہر نظر میں اس کو حج مقبول کا ثواب ملتا ہے۔ اسی طرح بیہقی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی روایت میں ہے کہ سرور عالم ﷺ نے فرمایا کہ تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں، لیکن جو شخص ماں باپ کی نافرمانی اور دل آزاری کرے اس کو آخرت سے پہلے دنیا ہی میں طرح

طرح کی آفتوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، یعنی یہ جرم نا قابلِ معافی ہے، اور اس کی سزا فوری وضروری ہے۔ سرور عالم ﷺ کے ارشادات دربارۂ حقوق والدین اتنے بکثرت ہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے تو ایک ضخیم دفتر تیار ہوگا، یہاں ان کی گنجائش کہاں؟

قرابتداروں کے حقوق کا بیان:

آیت کریمہ نے چوتھے نمبر پر والدین کے بعد عام رشتہ داروں کے حقوق، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا﴾ [الإسراء: ۲۶] (اور رشتہ دار کو اس کا حق دو، اور مسکین اور مسافر کو، اور اپنے مال کو بے ہودہ کاموں میں نہ اڑاؤ)۔ اس کے علاوہ قرآن کریم کی ایک جامع اور مشہور آیت، جس کو سرور عالم ﷺ اکثر اپنے خطبات کے آخر میں تلاوت فرمایا کرتے تھے، اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ [النحل: ۹۰] بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں سب کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کا، اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا، جس میں رشتہ داروں کی حسبِ استطاعت مالی جانی زبانی خدمت ودلجوئی سب داخل ہیں، اور ان سے ملاقات اور خبر گیری بھی۔

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: سرور عالم ﷺ نے فرمایا: صدقہ وخیرات عام فقیروں محتاجوں کو دینے میں تو صرف صدقہ کا ثواب ملتا ہے، اور اگر یہ صدقہ اپنے ذی رحم رشتہ داروں کو دیا جائے تو اس میں دوہرا ثواب ملتا ہے، ایک صدقہ کا، دوسرا صلہ رحمی کا، یعنی رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا۔ [ترمذي، نسائي، مسند أحمد]

اس مضمون پر بہت سی احادیث صحیحین ودیگر کتب حدیث میں مذکور ہیں۔ صلہ رحمی پر اتنے بڑے بڑے ثواب کا وعدہ ہے جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

یتیم ومسکینوں کے حقوق:

حقوق العباد کے تیسرے نمبر پر یتیموں اور عام مسکینوں کے حقوق، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا بیان ہے۔ یتیم عام ہے، خواہ کسی شخص کی اپنی پرورش میں ہو، یا نہ ہو۔ یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والوں کے لئے

رحمت کے آسمانی دروازے کھل جاتے ہیں، اور سنگدلی و بے رحمی کے اثرات دلوں سے زائل ہوجاتے ہیں، شفقت و رحم دلی کے جذبات دلوں میں ابھر آتے ہیں، اور حسنِ سلوک کرنے والوں کی حاجتیں پوری ہوجاتی ہیں۔ تجربہ اس پر گواہ ہے۔ شروع سورت میں یتیموں کے متعلق بہت سے مسائل بیان ہوئے، وہاں دیکھا جائے۔

پڑوسی وہمسایہ کے حقوق:

حقوق العباد کے چوتھے نمبر پر پڑوسیوں کے حقوق کا بیان ہے:

﴿وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ قریبی رشتہ دار پڑوسی۔ اور پانچویں نمبر:

﴿وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ بیگانہ پڑوسی مراد ہے۔ جار کے معنی پڑوسی کے ہیں۔ آیت کریمہ میں اس کی دو قسمیں بیان ہوئی ہیں: ایک ﴿جَارِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ دوسرے ﴿جَارِ الْجُنُبِ﴾ ان دو قسموں کی تفسیر وتشریح میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مختلف اقوال ہیں۔ عام مفسرین نے فرمایا کہ ﴿جَارِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ سے مراد وہ پڑوسی ہے جو تمہارے مکان کے متصل رہتا ہے، اور الْجَارِ الْجُنُبِ سے مراد وہ پڑوسی ہے جو تمہارے مکان سے فاصلہ پر رہتا ہے۔ پھر فاصلہ بعضوں کے نزدیک دس گھروں تک، بعض کے نزدیک چالیس گھروں تک، بعضوں کے نزدیک ہر طرف سے دس گھر مجموعہ چالیس ہی ہوجائیں گے۔ یہ آخری قول ہی راجح ہے، جو کہ سب اقوال پر مشتمل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿جَارِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ سے مراد وہ شخص ہے جو پڑوسی بھی ہے، اور رشتہ دار بھی ہے، اس طرح اس میں دو حق جمع ہوگئے، اور الْجَارِ الْجُنُبِ سے مراد وہ پڑوسی ہے، جو صرف ہمسایہ ہے، رشتہ دار نہیں ہے، اس لئے اس کا درجہ پہلے سے مؤخر ہوا، اور اس کا حق صرف ایک شمار ہوا۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ﴿جَارِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ سے مراد مسلمان پڑوسی ہے، اور الْجَارِ الْجُنُبِ سے غیر مسلم پڑوسی مراد ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ ان سب معانی کو محتمل ہیں، اور حقیقت کے اعتبار سے بھی درجات میں فرق معقولی امر ہے، اور یہی معتبر بھی ہے، اور پڑوسی کے رشتہ دار یا غیر ہونے کے اعتبار سے بھی، اور مسلم وغیر مسلم ہونے کے اعتبار سے بھی۔ اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پڑوسی خواہ قریب ہو یا بعید، رشتہ دار ہو یا غیر، پھر مسلم ہو یا غیر مسلم ہو، ہر حال میں اس کا حق ہے کہ بقدر استطاعت امداد وخبر گیری اور خیالداری سے نوازا جائے، اور یہ ہر شخص پر لازم ہے، اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔

البتہ جس کا حق علاوہ پڑوسی کے دوسرا بھی ہے، وہ دوسرے پڑوسیوں سے درجہ میں مقدم ہے۔ ایک حدیث

میں خود رحمت عالم ﷺ نے اس کو واضح فرما دیا، ارشاد فرمایا "بعض پڑوسی وہ ہیں جن کا صرف ایک حق ہے، بعض وہ ہیں جن کے دو حق ہیں، اور بعض وہ ہیں جن کے تین حق ہیں۔ ایک حق والا پڑوسی وہ غیر مسلم ہے جس کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں ہے، دو حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی ہونے کے ساتھ مسلمان بھی ہے، تین حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی بھی ہے مسلمان بھی ہے، اور رشتہ دار بھی"۔ [مظھري ابن كثير]

سرور عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام ہمیشہ مجھے پڑوسی کی خبر گیری و امداد کی وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو بھی رشتہ داروں کی طرح وارثت میں شریک کر دیا جائے گا۔ [متفق عليه]

ترمذی اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ سرور عالم ﷺ نے فرمایا کہ کسی محلہ کے لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل اور بہتر وہ شخص ہے جو اپنے پڑوسیوں کے حق میں بہتر ہو۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ ایک پڑوسی کو سیر ہو کر پیٹ بھر کر کھانا جائز نہیں، جبکہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو، بخاری و مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سید عالم ﷺ نے فرمایا: وہ شخص مؤمن نہیں ہے جس کا پڑوسی اس کی تکلیفوں سے امن میں نہ ہو۔ [الحاكم ابن أبي شيبة]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ادب میں، اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے، نیز بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ سید کائنات ﷺ سے لوگوں نے کہا کہ فلاں عورت رات کو قیام کرتی ہے، دن کو روزہ رکھتی ہے، اور دوسرے خیر کے کام کرتی ہے، اور صدقہ بھی کرتی ہے، لیکن پڑوسیوں کو زبان سے تکلیف دیتی ہے۔ سرور دو جہاں ﷺ نے فرمایا: وہ دوزخ والوں میں سے ہے، (اس میں کوئی شک نہیں)۔ لوگوں نے عرض کیا کہ: فلان عورت صرف فرض نماز پڑھتی ہے، فرض روزہ رکھتی ہے، معمولی صدقہ کرتی ہے، مگر پڑوسیوں کو کوئی تکلیف نہیں دیتی، تو آپ ﷺ نے اسے جنتی قرار دیا۔

دیکھیں! پہلی عورت اس لئے دوزخی قرار پائی جس نے حقوق العباد میں سستی کی، اور مردم آزاری کر کے پڑوسیوں کا حق تلف کیا،، جبکہ دوسری عورت نے باوجود اس کے کہ عبادات وطاعات کو اگر چہ بکثرت ادا نہیں کیا، مگر حقوق العباد کا پاس رکھا، اور مردم آزاری نہیں کی، تو جنتی ہوئی۔

فائدہ:

عام طور پر لوگ ہمسایہ کے حقوق صرف اس کو سمجھتے ہیں کہ کبھی کبھار انہیں کوئی چیز دیدو، یا ملاقات پر السلام علیکم کہو، یا اس کے سلام کا جواب دیدو، یا اس کی کسی تقریب میں شرکت کرو، یا اپنی کسی تقریب میں اس کو مدعو کرو، وغیرہ۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمسایہ کا حق اس سے کہیں زیادہ ہے، اور اس کے حقوق میں سے اہم حق یہ بھی ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے اہل وعیال کی نگرانی کرو، اس کی بیمار پرسی کرو، اگر وہ فقیر ہے تو مالی مدد کرو، اگر اسے قرض دو تو تنگ نہ کرو، اپنے گھر میں ایسا کوئی کام نہ کرو جس سے ان کے آرام میں خلل ہو، جو چیز اپنے لئے پسند کرو وہی اس کے لیے بھی پسند کرو، اور جو چیز اپنے لئے پسند نہ کرو وہی اس کے لئے بھی پسند نہ کرو، اس کی بیوی بچیوں کو ماں بہن کی نظر سے دیکھو، اپنے گھر کے کوڑے کچرے اس کے گھر کے سامنے مت ڈالو۔

بہر حال! پڑوسی کے ساتھ وہی حسن سلوک رکھو جو اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ رکھتے ہو، زبان سے، عملاً، یا اشارۃً کسی بھی طریقے سے ایذاء رسانی سے پرہیز کرو۔ اگر بھول یا غیر ارادی طور پر اس کو کسی تکلیف کا سامنا ہوا تو فوراً ازالہ کرو، اور معافی مانگو۔ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمسایہ قیامت کے گواہ بنیں گے۔ واللہ اعلم

﴿وَالصَّاحِبِ بِالۡجَنۡبِ﴾ یہ چھٹا نمبر ہے، لفظی ترجمہ: ہم پہلو ساتھی کے ہیں۔ جس میں گھر کے افراد خصوصاً بیوی، بچے، بھائی، رفیق سفر، خواہ اقامت کی حالت میں ہو یا بیرونی سفر، طلبِ علم تجارت، حج، عمرہ، جہاد وغیرہ، کسی بھی نوعیت کے سفر کا ساتھی، اس میں مسلم، غیر مسلم رشتہ دار، غیر رشتہ دار، واقفِ کار، یا ناواقف، سب شامل رہیں گے، خواہ سفر طویل ہو یا مختصر ہو۔ یہ ہم سفر ہر قسم کے حسنِ سلوک و مدارات کے حقدار ہی رہیں گے، اور انہیں خوش رکھنا اور ایذاء نہ دینا ایک اسلامی فریضہ ہے، جس کو قرآن حکیم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا، اور مسلمان کو وسیع النظرفی کی تعلیم فرمائی۔

﴿وَابۡنِ السَّبِيۡلِ﴾ یہ ساتواں نمبر ہے ابنِ سَبِیل مسافر یا مہمان، دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہر طرح امداد و مدارات اور حسنِ سلوک کے حقدار ہیں۔ کبھی ایسے لوگوں کے پاس معمولی خورد ونوش کی استطاعت بھی نہیں رہتی۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت یہی رہی کہ باہر سے آنے والے مسافروں اور مہمانوں کی حَتَّی الۡمَقۡدُور پذیرائی اور خدمت کیا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بغیر کسی مہمان کے کھانا نہیں کھاتے تھے، اور بسا اوقات اگر کوئی مہمان نہ آیا تو دو دو دن تک بھوکے رہتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اسی پیغمبرانہ سنت پر

عامل رہتے تھے۔ حضرت امام نافع رحمۃ اللہ علیہ کو کھانے کے وقت مدینہ کے بازار بھیج دیتے کہ کوئی مسافر لاؤ جوان کے ساتھ کھانا کھالے۔ رضي الله عنه وعن جميع الصحابة

﴿وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ یہ آٹھواں نمبر ہے، جس سے مراد غلام اور باندیاں ہیں۔ ان کمزور اور ضعیفوں کا بھی حق بنتا ہے کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک رکھا جائے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے غلام اور خادموں میں سے جو تمہارے ساتھ نرمی کرے، ان کو کھلاؤ جو تم کھاتے ہو، ان کو پہناؤ جو تم پہنتے ہو، اور ان میں سے جو تمہارے مزاج کے موافق نہ ہوں ان کو فروخت کرو، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو عذاب نہ دو۔ [بيهقي وأحمد]

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت نماز اور عورتوں اور غلام و باندیوں کے متعلق بڑی تاکید فرمائی، کیونکہ نماز عماد الدین ہی ہے، اور یہ بیچارے سب ضعیف و کمزور لاچار قابلِ رحم ہی ہیں، اس لئے حضرت رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ان کے حقوق کے بارے میں خبردار کیا، اور ہدایات دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قیامت تک بے شمار صلوۃ وسلام ہوں۔

آج غلاموں اور باندیوں کا زمانہ نہیں رہا، بسببِ اشتراک فی العلۃ غلاموں باندیوں کے سارے احکام ہمارے زمانہ کے خادموں، مزدوروں، نوکروں پر حاوی اور جاری ہی رہیں گے، لہٰذا ان بیچاروں کے ساتھ وہی حسنِ سلوک روا رکھا جائے جو غلاموں باندیوں کے ساتھ رکھا گیا۔ آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتے جو متکبر ہو، اور دوسروں پر اپنی بڑائی جتانے والا ہو۔ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں:

(۱) عباد الرحمٰن، جن کی صفت و خصلت تواضع عاجزی اور انکساری ہے، جو کہ بارگاہِ الٰہی کے مقبول و پسندیدہ ہیں، اور مذکورہ اعمال پر سختی سے کاربند و عامل رہتے ہیں۔

(۲) عباد الشیطان، جن کی شناخت و معرفت اور صفت کبر وغرور و سرکشی ہے، جو کہ بارگاہِ الٰہی کے راندہ و مبغوض ناپسندیدہ لوگ ہیں، اور مذکورہ اعمال سے سراسر بیگانہ اور کوسوں دور ہیں۔ جس طرح عزازیل کبر وغرور کی وجہ سے مردود و ملعون ہوا، اسی طرح یہ لوگ بھی کبر وغرور کی وجہ سے مبغوض و مردود رہیں گے۔ پس آیت کریمہ کا یہ آخری جملہ گزشتہ تمام ارشادات کا تکملہ و نتیجہ ہے، کہ پچھلے آٹھ نمبروں میں جن لوگوں کے حقوق کی تاکید آئی ہے اس میں کوتاہی

وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں تکبر فخر وغرور ہے، اور یہ سب سے بڑا ابلیسی کارنامہ ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید المتواضعین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکے گا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے سوال کیا کہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے کپڑے اچھے ہوں، ان کے جوتے اچھے ہوں، تو کیا یہ بھی تکبر میں داخل ہے؟ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تکبر نام ہے حق رد کرنے کا، اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا۔ [رواہ مسلم، مشکوٰۃ]

کوئی شخص خود کو ایک بڑی ہستی تصور کرتا ہو، اور حق کو رد کرتا ہو، صحیح بات کو جھٹلاتا ہو، اور لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہو، یعنی اپنے سے کم خیال کرتا ہو، یہ ہے تکبر وغرور، جیسے ابلیس نے خود کو بڑا سمجھا، اور حضرت آدم علیہ السلام کو کمتر وحقیر سمجھا، اور اللہ تعالیٰ نے اسے جس سجدہ کا حکم دیا اس کو رد کیا، نہ مانا، یہی تکبر کی اصلی تعریف ہے، اور یہ حرام اور ناروا ہے۔ اسی وجہ سے دوسری روایت میں ارشاد ہے: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ اَحَدٌ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ كِبْرٍ [رواہ مسلم عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ]

یعنی جنت میں ایسا کوئی شخص نہیں جا سکے گا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر تکبر ہو۔ اللہ تعالیٰ شانہ سب مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، معزز تصور کرنا اسی سے تو اکثر گناہ ہوتے ہیں، ناحق پر اصرار کرتے ہیں، شریعت پر چلنے میں خفت محسوس کرنا، گناہوں کو اس لئے نہ چھوڑنا کہ لوگ کیا کہیں گے، شہرت کا طالب ہونا، ریاکاری کرنا، شادی بیاہ میں دنیاداری کی رسمیں برتنا، لوگوں کی خوشی پر چلنا، اور شرعی احکام کی پرواہ نہ کرنا، یہ سب تکبر وغرور کے شعبے ہیں، جو باعثِ لعنت ہیں۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾

ترجمہ: جو لوگ کنجوسی کرتے ہیں، اور لوگوں کو کنجوسی کا حکم دیتے ہیں، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے

فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں، اور ہم نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا ہے ۳۷ اور جولوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو لوگوں کو دکھانے لئے، اور اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے، اور نہ آخرت کے دن پر، اور شیطان جس کا ساتھی ہو سو وہ بہت برا ساتھی ہے ۳۸ اور کیا نقصان ہے ان کا اگر وہ ایمان لائیں اللہ پر، اور آخرت کے دن پر، اور خرچ کریں اس میں سے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کو خوب جانتا ہے ۳۹

معارف ومسائل

شانِ نزول:

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس اور ابن زید رضی اللہ عنہم کے قول پر آیت کا نزول یہود کے بارے میں ہے۔ یہود کے لوگ انصار مدینہ رضی اللہ عنہم کے پاس آتے تھے، اور ان سے خیر خواہانہ طور پر کہتے تھے کہ تم لوگ راہِ جہاد میں اپنے اموال کو خرچ نہ کرو، ہمیں خوف ہے کہ ایسا کرنے سے تمہارے مال ختم ہو جائیں گے، اگر اخراجات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لوگے تو نہ جانے آگے کیا ہوگا؟ [مظهري روح المعاني وغيره] فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ بخل سے مراد علم کا بخل ہے، کیونکہ یہود کے علماء نے بخل کر کے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف جو تورات میں لکھے تھے ان کو چھپایا، اور دوسروں کو چھپانے کا مشورہ دیا، اور امر کیا۔

عام مفسروں کا خیال ہے کہ آیت کے معنی عام ہیں، خواہ مال میں بخل ہو، یا علم میں، آیت سب کو شامل ہے۔ اس سے قبل والدین، یتامیٰ، مساکین، ہمسایہ، رفقاء، مسافر وغیرہ پر مال خرچ کرنے اور خبر گیری کا بیان ہوا، اور آخر میں تکبر وغرور کی مذمت بیان ہوئی، اب تکبر وغرور کے اسباب کا بیان شروع ہوا، کہ اصل سبب تکبر وغرور کا بخل ہی ہے، اسی طرح بخل کا سبب تکبر وغرور بھی ہے، یہ دونوں لازم وملزوم ہیں، جو سزا کتمانِ علم کی ہے، وہی سزا تکبر وغرور اور بخل کی ہے، یعنی عذاب مہین، ذلت والا عذاب۔

تو فرمایا کہ یہ لوگ ایسے ہیں (غرور کی وجہ سے) جو بخل کرتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کو بھی (علم اور مال میں) بخل کا حکم دیتے ہیں، اور انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کو چھپاتے ہیں، یعنی یہ لوگ متکبر ہیں، اور کنجوس بھی ہیں، اور صرف خود ہی کنجوس نہیں، بلکہ دوسروں کو بھی کنجوسی کا حکم دیتے ہیں، خود تو عزیز وقریب،

یتیم ومساکین ،ضعفاء و پڑوسیوں پر خرچ کرتے ہی نہیں، دوسروں کو بھی خرچ کرنے نہیں دیتے ،جن لوگوں کا مزاج اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا نہیں ہوتا، انہیں دوسروں کا خرچ کرنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ مال کی محبت ان کے دلوں میں اس قدر پیوست ومحکم ہے کہ دوسروں کا خرچ کرنا بھی ان کو ناگوار ہے۔ پس ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے اتنے دور ہیں کہ جنت کی مہک وخوشبو بھی ان تک نہیں پہنچتی۔

یہ بدبخت ہرگز نہیں سوچتے کہ اس مال اور علم کا دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، ہمیں چاہئے کہ اس کا دیا ہوا مال وعلم اس کے فرمان کے مطابق خرچ کریں، اور نہ چھپائیں، تو ان کے بخل وغرور اور کتمانِ علم کا یہ نتیجہ ہوا کہ:

﴿وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا﴾ ایسے ناشکروں کے لئے ہم نے تیار کر رکھا ہے ذلیل ورسوا کرنے والا عذاب، جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری اور توہین کرتے ہیں، ان کا بدلہ وعوض توہین والا عذاب ہی ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سخی اللہ تعالیٰ سے قرب رکھنے والا، جنت سے قرب رکھنے والا، لوگوں سے قرب رکھنے والا (معزز وہر دلعزیز ومحبوب خلق ہوتا ہے) دوزخ سے دور ہوتا ہے۔ اور بخیل اللہ تعالیٰ سے دور، جنت سے دور، لوگوں سے دور، اور دوزخ سے قریب ہوتا ہے۔ اور جاہل سخی عابد (عالم) بخیل سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ [ترمذي]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ مؤمن کے اندر دو بڑی خصلتیں: کنجوسی اور بدخلقی جمع نہیں ہوسکتیں۔ [ترمذي] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا جنت میں داخل نہ ہوگا مفسد، مکار، بخیل ،احسان جتلانے والا۔ [ترمذي]

حضرت جابر بن عبد اللہ کی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے گروہ اہل اسلام! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، کوئی شبہ نہیں کہ جنت کی ہوا (خوشبو) ہزار سال کی مسافت سے محسوس کی جائے گی، مگر نہ ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا اس کو پائے گا، نہ قطع رحمی کرنے والا، نہ بوڑھا زانی، اور نہ وہ شخص جو غرور سے اپنا پاجامہ گھسیٹا چلتا ہے، بڑائی صرف ربّ العلمین کو زیبا ہے۔ [رواه الطبراني، مظهري]

ٹخنوں سے نیچے پاجامہ گھسیٹ کر چلنا یہ ایک ادنیٰ مثال ہے غرور وتکبر کی، پس اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ غرور کے دیگر طور وطریقوں اور مختلف نمونوں اور اقسام کی سزا کیا ہوگی؟ جس کا ایک حصہ بخل وکنجوسی ہی ہے۔

فائدہ:

اللہ تعالیٰ شانہ اپنے بندوں پر اتنا مہربان ہے جس کی حد نہیں، وہ اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ مجھ سے ہر چیز مانگا کرو، وہ مانگنے والوں سے بے حد خوش اور راضی ہوتا ہے۔ سرور عالم ﷺ نے یہ دعا تعلیم فرمائی، آپ صبح شام پڑھا کریں:

"اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعِجْزِ وَالْکَسْلِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ غَلَبَۃِ الدَّیْنِ وَقَھْرِ الرِّجَالِ"۔ اس دعاء کے پڑھنے سے ہر قسم کی پریشانی دور ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ

﴿وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں لوگوں کو دکھانے کے لئے، اور نہیں ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر۔ پہلا جملہ: ﴿مُخْتَالًا فَخُوْرًا﴾ جو گزرا یہ اس کی دوسری صفت ہے۔ درمیان سے ﴿عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾ جملہ معترضہ بیان ہوا۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ یہ تکبر وفخر کرنے والے اللہ تعالیٰ کی رضا کے کاموں میں تو خرچ نہیں کرتے، البتہ لوگوں کے دکھانے اور اپنی نام آوری کے لئے خرچ کرتے ہیں، کیونکہ دنیا دار کو جاہ وشہرت مطلوب ہوتی ہے، وہ چاہتا ہے ہر جگہ میری تعریف ہو، اور میری شہرت ہو، لوگوں پر میری مالداری ظاہر ہو۔ اسی لئے اہلِ دنیا اللہ تعالیٰ سبحانہ کی رضا میں مال خرچ کرنے سے جان چھڑاتے ہیں۔ وہ بندۂ خدا اور تابع شریعت نہیں ہوتے، وہ بندۂ ہوس اور شیطان کے ساتھی ہوتے ہیں۔ اسی خاطر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے، اگر یہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے تو اس کی رضا میں خرچ کرتے، اور اس سے ثواب لینے کی امید رکھتے، اور عذاب الٰہی سے ڈرتے، اور اپنی زندگی کو درست کرتے، مگر وہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ شیطان کے اشاروں پر چل کر آخرت خراب کر رہے ہیں، جیسے ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا﴾ یعنی جس کا ساتھی شیطان ہی ہو تو اس کے اعمال بھی شیطانی ہوں گے، اور وہ بہت برا ساتھی ہے۔ یہاں شیطان سے مراد ابلیس اور اس کے مددگار ہمنوا، جو اس کے قبیلہ سے ہیں، اور وہ لوگ جو اس کی باتوں پر چلتے ہیں، یہ سب مراد ہیں، اور یہ کہ نفسانی قوتیں اور خواہشیں اور شیاطین الانس والجن بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ [روح المعاني]

شیطان کو برا ساتھی اس لئے بتایا کہ ہمیشہ گناہوں کی طرف بلاتا ہے، اور گناہوں پر ترغیب دیتا ہے، اور گناہ دوزخ میں جانے کا سبب ہے، جیسے فرمایا: ﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ [البقرۃ:۲۶۸] (شیطان تم کو فقر سے ڈراتا ہے، اور تم کو بے حیائی کا حکم کرتا ہے)۔ صرف ایک بخل نہیں، بلکہ جتنے فحشاء و منکرات ہیں شیطان اور اس کے حواری انہیں خوبصورتی کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور انہیں جہنم کی آگ میں دھکیل دیتے ہیں۔

اگر ربّ العزّت کا فضل و کرم نہ ہو تو شاید کوئی ہدایت نہ پائے، کئی لوگ شرک جلی سے تو بچ جاتے ہیں، دیکھو تو شرک خفی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جیسے ریاء شرک اصغر میں اچھے بھلے دیندار لوگ بہہ جاتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میں شرک سے بہت ہی زیادہ بے نیاز ہوں، یعنی مجھے کسی کو شریک بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں، اگر کوئی ایسا عمل کرے گا کہ جس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرلے گا، تو میں اس کے شرک آمیز عمل کو چھوڑ دوں گا، رد کروں گا۔ دوسری روایت میں ہے: میں اس سے بیزار ہوں، اس کا عمل اسی کے لئے ہوگا جس کے لئے اس نے کیا ہوگا۔ [رواہ مسلم]

﴿وَمَاذَا عَلَیْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ان کا کیا حرج ہوتا، ان پر کیا آفت آجاتی، یا یہ کہ ان پر کیا وبال آجاتا اگر یہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آتے؟ تو اس میں ان کی سعادت و کامیابی ہوتی۔ محسنِ حقیقی کا شکر بھی ادا ہو جاتا، اور ابدی عذاب سے بھی بچ جاتے، اور جو کثیر مال اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے، اور دس گنا سے سات سو گنا تک ثواب پانے کی امید میں صرف کر دیتے۔

یہ سوال بطور استفہامِ انکاری کا ہے، بطور زَجر و توبیخ یہ سوال کیا ہے، اور ان کو توجہ دلائی ہے کہ اپنے طرز زندگی کے بارے میں فکر مند ہوں، اور نفع و نقصان کے بارے میں سوچیں، اگر غور کریں گے تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ ان کا طریقہ سراسر غلط ہے، اور جو اہلِ ایمان کا طریقہ ہے وہ صحیح اور فائدہ مند ہے، اسی کو اختیار کرنا ضروری اور لازم ہے، اسی میں ان کا بھلا ہے، اور مخالفت میں وبال ہے، پس انہیں چاہئے کہ شیطان کی رفاقت چھوڑ کر حق تعالیٰ رحمٰن کی بندگی اختیار کریں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۴۰﴾

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں فرمائے گا، اور اگر نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا چند در چند کردے گا، اور اپنے پاس سے بڑا ثواب عطا فرمائے گا۞

معارف ومنازل

یہ امر مسلّم اور یقینی ہے کہ عدل وانصاف اور شفقتوں اور بے پناہ رحمتوں کا خالق و مالک عزّ مجدہٗ وجل عظمتہٗ و تعالیٰ ذاتہٗ وصفاتہٗ سبحانہٗ ذرّہ برابر ظلم نہیں کرے گا۔ مثقال ثقل سے ماٴخوذ ہے، ذرّہ سرخ چھوٹی چیونٹی، یا گھر کے روشندان میں دھوپ کے رخ پر جو ذرّے سے اڑتے دکھائی دیتے ہیں، اور جن کا کوئی وزن نہیں ہوتا، ہاتھ میں پکڑنے پر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بالکل ظلم نہیں کرتا، کسی قسم کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے جو عذابِ مہین تیار کر رکھا ہے وہ ظلم نہیں ہے، بلکہ سراسر انصاف ہے، بلکہ اگر ان کو عذاب نہ دے گا تو یہ ظلم ہوگا، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور بندگی سے انحراف کیا، والدین اور اقارب واجانب کے حقوق کی ادائیگی سے اعراض کیا، تو اگر ان کو عذاب نہ ہو تو گویا یہ ظلم اور بے حد ناشائستہ معاملہ ہوگا۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کفار چونکہ عذاب کے مستحق ہیں، اگر ان کو عذاب نہ دیا جائے تو گویا ان کی حق تلفی ہوجائے گی۔ ظلم کے معنی ہیں کہ: غیر جگہ میں کسی چیز کو رکھ دینا، اور بیجا و ناجائز کام کرنا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی کام ناجائز اور بیجا نہیں ہے، وہ خالق کُل ہے، اور مالک الملک والملکوت ہے، اگر وہ سارے جہاں کو بغیر جرم کے سزا دیدے تب بھی ظلم نہ ہوگا، پس اس کی شان میں کسی فعل پر ظلم کا اطلاق ہی نہیں ہوسکتا، اس لئے آیت کی مراد یہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی عمل بھی ظلم ہوسکتا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا کام بھی نہیں کرے گا کہ دوسرے اگر وہی کام کریں تو اس کو ظلم کہا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی طاعت ونیکی کے ثواب میں ذرّہ برابر کمی نہیں کرے گا، اور نہ ہی کسی کی معصیت وگناہ میں ذرّہ برابر بیشی کرے گا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن کی کسی نیکی کے اجر وثواب میں کمی نہیں کی جائے گی، دنیا میں اس کے عوض رزق زیادہ ملے گا، اور آخرت میں بھی اس کا بہتر اجر وثواب ملے گا، اور کافر کی نیکی کا بدلہ اس کو بصورت رزق دنیا میں ہی ملے گا، اور جب آخرت میں پہنچے گا تو

اس کی کوئی نیکی باقی ہی نہ رہے گی، کہ ثواب پاسکے۔ [رواہ أحمد و مسلم، معالم]

بعض علماء کرام کا کہنا ہے کہ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کا کسی پر حق نہ رہنے دے گا، بلکہ ضرور وصول کرے گا (دادرسی فرمائے گا)، اور کسی کا ذرّہ برابر حق ایسا باقی نہیں رہے گا، نہیں چھوڑے گا کہ اس کا اجر نہ دے، اور چند گنا نہ دے، جیسے آگے ارشاد ہے:

﴿وَاِنۡ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفۡهَا﴾ اگر ذرّہ برابر نیکی ہوگی تو اللہ تعالیٰ کئی گنا بڑھا کر اپنے خزانوں سے عنایت فرمائے گا، کبھی ایک کے عوض دس، کبھی ستر گنا، کبھی سات سو، کبھی ساٹھ لاکھ، کبھی بیس لاکھ گنا بڑھا بڑھا کر عنایت فرمائے گا، کیونکہ سارے اعمال ایک جیسے نہیں ہوتے، اور سارے عاملین کا اخلاص ایک جیسا نہیں ہوتا۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوعثمان نہدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی، اور ان سے عرض کیا کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے یوں فرمایا ہے کہ ایک نیکی کو دس لاکھ گنا بڑھایا جاتا ہے؟ انہوں نے فرمایا کیا تم کو اس بات سے تعجب ہے؟ اللہ تعالیٰ کی قسم میں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيُضَاعِفُ الْحَسَنَةَ اَلْفَى اَلْفِ حَسَنَةٍ۔ کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کو بیس لاکھ تک بڑھادیں گے۔ [در منثور]

﴿وَيُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡهُ اَجۡرًا عَظِيۡمًا﴾ اور اپنے پاس سے اپنی مہربانی سے اس ایک نیکی والے کو مقررہ موعودہ ثواب سے الگ اجر عظیم عنایت فرمائے گا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اَجۡرًا عَظِيۡمًا فرمایا، تو اب اس کی مقدار کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ اگلوں پچھلوں کو جمع فرمائے گا، اور ایک منادی ندا کرے گا: خبردار ہوجاؤ! جس کسی کا کسی پر کوئی حق ہو وہ اپنا حق لینے آجائے، یہ سن کر لوگ خوش ہوجائیں گے، کہ باپ یا دادا یا بھائی یا کسی پر جو حق ہوگا وہ آج مل جائے گا، اور ہر شخص کو جب طلب کیا جائے گا، تو منادی ندا کرے گا کہ: یہ فلاں شخص ہے، جس کسی کا اس پر جو حق ہو وہ اپنا حق وصول کرے، پھر اس شخص سے کہا جائے گا ان کے حقوق ادا کرو، وہ شخص کہے گا: میرے پروردگار! دنیا تو جاتی رہی، اب یہ حقوق کہاں سے اور کیسے دوں گا؟ تب اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیں گے کہ اس کے نیک اعمال میں سے حقوق دیا کرو۔ اب اگر ذرّہ بھر نیکی رہ جائے گی تو فرشتے عرض کریں گے: اے ہمارے مالک! اس کی ذرّہ برابر نیکی رہ گئی ہے، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے

بندے کے لئے اس کو چند گنا کر کے بڑھا دو، اور اس کو میری رحمت کے طفیل جنت میں داخل کرو۔ اس کا ثبوت یہ آیت ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا﴾۔

اور اگر بندہ بد بخت ہوگا، اور فرشتے کہیں گے: اے ہمارے معبود! اس کی ساری نیکیاں تو ختم ہوگئیں، اور حقدار بھی باقی ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ حقداروں کے گناہ لے کر اس کے گناہوں میں شامل کردو، پھر اس کے لئے دوزخ کا پروانہ تیار کرو، اور دوزخ میں خوب مارتے ہوئے داخل کرو۔ [معالم ابن أبي حاتم أبو نعيم ابن المبارک]

یادرہے کہ ایسے لوگ جیسے ترمذی وغیرہ میں ہے، اس امت کے مسکین کہلائیں گے، شروع میں غنی شمار ہوں گے، پہاڑوں کے برابر اعمال کے ساتھ محشر میں موجود ہوں گے، اور حساب کے بعد ان کے سارے اعمال حقداروں کو دے کر فقیر ہو جائیں گے، اور حقداروں کے مختلف گناہ ان کر سر پر ڈال کر جہنم کے حوالہ کئے جائیں گے۔

وہاں حقداروں کے حقوق کیا ہوں گے؟ وہ یہ کہ انہوں نے دنیا میں کسی کی غیبت کی ہوگی، کسی پر ظلم کیا ہوگا، کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا کوئی مال کھایا ہوگا، جہاں ایک ایک درہم کے عوض اس سے سینکڑوں قبول شدہ نمازوں کی کٹوتی ہوگی، اور دس درہم کے عوض اس کے حج کا حقداروں کو معاوضہ دیا جائے گا۔ اگر یہ سلسلہ ہزاروں اور لاکھوں سے زائد کا ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کے نیک اعمال اکارت ہو جائیں گے، اور حقداروں کے جرائم زنا، شراب، سود و دیگر برائیاں اس کے کھاتے میں آجائیں گی، اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے، اور پوری امت کو ایسے خساروں سے بچائے۔ آمین

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝٤١ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۚ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝٤٢

ترجمہ: پس کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے؟ اور آپ کو ان پر گواہ بنائیں گے ﴿۴۱﴾ جس دن وہ لوگ آرزو کریں گے جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، ہائے کاش ان پر زمین برابر کردی جاتی، اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات بھی نہ چھپا سکیں گے ﴿۴۲﴾

معارف ومنازل

قیامت کے بارے میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ﴾ [القمر: ۴۶] قیامت کی گھڑی بڑی آفت ہے، اور بڑی کڑوی ہے۔ اس آیت کریمہ میں اس کڑوی قیامت کی ایک ادنیٰ جھلک اور پریشان کن منظر کا بیان ہو رہا ہے۔ جب مدعیٰ علیہ کے خلاف پاکیزہ لوگوں کی گواہی ہوتی ہے، تو پھر اس کا بچنا اور جیت جانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔

فرمایا: قیامت کے دن سارے انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے ساتھ میدانِ محشر میں حاضر ہو جائیں گے، اور ہر نبی اپنی امت کے بارے میں گواہی دیں گے کہ یہ لوگ عقائد واعمال کے لحاظ سے ایسے ایسے تھے، ان کی گواہیوں پر حضرت خاتم الانبیاء ﷺ گواہی دیں گے، کہ انبیاء علیہم السلام نے وحی الٰہی کا حق ادا کیا، اور قوموں کو اللہ تعالیٰ کی امانت پہنچادی۔ اس پر آپ ﷺ کی امت گواہی دے گی، پھر آپ ﷺ اپنی امت کی گواہی کی صداقت پر گواہی دیں گے، جیسا کہ سورۂ بقرہ پارہ دوئم کے شروع میں تفصیلاً بیان ہوا، وہاں دیکھا جائے۔

جب ہر نبی اپنی امت پر گواہ بنے گے، تو خاتم الانبیاء ﷺ بھی اپنی امت پر گواہی دیں گے، اور بطور خاص اپنی امت کے کفار ومشرکین، اور قیامت تک آنے والے زندیق وملحدین پر گواہی ادا کریں گے، کہ ان لوگوں نے کھلے معجزات اور قرآن کریم کی صداقتوں، اور اسلام کی برکتوں، اور شریعت کی عظمتوں، اور علماء اسلام کی صداقتوں اور طہارتوں کو دیکھ کر بھی تکذیب کی، اور آپ کی توحید اور میری رسالت کا انکار کیا، اور قیامت کے منکر ہو گئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ سرور عالم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ: مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ! میں نے عرض کیا: کیا آپ کے سامنے تلاوت کروں؟ حالانکہ آپ پر ہی تو نازل ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ کسی دوسرے سے سنوں، اس پر میں نے سورۂ نساء پڑھنی شروع کی، یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ﴾ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بس کرو، میں نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو آپ ﷺ کی مبارک آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ [بخاري]

یہ حدیث نقل کر کے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ: جب شاہد کا یہ حال ہے کہ اس شہادت کے استحضار سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، تو مشہود علیہ، یعنی اس کا کیا حال ہوگا جس کے خلاف یہ گواہی ہوگی؟ اور جسے روزِ قیامت کے مصائب نے گھیر رکھا ہوگا۔

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت سے آخرت کا منظر مستحضر ہو گیا، اور اپنی امت کے کمزور و کوتاہ عمل، اور بے عمل لوگوں کی بابت خیال آیا، اس لئے آنسو مبارک جاری ہوئے۔

عظیم محقق عالم ربانی حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تمہارے رسول تم پر گواہی دیں گے، کیونکہ وہ جانتے ہیں اپنی نبوت کے نور سے اپنے دین کے ہر ماننے والے کے رتبہ کو، کہ میرے دین میں اس کا کیا درجہ و مرتبہ ہے؟ اور اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کونسا پردہ ہے جس سے اس کی ترقی رکی ہوئی ہے؟ پس وہ تمہارے گناہوں کو بھی پہچانتے ہیں، تمہارے ایمان کے درجوں کو تمہارے نیک اور بد سارے اعمال کو، اور تمہارے اخلاص اور نفاق کو۔ [فتح العزیز]

بعض حضرات نے فرمایا کہ هٰؤُلَاءِ کا اشارہ زمانہ رسالت میں موجود کفار اور منافقین کی طرف ہے۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ قیامت تک کی پوری امت کی طرف اشارہ ہے، اس لئے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اعمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش ہوتے رہتے ہیں۔ [معارف القرآن]

قرآن کریم کے اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری نبی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، جو اپنی کسی امت کے متعلق گواہی دے، ورنہ قرآن کریم میں اس کا، اور اس کی شہادت کا بھی ذکر ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ آیت ختم نبوت کی دلیل بھی ہے۔

﴿يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ﴾ اس روز کفار اور معصیت نواز مجرم تمنا و آرزو کریں گے: ہائے کاش ہم زمین کا پیوند بن گئے ہوتے، کاش زمین پھٹ جاتی، اور ہم اس میں دھنس کر مٹی بن جاتے، اور اس ذلت و رسوائی اور خواری سے نجات پاتے۔ میدان حشر میں پہلے جانوروں سے حساب و قصاص ہوگا، پھر انہیں مٹی بنا کر ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے گا، ارشاد ہوگا "كُوْنُوْا تُرَاباً" سب مٹی بنو، نیست و نابود ہو جاؤ جب کفار و منافقین یہ منظر دیکھیں گے تو وہ بھی تمنا کریں گے، جیسے سورۂ نباء میں ارشاد ہے: ﴿وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾ [النباء: ۴۰] (کافر کہے گا: کاش میں بھی مٹی ہو جاتا) آخر میں پھر فرمایا: ﴿وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا﴾ اس دن یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ قرآن کریم میں ایک یہ ارشاد ہے کہ: ﴿وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا﴾ دوسری جگہ وہ قسم کھا کر کہیں گے: ﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا

﴿مُشْرِكِيْنَ﴾ [الأنعام: ۲۳] (اللہ کی قسم ہم نے شرک نہیں کیا)۔ دیکھو انہوں نے اپنا شرک چھپا دیا، تو یہ ایک قسم کا تعارض ہوا؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا کہ قیامت کے روز اول سے آخر تک ایک جیسے حالات نہیں ہوتے، ایک وقت بڑی سختی ہوگی، تو دوسرے وقت کچھ کم حالات بدلتے رہیں گے، اور کفار موقع پا کر کبھی آپس میں سوالات کریں گے، اور کبھی انہیں اس کی استطاعت نہیں ہوگی، یہ دونوں باتیں قرآن پاک میں ہیں: ﴿يَتَسَاءَلُوْنَ﴾ [الصافات: ۲۷] (آپس میں پوچھیں گے) اور ﴿وَلَا يَتَسَاءَلُوْنَ﴾ [مؤمنون: ۱۰۱] (آپس میں نہیں پوچھیں گے)

اسی طرح ایک وقت وہ ہوگا کہ ﴿وَلَا يَكْتُمُوْنَ﴾ لیکن دوسرے مرحلہ پر کہیں گے: ﴿وَ مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ لہٰذا کوئی تعارض نہیں رہا۔

جب انکار کے بعد ان کے اعضاء وجوارح ان کے خلاف گواہی دیں گے، اور چھپانے کی جو تدبیر انہوں نے مرتب کی ہوگی، وہ سراسر ناکام ہوگی، تو سب اقرار کرلیں گے، اور کہیں گے: ﴿يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾ یہ مضمون قرآن کریم میں بکثرت موجود ومذکور ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ
وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ
اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا
صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۴۳

ترجمہ: اے ایمان والو! اس حال میں کہ تم نشہ میں ہو نماز کے پاس نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم جان لو کہ کیا کہہ رہے ہو، اور نہ اس حالت میں نماز کے پاس جاؤ جبکہ تم پر غسل فرض ہو، مگر یہ کہ راستہ گزرنے والے ہو، یہاں تک کہ تم غسل کرلو۔ اگر تم مریض ہو، یا تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کی جگہ سے آیا ہو، یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو، اور پانی نہ پاؤ، تو ارادہ کرو پاک مٹی کا، سو مسح کرلو اپنے چہروں کا، اور ہاتھوں کا، بیشک اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا، مغفرت فرمانے والا ہے ۝۴۳

☆☆☆

معارف ومنازل

شانِ نزول:

ترمذی شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ شراب کی حرمت سے پہلے ایک دفعہ حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کھانے کی دعوت پر بلایا، جس میں شراب نوشی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا، جب سب حضرات کھا پی چکے، تو مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام بنا دیا گیا، ان سے نماز میں ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ کی تلاوت میں بسببِ نشہ کے سخت غلطی ہوگئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں تنبیہ کی گئی کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے۔ اس کے بعد قطعی طور پر شراب بالکل حرام کردی گئی، جس کا ذکر سورۂ مائدہ کی اس آیت میں ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ [المائدة: ۹۰] (اے ایمان والو! بیشک شراب، جوا، بتوں کے تھان، اور جوے کے تیر، یہ سب ناپاک شیطانی کام ہیں، لہٰذا ان سے بچو)۔

بقدرِ ضرورت تفصیل سورۂ بقرہ آیت 219 میں گزر چکی ہے، جہاں بیان ہوا کہ حرمتِ خمر تدریجاً نازل ہوئی، کیونکہ صدیوں سے شراب نوشی کی عادت عرب اقوام میں پختہ ہو چکی تھی، جس کا بیک وقت چھڑانا کچھ مشکل معلوم ہوا، لہٰذا یہ حکم تدریجاً نازل ہوا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں تیمم کی مشروعیت کا بیان ہے۔ مزید تیمم کا بیان سورۂ مائدہ میں آنے والا ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ پانی نہ ہونے کی صورت میں، یا مریض ومسافر ہونے کی صورت میں حدثِ اصغر (بے وضوئی) حدثِ اکبر (جنابت) دونوں سے پاک ہونے کے لئے تیمم کرنا جائز ہے، کیونکہ حدثِ اصغر وحدثِ اکبر کے ہوتے ہوئے نماز جائز نہیں ہوتی، اور نماز کے لئے طہارت شرط ہے۔ پوری تفصیل سورۂ مائدہ، رکوع دوئم میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

تیمم امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس کا رواج اور جواز گزشتہ امتوں میں نہیں ہے۔ یہ ایک خصوصی نعمت وشرف ہے جو آخری امت کے حق میں مشروع ہوا۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ: مجھے انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں کے ذریعہ فضیلت دی گئی: اول مجھے جوامع الکلم عطا کئے گئے، دوئم رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی، کہ اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے دلوں میں میرا رعب ڈال دیا ہے، جس کی وجہ سے حملہ آور ہونے سے ڈرتے ہیں۔ سوئم میرے لئے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا۔ چہارم ساری زمین میرے لئے سجدہ گاہ، یعنی نماز پڑھنے کی جگہ بنادی گئی ہے، اور ساری زمین میرے لئے پاک کرنے والی بنادی گئی ہے، کیونکہ اگر پاک مٹی سے تیمم کر لیا جائے، جبکہ شرائط تیمم کے متحقق ہوں، تو اس سے وہی پاکی حاصل ہوتی ہے جو وضو اور غسل سے حاصل ہوتی ہے۔ پنجم میں ساری مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام خاص اپنی قوموں کی طرف بھیجے جاتے تھے۔ ششم انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد میری آمد پر ختم کردی گئی، اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ [مشكوة]

اس حدیث میں فضیلت والی چھ چیزوں کا ذکر ہے۔ دوسری احادیث میں اور بہت سے فضائل مذکور ہیں، جن کا علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے خصائص میں احاطہ اور استیعاب کیا ہوا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: پاک مٹی مسلمان کو پاک کرنے والی ہے، اگرچہ دس سال تک پانی نہ ملے، پس جب پانی مل جائے تو اسے استعمال کرے۔ [رواه الترمذي]

تیمم کا طریقہ تمام کتبِ فقہ اور رسائل میں لکھا ہوا ہے۔ تعلیم الاسلام سے طریقہ اور ضروری شرائط و دیگر تمام معلومات حاصل کرلیں۔

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ اس حالت میں کہ تم نشہ میں ہو، ﴿حَتّٰى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ یہاں تک کہ تم سمجھ لو اور جان لو جو کچھ تم کہتے ہو۔ جس طرح نشہ کی حالت میں نماز ممنوع ہے، اسی طرح نیند کی حالت میں ممنوع ہے، جب تک پوری بیداری نہ ہو نہ نماز کی اجازت ہے، نہ تلاوت قرآن کی، اور نہ دعاء و مناجات کی، لَعَلَّهُ يَسْتَغْفِرُ فيسب نَفْسَهُ، کیونکہ بیداری مکمل جب تک نہ ہو تو بجائے دعاء و استغفار کے منہ سے بددعاء نکلے تو کیا فائدہ۔ [بخاري]

وَلَا جُنُبًا اور نہ ہی جنابت کی حالت میں، کیونکہ بغیر وضوء و طہارت نماز پڑھنا قطعاً حرام ہے، بلکہ جنب کے لئے تلاوت بھی سخت گناہ اور حرام ہے، چہ جائیکہ نماز جہاں قرأت بھی فرض ہے۔

﴿إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ﴾ سوائے اس کے کہ وہ راستہ گزرنے والا مسافر ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص مسافر ہے، اس کو جنابت لاحق ہوئی ہے، مگر غسل کے لئے پانی دستیاب نہیں ہے، یا اس پر قادر نہیں ہے، تو اس کے لئے

اجازت ہے کہ وہ اس وقت تک بغیر غسل کے تیمم کے ساتھ نماز ادا کرلے، جب تک اسے غسل کے لئے پانی میسر نہیں آئے گا۔ جیسے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر گئی۔

عَابِرِیْ سَبِیْلٍ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ محلِ نماز، یعنی مسجد میں بھی داخل نہ ہو، البتہ اگر وہاں بطورِ راستہ گزرنا ہو، تو مسجد سے گزر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر مسجد میں احتلام ہوا تو مسجد کے اندر سے گزر کر باہر جا سکتا ہے، تو آیت کا ترجمہ یہ ہوا کہ: نہ حالتِ جنابت میں نماز کے قریب جاؤ، تاوقتیکہ غسل نہ کرلو، ہاں راستہ سے گزرتے ہوئے جا سکتے ہو، خواہ غسل نہ کیا ہو، یعنی جنابت کی حالت میں بغیر غسل کئے مسجد کے اندر سے گزر سکتے ہو۔

آنے والی آیت میں اسبابِ عذر، اور مواقعِ تیمم کو بیان فرماتے ہیں، کہ ان چاروں حالتوں میں تیمم جائز ہے: (۱) بیماری (۲) سفر (۳) حدثِ اصغر (۴) حدثِ اکبر، یعنی بیوی سے صحبت کے بعد، مگر ان چاروں صورتوں میں شرط یہ ہے کہ: ﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً﴾ یعنی پانی دستیاب نہ ہو، تو ﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً﴾ کا تعلق چاروں وجوہات کے ساتھ ہے، تو فرمایا:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ اگر تم مریض ہو، یا مسافر ہو، یا تم میں سے کوئی شخص پیشاب یا پاخانہ سے فارغ ہو کر جائے ضرورت سے آیا ہے، یعنی قضائے حاجت کر کے آیا ہے، یا تم نے عورتوں سے مباشرت وصحبت کی ہے، پھر تم کو طہارت کے لئے پانی دستیاب نہ ہو۔ اول یہ کہ سرے سے پانی ہی نہ ہو، یا ضرورت سے زائد نہ ہو، یا استعمال پر قدرت نہ ہو، پس تم ان تمام حالتوں میں پاک وصاف مٹی پر تیمم کرو۔

﴿وَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ﴾ پس مسح کرو اپنے چہروں پر، اور اپنے ہاتھوں پر، پاک مٹی کا قصد، یہ تیمم کی کیفیت ہوئی، جو کہ فرض ہے، اور چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرنا تیمم کے ارکان ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا﴾ بیشک اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے، بڑے بخشنے والے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مٹی کو پانی کا نائب بنایا۔

فائدہ:

تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ صاف مٹی، پتھر، دیوار، یا کسی گرد غبار والی چیز پر دونوں ہاتھ مارے، پھر ہاتھوں کو پورے چہرے پر پھیرے، پھر دوسری مرتبہ مٹی پر دونوں ہاتھ مار کر دونوں ہاتھوں کا کہنیوں تک مکمل مسح کرلے۔ غسل

اور وضوء کا تیمم ایک ہی طرح ہے، کوئی ذرّہ بھر فرق نہیں۔ غسل کے تیمم میں غسل کی نیت کرے، وضوء کے تیمم میں وضوء کی نیت کرے، نیت تیمم میں فرض ہے، جبکہ وضوء وغسل میں فرض نہیں ہے۔ تیمم کا مکمل بیان سورۂ مائدہ میں آنے والا ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ، یہاں ضمناً بیان ہوا، کیونکہ حضرت اسلع بن شریک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ میں خادم خاص آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی کا کجاوہ باندھا کرتا تھا، ایک رات مجھ پر غسل فرض ہوگیا، حالتِ سفر میں ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے سے موت یا مرض کا اندیشہ ہوگیا، میں نے خدمت گرامی میں حاضری کے بعد یہ کیفیت ذکر کی، تو حضرت جبریل علیہ السلام اترے اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں تیمم کی اجازت مل گئی۔ [الباب النقول]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

ترجمہ: کیا تو نے ان لوگوں کو دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ گمراہی کو خریدتے ہیں، اور یہ ارادہ کرتے ہیں کہ تم راہِ حق سے بھٹک جاؤ ﴿۴۴﴾ اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جاننے والا ہے، اور اللہ تعالیٰ کافی ہے ولی ہونے کے اعتبار سے، اور اللہ تعالیٰ کافی ہے مددگار ہونے کے اعتبار سے ﴿۴۵﴾ جو لوگ یہودی ہیں ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کلمات کی تحریف کرتے ہیں ان کی جگہوں سے، اور کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا، اور نہیں مانیں گے، اور کہتے ہیں کہ سن لے اس حال میں کہ تو سننے والا نہ ہو، اور اپنی زبانوں کو موڑتے ہوئے، اور دین میں طعن کرتے ہوئے لفظِ راعنا کہتے ہیں، اور اگر وہ یوں کہتے کہ: ہم نے سن لیا، اور مان لیا، اور آپ سن لیجئے، اور ہم پر نظر فرمائیے، تو ان کے لئے بہتر ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کردی، سو وہ ایمان نہیں لائیں گے، مگر تھوڑے سے آدمی ﴿۴۶﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

ان آیات کریمہ کا مطلب وتفسیر اپنے تمام ضروری مندرجات کے ساتھ سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکا ہے۔ یہود قوم کی تقریباً چالیس کے قریب شرارتوں کا بیان وہاں گزر چکا۔ مذکورہ آیات بھی انہی شرارتوں کے مکرر بیان کے بارے میں ہیں۔

تفسیر در منثور میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رفاعہ بن زید یہودیوں کا ایک رئیس تھا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتا تو اپنی زبان موڑ کر بات کرتا، پھر اس نے اسلام کے بارے میں طعنہ زنی شروع کر دی، اور احکامِ اسلام میں عیب نکالنے لگا، اس پر یہ آیت کریمہ اِلَّا قَلِیْلًا تک نازل ہوئی۔

یہودیوں کو اللہ تعالیٰ نے تورات کا علم دیا تھا، باوجودیکہ انہوں نے اس میں تحریف کر لی تھی پھر بھی اس میں آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نبوت ورسالت کا ذکر موجود تھا، ہر قوم کے چھوٹے اپنے بڑوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں، یہودیوں کے علماء وزعماء حق وصداقت کو جانتے ہوئے بھی نہ اسلام کی طرف آتے تھے، اور نہ عوام کو اس کی طرف آنے دیتے تھے، بلکہ انہوں نے ہدایت کی جگہ گمراہی اختیار کی، اور اپنی قوم کو کفر پر جما کر رکھا، اور مسلمانوں کو بھی اسلام سے ہٹانے اور گمراہ کرنے کی پوری کوشش کی۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے دشمنوں کا خوب علم ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہاری مدد و نصرت کے لئے کافی ہے، یہ تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ یہودی لوگ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو زبان دبا کر بات کرتے تھے، ایسے الفاظ بولتے تھے جن کے ظاہری معنی کچھ اور ہوتے تھے، اور دل سے دوسرے معنی مراد لیتے تھے۔ ان الفاظ میں سے لفظ "رَاعِنَا" بھی تھا، جس کے معنی عربی میں تو یہ ہیں کہ ہماری رعایت فرمائیں، مگر ان کی زبان میں یہ لفظ موت کی بددعاء کے لئے بولا جاتا تھا، جس کی تشریح سورۂ بقرہ کے رکوع ۱۳ میں، آیت: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا﴾ [البقرة: ۱۰۴] (اے ایمان والو! تم رَاعِنَا مت کہو، اور کہو کہ دیکھئے) کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

اس آیت کریمہ میں بھی ان لوگوں کی اس حرکتِ شنیعہ کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وہ بات سنتے تھے، اور ساتھ ہی عَصَيْنَا کہتے تھے، کہ ہم فرمانبرداری نہیں کریں گے، اور اس بات کو نہیں مانیں گے۔ (یہ تو ان کا مطلب دل میں ہوتا تھا، اور ظاہری مطلب یہ تھا کہ آپ کے خلاف کسی کی بات نہ مانیں گے)۔ اور جب آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو

خطاب کرتے ہوئے "اِسْمَعْ" کہتے تھے، تو ساتھ ہی "غَيْرَ مُسْمَعٍ" بھی لگا دیتے تھے۔ صاحب رواح المعانی لکھتے ہیں کہ اس لفظ کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک معنیٰ شر والا ہے، اور وہ یہ کہ تم سننے والے نہ رہو، جس کا مقصد قوتِ سامعہ ختم ہو جانے کی بد دعا دینا تھا، اور یہی ان لوگوں کا مقصود تھا۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ آپ کو کوئی مکروہ بات سننا نہ پڑے۔ یہودی ملعون قوم ہے، وہ بطور استہزاء یہ لفظ بولتے تھے، تاکہ ظاہر میں کچھ اور سمجھا جائے، اور وہ اپنے دلوں میں اپنی نیت کے مطابق معنیٰ مراد لیتے رہیں۔

ان کے بارے میں فرمایا کہ اگر یہ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (ہم نے سن لیا اور مان لیا) کہتے اور "اِسْمَعْ" (سن لیجئے) کہتے، اور "غَيْرَ مُسْمَعٍ" کا لفظ ساتھ نہ ملاتے، اور "اُنْظُرْنَا" (ہماری طرف توجہ فرمایئے) کہتے، اور "رَاعِنَا" نہ کہتے، تو ان کے لئے بہتر اور اچھا ہوتا، مگر انہوں نے بیہودگی اختیار کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب ان کو ملعون قرار دے دیا، اب یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے، مگر تھوڑے لوگ اور یہی تھوڑے لعنت سے بھی بچ جائیں گے، جیسے یہودی عالم حضرت عبداللہ بن سلام، کعب الاحبار اور چند دیگر حضرات رضی اللہ عنہم۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا
فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

ترجمہ: اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی گئی، ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا، جو اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں، پھر ان کو الٹی جانب کی طرح بنا دیں، یا ان پر لعنت کر دیں، جیسا کہ ہم نے ہفتہ کے دن والوں پر لعنت کی، اور اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے ﴿۴۷﴾

معارف ومنازل

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے روساء یہود سے بات کی جن میں عبداللہ بن صوریا، اور کعب بن اسد بھی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اے یہودیو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور اسلام قبول کرو، اللہ تعالیٰ کی قسم تم جانتے ہو کہ جو دین میں لے کر آیا ہوں وہ برحق ہے۔ وہ کہنے لگے: اے محمد! کہ ہم اس کو نہیں پہچانتے تو کیسے اس کو قبول کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، اور ارشاد فرمایا:

اے اہل کتاب! جو کتاب ہم نے نازل کی ہے اس پر ایمان لاؤ، جو کتاب تمہیں دی گئی ہے، یعنی تورات یہ کتاب اس کی بھی تصدیق کرتی ہے، تم اس سے پہلے ایمان لے آؤ کہ ہم (بطورِ سزا) چہروں کو بالکل مٹادیں، اوران کو الٹی جانب، یعنی گدی کی طرح بالکل صفاچٹ بنادیں، ناک آنکھ منہ کچھ بھی نہ رہے، یا ہم ان لوگوں پر لعنت کردیں، جیسا کہ ہم ہفتہ کے دن زیادتی کرنے والوں پر لعنت کی تھی۔

یہودیوں کو ہفتہ کے دن کی تعظیم کا حکم دیا گیا تھا، جس میں یہ بھی تھا کہ اس دن شکار نہ کریں، وہ لوگ نافرمانی کر بیٹھے، اور نہ مانا، تو ان کو اللہ تعالیٰ نے بندر بنادیا، جیسا کہ سورۂ بقرہ رکوع ۸ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ چونکہ یہ واقعہ یہودیوں کا تھا، ان ہی کو اللہ تعالیٰ نے مسخ فرمایا تھا، اور موجودہ یہود باپ دادوں سے مسلسل سنتے چلے آئے تھے، اس لئے ان کو یاد دلایا، اور بتایا کہ تمہارے ساتھ بھی یہی ہوسکتا ہے۔

آیت کریمہ میں طمس الوجوہ کا ذکر ہے، اس کے بارے میں مفسرین کرام نے لمبی اور طویل بحث کی ہے، اور یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ یہ مسخ دنیا میں یہودیوں کے ساتھ ہوچکا ہے، یا آئندہ ہوگا؟ صاحب روح المعانی نے اس کی بڑی تفصیل بیان کی ہے، اور مفسرین کے متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ واقعہ پیش نہیں ہوا، کیونکہ اس کے بعد بعض یہود مسلمان ہوگئے تھے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ واقعہ قیامت سے پہلے پہلے پیش آئے گا، اور یہودیوں میں مسخ ہوگا۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں دو چیزوں کا ذکر ہے: ایک طمس وجوہ، دوئم لعنت۔ دونوں کے درمیان أو حرفِ عطف لایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ چہرے مسخ کردینا، یا لعنت کردینا دونوں میں سے ایک ہوگا۔ جب یہود پر لعنت ہوگئی تو دونوں میں سے ایک چیز وجود میں آگئی، اور وعید پوری ہوگئی۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ مسخ قیامت کے روز ہوگا۔ صاحب مظہریؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت: ﴿يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا﴾ [النباء:۱۸] (جس دن صور میں پھونکا جائے گا تم گروہ درگروہ آؤ گے) تلاوت کی، اور فرمایا: میری امت (امت دعوت) کے محشر کے دن دس گروہ ہوں گے، ایک گروہ کا حشر بندروں کی صورت پر، ایک گروہ کا حشر خنزیروں کی صورت پر، ایک گروہ کا کتوں کی صورت پر، اور ایک کا گدھوں کی صورت پر۔ [مظهري بحواله خطيب وابن عساكر]

حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ بیان القرآن میں فرماتے ہیں کہ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ ایمان نہ لاؤ گے تو مسخ ضرور ہوگا، بلکہ بطور احتمال ایک سزا کا ذکر فرمایا ہے، اس کے وہ مستحق تو ہیں، سو اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ عذاب دے، یا نہ دے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ اے اہلِ کتاب! اس قرآن پر ایمان لاؤ جو ہم نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا ہے، وہ تمہاری کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہے۔

﴿مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ﴾ اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بالکل مٹا ڈالیں، اور پشت پر ان کو الٹا دیں۔ یعنی چہروں سے جب ناک آنکھ منہ مٹ جائے تو وہ گدی کی طرح ہموار ہو جائے، یہ ایک قسم کا مسخ اور عذاب ہے، نعوذ باللہ منہ۔

﴿اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ﴾ یا ان پر ہم ایسی لعنت کریں جس طرح ہفتہ والے یہودیوں پر لعنت آئی، اور وہ بندر و خنزیر کی شکل میں مسخ ہو گئے۔

﴿وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا﴾ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ضرور پورا ہوتا ہے، اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝۴۸

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، اور اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہے بخش دے گا، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے تو اس نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا۝۴۸

معارف ومنازل

یہ آیت کریمہ بطورِ ضابطہ کلیہ کے ہے، قرآن وسنت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور و کریم رحمٰن و رحیم ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت کا مالک ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: یا رسول اللہ! ہم اپنے غلام اور باندیوں کو ان کی غلطیوں پر روزانہ کتنی مرتبہ معاف کر لیا کریں؟ فرمایا روزانہ ستر مرتبہ کی لغزشوں کو معاف کیا کرو۔ [در منثور]

سبحان اللہ! ایک ظلوم وجہول تنگدل انسان کو حکم ہوتا ہے کہ وہ ستر مرتبہ درگزر اور عفو وکرم کا مظاہرہ کرے، پس ربّ العزّت غفور رحیم کی مغفرت وبخشش کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا، وہ اگر چاہے تو پوری زندگی کی خطاؤں لغزشوں کو بغیر کسی توبہ کے یک لخت معاف فرمائے، یہ اس کی شان کریمی کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

مگر اس نے ایک اہم قانون وضابطہ، جو اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا، یہ انتہائی شفقت ورحمت پر مبنی ہے، صرف ایک بڑے بدترین گناہ کی مغفرت کا استثناء فرمایا۔ دراصل بات یہ ہے کہ شرک کے علاوہ کوئی ایسا گناہ نہیں جس سے عابد ومعبود کا رشتہ منقطع ہوجائے، کیونکہ گناہوں سے رشتہ ضرور کمزور ہوگا، مگر ٹوٹے گا نہیں، پس مغفرت سے ناامیدی نہیں ہوسکتی، کیونکہ رشتہ کمزور ہی سہی، مگر ٹوٹا نہیں۔

لیکن اگر بندے نے شرک وکفر کا ارتکاب کیا، تو گویا اس نے معبود کی حاکمیت کا انکار کیا، اور اس کی ننگ و عزّت میں مداخلت اور دست درازی کی، جس سے رشتہ مکمل منقطع ہوگیا۔ اب اس کی مغفرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

جس طرح قرآن کریم نے مسلمان مرد کا مشرک عورت کے ساتھ نکاح کو لغو اور کالعدم قرار دیا، اسی طرح مشرک انسان کے رشتہ کو معبود کے ساتھ باطل قرار دے کر اس کی مغفرت کو کالعدم قرار دیا، اور فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ﴾ کیونکہ رشتہ باقی نہیں رہا۔

﴿وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ کیونکہ رشتہ کمزور ہی سہی۔ مگر من وجہٖ باقی ہے۔ اس سے پہلے بھی اعلان ہوچکا تھا کہ ﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِــيْمًا ⑱﴾ [النساء:۱۸] (اور توبہ کی قبولیت ان کے لئے نہیں ہے جو برے کام کئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت کا وقت آکھڑا ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں نے اب توبہ کرلی ہے، اور نہ ان کے لئے ہے جو کفر ہی کی حالت میں مرجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے تو ہم نے دکھ دینے والا عذاب تیار کررکھا ہے)۔

پوری زندگی توبہ کا دروازہ کھلا رہا، اور عام اعلان ہوتا ہی رہا کہ توبہ کے ذریعہ گناہ، خواہ کفر وشرک ہو، یا اور کوئی گناہ ہو، قابلِ مغفرت وبخشش ہے، اور توبہ ہرگز مردود نہیں ہوتی، مگر جن لوگوں نے اس انعام سے فائدہ حاصل نہیں کیا، اور کفر وشرک پر مرے، اور اللہ تعالیٰ کی اس عظیم پیش کش کو ٹھکرادیا، اب روزِ محشر ہرگز ان کی مغفرت نہیں

ہو سکتی، کیونکہ ان کا رشتہ باقی نہیں رہا۔

تو آیت کریمہ نے واضح کر دیا کہ شرک کرنے والا جو بغیر ایمان لائے مرجائے، اس کی بخشش کبھی نہیں ہوگی، اور شرک کے علاوہ دوسرے جو گناہ ہیں اللہ تعالیٰ جن کو چاہے گا معاف فرمائے گا، اور جس گناہ پر چاہے گا عذاب دے گا۔ شرک بہت ہی بڑا جرم ہے، احسان فراموشی، نمک حرامی کا کوئی اندازہ اور حد ہو! پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے، اسی طرح رزق وروزی، مال وسرمایہ، بیوی بچے، اولاد اور زندگی وخوشحالی سب کچھ اسی نے عطا فرمایا، اور ہر حاجت بھی پوری کردی، جو چیز مانگو وہی عطا کرے، اب کیا ہوا کہ اس کی عبادت، استعانت وغیرہ میں کسی دوسری عاجز درماندہ مخلوق کو اس کے ساتھ شریک کرلیا جائے۔ عقلی طور پر بھی یہ بہت بڑی حماقت ہے، اور سفاہت وناانصافی ہے۔

اسی خاطر کہا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والے کھربوں انسانوں کے گناہ اور ساری خطائیں اور معاصی قیامت کے دن اعمال کے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے، اور ایک ادنیٰ کافر کا ادنیٰ ترین شرک ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا، تو یہ ایک ادنیٰ شرک ساری کائنات کے تمام جرائم اور گناہوں پر بھاری رہے گا۔ اسی کو قرآن کریم نے خود وضاحت کے ساتھ فرمایا: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ [لقمان:۱۳] بیشک شرک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی بے انصافی ہے۔ اسی لئے اس کی مغفرت کا کوئی امکان نہیں۔ پس ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ہر قسم کے شرک سے توبہ کرے، اور کسی قسم کے شرک کا ارتکاب نہ کرے۔

شرک کی تقریباً بیس سے زائد قسمیں ہیں، سب سے اجتناب کرے۔ اس سلسلے میں تقویۃ الایمان کتاب، اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرے، اور اپنی آخرت کو تباہی سے بچائے۔

ہمارے زمانہ کے اہل بدعت علماء سوء لوگوں کو اپنے پیٹ اور دنیوی اغراض کی خاطر رات دن شرک وبدعت کی خوب تعلیم دے رہے ہیں، اور شیطانی گمراہیوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی صحبت ورفاقت اور ان کی تعلیمات سے بچا جائے، جنہوں نے آدھی امت سے زائد لوگوں کو بجائے توحید کے شرک پر لگا کر خود بھی جہنمی بنے، اور انہیں بھی جہنم کا راستہ دکھا دیا، اور درختوں، قبروں، مزارات پر سجدہ کرایا۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

فَسَوْفَ تَرٰى اِذَا انْكَشَفَ الْغُبَارُ ★ اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارُ

ابھی تو دنیا کے گرد وغبار میں پتہ نہیں چلتا، جب قیامت کے دن سارے گرد وغبار چھٹ جائیں گے، تب ہر سوار کو اپنی سواری کا، اور ہر شخص کو اپنے اپنے عمل کی حقیقت کا پتہ چل جائے گا، اور شیطان اور اس کے حواری اپنے

متبعین سے براءت کا اعلان کریں گے۔﴿وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ [ابراھیم:۲۲] یعنی حساب وکتاب کے بعد جب جنتیوں کے جنت میں، اور دوزخیوں کے دوزخ میں جانے کا فیصلہ ہو چکے گا، اس وقت کفار ومشرکین داخل ہونے سے پہلے اپنے سردار ابلیس جنہوں نے اس کی سربراہی اور ہدایات پر کفر وشرک کیا تھا، اسے الزام دیں گے کہ مردود! دنیا میں تو نے ہماری راہ ماری، ہدایات سے منہ موڑ کر گمراہی سکھائی، اور ہمیں جہنم پہنچایا، اب کوئی تدبیر کر کے نجات کا راستہ پیدا تو کر۔ اب ابلیس ان کے سامنے لیکچر دے گا کہ: بیشک حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کے توسط سے بہت اچھے، گرانقدر، پکے سچے وعدے کئے تھے، اور میں نے اس کے مقابل جھوٹی باتیں اور بے حقیقت جھوٹے وعدے کئے، پس میں نے زبردستی تمہارے ہاتھ پکڑ کر اپنی جھوٹی باتوں پر تمہیں مجبور نہ کیا، کہ آؤ مجبوراً کفار ومشرک بنو، میں نے صرف تمہیں اپنے مشن پر چلنے کی دعوت دی۔ بالمقابل پیغمبروں اور ان کے خلفاء نے بھی تمہیں دعوت دی، تم نے بخوشی میری بات مانی، اور لبیک کہا، پیغمبروں کو جھٹلایا۔ اگر تم کامیابی چاہنے والے ہوتے تو ان کی بات مانتے، اور مجھے چھوڑ دیتے، جیسے کہ ہدایت یافتہ لوگوں نے ایسا کیا، آج وہ جنت کے حقدار ہوئے۔ بھائی مجھے کوئی الزام مت دو، خود کو ملامت کرو، کہ تم اپنے اختیار سے سچ کو چھوڑ کر میرے جھوٹ پر عمل پیرا ہوئے، آج میں نہ اپنے لئے کچھ کر سکتا ہوں، نہ تمہارے لئے کچھ کر سکتا ہوں۔ آج میں تم سے اور تمہارے کفر وشرک سے اور تمہارے کار وکردار سے بری الذمہ اور بیزار ہوں، تم کتنے ناسمجھ اور بے عقل لوگ ہو کہ اپنے ربّ کی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے میری بیہودہ باتوں پر یقین کیا، میرے سامنے سے ہٹو۔ دور ہو جاؤ، تمہارے ہی سبب سے میرے عذاب میں سختی اور زیادتی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ لیکچر مکمل کر کے ابلیس الثاان پر الزام عائد کرے گا۔ ؎

مَرے تھے جن کے لئے وہ لگے وضوء کرنے ☆ میری نماز جنازہ پڑھائی غیروں نے

مزید تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

توحید کے اہم ارکان

قرآن حکیم میں سب سے زیادہ جگہ جگہ توحید کا حکم فرمایا، کیونکہ توحید ہی کائنات کی روح رواں ہے۔ توحید

ہی تخلیق کائنات کی علّتِ تامہ ہے، اور توحید ہی آٹھوں جنتوں کی چابی ہے، جس کو توحید ملی سمجھو اس کو سب کچھ ملا، اور جس کو نہیں ملی اس کو کچھ بھی نہ ملا۔

توحيدفي الذات، توحيدفي الصفات، توحيدفي العلم، توحيدفي التصرف، توحيدفي التدبير، توحيد في العبادة، یہ توحید کے اہم ارکان ہیں، ان کے ذیل میں بے شمار جزئیات ہیں، جو کہ توحید کی اہم اور ضروری شاخیں ہیں۔ ان کلیات اور جزئیات میں اگر سوئی کے سوراخ برابر فتور پیدا ہوا تو خطرناک نتائج سامنے آئیں گے، تب ہی تو مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ سارے اعمال سے پہلے توحید کی نزاکتوں کو سیکھنا، اور شرک کی خباثتوں سے بچنا فرض ہے، کیونکہ اربوں رکعات نماز، ہزاروں ختم قرآن، سینکڑوں حج وعمرے ادنیٰ شرکیہ عمل سے ضائع اور غیر کارآمد رہیں گے۔

﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝٣ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝٤﴾ [الغاشية] (مصیبت جھیلتے ہوئے، تھکن سے چور۔ وہ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے)۔ ساری زندگی تھکاوٹوں، عبادتوں طاعتوں میں گزری، جب قیامت کے دن پردہ اٹھایا گیا تو شرک نظر آیا، اور یہ سارا سرمایہ اور پوری پونجی جہنم کی نذر ہوگئی۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا، وہ بھی مرا ہوا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بیت المقدس کے سفر کے موقع پر ایک نصرانی راہب کو دیکھ کر رو پڑے، لوگوں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا: ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ کی تفسیر یاد آئی۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت سے تھکے ہوئے عابد زاہد جہنم کے ایندھن بنیں گے، کیونکہ ان کا عقیدہ شرکیہ رہا ہے، یہی حال ہے ہمارے زمانہ کے مجاوروں کا جو قبروں پر بیٹھے شکرانہ نذر و نیاز جمع کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے، اور توبہ کی توفیق بخشے۔ آمین

پس صرف اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک ربّ یقین کرو، اور صرف اس کی عبادت کرو، صرف اس سے مدد و استعانت طلب کرو، اور اس کی ذات وصفات میں کسی مخلوق کو شریک نہ کرو، اور ہر طرح کے شرک سے بچو، پورے حوض کا پانی ایک قطرہ پیشاب سے ناپاک ہوگا، جبکہ شرک کی ناپاکی پیشاب سے کہیں زیادہ ہے، دنیا کے سارے معبودانِ باطلہ جو کہ کروڑوں میں ہیں، صرف ہنود (ہندو) کے معبودوں کی تعداد تینتیس کروڑ ہے، یہ سارے مل کر ایک مکھی، مچھر، چیونٹی نہیں پیدا کر سکتے، اور یہ سارے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، یہ اپنے وجود کے مالک نہیں، پس کیا حماقت ہے، اور کتنی بزدلی ہے کہ لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں؟ اور انہیں نفع ونقصان کا مالک تصور کرتے ہیں؟

جب یہ مقام کسی برگزیدہ پیغمبر اور مقرب فرشتہ کو حاصل نہیں ہوسکتا، چہ جائے کہ کسی اور کو حاصل ہو۔ اس علیم و

خبیر بے نیاز کے در پر جھکو جس کا نہ کوئی شریک ہے، نہ مشیر ہے، اور نہ وزیر ہے، وہ خود مختار واحد الجبار ہے۔ اگر فرعون کی بیوی کو توحید پر جنت دے، اور براہیم خلیل علیہ السلام کے باپ کو، اور نوح علیہ السلام کی بیوی کو شرک کی وجہ سے دوزخ میں ڈال دے، تو یہ عین انصاف اور قانون کا تقاضا ہوگا، پس تم سبق سیکھو، تم پیروں، فقیروں، سیدوں، ملنگوں کو جنت کا وارث سمجھتے ہو۔

پانچ کھرب پیر وفقیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ کی ایک انگلی کے برابر نہیں ہو سکتے۔ جب وہ عظیم پیغمبر اپنے والد کی مغفرت نہیں کروا سکے، تو یہ بیچارے پیر وفقیر سیادت پناہ آغا صاحبان تمہارے لئے کیا کریں گے؟ تم ان کو متصرف سمجھ کر ایمان خراب نہ کرو، یہ بیچارے اپنے لئے جب کچھ نہیں کر سکتے تو تمہارے لئے کیا کریں گے؟ یہ سارا دن منتظر رہتے ہیں کہ کب کوئی مصیبت زدہ مشرک آئے گا چند پیسے بطورِ شکرانہ پیش کرے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ
فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾

ترجمہ: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی جانوں کو پاکیزہ بتاتے ہیں؟ بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے پاکیزہ بناتا ہے، اور لوگوں پر کھجور کی گھٹلی کے تاگے کے برابر بھی ظلم نہ ہوگا ﴿۴۹﴾ دیکھو! یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر کیسے جھوٹ باندھتے ہیں، اور ان کا یہ افتراء صریح گناہ ہونے کے لئے کافی ہے ﴿۵۰﴾

معارف ومنازل

تزکیۃ بمعنی صفائی، طہارت، پاکیزگی۔ عام طور پر اس کا اطلاق روحانی اور باطنی پاکیزگی پر ہوتا ہے، کہ کوئی اپنے نفس کو رزائل اور برے اخلاق سے پاک وصاف رکھے۔ سورۂ بقرہ میں اور آل عمران میں تزکیہ پر مفصل کلام گزر چکا۔ دراصل تزکیہ ایسے لوگوں کی صفت ہے جن کا ظاہر وباطن دینی اقدار اور اتباعِ شریعت کے سنہرے اصول وہدایات اور قرآنی تعلیمات کے رنگ میں رنگا ہوا ہو، جیسے ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ [البقرۃ:۱۳۸] (اللہ نے رنگ چڑھا دیا ہے، اور کون ہے جو اللہ سے بہتر رنگ چڑھائے؟)۔

پس جو قوم مغضوب وملعون اور گمراہ ہو، جس کے ناپاک ہاتھ انبیاء علیہم السلام کے مقدس خون سے رنگین ہوں، جو

کفروشرک کی علمبردار ہو، حضرت عزیر وحضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ کا عقیدہ رکھتی ہو، جو گوسالہ پرستی پر فخر محسوس کررہی ہو، اور جو خود کو غنی اور خالق کائنات کا فقیر کہنے سے شرم محسوس نہ کرتی ہو، جو خود کو ﴿اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ﴾ [المائدۃ:۱۸] (اللہ کے بیٹے، اوراس کے محبوب) کہہ کر نہ شرماتی ہو، اس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اپنی طہارت وصفائی اور تزکیہ بیان کرے، اور اپنے آپ کو مقدس تصور کرے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے پر اترائے، اور فخر کرے۔

صاحب روح المعانی بحوالہ ابن جریر، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہود ونصاریٰ دونوں کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ ان لوگوں نے یہ کہا تھا: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾[المائدۃ:۱۸] ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اور اس کے محبوب بندے ہیں۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ: ﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾[البقرۃ: ۱۱۱] (ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگا مگر جو یہودی ہو اور نصرانی ہو)۔ اس طرح انہوں نے اپنے نفسوں کا تزکیہ کیا، اور اپنے آپ کو صالح اور نیک اور مستحق جنت بتایا، اور باوجود کفر وشرک میں مبتلا ہونے کے اللہ تعالیٰ کے محبوب ہونے کا دعویٰ کیا، اور خود کو ابناء اللہ قرار دیا، جو کہ بدترین کفر ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی، کہ یہ لوگ ناپاک ہیں، تو وہ اتنے جرائم اور کفریہ عقائد کے ہوتے ہوئے قطعاً پاک نہیں ہوسکتے۔ خود اپنی تعریف کرنے سے نہ کوئی پاک ہوتا ہے، اور نہ ہی جنت کا مستحق و نجات کا حقدار بنتا ہے۔ یہ سارے ابلیسی کارنامے ہیں، جس نے اپنا تزکیہ اور برتری ثابت کرتے ہوئے کہا تھا: ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ [الأعراف:۱۲] (میں آدم (علیہ السلام) سے بہتر ہوں، مجھے آگ سے پیدا کیا ہے، اور اس کو مٹی سے پیدا کیا)۔

جو شخص خود اپنا تزکیہ کرے وہ اول درجہ کا احمق شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کو سب کے عقائد واعمال کی خبر ہے، اور ہر ایک کے انجام کا بھی، وہ جس کا تزکیہ فرمادے صرف وہی پاک ہوگا، اور جو کفر میں مبتلا ہوتے ہیں، اور اپنے کو پاکباز بتارہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو پوری پوری سزا دے گا، اور ان کا عذاب ان کے اعمال کا موافق ہوگا، ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا، ایک قطمیر یا فتیل برابر ان پر زیادتی نہ ہوگی۔

حقیر اور معمولی چیز کی مثال دینے کے لئے اہل عرب لفظ "فَتِيل، نَقِير، قِطْمِير" استعمال کیا کرتے ہیں، کھجور کی گٹھلی میں جو گڑھا ہے اسے نقیر، اور اس گڑھے میں جو تاگا ہوتا ہے، اسے فتیل، اور گٹھلی پر جو ہلکا سا چھلکا

ہوتا ہے اسے قِطْمِیر کہا جاتا ہے۔قرآن حکیم میں تینوں کی مثالیں موجود ہیں۔لفظ فَتِیل، اور نقیر دونوں اسی سورت میں، جبکہ قطمیر سورۂ فاطر میں مذکور ہے۔پھر فرمایا:

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ دیکھو یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر کیسے جھوٹ باندھتے ہیں؟ کہ ان کا کہنا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے اور مقبولِ بارگاہ ہیں۔پس اس کا مطلب یہ ہے کہ اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہ اللہ تعالیٰ ان کے کفر پر راضی ہیں۔یہ کتنا بڑا جرم اور افتراء ہے؟ کیا اس سے بڑھ کر کوئی افتراء ہو سکتا ہے؟ ﴿فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: ۸۹] (اللہ کی پھٹکار ہو کافروں پر) کے مستحق ٹھہرے۔

تزکیۂ نفس تقویٰ کا مغز ہے:

اللہ تعالیٰ نے سرورِ عالم ﷺ کے فرائض اور تعلیمات کا لُبِّ لباب چار چیزوں کو بتایا:

(۱) تلاوتِ آیات۔(۲) تعلیمِ کتاب۔(۳) تعلیمِ حکمت۔(۴) تزکیۂ نفس۔

تزکیة کے معنی ہیں: تہذیبِ نفس، کہ اپنے نفس کو برے اخلاق اور رزائل سے پاک کرنا، اور اچھے، پسندیدہ اور حمیدہ اخلاق کو اپنانا اور اختیار کرنا۔صوفیاء کے نزدیک یہ بہت اعلیٰ پسندیدہ مقام ہے، جسے تقویٰ کا مغز و خلاصہ کہا جاتا ہے، مگر اس کا درجہ مقامِ احسان سے نیچے ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس کی یوں تعریف فرمائی ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ [الأعلى: ۱۴] (فلاح اس نے پائی جس نے پاکیزگی اختیار کی)۔اسی طرح فرمایا ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا﴾ [الشمس: ۹] (فلاح اس نے پائی جس نے نفس کو پاک رکھا)۔تو تزکیۂ نفس پر فلاح کو مرتب فرمایا۔

صوفیاء کرام بہت ہی زیادہ اسی تزکیہ پر محنت کرتے ہیں، جب تزکیہ طبیعتِ ثانیہ قرار پاتا ہے، تو پھر مقامِ احسان میں قدم رکھتے ہیں، جس سے سیر إلی الله اور سیر في الله کا سبق شروع کرتے ہیں۔قرآن کریم نے تزکیہ کے حصول کو فلاح بتا کر اس کی تحصیل کا حکم صادر فرمایا۔مگر اس پر یہ پابندی ضرور عائد کر دی کہ یہود کی طرح اپنا تزکیہ خود نہ کرو، ہر چند تم لوگ نیک بنو، اور تزکیہ حاصل کرو، مگر خود کو کمتر، پست اور گناہ گار ہی سمجھو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کبر و غرور پیدا ہو جانے سے تزکیہ سلب نہ ہو جائے، اور نسبت ختم ہو جائے۔ہاں! حسبِ ضرورت، اور بمقدارِ ضرورت اگر کسی امتی کا، یا قاضی کی عدالت میں گواہوں کا تزکیہ بیان کرو، تو بہتر ہے، مگر افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال پر عمل کرو۔

اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اچھے اعمال اچھے اخلاق اچھے علم کی نعمت سے نوازا تو عزیمت یہ ہے کہ لوگوں میں اس کا اظہار نہ کرو۔ہاں! بوقتِ ضرورت بیان کرنے پر پابندی نہیں ہے۔واللہ اعلم

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ
وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾

ترجمہ: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا؟ وہ مانتے ہیں بتوں کو، اور شیطان کو، اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائے ان کی نسبت یہ کافر زیادہ راہِ راست پر ہیں ﴿۵۱﴾ ایسا کہنے والے وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی، اور جن پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے تو اس کے لئے کوئی مددگار نہ پائے گا ﴿۵۲﴾

معارف ومنازل

اَلْجِبت اور اَلطَّاغوت:

آیت کریمہ میں لفظ ﴿اَلْجِبْت﴾ اور ﴿اَلطَّاغُوت﴾ کا مطلب کیا ہے؟ مفسرین کے اس بارے میں متعدد اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر اور ابو العالیہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ جِبْت حبشی لغت میں ''ساحر'' کو کہتے ہیں، اور طَاغُوت سے مراد ''کاہن'' ہے۔ لفظ طاغوت قرآن کریم میں سات جگہ مذکور ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جِبْت سے مراد سحر ہے، اور طَاغُوت سے مراد شیطان ہے۔

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن چیزوں کی عبادت کی جاتی ہے ان سب کو طَاغُوت کہا جاتا ہے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ اس کا ثبوت قرآن کریم سے بھی ہوتا ہے، ارشاد ہے: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ [النحل: ۳۶] (اللہ کی عبادت کرو، اور طاغوت سے بچو)۔

لیکن ان متعدد اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے سب ہی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ اس طرح کہ اصل میں جِبْت تو بت ہی کا نام تھا، لیکن بعد میں اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری عبادت کی جانے والی چیزوں پر بھی ہونے لگا۔ [روح المعاني]

☆☆☆

مذکورہ آیت کا شانِ نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہود کے سردار حُیی بن اخطب اور کعب بن اشرف اپنی ایک جماعت کو جنگ اُحد کے بعد لے کر مکہ مکرمہ میں کفارِ قریش کے ساتھ ملنے آئے، یہود کا سردار کعب بن اشرف ابوسفیان کے پاس آیا، اور اس نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلاف ان کے ساتھ تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ مکہ کے کفار نے کعب بن اشرف سے کہا: تم ایک دھوکہ دینے والی قوم ہو، اگر تم واقعی اپنے قول میں سچے ہو تو ہمارے ان دونوں بتوں (جبت اور طاغوت) کے سامنے سجدہ کرو، چنانچہ اس نے قریش کو مطمئن کرنے کے لئے دونوں بتوں کا سجدہ کیا، اس کے بعد کعب بن اشرف نے قریش سے کہا کہ تیس آدمی تم میں سے، اور تیس آدمی ہم میں سے سامنے آجائیں، تاکہ ربّ کعبہ کے ساتھ اس چیز کا عہد کریں کہ ہم سب مل کر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے خلاف جنگ کریں گے۔ کعب بن اشرف کی اس تجویز کو قریش نے پسند کیا، اور اس طرح سے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کردیا۔

اس کے بعد ابوسفیان نے کعب سے کہا کہ تم اہلِ علم ہو، تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، لیکن ہم بالکل جاہل ہیں، اس لئے آپ ہمارے متعلق بتائیں کہ ہم حق پر چلنے والے ہیں یا محمد؟ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کعب نے پوچھا کہ تمہارا دین کیا ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ ہم حج کے لئے اپنے اونٹوں کو ذبح کرتے ہیں، اور ان کا دودھ بھی لوگوں کو پلاتے ہیں، اور مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، اپنے عزیز واقرباء کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں، اور بیت اللہ کا حج وعمرہ اور طواف کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے اپنے آبائی دین کو چھوڑ دیا ہے، اور اپنوں سے علیحدہ ہو چکا ہے۔

ان باتوں کو سن کر کعب بن اشرف نے کہا کہ تم لوگ حق پر ہو، تمہارا دین سچا اور برحق ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) معاذ اللہ گمراہ ہو چکا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات نازل فرما کر یہودیوں کے دجل وفریب اور کھلم کھلا کفر کی مذمت فرمائی۔

بغض وحسد اور نفسانی خواہشات نے ایمان سے محروم کردیا:

کعب بن اشرف یہودیوں کا عالم تھا، اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا تھا، مگر نفسانی خواہشات اور بغض وحسد نے اسے ایمان سے ہمیشہ کے لئے محروم کردیا۔ یہاں تک کہ اس نے اسلام کے مقابلہ میں قریش کے منحوس دین اور بت پرستی کو اچھا اور برحق کہہ دیا۔ پھر قریش کی حمایت اور دوستی میں ان کے بتوں کو سجدہ بھی کیا۔ اس

دوران مال، اسلحہ ودیگر ساز وسامانِ حرب قریش کو مہیا کر کے ان کو آئندہ مسلمانوں کے خلاف جنگ وقتال پر ابھار کر انہیں مطمئن کر دیا کہ مدینہ کے یہود ہر محاذ پر مسلمانوں کے خلاف تمہاری مدد کریں گے۔

یہود کے جتنے سردار اور علماء یا رؤساء تھے وہ سب اپنے بغض وحسد اور نفسانی خواہشات کی وجہ سے ایمان سے محروم رہے، اور ابدی جہنم کے ایندھن بن گئے۔ اگر چہ کافی عرصہ سے مبغوض وملعون ہو چکے تھے، مگر اسلام کی کھلم کھلی مخالفت کر کے ملعونیت ومبغوضیت کی تجدید کے مرتکب ہو گئے۔

نفسانیت اور عناد کا بیڑا غرق ہو، جب یہ دونوں چیزیں کسی کے دل میں جگہ پکڑ لیتی ہیں، تو حق وصداقت اور حقیقت کو دیکھنے ہی نہیں دیتیں۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر بینائی سلب کر لیتی ہیں، دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، کان سننے کے قابل نہیں رہتے، دل مردہ ہو جاتا ہے، عقل ناکارہ ہو جاتی ہے۔ توریت کے علوم سے آشنا ہونے کے باوجود بتوں کا سجدہ کرنا، اور مشرکین کے منگھڑت باطل اور بت پرستی کی تائید کرنا، اور انہیں ہدایت یافتہ اور مسلمانوں کو (العیاذ باللہ) گمراہ قرار دینا، اور جس مبارک ہستی کے تقدس پر ساتوں آسمانوں کے نورانی فرشتے قربان ہونے پر تیار ہوں، ان کی شان عالی میں گستاخیاں کرنا، اور قرآن پاک کی بیحرمتی اور تکذیب کرنا، یہ وہ اسباب تھے جنہوں نے یہود ونصاریٰ کی قدیم لعنتی ہونے کی تجدید کر لی۔ فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا﴾ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی، اور انہیں اپنی رحمتوں سے دور کر دیا۔ اسی ملعونیت نے انہیں نڈر اور بیباک کر دیا، اور شرک وکفر کی حمایت کر کے اہلِ توحید پر انہیں ترجیح دی۔ جب قیامت کے دن کفار ومشرکین کے زمرے میں شامل ہو کر ابدی جہنم کے عذاب میں داخل کئے جائیں گے، تو ان کا نہ کوئی حامی ہوگا، اور نہ ہی کوئی ناصر ومددگار ہوگا۔

لعنت کے اسباب:

مشرک اور کافروں پر لعنت ہے ہی، مگر بہت سے گناہ گاروں پر بھی حدیثوں میں لعنت آئی ہے۔ گناہ تو سب ہی چھوڑنے لازم ہیں، لیکن خصوصیت کے ساتھ ان گناہوں سے پرہیز کریں جن کے کرنے والوں پر لعنت وارد ہوئی ہے۔ ذیل میں چند وہ احادیث لکھی جاتی ہیں جن میں گناہوں پر لعنت کا ذکر ہے۔

اول: شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت وارد ہوئی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت

بھیجی، اور وہ یہ ہیں: (۱) شراب بنانے والے پر۔ (۲) شراب بنوانے والے پر۔ (۳) اس کے پینے والے پر۔ (۴) اس کے اٹھانے والے پر۔ (۵) جس کی طرف اٹھا کر لیجائی جائے اس پر۔ (۶): اس کے پلانے والے پر۔ (۷) اس کے بیچنے والے پر۔ (۸) اس کی قیمت کھانے والے پر۔ (۹) اس کے خرید نے والے پر۔ (۱۰) جس کے لئے خریدی جائے اس پر۔ [مشكوة]

دوم: مسلمان کو نقصان پہنچانا، یا اس کے ساتھ مکاری کرنا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص ملعون ہے جو کسی مؤمن کو نقصان پہنچائے، یا اس کے ساتھ مکر کرے۔ [ترمذي]

سوم: تقدیر کو جھٹلانا، یا کتاب اللہ میں کچھ بڑھا دینا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بلاشبہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چھ اشخاص ایسے ہیں جن پر میں نے لعنت کی ہے، اور ہر مستجاب الدعوات نبی نے بھی لعنت کی ہے۔

وہ چھ اشخاص یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی کتاب میں بڑھانے والا۔ (۲) تقدیر کو جھٹلانے والا۔ (۳) اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ان کو حلال کرنے والا۔ (۴) میری عترت، یعنی اولاد کی بے حرمتی کرنے والا۔ (۵) اور سنت کو چھوڑنے والا۔ (۶) جو زبردستی اقتدار حاصل کرے، تاکہ اس کو عزّت دے جس کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل کیا، اور اس کو ذلت دے جس کو اللہ تعالیٰ نے عزّت دی۔ [مشكوة، المدخل]

چہارم: عورتوں کا قبروں پر جانا، اور وہاں چراغ جلانا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کی زیارت کے لئے جانے والی عورتوں پر اور ان لوگوں پر لعنت فرمائی جو قبروں کو سجدہ گاہ بنائیں، اور جو قبروں پر چراغ جلائیں۔ [ترمذي، أبو داود]

پنجم: نوحہ کرنے والی اور نوحہ سننے والی پر لعنت۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوحہ کرنے والی عورت، اور اس کا نوحہ سننے والی عورت پر لعنت کی ہے۔ [أبو داؤد، مشكوة]

ششم: شوہر کی نافرمانی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب مرد اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کرے، جس کی وجہ سے شوہر غصہ کی حالت میں رات گزارے، تو

اس عورت پر صبح ہونے تک فرشتے لعنت کرتے رہیں گے۔ [متفق علیه]

ہفتم: حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو بُرا کہہ رہے ہیں، تو ان سے کہہ دو: تمہارے شر پر اللہ تعالیٰ کی لعنت، یعنی تم بُرے ہو، اور تمہارا عمل بھی برا ہے، اور بُروں پر اللہ کی لعنت۔ [ترمذي]

ہشتم: سود کھانا، اور سود کا کاتب، اور گواہ بننا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت بھیجی سود کھانے والے پر، اور سود کھلانے والے پر، اور اس کے لکھنے والے اور گواہ بننے والوں پر، اور فرمایا کہ گناہ میں سب برابر ہیں۔ [مسلم]

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے سود کھانے والے پر، اور سود کھلانے والے پر، اور گودنے والی اور گدوانے والی پر، اور تصویر بنانے والے پر۔ [بخاري]

نہم: رشوت لینا دینا، اور واسطہ بننا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی رشوت دینے والے پر، اور رشوت لینے والے پر۔ [أبو داؤد، ابن ماجة]

اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ جو شخص رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے کے درمیان واسطہ بنے اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ [بيهقي شعب الإيمان، مشكوة]

دہم: ضرورت کے وقت غلّہ روکنا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دوسری جگہ سے (شہر یا بستی میں) غلّہ لے کر آئے (جس سے لوگوں کو خوراک ملتی ہے) ایسا شخص مرزوق ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اس کو رزق دے گا) اور جو شخص ضرورت کے وقت غلّہ روک کر رکھے (مہنگائی کا انتظار کرے) ایسا شخص ملعون ہے۔ [ابن ماجه] بعض فقہاء کے نزدیک ذخیرہ اندوزی کرنے والا التعزیر أو اجب القتل ہے۔ واللہ اعلم

یازدہم: جاندار کو تیر اندازی کا نشانہ بنانا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے شخص پر لعنت کی جو کسی جاندار کو نشانہ بنائے۔ [متفق علیه]

دوازدہم: مردوں کا زنانہ وضع قطع، اور عورتوں کا مردانہ وضع قطع اختیار کرنا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے ان عورتوں پر جو

مردوں کی مشابہت اختیار کریں، اور ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں۔ [بخاري]

اس حدیث میں ان مردوں اور عورتوں پر لعنت بھیجنے کا ذکر ہے جو فطرت خداوندی کو چھوڑ کر دوسری جنس کی وضع قطع شکل وصورت لباس وپوشاک اختیار کریں۔ البتہ جو پیدائشی ہیجڑا ہو، چونکہ وہ اپنے اختیار سے نہیں بنا ہے، اس لئے وہ ملعون شمار نہیں ہوگا۔ لیکن جو مرد وعورت اپنے قصد وارادہ کے ساتھ ایسا کریں گے، جیسے آج کل لوگ یورپ کی تقلید میں یہی کچھ کر رہے ہیں، اور بے حیائی پھیلا رہے ہیں، وہ اس لعنت کے ضرور مستحق ہوں گے، اور انہیں گھروں سے نکالنے ہی کا حکم ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اور لعنت بھیجی اس مرد پر جو عورت کا لباس پہنے، اور اس عورت پر جو مرد کا لباس پہنے۔ [أبو داؤد]

سیزدہم: غیر فطری عمل پر بھی لعنت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص لعنتی ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ غیر فطری عمل اختیار کرے۔ [مشکوۃ]

اسی طرح کسی جانور کے ساتھ شہوت پوری کرنے والے پر، اور قوم لوط علیہ السلام کے عمل اختیار کرنے پر تین مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت بھیجی۔ [أبو داؤد، مسند أحمد وغیرہ]

چاردہم: عورتوں کا اپنے بالوں میں بال ملانا، اور گودوانا بھی حرام ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی بالوں میں بال ملانے والی عورتوں پر، اور بالوں میں بال ملوانے والی عورتوں پر، اور گودنے والیوں پر، اور گودوانے والی پر۔ [متفق علیہ] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت بھیجی گودنے والیوں پر، اور گودوانے والیوں پر، اور چہرے کے بال اکھاڑنے والیوں پر، اور لعنت بھیجی ان عورتوں پر جو خوبصورتی کے لئے دانتوں کو گھس کر باریک بناتی ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بدلنے والی ہیں۔ [متفق علیہ]

پانزدہم: چار آدمیوں پر لعنت۔

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس شخص پر جو غیر اللہ کے لئے ذبح کرے، اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جو زمین کی نشانی چرائے، اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جو اپنے باپ پر لعنت کرے، اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جو کسی ایسے شخص کو ٹھکانہ دے جس نے

(دین اسلام میں عمل یا اعتقاد کے اعتبار سے) کوئی نئی چیز (بدعت وضلالت) نکالی ہو۔ [مسلم]

اس آخری آدمی کے ساتھ یہ حدیث بھی منطبق کرو: مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ۔ [مشکوۃ] صاحبِ بدعت وضلالت کی جو توقیر واحترام کرے تو سمجھو کہ اس نے اسلام کے منہدم کرنے پر اس کی مدد کی۔ نعوذ باللہ منہ

اس سے بڑھ کر شرک کے بعد شاید کوئی گناہ نہ ہو، خاص کر آج کے زمانے کی بدعات، جو عین شرک یا شرک سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔ فقیروں، پیروں پر عرس کے میلوں میں وہی کچھ ہوتا ہے جو ہندوؤں کے بتوں کے آستانوں پر ہوتا ہے، اور یہ سب کچھ دیدہ دانستہ طور پر اہلِ حق واہلِ توحید کی ضد وعناد کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

یاد رہے کہ زمین کا نشان چرانے، دوسروں کی زمین کا ایک حصہ اپنی زمین کے ساتھ ملانے، یا کسی کی زمین پر قبضہ جمانے، اور غصب کرنے کا رواج اگرچہ پرانا رواج چلا آ رہا ہے، مگر آج یہ مذموم حرکت اپنے انتہائی عروج پر ہے، اور یہ موجبِ لعنت ہونے کے ساتھ ساتھ کبائر ومہلکات میں شمار ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ روزِ قیامت غصب شدہ قطعہ ساتوں زمینوں کا طوق بن کر غاصب کے گلے میں ڈالا جائے گا، جو اسے نہ اٹھا سکے گا، اور اس کے ساتھ جہنم میں گرایا جائے گا۔ [بخاري]

شانزدہم: نامحرم مرد وعورت کا دیکھنا، اور دکھانا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو دیکھنے والے پر، اور جس کی طرف دیکھا جائے اس پر بھی۔ [شعب الايمان] یہ حدیث بہت سی جزئیات پر حاوی ہے، جس میں بطور قاعدہ کلیہ کے ہر نظرِ حرام کو مستحق لعنت بتایا ہے، اور نہ صرف دیکھنے والے پر لعنت بھیجی، بلکہ اپنی خوشی اور اختیار سے جو کوئی مرد یا عورت کسی ایسی جگہ کھڑا ہو جہاں اس پر نظر بد ڈالی جا سکے، اس پر بھی لعنت بھیجی۔ اس طرح کوئی بھی مرد یا عورت کسی خاص شکل وصورت میں ہو، جسے لوگ غیر اختیاری طور پر یا تعجب وحیرانی کی وجہ سے دیکھیں، وہ بھی ملعون ہوگا۔

ہفدہم: نسب بدلنا حرام ہے۔ حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا باپ بنایا، اپنے موالی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی طرف اپنی نسبت ظاہر کی، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، اور اس پر فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے نہ فرض قبول فرمائے گا، نہ نفل۔ [مسند أحمد]

اس حدیث میں ان لوگوں کے لئے تنبیہ ہے جو اپنا کمزور نسب بدلتے ہیں، اور اعلیٰ نسب اختیار کر لیتے ہیں، اور اونچے خاندانوں میں شامل ہوکر اونچے القاب اور اونچے تخلّص کی نسبت کر لیتے ہیں۔ یہ مرض وباء کی طرح آج کل عام پھیلی ہوئی ہے۔

ہژدہم: مُحَلِّل اور مُحَلَّل لَهٗ دونوں لعنتی ہیں۔ بعض لوگ تین طلاق دے کر پشیمان ہوجاتے ہیں، کسی دوسرے مرد سے عارضی نکاح اس شرط پر کرادیتے ہیں کہ وہ جماع کر کے طلاق دیدے، وہ شخص راضی ہوجاتا ہے، نکاح کے بعد ہمبستری کر کے طلاق دیدیتا ہے، گویا یہ شخص ایسا کر کے پہلے شوہر کے لئے "مُحَلِّل" یعنی حلال کنندہ بنا، اور پہلا شوہر "مُحَلَّل لَهٗ" بن گیا۔ یہ کام نہایت قبیح ہے، ایمان وحیاء دونوں کے لئے مضر ہے، اس وجہ سے دونوں لعنت کے مستحق ٹھہرے۔ چونکہ یہ کام عورت کی رضامندی سے ہورہا ہے، اور دونوں گواہوں کی موجودگی میں ہورہا ہے، لہٰذا یہ سارے لعنت کے مستحق ہوگئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت بھیجی محلل پر، اور اس شخص پر جس کے لئے حلال کی جائے۔ [رواه الدارمي، ورواه ابن ماجة عن علي، وابن عباس، وعقبة بن عامر رضي الله عنهم، مشكوة المصابيح]

نوزدہم: نابینا کو غلط راستہ پر ڈال دینا، والدین کو ایذاء وتکلیف دینا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے اس پر لعنت کی جو زمین کی نشانیوں کو بدل دے، اور اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اس شخص پر جو نابینا کو راستہ سے بھٹکادے، اور اللہ تعالیٰ نے اس پر لعنت کی جو اپنے ماں باپ کو تکلیف دے۔ [مسند أحمد]

بیستم: چور پر لعنت۔ روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چوری کرنے والے پر لعنت کی۔ [بخاري]

بیست ویکم: پیسے کے غلام پر لعنت۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دینار کے غلام اور درہم کے غلام پر لعنت کی گئی ہے۔ [بخاري، ترمذي]

اس حدیث میں اصلی دنیادار کا نقشہ کھینچا گیا ہے، یوں دنیا میں تو پیسہ بھی کماتے ہیں، اگر حلال کمائیں حلال کھائیں تو کوئی حرج نہیں، بلکہ اپنی ضرورتوں کے لئے حلال کمانا ثواب اور پسندیدہ بھی ہے، اور عبادت بھی، لیکن یہ بات کہ پیسے ہی کا غلام ہوکر رہ جائے، اور پیسہ ہی مقصدِ زندگی اور شب وروز کا مشغلہ ہو، نہ حلال دیکھے نہ حرام، سوئے

بھی پیسہ کے لئے، جاگے بھی پیسہ کے لئے، کسی سے ملے تو بھی پیسہ کے لئے، تن و من سارا پیسہ کے لئے رَطب و یَابس جمع کر کے دین و دنیا سب پیسہ ہی پیسہ کے لئے، یہ مؤمن تو کیا، کسی عقلمند کو بھی زیب نہیں دیتا، ایسا دینار و درہم کا غلام اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام و فرشتوں کی لعنت کی زد میں ہے۔ فرمایا: لُعِنَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ والدِّيْنَارِ ۔ [بخاري] ایک دوسری حدیث میں ہے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ہلاک ہو دینار کا غلام، اور درہم کا غلام، اور چادر کا غلام، اگر ان چیزوں میں سے کچھ دیدیا گیا تو راضی ہوگیا، اور اگر نہ دیا گیا تو ناراض ہوگیا، ایسا شخص ہلاک ہو، اور اوندھے منہ ہوکر گرے، اور جب اس کو کانٹا لگ جائے تو خدا کرے (بددعاء ہے) کہ اس کا کانٹا بدن سے نہ نکلے۔ [بخاري] غور کیا جائے کہ حضرت رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دنیادار پیسے کے غلام کو کیسی بددعا دی؟

بیست ودوم: مدینہ منورہ میں بدعت پیدا کرنے والے، اور بدعتی کو پناہ دینے والے پر لعنت۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: مدینہ کا حرم یہاں (جبل عائر سے) وہاں (ثور) تک ہے، اس کا درخت نہ کاٹا جائے، اس میں کوئی بدعت نہ کی جائے، جو کوئی بدعت پیدا کرے اس پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہو۔ [بخاري] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے: جو مدینہ میں بدعت پیدا کرے، یا بدعتی کو پناہ دے اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہو، اس کا نہ نفل قبول کیا جائے گا، اور نہ فرض۔ [بخاري]

بیست وسوم: مسلمانوں کا ذمہ اور عہد توڑنے والے پر لعنت۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کا عہد توڑے (یعنی کسی ذمی کو، یا پناہ دیئے گئے کافر کو جیسے آج کل کوئی ویزا حاصل کر کے کسی مسلمان ملک میں آئے، اس کو قتل کردے) اس پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں اور سارے لوگوں کی لعنت ہو، نہ اس کا نفل قبول ہوگا، نہ فرض۔ [بخاري]

بیست وچہارم: جو آزاد شدہ غلام اپنے مالک کو چھوڑ کر اس کی اجازت کے بغیر کسی اور کو اپنا مالک بنائے، اس پر لعنت۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص اپنے آقا کو چھوڑ کر کسی اور قوم کو اپنا مولیٰ بنائے اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہو۔ [بخاري]

لعنت کے احکام:

لعنت جس قدر بری چیز ہے اسی قدر اس کے کرنے پر پابندیاں بھی عائد کی گئی ہیں، کسی حلال جانور پر بھی

لعنت نہیں کرنی چاہئے، اور کسی مسلمان پر لعنت کرنا تو قطعاً حرام ہے، اور کافر پر بھی صرف اس صورت میں لعنت جائز ہے جب اس کا کفر پر مرنا یقینی ہو، اور کسی فاسق پر نام لے کر بعینہٖ لعنت بھی جائز نہیں۔ اسی اصول کی بناء پر علماء کرام نے یزید جیسے فاسق وفاجر پر لعنت کی اجازت نہیں دی ہے۔

البتہ نام لئے بغیر، یعنی عموم کے ساتھ جیسے یہ کہنا کہ ماں باپ کے نافرمان پر، یا چوروں پر، ظالموں پر، فاسقوں پر، شریعت کے نافرمانوں پر، بے حیاؤں اور بے پردہ عورتوں پر، سودخوروں یا شرابیوں اور زناکاروں یا بے نماز اور روزہ خوروں پر لعنت ہو، یہ جائز ہے، جیسا کہ ہم نے گزشتہ سطور میں ترتیب وار تفصیل کے ساتھ حدیثوں کے حوالوں کے ساتھ بیان کیا۔ مزید تفصیل کتبِ فقہ وعقائد میں دیکھی جائے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ وَ عِلْمُہٗ اَکْمَلُ وَ اَتَمُّ وَ اَحْکَمُ

.........❁.........❁.........❁.........

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ
عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ
مُّلْكًا عَظِيْمًا﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا﴿۵۵﴾

ترجمہ: کیا ان لوگوں کا ملک میں کچھ حصہ ہے؟ سو ایسی صورت میں لوگوں کو وہ ذرا سی چیز بھی نہ دیتے﴿۵۳﴾ کیا وہ لوگوں سے اس چیز پر حسد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے؟ سو ہم نے آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی، اور ہم نے ان کو بڑا ملک عطا کیا﴿۵۴﴾ سو ان میں سے بعض اس پر ایمان لائے، اور بعض نے اس سے روگردانی کی، اور کافی ہے دوزخ کا دہکتی ہوئی آگ ہونا﴿۵۵﴾

معارف ومنازل

روحانی امراض، جیسے کبروغرور اور کنجوسی اور بغض وحسد، یہ سب شیطانی صفات ہیں، اور یہ صفات بتمامہٖ یہود کے اندر علیٰ وجہ الاتم موجود تھیں، بلکہ ان کی شناخت بھی انہی مذموم صفات پر مبنی تھی۔ پہلی آیت میں ان کی کنجوسی کا، دوسری آیت میں بغض وحسد کا بیان ہے۔ تیسری آیت میں ان کی بیماریوں کا نتیجہ اور دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ کا بیان ہے۔ اہل کتاب خاص کر یہودی کہتے تھے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) یوں کہتے ہیں کہ ان کو جو کچھ دیا گیا تو اضع کی وجہ

سے دیا گیا، اوران کی نو بیویاں ہیں، اوران کا مقصد بس نکاح کرنا ہی ہے، اوراس سے بڑھ کر کونسا بادشاہ ہوگا اس پر یہ آیتیں اتریں۔ [درمنثور]

حسد بہت بڑا مرض اور حرام ہے:

یہودی ہمیشہ حق کے دشمن رہے۔ انہوں نے اپنے پیغمبروں علیہم السلام کے ساتھ بھی دشمنی اور حسد رکھا، کبھی بَطِیبِ خاطر حق کو قبول نہیں کیا۔ اسی بناء پر وہ عند اللہ مغضوب علیہم لعنتی بن گئے۔ آئے دن ان کا مشغلہ یہی رہا کہ حق کو ناحق سمجھتے رہے، اور اعتراضات کرتے رہے، اور جھوٹے بہانے تلاش کرتے رہے، حتی کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کثرتِ ازواج کو بہانہ بنا کر اعتراض کر دیا۔ جب دلائل سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور رسالت ثابت ہوگئی، اور یہ بھی معلوم ہے کہ نبی اور رسول اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف نہ خود چلتے ہیں، اور نہ دوسروں کو چلنے کی اجازت دیتے ہیں، تو اب یہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہوا، کہ اس نے ایسے شخص کو کیوں نبی بنایا جس کی بیویوں کی تعداد زیادہ ہے؟

اس قسم کے اعتراضات اور حماقتوں سے یہودیوں کی تاریخ بھری پڑی ہے، اور جس قوم نے کبھی معبودِ حقیقی عزّ سبحانہ کو معاف نہ کیا ہو، وہ کسی نبی و رسول کو کیونکر معاف کرے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے فرمایا کہ ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، اگر ملک کا کچھ حصہ ان کے پاس ہوتا تو کسی کو نقیر کے برابر بھی کچھ نہ دیتے۔ نقیر، فتیل، قطمیر کے معنی ابھی چند صفحے پیچھے آیت ۴۸ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔

خود یہودیوں کی کنجوسی کا یہ حال ہے کہ وہ کسی کو ایک ذرّہ برابر چیز دیدینے کو تیار نہیں، اور جب اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے جو کچھ کسی کو عطا فرماتا ہے تو یہ اس پر حسد کرتے ہیں۔ ہزاروں سالوں تک ہزاروں کی تعداد میں ان کے اندر رسول اور نبی تشریف لاتے رہے ہیں، یہ آخری برگزیدہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب کی تصدیق کی ہے، اوران کے قلبِ اُطہر میں کسی کے ساتھ کسی حسد کا خیال تک پیدا نہ ہوا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور پوری امت کے ہر فرد کا ایمان و یقین جما ہوا ہے کہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام محض یہ نہیں کہ وہ سب برگزیدہ و برحق ہیں، بلکہ ہماری آنکھوں کے چشم و چراغ روشن ستارے ہیں، اور وہ تمہاری طرح ہرگز نہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں تفریق کریں، یا کسی سے حسد رکھیں۔

مگر تم یہودی سراسر حسد سے بھرے ہوئے ہو، یہاں تک کہ تم حسد کی بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر اور جانی دشمن بن گئے، اوران کے علاوہ چارسو سے زائد پیغمبروں علیہم السلام کو شہید کیا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

وَلَاتَبَاغَضُوْا وَلَاتَحَاسَدُوْا وَلَاتَدَابَرُوْا۔ اے مسلمانو! ایک دوسرے کے ساتھ بغض وکینہ نہ کرو، حسد نہ کرو، اور پیٹھ پیچھے عیوب نہ لگاؤ۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا: دَبَّ اِلَیْکُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَکُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ وَهِيَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰکِنْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ۔ [ترمذي]

گزشتہ امتوں کی بیماریاں حسد اور بغض آہستہ آہستہ تمہاری طرف آرہی ہیں، یہ مونڈنے والی بیماریاں ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بیماریان بالوں کو مونڈنے والی ہیں، بلکہ یہ دین کا صفایا کرنے والی ہیں، پھر فرمایا: اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔ [أبوداؤد] حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھاجاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑی کو کھاجاتی ہے۔

حسد کی تعریف یہ ہے کہ کسی کی نعمت، علم، مال، عزت، اولاد، حسن وغیرہ دیکھ کر اس کے زوال کی تمنا کی جائے، اور یہ حرام ہے۔ البتہ اگر زوال کی تمناء نہ ہو، اور اپنے لئے ایسی نعمتوں کا اللہ تعالیٰ سے مطالبہ اور تمنا ہو، تو یہ بہتر اور جائز ہے، اس کا نام حسد نہیں ہے، بلکہ رشک اور غبطہ ہے، یہ پسندیدہ ہے۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ حسد کرنے والا بیوقوف ہوتا ہے، اس کے حسد سے کسی کی نعمت چھن نہیں جاتی، اور وہ خوامخواہ ان نعمتوں کو دیکھ دیکھ کر جو اللہ تعالیٰ کسی کو دی ہیں، وہ اندر اندر گھٹتا، کڑھتا رہتا ہے، اور حسد کی آگ میں جلتا بھنتا ہے۔ حسد کی یہ سب سے بڑی شناعت اور قباحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قضاوقدر پر راضی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنی مہربانی سے نعمت عطا فرمادی، لیکن حاسد اللہ تعالیٰ کے انعام سے راضی نہیں، اور مسلسل بے قراری اور رنج و اَلم میں گرفتار ہے، اس لئے اس کے حسنات واچھے اعمال ضائع ہو رہیں، اور حسد کی آگ انہیں جلا کر بھسم کر رہی ہے۔

آل ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ شانہ کے عظیم انعامات وحکمت اور سلطنت:

چونکہ یہودی بنی اسرائیل کی تاریخ سے اچھے واقف تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں یاد دلایا کہ ہم نے آل ابراہیم علیہ السلام کو کتاب بھی دی، اور حکمت بھی دی، اور ملک عظیم بھی عطا کیا۔ یہ چاروں نعمتیں نبوت، کتاب، حکمت، ملک وسلطنت اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں۔ تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی۔

آل ابراہیم علیہ السلام سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام ودیگر انبیاء بنی اسرائیل جو صرف پیغمبر گزرے ہیں، یا نبی وبادشاہ گزرے ہیں، یا نبوت وکتاب اور بادشاہت تینوں کے جامع، جیسے حضرت داؤد علیہ السلام، داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب زبور عطا فرمائی تھی، اور داؤد وسلیمان علیہما السلام کو نبوت کے

ساتھ سلطنت وحکومت بھی عطا کی تھی، اوران حضرات کی بیویاں بھی بہت زیادہ تھیں۔

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار تین سو بیویاں تھیں۔[معالم] اور سات سو باندیاں بھی۔[درمنثور] اور داؤد علیہ السلام کی سو بیویاں تھیں۔[معالم] جیسے یہ حضرات انبیاء آل ابراہیم علیہ السلام میں سے تھے، تو سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم بھی آل ابراہیم علیہ السلام میں سے ہیں۔ اگر ان کی بیویاں متعدد ہوگئیں تو اس میں کیا اشکال ہے؟ جو تمہیں ہضم نہیں ہورہا ہے۔

اللہ تعالیٰ مالک الملک مختار کل ہے:

یہ پوری کائنات، اوراس کا ہر ہر ذرہ ربّ العزت سبحانہ کا پیدا کردہ ہے، کسی بھی مخلوق کے لئے کائنات کی چیزوں پر اصالۃً کوئی مالکانہ تصرف نہیں۔ پس وہ ذات کریم مالک ومختار ہے جس کو چاہے کوئی نعمت عطا فرمائے، اس میں کسی عاجز مخلوق کو کیا اعتراض؟ اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش پر اعتراض کفر ہے، اوراس کی تقدیر وقضاء پر ناراضی بھی کفر ہے۔ سارے جہاں کے دانشور وفلاسفر اور عقلاء وحکماء اس کی کسی ادنیٰ حکمت کا احاطہ اوراس کی حقیقت تک رسائی سے سراسر عاجز ودرماندہ ہیں۔

جس طرح تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ کو پورا پورا اختیار ہے جس کو جو چاہے عطا فرمائے، اسی طرح تشریعی طور پر بھی اسے مکمل اختیار ہے کہ جس کے لئے جو کچھ چاہے حلال قرار دے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے تیرہ سو بیویاں، حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے ایک سو بیویاں، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صرف نو بیویاں حلال فرمادیں، اور آئندہ کے لئے خود روک لگا کر ارشاد فرمایا: ﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ﴾ [الأحزاب: ۵۲] (اس کے بعد دوسری عورتیں تمہارے لئے حلال نہیں ہیں، اور نہ یہ جائز ہے کہ تم ان کے بدلے کوئی دوسری بیویاں لے آؤ)۔

اور امت محمدیہ کو صرف چار بیویوں تک کی اجازت دیدی، وہ مالک تکوین ومالک تشریع ہے، اس کے فیصلوں پر اعتراض جہالت اور صریح کفر ہے۔ آخر میں فرمایا:

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا﴾ ان لوگوں میں سے بعض تو ایمان لے آئے، اور بعض نے اعراض کیا۔ اس میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ لوگ ایمان لائے، اور کچھ نے اعراض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پریشان نہ ہوں، یہ سلسلہ پہلے سے اسی طرح چلا آرہا ہے، جو لوگ

منکر رہیں گے، ان کے لئے جہنم کی دہکتی آگ ہے۔ تیرے معبود کا فیصلہ ہی ایسا ہے کہ جنت و دوزخ دونوں کو پر کرنا ہے، یہ تب ممکن ہے جبکہ اعراض کرنے والے لوگ بھی ہوں۔

درکارخانہ عشق از کفر ناگزیر ست ☆ دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ
بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

ترجمہ: بلاشبہ جن لوگوں نے ہماری آیات کے ساتھ کفر کیا عنقریب ہم ان کو آگ میں داخل کریں گے، جب بھی ان کی کھالیں پک جائیں گی تو ہم ان کی کھالوں کے علاوہ ان کی دوسری کھالیں پلٹ دیں گے، تا کہ عذاب چکھیں، بیشک اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے ﴿۵۶﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے عنقریب ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، ان میں ان کے لئے پاکیزہ بیویاں ہوں گی، اور ہم ان کو گھنے سائے میں داخل کریں گے ﴿۵۷﴾

معارف منازل

اوپر مؤمنین اور منکرین کا ذکر تھا، اب یہاں انہی منکرین کا عقاب اور مؤمنین کا اجر وثواب ذکر ہو رہا ہے۔

پہلی آیت میں ترہیب، اور دوسری آیت میں ترغیب کا تذکرہ ہے۔ کافروں کے بارے میں فرمایا کہ بلاشبہ ہم ان کو آگ میں داخل کردیں گے۔ یہ آگ کوئی معمولی آگ نہ ہوگی، سورۂ اعلیٰ میں فرمایا: ﴿الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى﴾ [الأعلى:۱۲] (وہ شخص جو بڑی آگ میں داخل ہوگا) وہ بہت بڑی آگ ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ﴾ [الهمزة:۷] (وہ آگ جو دلوں تک جا چڑھے گی)۔

یہاں ناراً کی تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تمہاری یہ آگ (جو دنیا میں ہے) جہنم کی آگ کا سترواں حصہ ہے۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ! انسانوں کے عذاب کے لئے تو یہی کافی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے باوجود دوزخ کی آگ دنیاوی آگ پر

درجہ بڑھادی گئی ہے، ہر درجہ حرارت اسی قدر ہے جس قدر دنیا کی آگ میں حرارت ہے''۔ [بخاري] ۶۹

اہل دوزخ کے عذاب کی کچھ تفصیل بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: ''جب ان کی کھالیں جل کر پک جائیں گی تو ہم ان کی جگہ دوسری تازہ کھالیں پلٹ دیں گے''۔ یعنی پیدا کریں گے، اور بار بار ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

آیت کی تفسیر کے ذیل میں بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک ساعت میں ستر ہزار مرتبہ ان کی کھالوں کی تبدیلی ہوتی رہے گی۔ دنیا میں تو ایسا ہوتا ہے کہ آگ نے جلا دیا، اور وہ جل بھسم کر اور ختم ہو گئے، جہنم میں ایسا نہ ہوگا، وہاں تو ہمیشہ ہی بلا توقف عذاب جاری رہے گا، اور وہاں: ﴿ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى﴾ [الأعلى: ۱۳] یعنی نہ آرام والی زندگی ہوگی، اور نہ موت آئے گی، تا کہ عذاب ختم ہو۔

﴿لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ﴾ تا کہ وہ عذاب چکھیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَذُوقُوا فَلَنْ نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا﴾ [النباء: ۳۰] (چکھتے رہو، ہم تمہارے لئے عذاب ہی بڑھائیں گے)۔ آخر میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست، اور ہر چیز پر قادر ہے، اور غالب ہے، نہ اس کی گرفت سے کوئی بچ نکل سکتا ہے، نہ کوئی اس کو اس کے ارادہ سے روک سکتا ہے، اور وہ صاحب حکمت حکیم بھی ہے، اس کا ہر فیصلہ و حکم حکمتوں پر ہی مشتمل ہوتا ہے، اور یہ عذاب بھی حکمت کے عین موافق ہے۔

فائدہ:

مسند احمد میں ہے کہ جہنمی جہنم میں اس قدر بڑے بڑے بنادئے جائیں گے کہ ان کے کان کی نوک سے مونڈھا تک سات سال کی مسافت پر ہوگا، اور ان کی کھال کی موٹائی ستر ذراع ہوگی، اور کچلی مثل اُحد پہاڑ کے ہوگی۔ [ابن کثیر] اتنی موٹائی کا مقصد ایک یہ ہے کہ عذاب میں شدت ہو۔ دوئم یہ کہ بغیر اس کے جہنم کی بھرائی نہیں ہو سکتی، کیونکہ جنت کو پر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا فرمائیں گے، جو بغیر عمل کے جنت میں رہے گی، دوزخ کے لئے نئی مخلوق پیدا کرنا، اور بغیر کفر و معاصی کے ان کو دوزخ میں ڈالنا حق تعالیٰ شانہ کی رحمت اور عدل کے خلاف ہے، اس لئے انہی کفار کے بدن اور اجسام کو بڑھا کر جہنم کو پُر فرمائیں گے۔ [بخاري]

قرآن کریم ہر مقام پر عبرت و موعظت کی خاطر ترہیب کے ساتھ ترغیب کا التزام کرتا ہے، لہٰذا فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا﴾ جو لوگ ایمان لائے، اور نیک اعمال اختیار کئے،

حقوق اللہ وحقوق العباد انجام دیئے، تو وہ انعام واکرام کے مستحق ہوئے۔ فرمایا: ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان جنتی باغوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، خوشگوار زندگی بسر کریں گے، نہ غم دیکھیں گے، نہ کسی قسم کی کوئی بدمزگی محسوس کریں گے، ساری دنیا کی ساری خوشیاں ایک طرف، جنت کی صرف پلک جھپکنے کی خوشی ایک نہیں ہوسکتیں، یعنی برابر نہیں ہوسکتیں۔ وہاں ان کے لئے پاکیزہ بیویاں ہوں گی، ہر قسم کے ظاہری اور باطنی عیوب سے پاک ہوں گی، بدصورتی، میل کچیل، مرض وبیماری، بدمزاجی، بداخلاقی، غرور وسرکشی، لعن طعن، بغض وحسد، بدگمانی، کینہ ولاپرواہی، غرض یہ کہ تمام نقائص سے پاک وصاف، حتی کہ وحشت وخوف سے بھی پاک، ہم عمر وہم مزاج، محبت وچاہت کی پیکر، جن کے نظارہ سے روح خوش ہو، اور آنکھیں ٹھنڈی ہوں، اور دنیوی لاکھوں پریشانیاں کافور ہوں۔

ایک طرف یہ جنتی گھنے اور گنجان درختوں کا دلکش سایہ، دوسری طرف شجرۂ طوبیٰ کا عمومی سایہ۔ پھر ان دونوں پر عرش عظیم کا سایہ ہے۔ ظِلًّا ظَلِيلًا بہت گہرا اور نہایت ہی عمیق ومعطر سایہ۔ اے ہمارے ربّ کریم! ہمیں یہی نعمتِ جلیلہ محض اپنے کرم سے نصیب فرما۔ آمین

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا ۙ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٥٨﴾

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم فرماتا ہے کہ امانت والوں کو امانتیں دے دیا کرو، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلے کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس چیز کی تمہیں نصیحت فرماتا ہے وہ بہت ہی اچھی ہے، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا، دیکھنے والا ہے ﴿٥٨﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ کا شانِ نزول:

اس آیت کریمہ کے سببِ نزول میں حضرات مفسرین نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ فتح مکہ کے دن آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ حجبی سے کعبہ شریف کی چابی لے لی تھی، ان کے خاندان میں عرصہ دراز سے کعبہ شریف کے کھولنے اور بند کرنے کی خدمت چلی آرہی تھی، جس کو اہلِ عرب سدانة البیت کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ شریف میں داخل ہوئے، وہاں نماز پڑھی، جب باہر نکلے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ چابی ہمیں عنایت فرمائیے، تاکہ بنی ہاشم میں "سقایة الحاج" (حاجیوں کو پانی پلانا) اور "سدانة البیت" دونوں جمع ہوجائیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے یہ سوال کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں حضرات نے مل کر یہ سوال کیا ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میں سے کسی کو چابی نہ دی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ شریف سے باہر تشریف لائے تو آیت بالا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ﴾ تلاوت فرمارہے تھے۔ ربّ العٰلمین جل شانہ کے فرمان کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چابی اسی کو دیدی جس سے لی تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چابی عطا فرمائی، تو ارشاد فرمایا: خُذُوْهَا يَابَنِىْ اَبِىْ طَلْحَة بِاَمَانَةِ اللّٰهِ لَايَنْزَعُهَا مِنْكُمْ اِلَّا ظَالِم۔ اے بنی طلحہ! اس چابی کو اللہ تعالیٰ کی امانت کے طور پر لے لو، اس چابی کو تم سے ظالم کے علاوہ کوئی نہیں چھینے گا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خُذُوْهَا يَابَنِىْ طَلْحَة خَالِدَة تَالِدَة"۔ اے بنی ابی طلحہ! اس کو ہمیشہ کے لئے لے لو، یہ تمہارے لئے خاندانی میراث ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے آج تک یہ چابی انہیں کے خاندان میں ہے۔

جس کے پاس چابی ہوتی ہے اہل مکہ اس کو حجبي اور شيبي کہتے ہیں۔ عثمان بن طلحہ کے والد ابو طلحہ تھے، جن کا نام عبد اللہ بن عبد العزیٰ تھا، اور عثمان، شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ کے چچا زاد بھائی تھے۔ یہی شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ ہیں، جن کے خاندان میں اب تک کعبہ شریف کی کلید برداری چلی آرہی ہے، اور اسی لئے اس خاندان کو شيبي خاندان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کیونکہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ سے ہی چابی لی تھی، اور درمیان میں حضرت علی و حضرت عباس رضی اللہ عنہما اس چابی کے طالب بن گئے تھے، اس لئے حق تعالیٰ جل شانہ نے حکم دیا کہ امانت کو امانت والوں کے پاس پہنچاؤ۔ [تفسیر درمنثور و ابن کثیر]

فائدہ:

جب آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے موقع پر مکہ مکرمہ تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چودہ سو سے کچھ زیادہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ ادا فرمایا، اور خواہش ظاہر کی کہ کعبہ شریف کے اندر جاؤں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عثمان بن ابی طلحہ کو بلا کر اندر جانے کے لئے چابی مانگی، چونکہ یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے، تو عثمان نے دروازہ کھولنے اور چابی دینے سے صاف انکار کیا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا کہ وہ وقت عنقریب آنے والا ہے کہ جب یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی ۔ جب مکہ فتح ہوا، تو یہی عثمان بڑے مغموم نظر آئے، کہ معلوم نہیں آج میرا انجام کیا ہوگا؟

اس وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے چابی مانگی تو اس نے نہایت خوف کے عالم میں کانپتے ہوئے چابی دیدی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ واقعہ تجھے یاد ہے جب میں نے چابی مانگی اور تم نے انکار کیا، میں نے کہا کہ وہ دن نزدیک ہے جب یہ چابی میرے ہاتھ آئے گی، اب خطرہ محسوس نہ کرو، میں نے تمہیں معاف کیا، اور چابی بامرِ الٰہی جل شانہ تمہارے ہی سپرد ہوگی ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کریمانہ عفودرگزر کی تائید میں آیت کریمہ کا نزول ہوا ۔ [سیرت النبي]

بعض کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ فتح مکہ ہی کے روز جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عثمان بن طلحہ سے چابی طلب کی، تو اس نے انکار کیا، کیونکہ اس نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا ۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے زبردستی اس سے چابی لے لی، اور پھر آنحضرت رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چابی عثمان بن طلحہ کو دے کر ہمیشہ کیلئے اسے کعبہ شریف کی کلید برداری کا اعزاز بخشا ۔

مجھے اس روایت کی صحت میں تامل ہے، اس لئے کہ فتح مکہ مکمل ہونے کے بعد عثمان بن طلحہ کے لئے کیا مجال اور گنجائش رہتی ہے کہ وہ چابی دینے سے انکار کرے، اور یہ ممکن نہیں ۔ البتہ صاحب مظہری نے یہ واقعہ کچھ اسی طرح کی تفصیل سے لکھا ہے جس طرح میں نے لکھا، صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ بجائے عمرۃ القضاء کے انہوں نے قبل از ہجرت لکھا ہے، کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت سے پہلے مکی دور میں عثمان سے چابی مانگی، اور اس نے دینے سے انکار کیا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے عثمان! امید ہے کہ ایک روز تم اس کنجی کو میرے ہاتھ میں دیکھو گے، میں جہاں چاہوں گا اس کا استعمال کروں گا ۔ میں نے (عثمان نے) کہا کہ تو پھر اس وقت قریش تباہ اور ذلیل ہوجائیں گے، فرمایا: نہیں، وہ آباد اور باعزت ہوں گے ۔ یہ فرما کر کعبہ میں داخل ہوگئے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات میرے دل میں بیٹھ گئی، مجھے یقین ہوگیا کہ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ضرور ایسا ہوجائے گا ۔ [مظھري]

اداءِ امانت کی تاکید:

آیت کریمہ میں اداءِ امانت کے حکم کے ساتھ یہ تاکید فرمائی کہ امانتوں کی ادائیگی کا پورا پورا اہتمام کرو، اور لوگوں کے درمیان اگر فیصلہ کرنے لگو تو عدل وانصاف کرو ۔ چونکہ یہودی امانتوں میں بڑی خیانت کرتے تھے، اور فیصلوں میں رشوت لے کر بے انصافی کرتے تھے، تو مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم لوگ یہودیوں کے برے اعمال اور

بے انصافی وخیانت سے دور رہو۔اس کے علاوہ قرآن حکیم نے متعدد آیات میں اداءِ امانت کی تاکید کی ہے،اور خیانت کی مذمت فرمائی ہے،ارشاد فرمایا:﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾[الأنفال:۲۷] (اے ایمان والو!تم اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول کے حقوق میں خیانت نہ کرو،اور آپس کی امانتوں میں خیانت نہ کرو،حالانکہ تم جانتے ہو(کہ خیانت بہت بُری چیز ہے)۔

دوسرے مقام پر ارشادفرمایا:﴿وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ﴾[یوسف:۵۲](بلاشہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کوراہ نہیں دیتا)۔

تیسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ﴾[الأنفال:۵۸] (بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کوپسند نہیں فرماتا)۔

چوتھے مقام پرارشادفرمایا:﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ﴾[الحج:۳۸] (بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والے ناشکرے کو پسند نہیں فرماتا)۔سورۂ معارج میں پسندیدہ لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾[المعارج:۳۲] (وہ لوگ جواپنی امانتوں اوراپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں)۔

امانتوں کی تفصیل:

سورۂ نساء کی آیتِ بالا،اوردیگر آیات جونقل ہوئیں،ان سب سے عمومی طور پر ہر قسم کی امانتوں کی ادائیگی کا حکم،اور ہر قسم کی خیانت کی مذمت معلوم ہوئی۔اللہ تعالیٰ کے حقوق جو بندوں پر ہیں نماز،روزے،زکوۃ،کفارات، نذر اوران کے علاوہ بہت سی چیزیں،یہ سب امانتیں ہیں،جن کی ادائیگی یا اضاعت (ضائع کرنا) ہر شخص کو معلوم ہوتی ہے،کہ میں نے کس حکم پر عمل کیا،اور کس حکم کی ادئیگی میں کوتاہی کی،یہ دوسروں کوخبر بھی نہیں ہوتی۔

اسی طرح سے آپس میں حقوق العباد،جوایک دوسرے پر واجب ہیں،وہ بھی امانتیں ہیں،ان کی ادائیگی فرض ہے۔کسی نے مال امانت رکھ دیا،یا قرض دیدیا،یا کسی سے مال غصب کیا،یا کسی کے مال میں خیانت کرلی،یا چوری کرلی،یہ سب اموال امانتیں ہیں،ان کی دائیگی فرض ہے۔حکام کو یا صاحبِ مال کو معلوم ہو یا نہ ہو،ہر شخص اپنے اپنے متعلقہ احکام میں امانتدار ہے،چھوٹے بڑے حکام اور ملوک اور سرداروروٴسااوروزراءامانتدارہیں،انہوں نے جو عہدے اپنے ذمے لئے ہیں،وہ ان کی ذمہ داری شریعتِ اسلامیہ کے مطابق پوری کریں،کسی بھی معاملے میں عوام

کی خیانت نہ کریں۔

اسی طرح سے بائع اور مشتری، اور سفر کے ساتھی اور پڑوسی، اور میاں بیوی، اور ماں باپ، اور اولاد سب ایک دوسرے کے مال کے اور دیگر متعلقہ امور کے امانتدار ہیں، جو بھی کوئی کسی کی خیانت کرے گا گنہگار ہوگا، اور میدانِ آخرت میں پکڑا جائے گا، اور جان خلاصی مشکل ہوجائے گی۔

امانتداری ایمانی تقاضوں میں سے ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ سرورعالم ﷺ نے ہم سے خطاب فرمایا ہو، اور یہ نہ ارشاد فرمایا ہو کہ: لَاۤ اِیْمَانَ لِمَنْ لَّاۤ اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ۔ اس کا کوئی ایمان نہیں جو امانتدار نہیں، اور اس کا کوئی دین نہیں جو عہد کا پاسدار نہیں۔ [مشکوۃ، بیہقی شعب الایمان] صحیح مسلم میں ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: منافق کی تین نشانیاں ہیں، اگرچہ نماز پڑھے، اور روزہ رکھے، اور یہ خیال کرے کہ میں مسلمان ہوں:

(۱) جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

(۲) جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔

(۳) اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص میں چار چیزیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا، اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہوگی تو یوں سمجھا جائے گا کہ اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے، جب تک اسے چھوڑ نہ دے:

(۱) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

(۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

(۳) جب عہد کرے تو دھوکہ دے۔

(۴) جب جھگڑا کرے تو گالیاں بکے، یعنی سب وشتم کرے۔ [بخاري]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے فرمایا کہ جب تیرے اندر چار خصلتیں ہوں تو تجھے اس بات کا کوئی ضرر نہیں کہ دنیا میں باقی چیزیں تیرے پاس نہیں ہیں:

(۱) امانت کی حفاظت۔ (۲) بات کی سچائی۔ (۳) اخلاق کی خوبی۔ (۴) لقمے کی پاکیزگی۔ [أحمد، شعب الإيمان بيهقي]

موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ حضرت لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا کہ آپ علم وفضل کے اس مرتبے پر کیسے پہنچے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بات کی سچائی، امانت کی ادائیگی، اور لایعنی سے پرہیز (بے مقصد چیزوں سے دوری) ان تینوں کی وجہ سے میں اس مرتبہ پر پہنچا۔ [مشكوة]

دینی، دنیوی اداروں کی حفاظت میں امانتداری:

جن لوگوں کے ہاتھوں میں دوسروں کے اموال ہیں ان میں ملوک اور حکام وزراء، سرپرست افسرانِ مملکت بھی ہیں، ہسپتالوں کے ڈاکٹرز بھی، سکولوں، کالجوں، دینی مدارس کے نگران بھی، یتیموں کے اولیاء بھی، مسجدوں کے متولی بھی، فوجیوں کے آفیسرز بھی، بیت المال کے نگران بھی، اور کہیں پر پڑا ہوا مال اٹھانے والے بھی، اور بہت سے عہدیدار ہیں، جن پر دوسروں کے مالوں کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، یہ سب لوگ اس بات پر مامور ہیں کہ عوام الناس کے مالوں کی حفاظت کریں، اور ذرا سی بھی خیانت نہ کریں۔

امانت کی حفاظت اور اس کی ادائیگی بہت بڑی ذمہ داری ہے، یہ سارے عہدے بڑے ہوں یا چھوٹے لوگوں سے متعلق ہوں یا حیوانات سے، جنہیں دنیا میں خوشی خوشی قبول کیا جاتا ہے، اور کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے شمار پیسے خرچ کر کے ان عہدوں کو حاصل کیا جاتا ہے، پھر ان سے متعلقہ ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا جاتا، اور طرح طرح کی زیادتیاں اور بے انصافیاں ہوتی رہتی، اور اپنائی جاتی ہیں، پس روزِ قیامت یہ سارے عہدے وبال بن جاتے ہیں، اور ذرّہ ذرّہ کا حساب تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حسن ظن اور لیاقت واہلیت کی بنیاد پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو کسی بڑے علاقے (غالباً ملک شام) کی گورنری کی پیش کش فرمائی، صحابی رسول نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ میں روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا، اور بدنصیبوں میں شامل نہیں ہونا چاہتا، مجھے کیا ضرورت کہ لاکھوں انسانوں کے حقوق ضائع کر کے دوزخ خریدلوں؟ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِه۔ [متفق عليه] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک گلہ بان اور ذمہ دار ہے، اور جن کی نگرانی اس کے سپرد ہے وہ جواب دہ بھی ہے۔ حاکم رعایا کا نگران ہے، ہر مرد اپنے گھر والوں

کانگران ہے، غلام اپنے مولا کے مال کا نگران ہے، عورت اپنے شوہر کے گھر اور مال کا نگران ہے، پس قیامت کے دن ان سارے نگرانوں سے سوال وجواب ہوں گے، اور وہ جواب دہ ہی رہیں گے۔ [متفق علیہ]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ مجھے کسی عمل پر نہیں لگاتے؟ (یعنی مجھے کوئی عہدہ عنایت نہیں فرماتے؟) اس پر شافع محشر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے مونڈے پر ہاتھ مارا، اور پھر فرمایا: اے ابوذر! تو ضعیف ہے، اور بلاشبہ یہ عہدہ امانت ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا ذریعہ ہوگا، سوائے اس شخص کے جس نے حق کے ساتھ لیا، اور متعلقہ ذمہ داری کو پورا کیا۔

اور ایک روایت یوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابوذر! میں تمہیں ضعیف دیکھتا ہوں، اور میں تمہارے لئے وہ پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں، تم دو آدمیوں کا امیر مت بننا، اور یتیم کے مال کا متولی نہ ہونا۔ [مسلم]

پس معلوم ہوا کہ جم غفیر ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں لوگوں کا امیر بننا سوائے ہلاکت ورسوائی کے خطرہ کے اور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لئے بڑی نصیحت ہے۔

نااہل لوگوں کو عہدہ سپرد کرنا سراسر خیانت ہے:

بہت سے لوگ نااہلوں کو اپنی کوشش سے، یا اپنے اقتدار سے چھوٹے بڑے عہدے دیدیتے ہیں، یا دلا دیتے ہیں، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس کو عہدہ دیا جارہا ہے یہ اس عہدہ کا اہل نہیں ہے، یا حقدار نہیں ہے۔

یہ عہدہ ایک امانت ہے، اس کی ذمہ داری بہت بڑی ہے، لیکن دنیاوی تعلقات یا قومی تعلقات یا رشتہ یا زبانی تعلقات اور دنیاوی منافع کے پیش نظر جو فاسقوں، فاجروں، بے دینوں، بے نمازوں، ظالموں، شرابیوں، حرام خوروں کو عہدے دیتے اور دلاتے ہیں، یہ سب امانت میں خیانت ہے۔

یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جسے عہدہ سپرد کیا جارہا ہے، یہ شریعت اسلامیہ سے واقف ہے یا ناواقف ہے، یہ شخص حقوق اللہ وحقوق العباد کا قائل ہے یا نہیں، اس کے عقائد اسلامی ہیں یا غیر اسلامی، جسے اقتدار اعلیٰ سپرد کیا جارہا ہے اور کیا جاتا ہے، پھر وہ عہدے تقسیم کرنے لگتا ہے، تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ جس کو عہدہ دیا جارہا ہے اس میں خداترسی، غریب نوازی کی شان ہے بھی یا نہیں، اور یہ دین پر چلے گا یا نہیں، انصاف کرے گا یا نہیں، اور عوام کے ساتھ اس کا سلوک اچھا ہوگا یا نہیں۔

عہدہ سپرد کرنے میں رشتہ داری، قومی، زبانی، یا اپنی پارٹی کا آدمی دیکھا جاتا ہے، یا وطنی ولسانی عصبیتوں کو دیکھا جاتا اور رعایت کی جاتی ہے۔ یعنی صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ہمارا آدمی ہے، اپنوں کو نوازنا مقصود ہوتا ہے، دینِ خداوندی پر چلنے اور چلانے، اور امت مسلمہ کے ساتھ عدل وانصاف اور خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبات کا کہیں بھی دھیان نہیں ہوتا۔ اسی لئے سارے فیصلے غیر شرعی اور ظالمانہ ہوتے ہیں، اور عوام عہدہ داروں کے ظالمانہ فیصلوں کو بھگتتے رہتے ہیں، اور ظلم وستم کی چکی میں پستے چلے جاتے ہیں۔

جناب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کے متعلقہ امور سے جو شخص کسی امر کا والی بنا، پھر اس نے ان پر کسی شخص کو (ذاتی) مروّت اور تعلقات کی بناء پر امیر بنا دیا، تو اس شخص پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، اس سے کوئی فرض یا نفل قبول نہیں کیا جائے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ میں داخل فرمادے گا۔ [الترغيب والترهيب، أنوار البيان]

پھر جن لوگوں کے سیاسی وعدے ہوتے ہیں، جب انہیں عہدہ مل جاتا ہے، تو عوام بیچاروں پر ظلم بھی کرتے ہیں، اور وعدہ فراموشی ووعدہ خلافی بھی کرتے ہیں، اور غدر ودھوکہ بھی کرتے ہیں، اس بارے میں جو ارشاد نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ ہیں، ان سب کو یکسر بھول جاتے ہیں۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَامِنْ وَالٍ يَلِي رَعِيَّةً مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَيَمُوْتُ وَهُوَ غَاشٌ لَهُمْ اِلَّا حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ۔ [بخاري] جو شخص مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کا والی وحاکم بنا (یعنی ان کی دیکھ بال اس کے ذمہ کی گئی) پھر وہ اس حال میں مرگیا کہ وہ ان کے ساتھ خیانت کرنے والا تھا، تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام فرمادے گا۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: مَامِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيْهِ رَعِيَّةً فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيْحَةٍ اِلَّا لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةَ۔ [بخاري] جس کسی بندہ کو اللہ تعالیٰ نے چند افراد کا نگہبان بنایا، پھر اس نے ان لوگوں کی اچھی طرح خیر خواہی نہ کی، تو جنت کی خوشبو اللہ تعالیٰ اس پر حرام فرمائے گا (جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھے گا)۔

رعیت کو دھوکہ دینے کے بارے میں ارشاد فرمایا: عَنْ سَعِيْدٍ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِكُلِّ غَادِرٍ عِنْدَ اسْتِهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَفِي رِوَايَةٍ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرْفَعُ بِقَدْرِ غَدْرِهٖ اَلَا وَلَا غَادِرَ اَعْظَمُ غَدْرًا مِنْ اَمِيْرِ عَامَّةٍ [مسلم] حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت

کے دن ہر دھوکہ دینے والے کے لئے ایک جھنڈا ہوگا، جو اس کے پاخانہ کے مقام پر نصب کیا جائے گا، وہ اس کے دھوکہ کے بقدر بلند کیا جائے گا، پھر فرمایا: خبردار! جو شخص عوام کا امیر ہو اس کے غدر، یعنی دھوکہ سے بڑھ کر کسی کا غدر نہیں ہوسکتا۔

کام پورا نہ کرنا، اور تنخواہ پوری لینا خیانت ہے:

جو لوگ تنخواہ پوری لیتے ہیں اور کام پورا نہیں کرتے، یا وقت پورا نہیں دیتے، یہ سب لوگ خیانت کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ رشوت لیتے ہیں، اور رشوت لینے کی وجہ سے کار مفوّضہ انجام دینے کی بجائے رشوت دینے والے کی مرضی کے مطابق اس کا کام کردیتے ہیں، یہ لوگ بھی خیانت کرنے والے ہیں۔ رشوت تو حرام ہی ہے، ملازمت کی تنخواہ بھی پوری حلال نہیں ہوتی، کیونکہ جس کام کی تنخواہ دی جاتی ہے اس کے خلاف کام کرتے ہیں۔

درحقیقت امانتداری کی صفت بہت بڑی صفت ہے، اور اس کو پورا کرنا ایمان کا بہت بڑا مطالبہ ہے۔ یہ ایسی عظیم صفت ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ یہ صفت صرف مالیات، یعنی اموال ومتاع سے متعلق نہیں، بلکہ پوری زندگی کے رگ وپے کے ساتھ اس طرح موجزن ہے جیسے درخت کے ساتھ اس کی سبزی، اور انسانی بدن کے ساتھ خون کا تعلق ہے۔

دیکھیں! مجلسوں میں چند آدمی اگر بیٹھ کر کچھ تبادلہ خیال کرتے ہیں، اس کے متعلق بھی سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ۔ [أبو داؤد] کہ مجلسیں امانت کے ساتھ ہیں، یعنی مجلس میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ امانت ہوتی ہیں، ان کو مجلس سے باہر لے جانا اور لوگوں میں افشا کرنا، پھیلانا درست نہیں ہے، اور یہ امانتداری کے خلاف ہے۔ ہاں! اگر کسی مجلس میں کسی مسلمان کو یا مذہب کو نقصان دینے والی کوئی بات ہو، تو اظہار کرنا ضروری ہے، یا عام کوئی بات، جس کے اظہار پر مجلس والے راضی ہوں، یا اجازت دیتے ہوں، تو صحیح ہے، اور اظہار کرنے میں قباحت نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی کسی سے مشورہ طلب کرے، تو چاہئے کہ صحیح مشورہ دے، اگر غلط مشورہ دیا تو خیانت شمار ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ [ترمذي] یعنی جس سے کسی کام کے بارے میں مشورہ طلب کیا جائے تو وہ امانتدار ہوتا ہے، اس پر واجب ہے کہ صحیح مشورہ دے، جو مشورہ لینے والے کے حق میں بہتر ہو۔ اگر ایسا نہیں کیا تو خیانت ہوگی، جو لوگ غلط مشورہ دیتے ہیں، وہ

خائن ہوتے ہیں، اور گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اسی طرح جو شخص لوگوں کی امامت کرے، پھر ان کو چھوڑ کر صرف اپنے لئے ہی دعا کرے، وہ بھی خائن شمار ہوگا، یا کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل ہو، یا دروازے پر کھڑے کھڑے اندر نظر ڈال دے اور دیکھے، یا کسی دستر خوان پر بیٹھ کر دوسروں کی اجازت کے بغیر جلدی میں بہت کھانے کی کوشش کرے، یہ سب خیانت میں شمار ہوگا۔ [مشکوۃ]

﴿وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ ادائیگی امانت کے بعد واحد لاشریک جل شانہ نے اپنی عظیم صفتِ عدل وانصاف پر اپنے نیک بندوں کو چلنے کا حکم فرمایا کہ اے میرے مسلمان بندو! تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ کے پیش نظر اپنے ربّ ارحم الراحمین کی صفتِ عدل وانصاف کو اپناؤ، اور لوگوں کے درمیان اگر فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کو اپنا شعار بنالو۔

شریعتِ اسلامیہ میں جن امور کا بہت زیادہ اہمیت اور تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے ان میں عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے کرنا بھی ہے۔ عدل وانصاف کرنے والوں کو بلند مراتب کی خوشخبری دی گئی ہے، اور ظالمانہ وباغیانہ فیصلے کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے، اور ان کے لئے بڑی بڑی وعیدیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے جو فیصلوں کے قوانین اپنی کتاب کریم اور اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجے ہیں ان کے مطابق فیصلے کرنے ہی سے انصاف ہوگا۔ نیز اللہ تعالیٰ کے قانون میں جس کی جو چیز ہو اور جس کا جو واقعی حق ہو وہ حق اور وہ چیز مستحق کو دلانے سے انصاف قائم ہوگا۔

قرآن وحدیث کے خلاف فیصلے ظالمانہ ہی ہوں گے:

انسانوں نے اپنی طرف سے جو دساتیر اور قوانین بنائے ہیں عموماً وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہیں۔ قرآن وحدیث کے خلاف فیصلے کرنا سراسر ظلم ہے، اگرچہ اہلِ دنیا اسے انصاف ہی کہتے ہوں۔ میراث اور وصیت، دیت اور قصاص، حدود اور جنایات کے شرعی قوانین، تجارت اور زراعت سے متعلقہ احکامِ نکاح و طلاق کے مسائل، حکومت سپرد کرنے اور حکومت چلانے کے قوانین، اور انسانی زندگی میں جو کچھ پیش آتا ہے اس کے اصول وقواعد، جو شریعتِ اسلامیہ نے بتائے ہیں، ان کے خلاف فیصلے دینا ظلم ہے۔ سورۂ مائدہ میں فرمایا: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [المائدۃ: ۴۵] (اور جو شخص اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اتارا، تو یہ لوگ ظلم کرنے والے ہیں)۔

جن ملکوں میں کافروں کی عملداری ہے، وہاں حق تعالیٰ کی شریعت کے خلاف فیصلے تو ہوتے ہی ہیں، لیکن

جن ملکوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اقتدار دیا ہے، وہاں کے ذمہ دار بھی اسلامی احکام کو قبول کرنے، اوران کے مطابق فیصلے کرنے پر تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، لیکن جب ان کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ اسلامی قوانین نافذ کرو، تو کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ عوام جو مغربی قوانین کے مطابق فیصلوں کے باعث ہر قسم کے ظلم وستم سہتے، برداشت کرتے ہیں وہ بھی اسلامی نظام نافذ کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ دعویٰ مسلمان ہونے کا توسب کرتے ہیں، اور قوانین واحکام دشمنان دین کا نافذ کرتے ہیں۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے: ﴿ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴾[المائدۃ: ۵۰] (کیا پھر یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ اور فیصلہ کرنے میں اللہ تعالیٰ سے اچھا کون ہوگا یقین رکھنے والوں کے لئے؟)۔ تفصیل وہاں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

ظالمانہ اور غیر شرعی فیصلوں کی وجہ سے مصائب کی یلغار:

اب جو غیر اسلامی فیصلے ہورہے ہیں، ان کی وجہ سے مصائب اور آفات کا طوفان آیا ہوا ہے۔ جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہم سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے اند پانچ چیزیں موجود ہوجائیں، اور میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ چیزیں تمہارے اندر موجود ہوں، وہ یہ ہیں:

(۱) جس قوم میں زناکاری کھلم کھلا ہونے لگے، ان میں طاعون پھیل جائے گا، اور ایسے ایسے مرض ظاہر ہوجائیں گے جو ان کے آباء واجداد میں نہیں تھے۔

(۲) اور جو لوگ زکوٰۃ دینا روک دیں گے ان کو آسمان کے قطروں سے، یعنی بارش سے محروم کردیا جائے گا، اگر چوپائے اور جانور نہ ہوں تو بالکل بارش نہ ہو۔

(۳) اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کریں گے تو قحط بھیج کر ان کو سزا دی جائے گی، اور ان کو سخت محنت میں اور صاحبِ اقتدار کے ظلم میں مبتلا کردیا جائے گا۔

(۴) اور جس قوم کے امراء اس فیصلے کے علاوہ کوئی فیصلہ کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، تو اللہ تعالیٰ ان پر دشمن مسلط فرمادے گا، پھر یہ دشمن ان کے قبضے کی بعض چیزوں پر قبضہ کرے گا۔

(۵) اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اور اس کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت کو معطل کردیں گے (اور اس پر عمل

کرنا چھوڑ دیں گے) تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان جنگ وجدال کی صورت پیدا فرما دیں گے۔[ترغیب وترھیب، والحاکم وقَالَ صحیحٌ عَلٰی شرطِ مسلمٍ عن بریدہ رضي اللہ عنه]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جس کسی قوم میں خیانت ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں دشمن کا رعب ڈال دیتے ہیں، جو لوگ ناپ تول میں کمی کر دیتے ہیں تو ان کا رزق کاٹ دیا جاتا ہے، اور جو لوگ ظلم کے فیصلے کرتے ہیں ان میں خونریزی پھیل جاتی ہے، اور جو لوگ عہد شکنی کرتے ہیں ان پر دشمن مسلط کر دیا جاتا ہے۔[موطأ إمام مالک علیہ الرحمۃ]

تقویٰ انصاف کی چابی ہے، بغیر تقویٰ انصاف نہیں ہو سکتا:

انصاف جب ہی ہو سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا خوف ہو تقویٰ ہو۔ حق کا اتباع مقصود ہو، قرآن وحدیث کا علم ہو، قضاء کے احکام اور مسائل سے پوری واقفیت ہو، امیر وغریب، اپنے پرائے، چھوٹے بڑے کی کوئی رعایت نہ ہو۔ عادلانہ فیصلے کا معیار ایک حدیث میں یوں بتایا کہ: وَحَكَمُوْا لِلنَّاسِ كَحُكْمِهِمْ لِاَنْفُسِهِمْ۔ کہ لوگوں کے درمیان وہی فیصلے کرتے ہیں جو اپنی جانوں کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں۔[مشکوۃ]

مطلب یہ ہے کہ جیسے اپنے لئے حق اور انصاف چاہتے ہیں، اسی طرح جب دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرنے لگیں تب بھی حق وانصاف اختیار کریں۔

آج کل فیصلہ اس کے حق میں ہوتا ہے جو ہموطن ہو، ہم زبان ہو، یا ہم پیشہ ہو، یا اپنی جماعت کا ہو، ایسے فیصلہ کنندہ کے لئے آخرت میں سخت عذاب ہے، جو ظلم کا فیصلہ دے، اور ظالم کا ساتھی بنے، اور اس کی رعایت کرے، جس سے کسی قسم کا تعلق ہو، اور جس کا واقعی شرعی حق بنتا ہو اسے حق سے محروم کر دے۔

آج رشوتیں لے کر بھی فیصلے دیئے جاتے ہیں، تو جس نے رشوت دے دی اور موٹی رقم پکڑا دی اس کے حق میں فیصلہ دیا جاتا ہے۔ یہ رشوتیں اور موٹی رقمیں نوٹوں کے گڈے دنیا میں اچھے لگتے ہیں، لیکن آخرت میں جو ان کا وبال ہوگا اس کی طرف سے بے خبر ہیں۔ ایسے فیصلے کرنے والوں پر قبر میں ایک کالے رنگ کا خطرناک سانپ مسلط ہوگا، وہ اتنا زہریلا ہوگا کہ اگر وہ اپنا زہر دنیا پر پھینک دے تو کوئی سبزہ باقی نہیں رہے گا، اور دریاؤں کے پانی سارے زہر بن جائیں گے، اور تمام جاندار سڑ کر مر جائیں گے۔[أبو اللیث]

انصاف کے فیصلے کرنے والوں کے لئے بشارت، اور ظالموں کی ہلاکت:

جیسے ظلم کرنے والوں کے لئے سخت وعیدیں ہیں ایسے ہی کتاب اللہ اور سنت اللہ کے مطابق فیصلے کرنے والوں کے لئے عظیم بشارتیں ہیں۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: قاضی (فیصلہ دینے والے) تین قسم کے ہیں: ان میں سے ایک جنت میں ہے، اور دو دوزخ میں ہیں۔ جنت والا تو وہ شخص ہے جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا، اور ان میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے حق کو پہچانا اور ظلم کا فیصلہ کیا سو یہ شخص دوزخ میں ہوگا۔ تیسرا وہ شخص ہے جو جہالت کے ساتھ لوگوں میں فیصلے کرتا ہے (یعنی حق و ناحق کا کچھ پتہ نہیں) سو یہ بھی دوزخ میں ہوگا۔ [ترمذي، أبو داؤد، ابن ماجة]

جن سات آدمیوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں ہوں گے جس دن اللہ تعالیٰ کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا، ان میں سب سے پہلے امامِ عادل کا ذکر ہے، یعنی مسلمانوں کا وہ اعلیٰ اقتدار والا شخص جو انصاف کرنے والا ہو۔ [رواہ بخاری عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اہلِ جنت تین قسم کے لوگ ہوں گے:

(۱) وہ صاحبِ اقتدار جو انصاف والا ہے، اور اسے خیر کی توفیق دی گئی ہے۔

(۲) وہ شخص جو رحم کرنے والا ہے، نرم دل ہے، ہر قرابتدار کے لئے جو مسلمان ہو۔

(۳) وہ شخص جو صاحبِ اہل و عیال ہوتے ہوئے (حرام سے اور سوال سے) پرہیز کرنے والا ہو، اور پرہیز کرنے کا اہتمام کرنے والا ہو۔ [رواہ مسلم، الترغيب والترهيب] حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پیارا، اور اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ قریب مجلس کے اعتبار سے امام عادل ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مبغوض اور مجلس کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ دور امام جائر (ظالم بے انصاف) ہوگا۔ [ترمذي، طبراني]

امامِ جائر سے مراد ہے ظلم کرنے والا شخص، جسے اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو، حاکم بننا اور فیصلے کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لینا، یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے، یہ ذمہ داری بہت بڑی ہے، اور آخرت میں اس کا حساب بہت سخت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے والا مقرر کر دیا گیا، تو بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔ [ترمذي، أبو داؤد، ابن ماجة]

مطلب یہ ہے کہ اس عہدے کا انجام بہت برا اور خطرناک ہے۔ عام طور پر لوگ عدل وانصاف پر قائم نہیں رہتے، تو قیامت کے دن یہ عہدہ وبال بنے گا، اور اس عہدے کی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرنے پر عذاب ہوگا، اس کو اس دنیا میں اس طرح سمجھ لیا جائے جیسے کسی کو چھری کی بجائے (دھاری دار آلے کے علاوہ) کسی اور چیز سے ذبح کیا جائے۔ چھری سے ذبح کرنے کی تکلیف ذرا کم ہوتی ہے، لیکن اگر بغیر چھری کے ذبح کیا جائے تو اس کی تکلیف بہت ہی زیادہ ہوتی ہے۔

اقتدار اعلیٰ کے حاکموں اور قاضیوں کو ضروری تنبیہ:

اس حدیث شریف پر ہر وہ شخص غور کرے جو حاکم وقاضی، جج، مجسٹریٹ بنا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی کوئی حاکم (ظالم) لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے، قیامت کے دن اسے لایا جائے گا، پھر جہنم کے کنارے پر اسے کھڑا کر دیا جائے گا، پھر اگر حکم ہوگا کہ اسے دھکا دیدیا جائے تو اس کو دھکیل دیا جائے گا، جس کے نتیجے میں وہ ستر سال تک جہنم کی گہرائی میں گرتا چلا جائے گا۔ یہ ہے بے انصافی کا انجام۔ [رواہ البزاز کمافي الترغیب والترھیب]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انصاف کرنے والے قاضی پر قیامت کے دن ضرور ایک ایسی گھڑی آئے گی کہ وہ حساب کی سختی کی وجہ سے یہ تمنا کرے گا کہ میں کبھی کسی ایک کھجور کے بارے میں بھی فیصلہ نہ کرتا تو اچھا تھا۔ [الترغیب والترھیب]

ایک نہایت اہم عقدہ، اور اس کا بہترین حل:

شاید کسی کو یہ خیال گزرے کہ جب اتنی سخت یہ وعیدیں ہیں تو لوگوں کے درمیان جو جھگڑے ہوں، ان کے فیصلے کون کرے گا؟ جواب یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کے اصول کے مطابق اگر کسی کو حاکم وقاضی بنا دیا جائے، اور پھر وہ شریعتِ اسلامیہ کے مطابق انصاف کے ساتھ فیصلے کرے، حق وانصاف کو سامنے رکھے، قرآن وحدیث کے مطابق اپنی زندگی گزارے، اور دوسروں کو بھی اسی پر ڈالے، تو ایسا حاکم وقاضی کامیاب ہوگا (روزِ قیامت مشک وعنبر کے ٹیلوں پر خراماں رہے گا، اور حق وانصاف کے ہر فیصلہ پر اسے قبول شدہ حج کا ثواب ملے گا)۔ [إحیاء العلوم، مثنوي]

اب سوال یہ ہے کہ وہ اصول کونسے ہیں جن کے موافق کسی کو قاضی بنایا جائے؟ وہ اصول یہ ہیں کہ جو شخص قاضی بننے کی خود تمنا نہ کرے، اور نہ اس کا طلبگار ہو، نہ اس کے لئے جدوجہد کرے، اور نہ سفارشیں کروائے، نہ رشوتیں

دے، اور عہدۂ قضاء سے حتی الامکان بچتا رہے، اس کو قاضی بنا دیا جائے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص عہدہ قضاء کا طلبگار ہو، اور اس سلسلے میں سفارش کرنے والوں سے سوال کرے (جس پر اسے عہدہ دیدیا جائے) تو وہ اپنے نفس کے حوالے کر دیا جائے گا (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد نہ ہوگی، وہ جانے اس کا نفس جانے، جب ایسا ہوگا تو ظاہر ہے کہ نفس کے موافق فیصلے ہوں گے)۔ اور جس کو قاضی بننے پر مجبور کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتہ بھیج دیتا ہے، جو اسے صحیح راستے پر چلاتا رہتا ہے۔ [ترمذي، أبو داؤد]

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عہدۂ قضا کا طلبگار ہو، اسے تو عہدہ سپرد کیا ہی نہ جائے، جس کے دل میں خواہش ہے کہ میں فیصلہ کرنے والا بنوں، وہ حق پر قائم نہیں رہ سکتا، کیونکہ اس کی رغبت اور خواہش بتا رہی ہے کہ وہ اس سے دنیاوی منافع حاصل کرے گا، اسے جاہ و مال کی رغبت ہے، اسی لئے وہ اس عہدے کا طالب ہوا، اسے اگر عہدہ مل جائے گا تو فیصلے اپنی مرضی کے مطابق کرے گا، اور جہالت کے ساتھ کرے گا، رشوتیں بھی لے گا، اور اپنے کو پرائے پر ترجیح بھی دے گا۔

اور جس پر زبردستی عہدۂ قضا ڈال دیا گیا، وہ اس کی ذمہ داریوں سے جیسے پہلے ڈرتا تھا ایسے ہی اپنے نفس کو ذمہ داریاں پورا کرنے کا پابند بنائے گا، یہ ایک ایسا سنہری اصول ہے، کہ اگر اسے اختیار کیا جائے تو فیصلوں میں جو ظلم ہوتے ہیں ان کی روک تھام ہو جائے گی۔ اب تو ہوتا یہ ہے کہ جن کو مجسٹریٹ اور جج بننا ہے، وہ پڑھتے ہی اس لئے ہیں کہ ہم ڈگری لے کر اس کام میں لگیں گے، پھر درخواستیں دیتے ہیں، سفارشیں لاتے ہیں، رشوتیں دیتے ہیں، پھر جن لوگوں کے ہاتھ میں تقرر ہوتا ہے وہ بھی رشوتوں اور سفارشوں اور ڈگریوں کی بنیاد پر جج اور مجسٹریٹ بنا دیتے ہیں، اوپر چیف جسٹس تک یہی سلسلہ چلتا ہے، یہ جس کا تقرر کرتے ہیں اس کے بارے میں یہ تو دیکھا ہی نہیں جاتا کہ اسے قرآن و حدیث، اور اسلامی علوم کا کچھ علم ہے یا نہیں، اور اس میں تقویٰ کتنا ہے، خداترسی کتنی ہے، اس سے انصاف کی امید کتنی ہے؟

حاکم تک کوئی شخص وکیل کے بغیر نہیں پہنچ سکتا، کسی مظلوم کا کیس پیش نہیں ہو سکتا، پہلے وہ وکیل کی فیس فراہم کرے، پھر اس کا استغاثہ دائر ہو، پھر تاریخوں پر تاریخیں پڑتی رہتی ہیں، جس سے اس کے وقت اور پیسے کا لگاتار نقصان ہوتا رہتا ہے۔ یہ دشمنانِ اسلام یہود و نصاریٰ کا طریق کار ہے۔ مجسٹریٹ اسی سے مانوس ہیں، اور اسی پر چلتے

رہتے ہیں، اوراسی کی تنخواہ ومراعات لیتے ہیں۔ مظلوم کی دادرسی کاذرابھی دھیان نہیں، یہ مغربی قانون کی کارستانیوں کا اصلی چہرہ ہے، جوایک عذاب ہے، جوقوم اپنے پروردگار کے حقیقی اور بنیادی عدل وانصاف کے قانون سے منحرف اور بےگانہ ہو، پس تازیانۂ عبرت کا کوڑہ اس کے سراور کندھوں پر ایسا ہی مسلط ہوگا۔ ﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى﴾ [طٰہٰ:۱۲۴، أنور البیان] (اور جو میری نصیحت سے منہ موڑے گا تواس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی، اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا کرکے اٹھائیں گے)۔

تمام کائنات کی فلاح صرف اللہ تعالیٰ کے حکم ماننے میں ہے:

فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا﴾ بیشک اللہ تعالیٰ جس چیز کی طرف تمہیں بلاتا اور نصیحت کرتا ہے، وہ بہت اچھی ہے، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جوحکم دیتا ہے وہ سراسر تمہاری فلاح وکامیابی کے لئے ہوتا ہے، اس کے حکموں میں کبھی کوئی پہلونقصان کا نہیں ہوتا، اس کے ہزاروں مأمورات ومنہیات خیر وصلاح پر مبنی ہوتے ہیں، لہٰذا اس کے حکموں کی تعمیل میں کبھی سستی نہ کرو، اورانہیں چھوڑکرکسی ظلمت وتاریکی کی طرف نہ جھکو، پس اگرایسا کروگےتواس کی سزا کے لئے تیار رہو، وہ تمہاری باتوں اور قلبی ارادوں کو جانتا بھی ہے، سنتا بھی اور دیکھتا بھی ہے، اسی کے مطابق سزا بھی دیتا ہے۔

درحقیقت یہ بہت بڑی تنبیہ ہے، جولوگ خلاف شرع فیصلے کرنے، اورنااہلوں، ظالموں اوررشوت خوروں کو عہدۂ قضاء سپردکرتے ہیں، وہ سب قیامت کے روزعذابِ ابدی میں مبتلارہیں گے، اورابدی جہنم میں اوپر سے نیچے گرتے رہیں گے، جیسے بیان ہوا۔

اوران کے برعکس لوگوں کے لئے یہ پیغام ہے: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انصاف سے فیصلے کرنے والے قیامت کے دن رحمٰن جل جلالہ کے دائیں ہاتھ کی طرف نور کے ممبروں پر ہوں گے۔ فرمایا: رحمٰن سبحانہ کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں، یہ وہی لوگ ہوں گے جو فیصلوں اور فیصلہ کے فریقوں میں اوراپنے زیرِحکومت امور میں انصاف کرتے ہیں۔ [مسلم]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی، اور فرمانبرداری کرو رسول کی، اور ان لوگوں کی فرمانبرداری کرو جو اولی الامر ہیں تم میں سے، پس اگر تم آپس میں کسی چیز کے بارے میں جھگڑنے لگو تو اس کو لوٹا دو اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول کی طرف، اگر تم اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے، اور خوب تر ہے ﴿۵۹﴾

معارف ومنازل

قرآن کریم کی ہمہ گیری اور جامعیت کا یہ کمال ہے کہ پورے دین کا لُبِّ لباب اور خلاصہ ایک ہی آیت میں بیان فرمایا، ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہر معاملہ میں اطاعت وفرمانبرداری کرو، اور اپنے بڑوں کا حکم مانا کرو، اگر تمہارے آپس میں یا تمہارے اور تمہارے بڑوں کے درمیان کسی چیز میں اختلاف پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنا حَکَم اور قاضی تسلیم کرو، اور ان کی عدالت میں اختلافی مقدمہ پیش کر کے ان سے فیصلہ لے لو، اور دل وجان سے وہ فیصلہ تسلیم کر کے نفاق وکفر سے (جس کا عنقریب بیان آنے والا ہے) مکمل اجتناب کرو۔

یہ ہے وہ سنہری اصول جس میں پوری شریعت سما گئی ہے، اور دینی اقدار سارے اس میں جمع ہو گئے ہیں۔ علماء کرام اگر اسی ایک آیت میں غور کریں تو پورا دین اور تمام احکام شریعت مطہرہ کا بیکراں دریا اسی ایک ہی آیت کے کوزے میں بند کیا ہوا معلوم ہو جائے گا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی بات اس آیت کے بارے میں اور سورۃ الضحیٰ کی آیت: ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ کے بارے میں کہی ہے، میرے نزدیک ہاشمی خاندان کا انتخاب بہت ہی عمدہ اور برمحل ہے۔ رضي الله عنه وعن جميع أهل البيت وأولاد النبي صلى الله عليه وعليهم أجمعين۔

شانِ نزول:

آیت کریمہ کے شانِ نزول کے متعلق مفسرین کرام نے مختلف واقعات بیان کئے ہیں، مگر مطلب سب کا ایک ہی ہے۔ (یعنی اطاعت وفرمانبرداری) ان واقعات میں سے مشہور واقعہ یہ ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک جہادی لشکر کا امیر بنا کر بھیجا، ان کی زیر امارت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی تھے، یہ لشکر

جب اس مقام پر پہنچا تو دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ چکا تھا، اور ایک شخص وہاں باقی تھا، اس نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے پاس آکر کلمہ پڑھا، اور مسلمان ہوگیا، اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے اس کو پناہ دیدی، اس پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے کہ مجھ سے پوچھے بغیر تم نے یہ کام کیوں انجام دیا، اس پر دونوں کے درمیان تلخی بھی ہوئی۔

جب مدینہ منورہ پہنچے تو دونوں نے یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کیا، آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی پناہ دہی کو قائم رکھا، مگر آئندہ امیر کے حکم کے بغیر پناہ دہی کی ممانعت فرمائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ عالم کی مجلس میں دوبارہ ان کے درمیان درشت کلامی ہوئی، آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو منع فرمایا، اور کہا کہ جو عمار کو بُرا کہے گا اللہ تعالیٰ اس کو بُرا کہے گا، اور جو عمار سے بغض رکھے گا اللہ تعالیٰ اس سے نفرت فرمائے گا، اور جو عمار پر لعنت کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر لعنت فرمائے گا۔ یہ فرمان سن کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ فوراً حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے معذرت خواہ ہوئے، اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ ان سے راضی ہوگئے۔ اس پر یہ آیت اتری۔ [مظهري]

آیت کریمہ کا سببِ نزول جو بھی ہو آیت کا مفہوم عام ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کا مطلقاً حکم دیا گیا ہے، اور ﴿أُولُوا الْأَمْرِ﴾ کی فرمانبرداری کا بھی حکم دیا گیا ہے، اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جب تمہارا آپس میں، یا تمہارے ﴿أُولُوا الْأَمْرِ﴾ میں کسی چیز کے بارے میں اختلاف ہوجائے، تو اس معاملے کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹا دو، پس جو حکم اور فیصلہ وہاں سے صادر ہو اسے بلاچوں وچرا بخوشی قبول کرلو، اور اس پر راضی ہوجاؤ۔

اللہ تعالیٰ شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حکم قرآن حکیم میں جگہ جگہ موجود ہے، اور یہی اصل دین اور بنیاد شریعت ہے، کہ ہر موقع اور ہر معاملہ میں اطاعت جزِ جان ہو۔ اگر ایمان کے باوجود اطاعت کتاب وسنت نہ ہو، تو یہ سراسر دھوکہ اور بغاوت ہی شمار ہوگا، کیونکہ بغیر اطاعت کے ایمان متصور نہیں ہوگا۔ اسی طرح آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ ﴿أُولُوا الْأَمْرِ﴾ کی اطاعت کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

بات یہ ہے کہ جب کسی کو امیر بنالیا، جسے امام اور خلیفہ کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا حکم ماننے ہی سے امت کا شیرازہ مجتمع ومتحد رہ سکتا ہے۔ امیر کی فرمانبرداری نہ کرنے پر امت کا شیرازہ بُری طرح منتشر ہوجاتا ہے، اور ہر ایک اپنی اپنی راہ پکڑتا ہے، جب انتشار ہوتا ہے تو وحدت قائم نہیں رہتی، اور دشمن ہر جانب سے حملہ آور ہوکر

پوری ملت پر حاوی ہو جاتا ہے، پھر امیرِ اعلیٰ جن لوگوں کو مختلف جماعتوں کا امیر بنائے، یا چند مسلمان مل کر کسی کو امیر بنائیں، تو اس کی اطاعت بھی ضروری ہے، اس کی اطاعت نہ کرنے سے بھی انتشار پھیلے گا، اور آپس میں نزاع اور جدال کی صورتیں پیدا ہوں گی۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ امیر کی طاعت کرو، اس لئے امیر کی اطاعت کرنا بعینہٖ حق سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اس اطاعت میں ضبط و تنظیم کے علاوہ ثواب بھی ہے، اور امت مسلمہ کا اتحاد و ربط بھی۔ سید کائنات ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ [معالم التنزیل، متفق علیه]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نے سید کائنات ﷺ سے بیعت کی تھی اس بات پر کہ آنحضرت ﷺ کا حکم سنیں گے، اور مانیں گے، دشواری میں بھی اور آسانی میں بھی، خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی، اور حکام (امراء) سے ان کے حکم میں کوئی کشاکشی اور لَیت ولَعَل نہیں کریں گے، اور جہاں ہوں گے حق کو قائم کریں گے، اور حق بات کا اظہار کریں گے، اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ [متفق علیه] حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حاکم کا حکم سننا اور ماننا، خواہ کسی ایسے حقیر حبشی غلام کا حکم ہو جس کا سر کشمش کی طرح چھوٹا ہو۔ [بخاري]

﴿أُولُوا الْأَمْرِ﴾ سے مراد کون ہیں؟ اولوالامر سے مراد حکام وامراء ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہی فرمایا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ اولوالامر سے فقہاء وعلماء کرام مراد ہیں، جو لوگوں کو دینی احکام سکھاتے ہیں، انہیں انبیاء کرام علیہم السلام کی وراثت کا شرف حاصل ہے، جن کے لئے آسمانی فرشتے اور زمینی حیوانات اور دریائی مچھلیاں استغفار اور دعائیں کرتی ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اولوالامر سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مراد ہیں، جن کے متعلق خصوصی فرمان موجود ہے۔ [معالم التنزیل] علامہ ابن کثیر دمشقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وَالظَّاهِرُ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ اَنَّهَا عَامَةٌ فِي كُلِّ اُولِي الْاَمْرِ مِنَ الْاُمَرَاءِ وَالْعُلَمَاءِ۔

یعنی بظاہر آیت کریمہ کا عموم تمام اولی الامر کو شامل ہے، امراء اور علماء بھی اولوالامر ہیں، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ علماء کے ہاتھ میں نظام دین ہے ان کی فرمانبرداری بھی ضروری ہے، یہی لوگ حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے مشیر ہوتے تھے، اور خلیفہ کی مجلس میں ان کا حضور ضروری ہوتا تھا، اور انہی کے مشورے سے احکام جاری ہوتے تھے، اور امراء کے ہاتھ میں نظام حکومت ہے، پس دونوں فریق کی فرمانبرداری سے دین کے تمام شعبوں پر عمل ہوسکتا ہے، اور اتحاد واستحکام باقی رہ سکتا ہے۔ محدث کبیر حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ پھر جب سے امراء نے علماء، فقہاء کو نظر انداز کر کے خود کو مستقل سمجھا تب سے نظامِ حکومت اور نظامِ شریعت دونوں میں فتور پیدا ہوا۔ اب اگر دینی امور اور نظامِ شریعت متروک ہو چکا ہے تو نظامِ حکومت بھی ابلیسی کارناموں کی نذر ہو چکا ہے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں، اور صاحب اقتدار اسلام کے دعویدار ہیں، اسمبلیوں میں قانون بناتے ہیں، تو یورپ کو خوش کرنے کی خاطر انہی کے طرزِ حکومت کو سامنے رکھتے ہیں، اور انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں، اور انہی کی غلامی پر نازاں رہتے ہیں، بظاہر یہ کہنے سے نہیں تھکتے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بننے دیں گے، مگر قانون سراسر اسلام اور قرآن وسنت کے خلاف بناتے اور بنا رہے ہیں۔

یورپی حکومتوں نے جو قوانین بنا رکھے ہیں، یہ لوگ انہی میں کچھ ردوبدل کر کے قوانین نافذ کر دیتے ہیں۔ حدود اور جنایات کے احکام جب شریعت کے مطابق نافذ کرنے کو کہا جاتا ہے تو کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں، اور انہیں العیاذ باللہ ظالمانہ قوانین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دیت اور قصاص کا قانون نافذ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے تو بات سننے کے لئے تیار نہیں، کسی ملک میں اقتدار مل جاتا ہے تو دشمنوں کو خوش کرنے کے لئے اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا طریقہ نیشنلزم ہوگا۔ کوئی ملک اعلان کرتا ہے کہ کمیونزم اور سوشلزم جاری کریں گے، کچھ لوگ مغربی جمہوریت کے دلدادہ ہیں، اور کچھ لوگ فخریہ طور پر لادینی حکومت بنانے کا اعلان کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، اور اسلامی نظام نافذ کرنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ طور وطریق کہاں تک زیب دیتا ہے؟

ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکمل چلیں، اور عوام کو بھی چلائیں۔ ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ فرما کر اسی پر تنبیہ فرمائی ہے۔

رفع تنازع کے لئے کیا کیا جائے؟

پھر فرمایا: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ پس اگر تم آپس میں کسی چیز کے

بارے میں جھگڑنے لگو تو اس کو لوٹا دو اللہ تعالیٰ کی طرف، اور رسول کی طرف، اگر تم اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ آپس کے اختلاف کو رفع کرنے کے لئے اس آیت میں سب سے بڑا سنہری اصول بتایا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے، اور آخرت کے دن کی پیشی، اور وہاں کے حساب و کتاب کو بھی جزو ایمان بنالیا، تو مؤمن کی شان یہ ہے کہ ہر معاملے میں اور ہر موقع پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرے، آپس میں جب کوئی نزاع ہوجائے اس کو نمٹانے کے لئے ہر فریق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرے، اور جو کتاب وسنت کا فیصلہ ہے اس پر راضی ہوجائے، اور اپنی رائے کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات کے سامنے موقوف کردے۔

بہت سے لوگ جن میں رؤساء، امراء، عوام وخواص سب ہی شامل ہیں، اپنی رائے پر ضد کرتے ہیں، اور بہت سے وہ لوگ جن کا کوئی دنیاوی نفع قرآن وحدیث کے فیصلے پر چلنے کی وجہ سے مارا جاتا ہے، وہ بھی بس اپنے ہی دعوے کو دیکھتے ہیں۔ مؤمن بندہ کا یہ طریقہ نہیں، بلکہ مؤمن بندہ کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے پر راضی رہے، اور صدقِ دل سے اسے تسلیم کرے، ﴿وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ [النساء: ٦٥] (اور مکمل طور پر سر تسلیم خم کردیں)۔

آج یہ صورت حال مسلمانوں کے تقریباً تمام ہی طبقات میں ہے، کہ جو حکم اپنے فائدہ کے مطابق ہو اُسے تو ماننے کے لئے بصدرغبت تیار ہوتے ہیں، اور جو حکم طبیعت کے خلاف ہو، اور اپنے مفاد کے بھی خلاف ہو، دنیوی رواج کے خلاف ہو، اُسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ حاکم، محکوم، سرمایہ دار، کارخانہ دار، مستاجر، اجیر، کسان اور مزدور سب ہی اختلافات کے مواقع میں اپنے ذاتی منافع کو، اور اپنی اپنی رایوں کو، اور قبیلوں کے رواج کو، اور سرداروں، نوابوں کے فیصلوں کو دیکھتے ہیں۔ قرآن حکیم کی طرف دیکھنے کو تیار نہیں ہوتے۔ پس جو شخص ان تمام حقائق کو قرآنی فیصلوں پر قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا وہ کہاں کا مسلمان ہوگا؟ مسلمان تو وہ ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات وفرمودات پر بلا تأمل قربان کردے۔

﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ (یہ بہتر ہے، اور انجام کے اعتبار سے بہت خوب ہے)۔ اس میں تنبیہ فرمائی کہ اپنی اپنی رائے پر چلنے میں خیر نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ میری رائے یا میری جماعت کی رائے بہتر ہے، جیسے اہلِ بدعت کا خیال اور عقیدہ ہے، کہ ہماری رائے اور ہماری جماعت کی رائے درست ہے، اور یہ سراسر ان کی جہالت

ہے، کیونکہ بہتر وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا، دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا انجام ہی بہتر ہوگا، اور خیر و بہتری اتباع کتاب اللہ و اتباع سنت رسول اللہ ﷺ میں ہے، نہ اور کسی چیز میں۔

اطاعت کے تین درجات:

آیت کریمہ میں اطاعت کے تین درجات بیان کئے گئے ہیں:

پہلا درجہ اطاعتِ الٰہی کا ہے، یہ اطاعت مُطْلَقَه وَبِالذَّات ہے، یعنی بغیر کسی استثناء کے ہر حالت میں مطلقاً سارے انسانوں پر اللہ تعالیٰ خالق و مالک مختارِ کل کے احکام کو ماننا، اور بلا چوں و چرا اطاعت کرنا فرض ہے، اور سرتابی و نافرمانی جرم ہے، اور موجبِ عذاب ہے، اور انکار کرنا کفر ہے۔

دوسرے درجہ میں اطاعتِ رسول ہے، یہ بھی مطلق ہے، مگر بالذات نہیں، کیونکہ رسول ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی وجہ سے فرض ہے، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و مرضیات تک پہنچنے کے لئے قطعی اور یقینی واسطہ رسول ﷺ کی ذات گرامی ہے، ارشاد ہے: ﴿مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء: ۸۰] (جس نے رسول (ﷺ) کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی) کیونکہ رسول اللہ ﷺ صرف اللہ تعالیٰ کے حکموں کا نفاذ کرتے ہیں، اپنی طرف سے کوئی حکم نافذ نہیں کرتے۔ ﴿وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ○ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی﴾ [النجم: ۴] یعنی کوئی کام تو کیا، ایک حرف بھی اپنی زبان مبارک سے نہیں نکالتے جو خواہش نفس پر مبنی ہو، وہ جو کچھ کہتے ہیں اور بتاتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی وحی ہوتا ہے، کیونکہ وہ امین ہیں۔

تیسری اطاعت صاحب امر کی ہے۔ اس سے حکماء، یعنی حکام، علماء فقہاء اور ہر قسم کے ذمہ دار لوگ مراد ہیں۔ ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے، جب یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و احکام پر کاربند رہیں گے، اس وقت ان کی اطاعت لازم ہے، ان کی ہر جائز بات اور ہر جائز حکم کو ماننا ضروری ہے۔

اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی اطاعت نہیں کریں گے، یا اطاعت کے ساتھ غیر شرعی اور احکامِ الٰہی کے خلاف کوئی حکم جاری کریں گے، تو ان کی اطاعت واجب نہیں رہے گی، بلکہ ان کی مخالفت فرض ہوگی، جیسے ارشاد ہے: فَلَاسَمۡعَ وَلَاطَاعَةَ لِمَخۡلُوۡقٍ فِیۡ مَعۡصِیَةِ الۡخَالِقِ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الۡمَعۡرُوۡفِ۔ [مشکوۃ] اگر وہ نافرمانی یا کسی ناجائز کام کا حکم دیں، تو ان کی بات سننا اور اس پر عمل کرنا دونوں ضروری نہیں ہیں، بلکہ ناجائز ہیں، کیونکہ

اطاعت صرف نیکی میں ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں مخلوق کی اطاعت ناجائز ہے۔ اسی بنیاد پر فقہاء کرام نے کہا کہ اگر والدین اپنی اولاد کو بے نمازی اور ترک فرائض کا امر کریں، تو ان کی اطاعت ضروری نہیں ہے، بلکہ مخالفت ضروری ہے۔

فائدہ:

حکم و اطاعت کی بَادِیُ النَّظر میں تین صورتیں ہیں: ایک وہ امور جن کا نص قرآن مجید سے حکم قطعی ثابت ہو۔ دوم وہ امور جو حدیث شریف اور سیرتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہوں۔ سوم وہ امور و مسائل جنہیں ائمہ کرام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اجتہاد سے استنباط کیا ہو۔ پس ان تینوں صورتوں میں اتباع و اطاعت ضروری ہے۔

البتہ اگر کسی حاکم یا ملک کے سربراہ یا کسی تنظیم کے سربراہ نے نظام چلانے، اور اپنی صوابدید پر کچھ انتظامی قوانین وضع کرے، جو امورِ اختیاری ہوں، یا غیر اختیاری، جیسے مختلف مسلمان ملکوں میں مختلف انتظامی قوانین نظام چلانے کے لئے ہوتے ہیں، جن پر پوری آبادی کو عمل کرنے کا یکساں حکم ہوتا ہے، اور نظامِ مملکت صحیح اور درست چلتا ہے، تو ایسے امور کی پابندی اولوالامر کی اطاعت کا حصہ ہوتی ہے، چاہئے کہ ملک کے سارے باشندے اس نظام پر چل کر اس پر عمل کریں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ
يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا
بَعِيْدًا ۝٦٠ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ
عَنْكَ صُدُوْدًا ۝٦١ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَاۗءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ڰ
بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝٦٢ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۤ فَاَعْرِضْ
عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ۝٦٣

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف نازل فرمایا، اور اس پر بھی ایمان لائے جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ شیطان کی

طرف اپنا قضیہ لے جائیں، حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس کے منکر ہوں، اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو گمراہ کر کے دور کی گمراہی میں ڈال دے ۶۰ اور جب ان سے کہا گیا کہ آجاؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، اور آجاؤ رسول کی طرف، تو آپ منافقین کو دیکھیں گے کہ وہ آپ سے ہٹتے ہیں ۶۱ پس کیا حال ہوگا جب ان کو کوئی معیبت پہنچے ان کے ہاتھوں کے کئے ہوئے کرتوتوں کی وجہ سے؟ پھر وہ آئے آپ کے پاس، اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی کی صورت نکل آئے، اور آپس میں موافقت ہوجائے ۶۲ یہ وہ لوگ ہیں جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے، سو آپ ان سے اعراض کیجئے، اور ان کو نصیحت فرمایئے، اور ان کی ذاتوں کے متعلق ان سے ایسی باتیں کہہ دیجئے جو ان کے حق میں خوب زیادہ فائدہ مند ہوں ۶۳

معارف ومنازل

پہلے اس کا بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں کے مطابق فیصلہ کیا کرو، اس آیت کریمہ اور آئندہ آیات میں ایسے لوگوں کی مذمت ہے کہ کتاب وسنت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے، یا کتاب وسنت کے فیصلوں کو قبول نہیں کرتے۔ مفسرین کرام نے مختلف واقعات کو آیات کے نزول کا سبب قرار دیا ہے، اور یہ ہوسکتا ہے کہ یہ تمام واقعات آیات کے نزول کا سبب ہوں، اس میں کوئی مناقشہ نہ ہوگا، اور یہ بات واضح ہو کہ نزولِ آیات کا سبب کوئی بھی ہو، مگر آیت کا حکم قیامت کے لئے عام ہی رہے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بشر نامی ایک منافق تھا، اس کے اور ایک یہودی کے درمیان جھگڑا تھا، فیصلہ کرانے کے لئے کہیں جانا تھا، یہودی نے کہا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلیں، لیکن بشر نے کہا کہ نہیں، کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں۔ یہودی نے کہا نہیں، میں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلوں گا، جب منافق نے یہ دیکھا کہ یہ اور کسی جگہ جانے کو تیار نہیں ہے، تو دونوں حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوگئے۔ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے حق میں فیصلہ دیا۔

جب باہر آئے تو بشر منافق نے یہودی سے کہا کہ آؤ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس چلیں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے یہودی نے پورا واقعہ سنایا، اور بتادیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا دیا ہے، اور اب یہ چاہتا ہے کہ آپ سے فیصلہ کرائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ذرا ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں، یہ کہہ کر وہ اندر گھر میں تشریف لے گئے، اور اندر سے تلوار لے کر نکلے، جس سے بشر منافق کو قتل کر دیا، اور فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ کے اور اللہ

کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر راضی نہ ہو، ہمارے نزدیک اس کا یہ فیصلہ ہے، اس پر آیت بالا نازل ہوئی، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر فرمایا کہ عمر (رضی اللہ عنہ) نے حق اور باطل کے درمیان فرق کر کے دکھا دیا، اسی وجہ سے ان کو فاروق کہا جانے لگا۔ [معالم وابن کثیر، مظهري، درمنثور، روح المعاني]

اسلامی قانون کو چھوڑ کر کسی غیر اسلامی قانون کو اپنانا نفاق ہے:

آیت مذکورہ میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم قرآن پر بھی ایمان لائے، اور اللہ تعالیٰ کی کتب سابقہ پر بھی ایمان لائے دعویٰ تو ان کا یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں، لیکن جب کوئی قضیہ درپیش ہو جائے، اور فیصلہ کرانا پڑے، تو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق فیصلہ کرانے پر راضی نہیں ہوتے، بلکہ مقدمہ ایسے لوگوں کے پاس لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جن سے امید ہو کہ غیر اسلامی قانون کو سامنے رکھ کر، یا رشوت لے کر ان کی خواہش کے مطابق فیصلہ کر دیں۔

یوں تو بڑے زور شور سے اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن جب معاملات اور خصومات کا موقع سامنے آتا ہے تو طاغوت کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور اسی سے فیصلہ چاہتے ہیں۔

لفظ طاغوت پر عنقریب کلام ہو چکا، اور یہ شیطان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، یہاں یہ لفظ کعب بن اشرف یہودی کے لئے استعمال فرمایا ہے، جو یہودیوں کا سردار اور بہت بڑا فاجر یہودی شیطان تھا، جس نے ابوسفیان کی دلجوئی کی خاطر بتوں کا سجدہ کیا تھا، جیسے پہلے گزرا۔ ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ کسی بھی شیطان کی بات نہ مانی جائے، اور غیر اسلامی قانون سے پرہیز کیا جائے، جس کو ﴿وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ﴾ میں بیان فرمایا، لیکن دنیا کے غلام اور مادی منافع کے طالب اسلام کے مدعی ہونے کے باوجود ان لوگوں سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں جو اسلامی قوانین کے خلاف ان کے حق میں فیصلہ کر لیں۔ جب کوئی شخص یہ رائے اختیار کرے گا تو شیطان اس کو راہِ حق سے ہٹا دے گا، اور اسے حق سے بہت ہی دور پھینک دے گا، اور اسی کو فرمایا: ﴿وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾

بشر نامی منافق کا جو واقعہ پیش آیا، اس کو الفاظ کے عموم میں اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا﴾ کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس حکم کی طرف آؤ جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آؤ، تو منافقین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے سے بچتے ہیں، اور کتے ہیں۔ مسلمان ہونے کے دعوے

تو بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں، لیکن فیصلے کرانے کے لئے کسی دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حَکَم بنانے کی بجائے دوسروں سے فیصلہ چاہتے ہیں، اس طرح کے لوگ بشر کے علاوہ بہت بکثرت پائے جاتے ہیں۔

آج ہمارا معاشرہ ایسے نام نہاد مسلمانوں سے بھرا پڑا ہے، جو شرعی فیصلے کے لئے علماء کرام کے پاس آنے سے ہچکچاتے ہیں، اور اسلامی شریعت سے خوفزدہ ہیں، جیسے روبا (لومڑی) شیر سے ڈرتا ہو۔ اگر بالفرض کہیں شرعی فیصلہ کی نوبت آتی ہے، تو ملامت فریق کھلم کھلا شرعی فیصلہ کا انکار کرنے لگتا ہے، اور شرعی فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے آیت کریمہ میں عام الفاظ استعمال فرمائے، تاکہ سب کو تنبیہ ہو جائے کہ شرعی احکام اور شرعی فیصلوں سے انحراف کرنے والوں کا انجام بہت ہی برا ہوگا، اور ایسے لوگ کہیں غضبِ الٰہی کے حقدار ہوں گے، جس طرح زمانۂ رسالت کے منافقین تھے، تو چاہئے کہ مسلمان منافقین کے عمل و کردار سے مکمل پرہیز کریں، اور کتاب وسنت کے فیصلوں کو بخوشی تسلیم کریں۔

منافقِ مذکور کے قبیلہ والوں کی غلط بیانی اور غلط تاویلیں:

صاحب روح المعانی نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ جس منافق کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا، اس کے ورثاء خون کا بدلہ طلب کرنے کے لئے حاضر ہوگئے، اور جب ان کے سامنے یہ بات لائی گئی کہ تمہارے آدمی نے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فیصلہ سن کر دوبارہ فیصلہ کرنے کے لئے اپنے ساتھی یہودی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کیوں جانے پر مجبور کیا، اور حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیصلے کو کیوں تسلیم نہ کیا؟ جو سراسر کفر ہے، تو وہ اپنے آدمی کے اس عمل کی تاویلیں کرنے لگے، ان کی ان باتوں کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿فَكَيْفَ إِذَآ أَصَٰبَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ﴾ کہ ان لوگوں کا کیا حال ہوگا کہ جب ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی مصیبت پہنچ جائے، تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس (مدد طلب کرنے کے لئے) آئیں، اور قسمیں کھا کھا کر کہیں کہ بشر والے معاملے میں ہم لوگوں کا مقصد اچھی صورت نکالنا، اور باہمی رضامندی کے ذریعہ موافقت پیدا کرنا تھا، دل سے ہم کسی غیر کے فیصلے پر راضی نہ تھے، جو کچھ تھا اوپر اوپر تھا۔

اس آیت میں ان لوگوں کے لئے وعید ہے، اور یہ بتایا ہے کہ وہ عذر پیش کریں گے، لیکن یہ عذر انہیں فائدہ نہ دے گا، کیونکہ ان کا نفاق کھل کر سامنے آگیا، لہٰذا کوئی معذرت قابل قبول نہ ہوگی۔ ان منافقین کی جھوٹی معذرتوں اور جھوٹی قسموں کی قلعی کھول کر قرآن کریم نے سورۂ توبہ اور سورۂ منافقون میں تفصیل بیان کی، اور ان کی شرارتوں سے

عالم اسلام کو واضح طور پر آگاہ کیا، فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے قلوب کا حال معلوم ہے، وہ انہیں ضرور سزا دے گا، آپ ﷺ ان سے اعراض فرمائیں، زجر و توبیخ نہ کریں۔ البتہ ان کو نصیحت کرتے رہیں، جو ان کی ذاتوں کے بارے میں ہو، اور انتہائی وضاحت کے ساتھ ان سے ایسی باتیں فرمائیں جو راہِ حق پر لانے والی اور موثر ہوں۔

﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾ کا ایک مطلب تو مفسرین حضرات نے یہی بتایا ہے جو ابھی اوپر بیان ہوا کہ ان سے اعراض کریں، اور زجر و توبیخ سے کام نہ لیں۔ اور دوسرا مطلب یہ بتایا ہے کہ ان کا عذر قبول کرنے سے اعراض کریں، اور انہوں نے جو مقتول منافق کے خون کا مطالبہ کیا ہے اس طرف توجہ نہ فرمائیں، کیونکہ اس کے خون کی کوئی قیمت نہیں۔

﴿وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا﴾ کا دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ ان کو ان کی ذاتوں کے بارے تنہائی میں نصیحت فرمائیں، کیونکہ تنہائی کی نصیحت قریب تر اور مفید ہوتی ہے۔ [ابن کثیر، روح المعانی]

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾

ترجمہ: اور ہم نے پیغمبر نہیں بھیجے مگر اسی لئے کہ بحکمِ خداوندی ان کی فرمانبرداری کی جائے، اور جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا آپ کے پاس آتے، پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگتے، اور رسول ان کے لئے استغفار کرتا، تو ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا، مہربانی فرمانے والا پالیتے ﴿۶۴﴾

معارف ومنازل

جو لوگ آپ ﷺ کی موجودگی میں آپ ﷺ کو چھوڑ کر طاغوت کی طرف مائل ہوئے، اور پھر آپ ﷺ کی زبانِ حق بیان سے صحیح فیصلہ سن کر راضی نہیں ہوئے، منافق نے دوبارہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس فیصلہ کرانے کا اس لئے انتخاب کیا کہ یہ ﴿اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ﴾ [الفتح: ۲۹] (کفار پر سخت ہیں) کی صفت سے موصوف ہیں، شاید میرے حق میں، اور یہودی کافر کے خلاف فیصلہ صادر کرلیں، جو کہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوا،

اور ابدی جہنمی ہوا۔

پھر اس کے ورثاء نے یہ تاویل پیش کی کہ ہمارے آدمی کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ رسالت کا فیصلہ صحیح نہیں، بلکہ وہ صرف اس لئے عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تھے کہ شاید کوئی راضی نامہ کی صورت پیدا ہو، اور ہمیشہ کے لئے یہودیوں کے ساتھ چپقلش ختم ہو۔ آیت کریمہ میں ان کی سرزنش اور توبیخ ہے، کہ تمہارے لئے بہتر یہ تھا کہ فیصلہ بسر و چشم قبول کرتے، اپنے گناہ کا اعتراف کرتے، اور خدمت اقدس میں حاضر ہوتے، معافی مانگتے، انہیں بھی اپنے حق میں استغفار کا موقع دیدیتے، اس طرح سارا مسئلہ حل ہو جاتا۔ اب تفصیل سنیئے:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾ (الآیة) کہ ہم نے جو بھی رسول بھیجا اسی لئے بھیجا کہ بحکم خداوندی اس کی اطاعت کی جائے۔ رسول کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں تک اس کا پیغام پہنچائے، اور رسول کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اور رسول کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، جن لوگوں نے طاغوت کے پاس مقدمہ لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا، اور پھر جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمادیا اس سے وہ راضی نہ ہوئے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جانے پر ضد کی، تو اس میں سراسر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی ہے۔

نافرمانی کے باعث بشر منافق تو مقتول ہوا، لیکن اس کے ورثاء نے جو اس کے عمل کی تاویل کی، اور اسے بیگناہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی، اور عملِ شر کو عملِ خیر بنانے کی سعی کی، تو ان لوگوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، ان کو چاہئے تھا کہ خدمت گرامی میں حاضری دے کر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے مغفرت کی دعا فرماتے، تو اس طرح ان کی مغفرت اور بخشش کی صورت بن جاتی۔

صحیح توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ مغفرت کا فیصلہ فرمادیتا ہے، خواہ تنہائی میں توبہ کی جائے، یا مجمع میں، پیغمبر کی موجودگی میں، یا غیر موجودگی میں، لیکن خاص طور سے ان لوگوں کے لئے یہ فرمانا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوتے، اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے لئے استغفار کرتے، تو اللہ تعالیٰ کو ﴿تَوَّابًا رَّحِيۡمًا﴾ پالیتے، اس سے جو خدمتِ عالیہ میں حاضر ہونے کی شرط مفہوم ہو رہی ہے، اس کے لئے مفسرین کرام نے فرمایا کہ چونکہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت پر حملہ کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو نظر انداز کرنے کا تاویلوں کے ذریعہ جواز نکالا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے احترامی کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھ پہنچایا، اس لئے ان کے جرم کی توبہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے کی شرط لگائی گئی، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر

توبہ کا اعلان کریں۔

اور توبہ کا عام اصول ہے کہ توبہ اس طرح ہو کہ پوشیدہ گناہ کی توبہ پوشیدہ طریقے پر، اور اعلانیہ گناہ کی توبہ اعلانیہ طور پر ہو، جب ان کی سرکشی مشہور و معروف عام ہوئی، اس لئے خدمتِ عالیہ میں حاضری اور مجمع عام میں توبہ کی شرط لگائی گئی۔ ابھی بھی یہی اصول ہے کہ اگر کسی نے کسی مجمع عام میں کسی کی بے احترامی اور توہین کی ہو، تو اس کو چاہئے کہ مجمع عام میں معافی مانگے، تنہائی میں معافی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم

خدمتِ گرامی میں حاضری دینا اور معافی مانگنا اب بھی معمول ہے:

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں طلبِ مغفرت کی درخواست بظاہر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ساتھ ہی مختص معلوم ہوتی ہے، کہ جو کوئی غلطی کا مرتکب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو گیا، خود بھی استغفار کی، اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی معافی کی درخواست کی، تو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔

حضرت علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق عالمِ برزخ میں بھی قائم ہے، عرضِ اعمال، یعنی صبح و شام امت کے اعمال بحیثیت مجموعی، اور خواص کے اعمال بحیثیتِ خصوصی فرشتوں کے ذریعہ برزخ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ چیز صحیح حدیث کی رُو سے ثابت ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ امت کے اعمال مَلَاءِ اَعْلٰی میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوتے رہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق ملاءِ اعلیٰ کے ممبران میں تین گروہ ہیں: پہلا گروہ ملائکہ مقربین، اور دیگر بلند پایہ فرشتوں پر مشتمل ہے، جس میں حاملین عرش فرشتے بھی ہیں۔ دوسرا گروہ دوسرے نمبر کے فرشتوں کا ہے۔ اور تیسرا گروہ بنی نوعِ انسان میں اَفاضل الآدمیّین کا ہے، یعنی وہ کامل الایمان لوگ جو اپنی زندگیاں دین کی خاطر وقف کر دیتے ہیں، اور بنی نوع انسان کی اصلاح کا فریضہ انجام دیتے ہیں، اس گروہ میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے دیگر نیک بندے شامل ہوتے ہیں۔

اور ان ممبران ملاء اعلیٰ کا کام کیا ہے؟ ان کی پہلی مصروفیت یہ ہے کہ ان کی نگاہ ہر وقت ربّ العزّت سبحانہ کی تجلّی اعظم پر مرکوز رہتی ہے، اور ان کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے لئے بخشش کی دعائیں مانگتے ہیں۔

حاملینِ عرش کے متعلق تو خود قرآن کریم میں موجود ہے کہ وہ ایمان والوں کے لئے بخشش کی دعائیں مانگتے ہیں، ارشاد ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾[الغافر:۷] (وہ فرشتے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، اور جو اس کے گرد موجود ہیں، وہ سب اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو لوگ ایمان لے آئیں ہیں ان کے لئے مغفرت کی دعا کرتے ہیں)۔

تو مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد بھی امت کے اعمال ملاء اعلیٰ میں ان کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں، اور وہ امت کے لئے بخشش کی دعا بھی کرتے ہیں، کیونکہ اس گروہ میں شامل ہونے والوں کی ایک مصروفیت طلبِ بخشش بھی ہے۔ اور علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے الفاظ سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استشفاع تو واضح ہے، جب کوئی شخص غلطی کرتا، پھر اسے ندامت ہوتی، تو وہ حضور ختمی رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ سے اپنی گناہ کی معافی طلب کرتا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی بخشش طلب کرنے کی درخواست کرتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے لئے معافی مانگتے، تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا۔

اس قسم کے واقعات بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق احادیث میں آتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ، اور دیگر بہت سے واقعات اس پر شاہد ہیں۔

آیت کریمہ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد بھی کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر اپنی غلطی کی اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھی طلبِ معافی کی درخواست کرے، تو ایسا کرنا جائز ہے۔ حضرت علامہ رشید احمد گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استشفاع کی دعا کرنا جائز ہے، صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کے بعد بندہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کرے کہ یارسول اللہ! آپ میرے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سفارش کریں کہ اللہ تعالیٰ شانہ میری مغفرت فرمائے، مجھے اسلام پر استقامت اور خاتمہ مع الایمان نصیب کرے، روزِ قیامت مجھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے نیکوں کے ساتھ شامل فرمائے، وغیرہ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ نَائِیًا اُبْلِغْتُهٗ

وَمَنْ صَلّٰى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِيْ سَمِعْتُهُ [مشكوة، بيهقي] جو دور سے مجھ پر درود پڑھتا ہے وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے، اور جو کوئی میری قبر پر آکر درود پڑھے، تو میں اس کو سنتا ہوں۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عام مُردوں کے سننے کے متعلق علماء کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے، بعض سماع کے حق میں ہیں، اور بعض عدم سماع کے۔ مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور سے لے کر آج تک یہ اختلاف ختم نہ ہوسکا، لہٰذا اس مسئلہ میں زیادہ سختی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے، تاہم انبیاء علیہم السلام کی سماعت کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں۔ وَهُمْ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ۔ وہ حضرات برزخی زندگی کے ساتھ حیاتِ رکھتے ہیں، ان کی برزخی زندگی شہداء کی زندگی سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے۔

اگر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر شریف پر جا کر صلوٰۃ وسلام عرض کیا جائے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنفس نفیس اسے سماعت فرماتے ہیں۔ علماء دیوبند کے مسلک کے مطابق بھی یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔ صاحب معارف القرآن نے بحر المحیط کے حوالہ سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب ہم سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دفن کر کے فارغ ہوئے، تو اس کے تین روز بعد ایک گاؤں والا (اعرابی) آیا، اور قبر شریف کے پاس آکر گر گیا، اور زار و قطار روتے ہوئے آیتِ مذکورہ کا حوالہ دے کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ اگر گنہگار رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائے، اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے لئے دعائے مغفرت کر دیں، تو اس کی مغفرت ہو جائے گی، اس لئے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے لئے مغفرت کی دعا کریں۔ اس وقت جو لوگ حاضر تھے، ان کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں روضۂ اقدس کے اندر سے یہ جواب اور آواز آئی: قَدْ غُفِرَ لَكَ۔ تیری مغفرت کردی گئی۔ [معارف القرآن]

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ

لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾

ترجمہ: سو قسم ہے آپ کے ربّ کی! وہ مؤمن نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ جو ان کے آپس کے جھگڑے ہوں ان میں آپ کو فیصلہ کرنے والا بنا کر آپ کے فیصلے سے اپنے دلوں میں کسی بھی طرح کی تنگی محسوس نہ

کریں، اور پورا پورا تسلیم کرلیں ﴿۶۵﴾

معارف ومنازل

حضرت عُروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا ایک انصاری سے کاشت کے سیراب کرنے کے سلسلے میں جھگڑا ہوگیا، دونوں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، بارش کے پانی کا بھاؤ کچھ اس طرح تھا کہ پہاڑی پانی کے راستے میں پہلے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی زمین پڑتی تھی، اس کے بعد نشیبی میں اس منافق انصاری کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مصالحانہ انداز میں فرمایا: اے زبیر! تم اپنی کھیتی کو سیراب کرلو، پھر اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑ دو۔ اس انصاری نے کہا: یا رسول اللہ! یہ زبیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پھوپھی (حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا) کا بیٹا ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کے حق میں فیصلہ دیا، اور اس کو ترجیح دیدی۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ناراض ہوئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا چہرۂ مبارک متغیر ہوا، اور فرمایا: اے زبیر! تم اپنی زمین کو سیراب کرلو، اور پانی کو یہاں تک روک لو کہ تمہاری کیاریوں (مینڈھے لٹھ بند) کے اوپر تک آجائے، پھر اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑ دو۔ (بنیادی فیصلہ یہی ہے)۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انصاری کے غلط رویہ کی وجہ سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کا پورا پورا حق دلا دیا، حالانکہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایسا مصالحانہ فیصلہ کیا تھا جس میں انصاری کے لئے رعایت کا پہلو رکھا تھا، مگر اس ناداں نے اسے قبول کرنے کے بجائے مسترد کردیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جانبداری کا الزام لگا کر اپنے چھپے ہوئے نفاق کا اظہار کیا۔

جس ہستی کی قدر ومنزلت پوری کائنات سے اونچی و بلند ہو، اس پر الزام عائد کرنا بدترین کفر اور نفاق ہے۔ آیت کریمہ نے تو اسی بات پر اتنی تاکید کے ساتھ وضاحت فرمائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیصلے کو دل وجان سے قبول کرنہ کرنے والا خدا کی قسم ہرگز مؤمن نہیں ہوسکتا۔ اسلام کوئی ظاہری دعویٰ کا نام نہیں ہے، بلکہ باطنی انقیاد وتسلیم اور رضا بحکم اللہ والرسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کا نام ہے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ آیت کریمہ میرے ہی بارے میں نازل ہوئی۔

مطلب یہ ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیصلے پر جب فریقِ مقابل راضی نہیں ہوا، بلکہ اعتراض بھی کیا، تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنی زمین سیراب کرنے کا حق پہلے اس لئے دیا کہ ان کی زمین پہاڑی

سیلاب کے پانی کے راستے میں پہلے پڑتی تھی، اور پہاڑ کے متصل بالائی حصے میں ان کی زمین تھی، اور انصاری کی زمین اس سے نشیبی علاقے میں تھی۔ پہلے فیصلے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلے تمہارا حق ہے، پھر انصاری کا، دوسرے فیصلے میں اس کو پورا حق دلوایا، کہ کیاریوں کے اوپر تک پانی روکنا، پھر نیچے والے کے لئے پانی چھوڑ دینا۔ پہلا حکم استحبابی تھا، دوسرا حکم استحقاقی رہا۔ [صحاح ستہ سب کے حوالے سے]۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر اس آیت کا نزول بشر منافق، اور ایک یہودی کے حق میں ہوا تھا، جو سرور عالم ﷺ سے فیصلہ کرانے اور یہودی کو ڈگری ملنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منافق بشر کو قتل کیا تھا۔ پورا قصہ پہلے بیان ہوا۔ کلام کی رفتار کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان ہی دونوں کے متعلق آیت کا نزول مانا جائے۔ [مظهري]

خلاصہ: آیتِ بالا میں مستقل یہ قانون بتا دیا کہ سرور عالم ﷺ کے تمام فیصلوں پر (پورے ذخیرۂ حدیث کے فیصلوں پر پوری شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلوں پر) دل وجان سے بطیبِ خاطر بلا تأمل راضی ہونا ہی اسلام اور ایمان کا تقاضا ہے۔ جب آنحضرت سرور عالم ﷺ کا کوئی فیصلہ، یا ارشار گرامی سامنے آجائے، تو اس کے خلاف اپنے نفس میں ذرا بھی کچھ تنگی محسوس نہ کرے۔

سببِ نزول خواہ وہی ہو جو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا، یا وہی ہو جسے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ و حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا، لیکن آیت کریمہ کے عموم نے صاف اور واضح طور پر بتادیا کہ جب کبھی بھی کوئی واقعہ پیش آجائے، جہاں ایک شخص دوسرے پر دعویٰ کرتا ہو، اور ان کے جھگڑے مٹانے اور ختم کرنے کے لئے سرور عالم ﷺ کا کوئی فیصلہ یا حدیثی فرمان کتبِ حدیث میں موجود ہو، تو ہر فریق کو لازم ہے کہ اس پر دل وجان سے بغیر حیلہ وحجت کے راضی ہو، اور مکمل تسلیم کر کے ایمانی تقاضوں پر قائم ہو، خواہ اس میں اس کا حد سے زیادہ نقصان اور بدنامی کیوں نہ ہو۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلوں اور احکامات پر راضی نہیں ہوتے، یا انہیں کسی بدنامی یا ملی وقومی خاندانی نقصان کی وجہ سے تسلیم نہیں کرتے، ایسے لوگوں کو اپنے ایمان کے بارے میں خوب غور وفکر کرنا ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر واضح کیا کہ ایسے لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے۔ پس فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہوگا، نہ کسی اور مدعی اسلام کا، جسے اللہ تعالیٰ مؤمن قرار دیدے وہ مؤمن رہے گا، اور جسے اللہ تعالیٰ مؤمن قرار نہ دے وہ کیسے

مؤمن رہے گا؟ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔

حکایت:

تین براعظموں پر پھیلی ہوئی خلافت عثمانیہ ترکیہ کا بادشاہ سلطان مراد خان ابن سلطان احمد خان (موجودہ تعمیر کعبہ شریف اسی سلطان کے ہاتھ کی ہے) سلطان نے ایک خجندی انجینئر کے ہاتھ سے پرشکوہ مسجد بنانا چاہی، انجینئر نے چھ سال کے عرصہ میں مسجد تیار کی، جس پر بہت بڑا خرچہ آیا۔ مسجد کی تکمیل کے بعد سلطان ناراض ہوئے، اسے تعمیری نقشہ پسند نہیں آیا۔ اتنے بڑے اخراجات کے باوجود مسجد پررونق اور دلکش نہیں ہے، حکم دیا کہ خجندی انجینئر کو حاضرِ دربار کیا جائے، چنانچہ وہ حاضر ہوئے، سلطان نے غیظ وغضب کے عالم میں مست اس خجندی کے دائیں ہاتھ کو کاٹ کر اسے ہمیشہ کے لئے معذور کردیا۔

خجندی وہاں سے چل کر شیخ الاسلام قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کی عدالت میں پہنچے، کٹا ہوا ہاتھ ساتھ لایا۔ قاضی نے سلطان کے نام فرمان روانہ کیا، اور انہیں عدالت میں حاضری کا حکم بھیجا، بادشاہ حاضر ہوئے اور اپنے جرم وقصور کا اعتراف کرکے مان لیا، قاضی نے مدعی سے کہا کہ کیا تم معاف کرسکتے ہو یا کسی دیت پر راضی ہوسکتے ہو؟ تین مرتبہ پوچھا، ہر بار مدعی نے نفی میں جواب دیا، پھر قاضی نے ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ [البقرة:۱۷۹] (اورتمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے) اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ﴾ [النحل:۹۰] (اللہ حکم دیتا ہے کہ انصاف اورنیکی کرنے کی) اسی طرح ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ والی آیات تلاوت کی، اور ترکی زبان میں بادشاہ کو سمجھایا، اور حکم صادر فرمایا کہ میرے سامنے والی میز پر سلطان سے قصاص لیا جائے، اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، یہ میرا حکم نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے، اسے جو مسترد کرے گا اور نہیں مانے گا، یا بادشاہ ہوکر کسی عام مسلمان سے اپنے کو بہتر سمجھے گا، یا یہ کہے گا کہ بادشاہ ایسی چیزوں سے مستثنیٰ ہے، تو اس کا ایمان نہیں رہے گا۔

یہ خطبہ سنتے ہی سلطان آگے بڑھے، اور آستین سے ہاتھ نکال کر قاضی کے سامنے والی میز پر ہاتھ رکھ دیا، اور کلمہ پڑھا، اس آخری مرحلے میں سارے موجود لوگ جو کہ ہزاروں کی تعداد میں تھے چیخ چیخ کر رونے لگے، جبکہ سلطان نے انہیں تسلی دی، اور کہنے لگے: پریشان نہ ہونا، بلکہ خوش رہو کہ میں یہ سب کچھ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم پر تسلیم کررہا ہوں، بیچارے خجندی نے فوراً معافی کا اعلان کرکے بادشاہ کا ہاتھ بچالیا، جو ایک دومنٹ کے بعد کٹنے

والا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اس واقعہ کو نظم بنا کر پیش کیا: ؎

بود معمارے زاقلیم خجند ☆ درفن تعمیر نام او بلند
ساخت آن صنعت گرفرہاد زار ☆ مسجد از حکم سلطان مراد
خوش نیامد شاہ را تعمیر او ☆ خشمگین گردید از تقصیر او
آتش سوزندہ از خشمش چکید ☆ دست آن بیچارہ از خنجر برید
جوئے خون از ساعد معمار رفت ☆ پیش قاضی ناتوان زار رفت
آن ہنر مندے کہ دستش سنگ سفت ☆ داستان جور سلطان باز گفت
گفت اے پیغام حق گفتار تو ☆ حفظ آئین محمد کار تو
سفتہ گوش سطوت شاہاں نیم ☆ قطع کن از روئے قرآن دعویم
قاضی عادل بدندان خستہ لب ☆ کرد شاہ را در حضور خود طلب
رنگ شہ از ہیبت قرآن پرید ☆ پیش قاضی چوں خطا کاراں رسید
از خجالت دید بر پا دوختہ ☆ عارض اولالہ ہا اندوختہ
یک طرف فریادئی دعویٰ گرے ☆ یک طرف شاہنشہ گردون فرے
گفت شہ از کردہ خجلت بردہ ام ☆ اعتراف از جرم خود آوردہ ام
گفت قاضی فی القصاص آمد حیوٰۃ ☆ زندگی گیرد باین قانون ثبات
عبد مسلم کمتر از احرار نیست ☆ خون شہ رنگین تر از معمار نیست
چون مراد این آیۂ محکم شنید ☆ دست خویش از آستین بیرون کشید
مدعی را تاب خاموشی نماند ☆ آیۂ بالعدل والاحسان بخواند
گفت از بہر خدا بخشیدمش ☆ از برائے مصطفیٰ بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر ☆ سطوت آئین پیغمبر نگر
پیش قرآن بندۂ و مولا یکے است ☆ بوریا و مسند دیبا یکے ست

جب قرآن وسنت پر ہمارے قاضیوں اور بادشاہوں کا مکمل ایمان تھا، تو عدل وانصاف اور دیانت وتقویٰ کا

عروج رہا۔ آج ہمارے ہاں پورے معاشرے میں صرف اسلام کا نام ہی ہے، اور کتاب اللہ کا رسم الخط ہے، جس پر ہم ناز اور فخر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پورے معاشرے پر مغرب کا تسلط ہے، اور ہر بڑے چور کو استثناء حاصل ہے، شاید ہم ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ کے مصداق اگر نہیں ہوں گے تو کیا ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾

ترجمہ: اور اگر ہم ان پر یہ فرض کر دیتے کہ اپنی جانوں کو قتل کرو، یا یہ کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ، تو اس پر عمل نہ کرتے مگر تھوڑے سے لوگ، اور اگر وہ لوگ ان کاموں کو کرتے جن کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے، تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا، اور یہ ان کے ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا عمل ہوتا ﴿۶۶﴾ اور اس وقت ان کو ہم اپنے پاس سے ضرور اجر عظیم عطا کرتے ﴿۶۷﴾ اور ہم ان کو سیدھے راستے پر چلاتے ﴿۶۸﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جن باتوں کا ان کو حکم دیا جا رہا ہے، اور جن باتوں کی ان کو نصیحت کی جاری ہے، وہ تو آسان اور سہل باتیں ہیں، اور یہ لوگ ان آسان باتوں پر عمل کرنے پر جان چھڑا رہے ہیں، اگر فرض کرو ہم اگر لوگوں پر خودکشی فرض کر دیتے، جیسے بنی اسرائیل پر فرض ہوئی، یا ترکِ وطن کو فرض کر دیتے، اور احکامِ مقصودہ کی طرح یہ چیزیں لوگوں پر فرض ہو جاتیں، تو سوائے ان چند لوگوں کے جن کے ایمان کامل ہوتے، اور کوئی بھی اس حکم اور اس فریضہ کو ان میں سے پورا نہ کرتا۔

لیکن اب جن آسان اور سہل باتوں کو ان پر لازم کیا گیا ہے، اور جن باتوں کی ان کو نصیحت کی گئی ہے، اگر ان کو بجا لائیں، اور ان کی پوری پوری تعمیل کریں، تو ان کے حق میں ثواب کے اعتبار سے بہتر ہوگا، یعنی زیادہ اطاعت کرنے میں زیادہ ثواب ملے گا، اور نیز تکمیلِ دین اور کمالِ ایمان کے لئے ان احکام کی بجا آوری مضبوطی اور تثبیت کا سبب ہوگا، کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ دین کی خدمت کرنے سے انسان کا عقیدہ پختہ ہو جاتا ہے، اور باطن کی اصلاح

ہوتی ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم نے فرمایا: اگر ایسا حکم ہوتا تو خدا کی قسم ہم فوراً اس حکم کی تعمیل کرتے، مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمیں ایسا حکم نہیں دیا گیا، اور ہمیں محفوظ رکھا گیا۔ سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جب اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ قول سنا تو ارشاد فرمایا کہ میری امت میں ایسے لوگ ہیں جن کے ایمان ان کے دلوں میں پہاڑوں سے بھی زیادہ جمے ہوئے ہیں۔

اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ جہاد اور ہجرت تو اب بھی اسلام میں ہیں، اور جہاد کے اندر قتل اور ہجرت میں ترک وطن ہوتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ چیزیں مقصود نہیں ہیں، بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ کے سلسلہ میں کبھی کبھی پیش آجاتی ہیں، اصل مقصد تو اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ اگر اعلاء کلمۃ اللہ بدونِ جہاد اور بدونِ ہجرت کے حاصل ہوجائے، تو نہ جہاد کی ضرورت ہے، نہ ہجرت کی۔

اور قَلِیۡل کے لفظ سے تمام کامل مؤمن مراد ہیں۔ خواہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہوں، یا غیر صحابہ، کیونکہ فاسق وفاجر اور کافر کے مقابلے میں کامل مؤمن قلیل ہی ہوتے ہیں۔ اب آگے کثرتِ ثواب اور تثبیتِ ایمان جو کامل اطاعت و فرمانبرداری کا ثمرہ تھا، اس پر جو اثرات مرتب ہونے والے ہیں، ان کا اظہار فرماتے ہیں۔ کہ اگر یہ لوگ وہ کام کرتے جس کی ان کو نصیحت کی جاتی ہے، تو وہ دین ودنیا کے اعتبار سے ان کے حق میں نہایت بہتر ہوتا، اور ان کے دین و ایمان کی زیادہ مضبوطی اور ثابت قدمی کا باعث ہوتا، اور ان کے سارے شکوک وشبہات ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتے، کیونکہ احکامِ خداوندی پر عمل کرنے سے دین وایمان میں قوت واستقامت پیدا ہوجاتی ہے، اور ہر قسم کے تردّد واوہام نیست ونابود ہوکر ثبات واستحکام پیدا ہوجاتا ہے۔

جبکہ بے عمل انسان میں نفس وشیطان کے تسلط کی وجہ سے استحکام باقی نہیں رہتا، اور نفاق وبزدلی اور کمزوری کا غلبہ ہوجاتا ہے، تو فرمایا: اگر وہ ایسا کریں تو ہم اپنے پاس سے انہیں اجر عظیم اخروی عطا کریں گے، اور صراط مستقیم پر چلائیں گے، جس کا ثمرہ اخروی سرخروئی اور کامیابی ہی ہوگا، اور یہی استقامت وصراط مستقیم انبیاء علیہم السلام و صدیقین شہداء اور صالحین کی رفاقت پر منتج ہوگا، جس کا بیان اگلی آیتوں میں وضاحت کے ساتھ آنے والی ہے۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا۔ آمین

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ

الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول کی فرمانبرداری کریں سو یہ ان اشخاص کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء اور صدیقین شہداء اور صالحین، اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں ﴿۶۹﴾ یہ فضل ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اور اللہ تعالیٰ کافی ہے جاننے والا ﴿۷۰﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرنے والوں کے لئے بشارتِ عظیمہ جلیلہ:

اوپر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کا ذکر ہے، یہاں بطور قاعدہ کلیہ فرمانبرداروں کا عظیم مرتبہ ذکر فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کا یہ عظیم المرتبت صلہ وانعام ہے کہ ایسے لوگوں کو آخرت میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور صدیقین، شہداء اور صالحین کرام چاروں کی رفاقت نصیب ہوگی۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے، ان کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ محبت تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے، ایک دن حاضر خدمت ہوئے تو ان کے چہرہ کا رنگ بدلا ہوا تھا، جس کی وجہ سے رنج والم اور غم کا اظہار ہو رہا تھا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تم کیوں پریشان ہو؟ عرض کیا: یارسول اللہ! نہ مجھے کوئی بیماری ہے، نہ کوئی تکلیف ہے، صرف اتنی بات ہے کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا ہر وقت شوق رہتا ہے، اور اس کے بغیر مجھے چین نہیں آتا، اور اپنے اندر بہت زیادہ وحشت محسوس کرتا رہتا ہوں، پھر مجھے آخرت یاد آگئی، اس پر یہ خیال آیا کہ میں وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکوں گا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اونچے نبیوں کے درجات میں ہوں گے، اور اگر میں جنت میں داخل ہوگیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجے سے نیچے کے درجے میں ہوں گا، اور اگر جنت میں مجھے داخلہ نہ ملا تو کبھی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکوں گا، اس غم میں مسلسل پریشان رہتا ہوں، اور بہت سخت غم میں مبتلا ہوں۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس بات پر خوشخبری اور عظیم بشارت کا نزول ہوا کہ قیامت کے دن

فرمانبرداروں کو ان مقدس چاروں ہستیوں کی معیت ورفاقت حاصل رہے گی، اور باوجود درجات کے مختلف ہونے کے رفاقت کی سعادت نصیب ہوتی رہے گی۔ [مظهري]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک شخص حاضر خدمت ہوا، اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایسے شخص کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ارشاد ہے جس نے کسی قوم سے محبت کی، اور علم وعمل کے اعتبار سے ان کے مقام کو نہ پہنچا؟ اس کے جواب میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلْمَرْأُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ یعنی انسان اس شخص کے ساتھ ہے (قیامت کے دن ان کے ساتھ ہوگا) جس سے محبت کرتا ہے۔ [بخاري]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! قیامت کب قائم ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھ پر افسوس ہے (قیامت کے بارے میں سوال کررہے ہو) یہ تو بتاؤ کہ تو نے قیامت کے دن کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے اس کے سوا کوئی تیاری نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں۔ فرمایا: تو اس کے ساتھ ہے جس سے تو نے محبت کی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نعمتِ اسلام کے بعد کسی اور چیز سے مسلمانوں کو اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اس بات سے خوشی ہوئی کہ جو شخص جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ ہوگا۔ [بخاري]

آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا: اَلْمَرْأُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ انسان اسی کے ساتھ ہے جس سے اس نے محبت کی۔ اس عموم میں دو باتیں داخل ہیں: اگر اچھے لوگوں سے محبت کی تو انہی کے ساتھ ہوگا، اگر بُرے لوگوں سے محبت کی تو انہی کے ساتھ ہوگا۔ نیز اس کا عموم دنیا وآخرت دونوں کو شامل ہے، دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بروں کے ساتھ برے لوگ ہوتے ہیں، اور اچھوں کے ساتھ اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ شاہین نے کبھی کبوتر کے ساتھ، اور کبوتر نے کبھی شاہین کے ساتھ نہ دوستی کی اور نہ ہی رفاقت کی۔

اسی طرح سے آخرت میں تقسیم ہوجائیں گے، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ [التكوير: ۷] (اور جب لوگوں کے جوڑے جوڑے بنادیئے جائیں گے)۔ قیامت کے دن ہر ایک اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے۔ اسی لئے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلْمَرْأُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُّخَالِلُ۔ [ترمذي، أبو داؤد] یعنی انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، سوتم میں سے ہر شخص غور کرے کہ وہ کس سے دوستی رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اچھوں کے ساتھ دوستی رکھو، بُروں کی دوستی اختیار نہ کرو۔

ہمچو بلبل دوستیٔ گل گزین ☆ تا شوی باخرمنِ گل ہمنشین
زاغ چون مردار راشد ہم نفس ☆ یار او مردار خواہد بود بس
زاغ چون فارغ زبوئے گل بود ☆ نفرتش از صحبت بلبل بود
نغمہ داری درگلوائے بے خبر ☆ قدر خود شناس بازاغان مپر
(اقبالؒ)

برے لوگوں کی رفاقت کی ایک بُری مثال:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کا تذکرہ فرمایا، اور ارشاد فرمایا: جس نے نماز کی پابندی کی وہ اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگی، اور اس کے ایمان کے لئے دلیل ہوگی، اور اس کی نجات کا سامان ہوگی، اور جس نے نماز کی پابندی نہ کی اس کے لئے نہ نور ہوگی، نہ دلیل ہوگی، نہ نجات کا سامان ہوگی، اور وہ قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔ [رواہ أحمد، والدارمي، والبيهقي في شعب الإيمان]

علماء حدیث نے حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ نماز کی پابندی نہ کرنے والے کئی قسم کے ہیں: کچھ لوگ مال کی وجہ سے نماز کی پابندی نہیں کرتے، یہ لوگ قارون کے ساتھی ہوں گے، اور کچھ لوگ حکومت کی وجہ سے نماز کی پابندی نہیں کرتے، یہ لوگ فرعون کے ساتھ ہوں گے، اور کچھ لوگ ملازمت کی وجہ سے نماز کی پابندی نہیں کرتے، یہ لوگ ہامان کے ساتھ ہوں گے، اور یہ شخص فرعون کا سینئر وزیر تھا، اور جو لوگ تجارت کی وجہ سے نماز کی پابندی نہیں کرتے وہ ابی بن خلف کے ساتھی ہوں گے، یہ ایک بہت بڑا مشرک تاجر تھا، جسے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ احد میں اپنے ہاتھ مبارک سے قتل کیا تھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح اچھے لوگ اچھے لوگوں کے ساتھ ہوں گے، اسی طرح بدعمل بُرے لوگ بُرے لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور صدیقین اور صالحین کی معیت و رفاقت کا جو آیت کریمہ میں ذکر ہے، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ درجات میں اختلاف نہ ہوگا، اور یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ صرف دخولِ جنت کے اشتراک کو معیت سے تعبیر فرمادیا ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نیچے کے درجات والے اوپر کے درجات والوں کو بُعدِ مسافت کے باوجود دیکھ بھی سکیں گے، اور زیارت بھی کرسکیں گے۔ اور یہ

بھی ہوسکتا ہے کہ نیچے درجے والوں کو زیارت کے لئے اور پر جانے کی اجازت دی جائے، اور بلند درجات والوں کو نیچے آنے کی اجازت دی جائے، تاکہ وہ اپنے بھائیوں کی زیارت کرلیں۔

جو بھی صورت ہو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے والوں کو مذکورہ بالا حضرات کی معیت نصیب ہوگی۔ ان حضرات سے جو قلبی محبت ہے وہ ان کی معیت کا ذریعہ بن جائے گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر دو بندوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے آپس میں محبت کی، اگر ان میں سے ایک شخص مشرق میں تھا، اور دوسرا مغرب میں تھا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان دونوں کو جمع فرمائیں گے، اور ارشاد ہوگا کہ یہ ہے وہ شخص جس سے تو میرے لئے محبت کرتا تھا۔ [مشکوۃ]

حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات گزارا کرتا تھا، (یہ بعض احوال اور بعض اوقات کا بیان ہے، اور رات کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوتے تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وضو کا پانی اور دوسری چیزیں حاضر کرتا تھا، ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوال کرلو، یعنی مانگو (جو تم چاہتے ہو) میں نے عرض کیا: میں جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے سوا اور کچھ چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میرا مقصود صرف یہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ایسی بات ہے تو اپنے نفس کے خلاف میری اس طرح مدد کرو کہ سجدے زیادہ کرتے رہو، (یعنی نفل نمازیں بہت زیادہ پڑھو)۔ [مسلم]

معلوم ہوا کہ بلند درجات والوں کی معیت حاصل ہونے کے لئے اعمالِ صالحہ بکثرت اختیار کرنا ہوں گے، اور نماز ایمان کے بعد سب سے بڑی ضروری چیز ہے، جتنی زیادہ نمازیں پڑھیں گے اتنے زیادہ سجدے ہوں گے، اور سجدوں کی یہ کثرت معیت کا ذریعہ بنے گی۔ آرزو کے ساتھ عمل بھی ہونا چاہئے۔ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں میری مدد کرو، اس میں اس طرح اشارہ ہے کہ نفس انسان کو آگے نہیں بڑھنے دیتا، اعمالِ صالحہ میں ہمت کرنی پڑتی ہے، اور نفس وشیطان کے خلاف مضبوط جہاد کرنا ضروری ہے۔

بعض عمالِ صالحہ ایسے مخصوص ہیں کہ ان اعمال پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء و صالحین کی معیت کا وعدہ فرمایا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سچا اور امانتدار تاجر انبیاء علیہم السلام، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ [الترمذي]

جنت میں درجات میں فرقِ مراتب بہت زیادہ ہوگا، لیکن اس کے باوجود باہمی ملاقات اور زیارتوں کے

مواقع عطا کئے جائیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ جنت میں سو درجے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے تیار فرمایا ہے جو اس کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان وزمین کے درمیان فاصلہ ہے، سو جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے بہتر اور بلند درجہ ہے، اوراس کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے، اوراس سے جنت کی نہریں جاری ہیں۔ [البخاري]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ عام جنتی بالاخانوں کے رہنے والوں کو اپنے اوپر اس طرح دیکھیں گے جیسے تم (دنیا میں) کسی چمکدار ستارے کو دیکھتے ہو، جو آسمان کے کناروں میں مشرق یا مغرب کی جانب دور نظر آرہا ہو، اور یہ ان کے آپس کے فرقِ مراتب کی وجہ سے ہوگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ تو انبیاء کرام علیہم السلام کے رہنے کی جگہیں ہوں گی، جہاں کوئی اور نہیں پہنچے گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ وہ لوگ ان میں رہیں گے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اور پیغمبروں کی تصدیق کی۔ [بخاري]

مسند احمد میں ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا، اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں اس بات کی شہادت دے چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سچے رسول ہیں، اور میں پانچ وقت کی نمازوں کا بھی پابند ہوں، اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہوں، اور رمضان کے روزے بھی رکھتا ہوں۔ یہ سن کر سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس حالت میں مرجائے وہ انبیاء، صدیقین، شہداء کے ساتھ ہوگا، بشرطیکہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہ کرے۔

انبیاء علیہم السلام کی معیت کسی رنگ ونسل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک سیاہ رنگ کا حبشی شخص سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا، اور عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ہم سے حسن وصورت اور حسین رنگ میں بھی ممتاز ہیں، اور نبوت و رسالت میں بھی، اب اگر میں اس چیز پر ایمان لے آؤں جس پر آپ ایمان رکھتے ہیں، اور وہی عمل کروں جو آپ کرتے ہیں، تو کیا میں بھی جنت میں آپ کے ساتھ ہوسکتا ہوں؟ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ہاں! ضرور (تم اپنی حبشیانہ بدصورتی سے نہ گھبراؤ) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے جنت میں کالے

رنگ کے حبشی سفید اور خوبصورت ہوں گے، اور حسین ہو جائیں گے، اور ایک ہزار سال کی مسافت سے چمکیں گے، اور جو شخص محض "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ" کا قائل ہو، اس کی فلاح ونجات اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو جاتی ہے، اور جو شخص "سُبْحٰنَ اللہِ وَ بِحَمْدِہٖ" پڑھتا ہے اس کے نامۂ اعمال میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

یہ سن کر مجلس میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حسنات کی اتنی عظیم سخاوت ہے تو ہم پھر کیسے ہلاک ہو سکتے ہیں، یا عذاب میں کیسے گرفتار ہو سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (یہ بات نہیں) حقیقت یہ ہے کہ قیامت میں بعض آدمی اتنا عمل اور حسان لے کر آئیں گے کہ اگر ان کو پہاڑ پر رکھ دیا جائے تو پہاڑ بھی ان کے بوجھ کا تحمل نہ کر سکے، لیکن اس کے مقابلہ میں جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں آتی ہیں، اور ان سے موازنہ کیا جاتا ہے، تو انسان کا عمل ان کے مقابلہ میں ختم ہو جاتا ہے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کو اپنی رحمت سے نوازے۔

اس حبشی صحابی رضی اللہ عنہ کے سوال وجواب ہی پر سورۃ الدہر کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ [الإنسان: ۱] (کیا انسان پر کبھی کوئی وقت آیا ہے)۔ حبشی صحابی رضی اللہ عنہ نے حیرت سے سوال کیا: یا رسول اللہ! میری آنکھیں بھی ان نعمتوں کو دیکھیں گی جن کو آپ کی مبارک آنکھیں مشاہدہ کریں گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! ضرور۔ یہ سن کر اس نومسلم حبشی نے رونا شروع کیا، یہاں تک کہ روتے روتے میں جان دیدی، اور آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ان کی تجہیز وتکفین فرمائی، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ جنت کے اشتیاق نے تمہارے بھائی کی جان لے کر انہیں آخرت میں پہنچا دیا۔ [رواه الطبراني في الكبير]

درجات کی تفصیل:

یہ خوش نصیب بابرکت چار گروہ، انبیاء علیہم السلام، صدیقین شہداء اور صالحین ہیں۔ اول تینوں مخصوص ہیں، چوتھا عام ہے۔ اول تینوں کے لئے صالحین کی صفت بھی لازم ہے، جبکہ صالحین کے لئے نبوت وصدیقیت اور شہادت ضروری نہیں ہیں۔ پہلی صفتِ نبوت مردوں کے ساتھ خاص ہے، جبکہ دیگر تینوں درجات مذکر ومؤنث سب کے لئے ہیں۔ اول درجہ خالص عطائی وہبی ہے، دیگر درجات کسبی ہیں، وغیرہ سارے جہاں پر ان حضرات کا تفوق برتری، اور قدر ومنزلت شرعاً، عقلاً، نقلاً ہر اعتبار سے ثابت ہے۔

یہ مقامات اتنے بلند وبالا ہیں اگر ان کا موازنہ دیگر تمام مخلوقات کے ساتھ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوگا

كَفَضْلِ الْخَالِقِ عَلٰى اَدْنٰى خَلْقِهٖ۔ جس طرح اللہ تعالیٰ پاک کا موازنہ مخلوقات کے ساتھ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی معیت کو محض اپنا فضل قرار دیا ہے، اور فضلِ الٰہی کو ساری کائنات پر برتری حاصل ہے۔

کیا ان چاروں میں باہمی نسبت اور فرق ہے یا نہیں؟ کیا یہ چاروں درجے کسی ایک شخص میں جمع ہوسکتے ہیں؟ حضرات مفسرین نے اس سلسلے میں مختلف توجیہات اور مختلف اقوال بیان کئے ہیں، بعض نے فرمایا کہ یہ چاروں درجے ایک شخص میں بھی جمع ہوسکتے ہیں، اور یہ سب صفاتِ متداخلہ کی طرح ہیں، کیونکہ قرآن کریم میں جس ہستی کو نبی فرمایا گیا ہے، اس کو قرآن کریم ہی میں صدیق اور صالحین جیسے القاب سے بھی یاد کیا گیا ہے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ [مریم: ۴۱] (بیشک وہ صدیق، نبی تھے) اور حضرت یحیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے: ﴿وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ [آل عمران: ۳۹] (اور نبی، صالحین میں سے) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے: ﴿وَ كَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ [آل عمران: ۴۶] (اور بڑی عمر میں، اور راست باز لوگوں میں سے ہوگا) وغیرہ۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ مفہوم ومعنی کے اعتبار سے یہ چار صفات اور درجات الگ الگ ہیں، لیکن یہ سب صفات ایک شخص میں بھی جمع ہوسکتی ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مفتی، محدّث، مفسر، فقیہ، مؤرخ اور مختلف صفات علماء کی ہیں، لیکن بعض علماء ایسے بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ تمام صفات اپنے اپنے مفہوم کے مختلف ہونے کے باوجود اس میں جمع ہوں، یہ کسی بھی اعتبار سے غلط نہ ہوگا۔

البتہ! عرف عام میں قاعدہ ہے کہ جس شخص پر جس صفت کا غلبہ ہوتا ہے اسی کے نام سے وہ معروف ہوجاتا ہے۔ طبقات پر کتاب لکھنے والے اسی طبقہ میں اسے شمار کرتے ہیں، اسی وجہ سے عام مفسرین نے فرمایا کہ صدیقین سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، اور شہداء سے مراد شہداءِ اُحد ہیں، اور صالحین سے عام نیک مسلمان مراد ہیں۔

اور امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان چاروں صفات کو مختلف درجات قرار دیا ہے۔ تفسیر روح المعانی، مظہری، بحر محیط وغیرہ میں بھی یہی مذکور ہے۔ یعنی یہ کہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ شانہ نے مؤمنین کو چار قسموں میں تقسیم کر کے ہر ایک کے لئے درجات اعلیٰ وادنیٰ مقرر فرمائے ہیں، اور عام مسلمانوں کو ترغیب دی ہے کہ وہ ان میں سے کسی کے درجے سے پیچھے نہ رہیں۔ علمی اور عملی جدوجہد کے ذریعہ ان درجات تک پہونچنے کی کوشش کریں، ان میں نبوت ایک ایسا مقام ہے جو جدوجہد سے کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا، لیکن انبیاء علیہم السلام کی معیت پھر بھی حاصل ہوسکتی

ہے۔ امام راغب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان درجات میں سب سے پہلا درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جن کو قوتِ الٰہیہ کی امداد حاصل ہے، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو قریب سے دیکھ رہا ہو، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا: ﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى﴾ [النجم: ۱۲] (کیا پھر بھی تم ان سے اس چیز کے بارے میں جھگڑتے ہو جسے وہ دیکھتے ہیں؟)۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ چاروں درجات کے حاملین مختلف چار طبقات پر منقسم ہیں، وہ جس ترتیب سے مذکور ہیں وہی ان کی بلندی و اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف مرتبہ کے اعتبار سے مقامات ہیں۔ پہلا درجہ انبیاء کرام علیہم السلام کا ہے، جن میں باقی صفات بھی موجود ہیں۔ دوسرا درجہ صدیقین کا ہے، جن میں نیچے دونوں درجات کی صفات بھی ہیں، تیسرے درجہ میں شہداء ہیں، جن میں چہارم درجہ کی صفات بھی ہیں، چوتھے درجہ میں صالحین ہیں، جن میں اپنے سے اوپر درجوں کی صفات مفقود ہیں، مگر ان کی اپنی صفات ان میں موجود ہیں جو کہ عوام الناس سے ممتاز ہیں۔

پھر صالحین سے نیچے کے لوگ دو قسم کے ہیں: پہلا طبقہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانبردار ہو، جس کو آیت کریمہ نے ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ کے ساتھ بیان فرمایا، اور ان کے لئے چاروں طبقات کی رفاقت اور معیت ثابت فرمائی، دوسرے طبقے میں وہ لوگ ہیں جو اس مقام کی تحصیل سے محروم رہے، جن کا آیت میں ذکر نہیں ہے۔

اس مسئلہ پر پوری تفصیل سورۂ فاتحہ کی تفسیری فوائد میں دیکھ لیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا۝۷۱ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا۝۷۲ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا۝۷۳ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۝۷۴

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنے بچاؤ کا سامان لے لو، پھر نکل کھڑے ہو، چھوٹی جماعتیں یا بڑی جماعتیں بنا کر۝۷۱ اور بلا شبہ تم میں بعض ایسے لوگ ہیں جو دیر لگاتے ہیں، سو اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچ جائے تو کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ

نے مجھ پر انعام فرمایا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ حاضر نہ تھا۞ اور اگر تم کو اللہ تعالیٰ کا فضل حاصل ہو جائے تو کہنے لگتے ہیں، گویا کہ تمہارے اور ان کے درمیان کوئی دوستی ہی نہیں: اے کاش! میں ان کے ساتھ ہوتا، تو مجھ کو بڑی کامیابی حاصل ہوتی۞ سو جو لوگ آخرت کے بدلہ دنیا والی زندگی کو اختیار کرتے ہیں ان کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کریں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرے، پھر وہ قتل کیا جائے، یا غالب ہو جائے، سو عنقریب ہم اسے اجرِ عظیم عطا کریں گے۞

معارف و منازل

پہلی آیت کریمہ میں مسلمانوں کو مستعد اور جہاد کے لئے ہر وقت تیار رہنے کا حکم ہے۔ دوسری اور تیسری آیت میں منافقین کے نفاق اور دورُخی کا بیان اور مذمت ہے۔ چوتھی آیت میں ترغیب و بشارت کا بیان ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں وہ ہر صورت اجرِ عظیم کے مستحق ہیں۔

مسلمانوں کو ترغیب، اور منافقین کے طرزِ عمل کی مذمت:

مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ دشمنوں کی جانب سے مستعد اور چوکنا رہو، اور اپنا ہتھیار تیار رکھو، جوں ہی ضرورت پڑے گی فوراً روانہ ہو جاؤ، جہاں چھوٹی جماعتوں سے ضرورت پوری ہوتی ہو وہاں چھوٹی جماعتیں چلی جائیں، اور جہاں بڑی جماعت کی ضرورت ہو وہاں بڑی جماعت چلی جائے۔

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''ثُبات'' کے معنی ہیں: چھوٹی جماعت، اور ''جَمِیْعاً'' کے معنی ہیں: بڑی جماعت (جیش)۔ چونکہ منافقین مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے، اس لئے فرمایا کہ تم میں بعض وہ لوگ ہیں کہ جب ان میں جہاد کی بات آتی ہے تو اندر سے ایمان نہ ہونے کی وجہ سے وہ جہاد میں جانے پر تیار نہیں ہوتے، اگر بابِ تفعیل سے ''لَيُبَطِّئَنَّ'' مراد لیا جائے۔ اور اگر بابِ افعال مراد ہو، تو معنی یہ ہوگا کہ وہ دوسروں کو جہاد کی شرکت سے روکتے ہیں۔

دونوں معنی صحیح ہیں، کہ خود بھی جہاد کے لئے تیار نہیں ہوتے، اور دوسروں کو بھی منع کرتے ہیں، جیسا کہ غزوۂ احد کے موقع پر منافقین نے ایسا کیا تھا، چونکہ یہ لوگ صرف صاحب دنیا ہیں، اور ایمان سے خالی ہیں، ظاہراً مسلمان اور باطن میں مسلمانوں کے دشمن ہیں، اس لئے ان کی زبانوں پر وہ باتیں آجاتی ہیں جو ان کے نفاق اور دل کے مرض

کو ظاہر کر دیتی ہیں۔

جب مسلمانوں کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو کہتے ہیں: اچھا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بچالیا، اور ہم ان کے ساتھ نہ رہے، جہاں ان کو تکلیف پہنچی ہم وہاں حاضر نہیں ہوئے، اور جب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہوجائے، فتح ونصرت انہیں نصیب ہوجائے، اور مالِ غنیمت مل جائے، تو ایسے طور پر خود غرضی کے ساتھ گویا مسلمانوں سے ان کو کوئی تعلق ہی نہیں، یوں کہتے ہیں: کاش کیا اچھا ہوتا جو ہم بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوتے، اور ہمیں بھی بڑی کامیابی حاصل ہوتی، ہمیں بھی مالِ غنیمت کا حصہ مل جاتا۔

دیکھیں! جب مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی ہے تو یہ خوش ہوجاتے ہیں، اور جب ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے تو ان پر گراں گزرتا ہے، اور وہ افسوس کرتے ہیں کہ ہم کیوں محروم ہوئے، اور یہ کیوں کامیاب ہوئے۔ اس طرح وہ دوغم میں مبتلا ہوجاتے ہیں: ایک مسلمانوں کی کامیابی، دوسرے مالِ غنیمت سے اپنی محرومی۔ آگے ارشاد ہے:

﴿فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ﴾ یعنی جو لوگ طالبِ دنیا ہیں، اپنی دنیا بنانے کے لئے آخرت کو چھوڑ رہے ہیں، اور صرف دنیا ہی پر فریفتہ ہیں، انہیں چاہئے کہ مسلمانوں کی طرح ایمان لائیں، اور پھر مسلمانوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ لڑیں، اور جہاد کریں۔ دوسرے معنی یہ ہے کہ "يَشْرُوْنَ" بمعنی "یبیعون" کے ہے۔ تو مطلب واضح ہے کہ اس سے مراد مؤمنینِ مخلصین ہوں گے، جنہوں نے دنیا بیچ کر اس کے بدلے میں آخرت خرید لی۔

تو انہیں چاہئے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر خوب لڑیں، اور جہاد کریں۔ آگے ایسے لوگوں کے لئے اجرِ عظیم کی بشارت کا بیان ہے، اور جہاد کی فضلیت واہمیت کا بیان ہے، فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرے گا، وہ خواہ مقتول ہوجائے، خواہ غالب ہوجائے، ہر حال میں اس کے لئے اجرِ عظیم کا وعدہ ہے۔ اصل تو آخرت ہی کا اجر ہے، اور دنیا میں جو مالِ غنیمت مل جائے وہ مؤمن کا مقصود نہیں ہے، وہ الگ سے اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، مسلمان کیلئے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس میں منافقوں کو تنبیہ ہے کہ جب مسلمانوں کو مالِ غنیمت مل جاتا ہے تو وہ افسوس کرتے ہیں کہ کیوں ہم لوگ ساتھ نہ ہوئے، اور محروم رہے، بڑی کامیابی سے رہ گئے، انہیں کہا جارہا ہے کہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی

ہے، نہ کہ مالِ غنیمت کی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مالِ غنیمت کے ملنے سے ثواب میں کسی قسم کی کمی نہ ہوگی، اور اجرِ عظیم کا وعدہ شہادت اور غلبہ دونوں صورتوں میں برقرار ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝

ترجمہ: اور تمہیں کیا عذر ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں، اور ضعیفوں کی خاطر، جن میں مرد اور عورتیں اور بچے ہیں، جنگ نہ کرو، جو یوں کہہ رہے ہیں: اے ہمارے ربّ! نکال ہم کو اس بستی سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں، اور بنادے ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی حمایت کرنے والا، اور ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی مددگار بنادے ۝ جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں، سو تم شیطان کے دوستوں سے جنگ کرو، بلاشبہ شیطان کی تدبیر ضعیف ہے ۝

معارف ومنازل

پہلی آیت میں جہاد کے دواعی کا بیان ہے، دوسری آیت میں مؤمن اور کافر کی نیتوں اور مقاصد کا بیان ہے۔ پہلی آیت میں جہاد کی ترغیب اور اس کی اہمیت اور اصلی مقصد کا بیان ہے۔ اول یہ کہ جہاد اس لئے ضروری اور لازمی ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ اسی پر موقوف ہے، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ [الأنفال: ۳۹] (کفار سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور پورے کا پورا دین اللہ کے لئے ہو جائے)۔

جہاد اس لئے ضروری ہے تاکہ کفر و شرک کا پورے عالم سے قلع قمع ہو، اور پورے جہاں پر توحید اور دینِ الٰہی کا غلبہ ہو۔ دوسرا یہ کہ جو مظلوم مرد، عورتیں، اور بچے جو کہ مکہ مکرمہ میں کفار کے قید و بند اور مظالم کے شکار ہیں، اور مشرکین کے نرغے میں محبوس ہیں، جن پر کفار ہر قسم کے اندوہناک اور ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں، اور وہ ہجرت

کرنے اور مدینہ منورہ تک آنے سے قاصر اور بے بس ہیں، مسلسل اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعاء مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ان ظالموں کے ظلم اور پنجۂ استبداد سے ہماری نجات کا فیصلہ فرما کر ہماری نجات کا کوئی راستہ، ذریعہ اور وسیلہ پیدا فرمائیں۔ یہ ضعفاء و مظلومین یہ دعاء بھی کر رہے تھے کہ ہمارے ربّ! ہمارا کوئی حمایتی بنادے، اور ہمارا کوئی مددگار بنادے۔

مفسرین حضرات نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، جب پروردگار سبحانہ کے حکم پر حضرت خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکہ فتح کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب ضعفاء کی مدد فرمائی، اور بڑے بڑے لوگوں کو چھوڑ کر ایک انیس سالہ نوجوان حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا والی مقرر فرمایا، اس جلیل القدر امیر نے ضعفاء کی وہ مدد و خدمت کی کہ یہ لوگ سارے شہر کے باعزّت و باکرامت لوگوں میں شامل ہوگئے۔

جو حضرات ضعفاء تھے، ہجرت نہ کر سکتے تھے، اور مکہ معظّمہ میں مشرکین کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے، ان میں ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہم وغیرہ بھی تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں اور میری والدہ بھی انہیں لوگوں میں سے تھے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے نماز میں رکوع کے بعد کھڑے ہوکر آخری رکعت میں دعا فرمایا کرتے تھے۔ [بخاري]

مؤمنین اور منافقین کی نیتوں کا بیان:

پھر مؤمن و کافر کی جنگ کے مقاصد کا تذکرہ فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ یعنی جو لوگ مؤمن ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتے ہیں، ان کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء اور اعلاء کلمۃ اللہ ہوتا ہے، اور کافر جو جنگ لڑتے ہیں وہ طاغوت، یعنی شیطان کی راہ میں جنگ لڑتے ہیں، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کفر و شرک کو رواج دیں، اور کفر کی اشاعت ہوجائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا:

﴿فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ﴾ کہ شیطان کے دوستوں سے جنگ کرو، شیطان تو اپنے دوستوں کی مدد کرتا ہے، لیکن اس کی مدد اللہ تعالیٰ کی مدد کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ جب مؤمن بندے اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے میدان جنگ میں اترتے ہیں، اور ان کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوجاتی ہے، تو شیطان اور اس کے کارندے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں، اور مسلمانوں کی تھوڑی جماعت کے مقابلہ میں عاجز رہتے ہیں، اور شیطان اور اس کی ساری تدبیریں

مسلمانوں کے حربی جنگی سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتی ہیں۔قرآن کریم نے اسی عزم وہمت کے لئے تو ایمان وتقویٰ اور اخلاص کو ضروری لازمی قرار دیا جو فتح وکامیابی کا ستون ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ
فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ
خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۪ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾

ترجمہ: کیا تونے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو، اور نماز قائم کرو، اور زکوۃ دیتے رہو، پھر جب ان پر جنگ کرنا فرض کیا گیا، تو اس وقت ان میں سے ایک فریق لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگا جیسے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوں، بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈرنے لگے، اور کہنے لگے کہ اے ربّ! آپ نے ہم پر جنگ کیوں فرض کی؟ ہم کو تھوڑی مدّت کے لئے مہلت کیوں نہ دی؟ آپ فرمادیجئے کہ: دنیا کا نفع تھوڑا سا ہے، اور آخرت بہتر ہے اس کے لئے جو پرہیز گاری اختیار کرے، اور تم لوگوں پر کھجور کی گٹھلی کے تاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۷۷﴾

معارف ومنازل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور ان کے بعض ساتھی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے (یہ واقعہ مکی زندگی کا ہے) اور انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم جب مشرک تھے تو عزّت میں تھے، پھر جب ہم ایمان لائے تو ذلّت والے ہوگئے، چاروں طرف سے مشرکین کے نرغے میں ہیں، لہٰذا آپ ہمیں دشمنانِ اسلام کے ساتھ جنگ کی اجازت دیں۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابھی وقت نہیں آیا، فی الحال مجھے معاف اور درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا جنگ نہ کرو، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو جہاد فرض ہوا، تو فرضیت جہاد کے بعد کچھ لوگ جہاد سے بچنے لگے، اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔ [لباب النقول، نسائي، حاكم]

مطلب یہ ہے کہ مکی زندگی میں لوگ جہاد کا شوق رکھتے تھے، اور قرآن حکیم میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے ذریعہ جہاد اور اس کے فوائد سے واقف ہو چکے تھے، اسی بنیاد پر اپنے بارے میں دفاعی مقاصد کی خاطر انہوں نے جہاد کی مشروعیت اور اجازت طلب کی تھی۔ جب مدنی زندگی میں ان کے مطلوبہ جہاد کی فرضیت نازل ہوئی تو ایک فریق نے اسے بوجھ سمجھ کر پہلوتہی کی، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ [البقرۃ:۲۱۶] (تم پر جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے، اور وہ تم پر گراں ہے، اور عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا سمجھو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اور ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو)۔ کے ضمن میں بیان ہوا۔

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاد کرنے کا مطالبہ کیا تھا تو اس وقت ان سے کہا گیا تھا کہ ابھی قتال نہ کرو، نمازیں پڑھتے رہو، اور زکوٰۃ دیتے رہو، لیکن جب قتال کا حکم آ گیا، اور جہاد فرض ہو گیا، تو وہی لوگ جو قتال کی خواہش کر رہے تھے ان میں سے ایک فریق پر بزدلی چھا گئی، اور بزدلی بھی معمولی نہیں، کیونکہ اس جماعت پر خوف اس قسم کا سوار ہو گیا، اور لوگوں سے ایسے شدید خوف کھانے لگے، جیسے اللہ تعالیٰ سے خوف کھانے کے برابر یا اس سے بھی زیادہ، اور کہنے لگے کہ اے ہمارے ربّ! آپ نے ابھی سے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا؟ ہمیں تھوڑی سی مہلت اور مل جاتی تو اچھا ہوتا۔

یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ پہلے سے جہاد کا مطالبہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، ہر حال میں یہ الفاظ اعتراض کے معلوم ہوتے ہیں، اور مؤمنوں کی شانِ انقیاد و تسلیم کی ہے، نہ کہ اعتراض اور اظہارِ ناراضگی، عام مؤمن ایسی بات نہیں کہتے، چہ جائیکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسا کہیں۔

علماء کرام اور مفسرین حضرات نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں: اول یہ کہ لفظ ﴿اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ کہنے والے منافقین تھے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ قول ایسے مسلمانوں سے سرزد ہوا جو علم میں راسخ نہ تھے، خوف اور بزدلی کی وجہ سے ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے، بطور اعتقاد ایسا نہ تھا، پھر بعد میں انہوں نے توبہ بھی کر لی۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ بات کہی وہ پہلے مؤمن تھے، جب قتال فرض ہوا تو بزدلی کی وجہ سے منافق ہو گئے، اور جہاد سے پیچھے ہٹ گئے۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ انہوں نے یہ الفاظ بطور اعتراض نہیں کہے، بلکہ یہ ایک لطف آمیز شکایت کے طور پر کہا تھا۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ انہوں نے صراحۃً زبان سے یہ کلمات نہیں کہے تھے، بلکہ ان کے قلوب میں اس قسم کا خیال اور وسوسہ پیدا ہوا تھا، اور قلبی وساوس پر مؤاخذہ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے معاف ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ شان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پیش نظر جیسے سیاق وسباق کا تقاضا بھی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ کہنے والے منافقین ہی تھے، جیسے کہ اول جواب کا خلاصہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ میں اصلاح نفس کا راز پوشیدہ ہے، جو کہ جہاد پر مقدم ہے، کیونکہ اصلاح نفس اگر حاصل نہ ہو تو جہاد جیسے مشکل عمل نہایت دشوار ہوگا، جہاد میں بنیادی چیز اصلاحِ ملک ہے، اور یہ اصلاحِ نفس کے بعد کا درجہ ہے، اسی وجہ سے درجہ اول کا حکم فرضِ عین اور جہاد فرضِ کفایہ ہے۔ [مظھري وغيره]

﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى﴾ آپ فرما دیجئے کہ دنیا کا فائدہ بہت کم ہے، اور آخرت بہتر ہے اس شخص کے لئے جو تقویٰ اختیار کرے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو قلیل اور نہایت معمولی قرار دیا ہے۔ اس کی وجوہات یہ ہیں:

(۱) دنیا کی نعمتیں قلیل ہیں، اور آخرت کی نعمتیں کثیر ہیں۔ (۲) دنیا کی نعمتیں فانی ہیں، اور آخرت کی نعمتیں باقی ہیں۔ (۳) دنیا کی نعمتیں ناقص ہیں، اور آخرت کی نعمتیں کامل ہیں۔ (۴) دنیا کی نعمتیں محدود ہیں، اور آخرت کی نعمتیں بے حساب ہیں۔ (۵) دنیا کی نعمتیں بسا اوقات مضر اور نقصان دہ ہوتی ہیں، جبکہ آخرت کی نعمتیں ہر خطرہ سے محفوظ ہیں۔ (۶) دنیا کی نعمتوں کا حصول یقینی نہیں ہے، جبکہ آخرت کی نعمتوں کا حصول یقینی ہے۔ (۷) دنیا کی نعمتیں دوست ودشمن سب کے لئے ہیں، جبکہ آخرت کی نعمتیں صرف متقی لوگوں کے لئے ہیں۔ (۸) دنیا کی نعمتوں کا نتیجہ شقاوت ہے، جبکہ آخرت کی نعمتوں کا نتیجہ راحت وسکون ہے۔ (۹) دنیا کی ادنیٰ سے ادنیٰ نعمت کے لئے دوڑ دھوپ اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ آخرت کی نعمتوں کا یہ حال ہے کہ محض خیال میں آنے کے ساتھ سب کچھ حاضر ہے۔ (۱۰) دنیا کی نعمتوں سے ہزاروں بیماریاں اور مشکلات پیدا ہوتی ہیں جبکہ آخرت کی نعمتیں صحت افزا ہیں وغیرہ۔

﴿وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا﴾ فتیل، قمطیر، نقیر وغیرہ کی تفصیل عنقریب گزر چکی۔ یعنی تم پر ذرّا سا بھی ظلم

نہیں ہوگا، تمہارے ہر چھوٹے بڑے عمل کا پہاڑوں برابر ثواب تمہیں پیش کیا جائے گا، بہت سارے لوگوں نے زندگی بھر دنیا کے لئے محنت وخواری کی، مگر دنیا کی لذتوں سے محروم رہے، اور بسا اوقات یہ بھی ہوا کہ لینے کے بدلے دینے پڑ گئے۔ آخرت کا معاملہ ایسا نہیں ہے، وہاں تمہارے ہر ایک عمل کا بدلہ ضرور ملے گا، کوئی عمل ضائع نہیں ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب لاکھوں میں ہو، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیس لاکھ تک کے ثواب کی روایت نقل فرمائی۔ [درمنثور]

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَاِنْ تُصِبْھُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا ھٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا ھٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ ھٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

ترجمہ: تم جہاں بھی ہو تم کو موت پکڑ لے گی، اگرچہ تم مضبوط قلعوں کے اندر ہو، اور اگر ان کو کوئی اچھی حالت پیش آجاتی ہے تو کہتے ہیں: یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے، اور اگر ان کو کوئی بری حالت پیش آجاتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تیری وجہ سے ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ: یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، سو ان لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں جاتے ﴿۷۸﴾ تجھے جو کوئی اچھی حالت پہنچ جائے سو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور تجھے جو کوئی بری حالت پہنچ جائے سو وہ تیری طرف سے ہے، اور ہم نے آپ کو لوگوں کے لئے پیغام پہنچانے والا بنا کر بھیجا ہے، اور اللہ تعالیٰ کافی ہے گواہی دینے والا ﴿۷۹﴾

معارف ومسائل

یہ رنگوں والا جہاں عجائبات کی دنیا ہے، یہاں کروڑوں اربوں انسان آئے اور فنا ہوئے، اور اب بھی انسانوں کی آبادی ساڑھے چھ ارب سے کچھ زائد ہے۔ اور روزانہ کے حساب سے فنا وبقاء اور آمد ورفت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہاں منکرینِ خدا ورسول، اور منکرینِ قیامت، جزاء وسزا جنت ودوزخ کے منکرین کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور ہر زمانہ میں یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مگر اللہ تعالیٰ بھلا کرے موت کا کہ آج تک اس کا کوئی منکر پیدا ہوا، نہ اس کا کوئی ٹالنے والا دیکھا گیا، وہ بدستور اٹل اور فیصلہ کن حیثیت کے ساتھ بلا خوف وخطر اور بغیر کسی لحاظ داری کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک، محکوم سے لے کر حاکم تک، اور بڑے بڑے صنادید اور فرعون وغیرہ تک، اس کے فولادی پنجے گاڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اتنا دنیا والوں کو پتہ ہے کہ یہ پیغامِ الٰہی اور اٹل ہے، اس سے نجات اور بچنے کی نہ کوئی صورت ہے، اور نہ کوئی تدبیر کارگر ہے۔ مگر کائنات کی تسخیر پر مامور بندۂ ضعیف آج تک یہ سراغ نہ لگا سکا، اور معلوم نہ کر سکا کہ یہ کیا ہے، اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

کائنات کے خالق ومالک نے کھل کر پوری انسانیت کو چیلنج فرمایا: ﴿كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ﴾[آل عمران: ۱۸۵] (ہر جان موت چکھنے والی ہے)۔ اور فرمایا: ﴿كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ﴾[الرحمن:۲۶] (زمین میں جو کوئی ہے فنا ہونے والا ہے)۔ پھر فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ الۡخُلۡدَ﴾ [الأنبياء:۳۴] (آپ سے پہلے ہمیشہ رہنا کسی فردِ بشر کے لئے ہم نے طے نہیں کیا)۔ اور فرمایا: ﴿اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يُدۡرِكْكُّمُ الۡمَوۡتُ وَ لَوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُرُوۡجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾۔

اور اس کی پختگی اور اصلی آمد کے متعلق فرمایا: ﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ لَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّلَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ﴾[النحل: ۶۱] (پھر جب ان کا وہ معین وقت آجائے گا تو وہ گھڑی بھر بھی اس سے آگے پیچھے نہیں ہو سکیں گے)۔ یہ اتنا اٹل اور فیصلہ کن امر ہے کہ پوری کائنات کے اقتدار پر قدم جمانے والا بادشاہ یا حاکم نہ موت کو ٹال سکتا ہے، نہ اس کے پروگرام میں کوئی کمی بیشی تقدیم وتاخیر کر سکتا ہے، جیسے جنگل کے بادشاہ ببر شیر کے سامنے ساری لومڑیاں بیچاریاں بے بس نظر آتی ہیں، اسی طرح ربّ العزّت کے اس اٹل فیصلے کے سامنے سارے لوگ بے بس ہیں، کیونکہ وہ سوائے انبیاء علیہم السلام کے نہ کسی سے مشورہ کرنے کی پابند ہے، اور نہ ہی مہلت دینے اور اختیار دینے کی۔

قرآن حکیم نے اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے ملحدین اور منافقین کو تنبیہ فرمائی کہ جو لوگ بزدلی اختیار کرتے ہیں، اور فی سبیل اللہ جہاد کرنے سے کتراتے ہیں، اور موت کے خوف سے میدانِ جہاد میں نہیں اترتے ہیں، فرمایا: یہ ان کے ایمان نہ ہونے کی نشانی ہے، اور حق کی تکذیب ہے، کیونکہ موت کا وقت مقرر ہے، وہ کسی جہاد میں جانے یا گھر میں رہنے کے ساتھ ہرگز معلق نہیں ہے، اس کا مقررہ وقت جب بھی آپہنچے گا اس کی کارروائی شروع ہو گی، اور مرنا ہی پڑے گا۔ جب صدر دفتر سے منظوری آئے گی تو پھر ہر صورت یہاں سے جانا پڑے گا۔ جہاں کہیں چھپ

جاؤ، ہزاروں پہرہ داروں کی مسلح جھرمٹ میں رہو، ملک الموت علیہ السلام کے بے رحم آہنی پنجوں سے نہیں بچ سکتے ہو۔

دنیا کی تاریخ میں آج تک کوئی ثابت نہیں کرسکتا کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے کسی کو معاف کیا ہو، اس آیت کریمہ میں فرمایا کہ تم جہاں کہیں ہوں گے تمہیں موت آ پکڑے گی، اگرچہ مضبوط قلعوں میں رہو۔ غزوۂ احد میں منافقین عذر کرکے راستے سے واپس ہوئے، جبکہ ان کے قبیلہ والے لوگ جو سچے مسلمان تھے میدان میں اترے، اور شہید ہوگئے، تو منافقین نے کہا:

﴿لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا﴾ [آل عمران: ۱۵۶] یعنی اگر ہمارے قبیلہ کے یہ لوگ میدان جہاد میں نہ اترتے اور ہمارے پاس گھروں میں ہوتے تو نہ وہ مرتے اور نہ مقتول ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرما کر ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ [آل عمران: ۱۶۸] تم اپنی جانوں سے موت کو دفع کرو، اگر تم سچے ہو۔ اور یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے، اور آئندہ یہی مشاہدہ کرو گے کہ تم پر گھروں کے اندر موت آئے گی، اور میدانِ جہاد میں اترنے والے صحیح سلامت گھروں کو لوٹیں گے، جن پر خراش تک نہ ہوگی۔

منافقوں اور یہودیوں کی شرارت اور خباثت:

سرور عالم برکت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے کفر اور ظلمتوں میں ڈوبا ہوا جہاں روشن ہوا۔ قبیلہ بنی سعد کی حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کا غربت ومسکنت میں ڈوبا ہوا گھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور نزول سے ایسا آباد اور خوشحال ہوا کہ جس پر وہاں کی پوری آبادی کو اس جنت نظیر گھر پر رشک آیا، مگر کیا کیا جائے حسد اور عناد کی بیماری کا جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پورا مدینہ اوس اور خزرج کے قبائل میں جاری تمام عداوتیں محبت ودوستی کے ساتھ بدل گئیں، بدامنیاں یکسر ختم ہوگئیں، ان کے اموال اولاد میں بے نظیر برکتوں اور خوشحالیوں کا ظہور ہوا، مگر یہ برکت وخوشحالی دشمنانِ اسلام اور بدخواہانِ رسالت کو راس نہیں آیا۔ یہودیوں نے منافقین کے ساتھ مل کر یہ منافقانہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ جب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد وتشریف آوری ہوئی ہے ہمارے باغوں کے پھل کم ہوتے جارہے ہیں، اور کھیتوں کی پیداوار بھی گھٹتی

جارہی ہے، وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے فرعونیوں نے (العیاذ باللہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منحوس سمجھا تھا، اور فساد کی جڑ قرار دیتے تھے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ﴾ [الأعراف: ۱۳۱] (اور اگر ان پر کوئی مصیبت پڑ جاتی، تو اس کو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے)۔

بعینہٖ یہود مدینہ نے یہی کچھ منصوبہ بندی کے تحت سرور عالم ﷺ اور صحابہ کرام مہاجرین رضی اللہ عنہم کے بارے میں شروع کیا۔ ان کی تردید وابطال میں ان آیات کا نزول ہوا:

﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ﴾ یعنی اگر ان کو کوئی اچھائی پہنچ جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اگر کوئی مصیبت پہنچ گئی، تو کہتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ کی نحوست کی وجہ سے ہے (نعوذ باللہ منہ)۔ قرآن کریم نے ان کے غلط مزعومہ اور شرارتوں کا جواب دے کر ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ کہ آپ ﷺ فرما دیجئے کہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، ہر قسم کی خیر و شر، اچھے برے، آبادی و بربادی، خوشحالی و غمی، فتح و شکست اس کے حکیمانہ فیصلے کے مطابق ہوگا، جو ہستی رحمۃ للعٰلمین کے منصبِ عالی پر متمکن ہو، اس عظیم ہستی اور اس کے مقدس اصحاب رضی اللہ عنہم کے بارے میں تمہارے خیالات صرف تمہارے خبثِ باطن کے اندازے اور حسد کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ یہ ہستی اتنی پاکیزہ ہے کہ وہاں تک کسی مخلوق کی رسائی ممکن ہی نہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ☆ چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ان دشمنانِ اسلام اور بدخواہانِ نبوت سے فرما دیں کہ یہ سب کچھ نعمت اور نقمت خوشحالی اور غمی و بدحالی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، میرے اور میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ نعمت و آبادی تو صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہے، اور نقمت و مصیبت کے آنے میں تمہارے برے کردار اور بداعمالیوں کا دخل ہے۔ ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ [الشوریٰ: ۳۰] (اور تمہیں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کئے ہوئے کاموں کی وجہ سے پہنچتی ہے)۔ لیکن ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ سے ہے۔ پھر فرمایا:

﴿فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ ان لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے پاس نہیں

پھٹکتے، باتوں کو کیا سمجھتے، سمجھنے کے پاس نہیں گزرتے۔ یہ ایک ایسے جہل مرکب میں غرق ہیں کہ صحیح بات کو غلط، اور اپنی غلطی اور جہالت کو صحیح اور علم سمجھتے ہیں۔ پھر فرمایا:

﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ جو کچھ اچھی حالت تجھے پہنچ جائے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور جو کچھ تجھے بدحالی پہنچ جائے وہ تیری طرف سے ہے۔ یہ خطاب تمام مسلمانوں کے لئے ہے، اس میں اچھی حالت، یعنی خوشی وفراخی، اور بُری حالت پریشانی وتکلیف پیش آنے کا قانون بتادیا، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق واجب نہیں ہے، جو بھی نعمت اور اچھی حالت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل جائے وہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل وبخشش ہے، نیک اعمال انجام دینے سے بھی اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق واجب نہیں ہوتا، نیک اعمال پر جو رحمتوں نعمتوں وبرکتوں کے وعدے ہیں وہ سب اس کا فضل ہے، اور جو کوئی نعمت یا مصیبت اور بدحالی انسان کو پہنچ جائے وہ انسان کے اپنے برے اعمال کی وجہ سے ہے۔

البتہ مؤمن اور کافر میں اتنا فرق ہے کہ مسلمان کو جو بھی تکلیف پہنچی ہے اس سے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جس طرح حسنات سے مؤمن کی سیآت معاف ہوجاتی ہیں، اسی طرح پریشانیوں اور بیماریوں وغیرہ سے بھی مؤمن کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، جیسے درخت کے پتے خزاں میں جھڑ جاتے ہیں، آخر میں فرمایا:

﴿وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ آپ ﷺ کا منصبِ عظیم جو کہ پورے جہاں پر محیط ہے، حتیٰ کہ جنات کے لئے بھی، اس آیت میں بیان ہے، دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ﴾ [سبأ:۲۸] (اور ہم نے آپ کو سارے ہی انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے)۔ ایک مقام پر فرمایا: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّھَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا﴾ [الأعراف:۱۵۸] (کہہ دیجئے: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں)۔ یہ بھی فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأنبياء:۱۰۷] (اور ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لئے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

بلاشبہ آپ ﷺ کی بعثت قیامت تک آنے والی تمام مخلوقات انس وجن سب کے لئے ہے، اور آپ ﷺ ربّ العزّت کے آخری رسول ہیں، آپ ﷺ تاجدارِ ختم نبوت کے منصب عالی پر فائز ہیں۔ فَصَلٰوةُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْكَ عَدَدَ ذَرَّاتِ الْمَوْجُوْدَاتِ۔ اگر کوئی بدنصیب آپ ﷺ کی رسالتِ عامہ اور ختمِ نبوت کا منکر ہو تو اس کے انکار سے آپ ﷺ کے منصب رسالت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ ﷺ منکرین کے انکار سے ہرگز

رنجیدہ نہ ہوں، آپ ﷺ کی رسالت پر خالقِ کائنات کا گواہ ہونا کافی ہے۔ ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿٨٠﴾

ترجمہ: جو شخص فرمانبرداری کرے رسول کی، تو اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی، اور جس نے روگردانی کی سو ہم نے آپ کو ان پر نگراں بنا کر نہیں بھیجا ﴿٨٠﴾

معارف ومسائل

شانِ نزول:

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے جب یہ ارشاد فرمایا کہ: مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ اَحَبَّنِیْ فَقَدْ اَحَبَّ اللّٰهَ۔ تو منافقین نے کہا کہ بس جی دیکھو! یہ شخص تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اسے ربّ ہی بنالیں، جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو ربّ بنایا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں یہ بتایا کہ آنحضرت ﷺ کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے، کیونکہ آپ ﷺ جو کچھ حکم دیتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے، پیغام پہنچانے والے کے واسطہ سے جو پیغام پہنچے اور اس پر عمل کیا جائے، وہ پیغام بھیجنے والے ہی کے حکم پر عمل ہوتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا پیغام لانے والا ربّ ہو جائے۔

نصاریٰ نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت ورسالت کے درجے سے آگے بڑھا دیا، ان کو خدا بتادیا، اور خدا کا بیٹا بنادیا، اور انہیں الوہیت کا درجہ دے دیا۔ کہاں نصاریٰ کی جہالت اور حماقت، اور کہاں خاتم الانبیاء ﷺ کی فرمانبرداری واطاعت، دونوں میں زمین وآسمان کا فرق واضح ہے۔

گمراہ فرقوں اور منکرینِ حدیث کا رد:

جو لوگ منکرینِ حدیث ہیں وہی منکرینِ قرآن بھی ہے، اسی لئے وہ دائرہ اسلام سے خارج اور گمراہ ہیں، کیونکہ وہ (العیاذ باللہ) اقوال اور احادیثِ رسول اللہ ﷺ کو حجت نہیں مانتے۔ قرآن کریم تو حضور اکرم ﷺ کے واسطے سے امت تک پہنچا ہے، اور قرآن کریم میں جگہ جگہ اطاعتِ رسول ﷺ کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ [النساء: ٦٤] (اور ہم نے کوئی رسول اور کسی مقصد کے

لئے نہیں بھیجا سوائے اس کے کہ اس کی اطاعت کی جائے)۔اسی طرح: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[الأحزاب:۲۱](اور تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ تھا)۔اسی طرح: ﴿يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾[الأعراف:۱۵۷] (رسول ان کو اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں، ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال، اور گندی چیزیں حرام قرار دیتے ہیں)۔

پس جو گمراہ شخص آپ کے اقوال وافعال کو شرعی حجت نہیں مانے گا، وہ درحقیقت منکرِ قرآن ہی ہوگا۔ بلکہ قرآن مجید نے مزید تاکید کے ساتھ واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بننے کا اصلی ذریعہ اطاعتِ رسول ہی ہے: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾[آل عمران:۳۱] (کہہ دیجئے: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اطاعت کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا)۔ اور ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾[الأحزاب:۷۱] (اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے تو یقیناً بڑی کامیابی کے ساتھ کامیاب ہوا)۔ آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا﴾ جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿فَذَكِّرْ ۣ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ؀ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ؀﴾[الغاشية] (آپ نصیحت کیے جائیں، آپ تو بس نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ کو ان پر زبردستی کرنے کے لئے مسلّط نہیں کیا گیا)۔ آپ کا کام صرف اِبلاغ ہے، اگر کوئی روگردانی کرے، اور آپ کی ہدایت قبول نہ کرے، اور راہِ حق اختیار نہ کرے، تو آپ رنجیدہ نہ ہوں، کسی کے ایمان کے بارے میں آپ جوابدہ نہیں ہیں، اور آپ ﷺ سے باز پرس نہیں ہوگی، آپ ﷺ کے ذمہ صرف اِبلاغ ہے، اور کچھ نہیں۔

❁ ❁ ❁

وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾

ترجمہ: اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا کام بات ماننا ہے، پھر جب آپ کے پاس سے باہر جاتے ہیں تو ان

میں سے کچھ لوگ اس بات کے خلاف کہتے ہیں جو وہ کہہ چکے تھے، اور اللہ تعالیٰ لکھتا ہے جو کچھ وہ راتوں کو مشورہ کرتے ہیں، سو آپ ﷺ ان کی طرف سے اعراض کریں، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کافی ہے، کارساز ہے ﴿۸۱﴾ کیا وہ قرآن کریم میں غور نہیں کرتے؟ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کے پاس سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلاف پاتے ﴿۸۲﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں منافقین کی ایک خصلتِ بد کا بیان ہے۔ یہ وہ بے ایمان قوم ہے کہ ان کی مختلف عاداتِ بد سے مسلمانوں کو آگاہ کیا جارہا ہے، اور وہ یہ کہ جب یہ لوگ آپ کی خدمت گرامی میں حاضر ہوجاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے حکم سے کیسے باہر ہوسکتے ہیں؟ ہمارا کام تو بات ماننا، اور فرمانبرداری ہی کرنا ہے، پھر جب آپ ﷺ کی مجلس سے باہر نکل جاتے ہیں، ان میں سے ایک (یعنی ان کے رؤساء) راتوں کو اس بات کے علاوہ مشورہ کرتے ہیں، جو انہوں نے آپ ﷺ کی مجلس میں کہا تھا، یعنی آپ ﷺ کے ارشادات کے خلاف راتوں کو منصوبے بنا کر چوری چھپکے انہیں انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور عملی جامہ پہناتے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ لکھتا ہے (فرشتے لکھتے ہیں) جو وہ رات کو منصوبہ بناتے، اور مشورے کرتے ہیں۔ آپ ﷺ مطمئن رہیں، یہ اللہ تعالیٰ سے نہ چھپ سکتے ہیں، نہ اس کی گرفت سے بچ سکتے ہیں۔

﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ آپ ﷺ ان سے اعراض فرمائیں، درگزر فرمائیں، ان کے محاسبے میں وقت ضائع نہ کریں، اپنے متعلق امور میں منہمک رہئے، اپنے پروردگار پر بھروسہ کریں، جو کہ آپ کے معاملات کو درست کرنے والا ہے، اور منافقین کا بھی محاسبہ کرنے والا ہے، وہی جل شانہٗ کافی ہے، کام بنانے والا اور آپ کو ہر شر و برائی سے تحفظ دینے والا۔

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾

منافق اور ضعیف الایمان لوگوں کی جس روش پر اوپر کی آیتوں میں تنبیہ کی گئی ہے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انہیں قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے میں شک تھا، انہیں یقین نہ آتا تھا کہ حضرت سرور عالم ﷺ پر واقعی وحی اترتی ہے، اور یہ جو کچھ ہدایات آرہی ہیں براہِ راست اللہ تعالیٰ ہی کے پاس سے آرہی ہیں، اسی لئے ان کی منافقانہ

روش پر ملامت کرنے کے بعد اب فرمایا جارہا ہے کہ یہ لوگ قرآن پر غور ہی نہیں کرتے، ورنہ یہ کلام تو خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا کلام نہیں ہوسکتا۔

کوئی انسان ہرگز اس بات پر قادر نہیں ہے کہ سالہاسال تک وہ مختلف حالات میں مختلف مواقع پر مختلف مضامین ومسائل پر تقریریں کرتا رہے، اور اول سے آخر تک اس کی سالہا سالوں کی ساری تقریریں ایسی ہموار، ایک رنگ، ایک طرز، متناسب مجموعہ بن جائیں جن کا کوئی جزء یا حصہ دوسرے جزء یا حصے سے متصادم نہ ہو، جس میں تبدیلی رائے کا کہیں نشان تک نہ ملے، جس میں متکلم کے نفس کی مختلف کیفیات اپنے مختلف رنگ نہ دکھائیں، اور جس پر کبھی نظر ثانی تک کی ضرورت نہ پیش آئے۔

یہ ہے اصلی بنیادی بات، جس پر غور کرنے کی دعوت ہے، کہ غور کرو اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کا ہوتا تو ضرور اس میں اختلافات بکثرت ہوتے، جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ لوگوں کے کلام میں تعارض، اختلاف، نظم میں تفاوت، عربیت اور لغت، اعراب، وترکیب، فصاحت وبلاغت، صحت وسقم، صحت وفساد، الفاظ، معانی اخبار واقعات، امورِ غیبیہ کی نشانی، عجائبات عالم، علویات سفلیات، مخلوقات وغیرہ بے شمار چیزیں ہیں جن کے بیان کرنے میں دنیا کے نامور صاحب قلم لوگوں کے کلام میں ہزاروں نقائص اور اختلافات نمایاں ہیں۔ جبکہ کلامِ الٰہی کتاب اللہ اس قسم کے حقائق ومسلمات کے بیان کرنے میں پوری طرح سچا اور مبنی برحقیقت ہے۔

جس کتاب نے سارے عالم کے ادباء، وفصحاء وشعراء کو قرآن کریم کی ایک چھوٹی سی سورت کی نظیر ومثال لانے کی چیلنج دی ہوئی ہے، جس سے قیام قیامت تک دنیائے کفر نہ جان چھڑا سکتی ہے، اور نہ ہی مثال پیش کرنے پر قادر ہے سوائے عجز ودرماندگی کے۔

قرآن کریم میں تدبر کرنے کے اہل کون ہیں؟

آیت کریمہ میں تدبر فی القرآن کی دعوت دی گئی ہے، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے علم وفہم دیا ہے وہ قرآن میں تدبر کریں، ہر شخص اپنے اپنے فہم اور استعداد کے مطابق تدبر کرسکتا ہے، اور جہاں کہیں کچھ سمجھ میں نہ آئے، یا کوئی اشکال پیدا ہو، تو اہلِ علم سے رجوع کرے۔ اہلِ فہم کے درجات مختلف ہیں، اور تدبر کی صورتیں بھی مختلف ہیں۔ معانی میں تدبر، نظم وعبارت میں تدبر، حقائق ومعارف کی تلاش، مسائل واحکام کا استنباط، فصاحت وبلاغت کا تعین اور نشاندہی، طرزِ بیان کی خوبیوں کی تلاش، یہ سب تدبر میں آتے ہیں۔

ائمہ مجتہدین حضرات نے خوب تدبر کیا، بے شمار مسائل کا استنباط کیا، معارف وحقائق کو سمجھا۔ اسی طرح ہر طبقہ کے علماء نے اپنے اپنے فن کے لحاظ سے تدبر کیا، اور علمی وفنی مسائل کا اثبات کیا۔ کچھ صوفیاء کرام نے باطنی علوم و معارف کا اضافہ کیا۔

الغرض اس بے کراں سمندر کے علوم ومعارف میں امام غزالی وامام رازی رحمۃ اللہ علیہما سے لے کر آج تک مسلسل اہلِ علم ومعرفت کے تدبر کا سلسلہ جاری ہے، اور ہر زمانہ میں نئے نئے جدید علمی، ادبی، اخلاقی، شرعی مسائل کا بدستور اضافہ ہوتا جارہا ہے، مگر قرآن حکیم کے عجائبات کا احاطہ نہ ہوسکا ہے، اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے۔

تفاسیر وتراجم وحواشی قرآن مجید پر زمانہ نزول سے آج تک جو لکھے گئے ہیں، وہ تقریباً تین لاکھ کے قریب ہیں، اور ایسی تفاسیر بھی ہیں جو ہزاروں جلدوں میں ہیں، اور ہر جلد ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ [مقالات افغاني، تاريخ بغداد]

ہمارے موجودہ عصری علوم کے پروفیسر واسکالروں نے حق نمک (یورپ کا) ادا کرتے ہوئے اس میدانِ تدبر میں بغیر محنت وخواری، علوم عربیت سے ناواقف، لغتِ عرب کے اسرار سے جاہل، اور علم حدیث وعلم فقہ سے نابلد، معانی، بدیع، بیان، صرف، نحو، ترکیب، ودیگر علوم سے ناواقف تدبر کے میدان میں اتر کر کہتے ہیں کہ قرآن کریم سب کے لئے ہے، کسی خاص طبقہ کے لئے نہیں ہے، اس میں سارے لوگوں کے مساوی حقوق ہیں، پھر یہ کیا بات ہے کہ قرآن کریم پر صرف مولویوں کی اجارہ داری ہے؟ وہی جو کچھ لکھتے یا کہتے اور تشریح کرتے ہیں وہی قرآن کا مطلب اور مقصد ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم بھی بحیثیتِ مسلمان ودانشور حق رکھتے ہیں کہ اپنے علم وفہم واستعداد کی روشنی میں قرآن کریم کی تفسیر اور تشریح کرسکیں، اور ضروری افکار ومسائل کا استنباط کرکے ماضی کے مفسرین کے علوم میں اضافہ کریں...... ماشاء اللہ! بہت ہی اچھا نظریہ، اور عمدہ خیال ہے، مگر ۔

تو نہ دیدی گہے سلیمان را ☆ پس چہ دانی زبانِ مرغان را

جن لوگوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہیں دیکھا، ان کی محفل میں نہیں رہے، ان کے ملفوظات نہیں سنے، یہ بیچارے کیا جانتے ہوں گے کہ منطق الطیر کیا ہے، پرندوں کی بولی کیا ہوتی ہے؟ یہ پروفیسروں، اردو دانوں اور انگریزی دانوں کا کیسا بے ڈھنگ سوال ہے؟

جب شعبۂ علاج پر ڈاکٹروں کا قبضہ ہے، اور قانون کے شعبے پر قانون دانوں کا قبضہ ہے، اور انجنیئر نگ

کے کاموں پر انجنیئروں کا قبضہ ہے، سکولوں کالجوں پر ماسٹروں اور پروفیسروں کا قبضہ ہے، تو قرآن کریم کے مقاصد، علوم و معارف اور مفاہیم پر علماء کرام کا کیوں قبضہ نہ ہوگا؟

شاید کسی کے ذہن میں یہ بات نہ ہو، تو عرض ہے کہ جس طرح قانون، ڈاکٹری انجنیئرنگ کی تعلیم کے بغیر اگر کوئی ڈاکٹر اور وکیل اور انجنیئر نہیں بن سکتا، تو قرآنی علومِ ضروریہ کی تحصیل کے بغیر کوئی مفسر اور قرآن داں بھی تو نہیں بن سکتا۔ پس اگر کوئی میڈیکل کی تعلیم کے بغیر ڈاکٹری شروع کرے گا، تو مریضوں کا جو حشر ہوگا وہ واضح ہے۔

اسی طرح اگر چودہ علوم کی تحصیل کے بغیر کوئی قرآن کے مقاصد بیان کرنے کا شوقی ہوگا، تو وہ اپنے دونوں جہانوں کا بیڑا غرق کرے گا، نہ ادھر کا رہے گا نہ ادھر کا، دونوں جہاں تباہ ہوں گے۔

غلام محمد پرویز جیسے ملحدوں نے اس میدان میں اتر کر ایک بڑے انگریزی داں طبقے کو اسلام سے منحرف کیا، خود بھی جہنمی ہوا، اور ہزاروں تعلیم یافتہ لوگوں کو دوزخی بنادیا۔ دنیائے اسلام کے دس ہزار سے زائد محقق علماء کرام نے اس کے کفر پر فتویٰ دے کر اپنا حق ادا کیا۔

یہ ایک کھلی بات ہے کہ جو بھی آدمی کسی فن کی کتاب پڑھتا ہے، مثلاً طب یا حساب کی کتاب، تو ضرور بالضرور اس کے معانی اور مطالب کو اچھی طرح سمجھنے، اور جاننے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب قرآن حکیم کے معانی و مطالب حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معلوم نہ کئے ہوں؟ حالانکہ قرآن حکیم کو نجات کا ذریعہ اور دونوں عالم کی صلاح و فلاح کا وسیلہ سمجھتے تھے۔

قرآنی علوم میں بحث کرنے والے، اور حواشی و تفسیر اور مقاصد قرآنی پر تحقیق کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن کریم ہی میں تلاش کرے (تفسیر القرآن بالقرآن) کیونکہ قرآن حکیم میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آیت کریمہ کی توضیح و تفسیر دوسری آیات میں مل جاتی ہے۔ اگر کسی آیت کی تفسیر قرآن حکیم میں نہ ملے تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مطہرہ احادیث میں تلاش کرے، کیونکہ سنت مطہرہ، احادیث نبویہ علی صاحبھا آلاف الصلوۃ والتسلیمات قرآن مجید کی مستند اور معتمد و برحق مفسر اور بہترین شارح ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ جس ذات گرامی پر قرآن پاک کا نزول ہوا، اس نے جو قرآن حکیم کی تفسیر کی ہو وہ سراسر حقیقی اور برحق تفسیر ہوگی، اور اس کے خلاف جو بھی شخص تفسیر کرے گا وہ شخص اور اس کی تفسیر مردود اور ابلیسی تفسیر ہوگی۔ ارشاد ہے: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ﴾ [النساء: ۱۰۵] (بیشک ہم نے

حق پر مشتمل کتاب آپ پر اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس طریقے کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو سمجھا دیا ہے)۔اسی طرح: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝١٧ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝١٨ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝١٩﴾ [القيامة] (یقیناً اس کو یاد کرانا اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں۔ پھر اس کی وضاحت ہماری ذمہ داری ہے)۔ یہ ہے (تفسير القرآن بالحديث)۔

اگر کسی آیت کی تفسیر حدیث شریف میں بھی نہ ملے، تو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال کی طرف رجوع کرے، کیونکہ ان حضرات کو براہِ راست بلاواسطہ اکتسابِ فیض کی سعادت وشرف حاصل رہے۔ اسی چیز نے تو انہیں صدیقیت کے اونچے مقام پر پہنچایا، اور انہوں نے رحمۃ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے بالمشافہہ وحی الٰہی کے اسرار و رموز سیکھے۔ اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد پوری امت کے خادم ومحسن اور بڑے صاحبِ علم اور عمل کے شہسوار رہے۔ یہ سارے حضرات نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے، اور ان تمام قرائن واحوال سے باخبر تھے جو نزولِ قرآن کے وقت سامنے آتے رہتے تھے۔

پھر رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کی برکت سے علمِ صحیح، فہمِ کامل اور عملِ صالح کی دولت سے مالا مال تھے۔ سید کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن حکیم کے الفاظ اور قراءت سکھاتے تھے، اسی طرح قرآن کریم کے علوم ومعارف اور معانی ومطالب بھی بیان فرماتے تھے۔ چنانچہ ابوعبدالرحمن سلمی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب ہم سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے دس آیات سیکھتے تھے تو جب تک ان سے متعلقہ علم وعمل کو نہ جان لیتے تھے، دوسرے سبق کے لئے آگے نہ بڑھتے تھے۔ قرآن اور قرآن کا علم وعمل ہم نے سب ساتھ ساتھ سیکھا ہے، اسی بنیاد پر تیسرا مقام یہ مقرر ہوا (تفسير القرآن بأقوال الصحابة رضی اللہ عنہم) پھر بڑے بڑے تابعین حضرات کا مقام وتفسیر کا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن وحدیث اور تفسیر صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین پر جسے عبور نہ ہو، ایسا شخص محض عربی دانی کے زور پر جو قرآن حکیم کی حکمت اور علوم ومعارف سمجھنے کی کوشش کرے گا، وہ ضرور گمراہ ہو جائے گا، اور امت کو گمراہ کرے گا۔

قرآن کریم کے صحیح مطالب واضح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ عقیدہ اور عمل درست ہو، یعنی سرور عالم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو جن عقائد واعمال پر ڈالا تھا، ان کا پابند ہو، فسق وفجور اور الحاد وزندقہ سے پاک ہو، قرآن پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہو، اس کی نیت قرآن کو اپنے نظریہ اور خودساختہ معنی پر چپکانے کی نہ ہو۔ قرآن مجید میں اہلِ شرک و بدعت کی طرح تحریفِ معنوی کا قائل نہ ہو۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

ترجمہ: اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آجاتی ہے تو اسے مشہور کردیتے ہیں، اور اگر اس خبر کو پہنچادیتے رسول اللہ کی طرف، اور ان لوگوں کی طرف جو ان میں سے فہم رکھنے والے ہیں، تو ان میں جو ایسے حضرات ہیں جو اس سے استخراج کرلیتے ہیں، وہ اس کو جان لیتے، اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیرو ہوجاتے، سوائے چند آدمیوں کے ۝

معارف ومنازل

بلاتحقیق باتوں کی تشہیر کرنا، اور اہلِ علم وذمہ داروں کے مشورے پر عمل نہ کرنا، یا سرے سے ان تک کوئی بات پہنچائے بغیر اس کی تشہیر کرنا، جس کے فوائد محدود اور نقصانات بہت زیادہ ہوتے ہیں، خاص کر ہنگامی حالات میں جب ماحول پرسکون نہ ہو، جیسے کہ غزوۂ احد کے موقع پر ابلیسی کارندوں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی افواہ اڑا کر مسلمانوں کو کمزور کردیا، یا یہ کہ کچھ ناداں لوگوں نے افواہ اڑا کر کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے، جس سے سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پریشان ہوئے، حالانکہ وہ طلاق کا مسئلہ نہ تھا، ایلاء کا مسئلہ تھا، بلکہ لوگ ایلاء سے اکثر بے خبر تھے، اسے جانتے ہی نہیں تھے، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معلوم کرکے اس کی وضاحت کی، اور لوگوں کو بتا کر مطمئن کردیا۔

بہرحال آیت کریمہ نے ایسے ہنگامہ خیز حالات میں خصوصاً، اور عمومی حالات میں عموماً اس بات کی ہدایت دی ہے کہ اگر کوئی امن وسلامتی (فتح وغنیمت) کی خبر ہو، یا خوف (یعنی قتل وہزیمت) کی خبر ہو، تو اسے بلا تحقیق وتجزیہ

شہرت مت دو۔ اگر اس خبر کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے جاتے، یا ان لوگوں کے پاس جو صاحب رائے اور دانشمند ہیں، پھر وہ تحقیق کرتے، اور صورتِ حال معلوم کر کے اپنی صوابدید پر فیصلہ کرتے، کہ اس خبر کی تشہیر کرنے میں کیا فوائد اور نقصانات ہو سکتے ہیں، اور عدمِ تشہیر کے فوائد ونقصانات کا اندازہ بھی لگالیتے، پھر کوئی فیصلہ صادر فرماتے، تو بہت ہی بہتر ہوتا، اور ہر قسم کی پریشانیوں کا سدِ باب ہو جاتا۔ چاہئے کہ آئندہ اسی ضابطہ پر کار بند رہو، اور عمل کرو۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، یا اہلِ علم واصحابِ عقل ودانش کے پاس جانے اور بات پہنچانے کا مطلب واضح ہے کہ وہ ہر طرح کی باتوں کو سمجھتے ہیں، نفع ونقصان سے باخبر رہتے ہیں، ہر بات کی گہرائی میں اترتے ہیں، جو چیز چھپانے کی ہوا سے چھپاتے ہیں، اور جو چیز آگے بڑھانے اور ظاہر کرنے کی ہو اس کو ظاہر کرتے ہیں۔

چونکہ منافق اور یہود مسلمانوں کے دشمن تھے، اور وہ کبھی مسلمانوں کی فتح ونصرت اور خوشی کو برداشت نہیں کرتے تھے، ادھر سے کچھ سادہ لوح اور ناداں مسلمان بھی ان کے ساتھ غیر شعوری طور پر مل کر صاف ستھری فضاء کو مکدر کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس لئے مسلمانوں کو آئندہ کے لئے خبردار کیا گیا، اور بتایا گیا واضح ہو کہ اس قسم کے واقعات، سچی اور جھوٹی باتوں کی قبل از وقت تشہیر صرف زمانۂ نبوت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، آج بھی مسلمانوں کو چاہئے کہ اس قرآنی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس قسم کی باتوں سے اجتناب کریں، خصوصاً ہنگامی حالات میں، جیسے ارشاد ہے: ﴿اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِيۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَهَالَةٍ﴾ [الحجرات:۶] (اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے، تو اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا بیٹھو)۔

اگر کوئی ایسی خبر پہنچے جسے غیر ذمہ دار لوگوں نے بیان کیا ہو، تو خوب تحقیق کرو، کہیں نادانی اور جہالت کی وجہ سے کوئی نقصان نہ اٹھا بیٹھو۔ اسی طرح سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کے لئے بھی ہدایت جاری فرمائی، جو کسی بات کو سن کر بغیر تحقیق اس کی تشہیر کرنے لگتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے لوگوں کو جھوٹا قرار دیدیا، اور فرمایا: كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔ [مسلم] یعنی کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق وچھان بین کے آگے چلادے، ورنہ کسی غلط فہمی یا غلط خبر کی وجہ سے بڑے سے بڑے ناقابلِ ناقابلِ برداشت نقصان کا اندیشہ ہے، اور دنیاوی تاریخ اس قسم کے مالی، جانی اور دیگر قسم کے واقعات سے پڑی ہے، جہاں ایک ادنیٰ غلط افواہ نے قوموں کو تہہ بالا کر کے وہ نقصان پہنچایا جس کی صدیوں تک تلافی ممکن نہ ہو۔

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، تو تم شیطان کے پیرو ہو جاتے، سوائے چند آدمیوں کے۔

جاننا چاہئے کہ اسلام، ایمان، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قرآن حکیم یہ سارے اللہ تعالیٰ سبحانہ کے فضل وکرم اور رحمتِ خاصہ ہیں، پس ہر مسلمان پر فرض ہے کہ اگر وہ توحید ورسالت پر ایمان رکھتا ہے حسب توفیق نیک اعمال انجام دیتا ہے، ایک ضروری مقدار میں معاصی سے بچتا رہتا ہے، وہ یہ سمجھے کہ میرا کمال وہنر اور سعی وکوشش کی وجہ سے یہ ہرگز نہیں، بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا فضل اور کرم ورحمت اور اس کی نگاہِ لطف وعنایت کا ثمرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک ایک ذرہ برابر انعامات کا شکر بجالانا چاہئے، اور ہر وقت اس کے فضل ورحمت کی اس سے درخواست کرنی چاہئے۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

ترجمہ: سو آپ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کیجئے، آپ مکلّف نہیں ہیں، مگر اپنی جان کے، اور ایمان والوں کو ترغیب دیجئے، عنقریب اللہ تعالیٰ کافروں کے زور کو روک دے گا، اور اللہ تعالیٰ بہت سخت ہے زور کے اعتبار سے، اور بہت سخت ہے سزا دینے کے اعتبار سے ﴿۸۴﴾

معارف ومنازل

غزوۂ احد کے موقع پر تفصیل گزر چکی۔ اس آیت کریمہ میں تقریباً دوبارہ اسی طرف اشارہ ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ احد کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو سفیان سے (جو مشرکین کی فوج کا سپہ سالار تھا) وعدہ فرمایا تھا کہ ماہ ذیقعدہ میں بدر کے موقع پر پھر جنگ ہوگی۔ وعدہ کے مطابق جنگ کے لئے پیشقدمی کرنے کی ضرورت ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چلنے کے لئے دعوت دی، اس پر بعض لوگوں کو ناگوار ہوا، اس پر آیت نازل ہوئی، جس میں یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں آپ جنگ کریں، اگر کوئی ساتھ نہ دے تب بھی آپ جہاد نہ چھوڑیں، آپ صرف اپنی جان کے مکلّف ہیں، اپنی جان کے ساتھ میدان میں حاضر ہو جائیں، اللہ تعالیٰ کا آپ سے نصرت کا وعدہ ہے۔ اور مؤمنین کو جہاد کی ترغیب دیتے رہیں، اور اس کا ثواب بتاتے رہیں، جو ساتھ چلے گا وہ ثواب

پالے گا۔

اس پر سید الانبیاء ﷺ ستر سواروں کو لے کر نکلے، اور وہاں پہنچے، ابو سفیان نہیں آئے، اور جنگ کی نوبت پیش نہیں آئی۔ کافر خوفزدہ ہو کر نہیں آئے، اللہ تعالیٰ شانہ نے وعدہ فرمایا کہ عنقریب اللہ تعالیٰ کافروں کے زور کو روک دے گا، اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ زور والا ہے۔ دنیا میں جب اہلِ ایمان کی نصرت فرمائے تو ان پر کوئی غالب ہونے والا نہیں، اور دنیا و آخرت میں وہ بہت سخت عذاب دینے والا بھی ہے، اس جیسا کوئی عذاب دینے والا نہیں ہے۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

ترجمہ: جو کوئی شخص اچھی سفارش کرے اسے اس میں سے حصہ ملے گا، اور جو شخص بری سفارش کرے اس کو اس میں حصہ ملے گا، اور ہر چیز پر اللہ تعالیٰ قدرت رکھنے والا ہے ﴿۸۵﴾

معارف ومنازل

مسلمان اکثر ایک دوسرے کو جہاد کی ترغیب دیتے تھے، یہ اچھی سفارش کی مثال ہے، جبکہ منافق لوگوں کو جہاد سے منع کر کے روکتے تھے، یہ بری سفارش کہلاتی ہے، جو کہ گناہ اور جرم ہے۔ آیت کریمہ مذکورہ دونوں جائز و ناجائز سفارشوں کے بیان میں ہے۔

آیت کریمہ میں جائز سفارش کی ترغیب ہے، اور اس پر ثواب کا وعدہ ہے، اور ناجائز سفارش پر گناہ اور وعید کا بیان ہے۔ جب کسی کا کوئی مطلوب و مقصود جائز اور اچھا ہو تو اس کی سفارش کر دینا ثواب کا کام ہے، بشرطیکہ اس کارِ خیر اور سفارش میں کسی دوسرے حقدار مسلمان کی حق تلفی نہ ہو۔ سفارش سے صاحبِ ضرورت کا کام بن جائے گا، اور سفارش کرنے والے کو ثواب مل جائے گا، کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی بات پوری طرح دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے، اور بات کو صحیح طور و طریقے پر نہیں کہہ سکتے، انہیں مَافِي الضمير کے اظہار پر قدرت نہیں ہوتی، اس لئے ان کی سفارش موجبِ اجر و ثواب ہے۔

دوئم یہ کہ بعض لوگ اپنے علم وفہم عقل وسوچ کی بنیاد پر إظهار مافي الضمير پر قدرت رکھتے ہیں، اور اپنی بات بخوبی لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں، لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں کام ہے ان تک نہیں پہنچ سکتے، اور نہیں منوا سکتے، جہاں دنیوی مراسم وشناخت وغیرہ کا فقدان ہوتا ہے۔ پس دونوں قسم کے لوگوں کے لئے سفارش کردی جائے تو یہ بہت مبارک اور کارِثواب ہے، ضروری نہیں کہ جس کی سفارش کی جائے اس کا کام ہو ہی جائے، مگر سفارش کرنے والے کو سفارش کا ثواب ہر حال میں ضرور مل جائے گا، کیونکہ اس نے اپنا حق ادا ہی تو کرلیا۔ سرورِ عالم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب فرما کر یہ ترغیب دی: اِشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَيَقْضِيَ اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ رَسُوْلِهٖ مَاشَاءَ۔ [رواه البخاري] یعنی جب میری مجلس میں کوئی حاجتمند حاضر ہو جائے، اور اس کا کوئی ضروری سوال یا حاجت ہو، اور وہ مجھ سے اپنا مطلب پورا کرنا چاہتا ہو، تو تم لوگ اس کی سفارش وشفاعت کرو، اس کے اجر وثواب کو حاصل کرو، ممکن ہے تمہاری سفارش سے اللہ تعالیٰ میری زبان پر اس کی حاجت برآری کا فیصلہ صادر فرمادے۔

مطلب یہ ہے کہ تم سفارش کر کے ثواب حاصل کرو، جس کی سفارش میرے پاس لاؤ گے اس کا پورا ہونا نہ ہونا یہ دوسری بات ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی تو میرے ذریعہ سے کام ہو جائے گا، اگر اس کا کام نہ ہوا تب بھی تمہارا ثواب کہیں نہیں گیا۔

شمائل ترمذی میں ہے کہ آنحضرت سید عالم ﷺ نے فرمایا: وَاَبْلِغُوْنِيْ حَاجَةَ مَنْ لَّايَسْتَطِيْعُ اِبْلَاغَهَا فَاِنَّهٗ مَنْ اَبْلَغَ سُلْطَانًا حَاجَةَ مَنْ لَّايَسْتَطِيْعُ اِبْلَاغَهَا ثَبَّتَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَدَمَيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ یعنی تم اس شخص کی حاجت مجھ تک پہنچایا کرو جو خود اپنی حاجت نہیں پہنچا سکتا، کیونکہ جو شخص کسی صاحبِ اقتدار کو کسی ایسے شخص کی حاجت پہنچادے جو خود اپنی حاجت نہیں پہنچا سکتا تو اللہ تعالیٰ شانہ قیامت کے دن اس کو ثابت قدم رکھے گا۔ جس طرح اچھی سفارش کرنے پر ثواب ہے اسی طرح بُری سفارش کرنے پر گرفت ہے، اور بُری سفارش کرنا گناہ ہے۔

کوئی شخص کسی گناہ کے کام میں لگنا چاہتا ہے، کسی ایسے محکمہ میں ملازمت چاہتا ہے جو شرعاً حرام ہے، سود یا قمار کا کاروبار کرنا چاہتا ہے، حرام چیزیں بیچنے کے لئے دکان لگانے کا ارادہ کرتا ہے، تو ایسے شخص کے لئے سفارش کرنا ہے، اور یہ شفاعت سیئۃ، یعنی بُری سفارش ہے۔

بہت سے لوگ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ ہمارا عزیز رشتہ دار ہے، یا ہمارے دوست کا آدمی ہے تو سفارش کرتے ہیں، اور یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ کس مقصد اور کس عمل کے لئے سفارش کر رہا ہوں، یہ مقصد حلال ہے، یا حرام، ثواب ہے یا

گناہ؟ گناہ کی سفارش کر کے گناہ میں شریک ہوجاتے ہیں، جس کے لئے سفارش کی ہے وہ جب تک گناہ کا کام کرتا رہے گا، یا کسی سودی کاروبار کی ملازمت پر رہے گا (جیسے بینکوں کی ملازمت) اوراس کے زیر اثر جولوگ گناہ کریں گے، ان سب کے گناہ میں سفارش کرنے والے کی شرکت رہے گی۔

بہت سارے لوگ قیامت کے دن اسی گناہ کے عذاب میں ڈوب کر غرق ہوجائیں گے۔ روزِ قیامت کے حساب وکتاب پر ایمان رکھتے ہوئے لاپرواہی، لاشعوری، کبروغرور کی بنیاد پر سفارش کرنے والوں کے لئے نہایت خطرناک انجام کا پیغام ہے، پس احتیاط لازم ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے کسی حد کے بارے میں جس کسی کی شفاعت حائل ہوگئی تو اس نے اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کیا، اور باطل کے بارے میں جھگڑا کیا ،حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ باطل ہے، تو وہ برابر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں رہے گا۔ جب تک باز نہ آجائے ،اور جس کسی نے کسی مؤمن کے بارے میں ایسی بات کہی جو اس میں نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخیوں کے جسموں سے نکلنے والے خون، پیپ میں ٹھہرادے گا، یہاں تک وہ اپنی کہی ہوئی بات سے نکل جائے۔ [رواہ أحمد، أبو داؤد، مشکوۃ]

ضروری فائدہ:

اللہ تعالیٰ شانہ نے جرائم کی جو حدود مقرر فرمائی ہیں، ان کے رکوانے کے لئے سفارش کرنا حرام ہے۔ بنی مخزوم قریش کی ایک عورت نے چوری کر لی تھی، قریش نے چاہا کہ اس کا ہاتھ نہ کٹے، انہوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو سفارش کے لئے آمادہ کیا، جب وہ سفارش کرنے لگے تو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَتَشْفَعُ فِیْ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ؟ (کیا تم اتنے جری ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟)۔

پھر آپ نے کھڑے ہوکر خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی لئے ہلاک ہوگئے کہ کوئی اونچے خاندان کا فرد چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے، معاف کرتے تھے، اور اگر کمزور شخص چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی چوری کرتیں (اَعَاذَھَا اللّٰہُ تَعَالٰی) تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ [بخاري]

اس مخزومی عورت کا نام بھی فاطمہ تھا، چنانچہ اس پر حد سرقہ جاری فرمایا، اوراس کا ہاتھ کٹوادیا۔ پھر اس عورت نے تائب ہوکر صداقت وطہارت اور پرہیزگاری اختیار کی، اوراپنے ہر مقصد وحاجت کے لئے حضرت عائشہ صدیقہ

رضی اللہ عنہا کے پاس آتی تھی، اور آپ رضی اللہ عنہا اس کی حاجت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش فرماتیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حاجت برآری کا حکم فرماتے، اور وہ خوش ہو کر چلی جاتی۔

مسئلہ:

سفارش کرنے والے، یا جس سے سفارش کی گئی دونوں کے لئے فدیہ لینا یا ہدیہ لینا، یا کوئی اور مطالبہ کرنا حرام ہے، اور رشوت میں شمار ہے۔

مسئلہ:

سفارش میں محض رضائے الٰہی مطلوب ہو، نہ اور کچھ۔ دوئم زبردستی واجبار نہ ہو، جو کہ حرام ہے۔ سوئم جس سے سفارش کرنی ہو اس کی صوابدید پر اسے چھوڑ دیا جائے۔ چہارم اس شخص پر سفارش قبول کرنا فرض نہیں ہے، کیونکہ بسا اوقات وہ بھی مجبور ہوتا ہے۔ پنجم سفارش قبول نہ کرنے پر اس سے ناراض ہونا یا انتقام لینا ہرگز جائز نہیں، وغیرہ۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا﴾ لفظ "مقیت" چار معنوں میں مستعمل ہے، یہاں چاروں معنی مراد لئے جا سکتے ہیں، جو کہ سب صحیح ہیں:

پہلا معنی "اَلْقَادِرُ"، دوئم "اَلْحَافِظُ"، سوئم "اَلشَّاهِدُ"، چہارم "اَلرَّازِقُ"۔ تو یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ شانہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، ہر چیز کا محافظ و نگہبان بھی ہے، اور ہر چیز پر مطلع و آگاہ بھی ہے، اور سب کا رازق و روزی رساں بھی ہے۔

وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾

ترجمہ: اور جب تمہیں کسی تحیہ کے ذریعہ دعا دی جائے تو تم اس سے اچھی اور بہتر دعا دے دو، یا اسی کو لوٹا دو، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے ﴿۸۶﴾

معارف و منازل

"اَلسَّلَامُ" اسماء حسنیٰ کی فہرست میں چھٹے نمبر پر بابرکت اسم ہے، جس کے طفیل اور برکت سے دنیا و آخرت دونوں میں سعادتوں کی بارش ہوگی، پھر دنیا میں جس کثرت کے ساتھ سلام و تحیہ کا عام معمول ہے، اور علماء نے اسے

شعائرِ اسلام میں شمار کیا ہوا ہے، جنت میں ابتدائی دخول سے سلاموں کا جو سلسلہ شروع ہوگا، وہ بھی کبھی ختم نہیں ہوگا۔ نماز کے اختتام پر، التحیات کے اندر درود شریف کے اندر، مکاتیب و رسائل اور کتابوں کے شروع میں، اور بار بار ملاقاتوں میں بکثرت سلام کا استعمال اس کی اہمیت و برکت پر واضح دلیل و علامت ہے۔

سلام کی ابتداء:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، اور اس کے اندر روح پھونک دی، تو ان کو چھینک آئی، انہوں نے **الحمدللہ** کہا، ربّ العزّت سبحانہ نے انہیں **یرحمک اللہ** کا تحفہ عطا فرمایا، کچھ فاصلہ پر فرشتے بیٹھے ہوئے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے پاس جانے اور **سلام علیکم** کہنے کا حکم ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں السلام علیکم کا تحفہ پیش کیا، فرشتوں نے اس کے جواب میں **علیک السلام ورحمۃ اللہ** کہا، پھر وہ واپس آئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلاشبہ یہ تحیہ ہے، تمہارا اور آپس میں تمہارے بیٹوں کا۔ [ترمذي، مشكوٰة]

جب سے حضرت آدم علیہ السلام کا زمین پر نزول ہوا ہے، اسی وقت سے قیامِ قیامت، بلکہ دخولِ جنت اور جنتی زندگی میں **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ** کا سلسلہ بطورِ خوشی و شفقت اور بارادۂ محبت و دوستی جاری رہے گا۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ: لفظ "السلام" اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے، اور **السلام علیکم** کے معنی یہ ہیں کہ: اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے، پس اسی معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ ایک عبادت بھی ہے (اور ادائیگی حق بھی ہے) اور اپنے بھائی مسلمان کے لئے دعا بھی ہے، اور اس میں اس بات کا اظہار بھی ہے کہ آپ میرے ہاتھ اور زبان سے محفوظ و سلامت بھی ہو۔ اس کے جواب میں دوسرا شخص بھی اسی عقیدت و احترام کا اظہار کرتا ہے۔

امام سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سلام کہنے والا گویا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون رہو، پس معلوم ہوا کہ اس مبارک کلمہ اور اس کے استعمال کے فوائد بہت سے ہیں، مثلاً:

(۱) اس میں ذکر اللہ تعالیٰ کا اظہار ہے۔ (۲) بھائی کے لئے دعاء ہے۔ (۳) اس کے لئے اعلان ہے کہ مجھ سے خوف نہ کرو۔ (۴) مسلمان بھائی کے لئے یہ محبت کا پیغام ہے۔ (۵) تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت پر عمل ہے۔ (۶) یہ اسلامی شعار اور علامتِ ایمان میں سے ہے۔ (۷) سلام ایک مستقل عبادت ہے۔ (۸) اس کی کثرت باعثِ

کثرتِ ثواب ہے۔ (۹) نیک اور صالحین کی خصلت ہے۔ (۱۰) اس کے کلمات کی کثرت پر الحسنة بعشر أمثالها کا وعدہ ہے، وغیرہ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہوسکتے جب تک مکمل مؤمن نہ ہو، اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو، میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کرلو تو تمہارے آپس میں محبت قائم ہوجائے گی، وہ یہ کہ آپس میں سلام کو عام کرو، یعنی ہر مسلمان کے لئے، خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔ [مسلم]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے افضل کونسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگوں کو کھانا کھلاؤ، اور سلام کو عام کرو، خواہ تم ان کو پہچانتے ہو یا نہیں پہچانتے ہو۔ [متفق عليه]

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں سبقت کرے۔ [أحمد، ترمذي، أبو داؤد]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بڑا بخیل وہ آدمی ہے جو سلام میں بخل کرے۔ [طبراني في الكبير]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روزانہ صبح وشام مدینہ منورہ کے بازار جایا کرتے تھے، کوئی خرید وفروخت مقصد نہیں ہوتا تھا، محض مسلمانوں کو کثرت سے سلام کرنے کی خاطر، اور جب تک تین سو آدمیوں کو سلام نہیں کرتے واپس گھر نہیں لوٹتے، اور اس عمل کا بہت ہی بڑا ثواب بیان کرتے تھے۔ [موطأ وغيره]

سلام کا طریقہ:

دنیا کی مختلف اقوام میں سلام کا کوئی شرعی طریقہ مسنونہ کا رواج نہیں ہے، لیکن دینِ الٰہی اسلام میں جو سلام کے الفاظ مشروع کئے گئے ہیں، ان سے بڑھ کر کسی کے یہاں کوئی ایسا کلمہ مروج نہیں جیسے السلام علیکم ورحمة الله وبركاته کے مبارک کلمات ہیں۔ ان کلمات میں اظہارِ محبت بھی ہے، اور حصولِ اجر وثواب بھی، اور اللہ تعالیٰ سے دعاء بھی ہے، کہ آپ کو اللہ تعالیٰ ہر قسم کے مصائب وآفات سے محفوظ رکھے۔ پس چاہئے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ سلام کی اشاعت کریں، اور اس پر عمل پیرا رہیں، غیر مسلم یا ایامِ جاہلیت کے ہر طرح کے رواج سے پرہیز

کریں۔

جولوگ جہالت کی وجہ سے یا غیر مسلموں کوخوش کرنے، یا برائے نام روشن خیالی کی بنیاد پر ملاقات کے وقت انگریزوں کے طریقے پر گڈ مورننگ وغیرہ کہتے ہیں، یا بے حس عربوں کے رواج کے مطابق "صَباحُ الْخَیر" یا "مَسَاءُ الْخَیر" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، اس سے پرہیز لازم ہے۔

کثرتِ سلام کے فوائد:

اسلام میں سلام کی کثرت واشاعت بہت مرغوب ومحبوب ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں بیان ہوا، اور حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت ابن عمر کے عمل اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہم کی روایتوں سے معلوم ہوا کہ سلام کا پھیلانا، اور ملاقات کے وقت ایک دوسرے کوسلام کرنا ایمان واخوت اسلامی کی بنیاد پر ہے، جان پہچان کی بنیاد پر نہیں ہے۔

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جوحقوق ہیں ان کو بیان فرماتے ہوئے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کے مؤمن پر چھ حقوق ہیں:

(۱) اگر بیمار ہوتو اس کی عیادت کرے۔ (۲) مرجائے تو جنازہ میں شرکت کرے۔ (۳) دعوت کرے تو قبول کرے (بشرطیکہ غیر شرعی نہ ہو)۔ (۴) ملاقات کے وقت سلام کرے۔ (۵) اس کو چھینک آجائے تو یَرْحَمُکَ اللہ کی تشمیت کرے یعنی دعا دیدے۔ (۶) حاضر وغائب اس کی خیرخواہی کرے۔ [نسائي، ترمذي، دارمي عن علي وأبي هريرة رضي الله عنهما]

پھر جس طرح سلام کرنا حقوقِ مسلم میں سے ہے، اسی طرح سلام کا جواب دینا بھی حقوقِ مسلم میں سے ہے، مگر اتنا فرق ہے کہ سلام کرنا سنت ہے، اور سلام کا جواب دینا فرض ہے۔ اور یہ ان چند چیزوں میں سے ہے جن میں سنت کا ثواب واجب سے زیادہ ہے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلْبَادِئُ بِالسَّلَامِ بَرِیْءٌ مِنَ الْکِبْرِ۔ یعنی جو شخص خود سے ابتداء سلام کرلے وہ تکبر سے بری ہے۔ [مشکوۃ] کیونکہ غرور والے لوگ عام غریبوں پر سلام نہیں کرتے، اور اگر غریب ان کوسلام کرے تو جواب ہی نہیں دیتے۔

آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص تمہیں سلام کرے، توتم اس کے سلام کا اس سے بہتر جواب دو، یا کم ازکم جواب میں اس قدر الفاظ کہہ دو جتنے الفاظ سلام کرنے والے کہتے ہیں۔ اگر کسی نے صرف السلام علیکم

کہا ہے، تو اس کے جواب میں کم از کم وعلیکم السلام کہہ دیا جائے، تاکہ واجب پورا ہو، اور بہتر اضافہ ہے، جو وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ تک اضافہ ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام کے سلام کے جواب میں بھی فرشتوں نے اضافہ کیا تھا۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو کہا: السلام علیکم، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا جواب دے دیا، اور وہ بیٹھ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کو دس نیکیاں ملیں۔ پھر دوسرا شخص آیا، اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا جواب دیدیا، وہ بیٹھ گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کو بیس نیکیاں ملیں۔ پھر تیسرا شخص آیا، اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا جواب دے دیا، وہ بیٹھ گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اس کو تیس نیکیاں ملیں۔ پھر ایک اور شخص آیا، اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کو چالیس نیکیاں ملیں، اور یہ بھی فرمایا کہ اسی طرح فضائل بڑھتے جاتے ہیں۔

حدیث سنن ابوداؤد میں ہے۔ نیز سنن ترمذی میں بھی ہے، لیکن اس میں مغفرتہ کا ذکر نہیں ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حسن بتایا ہے۔ پھر فرمایا ہے: وَفِی البَابِ عَنْ اَبِیْ سَعِیْد وَعَلِیٍ وَسَھْل بْنِ حُنِیْفٍ۔

اور مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ مفسر ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ ایک روایت یوں نقل کی ہے کہ جب ایک شخص نے السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا، تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وَعَلَیْکَ، اور فرمایا کہ تو نے ہمارے لئے کچھ نہیں چھوڑا، لہٰذا ہم نے اسی قدر واپس کر دیا جتنا تم نے کہا۔ اس کے بعد مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ وبرکاتہ سے آگے سلام میں اضافہ نہیں ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ: فَاِنْ قَالَ سَلَامٌ عَلَیْکَ وَرَحْمَۃُ اللہِ زِدتَ فِیْ رَدِّکَ وَ بَرَکَاتُہٗ وَھٰذَا ھُوَ النِّھَایَۃَ فَلَا مَزِیْدَ عَلَیْہِ۔

مطلب یہ ہے کہ برکاتہ سے آگے اضافہ نہیں ہے، اور صاحب درمختار نے کتاب الحظر والاباحۃ میں لکھا ہے کہ: وَلَا یَزِیْدُ الرَّادُ عَلٰی وَبَرَکَاتُہٗ، یعنی جواب میں وبرکاتہ سے زیادہ نہ کہا جائے۔ سنن ابوداؤد میں جو سلام کرنے والے کی طرف سے ومغفرتہ کا اضافہ ہے، اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ وبرکاتہ سے آگے بھی

اضافہ درست ہے۔ لیکن جس روایت میں **و مغفرتہ** کا اضافہ آیا ہے سند کے اعتبار سے ضعیف ہے، اسی لئے فقہاء اور مفسرین نے اسے نہیں لیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے عمل سے بھی حضرات فقہاء کی تائید ہوتی ہے۔ موطا امام مالک میں ہے کہ یمن کے ایک شخص نے ان کو سلام کیا، اور **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ** کہنے کے بعد کچھ اضافہ کر دیا، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اِنَّ السَّلَامَ اِنْتَھٰی اِلَی الْبَرَکَۃِ یعنی مسنون سلام برکتہ تک ختم ہو گیا۔

امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے موطا میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما والی روایت کو لکھا ہے، اور پھر فرمایا ہے: وَبِھٰذَا نَاخُذُ اِذَا قَالَ وَبَرَکَاتُہٗ فَلْیَکْفِفْ فَاِنَّ اِتِّبَاعِ السُّنَّۃِ اَفْضَلُ۔ یعنی ہم (احناف) بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں، کہ جب **وبرکاتہ** تک کہہ دے، تو ختم کر دے، کیونکہ سنت کا اتباع افضل ہے۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں ایسی احادیث جمع کی ہیں جن سے **وبرکاتہ** پر اضافہ ثابت ہوتا ہے، انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ احادیث ضعیف ہیں، لیکن سب کے مجموعے سے ایک طرح کی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی بات سے اس طرف اشارہ نکلتا ہے کہ **وبرکاتہ** پر اضافہ کرنا اگر مسنون نہیں، تو جائز بہر حال ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ: اگر بار بار ملاقات کا اتفاق، یا آمد و رفت مکرر ہو، تو ہر مرتبہ سلام کرنا مسنون ہے۔

مسئلہ: اپنے گھر والوں کو سلام کرنا، اور اگر مکان خالی ہو تب بھی سلام مسنون ہے۔

مسئلہ: قبرستان کے مردوں کو سلام کرنا بھی مسنون ہے۔

مسئلہ: کوئی مسجد میں آئے وہاں کوئی نہ ہو سلام مسنون ہے، اس لئے کہ فرشتے موجود رہتے ہیں۔

مسئلہ: مجلس میں آنے پر اور کچھ دیر بعد وہاں سے جانے پر دونوں مرتبہ سلام مسنون ہے۔

مسئلہ: اجنبی جوان عورتوں کو سلام کرنا مکروہ ہے، بوڑھی عورتوں پر سلام جائز ہے۔

مسئلہ: نابالغ بچوں کو سلام کرنا جائز ہے، اور ان کے سلام کا جواب دینا واجب ہے۔

مسئلہ: پیغام کے ذریعہ سلام کے جواب میں پیغام لانے والے کو شریک کرنا چاہئے، اور ایسا کہنا چاہئے: عَلَیْکَ وَعَلَیْہِ وَعَلَیْھِمُ السَّلَامُ وَرَحْمَۃُ اللہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔

مسئلہ: عورتوں پر ضروری ہے کہ وہ آپس میں سلام کی ترویج و اشاعت کریں۔

مسئلہ: مجلس میں صرف ایک شخص کے جواب سے کفایت ہوسکتی ہے، تمام لوگوں پر جواب ضروری نہیں۔

مسئلہ: حالتِ نماز میں سلام کرنا اور جواب دینا مفسدِ صلوٰۃ ہے، البتہ اشارہ مفسد نہیں، مگر مکروہ ہے۔

وہ مقامات جہاں سلام کرنا بالکل مکروہ ہے، اور جواب ضروری نہیں ہے، تقریباً بیس (٢٠) مقامات ایسے ہیں جہاں سلام کرنا مکروہ ہے، اور جواب ضروری اور واجب نہیں ہے۔ وہ مقامات یہ ہیں:

(١) بحالتِ نماز، یعنی کوئی نماز پڑھ رہا ہو اس کو سلام نہیں کرنا۔ (٢) بحالتِ تلاوتِ قرآن حکیم۔ (٣) بحالتِ درس وتدریس۔ (٤) بحالتِ ذکر واذکار۔ (٥) بحالتِ وعظ ونصیحت۔ (٦) بحالتِ خطبہ جمعہ وعیدین۔ (٧) بحالتِ اذان واقامت۔ (٨) بحالتِ قضاء وعدالت۔ (٩) بحالتِ اداء شہادت۔ (١٠) بحالتِ مخصوص سوالات وجوابات۔ (١١) بحالتِ بول وبراز واستنجاء۔ (١٢) بحالتِ وضوء وغسل۔ (١٣) بحالتِ نوم۔ (١٤) بحالتِ طعام وخوراک۔ (١٥) بحالتِ سکر ونشہ۔ (١٦) بحالتِ کھیل وتماشا بینی۔ (١٧) بحالتِ رقص وسرود وغیرہ۔ (١٨) بحالتِ بے حجابی وعریانی۔ (١٩) محرم جوان عورتوں پر۔ (٢٠) غیر مسلموں پر۔

البتہ! غیر مسلم سبقت کر کے سلام کہے، تو جواب میں صرف "علیک" ہی پر اکتفا کرنا چاہئے، لفظ السلام کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ آج کل ہاتھوں سے سلام کرنے کا جو رواج ہے وہ غیر شرعی ہے، ہاں! اگر کوئی بہت دور ہو، وہاں آواز نہیں پہنچتی، تو ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کی اجازت ہے، مگر یہ صرف اطلاع شمار ہوگی، السلام علیکم والا ثواب حاصل نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

مسئلہ: سلام کی تکمیل مصافحہ اور معانقہ ہے، یہ دونوں سنت اور کارِ ثواب ہیں، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارے آپس کے سلام کا تکملہ مصافحہ ہے۔ [أحمد، ترمذي]

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جب سفر سے واپس آئے، تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استقبال کیا، اور ان سے بغل گیر ہوگئے، (معانقہ فرمایا)، اور ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان میں چوما (بوسہ دیا)۔ [أبو داؤد، بيهقي شعب الإيمان]

مصافحہ اور معانقہ کے اثبات اور فضائل میں بکثرت احادیث مروی ہیں۔ [مشکوۃ وغیرہ]

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ضرور بالضرور قیامت کے دن تمہیں جمع فرمائے گا، جس میں کوئی شک نہیں، اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی؟ ﴿۸۷﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ میں عقیدۂ توحید باری تعالیٰ، اور عقیدۂ حشر ونشر اور قیامِ قیامت کو بیان فرمایا، سابقہ آیت میں حَسِیْبًا آیا تھا، یہ جملہ اس کی تشریح اور وضاحت ہے، یہاں "اِلیٰ" ، "فی" کے معنی میں ہے، اور ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ﴾ میں استفہام انکاری ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا کوئی نہیں، اللہ تعالیٰ کی ساری باتیں سچی، اور سارے احکام سچے، اور تمام وعدے سچے اور پکے ہیں، جن میں کوئی ادنیٰ شک بھی کفر وضلالت ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِى الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

ترجمہ: منافقین کے بارے میں تم کو کیا ہوا کہ دو گروہ بن گئے؟ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے کرتوتوں کی وجہ

سے انہیں الٹا پھیر دیا، کیا تم چاہتے ہو کہ اسے ہدایت پر لے آؤ جسے اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا؟ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے سو تو اس کے لئے کوئی راستہ نہ پائے گا ﴿۸۸﴾ ان کی خواہش ہے کہ کاش تم کافر ہو جاؤ، جیسا کہ انہوں نے کفر اختیار کیا، پھر تم سب برابر ہو جاؤ، سو تم ان میں سے دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اللہ تعالیٰ کے راستے میں، سو اگر وہ اعراض کریں تو ان کو پکڑو، اور ان کو قتل کرو، جہاں بھی تم ان کو پاؤ، اور نہ بناؤ ان میں سے کسی کو دوست اور نہ مددگار ﴿۸۹﴾ مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ میل ملاپ رکھتے ہیں، ان لوگوں کے ساتھ جن کے اور تمہارے درمیان عہد ہے یا تمہارے پاس اس حال میں آ جائیں کہ ان کے دل تمہارے ساتھ اور اپنی قوم کے ساتھ جنگ کرنے سے رک رہے ہو، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلّط فرما دیتا، سو وہ ضرور تم سے لڑتے، پس اگر وہ تم سے الگ رہیں سو تم سے قتال نہ کریں، اور تمہارے ساتھ سلامت روی کا معاملہ رکھیں، تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان پر کوئی راہ نہیں دی ﴿۹۰﴾ عنقریب تم دوسرے لوگوں کو پاؤ گے جو یہ چاہیں گے کہ تمہاری طرف سے بے خطر ہو کر رہیں، اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں، جب کبھی لوٹائے جائیں فتنے کی طرف تو اس کی طرف واپس لوٹ جائیں، سو اگر وہ تم سے یکسو نہ ہوں، اور تمہاری طرف سلامت روی کا معاملہ نہ رکھیں، اور اپنے ہاتھوں کو نہ روکیں، سو ان کو پکڑو، اور قتل کرو جہاں بھی ان کو پاؤ، اور یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہم نے تمہارے لئے ایسی حجت دے دی ہے جو واضح ہے ﴿۹۱﴾

معارف و منازل

قرآن حکیم کے مشکل ترین مقامات میں سے ایک یہی مقام ہے، جس کو کما حقہ سمجھنے اور معلوم کرنے کے لئے سخت محنت کی ضرورت ہے۔ وَبِاللہِ التَّوفیق و ھو العَلیم الحَکیم۔

منافقوں اور دشمنوں کے ساتھ معاملہ کا بیان:

تفسیر روح المعانی میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہاں اُن لوگوں کا بیان ہے جو مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے، اور انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ ہم مہاجر ہیں، پھر وہ مرتد ہو گئے، اور انہوں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی کہ ہم مکہ معظمہ جا کر اپنا تجارتی سامان لے آئیں، تاکہ یہاں تجارت کیا کریں، تو ان کے بارے میں مسلمانوں کا آپس میں اختلاف ہوا، ایک جماعت نے کہا کہ یہ لوگ منافق ہیں، دوسری جماعت نے کہا کہ یہ لوگ مؤمن ہیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی، اور ان کا نفاق کھول کر بیان فرما دیا، اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

دوم: واقعہ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو مکہ معظمہ ہی میں رہ گئے تھے، انہوں نے اپنے ایمان کا اعلان تو کیا، لیکن ہجرت نہیں کی، اور وہاں رہے، ان کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف ہوا، کچھ لوگ ان سے دوستی ومحبت کا اظہار کرنے لگے، اور کچھ لوگوں نے ان سے برأت وبیزاری کا اظہار کیا، اور کہنے لگے کہ یہ لوگ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کرکے نہیں آئے، لہٰذا ہم ان سے مکمل بیزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے اس آیت میں بتادیا کہ وہ لوگ منافق ہیں، اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ جب تک وہ ہجرت کرکے نہ آئیں ان سے دوستی کا تعلق نہ رکھیں۔

ان دونوں روایتوں کے بعد صاحب روح المعانی نے بحوالہ بخاری ومسلم وترمذی ونسائی واحمد رحمہم اللہ یوں نقل کیا ہے کہ: آنحضرت سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احد کے موقع پر جب اُحد کی طرف روانہ ہوئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہونے والوں میں سے کچھ لوگ (تین سو منافقین) واپس ہوگئے، ان واپس ہونے والوں کے بارے میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف ہوا، ایک جماعت کہتی تھی کہ ان کو قتل کردیں، اور دوسری جماعت کہتی تھی کہ قتل نہ کئے جائیں، اس پر اللہ تعالیٰ شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو کیا ہوا کہ منافقین کے بارے میں دوگروہ بن گئے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے اعمال بد کی وجہ سے واپس لوٹادیا، اور ان کو گمراہ فرمادیا، اور جسے اللہ تعالیٰ نے گمراہ کردیا تو کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ اس کو ہدایت دیدو؟ اور فرمایا کہ جسے اللہ تعالیٰ گمراہ فرمادے اس کے لئے تم کوئی صحیح راستہ پا ہی نہیں سکتے۔ اس کے بعد ان منافقوں کے عزائم اور ارادوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً﴾ کہ یہ بدقسمت لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہوجاؤ، جیسا کہ انہوں نے کفر اختیار کیا، اور اس طرح وہ اور تم برابر ہوجاؤ، پس تم ایسے نالائقوں کو دوست نہ بناؤ۔ ہاں! اگر فی سبیل اللہ ہجرت کرلیں، جس سے ان کا ایمان متحقق ہوجائے، تو ان سے دوستی کی جاسکتی ہے، اس مشہور اصول کی بنیاد پر جو کہ: اَلْحُبُّ فِي اللهِ وَالْبُغْضُ فِي اللهِ والا اصول ہے۔

ہجرت کو لفظ فِي سَبِيْلِ اللهِ کے ساتھ مقید فرمایا، کیونکہ ہجرت اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے نہ ہو دنیاوی اغراض کے لئے ہو، تو وہ ہجرت معتبر نہیں ہے۔ [بخاري]

☆☆☆

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہجرت کی تین اقسام ہیں:

(۱) وہ ہجرت جو آغازِ اسلام میں فرض تھی، جب مکہ فتح ہوا تو اس کی فرضیت موقوف ہوگئی، ارشاد ہوا: لَاھِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰکِنْ جِھَادٌ وَنِیَّةٌ وَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا۔ [بخاري]

(۲) ہجرت کی دوسری قسم یہ ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ فی سبیل اللہ خلوص کے ساتھ جہاد میں شرکت کرنا۔

(۳) تیسری قسم یہ ہے کہ زندگی بھر ممنوعاتِ شرعیہ کو ترک کردینا۔ وَالْمُھَاجِرُ مَنْ ھَجَرَ مَانَھَی اللّٰہُ عَنْہُ وَرَسُوْلُہٗ۔ [متفق علیہ]

فائدہ:

واضح رہے کہ آیات کریمہ کا پورا مضمون سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات تینوں قسم کے منافقین کے بارے میں نازل ہوئیں، لیکن تمام احکام خاص کر قتال کا حکم سب کے لئے نہیں ہے، کیونکہ مدینہ منورہ میں جو منافقین تھے جنہوں نے غزوۂ اُحد کے محاذ سے واپس ہوکر مسلمانوں میں بددلی پیدا کی، مسلمانون کے ساتھ غدر کیا، ابوسفیان کی خیرخواہی کی، مگر ان تمام باتوں کے باوجود ان کو قتل نہیں کیا گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پرزور مطالبہ کے باوجود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی کہ پورے خطے میں یہ افواہ آگ کی طرح پھیل جائے گی کہ: اِنَّ مُحَمَّدًا یَقْتُلُ اَصْحَابَہٗ۔ اس سے ہمارے دینی، اسلامی پروگرام کو نقصان پہنچے گا۔

مزید ارشاد فرمایا: ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْھُمْ وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْھُمْ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا﴾ اگر یہ لوگ ہجرت فی سبیل اللہ سے اعراض کریں، تو جب بھی تمہیں ان پر قدرت حاصل ہوجائے، اور ان کو جہاں بھی پاؤ، ان کو قتل کرو، اور ان میں سے کسی کو بھی دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

غزوۂ اُحد کے واقعہ میں گزر چکا کہ چند کافر مسلح ہوکر راستے پر انتظار کرنے لگے کہ جب مسلمانوں کا لشکر ہمارے قریب پہنچے گا، تو اس میں شامل ہوجائیں گے، جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا، تو ان لوگوں نے پیغام بھیجا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کیلئے آئے ہوئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمیں کافروں کی مدد کی ضرورت نہیں ہے، پہلے تم اسلام قبول کرو، پھر ہمارے ساتھ شامل ہوجاؤ، چنانچہ وہ لوگ واپس ہوگئے۔

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍۭ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْکُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُھُمْ اَنْ

﴿يُقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ﴾ اس میں ان لوگوں کو قتل سے مستثنیٰ فرمادیا۔

اول وہ لوگ جو ان لوگوں سے مل جائیں جن سے مسلمانوں کا عہد ہے، یعنی صلح ہے، جب یہ لوگ مسلمانوں کے صلح والوں سے مل جائیں گے تو وہ بھی صلح والوں کا حصہ شمار ہوں گے، تو مسلمانوں کی جنگ وقتل سے محفوظ رہیں گے۔

دوئم ان لوگوں کو بھی مستثنیٰ فرمادیا جو مسلمانوں کے پاس اس حالت میں آجائیں کہ ان کا دل جنگ کرنے سے منقبض اور تنگ ہو، وہ نہ مسلمانوں سے لڑنا گوارا کریں، اور نہ اپنی قوم سے جنگ کریں، یعنی دونوں جماعتوں سے صلح رکھیں، تو ایسے لوگ بھی پکڑنے اور قتل کرنے سے مستثنیٰ ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ شانہ نے بطورِ فضل وامتنان ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو دشمنوں کو تم پر مسلط فرمادیتا، اور وہ تم سے قتال کرتے، اب جب وہ تم سے کنارہ کش ہوگئے، اور تم سے جنگ نہ کی، اور تمہارے سامنے صلح کی پیش کش کردی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قتل کرنے اور پکڑنے کا کوئی راستہ نہیں بنایا، اور تمہیں ان کے پکڑنے اور قتل کی اجازت نہیں دی۔

یہاں تک دو جماعتوں کا ذکر ہوا: اول وہ جماعت جس نے اسلام تو قبول کرلیا، مگر ہجرت نہیں کی، یا ہجرت کرنے کے بعد واپس دارالحرب میں چلے گئے۔ دوسری وہ جماعت جس نے مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرلیا، یا معاہدہ کرنے والوں سے جاملی۔ اس کے بعد تیسری جماعت کا تذکرہ فرمایا، جو دفع الوقتی کے طور پر صلح کرلے، جن کا مقصد یہ ہو کہ مسلمانوں کی طرف سے بےخطر ہوکر رہیں، اور اپنی قوم کی طرف سے بھی، لیکن جب کبھی ان کو شرارت اور فتنہ گری کی طرف متوجہ کیا جائے تو فوراً اس کو قبول کرلیں، اور مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے آمادہ ہوجائیں، اور اپنا معاہدہ توڑ دیں، اس جماعت کا ذکر:

﴿سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ﴾ میں فرمایا ہے، ان کے بارے میں فرمایا کہ اگر یہ تم سے کنارہ کش نہ ہوں، اور سلامت روی اختیار نہ کریں، اور اپنے ہاتھوں کو نہ روکیں، تو ان کو پکڑو، اور جہاں کہیں ان کو پاؤ قتل کرو، ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دے دی ہے، یعنی ان کے قتل کی واضح طور پر اجازت عنایت فرمائی ہے۔

واضح رہے کہ ابتداءِ اسلام میں مسلمانوں پر فرض تھا کہ وہ دارالاسلام مدینہ منورہ میں ہجرت کرکے آجائیں، اور ہجرت کو ایمان کی شرط قرار دے دیا گیا تھا، جو لوگ ہجرت کرکے نہ آئیں ان سے مسلمانوں جیسا معاملہ کرنا ممنوع تھا، جیسا کہ اوپر آیت سے معلوم ہوا، اس کے بعد جب مکہ معظمہ فتح ہوگیا، تو مدینہ منورہ ہجرت کرنا فرض نہ رہا، اور سرور

عالم ﷺ نے فرمایا: لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ وَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا۔ [متفق علیہ] یعنی فتح مکہ کے بعد مدینہ منورہ کو ہجرت کرنا فرض نہیں رہی، جو ترکِ وطن کی صورت میں تھی، اب جہاد ہے، اور نیت ہے، جیسی ضرورت پڑے گی ہجرت کی یا جہاد کی اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا، اور جب بھی جہاد کے لئے نکلنے کو کہا جائے تو نکل کھڑے ہونا، یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

..........✿..........✿..........✿..........

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

ترجمہ: اور کسی مؤمن کی شان نہیں ہے کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کرے مگر خطا کے طور پر، اور جو شخص کسی مؤمن کو بطور خطا قتل کردے تو اس پر واجب ہے کہ ایک مؤمن غلام آزاد کرے، اور اس کے خاندان والوں کو دیت ادا کرے، مگر یہ کہ وہ لوگ معاف کردیں۔ اور اگر وہ مقتول ایک ایسی قوم میں سے ہو جو تمہارے مخالف ہیں، اور وہ شخص خود مؤمن ہے، تو ایک مؤمن غلام آزاد کرنا واجب ہے۔ اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو تو دیت بھی واجب ہے، جو اس کے خاندان والوں کو سپرد کردی جائے، اور ایک مؤمن غلام آزاد کرنا بھی واجب ہے۔ پھر جس شخص کو غلام نہ ملے وہ لگاتار دو ماہ کے روزے رکھے، بطریقِ توبہ کے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوئی ہے، اور اللہ تعالیٰ علم والا، حکمت والا ہے ۝

معارف ومنازل

اوپر یہ قتل وقتال کا حکم چلا آرہا ہے، اور ابتداءً قتل کی کُل آٹھ صورتیں ہیں، کیونکہ مقتول چار حال سے خالی نہیں ہے، یا مؤمن ہے، یا ذمی، یا مصالح ومستامن، اور یا حربی ہے۔ اور قتل دو طرح کا ہے: عمداً ہے، یا خطاءً۔ پس قتل کی کُل صورتیں آٹھ ہوجاتی ہیں:

اول مؤمن کا قتلِ عمد۔ دوئم مؤمن کا قتلِ خطاء۔ سوئم ذمی کا قتلِ عمد۔ چہارم ذمی کا قتلِ خطاء۔ پنجم مصالح کا

قتلِ عمد۔ ششم مصالح کا قتلِ خطاء۔ ہفتم حربی کا قتلِ عمد۔ ہشتم حربی کا قتلِ خطاء۔

ان صورتوں میں بعض کا حکم تو اوپر معلوم ہو چکا، بعض کا آگے آنے والا ہے۔ بعض کا حدیث شریف میں موجود ہے۔ چنانچہ پہلی صورت کا حکمِ دنیوی، یعنی وجوبِ قصاص سورۂ بقرہ کے رکوع ۲۲ میں مذکور ہے، اور حکمِ اخروی آگے آیت: ﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا﴾ میں آنے والا ہے۔

اور صورتِ دوم کا بیان ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا﴾ إلى قوله تعالىٰ ﴿ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ﴾ میں آتا ہے۔

اور صورتِ سوم کا بیان اور حکم حدیث دارقطنی میں ہے کہ ذمی کے عوض سرورِ عالم ﷺ نے مسلمان سے قصاص لیا۔ [أخرجه الزيلعي في تخريج أحاديث الهداية] وهو مذهب إمامنا الأعظم رحمہ اللہ)۔

صورتِ چہارم کا بیان قول اللہ تعالیٰ: ﴿وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ﴾ میں آتا ہے۔

صورتِ پنجم کا ذکر اوپر کے رکوع میں قول اللہ تعالیٰ: ﴿فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴾ میں آچکا ہے۔

صورتِ ششم کا حکم صورتِ چہارم کے ساتھ ہی مذکور ہے، کیونکہ میثاق عام ہے، جو وقتی اور دائمی دونوں کو شامل ہے، پس ذمی اور مستأمن دونوں آگئے۔ درمختار کی کتاب الدیات کے شروع میں مستأمن کی دیت کے وجوب کی تصحیح کی ہے۔

صورتِ ہفتم وہشتم کا حکم خود جہاد کی مشروعیت سے اوپر معلوم ہو چکا، کیونکہ جہاد میں اہلِ حرب قصداً مارے جاتے ہیں، اور خطا کا جواز بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوگا۔ [بیان القرآن] تو حربی کافر ہر حال میں واجب القتل اور مباح الدم ہے۔

قتل کی تین قسمیں، اور ان کا شرعی حکم:

پہلی قسم عمد: جو ظاہراً قصد سے ایسے آلہ کے ذریعہ ہو جو آہنی ہو، یا تفریقِ اجزاءِ بدن میں آہنی آلہ کی طرح ہو، جیسے دھار والا پتھر، یا دھار والی تیز لکڑی وغیرہ۔

دوسری قسم شبہ عمد: جو قصداً تو ہو، مگر ایسے تیز آلہ سے نہ ہو جس سے اجزاءِ بدن میں تفریق ہوسکتی ہو۔

تیسری قسم خطاء: یا تو قصد وظن میں کہ دور سے آدمی کو شکاری جانور یا حربی کافر سمجھ کر نشانہ لگایا، یا فعل میں

کہ نشانہ جانور ہی کو لگا یا، لیکن آدمی کو جا لگا۔ اس میں خطاء سے مراد غیر عمد ہے، پس دوسری تیسری دونوں قسمیں اس میں آ گئیں، ان دونوں میں دیت بھی ہے، اور گناہ بھی، مگر دونوں امر میں دونوں قسمیں متفاوت ہیں۔ دوسری قسم کی دیت سو اونٹ ہے، چار قسم کے، یعنی ایک ایک قسم کے پچیس پچیس۔ اور تیسری قسم کی دیت بھی سو اونٹ ہے، پانچ قسم کے، یعنی ایک ایک قسم کے بیس بیس۔

البتہ اگر دیت میں نقدی ہو، تو دونوں قسموں میں دس ہزار درہم شرعی، یا ایک ہزار دینار شرعی ہیں، اور گناہ دوسری قسم مین زیادہ ہے بوجہ قصد کے؛ اور تیسری قسم میں گناہ کم ہے، صرف بے احتیاطی کا گناہ ہے۔ [كذا في الهداية]

دیت اور کفارہ ادا کرنے کا حکم، اور حکمت کا بیان:

سورۂ بقرہ رکوع ۲۲ میں تفصیل گزر چکی ہے، ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ کے تحت۔

انسانی جان جتنی قیمتی ہے، اسی طرح اس کا ضیاع اور تلف بھی بڑا خطرناک جرم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پوری دنیا کا ختم ہو جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان آدمی کے قتل کے مقابلے میں معمولی چیز ہے۔ (یعنی دنیا کی پوری تباہی پر ایک مؤمن کا قتل بھاری ہے)۔ [رواه الترمذي، والنسائي وابن ماجة وغيره، مشكوٰة]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمام آسمان و زمین والے کسی مؤمن کے خون میں شریک ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اوندھے منہ کر کے دوزخ میں ڈال دے گا۔ [رواه الترمذي، مشكوٰة]

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اُمید ہے اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرما دے، مگر جو شخص مشرک ہوتے ہوئے مر گیا، اور جس نے کسی مؤمن کو قتل کیا، ان دونوں کی مغفرت نہیں ہے۔ [رواه أبو داؤد والنسائي، مشكوٰة]

یہ اتنی سخت وعیدیں، اور قصاص، پھر بھاری دیت اور کفارہ وغیرہ اسی خاطر ہیں کہ لوگ خاص کر مسلمان انسانی جان کی قیمت کے پیش نظر قتل و قتال اور خون خرابے سے مکمل پرہیز کریں۔

شریعتِ مطہرہ کے قانون میں قصاص و دیت، کفارہ وغیرہ انسانی قیمتی جانوں کی حفاظت کے لئے مقرر کئے

گئے ہیں، مگر بہت صدمہ اور افسوس ہے کہ خاص کر اسلامی دنیا میں قتل وخون کی گرم بازاری اور کثرت ہے۔ یورپ والے اتنے ہوشیار ہیں کہ کبھی آپس میں خونریزی نہیں کرتے، اور بے رحم وسنگدل اتنے ہیں کہ ہر وقت ہر محاذ پر دوسری اقوام کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے اور قتل کرتے ہیں۔ اور مسلمان اقوام کفر سے اتنے خوفزدہ مرعوب ہیں کہ ان کی حاشیہ برداری اور غلامی پر فخر کرتے ہیں۔ بڑے ادب واحترم کے ساتھ ان کا وظیفہ پڑھتے ہیں، مگر آپس میں اتنے دلیر اور بے رحم ہیں کہ لسانی، قومی، قبائلی، وطنی، اور صوبائی عصبیتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے کو مار رہے ہیں، قتل کر رہے ہیں، اور ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔

اور موجودہ سیاست اور سیاسی چالوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی، اور بے دینی اور قوم پرستی کا وہ مہیب وحشتناک سیلاب برپا کیا، کہ تمام دینی اقدار، ہدایات، شرافتیں، اخلاقیات اور ساری اسلامی خوبیاں سیلاب میں بہہ گئیں، اسلام کی جگہ قومیت آگئی، اور معاشرے تباہ ہوگئے۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ قوم وبرادری، ملک وطن وقبیلہ، مال وسرمایہ اور جاہ واقتدار سب یہیں دھرے رہ جائیں گے۔ ایک دوسرے کے قتل وغارت اور حقوق کی تباہی کا گناہ کبیرہ ساتھ لے کر قبر میں جانے والوں کو اپنی آخرت کا کیوں فکر نہیں؟ دوزخ میں داخل ہونا، اور اس میں ناقابلِ تصور سزا پانا، آگ میں ہمیشہ جلنا، یہ سب معمولی سی بات سمجھ رکھا ہے۔

اسلام سے پہلے کی جاہلی عصبیتیں پھر دوبارہ زندہ ہوکر ابھر آئی ہیں، اتنی شدت وبے رحمی کے ساتھ کہ اہلِ علم، عالم، مبلغ، مصنف، پابند صوم وصلوٰۃ، وظیفے اور ذکر واذکار کے داعی سب لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں، اور دشمنوں کے ورغلانے اور بھڑکانے سے شہری آبادی تو کیا میدانِ جہاد میں بھی عصبیتوں کا شکار ہو رہے ہیں، کیونکہ جب خلوص وللّٰہیت دل سے نکل جاتی ہے، اور دنیا وحطام ولذّاتِ دنیا وہاں پنجہ گاڑتے ہوئے مرکزِ قلب پر اقتدار قائم کرلیتی ہے، تو کتاب و سنت کے سارے انوار وبرکات رخصت ہوجاتے ہیں۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

مدینہ منورہ میں آباد انصار کے دونوں قبیلے اوس اور خزرج کی ساری عداوتیں، اور ان کی پرانی لڑائیاں جو سینکڑوں سالوں سے (تقریباً پانچ سو سال متواتر) جاری تھیں، جن میں بے شمار قیمتی جانیں ضائع ہوچکی تھیں، مگر اسلام اور قرآنی تعلیمات نے ان کے یہ سارے اختلافات مٹا کر انہیں متحد کیا، اور ان میں وہ تاریخی اُخوت ومودت قائم کی جس کی کوئی مثال نہ ہو۔

پریشانی یہ ہے کہ آج مسلمان نام کا رہا، اور روشن خیالی کو دین سمجھا، گھات میں بیٹھے ہوئے دشمن کو نظر انداز کرلیا، حالانکہ یہ دشمن بہت بیدار ہے، تمہاری طرح خواب خرگوش میں سویا ہوا نہیں ہے، تمہارے اتحاد واتفاق اسے گوارا نہیں ہے، وہ تمہیں ادنیٰ اور فرضی چیزوں پر لڑا لڑا کر تمہیں قتل وقتال میں ڈال کر تمہاری دنیا وآخرت دونوں تباہ کرتا ہے۔ آج یورپ کا عیسائی اپنے عیسائی بھائی کو پچاس لاکھ ڈالر کے عوض قتل نہیں کرتا، جبکہ ہمارے مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو مرغی کے انڈوں کے عوض صبح وشام قتل کررہے ہیں، اور بسا اوقات بلا وجہ محض اس لئے ایک دوسرے کو قتل کررہے ہیں کہ یہ ہماری جماعت کا آدمی نہیں ہے۔

آنحضرت رحمت عالم ﷺ نے آخری عالمگیر خطبہ حجۃ الوداع کے موقعے پر اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: لَاتَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ [بخاري] میرے بعد کافر وگمراہ نہ ہوجانا، جس کی وجہ سے ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: مَنْ حَمَلَ عَلَیْنَا السِّلَاحَ فَلَیْسَ مِنَّا۔ [بخاري] جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ کسی مسلمان کا قتل کرنا تو بڑی بات ہے (جیسے حدیث عبداللہ بن عمرو ابوسعید رضی اللہ عنہم میں گزرا) کسی ہتھیار سے اس کی طرف محض اشارہ کرنا بھی حرام ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ بھی نہ کرے، وہ نہیں جانتا کہ ممکن ہے کہ شیطان اس کے ہاتھ سے چھڑادے (جس کی وجہ سے قتل کا حادثہ ہوجائے) پھر دوزخ کے گڑھے میں گر جائے۔ [بخاري]

دیت کے معنی ہیں: خون بہا۔ یہ لفظ اصل میں وَدْیٌ تھا، وَزْنٌ زِنَۃٌ عِدَۃٌ وِعْد کی طرح۔ اس کا فاکلمہ، یعنی واو کو حذف کیا گیا، اور آخر میں اس کے عوض تا لگا دی گئی۔ وَدٰی یَدِیْ لفیف مفروق ہے، جس کا مطلب بہنے کا ہے، چونکہ یہ خون بہانے کے عوض دیا جاتا ہے، اس لئے اسے دیت کہتے ہیں۔

شریعتِ مقدسہ کے قانون میں دیت اور قصاص انسانی قیمتی جانوں کی حفاظت کے لئے مشروع کئے گئے ہیں، مگر افسوس ہے کہ حکومتوں کے ذمہ دار جو اسلام سے انتساب رکھتے ہیں، وہ دیگر احکامِ شریعت کی طرح ان احکام کو بھی عمل میں نہیں لاتے، لہٰذا انسانی جانیں بے قیمت ہوکر رہ گئی ہیں، اور گرامی قدر انسان جانوروں، بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہورہے ہیں، کوئی پرسانِ حال نہیں ہے، نہ محافظ ومددگار۔ جن چند ممالک میں قصاص ودیت کے احکام جزوی طور پر رائج ہیں وہاں بڑی حد تک انسانی جانیں محفوظ ہیں، اور جرائم ایک محتاط اندازے کے مطابق نہ ہونے

کے برابر ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو حکمران و حکام قوانینِ شرعیہ کو نافذ نہیں کرتے وہ فاسق اور ظالم ہیں۔ سورۂ مائدہ میں تفصیل آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔ ربّ العزّت کا فرمان ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [المائدۃ: ۴۵] (جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں)۔ حکومت کے وزراء، سیاست کے زعماء، عوامی نمائندے اور اربابِ حل وعقد، جنہیں مکمل اختیارات حاصل ہیں، وہ ہر قسم کے سیاہ وسفید کے مالک ہیں، ان کی ذمہ داری ہے اور ان پر صوم وصلوٰۃ کی طرح یہ فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کا نفاذ کریں، اور شرعی قوانین کو جاری کریں۔ اس کے علاوہ جو لوگ ذمہ دار ہوں، یا اور کوئی بھی شخص اگر احکامِ الٰہی پر معترض ہو، یا قوانینِ الٰہیہ کے بارے میں یہ خیال کرتا ہو کہ یہ ظالمانہ اور ناقابلِ عمل ہیں۔ اور موجودہ معاشرہ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے، تو ایسے لوگ کافر ہیں، اگرچہ وہ مسلمان ہونے کے مدّعی ہوں۔

قصاص اور قتل کا قانونِ خدواندی نافذ نہ ہونے کی وجہ سے قاتلین کسی بھی جان کے قتل کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے، وہ بڑی بے باکی کے ساتھ جس کو چاہتے ہیں قتل کردیتے ہیں، اگر کسی کو قتل کردیا اول تو قاتل معلوم نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل کو تحفظ حاصل ہے، اور مقتول کو نہیں۔ دوئم یہ کہ بغیر رشوت کے مقدمہ ہی درج نہیں ہوتا۔ اگر درج ہوتا ہے تو پھر شکاریوں کے رحم وکرم کی نذر ہوجاتا ہے، پھر وکیلوں کا سلسلہ اور بھاری فیسوں کا معاملہ، پھر خزانۂ قارون کی نوبت آتی ہے، یا حضرت نوح علیہ السلام کی عمر درکار ہوتی ہے۔ بیچارے مقتول کے نہتے کمزور وغریب ورثاء دوڑ لگا کر تھک جاتے ہیں۔

بالفرض اگر کوئی صاحبِ انصاف فیصلہ کنندہ اگر فیصلہ دے دیتا ہے تو اس پر عمل نہیں ہوتا، حتیٰ کہ مقتول کے وارث مایوس ہو کر دست بردار ہوجاتے ہیں وغیرہ۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ دار الخلافہ مدینہ منورہ سے ڈیڑھ دو ہزار کلو میٹر دور دریائے دجلہ کے کنارہ اگر کوئی کتا بھوک سے مرجائے گا تو مجھے خطرہ ہے کہ روزِ قیامت مجھ سے سوال وجواب ہوگا۔

قتل، قصاص، دیت، غلام کی آزادی، دو ماہ کا لگاتار روزہ اور دیگر احکام کتبِ فقہ میں تفصیلاً درج ہیں، اور علماء کرام نے ہر زمانے میں ان مسائل پر مستقل ضخیم کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، اگر کسی کو رغبت اور ذوق ہو تو ان کتب کی طرف مراجعت کرے۔ وباللہ التوفیق

البتہ یہ یادر ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کی آدھی ہے۔ کمافي المیراث، اور دیت میراث کے حکم میں ہے، جو مقتول کے شرعی ورثاء میں حسبِ حصص شرعیة مقررة في الإرث۔

ہمارے زمانے میں لوگ ظلم کرتے ہیں، دیت کے مال سے مقتول کی بیوہ کو حصہ نہیں دیتے ہیں، یہ بہت گناہ ہے۔ اگر وارث بالاتفاق معاف کریں، یا ان میں سے کوئی اپنا حصہ معاف کر دے، یا قصاص معاف کر دے، اس کی جگہ دیت قبول کر لے، درست ہے۔ کسی بادشاہ یا صدرِ مملکت یا وزیر یا کسی حاکم کو معاف کرنے کا کوئی اختیار نہیں کہ وہ وارثوں کے حقوق میں مداخلت کر کے قصاص یا دیت کو معاف کرے۔ تفصیل کتبِ فقہ میں دیکھیں۔

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا
وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا ﴿۹۳﴾

ترجمہ: اور جو شخص کسی مؤمن کو قصداً قتل کر دے تو اس کی جزاء جہنم ہے، اس میں ہمیشہ رہے گا، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا، اور اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی، اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے بڑا عذاب تیار فرمایا ہے ﴿۹۳﴾

معارف ومنازل

قتل خطاء کے احکام بتانے کے بعد اس آیت میں قصداً و عمداً قتل کرنے والے کی اُخروی سزا کا تذکرہ فرمایا، اور وہ یہ کہ جو شخص کسی مؤمن کو قصداً قتل کر دے تو اس کی سزا (اُخروی) جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ مزید فرمایا کہ اس پر حق تعالیٰ شانہ کا غضب ہوگا (جیسے کہ یہود پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا، اور وہ ﴿مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ﴾ قرار پائے)۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار فرمایا ہے۔

کسی مومن کا قتل دراصل بہت ہی بڑا جرم ہے، جیسے کہ یہ حدیث پہلے بھی بیان ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پوری دنیا کا ختم ہو جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان آدمی کے قتل کے مقابلے میں معمولی چیز ہے، یعنی دنیا کی تباہی پر قتلِ مؤمن بھاری اور وزن دار ہے۔

[رواه الترمذي والنسائي ووقفه بعضهم وهو أصح، ورواه ابن ماجة عن البراء بن عازب كذافي المشكوة]

اس کے علاوہ حضرت ابوہریرہ حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہم سے مروی احادیثِ مرفوعہ پچھلے

صفحات میں گزر چکیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے دنیا ختم ہونے سے پہلے ایسا دن ضرور آئے گا کہ قاتل کو بھی پتہ نہ ہوگا کہ میں نے کیوں قتل کیا، اور مقتول کو بھی معلوم نہ ہوگا کہ میں کیوں قتل ہوا۔ کسی نے عرض کیا: ایسا کیوں ہوگا؟ فرمایا: فتنہ کی وجہ سے ایسا ہوگا، قاتل اور مقتول دونوں دوزخ میں ہوں گے۔ [مسلم]

صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ قاتل کا دوزخ میں ہونا سمجھ میں آتا ہے، لیکن مقتول کیوں دوزخ میں ہوگا؟ فرمایا: مقتول بھی تو ارادہ کیا ہوا تھا کہ اس شخص کو قتل کردوں، لہٰذا وہ اپنی نیت اور پختہ عزم کی وجہ سے دوزخ میں جائے گا۔ [بخاري]

آیت کریمہ میں مؤمن کے قاتل کے لئے چار قسم کی سخت ترین وعیدوں کا ذکر ہے:

(۱) خلود فی النار۔ (۲) اللہ تعالیٰ کا غضب۔ (۳) اللہ تعالیٰ کی لعنت۔ (۴) عذاب عظیم۔

اسی کے ساتھ حضرت ابوہریرہ حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابودرداء اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث اسی طرح دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، مثلاً حضرت ابن مسعود حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ سے اس سلسلے میں احادیث بکثرت مروی ہیں۔ (تفصیل درمنثور میں دیکھیں)۔

پتہ چلتا ہے کہ مؤمن کا قاتل ابدی دوزخ میں ہوگا، چنانچہ معتزلہ وخوارج نے اپنے مذہب کے اثبات کے لئے استدلال کیا کہ مرتکبِ کبیرہ ابدی دوزخی ہی ہوگا۔ جمہور اہلسنت والجماعت ائمہ وفقہاء کرام کا مذہب یہ ہے کہ خلود فی النار صرف اور صرف کفار ومشرکین کے لئے مخصوص ہے، مرتکبِ کبیرہ خواہ کوئی بھی ہو، اور کسی سخت سے سخت کبیرہ کا مرتکب کیوں نہ ہو، نہ وہ کافر شمار ہوگا، اور نہ ہی ابدی دوزخی ہوگا۔ لا إله إلا الله محمد رسول الله کا اقرار کرنے والا صدق دل سے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والوں پر ابدی جہنم میں رہنا حرام ہی ہے۔ البتہ چند وقت کے لئے اپنے گناہوں کی وجہ سے اگر جہنم میں رہیں گے، تو یہ الگ بات ہے۔

قرآن کریم نے اس آیت میں ایک جزئی مسئلہ کی زجر وتوبیخ کے طور پر سخت وعید بیان فرمائی، جبکہ کلی قاعدہ جو فیصلہ کن ہے، وہ یہ ہے کہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ۴۸] (اللہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے شریک ٹھہرایا جائے، اور اس کے علاوہ کو معاف کرتا ہے جس کے لئے چاہے)۔

اور ظاہر ہے کہ شرک کے علاوہ سارے کبائر، بشمولِ قتلِ مؤمن سب کے سب ﴿مَا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ میں داخل ہیں۔
صحیحین کی روایت اس پر واضح دلیل ہے کہ ایک اسرائیلی شخص کی توبہ قبول ہوئی، جس نے سو آدمیوں کو قتل کیا تھا۔

یہاں آیت کریمہ میں اگرچہ توبہ کا ذکر نہیں ہے، مگر توبہ کی قبولیت کی نفی بھی نہیں، پس اگر قاتل صدقِ دل سے توبہ کرلے، یا دنیا میں قصاص کے طور پر مارا جائے، تو معاملہ واضح ہو جائے گا، اور ابدی جہنم سے بچ جائے گا، حتیٰ کہ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بہت سے مفسرین حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہاں خلود سے مراد کافروں والا خلود نہیں ہے، بلکہ مکثِ طویل مراد ہے، تاکہ نصوصِ قرآنیہ اور احادیث میں تطبیق ہو۔ اور یہی اہل حق کا متفقہ فیصلہ ہے۔

صاحب مظہریؒ فرماتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت آیت کریمہ کی جو تاویل کرتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ اجماع امت ہے کہ کوئی مؤمن ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا، خواہ بغیر توبہ کے مرگیا ہو۔ اور گناہ کبیرہ ایمان سے خارج نہیں کردیتا۔ اجماع امت کی سند آیات قرآنی اور متواتر احادیث ہیں۔ مزید تفصیل مظہری میں دیکھیں۔

صحیح بخاری ومسلم ودیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو مروی ہے کہ قاتل ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اور اس کے لئے توبہ ہے ہی نہیں، جس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کبھی قاتل کے لئے توبہ نہ ہونے کا فتویٰ دیا تھا، اسی طرح وہ قاتل کے لئے توبہ کے قائل بھی رہے ہیں، چنانچہ ہم اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ جب شرک کے لئے توبہ ہے، تو قتل جو کہ شرک سے بہت کم ہے، تو قاتل کے لئے بھی توبہ کی گنجائش باقی رہے گی، اور نہ توبہ کی گنجائش ثابت ہونے سے مغفرت کی گنجائش ہوگی، اور خلود فی النار کا حکم باقی نہیں رہے گا۔

......❁......❁......❁......

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ
السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ
كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۹۴

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں سفر کرو تو تحقیق کرلیا کرو، اور جو شخص تمہارے سامنے اطاعت ظاہر کرے اسے یوں نہ کہو کہ: تو مؤمن نہیں ہے۔ تم دنیاوالی زندگی کا سامان تلاش کرتے ہو، سو اللہ تعالیٰ کے پاس غنیمت کے بہت مال ہیں۔ اس سے پہلے تم ایسے ہی تھے، سو اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا، سو خوب تحقیق کیا

کرو، بیشک اللہ تعالیٰ ان کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو ﴿۹۴﴾

معارف ومنازل

بخاری، ترمذی، حاکم وغیرہ نے بحوالہ عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قبیلہ بنی سلیم کا ایک شخص اپنی بکریاں چراتے ہوئے چند صحابہ رضی اللہ عنہم پر گزرا، اس نے انہیں **السلام علیکم** کہہ کر سلام کیا، انہوں نے آپس میں کہا کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے ہمیں سلام کیا، یعنی یہ شخص مسلمان نہیں ہے، ہمیں دیکھ کر ڈر گیا کہ یہ قتل کر دیں گے، اس لئے سلام کیا، تا کہ مسلمان سمجھ کر چھوڑ دیں۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اسے تلوار سے قتل کیا، اور اس کی بکریاں لے لیں۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ واقعی مسلمان تھا، اور اس کا نام مرداس بن نہیک تھا۔

پھر اس کی بکریاں لے کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کی آمد سے پہلے آیت کریمہ کا نزول ہو چکا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی حرکت سے بے حد رنج ودکھ ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ملامت فرمایا، اور کہا: **اَقَتَلْتَهٗ بَعْدَ اَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ؟** یہ کلمات تین مرتبہ فرمائے، یہاں تک فرمایا کہ تم نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھا کہ تجھے معلوم ہو جاتا کہ اس نے یہ کلمہ دل سے کہا ہے یا نہیں؟ قیامت کے دن **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** کا تیرے پاس کیا جواب ہوگا؟

آیت کریمہ میں تنبیہ فرمائی کہ اگر کوئی سلام کرے، یا کلمہ پڑھ لے، یا اطاعت کا اظہار کرے، تو اسے مؤمن سمجھ کر چھوڑ دیا جائے، اور تحقیق کر کے اسے مؤمن سمجھا جائے۔ دوسری تنبیہ اس پر یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو اموالِ غنیمت ہیں ان کی رغبت کرو، کسی غریب کے مال کو خواہ مخواہ غنیمت شمار کر کے مت حاصل کرو، نہ کسی پر زیادتی اور ظلم کرو۔ تیسری تنبیہ یہ فرمائی کہ اپنے ماضی کا حال ذرا دیکھ کر فیصلہ کرو، کہ کبھی تم بھی اس طرح مجبور تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا، اور تم لوگ ذلت وخواری اور گمنامی سے نکل کر آگے بڑھے، اور اسلام کی بدولت دنیا میں متعارف وخوش نام ہو گئے، اور معرفتِ اسلامیہ کے سایہ میں عزت وشرف کے مالک ہو گئے، لہٰذا تحقیق کرو، کبھی عجلت اور بے اعتمادی کا شکار نہ ہو، کسی کے ایمانی دعوے کو مسترد نہ کرو۔

آیت کریمہ سے صراحۃً معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص سلام کرے، یا اسلام کا کلمہ پڑھے، یا یوں کہہ دے کہ میں مسلمان ہوں، تو اس کے ظاہری قول اور ظاہری دعوے پر اعتماد کرنا چاہئے، خواہ مخواہ اس کے ایمان میں شک کرنا، یا

اس کے ساتھ کافروں جیسا معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔

حقیقی ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے، اور قلبی تصدیق و تکذیب کو بندے نہیں جانتے، وہ ظاہر کے مکلف ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک عرصے تک منافقوں کو اپنے جیسا مسلمان سمجھتے رہے، کسی کو کسی کے قلب کا حال ہرگز معلوم نہیں ہو سکتا، جتنے معاملات دنیا میں جاری رہتے ہیں تقریباً سب کی بنیاد ظاہر سے ہے، نہ کہ باطن سے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کروں یہاں تک وہ لا إله إلا الله کی گواہی دے دیں، اور ساتھ یہ گواہی بھی دیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، پس جب وہ ایسا کرلیں گے تو اپنی جانوں اور مالوں کو میری طرف سے محفوظ کرلیں گے۔ ہاں! اگر اسلام کے حق کی وجہ سے قتل کرنے کی نوبت پیش آجائے تو یہ اور بات ہے (مثلاً! قصاص میں خدانخواستہ، انکارِ حق اور ارتداد ہو، یا شادی شدہ ہو اور زنا کرے) ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ [متفق علیه] البتہ مسلم نے إلا بحق الإسلام کا کلمہ ذکر نہیں کیا۔

پس جو شخص اسلام کو ظاہر کرتا ہو ہم اس کو مسلمان سمجھیں گے، اگر وہ دل سے مسلمان نہیں تو اللہ تعالیٰ کو چونکہ دلوں کے احوال بھی معلوم ہیں، اس لئے وہ اس سے اس کے عقیدے کے مطابق معاملہ فرمائے گا، منافق ہے تو کافروں میں شمار ہوگا، سخت سے سخت عذاب میں جائے گا، اگر دل سے مسلمان ہوگا تو اپنے ایمان اور عملِ صالح کا اجر و ثواب پائے گا۔ آیت کریمہ میں لفظ ''فَتَبَيَّنُوْا'' دو مرتبہ مذکور ہے، یا تاکید کے لئے، یا تو اس لئے کہ سفر و حضر دونوں میں تحقیق ضروری ہے، بغیر تحقیق و سراغ لگانے کے کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔

اہلِ قبلہ کی تکفیر کا بیان:

احتیاط میں بے احتیاطی، اور لاپرواہی یا غفلت درست نہیں ہے، جو شخص یہ کہے کہ میں مسلمان ہوں، اور ساتھ ہی کفریہ عقیدے اور اعمال کا اعلان اور ارتکاب کرتا ہو، جیسے بہت سارے لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے نہیں تھکتے، لیکن ختمِ نبوت کے منکر ہیں، یا اسلامی حدود کو ظلم کہتے ہیں، یا حدیث شریف کو حجت نہیں مانتے، اور منکرینِ حدیث ہیں، حج کو العیاذ باللہ تضییع مال و وقت کہتے ہیں، یا منکرینِ زکوٰۃ جو کہ زکوٰۃ کو بجائے عبادت کے ٹیکس مانتے ہیں، یا قرآن حکیم میں تحریف کرتے ہیں، وغیرہ غیرہ، ایسے لوگوں کو مسلمان کہنا اور کافر کہنے میں احتیاط کرنا مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنے کے اور ایسے بدعقیدہ لوگوں کو مسلمان سمجھنے میں ان کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہے، جو کہ مداہنت

فی الدین کے زمرے میں شامل ہے۔

جس کسی کا کفر ظاہر ہو، یا عمداً کفریہ اعمال کا مرتکب ہو، یا اس سے ایسے عقیدے اور عمل کا صدور ہو جو اہلِ اسلام کے مسلمات کے خلاف ہو، پس اس کے کفر کا اظہار واجب اور ضروری ہوگا، تاکہ یہ مرض دوسروں تک متعدی نہ ہو، اور دیگر اس طرح کے بُرے اعمال اور کفریہ عقائد سے بچ جائیں۔

اور جو یہ بات مشہور ہے کہ کسی کلمہ گو کو کافر نہ کہو، یا اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کرو، اس سے وہ کلمہ گو اہلِ قبلہ مراد ہے کہ جس سے دعویٰ ایمان کے ساتھ نواقضِ ایمان اور کفر کی کوئی نشانی ظاہر نہ ہو رہی ہو۔ بہت سے سرسری علم رکھنے والے لوگ فقہاء وائمہ کرام کی عبارت: "لَا نُكَفِّرُ اَحَدًا مِّنْ اَهْلِ الْقِبْلَةِ" کا مطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے یوں کہتے ہیں کہ: سب کلمہ گو مسلمان ہیں، یا یہ کہتے ہیں کہ اہلِ قبلہ سب مسلمان ہیں، حتیٰ کہ منافق بھی مسلمان ہیں، کیونکہ وہ اہلِ قبلہ ہیں۔ (دراصل یہ افواہ قادیانیوں کو تحفظ دینے کے لئے برطانیہ وغیرہ نے مشہور کی، پس سرسری علم والوں نے یقین کرلیا) یہ بہت سخت غلطی ہے، اور جہالت پر مبنی ہے، کیونکہ دعویٰ ایمان کے ساتھ جب ایمان کے منافی عقائد و اعمال کا صدور ہوگا تو ایمان کا دعویٰ کا اِبطال لازم آئے گا۔

حضرت علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے شرح فقہ اکبر کے تکملہ میں، اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ "اِکفار الملحدین" میں فرماتے ہیں کہ جاننا چاہئے کہ اہل سنت والجماعت کے حضرات نے جو یہ فرمایا ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر نہ کہا جائے، یہ اس وقت ہے جب اہل قبلہ سے کوئی چیز کفر کی علامات میں سے ظاہر نہ ہو، اور کوئی ایسی چیز صادر نہ ہو جس سے اس پر کفر عائد ہوتا ہے۔

فائدہ:

اگر کوئی شخص متواتر برملا گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، تو اسے کافر کہنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ اسے فاسق کہنا ضروری ہے، مثلاً تارکِ صلوٰۃ، یا شاربِ خمر، یا زانی وغیرہ، لیکن اگر کوئی ان مسلّم شدہ حرام اشیاء کو حلال کہے، یا کسی حلال شرعی چیز کو حرام کہہ دے، اور ایسا عقیدہ رکھے تو پھر ایسے شخص کے کفر میں شک نہیں ہوگا، اور بلاشبہ وہ کافر ہی ہوگا، تو تارک صلوٰۃ کافر نہ ہوا۔ اور منکرِ فرضیتِ صلوٰۃ کافر ہوا، اسی طرح ایک شخص شراب کو حرام سمجھ کر پیتا ہے، یہ کافر نہیں ہے، اور جو شخص شراب نہیں پیتا، مگر اس کو حلال کہتا ہے، تو یہ کافر ہے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں ایمان کے تقاضوں میں سے ہیں: اول یہ کہ جو شخص اسلام

کا کلمہ پڑھے اس کی طرف سے (زبان اور ہاتھ کو) روک لیا جائے، اور اسے کسی قسم کی زبان یا ہاتھ سے کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ دوئم یہ کہ کسی گناہ کی وجہ سے اسے کافر نہ کہا جائے، یعنی کسی بے عملی یا معصیت کی وجہ سے اسے اسلام سے خارج نہ کرو۔ سوئم یہ کہ جہاد جاری رہے گا، جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے، یہاں تک کہ اس امت کے آخری لوگ مسیح الدجال سے قتال کریں گے۔ جہاد کے حکم کو کسی ظالم کا ظلم اور کسی عادل کا عدل باطل نہیں کرسکتا، پھر فرمایا: تقدیروں پر ایمان لانا بھی ایمان کے تقاضوں میں سے ہے۔ [أبو داؤد]

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

ترجمہ: جو مسلمان عذر والے نہیں ہیں ان میں جو بیٹھے رہنے والے ہیں، اور جو اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں، برابر نہیں ہیں، جو لوگ اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرنے والے ہیں، ان کو بیٹھے رہ جانے والوں پر اللہ تعالیٰ نے بڑے درجے کی فضیلت دی ہے، اور سب سے اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے فضیلت دی ہے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہ جانے والوں پر اجر عظیم عطا فرما کر ﴿۹۵﴾ جو اس کی طرف سے درجات اور بخشش اور مہربانی کی صورت میں ملے گا، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ﴿۹۶﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیت میں دو مرتبہ ﴿فَتَبَيَّنُوْا﴾ کے تکرار سے خطرہ پیدا ہوا کہ آئندہ لوگ جہاد میں جانے اور شرکت سے کہیں معذوری ظاہر نہ کریں۔ نیز حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو جس شدت سے تنبیہ ہوئی اس نے بھی لوگوں کے لئے گھبراہٹ پیدا کی، اس خدشے کو دور کرنے کے لئے یہ آیات نازل ہوئیں، اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی فضیلت و برتری کے بیان کے ساتھ جہاد کی ترغیب دے دی۔

قانونِ جہاد کی رُو سے اب لوگ چار گروہوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں: پہلا گروہ منافقین کا ہے، جن کے

دلوں میں نفاق کا اختیاری مرض ہے، جن کا بیان ''لَیُبَطِّئَنَّ'' میں آچکا ہے، کہ وہ جان بوجھ کر بلا عذر جہاد سے گریز کرتے ہیں، اور گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔

دوسرے گروہ کے قاعدین میں وہ لوگ ہیں جو بالفعل جہاد میں شریک نہیں ہوتے، مگر جب ضرورت پڑے اور اعلیٰ قیادت کا فرمان جاری ہو، تو محاذِ جنگ پر جانے کے لئے بخوشی تیار ہو جاتے ہیں۔

تیسرا گروہ مجاہدین کا ہے، جو بالفعل جہاد میں شریک ہو کر مال وجان کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔

اور چوتھا گروہ معذوروں کا ہے، جو کسی عذر کی وجہ سے شریک جہاد نہیں ہو سکتے، مگر اہلِ ایمان کے خیر خواہ ہیں، گھروں میں بیٹھ کر مجاہدین کے لئے دعائیں کرتے ہیں، اور ان کے خلاف کوئی پروپیگنڈا نہیں کرتے۔ بخلافِ منافقین کے، کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر مجاہدین کے خلاف زہر افشانی کر کے لوگوں کی ہمت اور حوصلے پست کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی وجہ سے ان چاروں گروہوں میں سے اللہ تعالیٰ شانہ نے منافقین کی مذمت بیان فرمائی ہے، اور قاعدینَ سے ''اَلْحُسنیٰ'' بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے۔ مجاہدین کو بلند درجات اور مغفرت ورحمت کی خوشخبری سنائی ہے، اور معذورین کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

آیت کریمہ میں اول تو یہ فرمایا کہ:

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ﴾ کہ جو لوگ جہاد میں شریک نہیں ہیں، گھروں میں بیٹھے ہیں، اور وہ معذور بھی نہیں ہیں، تو یہ لوگ ان لوگوں کے برابر (اجر وثواب میں) نہیں ہو سکتے جو اپنے مال اور جان سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں، کسی قسم کا بھی جہاد ہو، بہر حال مجاہد کا درجہ گھر میں بیٹھے والوں سے کہیں زیادہ افضل ہے۔

پھر فرمایا کہ مجاہدین کو اللہ تعالیٰ نے قاعدین پر فضیلت دی ہے، اور ان کا درجہ بہت بڑھایا ہے۔ لفظ درجۃ نکرہ ہے، اس کی تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ اس درجے کی بڑائی وعظمت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں، اسے وہی بہتر جانتا ہے، لہٰذا قاعدین یہ نہ سمجھیں کہ ہمارا تھوڑا نقصان ہوا، بلکہ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ مجاہدین سے ہزاروں سال جنت میں جانے سے پیچھے رہ گئے، اور مجاہدین آگے نکل گئے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب وحی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا، وہ دوات اور لوح لے کر حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت اِملاء فرمائی، پیچھے حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ

نابینا موجود تھے، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نابینا اور معذور ہوں، میں جہاد میں شرکت نہیں کرسکتا، مجھے یہ فضیلت کیسے مل سکتی ہے؟ اس پر لفظ ﴿غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ﴾ نازل ہوا۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ران مبارک میری ران پر تھی، جب وحی نازل ہوئی، تو میری ران پر اس قدر بوجھ پڑا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ران ٹوٹ گئی، اور ریزہ ریزہ ہوگئی، یہ وحی کا بوجھ تھا، جسے ﴿إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا﴾ [المزمل:۵] (ہم آپ پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں) کہا گیا تھا۔

بہرحال! معذورین جہاد سے مستثنیٰ ہوئے، جیسے مریض، نابینا، اپاہج بہت بوڑھے وغیرہ۔ گویا لفظ ﴿غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ﴾ کا نزول بعد میں ہے، اس کی نظیر وہ کلمہ ہے، یعنی ''مِنَ الْفَجْرِ'' جو سورۂ بقرہ میں ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ نزولِ وحی کے لئے پوری آیت کا ہونا ضروری نہیں ہے، اور یہی راجح قول ہے۔

﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین اور قاعدین سب کے لئے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے۔ بھلائی سے جنت مراد ہے، جیسا کہ روح المعانی میں امام قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔ چونکہ ایمان اور فرائض کی ادائیگی میں سارے برابر ہیں، اس لئے سب کے جنت میں داخل ہونے کا وعدہ فرمایا۔ البتہ فرق مراتب کے اعتبار سے مقامات میں فرق ایک ضروری امر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاد اکثر وبیشتر اوقات میں فرض کفایہ ہے، اور جب جہاد فرض عین ہوگا تو پھر قاعدین کے لئے پیچھے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جہاد فرض عین نہ ہونے کی صورت میں جو لوگ اپنے فرائض واجبات میں مشغول رہتے ہوئے جہاد میں شریک نہ ہوں، خصوصاً جو حضرات جہاد بالسیف کے علاوہ دوسری دینی خدمات میں مشغول ہوں، ان کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنانا ہرگز درست نہیں، کیونکہ سارے دینی شعبے اسی طرح ضروری ہوتے ہیں جس طرح جہاد فی سبیل اللہ، جبکہ وہ فرض کفایہ کے درجہ میں ہو۔ قرآن وحدیث اور ان دونوں سے متعلقہ علوم کی تعلیم اور تدریس بھی خالص دینی مشغلہ ہے، اور نبوت کا اصلی ورثہ ہے۔

ابوداؤد اور ترمذی کی روایت میں جہاد باللسان کا بھی ذکر ہے، اور جہاد بالسنان کا بھی، یعنی زبان کے ساتھ بھی ہے، اور اسلحہ کے ساتھ بھی ہے۔ ابوداؤد کی روایت یہ ہے کہ: جَاهِدُوا الْكُفَّارَ وَالْمُشْرِكِيْنَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ۔ یعنی کفار ومشرکین سے جہاد کرو اپنے مالوں، جانوں اور زبانوں کے ساتھ۔

تو گویا بوقتِ ضرورت لسانی جہاد بھی فرض ہو جاتا ہے، تعلیمِ قرآن وحدیث، تبلیغِ احکامِ شریعت، اسی طرح تالیف وتصنیفِ کتب، یہ سب جہادِ لسانی کے شعبے ہیں، اور جہاد کے حصے ہیں۔ درس وتدریس، تعلیمِ کتاب وسنت، تالیف وتصنیف اور تبلیغ کے ذریعہ جہالت کو مٹانا، علم کو پھیلانا، اعمالِ صالحہ کی ترویج واشاعت کرنا، ایمان اور توحیدِ الٰہی کو عام کرنا، شرک وفواحش اور منکرات کا قلع قمع کرنا، جہاد ہی کا حصہ ہے۔ انہی چیزوں کے طفیل سے تو جہادی سرفروش مجاہد تیار ہوتے رہتے ہیں۔

دراصل رجالِ کار علماء امت ہی کے مساعی جمیلہ اور کوششوں سے تیار ہوتے ہیں، یہی چیز جہاد ہے، بلکہ جہاد کبیر ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے: يُوْزَنُ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ بِدَمِ الشُّهَدَاءِ۔ قیامتؒ کے دن اللہ تعالیٰ تصنیف وتالیف کرنے والے علماء کرام کی سیاہی کو شہید کے خون کا درجہ عطا فرمائیں گے۔ تصنیف وتالیف کی اتنی بڑی فضیلت آئی ہے، گویا جہاد کی یہ چار شکلیں واضح ہو گئیں:

(۱) تصنیف وتالیفِ کتب۔ (۲) تعلیمِ کتاب وسنت۔ (۳) تبلیغِ احکام۔ (۴) جہاد بالسنان، اور اسلحہ کا استعمال۔ مجاہد کی زندگی ایک عجیب وغریب قربانی کی زندگی ہے، مجاہد عشقِ الٰہی میں شب وروز مستغرق رہتا ہے، بسا اوقات وہ فرشتوں کا نظارہ بھی کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ شانہ کے نازل کردہ سکینہ میں وہ عجیب وغریب کیفیتوں میں ڈوبا ہوا، اور مست رہتا ہے۔

کئی مجاہدین سے سنا کہ عین لڑائی میں ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی نظر آئے، اور اپنا تعارف کر کے ہماری حوصلہ افزائی کی، اور تسلی دیدی۔ یہ جہاد ہی کی برکت ہے، جس نے روس جیسے ناقابلِ تسخیر مملکت کو پارہ پارہ کیا، پھر چیونٹیوں کے نہتے بھوکے پیاسے لشکر نے پچاس کے قریب ملکوں، یعنی ہاتھیوں کے لشکر پر یلغار کر کے انہیں لوہے کے چنے چبانے پر مجبور کیا، اور پورے عالم میں انہیں ذلیل وخوار کر کے عبرتناک شکست سے دوچار کر دیا۔ آج وہ مخمصہ کے عالم میں ایسے سرگرداں ہیں کہ انہیں نہ لڑنے کی جرأت ہے، نہ بھاگنے کی ہمت۔ وہ اتنے ذلیل وخوار ہیں کہ روزانہ ان کے سپاہی خودکشی کر رہے ہیں۔

جنگِ بدر کو اب ڈیڑھ ہزار سال ہو چکے، اگر وہ یاد نہیں تو آج بھی ربّ العزّت کی نصرت کو دیکھنا اور مشاہدہ کرنا ہو تو یہاں نزدیک افغانستان کی سرزمین پر آپ کو نظر آئے گی۔

﴿وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو فضیلت بخشی ہے پیچھے

بیٹھنے والوں پر۔اور اجر عظیم بھی۔

﴿دَرَجٰتٍ مِّنۡهُ﴾ حدیث شریف میں ان درجات کو سو درجات بتایا گیا ہے،اور ہر درجہ اتنا بڑا ہوگا جتنا آسمان وزمین کا درمیانی فاصلہ۔

﴿وَمَغۡفِرَةً وَّرَحۡمَةً ؕ﴾ انہیں بخشش بھی نصیب ہوگی،اور رحمتِ الٰہی بھی۔﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا﴾ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا،نہایت مہربان ہے،اور جو لوگ اس کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کرتے ہیں،وہ ان پر از حد مہربان وشفقت کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَفّٰٮهُمُ الۡمَلٰۤـئِكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِيۡمَ كُنۡتُمۡ ؕ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا ؕ فَاُولٰۤـئِكَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَـنَّمُ ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ۙ‏ ﴿۹۷﴾ اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ حِيۡلَةً وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ سَبِيۡلًا ۙ‏ ﴿۹۸﴾ فَاُولٰۤـئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّعۡفُوَ عَنۡهُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا‏ ﴿۹۹﴾

ترجمہ: بیشک فرشتے جن لوگوں کی جان ایسی حالت میں قبض کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کررکھا تھا،ان سے فرشتے کہتے ہیں کہ: تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم بے بس تھے زمین میں،فرشتے کہتے ہیں: کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم ترک وطن کرکے دوسری جگہ چلے جاتے؟ سو یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے،اور وہ بری جگہ ہے ﴿۹۷﴾ لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے قادر نہ ہوں کہ کوئی تدبیر کرسکیں،اور نہ راستے سے واقف ہوں،امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا،اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا،بخشنے والا ہے ﴿۹۹﴾

معارف ومنازل

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا (اور ہجرت نہ کی تھی) وہ مشرکین ہی کے ساتھ رہتے تھے،اور مشرکین کی جماعت کی تکثیر کرتے تھے،اگر مشرکین کہیں جنگ کرنے جاتے تو یہ بھی ساتھ چلے جاتے تھے،جس سے مشرکین کی جماعت میں اضافہ ہوجاتا تھا،نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کو بعض مرتبہ تیر لگ جاتا تھا،جس سے قتل ہوجاتے تھے،یا تلوار وغیرہ سے مقتول ہوجاتے تھے۔(امام ابو حیان رحمۃ

اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پانچ آدمی جو کہ مسلمان تھے، اور بدر کے دن مشرکین کی طرف سے آئے تھے، اور مارے گئے تھے) اسی پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی۔

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ شانہ نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ کوئی شخص ہجرت کے مواقع میسر ہونے کے باوجود ہجرت نہ کرے، اپنے دین وایمان اور اعمالِ اسلام کے لئے فکر مند نہ ہو، اور کافروں ہی میں گھسا رہے، اول تو ایسے لوگوں کو ﴿ظَالِمِیٓ اَنۡفُسِهِمۡ﴾ فرمایا، کہ یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، (ترکِ ہجرت اور ترکِ جہاد کی وجہ سے)۔

اور فرمایا کہ جب فرشتے ان کی جانیں قبض کرنے لگتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ تم کہاں تھے؟ دین کے ضروری کام کیوں بجا نہیں لاتے تھے؟ وہ جواب دیتے ہیں: ہمارا رہنا سہنا ایسی سرزمین میں تھا جہاں ہم مغلوب اور بے بس تھے، اس لئے بہت سی ضروریاتِ دین پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ فرشتے جواب میں کہتے ہیں: کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع اور کشادہ نہ تھی؟ تم ترکِ وطن کر کے کسی دوسری جگہ چلے جاتے، اور وہاں دینی فرائض ادا کرتے، جیسے کہ صحابہ کرام مہاجرین رضی اللہ عنہم نے کیا۔ ابتداءِ اسلام میں مدینہ منورہ کے لئے ہجرت کرنا فرض تھا، جن لوگوں نے بطورِ نفاق اسلام قبول کیا وہ لوگ اپنے نفاق کی وجہ سے مستحقِ عذاب ہوئے، اور جن لوگوں نے اسلام تو دل سے قبول کیا، لیکن قدرت ہوتے ہوئے ہجرت نہ کی، تو وہ ترکِ فرض کی وجہ سے مستحقِ عذاب ہوئے۔

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ان کی وجہ سے کفار و مشرکین کی مدد ہوتی تھی، ان لوگوں کی وجہ سے ان کی عددی قوت میں اضافہ ہوتا تھا۔ ہجرت کوئی سفرِ تجارت نہیں ہے کہ مال کے ساتھ اور آسانیوں کے ساتھ گھر سے نکل جائیں، اور پھر واپس آجائیں، یہ تو ایک مشکل چیز ہے، دین وایمان کو بچانے کے لئے گھر بار زمین وجائیداد وغیرہ سب چھوڑنا پڑتا ہے، وطن کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کرنا پڑتا ہے، پھر آسانی سے دشمن بھی نکلنے نہیں دیتے، اگر موقع لگ گیا تو آل واولاد کو ساتھ لے لیا، ورنہ ان کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے چھوڑنا پڑتا ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ابتداءِ اسلام میں جو ہجرتیں کی ہیں، ان کے دردناک واقعات جو کتابوں میں موجود ہیں انہیں پڑھ کر کلیجہ پھٹ جاتا ہے، اور زبانیں گنگ اور کان بہرے ہوجاتے ہیں۔ آپ صرف تینوں ہجرتوں کے واقعات پر نظر ڈالیں، تو آپ کو ان کی قربانیوں اور تحفظِ دین وایمان والی خدمات کا اچھی طرح اندازہ ہوجائے گا۔

انہوں نے ان سات چیزوں کی قربانی دے کر ایمان خریدا، اور حاصل کیا:

(۱) جان کی قربانی دی۔ (۲) راحتوں کی قربانی دی۔ (۳) بیوی بچوں کی قربانی دی۔ (۴) عزیزوں رشتہ داروں کی قربانی دی۔ (۵) گھر بار، دکان، زمین، جائیداد کی قربانی دی۔ (۶) وطن وشہر وملک کی قربانی دی۔ (۷) کاروبار، تجارت، مالداری وغیرہ کی قربانی دی۔

یہ سب کچھ چھوڑ کر ایک ہی ایمان کی حفاظت و بچانے کی خاطر راتوں کی تاریکی میں بیوی بچوں سے رخصت لے کر آہِ سرد کے ساتھ روانہ ہو رہا ہے، یا حبشہ یا مدینہ۔ یہ ہے ہجرت اور حفاظتِ ایمان کا سامان۔

سبحان اللہ! ہمارا ایمان موروثی ہے، بغیر کسی ادنیٰ قربانی کے مفت پدری و مادری میراث کے طور پر ہمیں ملا ہے، اسی وجہ سے مفت راچہ گفت، مفت کی چیز ہمیشہ بے قدر ہوتی ہے، خاص کر وراثت میں ملی ہوئی چیز کی تو کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے بیٹوں سے کہا کرتے تھے کہ: ہمارا ایمان جانگداز قربانیوں کا نتیجہ وثمرہ ہے، بے حد قربانیاں دے کر ہم نے پایا، اور حاصل کیا ہے، جبکہ تمہارا ایمان موروثی اور مفت کا ہے، اس لئے تمہارے پاس ایمان کی وہ قدر و قیمت نہیں جو ہمارے پاس ہے۔

اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جو ہجرت کے موقع پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پیش آئے۔ ان میں سے ایک واقعہ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، ان کے بڑے مناقب وفضائل ہیں۔، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے شہادت کی موت سے پہلے وصیت فرمائی کہ میری نماز جنازہ صہیب رضی اللہ عنہ پڑھائیں گے۔ اس وقت سوائے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سارے عشرہ مبشرہ موجود تھے، مگر انتخاب صہیب رضی اللہ عنہ کا ہوا۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ یہ ہے کہ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بمعیتِ رفیق غار ومزار رضی اللہ عنہ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ پہنچے، تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو بھی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ ہوا، ان کے پاس نقدی مال کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا، مکہ کے کسی محفوظ وادی کے پاس اپنا مال دفن کر کے مطمئن ہو گئے، ایک دن چھپ کر ہجرت کی غرض سے نکلے، اور روانہ ہو کر اکیلے جانے لگے، کفار مکہ کو پتہ چلا، وہ لوگ مسلح ہو کر دوڑے، اور راستے میں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں للکار کر کہا: اے مکہ والے سن لو! میں پہلے تیروں سے تمہاری خبر لوں گا، اور جب تیر ختم ہو جائیں گے تو تلوار سے مقابلہ کروں گا، اگر تم کو مقابلہ منظور ہے تو مقابلہ کرلو، اور اگر مال چاہتے ہو، تو مکہ میں میرا مال دفن ہے، جگہ تمہیں بتاؤں گا جاؤ لو، اور میرے مدینہ کے سفر ہجرت میں حائل نہ بنو،

مجھے اپنے نبی ﷺ کی زیارت سے محروم نہ کرو۔

کفارِ مکہ دفینہ حاصل کرنے پر رضامند ہوگئے، اور اِن کا پیچھا چھوڑ دیا، اور انہوں نے اپنے پورے مال جو دفن کیا تھا انہیں بتا دیا، اور ان کی گرفت سے بچ نکلے، اور مدینہ طیبہ پہنچ گئے، یہاں لوگوں نے ان کا استقبال کیا، اس پر یہ آیت اتری: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ وَاللهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ [البقرة: ۲۰۷] (اور لوگوں میں سے وہ شخص بھی ہے جو اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان کا سودا کر لیتا ہے، اور اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے)۔

سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رَبِحَ بَيْعُ اَبَا يَحْيٰ۔ یعنی ابا یحیٰ کی بیع نفع آور ہوئی۔ ابا یحیٰ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی تجارت کامیاب اور فائدہ مند رہی، مال کا بدلہ جلدی اور عنقریب اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے، جس کے متعلق آئندہ آیتوں میں وعدہ ہے۔

فتح مکہ مکرمہ کے بعد ہجرت کی فرضیت منسوخ ہوگئی، لیکن حسبِ حالات دین وایمان بچانے کے لئے ہمیشہ ہجرت کی مشروعیت باقی ہے، اور جب بھی مسلمانوں پر کسی علاقہ میں عرصۂ حیات تنگ ہو تو انہیں ہجرت کر کے اپنے دین وایمان بچانا فرض ہو جاتا ہے۔ انقلاباتِ زمانہ، اور اس قسم کے پیچیدہ حالات میں ایسا بہت ہوتا ہے کہ کچھ مسلمان کافروں کے علاقے میں رہ جاتے ہیں، باوجود موقع پانے کے گھر بار، مال جائیداد یا رشتہ داروں کی محبت میں اپنی جائے پیدائش ہی میں جمے رہتے ہیں، نہ نماز ادا کر سکتے ہیں، نہ اذان دے سکتے ہیں، نہ اور کچھ، بلکہ بعض حالات تو نہایت خطرناک ہوتے ہیں، حتیٰ کہ ان کی عورتیں اور بچیاں اور دیگر اموال بھی غیر محفوظ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے حالات میں ہجرت کی توفیق دے۔ اگر ممکن نہ ہو تو ان کے اموال اور جانوں، بیوی بچوں کی حفاظت فرمائے۔ آمین

قربِ قیامت ایمانداروں کے لئے بڑا خطرناک ثابت ہوگا، کیونکہ کفر اپنے عروج پر ہوگا، اور حق پر آہستہ آہستہ زوال آئے گا۔ آج کل تو لوگ الٹی راہ چل رہے ہیں، انہیں نہ ایمان وتقویٰ اور شرعی حیا وغیرت کی فکر ہے، اور نہ وہ اپنے دینی اقدار کا تحفظ چاہتے ہیں، روشن خیالی اور مذہب سے دوری اپنے عروج پر ہے، جیسے کہ کفار خالص دنیا دار جیسے مال ومتاعِ دنیا پر مر رہے ہیں، بعینہٖ یہی کیفیت مسلمانوں کی ہے۔ اپنے ملک میں رہتے ہوئے شرعی احکام کو ترک کر چکے ہیں، جب محض دنیا اور عیش وعشرت کی خاطر یورپ جاتے ہیں، یہاں سے ہجرت کر کے تو وہاں ان کا جو نام

اسلام تھا وہ بھی ختم ہو جائے گا، بے دینی میں وہ یورپ والوں سے بھی چند قدم آگے چلیں گے، اور سارے اسلامی اقدار پر پانی پھیر کر انگریزوں سے بھی بدتر ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرمائے۔ آمین

﴿اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾﴾ ماقبل کے حکم سے استثناء کرتے ہوئے فرمایا کہ جو مرد، عورتیں اور بچے کافروں میں پھنس جائیں، وہاں مغلوب ہوں، ہجرت سے عاجز ہوں، کوئی تدبیر سامنے نہ ہو، راستہ بھی معلوم نہ ہو کہ کہاں جائیں، کیا کریں، تو ایسے لوگ مؤاخذے سے مستثنیٰ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: میں اور میری والدہ بھی انہیں لوگوں میں سے تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے معذور قرار دیا۔ [بخاري]

ان کے علاوہ اور متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم تھے، جیسے عیاش بن ابی ربیعہ، سلمہ بن ہشام، اور ولید بن الولید رضی اللہ عنہم، جن کے لئے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم قنوت نازلہ میں دعا کیا کرتے تھے۔ [بخاري] یہ لوگ کافروں کے اندر پھنسے ہوئے تھے، ہجرت سے عاجز تھے، ان کے لئے مغفرت و بخشش کا وعدہ ہوا، اور انہیں معذور و مجبور قرار دیا گیا، اور ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ ان مستضعفین مغلوبین کو معاف فرمائے گا، وہ معاف فرمانے والا، بخشنے والا ہے۔

......❁......❁......❁......

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ
مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾

ترجمہ: اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں وطن چھوڑے، وہ زمین میں جانے کی بہت سی جگہ پائے گا، اور اسے کشادگی ملے گی، اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کی نیت سے نکل کھڑا ہو، پھر اس کو موت آپکڑے، تو یقینی طور پر اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ثابت ہو گیا، اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ﴿۱۰۰﴾

معارف منازل

ہجرت فرض ہونے کے ساتھ کارِ ثواب اور موجب مغفرت و رحمت کے علاوہ ایک قدرتی انعام بھی ہے، اس

کی بدولت مہاجرین کو انصار پر برتری حاصل ہے۔ اگر کوئی شخص ہجرت پر آمادہ ہو، تو اس کے سامنے کئی خطرات ہیں، انہی خطرات کے پیش نظر تو وعدہ ہو رہا ہے کہ گھبراؤ مت، آخرت کے اجر عظیم کے علاوہ اللہ تعالیٰ مہاجرین کے لئے برکت وخوشحالیاں، اور امن وسکون کا وعدہ فرما رہے ہیں۔ کیوں نہیں جو شخص خداوند ذوالجلال کا مہمان ہوگا، وہ ہرگز ناکام وخوار نہیں ہوگا، چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا، مہاجرین کو دار الہجرۃ مدینہ منورہ میں وہ خوشحالی اور قابلِ رشک زندگی میسر آئی کہ انہوں نے زندگی بھر آبائی وطن مکہ مکرمہ میں جانے کا تصور بھی نہ کیا۔ اگر کبھی حج وعمرے پر گئے تو بے قراری کے ساتھ فوراً مدینہ منورہ لوٹے۔

شانِ نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت ضمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی نیت سے نکلنے کا ارادہ کیا، اپنے گھر والوں سے کہا کہ مجھے سواری پر سوار کردو، اور مشرکین کی سرزمین سے نکال دو، تاکہ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاؤں۔ جب وہ روانہ ہو کر چلے، تو راستے میں موت آگئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچ سکے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوا، اور آیت بالا نازل ہوئی۔ [لباب النقول]

دوسرا واقعہ حضرت ابوضمرہ زرقی رضی اللہ عنہ کا ہے۔ وہ مکہ معظمہ میں مشرکین میں پھنسے ہوئے تھے، جب آیت کریمہ: ﴿اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ﴾ کا نزول ہوا، اور مدینہ منورہ سے یہ آیت کریمہ مکہ مکرمہ پہنچی، تو یہ بڑے بیتاب ہوئے، اور کہنے لگے: میں مالدار ہوں، نکلنے کی تدبیر بھی کرسکتا ہوں، تو اپنے گھر والوں سے کہا کہ مجھے سواری پر سوار کردو، اور مکہ مکرمہ سے نکال کر چھوڑ دو، تاکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاؤں۔ پس مکہ مکرمہ سے روانہ ہو کر مقام تنعیم پہنچے، اور وہاں پیغام کے ساتھ وفات پائے، اس پر آیتِ بالا کا نزول ہوا۔

لباب نے ایک واقعہ حضرت خالد بن حرام رضی اللہ عنہ کا لکھا ہے، کہ وہ حبشہ سے مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے، راستے میں ان کو زہریلے سانپ نے کاٹ لیا، جس کی وجہ سے وہ وفات پاگئے، اور یہ آیت نازل ہوئی۔ صاحب لباب النقول نے اسی طرح کا واقعہ حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ عنہ کا بھی نقل کیا ہے۔ یہ چاروں واقعات آیت کریمہ کے لئے اسبابِ نزول بن سکتے ہیں، کیونکہ اسبابِ نزول کا تعدد کوئی مضر نہیں، لہٰذا ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ سببِ نزول اگرچہ وہ واقعات ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، مگر آیت کا مفہوم عام ہے، اس

میں واضح طور پر یہ اعلان فرمایا کہ جو کوئی شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کے لئے نکل کھڑا ہو، اور اس کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہو، پس اگر منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکا ہو، تو اجر و ثواب کا حقدار ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اتنا عام ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے محض صدق نیت و اخلاص پر فیصلہ لکھ دیتے ہیں، اور اجر و ثواب عنایت فرما دیتے ہیں۔

ہجرت کے علاوہ دوسرے اعمال کا بھی یہی حال ہے، مثلاً طلبِ علم، تبلیغ، حج، عمرہ، وغیرہ کاموں کے لئے محض پختہ عزم اور خلوص کے ساتھ روانگی ہو، اور منزل سے پہلے موت آئی ہو، تو ثواب کا فیصلہ فرما دیتے ہیں۔

اس مضمون پر بکثرت احادیثِ مبارکہ ناطق اور وارد ہیں۔ امام طبرانی اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہما نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ اگر کوئی شخص حفظ قرآن کریم شروع کرے، اور تکمیل سے پہلے اس کی وفات ہو جائے، تو قبر میں ایک فرشتہ مقرر ہوگا جو قیامِ قیامت سے پہلے حافظ قرآن کے حفظ کی تکمیل کرائے گا۔ [بہشتی زیور، فضائل قرآن]

چاہئے کہ بکثرت لوگ اس عظیم انعام کو حاصل کرنے کی خاطر حفظ قرآن شروع کر کے اپنی قبروں کو جنتی مدرسہ بنائیں۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ
خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝١٠١

ترجمہ: اور جب تم زمین میں سفر کرو، تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کرلو، اگر تم کو اس بات کا خوف ہے کہ کافر لوگ تم کو فتنہ میں ڈال دیں گے، بے شک کافر تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں ۝١٠١

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ شانہ نے دین اور دینی امور میں نہایت آسانی کی ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو تمام احکامِ شریعت میں کوئی سختی اور مشکل نہیں، جو انسانی استطاعت سے باہر ہو۔ پوری تفصیل سورۂ مائدہ، سورۂ نحل اور سورۂ حج میں اِن شاء اللہ بیان کریں گے۔

سفر خواہ کوئی بھی ہو، تکلیف سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے سفر میں اللہ تعالیٰ نے روزے کے متعلق بھی آسانی

فرمائی، اور نمازوں کے بارے میں بھی، حالانکہ نمازوں میں اتنا وقت صرف نہیں ہوتا، مگر سہولت کا فائدہ شریعت کی نظر میں مبنی بر شفقت ضرور ہے۔

ہر سفر میں قصر نہیں ہوتا، جب تک تین منزل کا سفر نہ ہو، ایک منزل سولہ میل کا ہے، پس مسافتِ قصر تین منزل ۴۸ میل ہے۔ کلومیٹر کے حساب سے ۸۸ کلومیٹر ہے، اس سے کم مسافت میں قصر جائز نہیں ہے۔ اتنی مسافت کے لئے جب اپنی بستی کی حدود سے نکل جائے تو قصر شروع کردے، اگرچہ ذرّا دور ہی پہنچا ہو، اور جب تک کسی بستی یا شہر میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ کرے نماز قصر ہی پڑھتا رہے۔ اگر کسی جگہ پندرہ دن قیام کی نیت کرلی تو وہاں سے چلنے تک ہر نماز پوری پڑھے، قصر نہ کرے۔

یاد رہے کہ قصر ضروری ہے، اختیاری نہیں ہے، تو پوری نماز پڑھنے سے گناہ ہوگا، بخلاف روزہ کے، کہ سفر میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے دونوں میں اختیار حاصل ہے۔ قصر کے مسائل بہت زیادہ ہیں، کتب فقہ میں دیکھ لیں۔

قصر صرف چار رکعت والی نمازوں میں ہے، یعنی ظہر، عصر اور عشاء کی چار رکعتوں کے بجائے دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ نمازِ فجر اور مغرب میں قصر نہیں ہے، ان دونوں کو سفر میں بھی پورا پڑھنا فرض ہے۔

اگر مسافر کسی مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اسے بھی امام کی اقتداء میں چار رکعت والی نماز پوری پڑھنی فرض ہے۔ مقیم اگر مسافر کے پیچھے اقتداء کرلے، تو جب امام دو رکعت پر سلام پھیرے، تو مقیم مقتدی سلام پھیرے بغیر کھڑے ہوکر اپنی چار رکعت پوری کرنے کے لئے باقی رکعات پڑھ لے۔

سفر میں سنتوں کے بارے یہ یاد رکھیں کہ سنتیں نفل ہوجاتی ہیں، چاہے پڑھ لیں چاہے چھوڑ دیں۔ البتہ اگر جلدی ہو، سواری اور ساتھیوں کے چھوٹ جانے کا ڈر ہو، تو سنتیں بالکل ہی چھوڑی جاسکتی ہیں، اگر اطمینان ہو اور جلدی کا تقاضا نہ ہو، تو سنتیں بھی پڑھ لیں۔ سنتوں میں قصر نہیں ہے، وہ پوری پڑھی جاتی ہیں۔ فجر کی سنتوں کو کسی بھی حال میں ترک نہ کرے، اور وتر کا بھی یہی حکم ہے۔

﴿اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ اگر تم کو ڈر ہو کہ کافر لوگ تم کو فتنہ میں ڈال دیں گے۔ آیت کریمہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اگر امن ہو تو قصر نہ کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہی سوال کیا تھا کہ یا رسول اللہ! اب تو امن و امان ہے، دشمن سے کسی قسم کا خوف نہیں، چاہئے کہ ہم نماز پوری پڑھا کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر صدقہ ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا صدقہ

قبول کرو۔[مسلم] پھر سنتِ متواترہ سے یہی ثابت ہے کہ امن ہونے کے باوجود قصر پر عمل ہوتا رہا ہے، یہی مختار اور ائمہ میں متفق علیہ رہا ہے۔ الحمدللہ

وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۱۰۲ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝۱۰۳

ترجمہ: اور جب آپ ان میں موجود ہوں، پھر ان کے لئے نماز قائم کریں، تو چاہئے کہ ان میں سے ایک جماعت آپ کے ساتھ کھڑی ہو جائے، اور یہ لوگ اپنے ہتھیار لے لیں، پھر جب سجدہ کر چکیں تو یہ تمہارے پیچھے ہو جائیں، اور دوسری جماعت آجائے، جنہوں نے نماز نہیں پڑھی ہو، وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھیں۔ اور اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار ساتھ لے لیں، کافروں کی یہ خواہش ہے کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے غافل ہو جاؤ تو تم پر یکبارگی حملہ کر دیں، اور تم پر اس بات کا کوئی گناہ نہیں کہ اگر بارش سے تکلیف ہو، یا تم بیمار ہو، تو اپنے ہتھیار رکھ دو، اور اپنے بچاؤ کا سامان لے لو۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار فرمایا ہے ۝۱۰۲ سو جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر، پھر جب مطمئن ہو جاؤ تو نماز قائم کرو۔ بیشک نماز مؤمنین پر فرض ہے، جس کا وقت مقرر ہے ۝۱۰۳

معارف ومنازل

ایک ایسا حکم جس نے سارے جہاں کے عقلاء کو حیران کر دیا:

رشد وہدایت کا کیسا عالمگیر نظام ہے؟ اور پورے جہاں سے بے نیازی کا عالم ہے، اور کیسا حیران کن

عجیب وغریب نظارہ ہے؟ کہ دو لشکر آمنے سامنے مسلح، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے، برسر پیکار چاق وچوبند کھڑے ہیں، فضاء اتنا سوگوار ہے کہ چاروں طرف گرد وغبار کے بادل چھائے ہوئے ہیں، گھوڑوں کے پاؤں کے زوردار ٹاپوں سے زمین پارے کی طرح جھوم رہی ہے، میدان سرخ لالہ زار لگتا ہے، اس پر مخمل کا فرش بچھا ہوا ہے، انسانی اعضاء بکھرے پڑے ہیں، ہاتھ پاؤں کٹ رہے ہیں، انسانی قیمتی سر گیند کی طرح اڑ رہے ہیں، تلواروں اور نیزوں کی چمک سے بجلی کی طرح روشنی پھیل رہی ہے، تیروں کی بارش ہو رہی ہے، لگتا ہے کہ بادل سے اولے برس رہے ہیں، ایک ایسا خطرناک وخوفناک ہنگامہ خیز کیفیت ہے کہ معلوم نہیں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا؟

عین اسی کشمکش میں حکم ہوتا ہے کہ آؤ پہلے نماز ادا کرو، پھر لڑو۔ محض نماز نہیں، صلوٰۃ الخوف کے ساتھ جماعت کا اہتمام کرو، باری باری نماز بھی پڑھو، اور دشمن کی حرکت اور پوزیشن کی نگرانی بھی جاری رکھو، اور سجدۂ نیاز کو آگے اپنی فتح وکامیابی کا وسیلہ بنا کر اسے ادا کرو۔

یہ خصوصی، انوکھا اور حیران کن حکم کسی فلاسفر، سائنسدان، پروفیسر، بادشاہ، وزیر، گورنر کی سمجھ میں نہیں آتا، کہ یہ کیا ہے؟ اور کیسا بے ڈھب حکم ہے؟ ہاں! مگر وہ مرد قلندر اور فقیر وغریب مجاہد جس کے بدن پر لباس نہیں، جس کے سر پر لوہے کی ٹوپی نہیں، اور جس کے ہاتھ میں توپ وراکٹ نہیں، جس نے پیٹ پر پتھر باندھا ہو، اور ہر نشیب و فراز کو پیدل طے کیا ہو، جس کی ساری امیدیں اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہوں، اس حکم کا جاننے والا بھی وہی ہے، اس پر چل کر میدانِ کشت خون میں عمل کرنے والا بھی وہی ہے۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز ☆ قبلہ رو ہو کے زمین بوس ہوئی قوم حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز ☆ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے ☆ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

وہ سجدہ روئے زمین جس سے کانپ جاتی تھی ☆ اسی کو آج ترستے ہیں منبر ومحراب

الحمد للہ! اب یہ فلسفہ یورپ وامریکہ کو معلوم ہوا، اور ان کی سمجھ میں آیا کہ ایک باطنی مخفی قوت ضرور موجود ہے، جو کہ ہمارے عظیم سے عظیم منصوبوں کو خاک میں ملا کرنا کام کرتی ہے۔ اور یہ طاقت وہ ہے جس کے حضور نہتے اور بے سروسامان کمزور مخلوق صبح وشام جھک کر سجدہ ریز رہتی ہے۔

حضرت امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کا سب سے بڑا ہتھیار سجدہ ہے، اور اسی میں مسلمانوں کی

فتح مندی کا راز چھپا ہوا ہے۔ جب کرۂ ارض پر سجدوں کی کثرت رہے گی، مسلمان فتح مند رہیں گے، اور غلبہ پائیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

لباب النقول نے حضرت ابوعیاش زرقی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ ہم سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقام عسفان میں تھے، سامنے سے مشرکین آ گئے، جو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں تھے، (وہ اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے)۔ یہ لوگ ایسی جگہ تھے جو ہمارے اور ہمارے قبلہ کے درمیان تھی، سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو ظہر کی نماز پڑھائی، تو مشرکین نے کہا ہم نے غلطی کی، جب یہ لوگ نماز پڑھ رہے تھے اس وقت ان پر حملہ کر دیتے، ان کو تو ہمارے حملے کا خیال بھی نہ تھا، پھر کہنے لگے کہ ابھی ایک اور نماز آنے والی ہے (یعنی نماز عصر) یہ نماز ان کو اپنے بیٹوں سے اور اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب ہے، جب یہ لوگ آئندہ نماز میں مشغول ہو جائیں، تو ان پر حملہ کر دیا جائے، اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام ظہر اور عصر کے درمیان یہ آیت لے کر نازل ہوئے:

﴿وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ﴾

نماز خوف کئی طرح سے ثابت ہے، آیتِ بالا میں صلوٰۃ خوف کا جو طریقہ ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ امام نمازیوں کی دو جماعتیں بنائے، ان میں سے ایک جماعت دشمن کی طرف متوجہ رہے، اور دشمن کی نگرانی کرے، اور ایک جماعت امام کے پیچھے کھڑی ہو جائے، جب امام کے ساتھ کھڑی ہونے والی جماعت پہلی رکعت کے دونوں سجدوں سے فارغ ہو جائے، تو یہ لوگ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں، اور دشمن کی طرف چلے جائیں، اور وہ دوسری جماعت آ جائے جنہوں نے ابھی تک نماز شروع نہیں کی، ان کے آنے تک امام ان کی انتظار میں بیٹھا رہے، اب یہ گروہ ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھ لے، امام کی دو رکعتیں ہو گئیں، وہ سلام پھیر دے، اور دونوں جماعتوں کی ایک ایک رکعت ہوئی۔

اب یہ دوسری جماعت سلام پھیرے بغیر دشمن کی طرف چلی جائے، اور پہلی جماعت آ جائے، جس کی ایک رکعت باقی ہے، اپنی باقی ایک رکعت بغیر قراءت پڑھ کر سلام پھیر دے، (کیونکہ یہ جماعت لاحق ہے)، اور دشمن کی طرف چلی جائے، پھر دوسری جماعت (جو کہ مسبوق ہے) آ جائے، ان کی بھی ایک رکعت باقی ہے، وہ قرأت کے ساتھ اپنی باقی ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے۔

یہ ہر جماعت کو ایک ایک رکعت پڑھانا اس وقت ہے جب امام اور مقتدی مسافر ہوں۔ اگر امام مقیم ہو تو ہر

جماعت کو دو دو رکعتیں پڑھائے گا، باقی دو دو وہ باری باری سے خود پوری کر لیں۔ اگر نماز مغرب کی ہو تو پہلی جماعت کو دو رکعت، اور دوسری جماعت کو ایک رکعت پڑھائے۔ پھر نماز میں یہ آنا جانا چونکہ حالتِ اضطرار کی وجہ سے ہے، اور حکمِ الٰہی بھی ہے، اس لئے مُفسِد للصلوٰۃ نہیں ہے۔

صلوۃ الخوف کی مشروعیت سے نہ صرف نماز کی، بلکہ نماز باجماعت کی اہمیت معلوم ہو رہی ہے، جبکہ دشمن سر پر سوار ہے، اس وقت بھی نماز چھوڑنے کا ذکر تو کیا ہوتا، بلا جماعت نماز پڑھنے کا بھی موقع نہیں دیا گیا۔ ہاں! دشمن کا ہجوم اس انداز سے ہو جائے کہ ان کے حملے کی حفاظت سے کوئی راستہ ہی نہ ہو، اور نماز خوف پڑھنے کی صورت میں بھی حفاظت کی کوئی صورت نہ بن رہی ہو، تو پھر علیحدہ علیحدہ نماز پڑھ لیں، اور اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو نماز بالکل ہی چھوڑی جاسکتی ہے، جیسا کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ خندق کے موقع پر کیا تھا، پھر قضاء فرمائی تھی۔ سورۂ بقرہ میں گزر گیا۔

یہ ''صلوٰۃ خوف'' اس صورت میں ہے جب امام ایک ہی ہو، یا لوگ ایک ہی شخص کے پیچھے نماز پڑھنے پر اصرار کریں، اگر ایسی کوئی صورت نہ ہو تو صلوٰۃ الخوف کی بجائے دو امام، یا زیادہ بنا لیں، اور الگ الگ جماعت کا اہتمام کریں، یہ سب سے بہتر ہوگا۔

﴿وَلْيَأْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ﴾ یہ ضروری ہے کہ حالتِ نماز میں ہتھیار ساتھ ہوں، کیونکہ اگر دشمن حملہ کرے گا تو دفاع آسان ہو جائے گا۔

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى﴾ اگر بارش کی وجہ سے تمہیں تکلیف ہو، یا کسی بیماری کی وجہ سے تکلیف ہو، تو اسلحہ رکھنے میں حرج، یعنی گناہ نہیں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ سامان رکھنا اور ہوشیار رہنا، یا دشمن کے سامنے پہرہ دار بیٹھانا پھر بھی ضروری ہوگا، جبکہ ہنگامی حالات ہوں۔

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ﴾ جب نماز سے تم فارغ ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جاؤ، کھڑے ہو کر، بیٹھ کر، لیٹ کر۔ مطلب یہ ہے کہ یادِ الٰہی صرف نماز میں نہ ہو، بلکہ حالتِ جہاد کے عمومی حالات میں بھی کثرت کے ساتھ ذکر و اذکار، یادِ الٰہی کا ذکر قلبی اور ذکر لسانی دونوں طرح سے سلسلہ جاری رکھو، کیونکہ ذکرِ الٰہی تمام اعمال کے لئے بمنزلۂ روح کے ہے، تب ہی تو اس کے انقطاع سے فوراً قیامت قائم ہو جائے گی۔ کما رواہ مسلم۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: کَانَ یَذْکُرُ اللہَ فِیْ کُلِّ اَحْیَانِہٖ۔[بخاری] سرورِ کائنات ﷺ شب وروز ہر حال، ہر مرحلہ، بدونِ انقطاع ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ مراد ذکرِ قلبی ہے، کیونکہ ذکرِ لسانی میں انقطاع ہوسکتا ہے، جیسے کہ بیت الخلاء اور استنجاء کے مقامات پر۔ پھر فرمایا:

﴿فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ پھر جب خوف وخطرہ، یا دیگر سفری پریشانیوں سے مطمئن رہو، اور سکون پاؤ، تو نمازوں کو حسبِ سابق روایات پر قائم کرو۔ مفسرین کرام نے فرمایا ہے کہ اس کا تعلق ﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ﴾ کے ساتھ بھی ہے، کہ سفر میں قصر کرتے جاؤ، جب گھر پہنچ کر سفر کی صعوبتوں سے اطمینان پاؤ تو قصر چھوڑ دو، اور حسبِ سابق نمازوں کو پورا کر کے پڑھا کرو۔

باقی صلوۃ الخوف کے ساتھ اس کا تعلق تو واضح ہے، کہ جب خوف کا مرحلہ گزر جائے، اور اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز کو مقررہ قواعد کے مطابق ادا کیا کرو۔

﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ بے شک مقررہ اوقات اور متعین ومعلوم اوقات کے ساتھ مؤمنین پر نماز فرض ہے، جس کی فرضیت ابتداءِ نبوت سے ہوئی، پھر لیلۃ المعراج میں باقاعدہ اس کی فرضیت ہوئی۔ حدیث امامتِ جبرئیل علیہ السلام سے باقاعدہ پانچوں اوقات کا تعین ہوگیا، اب پابندی اوقات اور شرعی ترتیب کے ساتھ ادائیگی ارکان کے ساتھ نمازوں کا اہتمام بہت ضروری ہے، اور اَدَاءُ الصَّلوَات کا شمار شعائرِ اسلام میں سے ہے، جیسے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے فرمایا، اور تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ یَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا یَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ: اور دشمنوں کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو، اگر تم کو تکلیف ہوتی ہے تو ان کو بھی تکلیف ہوتی ہے، جیسا کہ تمہیں تکلیف ہوتی ہے، اور تم اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے ہو جو وہ امید نہیں رکھتے، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، حکمت والا ہے ﴿۱۰۴﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

بعض مفسرین کے مطابق اس آیت کا نزول غزوۂ حمراء الاسد کے موقع پر ہوا تھا۔ اور امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق اس کا نزول بدرِ صغریٰ کے متعلق ہے۔ مگر کلام کی رفتار سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس آیت کا تعلق ﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ﴾ کے ساتھ ہے۔ پس غزوۂ احد وحمراء الاسد اور بدرِ صغریٰ سب کے ساتھ تعلق ہوگا (جیسے پہلے بیان ہوا)۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں بار بار جو کہا جا رہا ہے کہ ﴿وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ﴾ اپنے بچاؤ کے لئے تم ہر وقت سامان تیار رکھو، اور اپنے دفاع سے غافل نہ ہوں۔ اسی طرح حکم دیا جا رہا ہے کہ تھکے ہوئے اور زخمی دشمن کو آرام کرنے کا موقع نہ دو، بلکہ ہر وقت مستعد رہو، اور دشمن کا تعاقب جاری رکھو، اس کو شیر بہادر بننے کا موقع فراہم نہ کرو، اور یہ بہانہ ہرگز نہ کرو کہ ہم تھکے ہوئے ہیں، یا زخمی ہیں، یا ہم دکھ و تکلیف میں ہیں، یا ہم پریشان و درماندہ ہیں، کیونکہ جس طرح یہ چاروں باتیں تمہارے اندر ہیں، اسی طرح وہ بھی انہی چاروں باتوں میں مبتلا ہیں۔ آگے یہ بھی تم سوچو کہ: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ﴾ [النساء: ۷۶] (جنہوں نے ایمان لایا ہے وہ اللہ کے راستے میں لڑ رہے ہیں، اور جنہوں نے کفر کیا ہے وہ طاغوت کے راستے میں لڑ رہے ہیں)۔ یعنی تمہاری لڑائی اللہ کے لئے اس کی راہ میں ہے، اور تمہارے دشمن شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں، پس تمہاری پریشانی کسی حقیقی مقصد کے لئے ہے، اور ان کا دکھ درد بے مقصد ہوا۔

اس کے علاوہ جب تم اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے لڑتے ہو تو تم اس اجرِ عظیم کی امید رکھتے ہو، جس کی کوئی مثال نہیں، اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اجرِ عظیم تمہارے لئے مقدر ہے، تم تو بڑے خوش قسمت ثابت ہوئے، اس کے برعکس تمہارا دشمن شیطان کے لئے لڑتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے محروم ہے، اور ناامید بھی ہے، وہ یہاں بھی زخمی و پریشان ہے، وہاں بھی تباہ و برباد ہے، خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ سے آخرت کے ثواب کی امید رکھتے ہو، بڑے بڑے درجات کے لئے تکلیف برداشت کرتے ہو، اور جنت و اجرِ عظیم کے مستحق بنتے ہو، تو اتنی بڑی اور بے شمار عظیم نعمتوں کے سامنے یہ چند روزہ قابلِ برداشت تکلیفیں کچھ بھی نہیں، اور کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

اور کافر جب وہ جنگ کرتے ہیں، مال خرچ کرتے اور مرتے بھی ہیں، حالانکہ وہ باطل پر ہیں، اور موت کے

بعد انہیں کسی خیر و بھلائی کی امید بھی نہیں، پس تمہیں ان سے بڑھ چڑھ کر خوب جم کر قتل و قتال کرنا چاہئے، لہٰذا تم ہر وقت تیار ہی رہو، اور ان کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو، جیو تو غازی، مرو تو شہید، ہر طرف سے فائدہ میں رہو۔
﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ﴾ یہی فیصلہ تمہارے حق میں ہو چکا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۟ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾

ترجمہ: بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ دے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھایا، اور نہ ہو جائیں خیانت کرنے والوں کے طرف دار ﴿۱۰۵﴾ اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کیجئے، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے مہربان ہے ﴿۱۰۶﴾ اور آپ ان لوگوں کی طرف سے جواب دہی نہ کیجئے جو اپنی جانوں کی خیانت کر رہے ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا اس شخص کو جو خیانت کرنے والا گنہگار ہو ﴿۱۰۷﴾ جو شرماتے ہیں لوگوں سے، اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے، حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہے، جبکہ وہ راتوں کو اس بات کا مشورہ کرتے ہیں، جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کے سب کاموں کو جاننے والا ہے ﴿۱۰۸﴾ خبردار! تم وہ لوگ ہو جو جھگڑتے ہو ان کی طرف سے دنیا والی زندگی میں، سو کون جھگڑے گا ان کی طرف سے قیامت کے دن؟ یا کون ہو گا ان کا کارساز؟ ﴿۱۰۹﴾

معارف و منازل

شانِ نزول:

آیت کریمہ کا سببِ نزول ایک واقعہ ہے، جسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے قبیلے میں تین آدمی تھے: بشر، بشیر اور مُبشر۔ ان کو بنی اُبیرق کہا جاتا تھا، ان میں بشیر منافق آدمی تھا، وہ ایسے شعر کہتا تھا جن میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ہجو ہوتی تھی،

پھر وہ ان اشعار کو بعض اہلِ عرب کی طرف منسوب کر دیتا تھا کہ فلاں شاعر نے یوں کہا آنحضرت ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جب ان اشعار کو سنتے تھے تو سمجھ لیتے تھے کہ اسی بشیر کی حرکت ہے، اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قسم یہ شعر تو اسی خبیث نے کہے ہیں، اور کہتے تھے کہ یہ ابن الا بیرق کے اشعار ہیں۔

یہ تینوں آدمی حاجتمند تھے، ان کو فاقے رہتے تھے، جاہلیت میں بھی ان کا یہ حال تھا، اور زمانہ اسلام میں بھی ان کی یہ حالت تھی۔ اہلِ مدینہ کا گزارہ اس وقت کھجوروں اور جَو پر تھا، جب ملکِ شام سے مال برآمد کرنے والے تاجر آتے تو میدہ فروخت کرنے کے لئے آتے تھے، یہ میدہ ایسے لوگ خاص کر اپنے لئے خرید لیتے تھے جو مالدار ہوتے تھے، جبکہ ان کے اہل وعیال کھجوروں اور جَو پر ہی گزارہ کرتے تھے۔

حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے مزید بیان فرمایا کہ ملکِ شام سے کچھ تاجر آئے، ان سے میرے چچا رفاعہ بن زید رضی اللہ عنہ نے میدہ خرید لیا، اور اسے اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں رکھ دیا، اس کمرے میں کچھ ہتھیار بھی تھے، زرہ تھی اور تلوار بھی، نیچے سے کسی نے اس کمرے میں نقب ڈال کر کھانے کی چیز میدہ اور ہتھیار چرا لیا، جب صبح ہوئی تو میرے چچا رفاعہ رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے، اور فرمایا کہ میرے بھائی کے بیٹے اس رات میں ہمارے اوپر زیادتی کی گئی ہے، کمرہ میں نقب لگائی گئی ہے، اور ہمارا کھانے کا سامان اور ہتھیار کوئی شخص لے گیا۔ اس پر ہم نے تجسس کیا، اور پتہ چلانے کی کوشش کی، محلے میں پوچھ گچھ کی، تو ہمیں لوگوں نے بتایا کہ بنی اُبیرق نے اس رات آگ جلائی ہے، یعنی کھانے پکائے ہیں، اور ہمارا اندازہ یہی ہے کہ انہوں نے آپ لوگوں کا مال چرا کر کھانے پکانے میں رات گزاری ہے۔

جب ہم پوچھ گچھ کر رہے تھے اس وقت بنی ابیرق بھی موجود تھے، وہ یہ کہتے جا رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قسم آپ لوگوں کا یہ مال لبید بن سہل نے چرایا ہے۔ لبید بن سہل رضی اللہ عنہ نیک آدمی تھے، سچے مسلمان تھے جب انہوں نے یہ بات سنی تو اپنی تلوار نکالی اور کہنے لگے: کیا میں چراؤں گا؟ اللہ تعالیٰ کی قسم! یا تو یہ چوری پوری طرح ظاہر ہو جائے گی، ورنہ میں اسی تلوار سے تمہاری خبر لے لوں گا۔ میرے خاندان والوں نے کہا کہ آپ اس فکر میں نہ پڑیں، ہمیں یقین ہے کہ آپ یہ کام کرنے والے نہیں ہیں۔

ہم برابر پوچھ گچھ کرتے رہے، یہاں تک کہ اس بات میں کوئی شک نہ رہا کہ اس کام کے کرنے والے بنی ابیرق ہی ہیں۔ میرے چچا نے کہا کہ سرورِ عالم ﷺ کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر پورا واقعہ بیان کر دو، چنانچہ

میں خدمت اقدس میں آیا، میں نے عرض کیا کہ ہمارے قبیلے میں ایک خانداں ہے جس سے لوگوں کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، انہوں نے میرے چچا رفاعہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں نقب لگا کر ہتھیار اور کھانے کا سامان چرا لیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہتھیار واپس کر دیں۔ اب رہا کھانے کا سامان، ہمیں اس کی کچھ حاجت نہیں۔

یہ سن کر حضرت رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں اس بارے میں مشورہ کروں گا، جب بنی ابیرق کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے اسیر بن عروہ نامی ایک شخص سے بات کی، اور کچھ لوگ جمع ہو کر آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا: یارسول اللہ! قتادہ بن نعمان اور اس کے چچا ہمارے قبیلے کے ایک خانداں کو جو مسلمان ہے، اور نیک لوگ ہے، بغیر کسی گواہ اور ثبوت کے چوری کی تہمت لگائی ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک خاندان جس کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہے، اور نیک ہے، تم بغیر کسی دلیل اور گواہوں کے ان پر چوری کی تہمت لگا رہے ہو۔ میں واپس ہوا، اور مجھے یہ تمنا ہوئی میرا کچھ مال جاتا رہتا، اور اس بارے میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں بات نہ کرتا تو اچھا ہوتا۔

میرے چچا رفاعہ رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے، اور کہنے لگے: تم نے کیا کیا؟ میں نے ان کو وہ بات بتادی جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، اس پر چچا نے کہ "اَللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ" کہ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کرتا ہوں۔

اس کے بعد تھوڑا سا ہی وقت گزرا تھا کہ قرآن کریم کی بالا آیت کا نزول ہوا۔ ان آیات میں خائنین سے بنو ابیرق مراد ہیں۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا﴾ آپ خیانت کرنے والوں کے طرف دار نہ بنئے، اور فرمایا:

﴿وَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ﴾ کہ قتادہ رضی اللہ عنہ سے جو آپ نے بات کہی اس کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ سے استغفار کیجئے۔ جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہتھیار حاضر کئے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہتھیار رفاعہ رضی اللہ عنہ کو واپس فرما دیئے، اس کے بعد بشیر مشرکینِ مکہ کے ساتھ جا کر مل گیا، اور سلافہ بنت سعد کے پاس جا کر ٹھہر گیا، اس پر آنے والی آیت کا نزول ہوا: ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى﴾ [النساء: ۱۱۵] (اور جو رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لئے ہدایت ظاہر ہو چکی)۔

جب بشیر سلافہ کے پاس جا کر مقیم ہو گیا تو حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کچھ اشعار کہے، جن میں سلافہ کو متہم

کیا۔ سلافہ کو غصہ آیا کہ میں بشیر کی وجہ سے متہم ہو گئی، اس نے بشیر کو اپنے گھر سے نکال باہر کیا۔ یہ ہے مختصر واقعہ۔

آیت کریمہ میں گمراہ فرقہ منکرینِ حدیث کی مکمل تردید ہے، فرمایا:

ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی حق کے ساتھ، تاکہ آپ لوگوں کے لئے بیان کریں، تشریح کریں جو ان کی طرف اتارا گیا، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و معرفت سے نوازا۔ اسی کا نام تو حدیث ہے، جس نے مکمل کتاب اللہ کی تشریح کی ہے۔

خلاصہ:

پورے واقعہ کو سمجھنے کے لئے ایک مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے تمام تر صورت حال اور آئندہ آیاتِ قرآنیہ کا مطلب بخوبی واضح ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ:

(۱) جس شخص یعنی بشیر ابن ابیرق نے رفاعہ رضی اللہ عنہ کا مال چوری کیا تھا، اس کے قبیلہ کا نام بنی ظفر ہے۔

(۲) چور بشیر نے مال ایک یہودی کے پاس امانتاً رکھا تھا، یہودی کا نام زید بن سمین تھا، اور یہودی کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ مال چوری کا ہے، ورنہ وہ اپنے پاس نہ رکھتا۔

(۳) چور نے ایک بیگناہ شخص حضرت لبید بن سہیل رضی اللہ عنہ کو ملوث کرنا چاہا، مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

(۴) حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے خدمت اقدس میں آ کر تمام صورت حال کو عرض کیا تھا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تأمل سے کام لے کر فرمایا تھا کہ مشورہ کروں گا، یعنی تحقیق اور تفتیش کروں گا۔

(۵) جب بشیر کو یقین ہو گیا کہ یہ سب کچھ میرے خلاف ثابت ہونے والا ہے، تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو جمع کر کے ان کے سامنے اپنی بے گناہی کا اظہار کیا، اور اپنے قبیلہ کے بارے میں اس کو ایک سازش قرار دیا۔ وہ خود اگرچہ منافق تھا، مگر قبیلہ والے منافق نہ تھے، قبیلہ والوں نے بشیر کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے ایک وفد کی تشکیل کی جو خدمت گرامی میں جا کر یہ بیان دیا کہ ہمارا آدمی شریف مسلمان ہے، قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے بغیر ثبوت و بغیر گواہ اس پر چوری اور خیانت کی تہمت لگائی ہے، ہمارا آدمی بے گناہ اور اس تہمت سے بَری ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفد کی گفتگو اور بیان سن کر اندازہ لگایا کہ اتنے لوگ خوامخواہ غلط نہیں کہتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ صورتِ حال اسی طرح ہو جیسے یہ لوگ کہتے ہیں، وغیرہ۔

(۶) جب قرآنی آیات کا نزول ہوا تو سارا ماجرا واضح ہوا، اور پوری حقیقت معلوم ہوئی، اور قلعی کھل گئی۔

آیت کریمہ نے پورے قبیلے کی دروغ گوئی اور ایک چور کی بے جا حمایت پر پورے قبیلے والوں کی پرزور مذمت کی، اور انہوں نے راتوں کو میٹنگ کر کے جو منصوبہ تیار کیا تھا اس کی بھی مذمت کی، جس کی تفصیل آیت کریمہ میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

(۷) چوری کا مال جب یہودی کے گھر سے برآمد ہوا، تو بشیر منافق اور اس کے قوم کے قبیلہ والوں نے مل کر بالاتفاق یہودی کو مجرم اور چور قرار دیا تھا، آیت کرمہ نے اس کو بھی واضح کر کے یہودی کی جان خلاصی فرمائی، اس طرح یہ پیچیدہ معمہ بآسانی حل ہوگیا۔

(۸) سرور عالم امام المعصومین ﷺ نے نہ کبھی کسی خائن کی طرف داری کی ہے، اور نہ کسی مجرم کی حمایت۔ آپ ﷺ کو جو خطاب ہے کہ آپ کسی خائن کی طرف داری نہ کریں، یہ خطاب بشیر منافق کے قبیلے والوں کے لئے خصوصاً، اور پوری امت کے لئے ہے بطور عموم، اور آپ ﷺ کو اتنا خطاب ضرور ہے کہ جس طرح آپ نے پہلے کسی خائن کی حمایت نہیں کی ہے، اسی طرح آئندہ بھی کسی خائن کی طرف داری نہ کریں۔ اور آپ کو جس استغفار کا حکم ہے وہ انہی لوگوں کے لئے استغفار کرنے کا جنہوں نے اپنے قبیلے کے ایک مجرم کے لئے بے جا طرف داری اور حمایت کا فیصلہ کیا تھا۔

اس کے علاوہ استغفار آپ ﷺ کے لئے عبادت کا درجہ رکھتا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ ہر مجلس میں تقریباً سو سو مرتبہ استغفار کرلیا کرتے تھے۔ جن مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ آنحضرت سرور عالم ﷺ نے حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کا بیان سن کر اس کے حق میں بروقت فیصلہ صادر نہیں فرمایا، اسی پر آپ ﷺ کو استغفار کا حکم ہوا، میں ناچیز اس توجیہ کو نہ قبول کرسکتا ہوں، نہ اتفاق، کیونکہ قتادہ رضی اللہ عنہ بحیثیتِ ایک مدعی کے آپ ﷺ کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے تھے، ان کے پاس نہ کوئی ثبوت تھا، اور نہ کوئی گواہ۔ آپ ﷺ بغیر اثبات کے کسی کے حق میں کیسے فیصلہ کرسکتے ہیں؟ واللہ اعلم

﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ﴾ بے شک یہ پاکیزہ کتاب ہم نے آپ کی طرف حق اور راستی کے ساتھ اتاری ہے، تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھایا، یا دکھلایا۔

شیخ ابو منصور رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ نازل شدہ اصول کے زیر نظر جو حکم اللہ تعالیٰ

تمہارے دل میں ڈال دے، اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ اس صورت میں بقول شیخ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اجتہاد کرنے کے جواز کی دلیل اس آیت میں موجود ہے۔ [مظهري]

﴿وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۝ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ آپ خیانت کرنے والے لوگوں کے طرف دار اور حمایتی نہ بنیں۔ خائنین سے مراد بنی ابیرق کے منافقین ہیں۔ حمایتی بننے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کی باتوں پر یقین نہ کریں، اور انہیں بے گناہ تصور نہ کریں، کیونکہ یہی تو اصلی مجرم اور چور ہیں۔ بہ تقاضائے بشریت اور ان کے حق میں اُسید بن عروہ نے اور ایک پورے وفد نے جو سفارش کی، اور ان کی بے گناہی پر گواہی دی، شاید آپ کا اسی جانب قلبی میلان ہو گیا ہو، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کریں، بیشک وہ پاک ذات معاف کرنے والا مہربان ہے۔

یاد رہے کہ انبیاء علیہم السلام، پھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں ہوتے، انہیں ہر قسم کے لوگ جھوٹ اور غلط بیانی سے اپنا حامی بنا کر کوشش کرتے ہیں، اور قسمیں کھا کر ان کے سامنے بے گناہی ثابت کرتے ہیں، پوری تفصیل سورۂ توبہ میں آئے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

﴿وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا﴾ اور آپ کوئی جواب دہی نہ کریں ان لوگوں (بنو ابیرق یا ان کے لئے سفارش کنندگان) کے لئے جنہوں نے خیانت کی اپنے نفسوں کے بارے میں۔ ظاہر ہے دوسروں کے ساتھ خیانت کا برتاؤ کرنا اسی طرح ہے کہ جیسے اپنے ساتھ خیانت کرنا، جس کا وبال و گناہ تو اسی پر ہوگا، جیسے ارشاد ہے: ﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا﴾ [الإسراء: ۷] یعنی دوسروں کے ساتھ اچھا کرنے والا اپنے ساتھ اچھا کرتا ہے، اور دوسروں کے ساتھ برا کرنے والا اپنے ساتھ برا کرتا ہے۔ فرمایا:

اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا، یعنی مبغوض جانتا ہے ایسے لوگوں کو جو بہت خیانت کرنے والے اور گناہگار ہوتے ہیں۔ ان کی خیانت و جرم کا یہ حال ہے کہ:

﴿يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ﴾ وہ لوگوں سے تو چھپاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سے وہ ایک ذرّہ بھی نہیں چھپا سکتے، کیونکہ:

﴿وَهُوَ مَعَهُمْ﴾ اللہ تعالیٰ ہر حال میں ان کے پاس ہوتا ہے۔ سورۂ حدید میں فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ

اَیۡنَمَا کُنۡتُمۡ﴾ [الحدید: ۴] یعنی اللہ تعالیٰ سے تمہارا کوئی راز پوشیدہ نہیں، نہ دن اور نہ ہی رات میں۔ فرمایا:

﴿اِذۡ یُبَیِّتُوۡنَ مَا لَا یَرۡضٰی مِنَ الۡقَوۡلِ﴾ جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف راتوں کو غلط تدبیر کرتے ہیں، اور ایسے ناجائز فیصلے کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہیں۔ جیسے کہ بنی ابیرق کی حمایت اور صفائی کے متعلق قبیلہ کے لوگوں نے راتوں کو میٹنگ کر کے فیصلہ کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں جاکر یہ یہ صفائی پیش کریں گے، اور چوری کا سارا ملبہ یہودی زید بن سمین پر ڈال دیں گے، اور اسے چوری کی سزا دلوائیں گے۔ فرمایا: یہ سارے غیر مرضی راتوں کے غلط فیصلے سب اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں، کیونکہ اس کا ذاتی علم سارے جہاں پر محیط ہے۔

﴿وَهُوَ مَعَهُمۡ اِذۡ یُبَیِّتُوۡنَ﴾ جو مجلسوں میں شریک ہو، اور مخفی مشوروں میں ساتھ ہو، اور پاس ہو، اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی، اور نہیں چھپتی ہے۔ اب ابن ابیرق کے حامیوں اور قومی لوگوں کو خطاب ہے:

﴿هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلۡتُمۡ عَنۡهُمۡ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا فَمَنۡ یُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنۡهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اَمۡ مَّنۡ یَّكُوۡنُ عَلَیۡهِمۡ وَكِیۡلًا﴾

ہاں! تم ایسے لوگ اور بے جا حمایتی ہو کہ تم نے دنیوی زندگی میں (یہاں جو سب کچھ چلتا ہے دنیا جیسے کہ دار العمل ہے ایسے دار الکذب والجدال بھی ہے) تو ان کی طرف سے جواب دہی کی باتیں کر لیں، حتیٰ کہ چور کو شریف ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی، اب ذرا یہ بتاؤ کہ قیامت کے دن جو کہ دار الجزاء ہے، کیا اس روز جب اس مجرم پر گرفت ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی عدالتِ عالیہ سے اس کے خلاف پروانہ عذاب جاری ہوگا، تو وہاں تم میں سے کون ہوگا جو اس کا وکیل صفائی بن کر ان کی شرافت یا بے گناہی ثابت کرے گا؟

تو ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے۔ پس تمہیں خبردار کیا جا رہا ہے کہ غلط سفارش کارآمد نہیں ہے، اور یہ بھی سمجھایا جا رہا ہے کہ غلط سفارش کرنے والا قیامت کے روز پکڑا جائے گا، اور سزا کا مستحق ہوگا۔ ابھی آیت کریمہ گزر گئی:
﴿مَنۡ یَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنۡ لَّهٗ نَصِیۡبٌ مِّنۡهَا ط وَمَنۡ یَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنۡ لَّهٗ كِفۡلٌ مِّنۡهَا﴾ [النساء: ۸۵] (جو شخص کوئی اچھی سفارش کرتا ہے، اس کو اس میں سے حصہ ملتا ہے، اور جو کوئی بری سفارش کرتا ہے اسے اس برائی میں سے حصہ ملتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے)۔

لہٰذا احتیاط ضروری ہے، خاص کر یہ کہ مجرموں کے لئے سفارش تباہ کن اور سخت گناہ ہے۔ آگے عام توبہ کی۔

ترغیب ہے۔کاش یہ ازلی بد بخت جرم کا اقرار کرتا، اور توبہ کرتا، نفاق سے برأت کا اعلان کرتا، اسلام قبول کرتا، تو دائی اورابدی راحتوں کو پالیتا، مگر ایسا نہیں ہوا۔مدینہ منورہ سے بھاگ کر مکہ مکرمہ پہنچا، وہاں کفر کی حالت میں نقب زنی کی واردات میں دیوار کے نیچے دب کر جہنم رسید ہوا۔البتہ جن لوگوں نے اس کی حمایت کی تو اتنے شدید زجر وتہدید کے نتیجے میں تائب ہو گئے، اور سعادت پا گئے۔

اللہ تعالیٰ غفور ورحیم سے التجاء اور درخواست ہے کہ ہمیں حق پر رکھے، باطل سے بچائے، استقامت عطا فرمائے، اور حسنِ خاتمہ مع الایمان نصیب فرمائے۔آمین مائة ألف آمین

وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا يَكۡسِبُهٗ عَلٰى نَفۡسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ خَطِيۡٓــئَةً اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ يَرۡمِ بِهٖ بَرِيۡٓــئًا فَقَدِ احۡتَمَلَ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ وَرَحۡمَتُهٗ لَهَمَّتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ اَنۡ يُّضِلُّوۡكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَضُرُّوۡنَكَ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ ؕ وَكَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا ﴿۱۱۳﴾

ترجمہ: اور جو شخص کوئی گناہ کرے، یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہے، تو اللہ تعالیٰ کو پائے گا بخشنے والا مہربان ﴿۱۱۰﴾ اور جو شخص کوئی گناہ کرے، تو یہ گناہ کرنا اسی پر پڑے گا، اور اللہ تعالیٰ علیم ہے حکیم ہے ﴿۱۱۱﴾ اور جو کوئی شخص چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ کرے، پھر کسی بے گناہ آدمی کو اس کی تہمت لگا دے، تو اس نے بڑا بہتان اور صریح گناہ اپنے اوپر لا دلیا ﴿۱۱۲﴾ اور اگر آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے یہ ارادہ کر ہی لیا تھا کہ آپ کو (معاذ اللہ) بہکا دیں، اور وہ نہیں بہکاتے مگر اپنے ہی نفسوں کو، اور آپ کو کچھ بھی ضرر نہ پہنچائیں گے، اور اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے آپ پر کتاب اور حکمت، اور آپ کو وہ باتیں بتائیں جن کو آپ نہیں جانتے تھے، آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل بہت بڑا ہے ﴿۱۱۳﴾

معارف ومنازل

جب قیامت کا معاملہ اتنا سخت اور دشوار ہے کہ کوئی بڑی سی بڑی شخصیت بھی کسی کی وکالت اور شفاعت پر

قادر نہیں ہو سکتی، تو عوام الناس سوائے ایک دوسرے سے بھاگنے کے کیا کچھ کر سکیں گے؟ اس لئے ارشاد فرمایا کہ پہلا علاج یہ ہے کہ گناہوں کا بوجھ ہی کم رکھو، سرے سے گناہ ہی نہ کرو۔ دوئم علاج اگر کبھی غیر اختیاری کوئی گناہ سرزد ہو، خواہ بڑا یا چھوٹا گناہ، تو فوراً توبہ کرلو، جو کوئی ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو غفور رحیم پائے گا، اور گناہوں سے بچ جائے گا، تو ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ جو شخص کوئی گناہ کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہے، تو اللہ تعالیٰ کو غفور رحیم پائے گا۔ جس طرح صابن سے بدن اور کپڑے کے میل صاف ہوتے ہیں، اسی طرح توبہ واستغفار سے سارے چھوٹے بڑے گناہ، حتیٰ کہ شرک جیسا اکبر الکبائر بھی معاف ہو جاتا ہے۔

اور اسی توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ جس کسی کا کوئی مال لیا ہے وہ واپس کردے، اگر کسی پر ظلم کیا ہے یا بہتان لگایا ہے، یا کوئی غیبت کی ہے، اور معاف نہیں کرایا ہے تو قیامت کے دن حقدار اس کے حسنات پر قبضہ کریں گے، اور نتیجہ نہایت خطرناک ہوگا۔ تو آیت کریمہ میں تنبیہ ہے کہ گناہ ہو جانے پر اللہ تعالیٰ سے دور نہ ہوتے چلے جائیں، بلکہ توبہ واستغفار کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے چلے جائیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس نے سورۂ نساء کی یہ دو آیتیں پڑھیں: ایک تو یہی ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا﴾ اور دوسری وہ آیت جو اوپر گزر چکی: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ﴾ اور ان دونوں آیتوں کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی، تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے۔

بعض اہل علم نے اس آیت کو سب سے زیادہ امید دلانے والی آیت کہا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً روایت کی ہے کہ کسی مسلمان سے کوئی گناہ ہو جائے، پھر وہ وضو کر کے دو رکعت پڑھ لے، اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے، تو اللہ تعالیٰ شانہ اس کا گناہ بخش دیتا ہے۔ حضرت ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی۔

اس آیت میں مسلمانوں کے لئے بہت بڑی بشارت ہے، اور ان لوگوں کے لئے ترغیب اور تنبیہ بھی ہے جنہوں نے ابن ابیرق منافق کا ساتھ دیا تھا، یہاں انہیں تنبیہ ہے کہ اپنے گناہوں پر نادم ہو کر استغفار کریں، اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔

﴿سُوٓءً﴾ سے مراد وہ گناہ ہیں جو متعدی ہوں، اور جن سے دوسروں کو نقصان پہنچتا ہو۔

﴿یَظْلِمْ نَفْسَهٗ﴾ سے مراد وہ گناہ ہیں جو غیر متعدی ہوں، اور حقوق اللہ سے متعلق ہوں۔ پھر فرمایا:

﴿وَمَنْ یَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَكْسِبُهٗ عَلٰی نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا﴾ اور جو شخص گناہ کرلے تو اپنی ذات ہی کے لئے گناہ کرتا ہے، وہ اپنے گناہ کی سزا خود ہی بھگتے گا۔ ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ [الأنعام: ۱۶۴] (اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی اور کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) کے بموجب کوئی دوسرا اس سزا میں شریک نہیں ہوگا، پس اسے چاہئے کہ توبہ واستغفار میں غفلت نہ کرے، فوراً توبہ کرکے اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ کی فہرست میں شامل ہوجائے۔ یہ سب کچھ حق تعالیٰ علیم وحکیم کی مہربانی اور کرم ہے کہ مغفرت کا سودا نہایت آسان کیا ہوا ہے، بار بار مغفرت کی پیش کش فرمارہے ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِکَ۔ پھر فرمایا:

﴿وَمَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا﴾ کہ جس شخص نے کوئی چھوٹا یا بڑا گناہ کیا، پھر اس کو کسی دوسرے (بے گناہ) پر چپینک مارا جو اس سے بری ہے، تو اس نے بہت بڑا بہتان اور صریح گناہ اپنے اوپر لاد دیا۔ چونکہ اس میں دوہرا گناہ ہے، ایک تو وہ گناہ جس کا اس نے ارتکاب کیا، اور اوپر سے دوسرا گناہ یہ کہ کسی ایسے شخص پر ڈال دیا جو اس سے بری ہے۔

اس کو صریح گناہ بتایا، جو ظاہر ہے، اور بہت بڑا بہتان اس لئے فرمایا کہ اس نے جانتے بوجھتے خود گھڑ لیا ہے، کسی غلط فہمی کی بنیاد پر، اور کسی دوسرے سے سن کر نہیں کہا ہے، لہٰذا یہ بہتانِ عظیم ہے، اس کی سزا بہت زیادہ ہوگی۔

یہاں خَطِیْٓئَةً سے مراد چھوٹا گناہ ہے، جو بغیر ارادہ سہواً ہو، اور اِثْمًا سے مراد گناہ کبیرہ ہے، جیسے چوری وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے یاد دلایا کہ منافقین سرور عالم ﷺ کو اپنے ساتھ شامل کرکے (یعنی حامی بنا کر) آپ ﷺ کو بھی ملوث کرنا چاہتے تھے، اس سلسلے میں انہوں نے سفارش بھی بہم پہنچائی، اور دوسروں پر بھی الزام لگایا، تاکہ وہ خود بری قرار پائیں، اور دوسرے بے گناہ پھنس جائیں (جیسے کہ لبید بن سہل رضی اللہ عنہ یا زید بن سمین یہودی)۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ساری صورتِ حال سے بذریعۂ وحی مطلع فرمائی، اس طرح آپ ﷺ کی ذات گرامی کو غلطی سے بچا کر آپ ﷺ کی پیغمبرانہ عصمت انبیاء علیہم السلام کو برقرار رکھا، اور تحفظ بخشا۔

اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اگر اس کے نبی ﷺ بعض ظاہری حالات کو دیکھ کر، یا کسی قرینے کی بنیاد پر کوئی خلاف معمول رائے قائم کریں، یا حکم جاری کردیں، تو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے اپنے نبی کو مطلع کردیتا ہے، اور انہیں

اپنی غیر حقیقت رائے اور حکم پر قائم نہیں رہنے دیتا، کیونکہ اگر نبی غلطی پر قائم رہے، اور غلطی برقرار رہے، تو یہ عصمت انبیاء علیہم السلام کے خلاف ہوگا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام کیا ہوا ہے، اور نبوت کے سارے فرامین واعمال ذات واحد لاشریک لہٗ کی نگرانی کے اندر مرتب ہوتے رہتے ہیں، کسی ادنیٰ خلافِ اولیٰ بات پر بھی اطلاع ہوجاتی ہے۔

اسی وجہ سے نبی اور مجتہد میں یہ بنیادی فرق ہے کہ مجتہد جب اپنی اجتہاد اور غور وفکر سے کوئی خلافِ حقیقت فیصلہ کرتا ہے تو اسے غلطی پر بھی اجر وثواب مل جاتا ہے، کیونکہ یہ ایک ثواب اس کی محنت کی ہے، مگر ضروری نہیں ہوتا کہ اس کو اس کی غلطی سے مطلع کر کے اس کی اصلاح کردی جائے۔ اس کے برخلاف اگر نبی سے کسی فیصلہ میں کوئی لغزش یا فروگزاشت ہوجائے، تو اسے فوراً بذریعۂ وحی مطلع کردیا جاتا ہے، اور ایسی خطا سے بچالیا جاتا ہے۔ عصمت کے یہی معنی ہیں کہ اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔

پھر نبی کے اجتہاد میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس کا سکوت بھی حجتِ شرعیہ ہے، کیونکہ وہ شارع ہیں، بخلاف مجتہد کے، اس کے اجتہادی مسائل میں غلطی کا امکان موجود ہے، اس لئے آپس میں مجتہدین کا اختلاف ہوتا رہا۔ واللہ اعلم۔ پھر فرمایا:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ﴾ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ ہوتی، جس نے بذریعۂ وحی آپ کو حقیقت حال سے بروقت باخبر فرمادیا، تو کچھ لوگ یہ ارادہ کر ہی چکے تھے کہ آپ کو غلطی میں مبتلا کردیں، ان لوگوں نے جو کچھ کیا اس کے ذریعہ خود ہی راہ حق سے ہٹے اور گمراہ ہوئے، یہ لوگ آپ کا کچھ ہی نہیں بگاڑ سکتے۔ فرمایا:

﴿وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب، یعنی قرآن حکیم اور حکمت نازل فرمائی ہے، اور آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے۔ یہ آیت کریمہ اور اس کے مندرجات فضل اور رحمت کے لئے دلیل بھی ہیں، اور بیان بھی، کیونکہ فضل و رحمت مُجمل ذکر ہوئے، پس کتاب وحکمت سے اس کی تشریح اور بیان ہوا، اور جس ذات اقدس پر مسلسل فضل اور رحمتوں کی بارش جاری ہو، وہ اسی علم وحکمت کی وجہ سے ہوسکتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ فضل ورحمت اور علم وحکمت آپس میں لازم وملزوم ہیں۔

''الکتاب'' سے مراد قرآن حکیم ہے، اور ''الحکمۃ'' سے مراد سنت ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ میں

گزر چکی۔اور ﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ﴾کی تشریح سورۂ شوریٰ کی آیت ہے: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ﴾[الشوریٰ:۵۲] آنے والی ہے۔اِنشاءاللہ تعالیٰ۔مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نبوت سے پہلے کتاب اور ایمان کی تفصیلات اور حقائق نہیں جانتے تھے،اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ وحی جلی اور وحی خفی کے ذریعہ آپ ﷺ کو آگاہ کیا،اور امی وناخواندہ ہوتے ہوئے اولین وآخرین کے علوم ومعارف سے نوازا۔پس آپ ﷺ علوی اور سفلی تمام مخلوقات سے علم وحکمت میں برتر وممتاز ہیں۔آپ ﷺ جیسا نہ کسی میں علم ہے نہ عمل نہ عقل اور نہ فہم،آپ ﷺ جامع الکمالات والمزایا ہیں۔مرزا غالب نے کہا:

غالب ثنائے خواجہ بیزداں گزاشتیم ☆ کاں ذات پاک مرتبہ داں محمدست

اے غالب! خواجۂ دوجہاں کی مدح ثنا ربّ العزّت کے حوالہ کرو،وہی اس کی حقیقت سے واقف ہے،تم کیا جانتے،اور کیا اندازہ کرسکتے ہو،یہ حقیقت تمہارے بس کی چیز نہیں۔

حضرت مصلح الدین شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں کہا:

یاصاحب الجمال ویاسید البشر ★ مِن وجھک المنیر لقد نور القمر

لایمکن الثناء کما کان حقہ ★ بعداز خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ خوبیوں اور کمالات میں وہ کونسی خوبی اور کمال ہے جو آپ ﷺ کی ذات میں ودیعت نہ کی گئی ہو؟ اور وہ کونسا نقص اور عیب ہے جس سے آپ ﷺ کی ذاتِ عالیہ منزہ اور مستثنیٰ نہ ہو؟ آپ ﷺ ہر خوبی کے مالک اور سرچشمہ ہیں،اور ہر عیب وکمی سے پاک اور منزہ ہیں۔اسی چیز کو دیکھ کر کچھ ناداں لوگ ضبط نہ کرسکے،اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرح مختار کُل سمجھ کر ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔روافض کا ایمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نذر ہوا،اور ان گم گشتہ مدّعیانِ محبت کا ایمان سرورِ عالم ﷺ کی محبت کی نذر رہوا،انہوں نے آپ ﷺ کی عالمگیر صفات پر قناعت نہیں کی۔اللہ تعالیٰ واجب الوجود جل شانہ کی ذاتی مخصوص صفت کو آپ ﷺ کے دامن میں ڈال کر صریح کفر کے مرتکب ہوئے۔حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

❁ ❁ ❁

لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَیْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ

الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿١١٥﴾ اِنَّ اللّٰهَ

لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١١٦﴾

ترجمہ: نہیں ہے کوئی بھلائی ان کے بہت سے مشوروں میں، مگر جو شخص صدقے کا یا اچھی باتوں کا یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم دے، اور جو شخص یہ کام اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے کرے گا سو ہم اس کو بڑا ثواب دیں گے ﴿١١٤﴾ اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لئے ہدایت ظاہر ہو چکی، اور مسلمانوں کے راستے کے خلاف کسی دوسرے راستے کا اتباع کرے، تو ہم اس کو وہ کام کرنے دیں گے جو وہ کرتا ہے، اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور وہ بڑا ٹھکانہ ہے ﴿١١٥﴾ بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، اور اس کے علاوہ جتنے گناہ ہیں جس کے لئے اسے منظور ہوگا بخش دے گا، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے تو وہ دور کی بڑی گمراہی میں جا پڑا ﴿١١٦﴾

معارف ومنازل

ابن ابیرق کے رشتہ داروں اور ساتھی راتوں کو بیٹھ کر مشورے اور سرگوشیاں کرتے رہے۔ اسی طرح عمومی حالات میں صبح وشام لوگ بیٹھ کر محفل کرتے ہیں، اور ہر قسم کے گزشتہ، موجودہ اور آئندہ حالات پر تبصرہ کرتے ہیں، اور اپنی ان مجالس اور محفلوں کو مفید اور کارآمد قرار دیتے ہیں، قرآن کریم نے واضح کیا کہ تم آپس میں شب وروز جو کچھ مشورے کرتے ہو، ان تمہارے مشوروں کی اکثریت خیر وبھلائی سے خالی ہے، کیونکہ اکثر مشورے خلافِ شرع ہوتے ہیں، یا معاشرہ کے نقصان میں ہوتے ہیں، یا عام لوگوں کے خلاف ہوتے ہیں، یا محض تضییع اوقات پر مبنی ہوتے ہیں، اور یہ سارے امور خیر سے خالی ہیں۔

ہاں! جس مجلس ومحفل میں اور تنہائی کے عمومی مجلسوں اور سرگوشیوں میں ذکرِ الٰہی، احکامِ شریعت کا سلسلہ ہو، غریبوں ناداروں کے لئے صدقات وخیرات کا اہتمام ہو، یا نیکیوں اور خیر وبھلائی کے امور پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مسئلہ ہو، یا خلق خدا کی اجتماعی زندگی کی اصلاح اور بہتری کے لئے کام ہو، لوگوں کے آپس میں جو اختلافات ہیں ان کے ختم کرنے کا عزم وارادہ ہو، تو بلاشبہ یہ سارے امور نیک اور قابلِ تعریف اور مکمل کارِ خیر اور موجبِ ثواب وبرکات ہیں۔ پس چاہئے کہ وہ لوگ ہمیشہ انہی کارِ خیر اور مفید مشوروں پر کاربند ہوں، اور بے مقصد مشوروں سے

دور ہوں۔

اصل نزولِ آیت کا سبب وہی چوری ہے، جس کے متعلق وہ لوگ مشورہ کرتے رہے کہ اس چوری سے کیسی جان خلاصی ہو، اپنے قبیلے کو بدنامی سے کیسے بچایا جائے، اور یہ چوری کسی دوسرے بیگناہ پر کیسے پھینک مارا جائے، تو ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں خیر سے یکسر خالی ہیں۔ قرآن کریم نے سورۂ مجادلہ میں نہایت جامع نصیحت فرمائی: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوٰى﴾ [المجادلة: ۹] (اے ایمان والو! جب تم آپس میں خفیہ طریقے پر مشورہ کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول (ﷺ) کی نافرمانی کے مشورے نہ کرو، اور بھلائی اور تقویٰ کے مشورے کرو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو)۔ آئندہ آیت میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ﴾ [المجادلة: ۱۰] لوگوں کے اکثر مشورے شیطانی ہوتے ہیں، جن میں دینی پہلو نہ ہونے کے برابر ہے۔ تو پس مؤمن کی شان یہ ہونی چاہئے کہ اجتماعی اور انفرادی دونوں حالتوں میں خیر وبھلائی اور نیکی وتقویٰ، اور رضائے الٰہی اور آخرت کی پیشی سامنے رہے، اور پوری زندگی لہو ولعب اور غفلت وغرور اور ہر قسم کے شر وفساد سے کلّی طور پر اجتناب ہو۔

صلح کرادینے کی فضلیت:

آیت کریمہ میں فرمایا کہ صدقہ کا حکم، امر بالمعروف کا حکم اور لوگوں کے درمیان صلح ومصالحت کرادینا ان کاموں کا مشورہ ہونا چاہئے، اصلاح بین الناس، یعنی لوگوں کے درمیان صلح کرانا، اور ہر قسم کے رنج وکشیدہ گیوں اور فساد کا خاتمہ کرنا بہت بڑا عظیم ثواب ہے۔ لوگ نفس وخواہشات اور شیطانی حرکتوں کی وجہ سے صبح وشام جھگڑتے ہیں، پس ان کے جھگڑوں کا خاتمہ، رنجشوں کا ازالہ کرنا، ان کے درمیان جوڑ پیدا کرنا، دوستوں کو ملانا اور میاں بیوی میں موافقت کرانا وغیرہ۔

حدیث شریف میں اصلاح کے متعلق روایت ہے سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جھوٹ بولنا حرام ہے، سوائے تین مواقع کے: بیوی کو خوش رکھنے اور راضی کرنے کے لئے، لڑائی اور جنگ کے وقت جھوٹ بولنا، اور لوگوں میں صلح کرانے کے لئے جھوٹ بولنا۔ [أحمد، ترمذي] حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو ایسی بات بتاؤں جس کا ثواب ودرجہ روزے، خیرات اور نماز سے بھی زیادہ ہے؟ ہم نے عرض کیا: ضرور یا رسول اللہ فرمائیے! فرمایا کہ: لوگوں کے باہمی تعلقات کو استوار کرنا، ذات البین کی اصلاح کرنا

(پھر فرمایا کہ باہمی فساد لوگوں کو ملیا میٹ کرنے والا ہے نیکیوں کو مونڈ ھنے والا ہے)۔ [أبو داؤد، ترمذي]

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لوگوں میں مصالحت کرانا اور فساد ورنجشوں کا خاتمہ کرنے کا ثواب ستر حج وعمرے کے ثواب کے ساتھ برابر ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ گزشتہ امتوں کی بری خصلتیں بکثرت تمہارے اندر پیدا ہوں گی، فتنہ وفساد، بغض وکینہ وغیرہ، یہ سب مونڈھنے والی چیزیں ہیں، میں نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈھ دیتی ہیں، بلکہ یہ دین کو مونڈھ دیتی ہیں۔ [ترمذي]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کرنا کفر ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى﴾ جو شخص ہدایت ظاہر ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے، اور مؤمنین کے راستے کے علاوہ دوسرے راستے کا اتباع کرے، تو ہم اسے وہ کرنے دیں گے جو وہ کرتا ہے، وہ جدھر پھرنا چاہے اسے پھیر دیں گے، یعنی اپنے اختیار سے جس بُرائی میں لگا ہوا ہے دنیا میں ہم اسے کرنے دیں گے، اس کا اختیار سلب نہیں کریں گے، اور آخرت میں اسے جہنم میں داخل کریں گے، پس جو شخص ہدایت ظاہر ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔

وہ تمام لوگ قیامت تک جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا علم ہوا، اور پھر اسلام قبول نہ کیا، اور ہر وہ شخص جس نے اسلام قبول کرلیا، پھر اسلام سے پھر گیا، مرتد ہوگیا، وہ سب لوگ آیت کی وعید میں شامل ہیں، چوری کرنے والا، وہ شخص جو مرتد ہوکر مکہ مکرمہ بھاگ گیا۔ آیت کا نزول اگرچہ اسی کے بارے میں ہے، مگر مفہوم اس کا قیامت تک آنے والوں کے لئے عام ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص مؤمنین کے راستہ کے علاوہ کسی دوسرے راستے کا اتباع کرے گا وہ بھی جہنم میں داخل ہوگا۔ اس سے یہی معلوم ہوا کہ جیسا کہ دینِ اسلام میں قرآن وسنت واجب الاتباع اور حجت ہیں، اسی طرح اجماعِ امت بھی حجت ہے، کیونکہ قرآن حکیم کا مطلب اور عقائد واعمال کی تفصیلات جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر ہر زمانے کے علماء صلحاء اور مشائخ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں، ان کو ماننا اور ان پر عمل کرنا ہی ذریعہ نجات ہے۔ ان ہی کے ذریعہ قرآن کریم کی تفسیر ہم تک پہنچی، جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تابعین حضرات تک پہنچائی، پھر انہوں نے آگے اس کی روایت کی، عقائد ہوں یا اعمال، اخلاق اور معاملات، الغرض سب کچھ ان ہی کے ذریعہ امت تک پہنچا ہے۔

اب جو کوئی شخص ان حضرات کو بیچ میں سے نکال کر خود اپنے پاس سے قرآن حکیم کی تفسیر کرے گا، اور آیات کے مطالب و مفاہیم اپنے پاس سے تجویز کرے گا، اور احکام اسلام کی اپنے طور پر تشریح کرے گا، حجیتِ حدیث کا منکر ہوگا، یا امتِ مسلمہ کے محکم اور مسلمہ عقائد کا انکار کرے گا، وہ بلا شبہ کافر ہوگا، اور ابدی جہنمی ہوگا۔

جو لوگ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں، یا جو لوگ پانچ نمازوں کے منکر ہیں، یا جو لوگ ختم نبوت کے منکر ہیں، یا جو لوگ جہاد کے منکر ہیں، یا جو لوگ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہیں، یا آسمانوں پر ان کی حیات کے منکر ہیں، وغیرہ، یہ سب لوگ کافر ہیں، اور دوزخی ہیں، کیونکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر اب تک پوری امت کے جو عقائد ہیں، اور آج تک تواتر کے ساتھ بلا کم و نقصان اور بغیر کسی کمی بیشی کے قائم ہیں، اور یہ لوگ ان سب کے منکر ہیں، اور اپنے خود ساختہ خانہ ساز عقائد و اعمال کے حامل ہیں۔

پس جو لوگ قرآن و حدیث اور اجماع امت کی رُو سے مسلمان ہی نہیں، اور اسلام میں داخل ہی نہیں، یا وہ یہود و نصاریٰ کی پیدا کردہ شخصیت یا گماشتے اور نمائندے ہیں، انہیں کیا حق ہے کہ وہ قرآن و سنت کی تشریح کریں؟ اور اپنے مزاج کے مطابق اپنے پاس سے منگھڑت اور بے بنیاد تاویلوں کا سلسلہ شروع کریں۔

الحمد للہ قیامِ قیامت تک اس امت کے اندر، ہر زمانہ، ہر قرن، ہر خطہ میں تکوینی نظام کے تحت وہ اساطینِ علم و عرفان، محقق مستند علماء، صلحاء، مفکر، محدث، فقیہ، ادیب، مؤرخ ہستیوں کا سلسلہ جاری و قائم رہے گا جو کہ ہر میدان میں اظہارِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ انجام دے گا، اور مدعیانِ علم و شرافت اور تحریف کنندگانِ قرآن و سنت اور یہود و نصاریٰ کے وکیلوں کو وہ دندان شکن جواب دے گا، جس سے حق کا بول بالا ہوگا، اور باطل دم دبا کر میدان سے بھاگے گا، اور اس کا منہ کالا ہوگا۔

روح المعانی میں ہے کہ حضرت محمد بن ادریس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ اجماعِ امت کے حجت ہونے کی کیا دلیل ہے؟ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تین دن تک روزانہ رات اور دن میں تین تین بار پورا قرآن مجید پڑھا، ان کو یہ آیت مل گئی، جس سے انہوں نے اجماعِ امت کے حجت ہونے پر استدلال کیا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے میری امت کے بارے میں تین وعدے فرمائے، اور ان کو تین چیزوں سے امان دے دی: اول یہ کہ پوری امت قحط کے ذریعہ کبھی ہلاک نہ ہوگی۔ دوم یہ کہ ان کا کوئی دشمن ان کو بالکل ہی ایک ایک فرد کر کے ختم نہ کر سکے گا۔ سوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو گمراہی پر جمع نہ فرمائے

گا۔[رواہ الدارمي، مشکوٰۃ]

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ شانہ نے تم کو (یعنی امت کو) تین چیزوں سے پناہ دی: اول یہ کہ تمہارا نبی تم پر بددعا نہیں کرے گا، جس سے تم سب ہلاک ہوجاؤ۔ دوم یہ کہ اہلِ باطل اہلِ حق پر غلبہ نہ پائیں گے، جس سے حق ختم ہوجائے، اورنورِ حق مٹ جائے۔ سوم یہ کہ تم لوگ (کبھی) گمراہی پر جمع نہ ہوں گے۔ [مشکوٰۃ]

فائدہ:

خیر القرون کے فیوض و برکات اپنی جگہ مسلّم ہیں، بارہویں صدی کے مجاہد حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ صرف ڈیڑھ گھنٹے میں پورے قرآن مجید کو ختم کرتے تھے، اہلِ بدعت نے امتحان کرنا چاہا، حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دہلی کے فلاں پل کے پاس عصر کی نماز ہوگی، تم سارے قرآن مجید کے نسخے لے کر آئیں، جب نماز عصر سے فارغ ہوئے تلاوت شروع کی، بہت بڑا مجمع لگ گیا تھا، لوگ قرآن مجید ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگے، مغرب کی اذان کے ساتھ قرآن مجید کا ختم مکمل ہوگیا، اور زیر و زبر پیش بھی کوئی ساقط نہیں ہوا۔ جو لوگ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کافر کہتے تھے، ان کی اکثریت نے توبہ کی، اور حضرت کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔ (قبر بالاکوٹ پاکستان میں ہے)۔

علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ روزانہ آٹھ مرتبہ قرآن مجید ختم کرتے تھے، اور یہ بالکل ممکنات میں سے ہے۔ [مرقات]

﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى﴾ [النساء:۱۱۵] (ہم اس کو اسی راہ کے حوالے کردیں گے جو اس نے خود اپنائی ہے)۔ اور ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى﴾ [اللیل:۷] (تو ہم اس کو آرام کی منزل تک پہنچنے کی تیاری کرادیں گے)۔ اسی طرح ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾ [اللیل:۱۰] (تو ہم اس کو تکلیف کی منزل تک پہنچنے کی تیاری کرادیں گے) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیر پر چلنے والے کے لئے خیر کا راستہ ہموار اور آسان ہوگا، اور شر پر چلنے والوں کے لئے شر اور برائی کا راستہ ہموار اور آسان ہوگا۔ پس ہر شخص خیر و شر کے انتخاب میں مکمل خود مختار ہے: اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ۔ آمین

پھر فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ﴾ یہ آیت کریمہ چھ رکوع پہلے اسی سورۂ نساء میں گزر چکی

ہے۔ البتہ آخر کے الفاظ میں ایک باریک نکتہ کے لحاظ سے تھوڑا سا اختلاف ہے، وہاں آیت کے اختتام پر ہے:
﴿فَقَدِ افۡتَرٰۤی اِثۡمًا عَظِیۡمًا﴾ اور یہاں فرمایا: ﴿فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا﴾۔

حضرت آلوسی رحمۃ اللہ علیہ روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ اس میں نکتہ یہ ہے کہ وہاں یہودیوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی، انہوں نے جو کچھ اپنی کتاب میں پڑھا تھا اس کی وجہ سے اس بات میں انہیں بالکل شک نہ تھا کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اور ان کی شریعت کا اتباع فرض ہے، اور وہ جو کچھ ایمان کی دعوت دیتے ہیں اس کا ماننا لازم ہے، ان سب باتوں کے باوجود یہودیوں نے شرک کی راہ اختیار کی، اور کفر پر جمے رہے، لہٰذا ان کا یہ عمل افتراء ہو گیا، اور اپنی طرف سے جھوٹ بنا کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے رہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور ہم جس دین پر ہیں وہی اللہ تعالیٰ کا محبوب دین ہے۔

اور یہاں اس آیت میں خالص مشرکین سے بات ہو رہی ہے، جو اس سے پہلے نہ کتاب کو جانتے تھے نہ وحی سے واقف تھے، ان کے پاس سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ ہدایت اور دینِ حق لے کر کوئی شخص نہیں آیا تھا۔ لیکن حجت کے ساتھ حق واضح ہونے کے بعد اپنی سابقہ گمراہی پر ہی برقرار رہے، اور شرک ہی پر جمے رہے، اس لئے ان کے حق میں: ﴿فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا﴾ فرمایا، اور یہ لوگ گمراہ تو تھے ہی، اور زیادہ گمراہ ہوتے چلے گئے، اور دور کی گمراہی میں جا پڑے۔

اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنۡ یَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَیۡطٰنًا مَّرِیۡدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَہُ اللّٰہُ ۘ وَقَالَ
لَاَتَّخِذَنَّ مِنۡ عِبَادِکَ نَصِیۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَاُضِلَّنَّہُمۡ وَلَاُمَنِّیَنَّہُمۡ وَلَاٰمُرَنَّہُمۡ
فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الۡاَنۡعَامِ وَلَاٰمُرَنَّہُمۡ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰہِ ؕ وَمَنۡ یَّتَّخِذِ الشَّیۡطٰنَ
وَلِیًّا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانًا مُّبِیۡنًا ﴿۱۱۹﴾ یَعِدُہُمۡ وَیُمَنِّیۡہِمۡ ؕ وَمَا یَعِدُہُمُ
الشَّیۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ۫ وَلَا یَجِدُوۡنَ عَنۡہَا مَحِیۡصًا ﴿۱۲۱﴾

ترجمہ: یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا صرف عورتوں کو پکارتے ہیں، اور نہیں پکارتے مگر شیطان کو، جو سرکش ہے ﴿۱۱۷﴾ جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی، اور شیطان نے کہا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقررہ حصہ لے لوں گا ﴿۱۱۸﴾

اور میں ان کو گمراہ کروں گا، اور امیدیں دلاؤں گا، اور ان کو تعلیم دوں گا، سو وہ جانوروں کے کانوں کو کاٹیں گے، اور میں ان کو تعلیم دوں گا، سو وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورتوں کو بدلا کریں گے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنالے سو وہ صریح نقصان میں پڑ گیا﴿۱۱۹﴾ شیطان ان سے وعدہ کرتا ہے، اور ان کو آرزوئیں دلاتا ہے، اور شیطان ان سے صرف فریب والا وعدہ کرتا ہے﴿۱۲۰﴾ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور اس سے کہیں بچنے کی جگہ نہ پائیں گے﴿۱۲۱﴾

معارف ومنازل

زنانے معبود:

جب دنیائے کفر وشرک کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کفر وشرک فطرتِ سلیمہ اور عقلِ سلیم کے ساتھ متصادم ہے، اور سراسر حماقت و بے عقلی پر مبنی ہے، اسی طرح مشرک اقوام کے باطل معبودوں کے نام بھی سراسر حماقت پر مبنی ہیں، کیونکہ عرب کے اکثر بتوں کے نام نسوانی ہیں، جیسے: ''لات، منات، عُزّیٰ، نائلہ'' وغیرہ۔

اسی طرح اہلِ یونان کے بت ''زُهرَه، جَوزَاء، سُنبله'' وغیرہ۔ ہندوؤں کے چند بتوں کے نام یہ ہیں: ''وشنو دیوی، درگی دیوی، سرسوتی دیوی، لکشمی دیوی، کالی دیوی'' وغیرہ۔ قرآن حکیم کا مقصد مردانہ بتوں کی نفی نہیں ہے، بلکہ مشرکین کی حماقت کی نشاندہی کرنا مقصود ہے، کہ مطلق بتوں کی پرستش جب حماقت ونادانی ہوسکتی ہے، تو ان کی مزید بے عقلی نے یہ بتادیا کہ انہوں نے زنانی مورتیوں کو معبود بنالیا، جن کے اندر خود ہی عقل کی کمی ایک مسلّم امر ہے۔ تو اس سے عابدوں کی بے عقلی خود بخود ہی ثابت ہوجاتی ہے۔

فتحِ مکہ کے موقع پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو طائف بھیجا، ''عُزّیٰ'' بت وہاں رکھا ہوا تھا، کہ جا کر اسے توڑ دو، اور ختم کرو۔ پہلی دفعہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کچھ نہیں دیکھا، دوسری مرتبہ تلاش کرنے پر تہہ خانے سے ایک عورت برآمد ہوئی، جس کے بہت لمبے بال تھے، جو بدصورتی کے ساتھ بکھرے ہوئے تھے، وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر دہشت ڈالنے کے لئے حملہ آور ہوئی، تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے چابکدستی کے ساتھ اس کے تلوار سے دو ٹکرے کئے، اس پر زوردار چیخ کے ساتھ وہ مرگئی۔ وہ اپنی اس کاروائی کے بعد جب خدمتِ اقدس میں واپس آئے اور ماجرا بیان کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ عُزّیٰ تھی، جس کی لوگ پرستش کرتے تھے، اب آج کے بعد اس کی پرستش نہیں

ہوگی۔

دنیا کے مختلف حصوں میں جہاں جہاں پتھروں، دھاتوں سے مختلف سائز کے جو بت رکھے ہوئے ہوتے تھے وہ درحقیقت بے حس اور بے جان بت ہوتے تھے، لیکن شیاطین ان میں گھس جاتے، اور پوجا کرنے والوں کے ساتھ بسااوقات صاف صاف باتیں کرتے، اور ان کو اس منحوس بت پرستی پر شاباش دیتے، اور ان کی اچھی حوصلہ افزائی کرتے، جس سے ان کا عقیدہ اور بھی زیادہ مضبوط ہوجاتا، اور وہ پھر بڑے فخر سے کہا کرتے: آج معبود نے مجھے ہم کلامی کا شرف بخشا، وغیرہ۔ قرآنِ حکیم نے اسی کو فرمایا:

﴿اِنۡ يَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنۡ يَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَيۡـطٰنًا مَّرِيۡدًا﴾ یہ لوگ نہیں پکارتے مگر عورتوں کو، اور نہیں پوجا کرتے مگر شیطان کی، جو سرکش ہے۔ بعض مفسرین نے اِناث سے فرشتے مراد لئے ہیں، کہ مشرکین فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، اور ان کی پوجا کرتے تھے، جیسے سورۃ الزخرف میں ارشاد ہے:

﴿وَجَعَلُوا الۡمَلٰٓـئِكَةَ الَّذِيۡنَ هُمۡ عِبٰدُ الرَّحۡمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوۡا خَلۡقَهُمۡ﴾ [الزخرف:۱۹] (اور انہوں نے فرشتوں کو جو اللہ کے بندے ہیں، مؤنث بنادیا۔ کیا یہ لوگ ان کی تخلیق کے وقت موجود تھے؟)

یہ مشرکین کی کتنی بڑی گستاخی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کی؟ اور وہ بھی بندوں میں سے، اور وہ بھی بیٹیاں، کہ سوائے بناؤ سنگار کے کسی کام کی نہ ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ ان مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا جو اپنا معبود بنالیا تو ان بتوں کو جن کو عورتوں کے نام سے نامزد کر رکھا ہے، جیسے لات، منات، عزیٰ، نائلہ، وغیرہ۔ اور حقیقۃ الامر دیکھئے! تو یہ مشرکین شیطان ملعون سرکش کی عبادت کرتے ہیں، اسی شیطان نے تو انہیں گمراہ کر کے اس راہ پر ڈال دیا، کیونکہ شیطان کی سب سے بڑی خوشی اسی بت پرستی میں ہے، اس سے مشرکین کے پرلے درجے کی حماقت اور جہالت کا اظہار مقصود ہے۔

اول تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معبود بنانا، اور اس سے بڑھ کر حماقت و نادانی کیا ہوسکتی ہے؟ پھر بنایا تو بے جان پتھروں کو، وہ بھی ان کے اپنے ہاتھوں کے تراشیدہ، جہاں رکھوائے سالوں تک وہاں پڑے رہے، اور کتے آکر ان پر پیشاب کرتے رہے، ان میں دفاع کی قدرت نہ ہو۔ اور جب شیطان سجدہ کرنے پر مردود و ملعون قرار پایا، تو اس نے اسی وقت یہ کہا کہ میں تو غارت ہو ہی چکا، مگر میں بھی تیرے بندوں اور اولادِ آدم میں سے اپنے لئے ایک مقدار معلوم اور بڑا حصہ لوں گا، اور اپنے ساتھ ملا کر انہیں ابدی جہنم کی تاریکیوں میں ڈال دوں گا۔ سورۂ حجر میں ارشاد

ہے: ﴿وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۭ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝﴾ [الحجر] (اور جہنم ایسے تمام لوگوں کا طے شدہ ٹھکانا ہے۔ اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لئے ایک ایک گروہ بانٹ دیا گیا ہے)۔

شیطان کو خطاب ہے کہ جاؤ، زور لگا کر گمراہ کرلو، اور اپنے لئے دوست اور ساتھی بناؤ، ہم نے جہنم کو بے مقصد تو نہیں بنایا، وہ بھی جنت کی طرح حقدار ہے کہ اسے نافرمان خلقت سے بھر دیا جائے، جاؤ تیرے اور تیرے ساتھیوں کے لئے دوزخ کا جیل خانہ تیار ہے، تم سب اسی گھاٹ پر اتارے جاؤ گے۔

بعض سلف نے ﴿لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ﴾ سے دوزخ کے سات طبقے مراد لئے ہیں، جو کہ اوپر نیچے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کے نام یہ بتلائے ہیں: **جهنم، سعير، لظى، حطمة، سقر، جحيم، هاوية۔**

البتہ جہنم جس طرح ایک خاص طبقہ کا نام ہے، اسی طرح مجموعۂ طبقات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موضح القرآن میں فرماتے ہیں کہ جیسے بہشت کے آٹھ دروازے ہیں، نیک عمل والوں پر بانٹے ہوئے، اسی طرح دوزخ کے سات دروازے ہیں، بدعمل والوں پر بانٹے ہوئے۔ شاید بہشت کا ایک دروازہ زیادہ اس لئے ہے کہ بعض موحدین نرے، یعنی خاص فضل سے جنت میں جائیں گے، بغیر عمل کے، باقی عمل میں دروازے برابر ہیں۔ اور یہ فضل والے لوگ جو بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے، ان کی تعداد حدیث شریف کی رُو سے چار ارب نوے کروڑ ہے۔ [البدور السافرة للسيوطي]

تو بات ظاہر ہے کہ متمرد وملعون ہونے کے علاوہ شیطان تو جملہ بنی آدم کا روزِ اول سے سخت دشمن اور بدخواہ ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر شیطان کو بنی آدم کا ازلی دشمن بتا کر لوگوں کو آگاہ کیا ہوا ہے، اور شیطان کی اطاعت کے برے نتائج سے خبردار کیا ہوا ہے۔ سورۂ یٰسٓ میں ارشاد ہے: ﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝﴾ [یٰس: ٦٠] (اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تمہیں یہ تاکید نہیں کردی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے)۔ اسی طرح قرآن حکیم نے شیطان کو دشمن قرار دے کر اسے دھوکہ باز، مکار اور فریب کار بھی بتایا۔

اس ملعون نے روزِ اول بڑے زور وشور کے ساتھ اپنی دشمنی کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہوئے اظہار کیا تھا۔ سورۂ اعراف، سورۂ حجر اور سورۂ بنی اسرائیل میں اس کی تفصیل ہے۔

اب تو یہ احتمال بھی نہ رہا کہ گو شیطان ہر طرح سے مردود گمراہ ہے، مگر شاید کسی کو خیر خواہانہ کوئی فائدہ کی بات بتلادے، بلکہ یہ معلوم ہوگیا کہ وہ دشمن ازلی تو بنی آدم کو جو کچھ بتلائے گا ان کی بربادی اور گمراہی ہی کی بات بتلائے گا، پھر ایسے گمراہ اور بدخواہ کی بات ماننی اور اطاعت کرنی کس قدر جہالت اور ناعاقبت اندیشی ہے؟

شیطان نے نصیب مفروض مقررہ حصہ لینے کا جو اعلان کیا ہوا ہے، اس سلسلے میں وہ ایک بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے، کیونکہ اول بات تو یہ ہے کہ اس کی رفتار دجال اکبر کی طرح نہایت ہی تیز ہے، وہ ایک ساعت میں پوری دنیا کا چکر لگانے پر قادر ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور خلفاء، مبلغین کی اصلاحی تعلیمات میں یہ سرعت نہیں ہے۔

دوئم شیطان کو بنی آدم مرد عورت کے جسم اور قلب و دماغ اور بدن میں گھسنے، یعنی داخل ہونے، اور اس کے خون میں شامل ہونے کی صلاحیت حاصل ہے، جبکہ قرآنی علوم و معارف کے علماء میں مجموعی طور پر یہ اثر نہیں ہے۔

حدیث میں ارشاد ہے: اِنَّ الشَّیطَانَ یَجرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ۔ [بخاری]

تیسری بات یہ ہے کہ شیطان اپنے پروگرام کے پھیلانے میں اتنا تیز اور مستعد رہتا ہے کہ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتا، جبکہ اصلاح کرنے والے ایسے نہیں ہوتے، وہ کھاتے پیتے اور سوتے ہیں، ایک مختصر وقت میں اصلاحی کام انجام دیتے ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد میں انقطاع اور فترۃ کا وقوع ہوجاتا ہے، جیسے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کتنا بڑا عرصہ گزرا؟ بخلاف شیطانی اعمال کے، کہ وہاں کوئی انقطاع نہیں، بلکہ مسلسل شیاطین بدون کسی رکاوٹ کے لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ شیاطین کے لئے ایک علاقے سے دوسرے علاقہ تک جانے کے لئے اسباب و وسائل، اور کسی سواری کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، جبکہ مذہبی خدمات انجام دینے والے تمام اسباب و ذرائع آمد و رفت کے محتاج رہتے ہیں۔

چھٹی بات یہ ہے کہ شیاطین کی تعلیمات نفسانی خواہشات کے عین مطابق ہیں، جنہیں لوگ بصد خوشی قبول کرنے پر تیار ہوتے ہیں، جبکہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات نفسانی خواہشات کے سراسر مخالف ہوتی ہیں، جہاں نفس پروری کی بجائے نفس کشی کی تعلیم دیجاتی ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے متبعین نہایت قلیل ہوتے ہیں، اور شیاطین نہایت کثیر اور زیادہ ہوتے ہیں۔

ساتویں بات یہ ہے کہ شیاطین کی اتنی بڑی بے شمار فوج ہے جس کا کوئی حساب نہیں۔ یہ پوری فوج چاق و چوبند مسلح اور فتنہ انگیزی میں رات دن معروف رہتی ہے، جبکہ اہلِ حق کے پاس کوئی فوج نہیں، جو ان کی مدد کرنے پر بروقت مستعد اور تیار ہو، وغیرہ۔ اسی وجہ سے شیطان نے ربّ العزّت سبحانہ کے حضور دندناتے ہوئے چیلنج کے ساتھ کہا تھا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک اچھے خاصے حصے کو اپنے ساتھ ملا کر گمراہ کروں گا۔ دیکھیں! اس جرأت اور بیباکی کی کوئی حد نہیں۔

پس دنیا کی تاریخ ہمارے سامنے ہے، ہم دیکھتے اور مطالعہ کرتے ہیں کہ ہر قرن اور ہر زمانہ میں اہلِ حق کی مقدار مٹھی بھر، یا آٹے میں نمک کے برابر رہی ہے، اور ابلیسی گماشتے باطل اور کفر پر چلنے والے نہایت کثرت میں اور بے شمار رہے ہیں۔ اور یہ قلت و کثرت کا سلسلہ قیامت تک اسی طرح جاری رہے گا۔ اس وقت دنیا کی مجموعی آبادی ساڑے چھ ارب نفوس پر مشتمل ہے، بہ مشکل مسلمانوں کی آبادی سوا ارب ہے، باقی سوا پانچ ارب لوگ شرک اور کفر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

پھر سوا ارب مسلمان بھی برائے نام ہیں، اگر عقائد اور اعمال، دیانت و تقویٰ کے لحاظ سے ان میں چھانٹی ہو تو نہایت قلت میں معلوم ہوں گے۔ اسی بنا پر صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ قیامت کے روز جنتی لوگوں کی تعداد نہایت معدود ہوگی، یعنی ہزار میں سے ایک جنت کے لئے، اور نوسو ننانوے دوزخ کے لئے نکالے جائیں گے۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ایک لاکھ انسانوں میں سے جنت کے لئے سو آدمیوں کا انتخاب ہو، اور باقی سب جہنم کے لئے ہوں۔ جہنمیوں کی اتنی بڑی تعداد تمام شیطانی حصے پر ہوگی۔

جس طرح شیطان نے انسانوں کی تعداد پر چھاپہ مار کر اکثریت کو دوزخی اور اپنا حصہ قرار دیا، اسی طرح برائے نام مسلمانوں کے اعمال پر چھاپہ مار کر ان کے اعمال میں اپنا حصہ مقرر کیا، کہ لوگ اپنی کمائی کا ایک حصہ اور کھیتی کی پیداوار کا ایک حصہ، مال و مویشی کا ایک حصہ نذر لغیر اللہ کی صورت میں پیروں، فقیروں اور قبروں، مزارات پر لگا کر کفر و شرک کا جو ارتکاب کر رہے ہیں، یہ سارے شیطان ہی کے حصے شمار ہوں گے۔

عبادت قولی ہو یا بدنی یا مالی ہو، سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، کسی بھی عبادت میں غیر اللہ کی نذر و نیاز اور شرکت صراحۃً شرک اور کفر شمار ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کی پوری تحقیق سورۃ الانعام اور سورۂ مائدہ میں ہے۔

﴿اٰذَانَ الْاَنْعَامِ﴾ مشرکین اونٹنی کو دسویں مرتبہ بچہ جننے کے بعد بتوں کے نام پر کرتے تھے، اور کان چھید

کر اسے آزاد کرتے تھے۔ بہت سے جاہل مشرک مزاج لوگ اب بھی اس طرح کرتے ہیں، اور تعجب کی بات ہے کہ اب بھی کچھ لوگ اپنے بچوں کے کان چھید کر فقیروں اور پیروں کے نام پر کرتے ہیں، یا پیدائشی بچوں کے بالوں کو پیر کے نام پر کرتے ہیں، اور عورتیں اپنے بالوں کو نذر کر کے پیر کے نام کرتی ہیں، پھر استطاعت کے بعد ایک بکرا لے کر پیر کے مزار پر جا کر ذبح کرتے ہیں، اور بال صاف کر کے مزار کے سرہانے یا مزار کے دروازے پر لٹکا دیتی ہیں۔ یہ ایک افسوسناک مشرکانہ رواج ہے، جو کہ بکثرت جہّال اور مشرکوں میں موجود ہے۔

﴿فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ وہ اللہ کی تخلیق کو بدل ڈالیں گے۔ یہ بھی ایک بھیانک شیطانی حربہ ہے۔ خداوند قدوس جل شانہ کی تخلیقی بناوٹ میں تغیر پیدا کرنا۔ یہ بھی شیطان کا حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز سے وہ کام لینا جس کے لئے باری تعالیٰ نے اسے پیدا نہیں کیا، یا کسی چیز سے وہ کام نہ لینا جس کے لئے باری تعالیٰ نے پیدا کیا۔ یعنی جس تغیر سے مذموم فساد پیدا ہو جائے تو وہ ناجائز اور خلاف شریعت ہے۔ مثلاً رہبانیت، لواطت، نس بندی، داڑھی منڈانا، عورتوں کا بال کٹوانا، مردوں کو زنانہ شکل وصورت اور لباس اختیار کرنا، عورتوں کو مردوں کی طرح وضع قطع اختیار کرنا، یا بے پردہ ہونا، یا ناخن بڑھانا، یا مردوں کی محفلوں، کھیلوں وغیرہ میں بے پردہ شرکت کرنا۔

البتہ جس تغیر میں فساد نہ ہو، اور حکمِ شرعی بھی ہو، تو وہ مستحسن ہوگا، جیسے ختنہ کرنا، ناخن تراشنا، زیر ناف اور بغل کے بال کٹوا کر صاف کرنا، اور مونچھوں کو کٹوانا، وغیرہ۔

بہر حال! اصلاح وفساد سب کچھ شریعت کے حکم پر موقوف ہے، اور ہر مسلمان مرد وعورت پر اتباعِ شریعت لازم ہے۔ سید کائنات ﷺ کی زندگی حیاتِ طیبہ، قولاً، فعلاً، عملاً، اخلاقاً امت کے لئے نمونہ ہے۔ فرمایا: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ۷] (اور رسول تمہارے پاس جو کچھ لے کر آئے ہیں اس کو لے لو، اور جس چیز سے منع کیا ہے اس سے باز رہو)۔ وباللہ التوفیق

﴿وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ شیطان ان کو وعدہ نہیں دیتا مگر دھوکے کا۔ کتنا مکار اور فریب کا ماہر، ہر شخص کے مزاج سے باخبر، اسی کے مطابق ناممکن کو ممکن بنا کر، سیاہ کو سفید بنا کر، خشک لکڑیوں کو سبز باغ دکھا کر لوگوں کو فریب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس کا سارا کرتا دھرتا اور دھندا یہی ہے کہ آرزوؤں اور تمناؤں اور شیخ چلی کی لمبی لمبی امیدوں پر چلتا ہے، طرح طرح کے سبز باغ دکھا دکھا کر آدمی کو مست کرتا ہے، موہوم اور غیر ممکن تمناؤں کا ایک طوفانی طومار بنا کر گلے میں ڈال دیتا ہے، جس سے عمر بھر نکلنا اور جان خلاصی مشکل سے نصیب ہو، یا نہ ہو۔

وہ وہ خطرناک اور تباہ کن وسوسے اور بُرے سے بُرے خیالات پیدا کر دیتا ہے، اور ان کی نشوونما کر کے انہیں خوبصورت بناتا ہے، کہ بڑے سے بڑے ہوشیار آدمی بھی بے عقل بن کر سب کچھ ضائع کر دیتے ہیں۔ چاہئے کہ لوگ ''ابلیس کی سوانح عمری'' کتاب کا مطالعہ کریں، اور صبح وشام بار بار استعاذہ کا عمل جاری رکھیں۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنَ الْاِبْلِیْسِ وَ جُنُوْدِہٖ وَ اَعْوَانِہٖ وَ ذُرِّیَّتِہٖ آمین ثم آمین۔

ابلیس کے مکروفریب سے صرف اللہ تعالیٰ ہی بچا سکتا ہے، ورنہ اس خبیث نے بڑے بڑے عابدوں، اور زاہدوں کو دنیا سے بے ایمان رخصت کیا۔ پس چاہئے کہ فضلِ الٰہی اور کرمِ خداوندی کا طلبگار رہا جائے، اور ایمان کی نعمت کو اسی پاک ذات کی حفاظت میں دیدیا جائے۔ امام اعمش حضرت سلیمان بن مہران رحمۃ اللہ علیہ کا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ میں شمار ہے، یہی دعا کرتے تھے: ''اے اللہ تعالیٰ! ایمان تیری دی ہوئی نعمت ہے، میں عاجز بندہ اس کی حفاظت نہیں کرسکتا، یہ آپ کی امانت ہے، آپ ہی اس کی حفاظت فرمائیں''۔

سپردم بتو مایۂ خویش را ☆ تو دانی حساب کم وبیش را

(سعدی)

﴿اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا﴾ ایسے لوگوں، یعنی ابلیس کی رفاقت ودوستی اختیار کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا، اور اس سے بچنے کا ٹھکانہ نہیں پائیں گے۔ کاش یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اطہر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، علماء وصلحاء نیک بندوں سے شریعت پر چلنے والے پرہیزگاروں سے محبت ودوستی استوار کرتے، اور اعمالِ صالحہ بجالاتے، تو اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ کے بمصداق آج جنت کے بالاخانوں میں اُفتاں وخیزاں خراماں رہتے، مگر بدقسمتی سے انہوں نے شیطان سے دوستی کی، تو شیطان نے انہیں اسی گھاٹ پر اتارا جہاں وہ رہتا ہے۔ یہ ابدی گھاٹی ان کے لئے ہے جہاں سے وہ کسی صورت نہ نکل سکتے ہیں، اور نہ جگہ تبدیل کر سکتے ہیں۔ اے ربّ! ہمیں بچا۔ آمین

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝۱۲۲ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۝

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے، اور نیک عمل کئے عنقریب ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے سچا وعدہ فرمایا ہے، اور کون ہے جس کا کہنا اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا ہو؟ ۝ نہ تمہاری آرزوؤں پر مدار ہے، نہ اہلِ کتاب کی امیدوں پر، جو شخص برا عمل کرے گا اس کا بدلہ دیا جائے گا، اور نہ پائے گا اللہ تعالیٰ کے سوا دوست اور مددگار ۝ اور جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت، اور وہ مؤمن ہو، تو یہ لوگ داخل ہوں گے جنت میں، اور ان پر اتنا بھی ظلم نہ ہوگا جتنا کھجور کی گھٹلی کا گڑھا ۝ اور اس سے بڑھ کر دین کے اعتبار سے کون اچھا ہوگا جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے لئے جھکا دیا، اور وہ اچھے کام کرنے والا ہے، اور اس نے ابراہیم کی ملت کا اتباع کیا، جو سارے دینوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہونے والے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو دوست بنالیا ۝ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو آسمانوں میں ہے، اور جو زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ فرمائے ہوئے ہیں ۝

معارف ومنازل

ان آیات میں ان حضرات کے لئے جو اہلِ ایمان ہوں، اور اعمالِ صالحہ میں مشغول ہوں، اور توحید پر قائم ہوں، ابلیسی کارناموں اور شیطانی شرارتوں سے محفوظ ہوں، اور اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم جن کے شاملِ حال رہا انہیں ابلیس کی رفاقت سے بچایا، ایسے لوگوں کے لئے باغوں میں داخلے کے لئے خوشخبری دی، جن کے نیچے نہریں جاری رہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ اللہ تعالیٰ کا سچا پکا وعدہ ہے، اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اپنی بات میں سچا کون ہوسکتا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہوگیا تو اب مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق مکمل اسلامی زندگی گزاریں۔ جب یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ان لوگوں کو پہنچے گا جو ایمان واعمالِ صالحہ پر پابندی کرنے والے ہوں، محض نسبت پر اکتفاء کرنے والے نہ ہوں، جیسے بعض نادانوں کا طریقہ رہا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ نے کہا کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی داخل نہ ہوگا، اور قریش نے کہا کہ ہم موت کے بعد اٹھائے ہی نہیں جائیں گے، تاکہ کوئی عذاب کی صورت سامنے آئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ پھر حضرت مسروق بن اجدع تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ نصاریٰ اور مسلمان جمع ہوئے، اور آپس میں فخر کرنے لگے، ہر فریق نے یہ کہا کہ ہم تم سے افضل ہیں، وجہ فضیلت کسی نے کیا بتائی، کسی نے کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اسی طرح کی روایت حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے، کہ اہلِ کتاب نے کہا کہ ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے، اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے، لہٰذا ہم تم سے افضل ہیں، ان کے جواب میں مسلمانوں نے کہا کہ ہم تم سے افضل ہیں، اس لئے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، اور سارے انبیاء کرام علیہم السلام سے افضل ہیں، اور ہماری کتاب آخری کتاب ہے، جس نے سب آسمانی کتابوں کو منسوخ کرلیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس کے علاوہ اہلِ کتاب اپنی افضلیت کے لئے دیگر بہت سی وجوہات ذکر کرتے رہے، جن کی تفصیل گزر چکی، اور قرآن کریم نے اس قسم کے خالی خولی منگھڑت دعوؤں کو مسترد فرمایا۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمنا اور آرزو اور تفاخر و افضلیت کسی کے لئے زیبا نہیں، کیونکہ محض تمناؤں، امیدوں اور دعوؤں سے کوئی کسی سے افضل نہیں ہوتا، مجموعی فضیلت افراد کے لئے ہرگز فائدہ مند نہیں، کیونکہ افضلیت کا مدار اعمال پر ہے، جو صاحبِ عمل ہوگا وہی افضل ہوگا۔ کسی قوم یا امت کا نبی اور کتاب کتنی ہی افضل اور اعلیٰ ہو، اگر ان کا عمل غلط ہوگا تو وہ لازماً سزا پائے گا، اور نبی و کتاب کی افضلیت اس کو کام نہیں آئے گی، پس تمہیں چاہئے کہ ایمان پر استقامت کے ساتھ رہو، اور اخلاص کے ساتھ اعمالِ صالحہ پر قائم رہو۔ اسی کے طفیل آخرت کے بلند درجات تک رسائی حاصل کرو۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایمان صرف آرزو کا نام نہیں ہے، ایمان وہ ہے جو دل میں جم جائے، اور عمل اس کی تصدیق کرے۔

بہت سے لوگوں کو مغفرت کی امیدوں نے غفلت میں ڈال دیا، یہاں تک کہ وہ دنیا سے اس حال میں چلے گئے کہ ان کے پاس ایک نیکی بھی نہ تھی، انہوں نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھتے ہیں، اور وہ اپنے اس کہنے میں جھوٹے تھے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ سے وہ حسن ظن اچھا گمان رکھتے تو حسن عمل اختیار کرتے۔ [روح المعانی]

خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب اپنی آرزوؤں پر بھروسہ کرکے ہلاک ہوئے، تم مسلمان ہرگز آرزوؤں پر بھروسہ نہ کرو، ایمان پر استقامت رکھتے ہوئے اعمالِ صالحہ انجام دیتے رہو۔

بُرے اعمال کا بدلہ دنیا میں ملے گا:

﴿مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِهٖ﴾ یعنی جو شخص کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سرورِ عالم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سنائی، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، ہم میں سے ایسا کون ہے جس نے گناہ نہیں کیے؟ اور اگر ہمیں ہر گناہ کی سزا بھی ملتی ہے تو ہمارا کیا بنے گا؟ اس پر سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ابوبکر! تم اور تمہارے ساتھی اہلِ ایمان کا گناہوں پر گرفت کرکے دنیا ہی میں معاملہ صاف کردیا جائے گا، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ سے ملوگے تو تم پر گناہ نہ ہوں گے، اور دوسرے لوگ (جو اہلِ ایمان نہیں ہیں) ان کے گناہ جمع کیے جاتے رہیں گے، یہاں تک کہ قیامت کے دن (پہاڑوں جتنے معاصی جمع ہوں گے) ان کی سزا پائیں گے۔ [ترمذي]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کو ذرہ برابر جو بھی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو وہ گناہ ہی کی وجہ سے پہنچتی ہے، اور اللہ تعالیٰ جو کچھ معاف فرمادیتے ہیں وہ تو اس سے بہت زیادہ ہوتا ہے جتنے پر مؤاخذہ ہوتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَیۡدِیۡكُمۡ وَیَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِیۡرٍ﴾ [الشوری: ۳۰]۔ (اور جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کیے ہوئے اعمال کی وجہ سے ہے، اور اللہ بہت زیادہ کو معاف فرمادیتا ہے)۔ [ترمذي]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری تو مسلمانوں کو بہت سخت پریشانی ہوئی، تو انہوں نے سرورِ عالم ﷺ کی خدمتِ گرامی میں اپنی پریشانی پیش کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ٹھیک چلتے رہو، اور کام کرتے رہو، کیونکہ مسلمان کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کے لئے کفارہ بن جاتی ہے، یہاں تک کہ جو کانٹا لگ جاتا ہے، یا جو چوٹ لگ جاتی ہے، ان سب کے ذریعہ گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے۔ [مسلم]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کو جو بھی تھکن، دکھن، فکر، غم، رنج، تکلیف پہنچ جائے، یہاں تک کہ کانٹا بھی لگ جائے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے گناہوں کا کفارہ فرمادیتے ہیں۔ [متفق علیه]

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن مرد اور مؤمن عورت کو برابر اس کی جان میں، اس کے مال میں، اور اولاد میں تکلیف پہنچتی رہتی ہے (اور اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتا رہتا ہے) یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا تو اس پر کوئی بھی گناہ نہ ہوگا۔ [ترمذي]

اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت اور مسلمانوں پر شفقت ومرحمت کا کوئی اندازہ نہیں، یہ کتنا بڑا انعام ہے جسے عام عرف میں "رنج میں گنج" سے تعبیر کرتے ہیں کہ مسلمان بندہ کے گناہوں کو معمولی اور نہایت حقیر غم ورنج کے ذریعہ معاف فرمادیتے ہیں، پس جو لوگ بہت سخت بیماریوں میں سالہا سال مبتلا رہتے ہیں، ان کے رفع درجات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، پس ثابت ہوا کہ جس طرح صحت وتندرستی اور خوشحالی اس کی عظیم نعمت ہے، اسی طرح بیماری، فقر، پریشانی وغیرہ بھی اس کی نعمتیں ہیں، اور مکفِّر سیآت ہیں۔

فائدہ:

﴿مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ﴾ یہ حکم بمنزلہ ایک قانون کے ہے، پس لازمی نہیں کہ ہر گناہ پر مؤاخذہ ہو، کیونکہ دوسری آیت: ﴿وَيَعۡفُ عَنۡ كَثِيۡرٍ﴾ سے عفو ودرگزر ثابت ہوا۔ پس مؤاخذہ نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ گناہ کے فوراً بعد جب توبہ استغفار ہو، تو گناہ معاف ہوجائے گا، تو مؤاخذہ ختم۔

تیسری بات یہ کہ سیآت حسنات سے مٹ جاتی ہیں، اگر گناہ کے بعد نیکی کا ارتکاب ہوا تو مؤاخذہ کا امکان ختم ہوجائے گا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مؤاخذہ کرے چاہے معاف کردے، اور اس کا عفو مقدم ہے مؤاخذہ پر۔ واللہ تعالیٰ اعلم

خوشخبری، بشارتِ عظمٰی:

حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، یہاں تک کہ کوئی کانٹا بھی لگ جاتا ہے، تو اس کا نتیجہ دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوتی ہے: یا تو اللہ تعالیٰ اس مصیبت پر اس کے گناہ معاف فرمادیتے ہیں، جو بغیر اس کے معاف نہیں ہوتا تھا، یا اس کو کسی (جنتی درجہ) عزّت کے مقام پر پہنچادیتا ہے، کہ اس جیسی مصیبت کے بغیر اس عزّت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ [بیهقي]

اسی طرح فرشتے جب جنت میں کسی کا بہت بڑا مقام دیکھتے ہیں تو وہ حیران ہوجاتے ہیں کہ اس مقام پر یہ شخص کیسے پہنچ سکتا ہے، کیونکہ اس کا عمل اتنا اونچا نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں بتایا جائے گا کہ عملِ کثیر نہ

سہی، یہ شخص مصیبتوں کے راستے اس مقام تک پہنچ جائے گا۔ اسی طرح قیامت کے دن جب مصیبت زدگان کو اونچے اعزاز اور بلند درجات پر فائز کیا جائے گا، تو انہیں دیکھ کر صحت منداور خوشحال لوگ تمنا کریں گے کہ کاش اگر دنیا میں ہمارے بدن ٹکڑے ہوتے، اور قینچیوں سے کاٹے جاتے، تو کتنا اچھا اور بہتر ہوتا، جس کے بدلے آج انعامات اور بڑے درجات وثواب سے نوازے جاتے۔ [مشکوۃ]

ثواب صرف مؤمنین ومؤمنات کے لئے ہے:

﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ آیت کریمہ میں اہل کتاب اور مشرکین دونوں کی تردید ہے۔ مشرکین سے کہا جارہا ہے کہ تم مسلمانوں سے افضلیت کا جو دعویٰ کرتے ہو وہ سراسر غلط ہے، اس لئے کہ افضلیت کا معیار ایمان اور تقویٰ ہے، جو تمہیں نصیب نہیں رہا۔ نیک عمل اس وقت معتبر ہوگا جب ایمان ہو، اور بغیر ایمان کے کوئی عمل قابل قبول نہیں ہوگا، اور اہلِ کتاب سے یہ کہا جارہا ہے کہ تم جب تک خاتم الانبیاء ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان نہیں لاؤ گے، اس وقت تک تمہارا کوئی عمل قابلِ قبول نہیں، چہ جائیکہ تمہارا ایمان۔ اور جب تمہارا ایمان وعمل دونوں غیر معتبر رہے تو افضلیت کا کیا مطلب؟ تمہارا ابدی ٹھکانہ جہنم کے سوا کوئی نہیں، اس لئے کہ تم مشرکین کی طرح کافر ومشرک ہو، جیسے بار بار گزرا۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی مرد یا عورت نیک عمل کرے، اس حال میں کہ وہ مؤمن ہو، پس ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور قیامت کے دن جب وہ اپنے ربّ کے حضور پیش ہوں گے تو ایمان وعملِ صالح اور اپنے اخلاص اور اتباعِ سنت کی وجہ سے بے شمار ثواب پائیں گے، جو بہت زیادہ ہوگا۔

﴿وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا﴾ کھجور کی گٹھلی کے اندر جو ذرا سا گڑھا ہوتا ہے، اس کے برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی ان کے اجر وثواب میں، جیسے پہلے ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ [النساء: ۴۰] (اللہ ظلم نہیں کرتا ذرّہ برابر)۔ ذرہ ایک نہایت حقیر چیز ہے، اگر کوئی ہاتھ میں لینا چاہے تو ممکن نہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ تم اہلِ کتاب اور مشرکین جو خود کو ابراہیمی کہتے ہو، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہو، اور دعویٰ کرتے ہو کہ ہم ابراہیمی ملت پر ہیں، فرمایا: یہ سب افتراء اور جھوٹ ہے، کیونکہ جب ابراہیم علیہ السلام جیسا عمل تمہارے اندر نہیں، اور ابراہیم علیہ السلام کی سب سے بڑی صفت حنیفیت ہے، وہ تمہارے اندر نہیں ہے، تو تم کس طرح جرأت کرکے کہتے ہو کہ ہم ابراہیمی ہیں؟ اور یہی ہماری برتری وشرف

کی اصلی وجہ ہے؟ حال یہ ہے کہ تمہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کوئی دور کا واسطہ بھی حاصل نہیں۔ پوری تفصیل سورۂ آل عمران آیت ۶۸ کے تحت گزر چکی۔

البتہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے لوگ ابراہیمی بھی ہیں، اور صاحب ایمان وعمل اور متقی بھی ہیں، جنہوں نے سارے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کی ہے، اور مقامِ توحید واخلاص اور اتباعِ سنت کے ساتھ اعمالِ صالحہ پر مداومت کی ہے، جنہیں ابراہیم علیہ السلام کے اتباع کا پورا پورا شرف وسعادت حاصل ہے، تو فرمایا:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا﴾ مطلب یہ ہے کہ دین کے اعتبار سے اس شخص سے اچھا کون ہوگا جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خالص کر دیا، اس کی توجہ ظاہر سے باطن سے اور جسم سے اور جان سے اور قلب اور قالب سے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے، اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کرتا ہے، جو حنیف تھے، جنہوں نے تمام ادیان اور پوری خلقت اور تمام دنیوی خواہشات کو بصد رغبت وخوشی چھوڑ کر فراموش کر دیا، حتیٰ کہ خود کو بھی فراموش کر کے ایک ہی ذات واحد لاشریک لہٗ کے حضور سرِ تسلیم خم کر کے مکمل فرمانبرداری کا عہد کیا، اور اس پر قائم رہے۔

پس جو کوئی ان اعلیٰ صفات، یعنی ایمان، احسان، اتباعِ حق، عملِ صالح اور اتباعِ ملّتِ ابراہیمی اور صفتِ حنیفیت کے ساتھ متصف ہوگا، وہ سب سے اچھا اور بہتر ہوگا، جس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنی بے حساب اور اعلیٰ قربانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے محبوب اور خلیل بنے، اسی طرح ان کے نقش قدم پر چلنے والے بھی محبوبیت کے مقام ومنصب پر فائز رہیں گے۔

﴿اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ﴾ یعنی اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کر دیا، کہ اس کے قلب کی کوئی علمی یا میلانی وابستگی غیر خدا سے نہیں رہی۔ دل ودماغ ظاہر وباطن سارا بدن اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کا پابند ہوگیا، یہاں تک کہ عالمِ امکان میں اپنا، یا کسی اور کا کوئی وجودِ حقیقی اصلی اس کو نظر ہی نہیں آتا، کسی کے مستقل وجود، یا کسی کو محبوب ومعبود بنانے اور ماننے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

﴿وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ ایسی حالت میں کہ وہ صفتِ احسان کا مالک بھی ہے، وہ اتباعِ حق کے سلسلہ میں درجۂ احسان تک پہنچا ہوا ہے، کہ اس کے سارے اعمال اچھے اور پسندیدہ ہیں۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ احسان (اعمال کی خوبی) کیا

ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عبادت کی خوبی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اللہ تعالیٰ کو اپنی نظر سے دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اپنی نظر سے اس کو نہیں دیکھ پاتے، تو وہ یقیناً تم کو دیکھتا ہے، جب تمہارا قلبی باطنی عقیدہ اس مقام پر پہنچا ہو پس آپ خوش قسمت ہی رہو گے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

﴿وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ یوں تو تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین ایک ہی ہے، کیونکہ اپنی ذات اور اعضاء بدن، مال واولاد اور اندرونی و بیرونی قوتوں کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی میں لگا دینا ہی دین انبیاء علیہم السلام ہے، (یعنی اسلام)، لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین وملت کا تذکرہ صرف اس وجہ سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت وسیادت پر تمام اقوام کا اتفاق ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت سب کے نزدیک مسلّم ہے۔

پھر دینِ اسلام بکثرت فروعی مسائل میں شریعتِ ابراہیمی کے موافق ہے، مثلاً استقبالِ کعبہ، طوافِ کعبہ، احکامِ حج، مناسکِ حج، مزدلفہ، منیٰ، عرفات کا وقوف، رمی جمار، قربانی اور ختنہ ودیگر بہت سے احکام، مہماں نوازی اور دیگر محاسنِ فطریہ، جن کی تکمیل کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا تھا، اور وہ اس امتحان میں پورے اترے تھے، اور خلت کے عظیم مقام ومنصب پر فائز ہو چکے تھے۔ تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خالص دوست بنالیا تھا، یعنی سچا دوست خالص محبت والا۔

سردارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلیل الرحمن بھی ہیں، حبیب الرحمن بھی:

سید الانبیاء خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درجہ خلت کے درجہ سے بہت اونچا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام خالص محبوبیت کا مقام ہے، مقامِ خلت کو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راستے میں چھوڑ گئے تھے، اور آگے قدم بڑھا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شب معراج کو اس مقامِ قرب ومحبت میں پہنچے جہاں کسی مخلوق کی رسائی ممکن نہ ہو۔

حضرت جُندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات سے پہلے فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خلیل بنالیا ہے، جس طرح ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنالیا تھا۔ [حاکم] امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنالیا تھا، اور تمہارا ساتھی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی اللہ تعالیٰ کا خلیل ہے، اور قیامت کے دن محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام بنی آدم کا سردار ہوگا، پھر آپ نے: ﴿عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ [الاسراء: ۷۹] (امید ہے کہ تمہارا

پروردگار تمہیں مقامِ محمود تک پہنچائے گا) کی تلاوت فرمائی۔

ترمذی اور ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کیا کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابراہیم خلیل اللہ تھے، اور واقع میں وہ ایسے تھے، لیکن سن لو کہ میں اللہ تعالیٰ کا حبیب ہوں، اور یہ فخر نہیں ہے (اظہارِ حقیقت ہے) سب سے پہلے میں ہی شفاعت کروں گا، اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت قبول ہوگی، اور یہ فخر نہیں ہے، اور سب سے پہلے میں ہی جنت کی زنجیر ہلاؤں گا، اور اللہ تعالیٰ اس کو کھول کر ہم کو اندر داخل فرمائے گا، اس وقت میرے ساتھ فقراء مؤمنین بھی ہوں گے، اور یہ فخر نہیں ہے۔

ابن جریر اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلّت کے لئے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلام کے لئے، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدار کے لئے چن لیا۔ [مظهري]

فائدہ:

آیت کریمہ: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران: ۳۱] (آپ کہہ دیں: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو محبوب رکھے گا) کے آخری جملہ میں جس محبوبیت کا بیان ہے وہ محبوبیتِ عامہ ہے، لہٰذا کسی کو اشتباہ نہیں ہونا چاہئے۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى
النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ
الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

ترجمہ: اور وہ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے، اور وہ جو کتاب میں تم پر تلاوت کیا جاتا ہے ان یتیم عورتوں کے بارے جن کو تم وہ حق نہیں دیتے ہو جو ان کے لئے مقرر کیا گیا، اور تم رغبت رکھتے کہ ان سے نکاح کرو، اور ضعیف بچوں کے بارے میں بھی تم پر آیات تلاوت کی جاتی ہیں، اور یہ کہ تم یتیموں کے حق میں انصاف کے ساتھ قائم رہو، اور جو کوئی خیر کا کام کروگے

سو اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے﴿۱۲۷﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ کے مطلب کی پوری وضاحت کے لئے سورۃ النساء کے شروع آیات کا دوبارہ مطالعہ کیا جائے: ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾[النساء:۳] (اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لے سکو گے، تو دوسری عورتوں میں سے کسی سے نکاح کرو، جو تمہیں پسند آئیں) کے ضمن میں۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کسی شخص کے پاس کوئی یتیم بچی ہوتی تھی، وہ اس کا ولی بھی ہوتا تھا، اور شریک میراث بھی، جیسے کہ اس یتیم بچی کو اور اس کے ولی کو کسی مرنے والے سے مشترک میراث ملی ہو، اب یہ ولی نہ تو اسے (بدصورتی کی وجہ سے) اپنے نکاح میں لیتا تھا، اور نہ کسی دوسرے مرد سے اس کا نکاح کراتا تھا، کیونکہ یہ ڈر تھا کہ دوسرے سے نکاح کی صورت میں یتیم بچی کا مال ولی کے قبضہ اور ہاتھ سے نکل جائے گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس میں کبھی یہ بھی ہوتا کہ بچی کی خوبصورتی کی وجہ سے ولی اس کے ساتھ نکاح تو کرتا تھا، مگر اسے حقِ مہر سرے سے یا تو نہیں دیتا تھا، یا بہت کم دیتا تھا، اور یہ اس کی حق تلفی ہوتی، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا۔

ایک تیسری ظالمانہ صورت یہ ہوتی تھی کہ لڑکی کا حصہ مال میراث میں زیادہ ہوتا تھا، ولی چاہتا تھا کہ مال پر میرا قبضہ ہو، یتیم لڑکی کا نکاح نہ چاہتے ہوئے محض اپنے یا اپنے بیٹے کے ساتھ کرتا تھا کہ باہر کا کوئی آکر مال پر قبضہ نہ کرے، پھر اس لڑکی کے ساتھ نہ رواداری رکھتے، اور نہ حسنِ سلوک کرتے، ایک تو اس کے مال پر قبضہ، دوئم بغیر مہر کے نکاح، سوئم حقوقِ زوجیت سے محرومی، اور محض خدمت گزاری۔ یہ تین ظلم ہوئے، جس پر آیت کریمہ کا نزول ہوا۔

فتح الباری جلد ہشتم میں بحوالہ ابن ابی حاتم حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایسا واقعہ موجود ہے، جو ابھی بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ طلب کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ شانہ ان کو فتویٰ دیتا ہے، اور اس سے پہلے شروع سورت میں جو آیات نازل ہوئی ہیں وہ بھی ان کو فتویٰ دے رہی ہیں، جو ان پر تلاوت کی جاتی ہیں۔ یہ فتویٰ یتیم عورتوں کے بارے میں ہے، جن کو تم ان کا مقررہ حقِ میراث نہیں دیتے ہو (جیسے کہ لوگ عورتوں اور نابالغ بچوں کو میراث سے محروم رکھتے تھے)۔ اور تم ان سے نکاح کرنے سے بے رغبت ہو۔ اس

ظالمانہ سلوک سے وہ پریشان رہتی ہیں، لہٰذا ایسی کوئی صورت پیدا ہو جس سے ظلم و بے انصافی اور حق تلفی کا خاتمہ ہو، اس کی سب سے بہتر صورتیں یہ ہیں:

پہلی صورت یتیم خواہ لڑکی ہو، یا نابالغ لڑکا، قرآن وحدیث کے اصولِ میراث کے قواعد کی رُو سے ان کا مقررہ حصہ انہیں دیدیں، اور ان کے کفیل اور وصی کے حوالہ کردیں، پھر وہ لڑکی خود مختار ہے، جہاں چاہے شادی کرلے۔ البتہ اگر تم اس کی شادی کی رغبت رکھتے ہو، اور وہ لڑکی بھی سو فیصد راضی ہے، تو تینوں شرائط کا پورا کرنا تمہارے اوپر فرض ہے:

(۱) اس بہانہ اس کے مال پر قبضہ نہ کرو، مال بدستور اس کی ملکیت میں رہنے دو۔

(۲) جو اس کا صحیح شرعی حقِ مہر ہے اس میں کسی قسم کی کمی بھی نہ کرو، اور ادائیگی میں پس وپیش اختیار نہ کرو۔

(۳) حسنِ سلوک، رواداری اور حقوقِ زوجیت میں کبھی سستی نہ کرو، گھر کی مرغی دال برابر کا سلوک نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ شانہ عدل وانصاف والے بندوں کو پسند کرتا ہے، اور بے انصاف لوگوں کو ناپسند کرتا ہے، پس ہر مسلمان کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہوجائے۔ آخر میں فرمایا:

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا﴾ جو کچھ تم خیر کا کام کروگے تو اللہ تعالیٰ شانہ کو اس کا علم ہے، تم یتیموں کے اموال کے بارے میں طرح طرح کی تدبیریں کرکے لوگوں کو باور اور راضی کراسکتے ہو، مگر اللہ تعالیٰ کو ہر چیز اور ہر ذرّہ کا علم ہے، اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے ہو، تو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف رکھو، اور یہ بھی سوچو کہ کہیں تمہارے مرنے کے بعد تمہارے یتیموں کا کیا حال ہوگا؟ اور یہ یاد رکھو: كَمَا تُدِيْنُ تُدَانُ، جیسا کروگے ویسا بھروگے۔ ظلم وزیادتی کا اثر اور نحوست سات پشتوں تک جاری رہ سکتی ہے، اور بعض اعمال کی سزا دنیا میں ضرور ملے گی۔ واللہ اعلم

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا

بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ

حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ
كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۝۱۲۹ وَاِنۡ يَّتَفَرَّقَا يُغۡنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنۡ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيۡمًا ۝۱۳۰

ترجمہ: اوراگرکوئی عورت اپنے شوہر کی طرف سے بدمزاجی کا یا بے رخی کا اندیشہ کرے تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں کہ آپس میں کسی خاص طریقہ پر صلح کرلیں، اور صلح اچھی چیز ہے، اور انسانوں کے نفسوں میں کنجوسی حاضر کردی گئی ہے، اور اگر تم اچھا برتاؤ رکھو، اور پرہیز گاری اختیار کرو، تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو ۱۲۸ اور تم ہرگز اس بات پر قادر نہیں ہو کہ عورتوں کے درمیان عدل قائم رکھو، اگرچہ تم حرص کرو، لہٰذا تم بالکل ہی نہ ڈھل جاؤ (نہ جھک جاؤ) جس کی وجہ سے ایک عورت کو ادھر میں (درمیان میں) لٹکی ہوئی چھوڑ دو، اور اگر تم اصلاح کرو، اور پرہیز گاری اختیار کرو، تو بیشک اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے ۱۲۹ اور اگر دونوں جدا ہوجائیں، تو اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اپنی عطا کی ہوئی وسعت کے ذریعہ بے نیاز کردے گا، اور اللہ تعالیٰ شانہ وسعت دینے والا ہے، حکمت والا ہے ۱۳۰

معارف ومنازل

نکاح ایک پسندیدہ عقد کا نام ہے، نیک اور صالح فرمانبردار بیوی دنیوی نعمتوں کا سرغنہ اور تاج ہے۔ جب کوئی نکاح کرتا ہے تو اس کا ارادہ پکا ہوتا ہے کہ زندگی بھر میں اپنی بیوی کو ساتھ رکھوں گا، اور عورت اور اس کے سرپرستوں کا بھی یہی ارادہ ہوتا ہے کہ یہ زندگی بھر شوہر کی ننگ وعزت بن کر رہے گی۔ مگر دنیا کی نیرنگیوں کا اندازہ نہیں ہوتا، ایک طرف سے مردوعورت کے مزاج اور خواہشات، سوچ وافکار اور چاہتوں کا اختلاف، پھر مزید برآں خاندانی اونچ نیچ، اس کے اوپر معاشرہ کی پیچیدگیاں، ذہنی افکار وتصورات، اگر یہ سارے مراحل خوش اسلوبی کے ساتھ طے پاگئے تو زہے خوش نصیبی! ورنہ پھر رنج والم اور پریشانیوں کی بھرمار۔

ضروری نہیں کہ ہمیشہ عورت بدمزاج ہو، بسا اوقات مرد ہی ناکارہ اور بدمزاج ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ اتنا بڑا لمبا ہے کہ سینکڑوں صفحات اس سے بھر جائیں گے۔ شریعت اسلامی میں ہر چیز کا حل موجود ہے۔

مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان فرمایا کہ آیت وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ ایک ایسے شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس کی ایک بیوی تھی، جس سے کئی بچے پیدا ہوچکے تھے، اس مرد کو خواہش ہوئی کہ اس بیوی کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے نکاح کرے، لہٰذا اس عورت نے اس سے یہ صلح کرلی کہ وہ اسی کے

نکاح میں رہے، اور راتوں کی تقسیم میں اسے شامل نہ کیا جائے۔

نکاح بھی انسان کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے، مردوں کو بھی اس کی ضرورت ہے، اور عورتوں کو بھی۔ اور اس میں مرد اور عورت کے بہت سارے دینی اور دنیاوی فوائد اور مصلحتیں ہیں، اور نکاح اسی لئے کیا جاتا ہے کہ زندگی بھر دونوں ساتھ رہیں، اور حسنِ معاشرت کے ساتھ دونوں میاں بیوی خیر وخوبی اور محبت والفت کے ساتھ زندگی گزاریں، لیکن کبھی بعض امور ایسے پیش آجاتے ہیں کہ کچھ ناگواری اور ناچاقی کی صورتیں پیش آجاتی ہیں، اور بعض اوقات اس دوستانہ سفر کو جاری رکھنا مشکل ہوجاتا ہے، اس لئے شریعت مطہرہ نے طلاق اور خلع کی صورتیں جائز رکھ کر مزید خرابیوں اور پریشانیوں کا سدباب فرمایا۔

بعض اوقات مرد کو ایک سے زائد دو تین چار تک نکاح کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ امت کی اجتماعی ضرورت بھی کبھی پیش نظر رہتی ہے، کثرت نکاح مسئلۂ جہاد کو جاری رکھنے کا سبب بھی ہے، اور جو لوگ جہاد میں شہید ہوجاتے ہیں ان کی بیواؤں اور بچوں کو سنبھالنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ ان بیواؤں سے مسلمان نکاح کرلیں۔ یہ کتنا کارِ خیر اور موجبِ ثواب ہے؟

جب ایک سے زیادہ نکاح کرلیا تو اس میں تمام بیویوں کے ساتھ عدل کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنا فرض ہے، اخراجات، خوراک اور پوشاک وغیرہ سب ضروری ہیں، اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر بیوی کے پاس راتوں کو قیام کرنے میں برابری کرے، یعنی جتنی راتیں ایک کے پاس رہے دوسری کے پاس بھی اسی قدر راتیں گزارے۔ یہ وہ عدل ہے جس کا شرعِ انور نے حکم دیا ہوا ہے، جو انسان کے اختیار میں ہے، اور جو چیز اختیار میں نہیں ہے، یعنی یہ کہ قلبی میلان ودوستی کسی کی طرف زیادہ ہو تو اس پر مؤاخذہ نہیں ہے، لیکن اس کی وجہ سے عدلِ اختیاری کو نہ چھوڑے۔

سید عالم ﷺ ازواج مطہرات میں عدل فرماتے تھے، اور انصاف کے ساتھ راتیں تقسیم فرماتے تھے۔ بعض ازواج کے ساتھ قلبی میلان زیادہ تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا: اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰذَا قَسْمِي فِيمَا اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِي فِيمَا تَمْلِکُ وَلَا اَمْلِکُ۔ [ترمذي] اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے، جو میرے اختیار میں ہے، سو آپ اس میں مجھے ملامت نہ فرمایئے جو چیز میرے اختیار میں نہیں، یعنی قلبی رجحان۔ یہ قلبی رجحان قدرتی بات ہے کہ انسان کے اختیار میں نہیں۔ بیویوں کو چھوڑیئے! اولاد، ماں باپ، بھائی، بہنوں میں یہ رجحان قلبی سب کے ساتھ

برابرنہیں ہوتا،جس طرح روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ اگرکوئی امر اختیاری میں عدل وانصاف نہیں کرے گا تو گناہگار ہوگا، اور قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا، یعنی فالج زدہ ہوگا۔[ترمذی]

جولوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے اختیار سے عدل کرنے میں کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی، اورانہیں خیال ہوتا ہے، یا پختہ عزم کرلیتے ہیں کہ اس بیوی کو طلاق دینا ہے جس کے ساتھ برابری کا معاملہ ذرا مشکل ہے، یا شوہر اپنی ایک بیوی کو اس لئے طلاق دینا چاہتا ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہوگئی ہے، یا یہ وجہ ہو کہ یہ بانجھ ہے اولاد پیدا نہیں کرسکتی، یا ان وجوہات کے علاوہ کوئی اور وجہ ہو، اگر وہ عورت صورتِ حال کو سمجھ کراور طلاق سے بچ کر شوہر کے ساتھ یوں صلح کرلے کہ مجھے طلاق نہ دو، اور مجھے بدستور اپنے نکاح میں رکھو، اور راتیں تقسیم کرنے والا میرا حق فلاں بیوی کو دیدیا کریں، مجھے اعتراض نہ ہوگا، یعنی اپنا حق سوکن کو بخش دے، یا یہ صلح کرلے کہ میرے نان ونفقہ ودیگر اخراجات سے تم بری الذمہ ہو، اور یہ سب کچھ معاف کرتی ہوں، یا مقدار میں کمی کرتی ہوں، پس شوہر نے منظور کیا تو یہ صلح ومصالحت شرعاً جائز ہے، اور اس میں کوئی گناہ نہیں، اور یہ صلح اچھی چیز ہے۔

صلح کے بہتر ہونے کی حقیقت کاراز:

جب میاں بیوی نے اتنی بڑی زندگی ساتھ گزاری ہے، تو طلاق دے کر عورت اور اس کے خاندان کو رنج پہنچانا، یا ان کی توہین کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ اپنا حق چھوڑنے پر بھی راضی ہے، تو طلاق دینا بہت نامناسب ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں: ’’صلح کرنا جدا ہونے سے اور بُرے طریقہ پر زندگی گزارنے سے، یا روزانہ لڑتے جھگڑتے رہنے سے بہتر ہے‘‘۔ صلح کو قرآن کریم نے اسی مقصد کے لئے خیر فرمایا۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ﴾ لفظ ’’شح‘‘ کے بارے میں مفسرین حضرات لکھتے ہیں: هُوَ الْبُخلُ مَعَ الْحِرْصِ۔ یعنی شح اس بخل کو کہتے ہیں جس میں حرص بھی ہو۔ اور درحقیقت بات یہ ہے کہ بخل اور حرص آپس میں ایک دوسرے کو لازم ہوتے ہیں، کیونکہ جو شخص حریص ہوتا ہے کنجوس بھی ہوتا ہے، اور جو کنجوس ہوتا ہے حریص بھی ہوتا ہے، چونکہ ان دونوں بُری خصلتوں کا سبب حُبِّ دنیا ہے، اس لئے سورۂ تغابن اور سورۂ حشر میں فرمایا: ﴿وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [الحشر: ۹۔ التغابن: ۱۶] جو شخص شح نفس سے بچالیا گیا سو یہ لوگ

کامیاب ہیں۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے: شَرُّ مَافِي الرَّجُلِ شُحٌّ هَالِعٌ وَ جُبْنٌ خَالِعٌ۔ [أبو داؤد بحوالہ مشکوٰۃ] کہ انسان کے اندر سب سے زیادہ بُری چیز حرص اور بخل ہے، جو خوب زیادہ گھبراہٹ میں ڈالنے والا ہے، اور دوسری چیز بزدلی ہے، جو جان نکالنے والی ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جملہ: ﴿وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ میں یہ بتایا ہے کہ چونکہ نفوسِ انسانیہ میں ایک طرح کی حرص ہے، اور خرچ نہ کرنے کے جذبات بھی ہیں، اس لئے صلح میں آسانی ہوگی، جب شوہر یہ دیکھے گا کہ عورت پورا، یا آدھا اپنا مالی حق چھوڑ رہی ہے، یا یہ کہ دوسری عورت کو اپنی باری کا حق سپرد کر رہی ہے، تو اس طرح سے میری طبعی حرص میں بھی کچھ خلل نہیں آتا، اور عورت بھی مفت میں میرے نکاح میں رہ جاتی ہے، تو وہ نکاح میں رکھنے پر راضی ہو جائے گا، اور عورت کو جو حرص ہے کہ وہ پرانے شوہر ہی کے نکاح میں رہے، اس کی یہ حرص بھی پوری ہو جائے گی، اور اس طرح سے صلح آسان ہو جائے گی۔ اگر ان کے بچے ہیں تو کسی فریق کو بچوں سے جدا ہونا بھی نہ پڑے گا، اور مل جُل کر سب کی خوشگوار زندگی ان شاء اللہ تعالیٰ گزرے گی۔ پھر فرمایا:

﴿وَإِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا﴾ اگر تم صلاح وفلاح کے راستے پر چل کر احسان اور بھلائی کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کا یہی شعار ہے، اور پرہیزگاری اختیار کرو، تو اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی خبر ہے، وہ تمہیں نیکی اور تقویٰ کا بہت ہی اچھا بدلہ دے گا۔

صلح کے بعد ایک اہم بات کی طرف متوجہ فرما کر ارشاد فرمایا:

﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا أَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ﴾ تم سے ہرگز یہ نہ ہو سکے گا کہ سب بیویوں میں ہر طرح کی برابری کرو، کیونکہ قلبی رغبت ومحبت غیر اختیاری چیز ہے، اور عورتیں بھی حسن وصورت، تقویٰ وطاعت، حسنِ سیرت اور دیگر صفات میں برابر نہیں ہوتیں، تو لازماً فطری محبت اور غیر اختیاری کشش میں فرق ہوگا۔ پس اگر کسی بی بی کی طرف قلبی رغبت اور میلان زیادہ ہو، تو اس کی وجہ سے کسی دوسری بیوی کے حقوق میں کمی اور اتلاف نہ ہو، جس سے وہ دوسری بیوی مظلوم ہو جائے، اور شوہر ظالم ٹھہرے، یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے، اور لوگوں کی نگاہ میں بھی بُری بات ہے کہ شوہر نے نہ اسے آزاد کیا، اور نہ خبر گیری کی، وہ بیچاری پنکھے کی طرح لٹک رہی ہے، سرگرداں ہے، نہ بیواؤں میں شمار ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا میں اس کی نگرانی کریں، اور نہ شوہر والوں میں شمار ہے کہ شوہر اس پر شفقت اور محبت کا برتاؤ رکھے، وہ نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی رہی، یہ

بہت بڑی بے انصافی ہے۔ اچھے شریف لوگ اپنے گھر کے کتے اور بلی کو بھی اس طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اگر کسی سے ایسی غلطی سرزد ہو تو اس کا واحد علاج یہ ہے کہ زندگی میں اس معلقہ بیوی سے معافی مانگے، اور اس کے ساتھ احسان کرے، اور آئندہ محتاط رہے۔ اور اگر یہ بیوی مر گئی ہے، کسی معافی کا امکان نہیں تو اس کے عزیز اور رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کرے، اور اس کے لئے بہت دعاء کرے، اور صدقات سے بھی ایصال ثواب کرلے، تاکہ وہ راضی ہوجائے، اور قیامت کی شرمندگی ٹل جائے۔

پھر فرمایا کہ اگر میاں بیوی کا اختلاف تیز ہوا، اور زور پکڑا، اور مصالحت کے تمام امکانات بھی معدوم ہوگئے، یہاں تک کہ جدائی کی نوبت آگئی، فرمایا کہ کوئی بات نہیں، شرعی قوانین کے مطابق جدائی ہو، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو، وہ ذات پاک اپنے بندوں کی شکست وریخت سے باخبر بھی ہے، اور وسعت وفراخی والا بھی ہے، وہ فریقین کو ایک دوسرے سے مستغنی فرما کر ہر قسم کی فراخی عطا فرمائے گا۔

چنانچہ ایسا بارہا ہوتا رہا کہ اس مطلقہ عورت کو پہلے شوہر سے بہت اچھا شوہر ملا، اور شوہر کو مطلقہ بیوی سے ہر اعتبار سے اچھی پسندیدہ بیوی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ پس کوئی فریق یہ نہ سمجھے کہ میرے بغیر اس کا کام نہیں چلے گا، ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں، وہ سب کا بے نیاز ربّ ہے، اور ہر ایک کو دوسروں سے بے نیاز کرنے والا بھی ہے۔ اس کائنات کے نظام کو ذرا دیکھو، روزانہ ہزاروں جارہے ہیں، اور ان کی جگہ خانہ پری کی طرح ہزاروں آرہے ہیں، یہ نظام یوں ہی چلتا رہے گا بغیر کسی کمی کے۔

یورپ کے خیر خواہوں کو جواب:

بھینگے کو دیکھنے میں ایک چیز دو نظر آتی ہے، اور ماچس کی باریک تیلی شہتیر نظر آتی ہے، ایسے لوگ یورپی تعلیم یافتہ جنہیں اسلام کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں، کہنے لگے: دیکھو! اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ تم بیبیوں میں ہرگز برابری نہیں کر سکتے، اور نہیں کر سکو گے، تو مطلب یہ ہوا کہ بہت شادیاں نہ کرو، تعدد ازواج سے پرہیز کرو، اور ممنوع شمار کرو، کیونکہ جب برابری نہیں ہوسکتی تو لازماً تعدد ممنوع ہوگا۔ یہ وہ عقل کے فقیر لوگ ہیں جو کثرت وتعدد ازواج کو ممنوع قرار دیتے ہیں، اور آوارہ گردی اور زنا کو جائز۔ ان کو اصل جواب سورۂ نساء کے شروع میں: ﴿فَإِنۡ خِفۡتُمۡ أَلَّا تَعۡدِلُوا۟﴾ کے ضمن میں دے چکے ہیں، وہاں دیکھا جائے۔ یہاں یہ کہنا ہے کہ: ﴿وَلَن تَسۡتَطِیعُوۤا۟﴾ میں قلبی محبت ورغبت کی نفی ہے، جو غیر اختیاری چیز ہے، اور یہ بیبیوں کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ سارے خاندانی لوگوں کے

ساتھ غیر اختیاری محبت میں برابری نہیں ہوسکتی، تو آیت کریمہ میں جن امور میں اپنے اختیار سے برابری کرسکتے ہیں ان کے لئے ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا﴾ نہیں فرمایا، اور اسی قاعدہ اختیاری برابری کی بنیاد پر چار عورتوں سے شرعی نکاح کی اجازت موجود ہے، جس کا ذکر سورت کے شروع میں ہوگیا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، اور البتہ ہم نے ان لوگوں کو وصیت کی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی، اور تم کو بھی وصیت کی کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور اگر کفر کرو گے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، لائق حمد و ستائش ہے ﴿۱۳۱﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، اور کارساز ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے ﴿۱۳۲﴾ اے لوگو! اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تم سب کو ختم کردے، اور دوسروں کو لے آئے، اور اللہ تعالیٰ کو اس پر قدرت ہے ﴿۱۳۳﴾ جو شخص ارادہ کرے دنیا کے ثواب کا تو اللہ تعالیٰ کے پاس دنیا و آخرت (دونوں) کا ثواب ہے، اور اللہ تعالیٰ سننے والا، دیکھنے والا ہے ﴿۱۳۴﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ بڑا صاحب وسعت ہے، اور اپنی قدرتِ کاملہ سے ہر ایک کا کام چلاتا ہے، وہ اپنی حکمت کے ساتھ اگر کسی پر ایک دروازہ بند کرتا ہے تو دوسرا دروازہ کھول دیتا ہے، کیونکہ آسمان و زمین کی تمام مخلوقات پر اس کی حکمرانی ہے، اور وہ سب کا مالک ہے، اور تمام مخلوقات اس کی مملوک ہیں، تو اسے اپنی مخلوقات پر ہر قسم کے امر و نہی جاری کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔ یہاں اس مقام پر تین مرتبہ مکرر فرمایا:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ پہلی دفعہ میں ﴿وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا﴾ یعنی اس کی قدرت و کمالات کی وسعت اور جودوکرم کی فراخی ازحد زیادہ ہے، اس کے خزانوں میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ دوسری دفعہ اپنی بے نیازی اور بے پرواہی کا اظہار فرمایا، کہ وہ تمہارے عبادات وطاعات سے مستغنی ہے، اور تمہیں جو احکام نافذ کرتا ہے ان کے بجالانے میں سراسر تمہارا ہی فائدہ اور کامرانی ہے۔ سارے عالم کے ایمان وتقویٰ سے اسے نفع وفائدہ نہیں، اور سب کے کفر وجحود سے اسے کوئی نقصان نہیں۔

تیسری بار میں اپنی کارسازی کا اظہار فرمایا، کہ اگر تم ایمان وتقویٰ اور امتثالِ حکم کرو، تو اللہ تعالیٰ غیب کے خزانوں سے تمہاری کفالت فرمائے گا، اور تمہارا کارساز رہے گا، اس لئے کہ وہ آسمانوں اور زمین کی سب چیزوں کا مالک ہے۔ اور ایک ہی دلیل سے متعدد دعوؤں کو ثابت کرنا، اور ہر دعوے کے بعد اسی دلیل کو دوسرے رنگ میں لانا اہلِ علم واصحابِ ذوق کے نزدیک قندمکرر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، سب اس کی مخلوق ومملوک ہیں، اسے اپنی مخلوقات میں تکوینی طور پر ہر طرح کے تصرف کا اختیار اور حق حاصل ہے، اور تشریعی طور پر جو احکام جاری فرمائے کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں۔

فرمایا کہ احکامِ الٰہی کا نفاذ اور ان پر عمل کرنا، حقوق اللہ وحقوق العباد کے متعلق احکام یہ نہیں کہ محض تمہارے او پر لازم کر لئے گئے ہیں، بلکہ جن لوگوں کو تم سے پہلے آسمانی کتاب دی گئی ان کو اور تم (سب کو) اللہ تعالیٰ نے یہ وصیت فرمائی ہے، یعنی تاکیدی طور پر حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے ہی میں سارے دین پر عمل کرنے کا حکم آجاتا ہے۔ فرائض وواجبات کی پابندی اور گناہوں کا چھوڑنا، یہ سب تقویٰ ہے۔ فرمایا: اگر تم کفر اختیار کروگے تو اللہ تعالیٰ کا اس میں کچھ بھی ضرر ونقصان نہیں، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، اور وہ غنی وبے نیاز ہے، اسے کسی چیز کی حاجت نہیں، تم سب اسی کے محتاج ہو، اور وہ کسی کا محتاج نہیں، اور وہ حمید بھی ہے، ازل سے ابد تک، وہ اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے محمود ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی حمد وثناء بیان کرنے میں ہمہ وقت رطب اللسان ہے۔

ہر گیاہے کہ از زمین روید ☆ وحدہ لاشریک لہٗ گوید

(مثنوی سعدی)

تم لوگ یہ گمان نہ کرو کہ تسبیح وتہلیل اور حمد وثناء بیان کرنے والے صرف ہم ہی ہیں، اگر ہم خاموش رہیں گے تو سارا عالم سکوت وخاموشی میں ڈوب جائے گا، فرمایا نہیں، یہ تمہاری بھول ہے۔

﴿اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا﴾ یعنی اے انسانو! اگر اللہ چاہے تو تم کو ختم کر کے تمہاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کردے، اور اللہ اس پر قادر بھی ہے۔ تم شکر کرو، اور اس کا احسان مانو کہ تمہیں فرمانبرادی کا حکم ملا۔

منت منہ بسلطان کہ خدمت ہمی کنی ☆ منت ازو شناس کہ بخدمت گزاشتت

اگر وہ چاہے تو تم سب کو ختم کردے، اور تمہاری جگہ طاعات وعبادات بجالانے کے لئے ایک نئی مخلوق پیدا فرمادے، جو شب وروز اس کی فرمانبرداری میں منہمک ومشغول رہے، اس پر اس کو پوری پوری قدرت ہے، مگر باوجود اس کو قدرت ہونے کے تم لوگوں کو باقی رکھا ہوا ہے، پس تم اس کی اطاعت وفرمانبرادی کو غنیمت سمجھو، اور حسنِ کارکردگی کا ثبوت پیش کر کے اس کے قرب ورضا کو حاصل کرو۔ زہے سعادت!

سعید بن منصور، ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دست مبارک حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی پشت پر مار کر ارشاد فرمایا: یقیناً وہ لوگ اس کی قوم والے ہوں گے۔ اس حدیث کی روشنی میں اس آیت کا وہی مفہوم ہوگا جو اس آیت کا ہے: ﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ﴾ [محمد ﷺ:۳۸] (اور تم منہ موڑو گے تو وہ تمہاری جگہ دوسری قسم پیدا کردے گا، پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے)۔

بخاری ومسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۂ جمعہ نازل ہوئی، جب آیت: ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ [الجمعة:۳] (اور ان میں سے کچھ اور بھی ہیں، جو ابھی ان کے ساتھ آکر نہیں ملے) نازل ہوئی تو عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دست مبارک حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر رکھ کر فرمایا: اگر ایمان ثریا پر بھی ہوگا (یعنی زمین پر ایمان کا کہیں وجود نہیں رہے گا) تب بھی کچھ لوگ ان کی قوم میں سے ایمان کو حاصل کرلیں گے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیت: ﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ﴾ [محمد ﷺ:۳۸] (اور تم منہ موڑو گے تو وہ تمہاری

جگہ دوسری قسم پیدا کردے گا، پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے) تلاوت فرمائی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دست مبارک حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی ران پر مار کر فرمایا: اور اس کی قوم والے اگر دین ثریا پر بھی ہوگا تو فارس کے کچھ لوگ اس کو پالیں گے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے عجمیوں کا تذکرہ آیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں ان پر، یا یہ فرمایا: ان میں سے بعض پر تم سے، یا یہ فرمایا: تمہارے بعض لوگوں سے زیادہ اعتماد رکھتا ہوں۔ شیخ محمد بن یوسف صالحی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس حدیث میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے ساتھی مراد ہیں۔

شیخ صالحی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شیخ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول میں کوئی شبہ نہیں، کیونکہ اہلِ فارس میں سے کوئی بھی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے ساتھیوں کے علمی درجہ کو نہیں پہنچا۔ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جداعلیٰ تھے۔ مزید تفصیل "تبييض الصحيفة" میں دیکھیں۔

میں کہتا ہوں: شاید ان احادیث میں حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ جیسے دوسرے مشائخ ماوراء النہر کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بزرگ اگرچہ عجمی النسل نہ تھے، مگر وطنیت کے اعتبار سے عجمی تھے۔ یہ اکثر حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نسل سے تھے۔ انہوں نے آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مردہ سنتوں کو زندہ کیا، اور کبھی بدعت کو سیئہ ہو یا حسنہ پسند نہیں کیا۔ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب کہا:

سکہ کہ در یثرب وبطحا زدند ☆ نوبت آخر بہ بخارا زدند

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماوراالنہر کے محدثین حضرات اور فقہاء کرام کی طرف اشارہ ہو، جیسے امام ابو عبداللہ محمد اسماعیل بخاری، امام ترمذی وغیرہ۔ رحمهم الله۔ [مظهري]

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ جو شخص دنیا کے ثواب کا ارادہ کرتا ہے اسے دنیا کا طالب ہو کر آخرت کا ثواب نہیں کھونا چاہئے، وہ اللہ تعالیٰ سے آخرت کا ثواب مانگے، اور اس کی آرزو بھی رکھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے تنگ نظر لوگوں کو سمجھائیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس دونوں جہاں کا ثواب ہے، اشرف وافضل اور دائمی ثواب آخرت کا طالب بننا چاہئے، صرف دنیا کا ثواب یہ کافروں کا ورثہ ہے، مؤمن کیلئے یہ حکم ہے: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾۔ [البقرة:۲۰۱] (اے ہمارے

ربّ! ہمیں دنیا میں اچھائی دے، اور آخرت میں اچھائی دے، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے)۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جن کا مقصد آخرت ہی بن جائے اللہ تعالیٰ اُس کے منتشر امور کو جمع فرما دے گا، اور اس کے دل کو غنی کر دے گا، اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آئے گی۔ اور جس کی نیت وارادہ حصولِ دنیا ہو، اللہ تعالیٰ اس کے کاموں کو منتشر فرما دے گا، اور اس کی آنکھوں کے سامنے تنگی کر دے گا، اور دنیا اسے اتنی ہی ملے گی جتنی اس کے لئے لکھ دی گئی ہے۔ [الترغیب والترھیب] مطلب یہ ہے کہ وہ شخص بے حوصلہ اور پریشان حال رہے گا، کبھی آرام وسکون اسے نصیب نہ ہوگا، جیسا کہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کے غم و پریشانی میں لوگ مبتلا ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! انصاف پر قائم ہونے والے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے گواہی دینے والے بن کر رہو، اگرچہ تمہاری جانوں یا تمہارے ماں باپ یا تمہارے رشتہ داروں کے خلاف پڑ جائے، اگر غنی ہے یا فقیر ہے تو اللہ تعالیٰ کو دونوں کے ساتھ تم سے زیادہ تعلق ہے، سو تم انصاف کرنے میں خواہش نفس کا اتباع نہ کرو، اور اگر تم کج بیانی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں سے باخبر ہے ﴿۱۳۵﴾

معارف ومنازل

شانِ نزول:

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سدّی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں دو شخص باہمی نزاع لے کر حاضر ہوئے، ایک مالدار تھا، دوسرا نادار۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جھکاؤ، یعنی توجہ زیادہ تر نادار کی طرف رہی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال تھا کہ یہ نادار مالدار پر کیا ظلم کرے گا؟ اس پر آیت کا نزول ہوا۔

دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجنے کا مقصد عدل وانصاف کا قیام ہے:

سورۂ نساء کی اس آیت میں تمام عالمِ اسلام کو عدل وانصاف پر قائم رہنے، اور سچی گواہی دینے کی ہدایت کی گئی ہے، اور جو چیزیں قیامِ عدل یا سچی گواہی میں رکاوٹ ہوسکتی ہیں ان کو نہایت بلیغ انداز میں دور کیا گیا ہے۔ اسی مضمون کی ایک آیت سورۂ مائدہ میں بھی آنے والی ہے۔ دونوں آیتوں کا مضمون اور الفاظ تقریباً مشترک اور ایک ہیں۔ اور سورۂ حدید کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں خلیفۃ اللہ تعالیٰ بنا کر بھیجنے کا، اور پھر ان کے بعد دوسرے انبیاء علیہم السلام کو یکے بعد دیگرے بحیثیتِ خلیفۃ اللہ بھیجتے رہنے کا، اور ان کے ساتھ بہت سی کتابیں اور صحیفے نازل فرمانے کا اصلی اور اہم مقصد یہی تھا کہ دنیا میں عدل انصاف اور اس کے ذریعہ امن وامان قائم ہو، اور ہر قسم کی دادرسی ہو۔

ہر انسانی فرد اپنے دائرۂ اختیار میں انصاف کو اپنا شعار بنالے، اور جو سرکش لوگ وعظ و پند اور تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ عدل وانصاف پر نہ آئیں، اور اپنی سرکشی پر اڑے رہیں، ان کو قانونی سیاست اور تعزیر وسزا کے ذریعہ انصاف پر قائم رہنے کے لئے مجبور کیا جائے، تاکہ خاطر خواہ امن وامان قائم ہوسکے۔ سورۂ حدید کی پچیسویں آیت میں اس حقیقت کو اس طرح واضح فرمایا ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾[الحدید: ۲۵] یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسولوں کو نشانیاں دے کر، اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ قائم رہیں انصاف پر، اور ہم نے اتارا ہے لوہا، اس میں بڑا رعب ہے، اور لوگوں کے کام اس سے چلتے ہیں (یعنی فوائد ومنافع کثیرہ)۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعثت انبیاء علیہم السلام اور تنزیلِ کتب سماویہ کا سارا نظام انصاف ہی کے لئے قائم کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ قیومیت اور صفتِ عدل کا یہی تقاضا اور ثمرہ ہے۔

ہر انسان مکلف پر عدل وانصاف فرض اور لازم ہے:

سورۂ حدید کی آیتِ مذکورہ، اور سورۂ نسآء کی اس آیت میں، اسی طرح سورۂ مائدہ کی آیت: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾[المائدۃ: ۸] (اے ایمان والو! ایسے بن جاؤ کہ اللہ کے لئے

ہر وقت تیار ہو، انصاف کی گواہی دینے والے ہو، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ناانصافی کرو۔ انصاف سے کام لو، یہی طریقہ تقویٰ سے قریب تر ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ یقیناً تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے) سے واضح طور پر یہ ہدایت دی گئی ہے کہ انصاف قائم کرنا، اور انصاف پر رہنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ نہیں، بلکہ ہر انسان اس کا مکلف اور مخاطب ہے، کہ خود انصاف پر قائم رہے، اور دوسروں کو بھی انصاف پر قائم رکھنے کی کوشش کرے۔

البتہ انصاف کا ایک خاص درجہ حکومت اور حکام کے ساتھ مخصوص ہے، وہ یہ کہ شریر اور سرکش لوگ جب انصاف کے خلاف کام کریں، نہ خود انصاف پر قائم رہیں، نہ دوسروں کو عدل وانصاف کرنے دیں، اور پورے معاشرے کو بے انصافی کے گڑھے میں ڈالنے کی کوشش کریں، تو حکام پر لازم ہے کہ وہ حاکمانہ تعزیر اور سزا کے قوانین پر عمل کریں، اور بے انصافی کا بزورِ قوت خاتمہ اور بیخ کنی کریں، کیونکہ اقتدار کی طاقت انہی کے پاس ہے، اور یہ کام اقتدار والے ہی کر سکتے ہیں۔

آج کی دنیا میں جاہل عوام کو چھوڑیئے، پڑھے لکھے تعلیم یافتہ حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ انصاف کرنا، اور انصاف کو زندہ رکھنا صرف حکومت وعدالت کا فریضہ ہے، عوام پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اور یہی وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے ہر ملک، ہر سلطنت میں حکومت اور عوام کو دو متضاد فریق بنا دیا ہے۔

راعی اور رعیت، یعنی حاکم اور محکوم کے درمیان خلاف واختلاف کی وسیع خلیج حائل کر دی ہے، ہر ملک کے عوام اپنی حکومت سے عدل وانصاف کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن خود کسی انصاف پر قائم رہنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اسی کا نتیجہ ہے جو دنیا آنکھوں سے دیکھ رہی ہے، کہ قانون معطل ہے، نظام مفلوج ہے، جرائم کی روزافزوں ترقی ہو رہی ہے۔ آج ہر ملک میں قانون سازی کے لئے اسمبلیاں قائم ہیں، ان پر اربوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے، ان کے نمائندے منتخب کرنے کے لئے الیکشن پر خدا کی پوری زمین ہل جاتی اور حرکت کرتی ہے، اور پھر یہ پورے ملک کا دل ودماغ ملک کی ضروریات اور لوگوں کے جذبات اور احساسات کو سامنے رکھتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ قانون بناتے ہیں، اور پھر رائے عامہ کے لئے شائع کرتے ہیں، رائے عامہ معلوم کرنے کے بعد یہ قانون قابلِ تنفیذ سمجھا جاتا ہے، پھر اس کے نفاذ کے لئے حکومت کی لاتعداد مشینری حرکت میں آجاتی ہے، جس کے لاکھوں شعبے ہوتے ہیں، اور ہر شعبہ میں ملک کے بڑے بڑے مایۂ ناز آزمودہ کار لوگوں کی محنتیں بروئے کار آتی ہیں۔

لیکن چلی ہوئی رسوم کی دنیا سے ذرا نظر کو اونچا کر کے دیکھا جائے، اور جن لوگوں کو خواہ مخواہ تہذیب اور شائستگی کا ٹھیکہ دار تسلیم کیا گیا ہے، تھوڑی دیر کے لئے ان کی بے بصیرت اور کورانہ تقلید سے نکل کر حقیقت کا جائزہ لیا جائے تو ہر شخص بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ: ؎

نگاہ خلق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے ☆ مری نظروں میں پھیکا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

انصاف کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ قانون پر عملدر آمد کا فقدان ہے۔ قانون تو بکثرت بنتے رہتے ہیں، ہم گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے انگریزی قانون دیکھ رہے ہیں، کئی قسم کی پولیس بھی موجود ہے، کہیں سول پولیس ہے، کہیں ملٹری پولیس، کہیں سکورٹی پولیس ہے، اور کہیں خفیہ پولیس، مگر قانون خوابِ غفلت میں ایسا بے غم سویا پڑا ہے کہ بیداری کا نام تک اسے یاد نہیں۔

ع خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

ہر طرف رشوت، لوٹ مار، ڈاکہ، چوری، اغوا، اقرباء پروری کا دور دورہ ہے، خوفِ خدا کا تصور تک ذہنوں سے نکل چکا ہے۔ کوئی منصف مزاج مرد رشید نہیں کہ آنکھ کھول کر دیکھے، اور چلتی ہوئی گروہ بندی، اور بری رسموں کی جکڑ بندی کو توڑ کر ذرا سید الانبیاء محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے پیغامِ مبارک کو سوچے سمجھے، اور کوئی قدم اٹھائے، اور اس حقیقت پر غور کرے کہ دنیا کا امن وسکون صرف نرے تعزیرات سے نہ کبھی حاصل ہوا، نہ آئندہ ہوگا، نہ پولیس کی کثرت سے یہ مسئلہ حل ہوگا، نہ سپاہیوں کی بھرمار سے۔ عالم کے امن وامان اور خوشحالی کی ضمانت صرف خوفِ خدا اور عقیدۂ آخرت دے سکتا ہے، جس کے ذریعہ سارے فرائض راعی اور رعیت اور عوام اور حکومت میں مشترک ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص اپنی ذمہ داری کو احسن طریقہ پر محسوس کرنے لگتا ہے۔

چو پیرش جام مئے نوشد مریدش را چہ میخوانی ☆ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا

ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر، اور اس کے رسولوں پر، اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل فرمائی، اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل فرمائیں، اور جو شخص منکر ہو اللہ تعالیٰ کا، اور اس کے فرشتوں کا، اور اس کی کتابوں کا، اور اس کے رسولوں کا، اور آخرت کے دن کا، تو وہ گمراہ ہو کر دور کی گمراہی میں جا پڑا ﴿۱۳۶﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے، پھر کافر ہوئے، پھر ایمان لائے، پھر کافر ہوئے، پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے، تو اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بخشے گا، اور نہ ان کو راہ دکھادے گا ﴿۱۳۷﴾

معارف ومنازل

آیات کریمہ کے متعلق مفسرین کرام نے دو قول نقل کئے ہیں: ایک یہ کہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہے، کہ وہ اول ایمان لائے، پھر گوسالہ کی پرستش کر کے کافر ہوگئے، پھر توبہ کر کے مؤمن ہوئے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے کافر ہوئے، پھر اس انکار اور تکذیب میں مسلسل بڑھتے ہی چلے گئے، یہاں تک کہ جانتے ہوئے خاتم الانبیاء سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور رسالت کے منکر ہوگئے۔ [روح المعاني]

دوئم قول یہ ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے، کیونکہ آنے والی آیت میں صراحۃً ان کو نام لے کر دوزخی کہا جارہا ہے، کیونکہ آیت کا مفہوم ان پر بھی صادق ہے، کہ ان کے سامنے دنیا تھی، ظاہری مفادات کی خاطر ظاہراً ایمان قبول کر لیتے تھے، اور باطن میں کافر رہتے تھے، پھر ان میں بعض کو تو ایمان کی توفیق مل گئی، اور بعض کفر میں ہی بڑھتے چلے گئے۔ جب انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تو پیچھے پلٹ کر دیکھنے اور آخرت کا نفع نقصان سمجھنے کا موقعہ ہی ختم کر دیا۔ جو شخص کفر وشرک اور نفاق پر مرجائے اس کی بخشش کبھی نہیں ہوگی، اور جب کفر پر مر گیا تو اب جنت کی راہ دکھانے کا کوئی راستہ اور علاج ہی نہیں رہا، یہی معنی ہیں: ﴿وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا﴾ کے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ اے ایمان والو! اٰمِنُوْا تم اپنے ایمان پر استقامت کے ساتھ جمے رہو۔ یعنی قائم رہو، کسی تذبذب کا شکار نہ ہو۔ (جیسے آئندہ آیت میں منافقین کے تذبذب کا بیان ہے)۔

آیت کریمہ میں ایمانِ مفصل میں جن چند چیزوں پر ایمان لانے کا بیان ہے، انہی کو دوبارہ تاکید کے ساتھ ذکر فرمارہے ہیں۔ گویا کہ اصولِ ایمان کا تذکرہ اس لئے ہے کہ یہ اصول صرف مسلمانوں کے پاس ہیں۔ منافقین اور

یہودان گرانقدر اصولِ ایمانی سے محروم ہیں۔ اس لئے ارشاد ہے کہ جو ان اصول کا منکر ہوگا وہ کافر ہوگا۔ اور بہت بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑے گا۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۝۱۳۸ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝۱۳۹

ترجمہ: منافقین کو خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے ۝۱۳۸ جو مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا ان کے پاس عزّت تلاش کرتے ہیں؟ بلاشبہ ساری عزّت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے ۝۱۳۹

معارف ومنازل

منافقین جن کے پورے احوال اور طور وطریق اور ان کی اقسام کا مفصل تذکرہ سورۂ بقرہ کے شروع میں بیان ہوا۔ وہاں دیکھا جائے۔

منافقین نے جو نفاق اختیار کیا تھا، اس میں ان کا ایک مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ کافروں کی دوستی میں اپنے لئے عزّت کے خواہاں رہتے تھے، اور وہ یہی سمجھتے تھے کہ ہم بڑے کامیاب ہیں، کہ مسلمانوں اور کافروں دونوں فریق کو اپنے تعلق میں الجھا رکھا ہے۔ اس فریق سے بھی نفع حاصل کرتے ہیں، دوسرے فریق سے بھی، ان کی یہ دورخی اور چالاکی انہیں ایمان سے محروم رکھا۔ اخلاص کے ساتھ ظاہراً باطناً اسلام قبول کر کے سچے پکے مسلمان اس لئے نہیں بنتے تھے کہ انہیں یہ خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کا غلبہ نہ ہوا تو ہم اسلام قبول کر کے اس عزّت سے محروم ہو جائیں گے، جو کافروں سے دوستی کرنے میں حاصل ہے، اسی کو فرمایا:

﴿اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ کیا یہ لوگ کافروں کے پاس عزّت تلاش کرتے ہیں، عزّت تو ساری اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ خود عزیز ہے، وہ جس کو چاہے عزّت دے، اور جس کو چاہے ذلت دے۔ یہ کافروں کے ذرا سے مال وجائیداد اور جتھے کی جو عزّت نظر آ رہی ہے، اس کی کچھ حیثیت نہیں، اور اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جو عزّت دے گا یہ اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔

سورۂ منافقون میں فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

[المنافقون:۸] یعنی عزّت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے، اور مؤمنین کے لئے ہے، لیکن منافقین نہیں جانتے۔

چنانچہ مختصر وقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو وہ عظیم تاریخی عزّت عطا فرمائی جس کی مثال نہیں، اور یہود و نصاریٰ، کافروں اور منافقوں کو وہ عالمگیر ذلّت وخواری سے دوچار ہونا پڑا جس کی نظیر نہیں۔ کافر و مشرکین اور منافقین زیر ہوتے گئے، پستی اور شکست سے دوچار ہوتے گئے، مسلمان سرخرو، سربلند اور کامیاب ہوتے گئے، اور مسلسل فتوحات کرتے رہے۔ ایک مختصر وقت میں دنیا کی ہزاروں سالوں سے قائم عظیم سلطنتوں قیصر و کسریٰ کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر ان کے تختوں پر مسند آرا ہوئے، پورے جزیرۂ عرب، فارس و روم اور افریقہ و یمن پر اسلامی پرچم لہرا کر کفر و بت پرستی، کواکب پرستی اور مجوسیت وصابئیت کے گند اور نجاستوں سے کرۂ ارض کو پاک کیا۔

آیت کریمہ میں بہت بڑا پیغام اور سبق ہے، کہ اصل عزّت کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور مسلمانوں کو پیغام دیا جارہا ہے کہ اسلام کو سب سے بڑی عزّت سمجھیں، اور اللہ تعالیٰ سے عزّت مانگیں۔ کافروں سے یہود و نصاریٰ سے عزّت کی بھیک نہ مانگیں، اور ان کے نقش قدم پر چل کر اپنی اسلامی عزّت کو ضائع نہ ہونے دیں۔ آج اسی وجہ سے مسلمان پورے عالم میں پسماندہ اور بے عزّت ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عزّت اور خودداری کا سودا کر کے کافروں کے غلام بن گئے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب کہا: ؎

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت ☆ بہ ہر در کہ شد ہیچ عزّت نیافت

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عزّت چھوڑنے والا کبھی عزّت نہیں پائے گا، بلکہ ہر جگہ رسوا ہی ہوگا۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۝١٤٠ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ڮ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝١٤١

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے تم پر کتاب میں یہ حکم نازل فرمایا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا جارہاہے، اوران کا مذاق کیا جارہاہے، تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو، یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہوجائیں، بلاشبہ تم اس حالت میں ان جیسے ہوجاؤ گے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ منافقوں کو اور کافروں کو سب کو دوزخ میں جمع فرمادے گا۞ جو اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ تمہارے اوپر کوئی مصیبت آپڑے، سو اگر تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح یابی حاصل ہوجائے تو کہتے ہیں: تمہارے ساتھ نہ تھے، اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل جائے تو ان سے کہتے ہیں: کیا ہم تم پر غالب نہ آگئے تھے؟ اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے نہیں بچایا؟ سو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلے فرمائے گا، اور اللہ تعالیٰ ہرگز کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائے گا۞

معارف ومنازل

اس قبل سورۂ انعام میں (جوکہ مکی سورۃ ہے) ارشاد فرمایا تھا:﴿وَاِذَا رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِهٖ ؕ وَاِمَّا یُنۡسِیَنَّكَ الشَّیۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّكۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ﴾[الأنعام:٦٨] (اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کو برا بھلا کہنے میں لگے ہوئے ہیں تو ان سے اس وقت تک کے لئے الگ ہوجاؤ جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہوجائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تمہیں یہ بات بھلادے تو یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو)۔

یہاں سورۂ نساء میں اسی سورۂ انعام کے مضمون کو دوبارہ یاد دلایا، اور فرمایا کہ تمہیں پہلے یہ حکم دیا جاچکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کفر کیا جارہاہے، اوران کا مذاق اڑایا جارہاہے، تو اس عمل میں جو لوگ مشغول ہوں ان کے ساتھ نہ بیٹھو، اگر تم ایسے موقع پر وہاں سے نہ ہٹے، دور نہ ہوئے، تو تم بھی انہیں جیسے ہوجاؤ گے، (گناہ میں شریک ہوکر)۔

مکی زندگی میں کافر کھلم کھلا آیات قرآنیہ کا انکار کے ساتھ تکذیب اور مذمت کرتے تھے، اور طرح طرح کا مذاق اڑاتے تھے۔ اسی طرح مدنی زندگی میں منافق کافروں کے ساتھ مل کر یہی مشغلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ پس مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی کہ تم ایسے موقع پر ان کے ساتھ نہ بیٹھو، وہاں سے اٹھ کر چلے جاؤ، کیونکہ جو اعتقاد میں ان کے ساتھ شریک ہوجائے تو کفر لازم آئے گا، اور اگر اعتقاد میں شریک نہ ہو تو گناہ کی شرکت ہر حال لازم آئے گی۔ اور یہ

تمہارے لئے جائز نہیں ہے۔

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے آیتِ بالا سے اس پر استدلال کیا ہے کہ اہلِ بدعت اور فاسقوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا حرام اور ناجائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ایک روزہ دار شخص شراب پینے والوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی پٹائی کی، اور یہی آیت تلاوت کی۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ جس دسترخوان پر شراب نوشی ہو رہی ہو، اس پر کسی ایسے شخص کو نہ بیٹھنا چاہئے جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔ [ابن کثیر] پھر فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تمام منافقوں کو اور سارے کافروں کو قیامت کے دن جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔ جس طرح یہ لوگ دنیا میں کفر پر متفق اور اکٹھے رہے، اسی طرح جہنم میں بھی اکٹھے رہیں گے، جیسے حدیث شریف میں فرمایا: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ [بخاري] قیامت کے روز ہر شخص اپنے پسندیدہ دوستوں کے ساتھ ہوگا۔

غرض یہ ہے کہ منافق اور کافر اکٹھے جہنم میں رہیں گے، اور ہر قسم کے سخت ترین عذابوں میں برابر کے شریک رہیں گے، اور دونوں کا عذاب ابدی اور دائمی ہوگا۔ پھر فرمایا:

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللَّهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ کہ قیامت کے دن جب فیصلے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کافروں کو ایمان والوں پر غلبہ نہ دے گا۔ دنیا میں تو مسلمانوں کے ابتلاء کے لئے اور کافروں کے استدراج کے لئے کبھی کافروں کا غلبہ ہوجاتا ہے، جیسے غزوۂ احد میں ہوا۔ لیکن آخرت میں کامیابی کے لحاظ سے ہر حیثیت سے مسلمانوں ہی کا غلبہ ہوگا۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے اس آیت کا یہی مطلب مروی ہے۔

صاحب روح المعانی اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو دنیا میں مسلمانوں پر غلبۂ تام نہیں دے گا، جس سے سب مسلمان ایک ایک کر کے ختم ہوجائیں (جیسے آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ﴾ [النساء: ۱۱۵] کی تفسیر میں بیان ہوا)۔

اور یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ کافروں کو کبھی بھی مؤمنین کے مقابلہ میں کوئی ایسی حجت اور دلیل نہیں مل سکتی جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں سے جیت جائیں، دلائل کے اعتبار سے اہل ایمان ہی ہمیشہ غالب رہیں گے۔ [روح المعاني]

صاحب ہدایہ نے اس آیت کو اس امر کے استدلال میں پیش کیا ہے کہ کسی کافر کی ولایت کسی مسلمان پر نہیں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کافر اپنی مسلمان اولاد کا ولی نہیں ہوسکتا، کافر اپنی کافر اولاد کا نکاح کراسکتا ہے، اپنی مسلمان اولاد کی ولایت اسے حاصل نہیں ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا
كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ
ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ: بیشک منافق اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں (چالبازیاں کر کے) اور حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دھوکہ بازی کی سزا ان کو دینے والا ہے، اور جب وہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کرتے مگر تھوڑا سا﴿۱۴۲﴾ بیچ میں ہی معلق لٹکے ہوئے ڈگمگا رہے ہیں، نہ ان لوگوں کی طرف نہ اُن لوگوں کی طرف، اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کردے اس کے لئے تو ہرگز کوئی راستہ نہ پائے گا﴿۱۴۳﴾

معارف ومنازل

سورۂ بقرہ کے شروع میں بھی اس مخادعۃ پر تفصیلاً بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ یہ فرمارہے ہیں کہ یہ ناداں منافق اس ربّ ذوالجلال کے سامنے چالیں چلتے ہیں جو سینوں میں چھپی ہوئی باتوں، اور دل کے پوشیدہ رازوں سے آگاہ ہے۔ یہ لوگ کم فہمی سے یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ جس طرح ان کا نفاق دنیا میں چل گیا، اور مسلمانوں میں ملے جلے رہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے پاس بھی یہ مکاری چل جائے گی۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے کہ قیامت کے دن بھی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی یک رنگی کی قسمیں کھائیں گے، جیسے یہاں کھاتے ہیں۔ لیکن اس عالم الغیب کے سامنے یہ جھوٹی قسمیں ہرگز کارآمد نہیں ہوسکتیں۔ اللہ تعالیٰ بھی انہیں بطور استدراج دھوکے میں رکھ رہا ہے، وہ ڈھیل دیتا ہے، ترقی دیتا ہے، اور یہ پھولتے خوش ہوتے ہیں، اور اپنے لئے اسے اچھائی خیال کرتے ہیں۔ قیامت میں بھی ان کا یہی حال ہوگا، مسلمانوں کے نور کے سہارے میں ہوں گے، وہ آگے نکل جائیں گے، یہ آوازیں دیں گے کہ ٹھہرو، ہم بھی تمہاری روشنی میں چلیں۔ جواب ملے گا کہ پیچھے

مڑ جاؤ، اور روشنی تلاش کرلاؤ۔ یہ مڑیں گے، ادھر حجاب حائل ہوجائے گا، مسلمانوں کی طرف رحمت وخوشی، اور ان کی طرف عذاب وذلت کا نزول ہوگا۔ [سورۃ الحدید]

حدیث شریف میں ہے جو سنائے گا، یعنی کسی کے عیب بیان کرے گا، تو اللہ تعالیٰ بھی اسے سنائے گا، یعنی اس کے عیب ظاہر کردے گا، اور جو ریا کاری کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اسے دکھائے گا، یعنی اس کو سزا دے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے: ان منافقوں میں وہ بھی ہوں گے جو بظاہر لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ ان کی نسبت یہ فرمائے گا: انہیں جنت میں لے جاؤ، فرشتے لے جاکر انہیں دوزخ میں ڈال دیں گے۔ [ابن کثیر]

پھر ان منافقین کی بدذوقی کا بیان ہورہا ہے، کہ نماز جیسی بابرکت بہترین عبادت بھی شوق اور دلچسپی سے ادا کرنا انہیں نصیب نہیں ہوتا، کیونکہ نیک نیتی حسنِ عمل، ایمان اور سچا یقین ان میں ہے ہی نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تھکے ہارے ہوئے بدن سے کسمسا کر نماز پڑھنے کو مکروہ جانتے تھے، اور فرماتے تھے کہ نمازی کو چاہئے کہ ذوق وشوق سے راضی خوشی پوری رغبت اور انتہائی توجہ کے ساتھ نماز میں کھڑا ہو، اور یقین مانے کہ اس کی قراءت کی آواز پر اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں، اور اس کی طلب پوری کرنے کو اللہ تعالیٰ تیار ہے۔

یہ تو ہوئی ان منافقوں کی ظاہری حالت کہ تھکے ہارے تنگدلی کے ساتھ سمجھ بوجھ کر نماز کے لئے آتے ہیں، پھر اندرونی حالت یہ ہے کہ اخلاص سے کوسوں دور ہیں، اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، نمازی مشہور ہونے کے لئے لوگوں میں اپنے ایمان کو ظاہر کرنے کے لئے نمازیں پڑھ رہے ہیں، (یہ ایک سیاسی نماز ہے، جس کی بنیاد نہیں ہوتی)، بھلا ان صنم آشنا دل والوں کو نماز میں کیا ملے گا؟

یہی وجہ ہے کہ ان نمازوں میں جن میں لوگ ایک دوسرے کو کم دیکھ سکیں گے، یہ لوگ غیر حاضر رہتے ہیں، مثلاً عشاء کی نماز اور فجر کی نماز، جہاں تاریکی کی وجہ سے لوگ بہت کم دیکھتے ہیں۔ بخاری ومسلم میں ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ بوجھل نماز منافقوں پر فجر اور عشاء کی ہے۔ دراصل اگر یہ ان نمازوں کے فضائل کے دل سے قائل ہوتے تو اگر گھٹنوں کے بل چل کر آنا پڑتا تب بھی یہ ضرور آجاتے۔ فرمایا: میں تو ارادہ کررہا ہوں کہ تکبیر کہلوا کر کسی کو اپنی امامت کی جگہ کھڑا کر کے نماز شروع کرا کر کچھ لوگوں سے لکڑیاں اٹھوا کر ان لوگوں کے گھروں میں جاؤں جو جماعت کی نماز میں شامل نہیں ہوتے، اور لکڑیاں ان کے گھروں کے اردگرد لگا کر حکم دوں کہ آگ لگادو، اوران کے گھروں کو جلادو۔

ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قسم اگر انہیں ایک چرب ہڈی یا دو اچھے کھر ملنے کی امید ہو تو دوڑ کے چلے آئیں، لیکن آخرت کی اور اللہ تعالیٰ کے ثوابوں کی انہیں اتنی بھی قدر نہیں۔ اگر بال بچوں اور عورتوں کا جو گھروں میں رہتی ہیں مجھے خیال نہ ہوتا تو قطعاً میں ان کے گھر جلا دیتا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مسلمان کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بغیر نماز کے کوئی مسلمان ہو، وہاں نماز باجماعت کی اتنی پابندی تھی کہ جماعت سے پیچھے رہنے والا منافقوں میں شمار ہوتا تھا۔ آج لوگوں نے سرے سے نماز کی اہمیت اور ضرورت سے چھٹی لی ہوئی ہے۔ جماعت کی اہمیت اپنی جگہ پوری بستی یا محلے میں نمازی گنتی کے چند آدمی ہوتے ہیں، حالانکہ ترک صلوٰۃ اگر حقیقی کفر نہیں تو مفضي إلى الكفر اور کافرانہ خصلت ضرور ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی نماز کے ترک کی سزا ننانوے سال جہنم میں رہنے کی ہے۔

پس نماز میں سستی جس طرح زمانہ رسالت میں جرم عظیم اور علامتِ نفاق تھی، اسی طرح آج بھی یہی حکم ہے کہ تارکِ صلوٰۃ منافق اور بدترین نفاق کا شکار ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث میں فرمایا کہ نمازوں کو وقت پر ادا نہ کرنا بھی نفاق ہے، اور منافق کی نشانی یہ ہے کہ نمازوں کو تاخیر سے پڑھتا ہے، تو کیا ترکِ نماز اگر منافقت نہیں تو کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، اور ہمیں بے دینی اور بدعملی سے بچائے۔ آمین

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ
سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ
تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ
الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی صریح حجت قائم کرلو؟﴿۱۴۴﴾ بیشک منافق دوزخ کے سب سے نیچے طبقے میں ہوں گے، اور تو ہرگز ان کے لئے کوئی مددگار نہیں پائے گا﴿۱۴۵﴾ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کرلی، اور اصلاح کرلی، اور اللہ تعالیٰ پر مضبوط بھروسہ رکھا، اور اپنا دین اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کردیا، تو یہ لوگ مؤمنین کے ساتھ ہوں گے، اور عنقریب اللہ تعالیٰ مؤمنین کو اجر عظیم عطا فرمائے گا﴿۱۴۶﴾ اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا؟ اگر تم شکر گزار بنو، اور ایمان لاؤ، اور اللہ

تعالیٰ شانہ قدرداں ہے، جاننے والا ﴿۱۴۷﴾

معارف ومنازل

مسلمانوں کو قرآن حکیم بار بار تنبیہ اور خبردار کر رہا ہے کہ کفار سے خواہ یہود ونصاریٰ اہل کتاب ہوں، یا مشرکین ومنافقین وغیرہ ہوں، کبھی دوستی نہ کرو، ان کی دوستی تمہارے لئے دنیا وآخرت دونوں میں سخت نقصان دہ ہے، جب وہ کھل کر برملا تمہارے ساتھ دشمنی پر آمادہ اور تیار ہیں، اور تمہاری دوستی سے مستغنی اور لاپرواہ رہتے ہیں، اور کبھی تمہاری صلاح وفلاح اور کسی کامیابی پر خوش نہیں ہوتے، تو تمہیں کیا ضرورت کہ تم اپنے مسلمان بھائیوں کو جو کہ تمہارے ہمنوا اور خیر خواہ ہیں چھوڑ کر اپنے دین ومذہب کے دشمنوں سے دوستی اور رفاقت کرو؟ تمہارے ایمان کا اصلی اور حقیقی تقاضا تو یہ ہے کہ اپنے کافر ماں باپ بہن بھائیوں سے بھی لاتعلق رہو، اور دوستی نہ کرو، چہ جائیکہ عام کفار اور دشمنانِ اسلام کے ساتھ، تو ارشاد فرمایا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلْكَٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ ٱلْمُؤْمِنِينَ﴾ اے ایمان والو! مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ یہاں کافروں سے مراد عام کفار ہیں، پس اگر کوئی مسلمان اپنے بھائی مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ دوستی کرے گا تو وہ منافق ہوگا، اور قیامت کے دن کفار ہی میں شمار ہوگا، آنے والی آیت اس کی دلیل ہے:

﴿أَتُرِيدُونَ أَن تَجْعَلُوا۟ لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَٰنًا مُّبِينًا﴾ کیا کافروں کے ساتھ دوستی کر کے تم یہ چاہتے ہو کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری غلط دوستی کی وجہ سے صریح حجت قائم ہو؟ اور تم اللہ تعالیٰ کے عذاب کے مستحق بنو؟ لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو، اور مجرم بن کر عذاب کے مستحق نہ بنو، کیونکہ مَنْ أَحَبَّ قَوْمًا فَهُوَ مِنْهُمْ۔ جو کسی کی دوستی اختیار کرے وہ انہی میں شمار ہوگا۔ اس مسئلہ کی پوری مکمل تشریح سورۂ مائدہ آیت ۵۷ میں ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

﴿إِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ فِى ٱلدَّرْكِ ٱلْأَسْفَلِ مِنَ ٱلنَّارِ﴾ بیشک منافق دوزخ کے سب سے نیچے والے طبقے میں ہوں گے۔ پس ایسے جہنمی لوگ ہرگز دوستی ومحبت کے لائق نہیں ہوں گے۔ منافق کو بہ نسبت دوسرے کافروں کے سخت عذاب اس لئے ہوگا کہ اس نے کفر کے ساتھ مزید اس بات کو اختیار کیا کہ جھوٹ بولا، دھوکہ کیا، مکروفریب

اختیار کیا، اور اسلام و مسلمانوں کا زیادہ مذاق اڑایا، اور بلا وجہ مالِ غنیمت حاصل کرتا رہا، وغیرہ۔ [روح المعانی]

یہ ہم چند صفحات پہلے لکھ چکے ہیں کہ دوزخ کے سات طبقے ہیں: پہلے طبقے کا نام جهنم ہے، اور دوسرے کا لظی، اور تیسرے کا حطمة، اور چوتھے کا سعير، اور پانچویں کا سقر، اور چھٹے کا جحيم، اور ساتویں کا نام هاوية ہے۔ اور کبھی مجموعے پر النار اور جهنم کا اطلاق ہوتا ہے۔

جنت کے درجات کے برخلاف جہنم کے طبقات کو دَرک کہا جاتا ہے۔ دَرک اور دَرکات اس لئے کہ یہ متدارکة ایک دوسرے کے نیچے ہیں۔

درجة اور دَرک میں یہی فرق ہے کہ درجہ نیچے سے اوپر کو کہتے ہیں، تو سب سے اوپر اور اعلیٰ جنت الفردوس ہے، اور دَرکات میں اوپر سے نیچے، جو سب سے باعتبار عذاب کے سخت ترین الهاوية ہے۔ (أَعَاذَنَا اللهُ تَعَالَىٰ مِنْهَا)۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ توبہ کا دروازہ بند نہیں، وہ سب کے لئے اور تمام کفار کے لئے بھی کھلا ہے، فرمایا:

﴿إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا﴾ یہ لوگ مستثنیٰ رہیں گے جنہوں نے نفاق اور کفر سے توبہ کی، اور اپنی نیتوں اور اعمالِ قلبی کو درست کرلیا، فساد کو چھوڑ کر اصلاح پر آ گئے۔

﴿وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ پر مضبوط بھروسہ رکھا، اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑا۔ ﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾[آل عمران:۱۰۳] والے لوگوں کی طرح تمام کفریات سے کنارہ کشی اختیار کر کے قرآن حکیم کے پیروکار بن گئے۔

﴿وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ﴾ اور اپنے دین کو اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کرلیا، جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان چاروں صفاتِ عالیہ سے متصف ہیں۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں منافقین سے یہی مطالبہ ہوتا رہا، جیسے فرمایا: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾[البقرة:۱۳] (اور جب ان سے کہا جائے کہ ایمان لاؤ، جیسے اور لوگوں نے لایا ہے)۔ وہاں "اَلنَّاسُ" سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی مراد تھے، پس نتیجہ واضح ہے:

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ سو یہ لوگ اب کافر نہ رہے، اور پورا پورا اسلام کا گرویدہ بنے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہوں گے، اور جنت کے عظیم درجات کے مستحق بنیں گے۔ یہ ربّ العزّت سبحانہ کا کتنا کرم اور فضل ہوا

کہ جولوگ جہنم کے درکِ اسفل میں گرنے والے تھے، وہ ایمان واصلاح اور خالص اسلام قبول کرنے کے بعد وہاں کے درکات سے نکل کر جنت کے درجات میں پہنچے۔

حضرات مفسرین کرام نے فرمایا کہ یہ حکم قیامت تک کے منافقین اور کفار وزندیقوں کے لئے عام ہے، جو کوئی اپنے کفر سے تائب ہوکر خالص اسلام قبول کرے گا، تو﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کا حکم اسے حاصل رہے گا۔ اسی نکتۂ باریک کے پیشِ نظر اگلا فرمانِ الٰہی ہے:

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ﴾ دیکھیں! دنیا کے حکمران اور بادشاہ اپنے مجرم کی سزا دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، اور اس سے بدلہ لے کر راحت محسوس کرتے ہیں، اور جب تک انتقامی کارروائی مکمل نہیں کرتے رنجیدہ رہتے ہیں، بسا اوقات ان کو بیماری لگ جاتی ہے، مجرم کو سزا دینے کے بعد تندرست ہوجاتے ہیں، اور بسا اوقات سزا دینے پر فخر ونام آوری پاتے ہیں۔ لیکن ربّ العزّت عزّ مجدہٗ وجل شانہٗ ان تمام چیزوں سے پاک اور مستغنی ہے، تو یوں فرمایا:

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کو کسی کے سزا دینے سے کوئی نفع نہیں پہنچتا، اس کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے، جو تم لوگوں کو سزا دینے سے پورا ہوجائے، اگر تم خود اپنے اختیار اور سرکشی سے جہنم میں گرنے کی جسارت نہ کرو تو وہ کبھی کسی کو بلاوجہ عذاب نہیں دے گا۔

ہاں! اگر تم کفر اختیار کرو تو پھر اس کی حکمت وعدل کا تقاضا ضرور پورا ہوگا، اور اگر شکر گزار بندہ بنو، اور ایمان قبول کرو، تو سمجھو کہ وہ پاک ذات ایمان وشکر اور اعمالِ صالحہ کا قدرداں بھی ہے، اور جاننے والا بھی ہے۔

﴿اَلْجُزْءُ السَّادِسُ﴾

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝۱۴۸

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝۱۴۹

ترجمہ: اللہ تعالیٰ بُری بات کے ظاہر کرنے کو پسند نہیں فرماتا، سوائے اس شخص کے جس پر ظلم کیا گیا ہو، اور اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے ۝۱۴۸ اگر تم خیر کو ظاہر کرو، یا اس کو چھپاؤ، یا برائی کو معاف کرو، تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا، قدرت رکھنے والا ہے ۝۱۴۹

معارف ومنازل

بُری بات کی تشہیر واشاعت کرنا، اُسے پھیلانا، عام کرنا، ہر مجلس میں ہر کس وناکس سے کہتے ہوئے پھرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے (اس کے برے اثرات معاشرے پر اثر انداز ہو کر کئی خرابیوں کے پیش خیمہ ہوتے ہیں)۔

ہاں! اگر کسی پر کوئی ظلم ہوا ہو تو وہ اپنی مظلومیت ظاہر کرنے کے لئے ظالم کا ظلم اور زیادتی لوگوں کے سامنے بتائے، بیان کرے، تو یہ جائز ہوگا۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی مدد بھی ہو جائے گی، اور خود ظالم کو بھی اپنی زیادتی اور بدنامی کا احساس ہو جائے گا، جس کی وجہ سے آئندہ ظلم سے باز آجائے گا، اور لوگوں کو بھی اس کی حرکتوں کا علم ہو جائے گا، وہ اس سے دور رہنے کی کوشش کریں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا، اس نے عرض کیا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے تکلیف دیتا اور تنگ کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تو اپنے گھر کا سامان نکال کر راستے میں رکھ دے، چنانچہ اس شخص نے ایسا کیا، اب ہر جو شخص وہاں سے گزرتا تھا تو پوچھتا تھا کہ کیا بات ہے؟ (تم نے سامان یہاں کیوں رکھا ہے؟) وہ کہتا تھا: میرا پڑوسی مجھے تکلیف دیتا ہے، اس پر گزرنے والے اس کے پڑوسی پر لعنت بھیجتے تھے، اور اس کی رسوائی کے لئے بددعا کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پڑوسی شرمندہ ہو کر آیا، اور کہنے لگا کہ تم واپس اپنے گھر چلے جاؤ، اور سامان اندر رکھو، اللہ کی قسم میں تجھے آئندہ کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ [ابن کثیر]

سبحان اللہ! یہ کتنی بڑی پُر حکمت تدبیر تھی؟ اگر اس کی گہرائی میں غور کیا جائے تو اس سے بہتر کوئی تدبیر شاید نہ ہو۔ آج بھی اس کے فوائد نمایاں اور ظاہر ہیں، اگر کوئی اس پر عمل کرے۔

آیت کریمہ کے عموم میں یہ سب باتیں شامل ہیں، کہ کسی کی غیبت کی جائے، یا کسی پر بہتان باندھا جائے، کسی کے عیب اور گناہ کو لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے، یہ سب چیزیں حرام ہیں۔ اگر کسی کا کوئی عیب اور گناہ معلوم ہو جائے تو اس کی پردہ پوشی کرے، نہ یہ کہ اس کی تشہیر کرے، اور پھیلائے، کیونکہ جو لوگوں کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمائے گا، اور جو لوگوں کی پردہ پوشی نہیں کرتا تو اس کی پردہ پوشی بھی نہیں ہوگی۔

اور بہت سے لوگوں کو غیبت کرنے، بہتان باندھنے اور دوسروں کی پردہ دری کرنے، اور لوگوں کے گناہوں کو مشہور کرنے، اور ادھر ادھر لئے پھرنے کا شوق ہوتا ہے، ایسے لوگ اپنی بربادی کرتے ہیں، اور دنیا و آخرت دونوں میں اس کی سزا پاتے ہیں۔ گویا وہ اپنی ذات اور اپنی عزت و شرف برباد کر رہے ہوتے ہیں۔

اگر کسی شخص سے کوئی زیادتی ہو جائے، اول تو بہتر یہ ہے کہ اسے معاف کر دے، اور اگر معاف کرنے کی ہمت نہیں ہے تو بدلہ لے سکتا ہے، اور بدلہ بقدرِ مظلومیت لیا جا سکتا ہے۔ اگر بدلہ لینے والے نے زیادتی کر دی تو اب وہ بھی ظالم ہو جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آپس میں گالی گلوچ کرنے والے جو کچھ کہیں ان سب کا گناہ اس شخص پر ہے جس نے گالی گلوچ شروع کی تھی، جب تک کہ مظلوم زیادتی نہ کرے۔ [مسلم]

جب مظلوم نے زیادتی کر دی تو وہ بھی گنہگار ہوگا، اور ظالم شمار ہوگا، کیونکہ وہ تارکِ قرآن ہوگا، جو فرمایا: ﴿فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۹۴] (تم بھی ویسی ہی زیادتی اس پر کرو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہو)۔ اور اسی طرح: ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ [النحل: ۱۲۶] (اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی زیادتی تمہارے ساتھ کی گئی تھی)۔

اسی تجاوز سے اب وہ ظالم اور تارکِ شریعت کہلائے گا۔ پہلی آیت کے ختم پر فرمایا:

﴿وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا﴾ اللہ تعالیٰ ظالم و مظلوم دونوں کے حال، اور اچھی اور بری باتوں سے باخبر، جاننے والا، اور سننے والا ہے۔ دنیا ہو یا قیامت بہر حال ظالم اس کی گرفت میں رہے گا، اور مظلوم کی دادرسی ضرور ہو جائے گی۔ دوسری آیت میں فرمایا:

﴿اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا﴾ اگر تم خیر کو ظاہر کرو، یا اس کو چھپاؤ، یا برائی کو معاف کرو، تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا، قدرت رکھنے والا ہے۔ آیت کریمہ

میں عفوودرگزر پر ترغیب دیجارہی ہے، کہ جو بھی خیر کا کام کروگے ظاہراً ہو یا پوشیدہ (عبادت بدنی ہو یا مالی) یا کسی ظلم و زیادتی کو معاف کردو گے، تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے، قدرت والا ہے، وہ تمہارے اعمال کا بدلہ دینے پر قادر ہے، اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، جیسے ارشاد فرمایا: ﴿وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [النور: ۲۲] یعنی چاہئے کہ معاف کریں، اور درگزر کریں، کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے؟ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ جو شخص لوگوں کو معاف کردیتا ہے اللہ تعالیٰ شانہ کے یہاں اس کا بڑا مرتبہ ہے، اور یہ دنیا و آخرت میں اس کی عزّت و شرف بڑھنے کا سبب بن جاتا ہے۔

حضرت ابو کبشہ انماری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں ہیں جنہیں میں قسم کھا کر بیان کرتا ہوں، اور وہ تین یہ ہیں کہ: صدقہ کی وجہ سے کسی آدمی کا مال کم نہیں ہوگا، اور جس کسی بندہ پر کوئی ظلم کیا گیا جس پر اس نے صبر کرلیا تو اللہ تعالیٰ اس کی عزّت بڑھا دے گا، اور جس کسی نے مخلوق سے سوال کرنے کا دروازہ کھول دیا تو اللہ تعالیٰ اس پر فقر و تنگدستی کا دروازہ کھول دے گا (یعنی وہ ہمیشہ فقیر ہی رہے گا، جس قدر بھی مال جمع کرے گا اس کا فقر و فاقہ ختم نہیں ہوگا، اور مفلس ہی رہے گا)۔ [رواہ الترمذي وقال صحيح]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا کہ: اے ربّ! تیرے نزدیک بندوں میں سب سے بڑی عزّت والا کون ہے؟ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ: مَنْ اِذَا قَدَرَ غَفَرَ۔ یعنی جو شخص قدرت ہوتے ہوئے لوگوں کو معاف کردے، وہ شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزّت والا ہے۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنی زبان کو محفوظ رکھے اللہ تعالیٰ اس کی پوشیدہ چیزوں کی پردہ پوشی فرمائے گا، اور جو شخص اپنے غصہ کو روک لے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے اپنے عذاب کو روک لے گا، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عذر و معذرت پیش کرے اللہ تعالیٰ اس کی معذرت کو قبول فرمادے گا۔ [مشکوۃ]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا: یارسول اللہ! میں اپنے خادم کی غلطیوں کو کتنی مرتبہ معاف کیا کروں؟ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر دن ستر مرتبہ درگزر کیا کرو۔

[ترمذي، أبو داؤد، أبو يعلى]

مطلب یہ ہے کہ عفو ودرگزر ایک بہت عمدہ صفت ہے، اور عباد اللہ الصالحین کا طریقہ اور خصلت ہے، جب تک اس پر عمل ہوتا رہے گا فرشتے دعاء کرتے رہیں گے، اور ابلیس محروم رہے گا۔ خاص کر اپنے ماتحت لوگوں بیوی بچوں، خادموں، شاگردوں، مزدوروں، اور ضعیف لوگوں پر اس طرز عمل کو ربّ العزّت رحمت وشفقت کی نظر سے دیکھتا، اور پسند کرتا ہے، اور جنت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

حکایت:

حضرت اقدس سید المتقین امام حسن رضی اللہ عنہ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، ایک بدوی شخص نے وہاں حاضر ہوکر آپ رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیں، اور نہایت سست وناشائستہ کلمات استعمال کئے، لوگوں نے اسے مارنے کا اور سزا دینے کا ارادہ کیا، حضرت رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا، اور خندہ پیشانی کے ساتھ معاف فرمایا، اور خدمتگاروں کو حکم دیا کہ اس کو کپڑے اور مال دے کر عزّت کے ساتھ رخصت کریں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور وہ شخص چلا گیا۔ دوسرے دن پھر حاضر ہوکر معافی طلب کی، اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بڑی تعریف کی، اور کہنے لگا کہ گزشتہ روز میں نے آپ کو آزمایا، اور معلوم کرنا چاہا کہ نبوت کا کس قدر خون وحوصلہ آپ کے اندر موجود ہے؟ چنانچہ مجھے تسلی ہوئی (اور یہی میرا مقصد تھا)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝۱۵۰ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۱۵۱ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۵۲

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں، اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان راہ تجویز کرلیں ۱۵۰ یہ وہ لوگ ہیں جو یقیناً کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا ہے ۱۵۱ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر، اور اس کے رسولوں پر اور ان میں کسی کے درمیان میں فرق نہیں کرتے، یہ وہ لوگ ہیں کہ عنقریب اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اجور عطا فرمائے گا،

اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا، مہربان ہے ﴿۱۵۲﴾

معارف ومنازل

یہ آیات کریمہ آئندہ آنے والی آیات کے لئے تمہید بھی ہیں، اور اہل کتاب یہود ونصاریٰ کے خود ساختہ ایمان وایمانیات کی تردید بھی ہیں۔ اسی طرح ان کے کفر کی اقسام کا اجمالی بیان بھی، مثلاً وہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ماننے کے مدّعی بھی تھے، مگر اس کی ذات کو ایسی بہت سی صفات سے متصف کرتے تھے جن سے ربّ العزت سبحانہ کی ذات نہایت بلند وبالا ہے، جیسے: ﴿يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ [المائدۃ:٦٤] (اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے)۔ اسی طرح وہ کہتے تھے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ﴾ [آل عمران: ۱۸۱] (بیشک اللہ فقیر ہے، اور ہم مالدار ہیں)۔ یہ ہے تفریق بین اللہ وصفاتہ کی مثال جو کہ خالص کفر ہے۔

دوسرے نمبر پر وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے، اور اس کے رسولوں علیہم السلام (سب کے یا بعض کے) منکر تھے۔ یہ ہے تفریق بین اللہ ورسلہ جو کہ خالص کفر اور تکذیبِ حق ہے۔

تیسرے نمبر پر وہ بعض رسولوں علیہم السلام کو مانتے تھے، اور بعض کو نہیں مانتے تھے، جیسے یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اور نصاریٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانا، اور دونوں نے مل کر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی۔

چوتھے نمبر پر آسمانی کتب میں تفریق کی، یہود نے انجیل کی، اور نصاریٰ نے تورات کی، اور دونوں نے قرآن حکیم کی تکذیب کی، جو کہ خالص کفر اور حق کی تکذیب ہے۔

پانچویں نمبر پر اہلِ کتاب نے تورات وانجیل وزبور کے احکام میں تفریق کی، کہ اپنے مطلب کے چند احکام پر کاربند رہے، اور دیگر احکام کی تکذیب کی، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ [البقرۃ:۸۵] (کیا تم ایمان لاتے ہو بعض کتاب پر، اور انکار کرتے ہو بعض کا؟) کے ضمن میں بیان ہوا۔

یہ ساری تفریقات کفر اور کفر کی بدترین اقسام ہیں، جو کہ اہل کتاب کی خصوصیات اور ان کی علامات ہیں۔ مسلمان سارے انبیا کرام علیہم السلام، اور تمام آسمانی کتابوں پر بغیر تفریق ایمان لاتے ہیں، جبکہ مشرکین سب کا انکار کرتے ہیں۔ یہود ونصاریٰ نے بعض کا تو انکار کیا، اور بعض کو برحق سمجھا، یہ ایک درمیانی اختراعی طریقہ ہے، اسی کو قرآن حکیم نے: ﴿بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا﴾ (اس کے درمیان راستہ) سے تعبیر فرمایا، اور مذمت کی۔

ان کے برعکس اہلِ اسلام کی خصوصیات وعلامات کا تذکرہ ہے، جو کہ ان تمام منکرات اور تفریقات سے

پاک اور منزہ ہیں، جن کے لئے اجور اور بہت سے ثوابوں کا اعلان فرمارہے ہیں، جن کے عقائد واعمال میں کسی تفریق کا نام ونشان تک نہیں۔ وہ دینِ الٰہی کو مکمل بلا تفریق مانتے ہیں۔ صاحب روح المعانی نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آیت کریمہ میں یہود ونصاریٰ دونوں کا ذکر ہے، جنہوں نے تفریق کر کے اللہ تعالیٰ شانہ کے دینِ برحق کو چھوڑ بیٹھے، اور خواہشات پر کاربند رہے۔

درحقیقت ایمان جب ہی معتبر ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ قبول ہوتا ہے جبکہ تمام ایمانیات پر ایمان لایا جائے، جن کی تفصیل حدیث جبرئیل اور سورۂ بقرہ کے آخر میں گزر چکی ہے۔ ارشاد ہے: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾[البقرۃ: ۲۸۵] (یہ رسول اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ان کی طرف ان کے ربّ کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اور تمام مسلمان بھی، یہ سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں)۔

پس اگر کوئی شخص فرشتوں کا منکر ہو، یومِ آخرت کا منکر ہو، قرآن حکیم یا اس کی کسی آیت یا حکم کا منکر ہو، کسی شعائر اسلام کا منکر ہو، کسی بھی رسول کی رسالت، اور کسی نبی کی نبوت کا منکر ہو، یا خیر وشر کی تقدیر کا منکر ہو، تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر ہوگا، اگر چہ وہ اللہ تعالیٰ کو مانتا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں یہ سب چیزیں شامل ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کا اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ حکم فرمایا، اور یہ اہلِ اسلام کی امتیازی شان اور مخصوص صفت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں اور رسولوں اور کتابوں پر بغیر کسی تفریق کے ایمان لائے ہیں، اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی توقیر واحترام کرتے ہیں۔

جس طرح انہیں یہ گوارا نہیں کہ حضرت خاتم الانبیاء حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں کوئی نازیبا کلمہ کہا جائے، اسی طرح انہیں یہ بھی گوارا نہیں کہ سیدنا موسیٰ وسیدنا عیسیٰ علیہما السلام یا کسی دوسرے پیغمبر کے بارے میں کوئی نازیبا بات کہی جائے۔

نصاریٰ کے پاس موجودہ انجیلیں ہیں، ان میں جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام، یا ان سے پہلے کسی بھی نبی رسول کے بارے میں کوئی نازیبا بات آگئی ہے، اس پر مسلمانوں ہی نے انہیں متنبہ کیا، اور انہیں بتایا کہ یہ رسول اور نبی کی شان کے خلاف ہے، اور دنیا میں جب کبھی بھی کسی فرد یا جماعت کی طرف سے کوئی ایسی بات اٹھتی ہے جس سے کسی بھی نبی کی شان میں کوئی حرف آتا ہو، تو الحمد للہ مسلمان ہی خداوند تعالیٰ کے فوج دار بن کر اس کے مقابلہ کے لئے کھڑے

ہو جاتے ہیں۔

پھر کتاب وسنت کے پورے ذخیرے میں کوئی ایک کلمہ ایسا بھی نہیں ملے گا جس میں صراحۃً تو کیا اشارۃً بھی کسی پیغمبر کی شان میں بے احترامی کا کوئی عنصر پایا جاتا ہو۔ تو یہی چیز کتاب وسنت کی حقانیت کی علامت ہے۔ اگر کوئی موجودہ انجیل کا مطالعہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی صفات اور الوہیت اور رسالت ونبوت کے بارے میں اتنے دلخراش اور پریشان کن مضامین ملیں گے جنہیں مسلمان عقلاء تو کیا غیر مسلم مجنون و پاگل بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ انہوں نے الوہیت ورسالت کے مطالب وحقائق کو مسخ کر کے ایسے انداز میں لکھے ہیں جنہیں دیکھ اور سن کر عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِى السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾

ترجمہ: اہل کتاب آپ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے ایک کتاب اتار دیں، سو وہ موسیٰ سے اس سے بھی بڑی بات کا سوال کر چکے ہیں، انہوں نے یوں کہا کہ: تو ہمیں آمنے سامنے اللہ تعالیٰ کو دکھا دے، سو ان کو ان کے ظلم کی وجہ سے بجلی نے پکڑ لیا، پھر انہوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا، اس کے بعد کہ ان کے پاس دلائل آچکے تھے، پھر ہم نے اس کو معاف کر دیا، اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو صریح غلبہ دے دیا﴿۱۵۳﴾ اور ہم نے ان لوگوں پر طور کو اٹھا دیا، ان سے مضبوط عہد لینے کی وجہ سے، اور ہم نے ان سے کہا کہ دروازہ میں داخل ہو جاؤ جھکے ہوئے (بحالت سجدہ وانکساری)، اور ہم نے ان سے کہا کہ زیادتی نہ کرو سنیچر (ہفتہ) کے دن میں، اور ہم نے ان سے لے لیا تھا بہت مضبوط عہد﴿۱۵۴﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾[البقرة:۱۸۹](وہ آپ سے پوچھیں گے چاند کے بارے میں) کے تحت اس بارے میں تفصیل گزر چکی ہے، وہاں دیکھا جائے۔ یہاں يَسْـَٔلُكَ کا تعلق بھی انہی سوالات کے ساتھ ہے، جو پہلے بیان ہوئے۔

مطلب یہ ہے کہ یہودیوں کی شرارت ضد وعناد اور حسد وعداوت پر قرآن کریم نے مختلف مقامات پر جو روشنی ڈالی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کو ایمان تو نہ لانا تھا، لیکن ضد اور عناد کی وجہ سے طرح طرح کے بے جا سوالات کرتے تھے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بے مقصد سوالات سے تکلیف ہوتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف دور کرنے، اور تسلی کی خاطر آیتِ قرآنیہ کا نزول ہوتا رہتا تھا۔ یہ مقام بھی ان ہی میں سے ایک ہے کہ یہودیوں کے ایک وفد نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر یہ سوال کیا کہ آپ آسمان سے ایک کتاب اتار دیں، جس کو اترتی ہوئی دیکھ کر ہم ایمان لائیں گے، کیونکہ جب ہمارے سامنے اس کا نزول ہوگا، اور وہ ہمارے ہاتھوں میں آجائے گا، تو ہمیں اطمینان حاصل ہو جائے گا کہ واقعی آپ اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں، اور یہ کتاب آپ کی نبوت پر کھلم کھلا ایک ثبوت اور دلیل بن جائے گی۔

یہ صرف یہود نہیں، بلکہ مشرکین مکہ نے بھی اس قسم کا سوال اور مطالبہ پیش کیا تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے: ﴿وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ﴾[الإسراء:۹۳] یعنی ہم نہیں مانیں گے تیرے آسمان پر چڑھنے کو، یہاں تک کہ تو اتار دے ہمارے اوپر ایک کتاب، جسے ہم خود پڑھ لیں۔

کبھی کتاب کے اتارنے کا سوال، کبھی فرشتوں کے اترنے اور کلام کرنے کا سوال۔ درحقیقت نہ مشرکینِ مکہ کو ایمان لانا تھا۔ اور نہ یہودیوں کو، بلکہ خواہ مخواہ بہانے ڈھونڈتے تھے، اور اس قسم کے سوالات کی آڑ پکڑتے تھے۔ سورۂ انعام میں ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾[الأنعام:۷] یعنی اگر ہم اتار دیں آپ پر کتاب کاغذ میں، پھر وہ اسے چھو لیں اپنے ہاتھوں سے، تو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ ضرور یہ کہیں گے کہ یہ تو صرف کھلا ہوا جادو ہے۔

منکرین کا ہر وقت یہی طریقہ رہا کہ وہ معجزات کا مطالبہ کرتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ اگر یہ کام ہو جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے اتمامِ حجت کی خاطر بہت سے معجزات ظاہر فرمائے، جو ایک منصف

مزاج عقلمند طالبِ حق آدمی کے لئے کافی تھے۔

اور بعض معجزات ان کے کہنے اور مطالبے کے مطابق ظاہر ہوئے، جن میں معجزہ شَقُّ الْقَمَر بھی ہے، لیکن چونکہ ماننا ان کا مقصود نہ تھا، اس لئے معجزات کو جادو بتا کر پہلو تہی کرتے گئے۔ اس سلسلے میں سید الانبیاء ﷺ کو تکلیف پہنچتی تھی، اور آپ ﷺ فکرمند ہوتے تھے۔ آپ ﷺ کی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ آپ ان کی پرواہ نہ کریں، اور انہوں نے آپ سے جو سوال کیا ہے کہ آسمان سے کتاب اتار دو، یہ وہ لوگ ہیں کہ آپ سے پہلے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستا کر اس سے بھی بڑا سوال کر چکے ہیں، چنانچہ انہوں نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا ہمارے آمنے سامنے لاکر دکھا دو، جیسے سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾[البقرة:۵۵] یعنی جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم تمہاری بات ہرگز نہ مانیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو آمنے سامنے نہ دیکھ لیں۔

یہ دنیا اس قابل نہیں ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو سکے، اللہ تعالیٰ کا دیدار جنت ہی میں ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں دیدارِ الٰہی کا سوال تو کیا تھا، اور کہا تھا: ﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ﴾[الأعراف:۱۴۳] (اے میرے ربّ! مجھے دکھاؤ کہ آپ کو دکھ سکوں)۔ جواب ملا تھا: ﴿لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ﴾[الأعراف:۱۴۳] (ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے، مگر پہاڑ کی طرف دیکھ لو، اگر وہ اپنی جگہ برقرار رہا تو مجھے دیکھ سکو گے)۔

جب اللہ تعالیٰ شانہ کی پہاڑ پر تجلی ہوئی، تو پہاڑ سرمہ کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں تبدیل ہو کر فنا ہوا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔

دیکھیں! جب اولوالعزم پیغمبر حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کا یہ حال ہے، تو ایک عام امتی کو دیدارِ الٰہی کی کہاں تک تاب ہو سکتی ہے؟ یہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا سرور عالم ﷺ کے متعلق شب معراج کے موقع پر خیال اور تحقیق ہے۔ البتہ جمہور علماء سلف وخلف لیلۃ المعراج میں دیدارِ الٰہی شانہ کے حصول و وقوع کے قائل ہیں۔ تفصیل سورۂ اعراف میں دیکھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہودیوں کے وفد نے سرور عالم ﷺ سے مطالبہ کیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر لکھی ہوئی کتاب تورات بیک مرتبہ نازل ہوئی تھی، اسی طرح کی ایک کتاب آپ بھی آسمان سے لے آئیں، تو ہم ایمان

لے آئیں گے۔ اس پر آیت بالا کا نزول ہوا، کہ آپ ان کے بے جا، بے مقصد مطالبات سے دلگیر اور پریشان نہ ہوں (اس کی پوری تفصیل ان شاء اللہ اپنے مقام پر سورۂ فرقان میں آنے والی ہے)، کیونکہ ان کے آباء واجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی زیادہ بڑی بات کا مطالبہ کیا تھا، کہ آپ ہمیں آمنے سامنے مشاہدۃ اللہ تعالیٰ کو دکھادیں۔ ان کی اس گستاخی پر آسمان سے بجلی آئی، اور انہیں تباہ کیا۔

پھر توحید اور خدائے واحد لاشریک کے براہین اور بینات کو اچھی طرح سمجھنے اور جاننے کے بعد بھی خالقِ حقیقی معبود برحق لاشریک کے بجائے بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے تھے، لیکن اس سب کچھ ظلم شرک کے باوجود اللہ تعالیٰ نے عفو ودرگزر سے کام لے کر ان کی توبہ قبول فرمائی، ورنہ موقع تو اس کا تھا کہ عادوثمود وغیرہ کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹادیئے جاتے، اور ان کا قلع قمع کیا جاتا، اور اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا فرمایا۔

اس کے ساتھ ایک موقع ایسا آیا تھا کہ ان لوگوں نے تورات کی شریعت کو ماننے سے صاف انکار کردیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور (پہاڑ) اٹھا کر ان کے سروں کے اوپر معلّق فرمایا، اور حکم دیا تھا کہ شریعت موسوی کو ضرور مانو، ورنہ کچل دیئے جاؤ گے۔

اور ہم نے جہاد کے سلسلے میں ان سے کہا تھا کہ جب شہر ایلیاء کے دروازے میں داخل ہو تو نہایت عاجزی و انکساری سے سر جھکائے ہوئے تسبیح پڑھتے ہوئے داخل ہوجاؤ، اور یہ بھی انہیں حکم دیا تھا کہ یوم السبت ہفتہ کے دن کا احترام کرتے ہوئے مچھلیوں کا شکار نہ کرو، اور اسی طرح ان سے مضبوط عہد لے لیا تھا۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ اس نافرماں قوم نے ہمارے سارے حکموں اور فرمانوں سے بغاوت کی، اور ہٹ دھرمی پر اتر آئے، احکام کی خلاف ورزی کی، اور ہمارے عہد کو توڑ ڈالا، تو ہم نے دونوں جہانوں میں انہیں خوار وذلیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان تمام باتوں کی پوری تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، وہاں دیکھیں۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ
بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾

ترجمہ: سو ہم نے اس وجہ سے (ان پر لعنت کی) کہ انہوں نے عہد شکنی کی، اور اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کفر کیا، اور نبیوں کو ناحق قتل کیا، اور انہوں نے یوں کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، سو وہ ایمان نہ لائیں گے، مگر تھوڑے سے لوگ ﴿۱۵۵﴾ اور اس وجہ سے بھی ان پر لعنت کی کہ انہوں نے کفر اختیار کیا، اور انہوں نے مریم پر بہت بڑا بہتان لگایا ﴿۱۵۶﴾

معارف ومنازل

سورۂ بقرہ کے رکوع چہارم سے قوم یہود کی شرارتوں اور قباحتوں کا بیان شروع ہوا تھا، جو کہ چالیس سے زائد کفریات پر مشتمل رہا، موجودہ اور گزشتہ قریبی آیات میں انہی شرارتوں میں سے اجمالی طور پر چند ایک کی نشاندہی فرما رہے ہیں، اور ان کی ملعونیت ومغضوبیت کے اسباب واضح فرما رہے ہیں۔ مثلاً عہد شکنی، کفر وتکذیب، ایمانیات میں تفریق، آیات اللہ کا انکار، انبیاء علیہم السلام کا ناحق قتل، اور عفیفہ وپاکیزہ حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان وغیرہ۔

نیز ان کا استہزاء، اور یہ کہنا کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے قلوب ہدایت سے بھرے ہوئے ہیں، مزید کسی ہدایت کے لئے کوئی جگہ خالی نہیں ہے، جیسے بھرے برتن میں مزید کسی چیز ڈالنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے دین پر بہت مضبوط ہیں، ہم پر کسی نصیحت کی بات کا اثر کبھی نہیں ہوسکتا، جیسے مشرکین نے بھی یہی کہا تھا، ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ﴾ [حم سجدہ:۵] (اور کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو اس کے لئے ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں، ہمارے کان بہرے ہیں، اور ہمارے اور تمہارے درمیان ایک پردہ حائل ہے)۔

یہاں ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ﴾ اپنے معطوفات کے ساتھ مل کر فعلِ محذوف سے متعلق ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: تقدیر عبارت یوں ہے: فَفَعَلْنَا بِهِمْ مَا فَعَلْنَا بِنَقْضِهِمْ۔ یعنی ہم نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا، اور ان کو جو سزائیں دیں، وہ ان کے ان اعمال کی وجہ سے ہیں، جن میں عہد کا توڑنا بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کفر کرنا بھی، اور انبیاء علیہم السلام کا قتل کرنا بھی، اور یہ کہنا بھی ہے کہ ہمارے قلوب پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، اور حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان باندھنا، باوجودیکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خرق عادت ان کی گود میں ہی ان

کی عفت وطہارت اور براءت ظاہر کردی۔

جب بنی اسرائیل کے لوگوں نے اس پر تہمت لگائی، تو اس نے بچے کی طرف اشارہ کردیا، لوگوں نے کہا کہ ہم کس طرح ایک نوزائیدہ بچہ سے بات کریں؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ماں کی گود میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے کلام فرما کر اپنی ماں کی براءت کا اعلان فرمایا، اور کہا: ﴿اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ﴾ [مریم: ۳۰] (میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے کتاب دی ہے، اور مجھے نبی بنایا۔ اور مجھے برکت والا بنایا، جہاں بھی میں ہوں)۔

اسی طرح دوسرے مقام پر بھی قرآن حکیم نے اس کی پاکدامنی کا اعلان فرما کر ارشاد فرمایا: ﴿وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ [التحریم: ۱۲] (اور عمران کی بیٹی مریم، جنہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی)۔ مگر یہودی جس طرح اللہ تعالیٰ کے دوسرے حکموں سے منحرف ہوئے، اسی طرح اس خرق عادت معجزہ کے بھی منکر رہے۔ مزید تفصیل آئندہ آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

علامہ ابوحیان اندلسی اور دیگر مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس پوری عبارت قرآنی کے آخر میں کلمۂ "لَعَنّٰهُمْ" مقدر ہے، جیسے کہ دوسرے مقام پر مذکور ہے: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ﴾ [المائدۃ: ۱۳] (ان کے عہد توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت برسائی)۔ مطلب یہ ہے کہ ان باتوں کی وجہ سے ہم نے ان کو ملعون قرار دیا۔

اور سورۂ بقرہ میں یوں ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ [البقرۃ: ۸۸] (انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں، بلکہ ان پر اللہ نے لعنت برسائی، ان کے کفر کی وجہ سے)۔ یہاں فرمایا:

﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا﴾ بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی۔ اسی طرح ان کے دیگر ساتھیوں، یعنی کفار ومشرکین کے بارے میں فرمایا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ [البقرۃ: ۷] (اللہ نے مہر لگادی ان کے دلوں پر)۔ یعنی بات یہ نہیں ہے کہ مشرکین اور یہود کے قلوب پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر وسرکشی کی وجہ سے ان کے قلوب پر مہر لگادی ہے، جس کے سبب وہ روشنی اور دولتِ ایمان سے محروم ہوئے۔ اس طبع اور ختم علی القلوب کی تحقیق کے لئے سورۂ بقرہ کے شروع کا مطالعہ کیا جائے۔

وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ‌ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَ
لٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ‌ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ‌ ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا
اتِّبَاعَ الظَّنِّ‌ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا ۱۵۷ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ۱۵۸ وَاِنۡ
مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ‌ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا‌ ۱۵۹

ترجمہ: اور انہوں نے یوں کہا کہ ہم نے بلاشبہ مسیح بن مریم کو قتل کر دیا، جو اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، حالانکہ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا، اور نہ سولی پر چڑھایا، لیکن ان کو شبہ میں ڈال دیا گیا، اور بلاشبہ جن لوگوں نے ان کے بارے میں اختلاف کیا وہ ضرور ان کے بارے میں شک میں ہیں، اٹکل پر چلنے کے سوا ان کو ان کے بارے میں کوئی علم نہیں، اور یقیناً انہوں نے ان کو قتل نہیں کیا ۱۵۷ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا، اور اللہ تعالیٰ شانہ زبردست ہے، حکمت والا ہے ۱۵۸ اور اہلِ کتاب میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو ان پر مرنے سے پہلے ایمان نہ لائے، اور قیامت کے دن وہ ان کے خلاف گواہی دیں گے ۱۵۹

معارف ومنازل

فرمایا: ان سب بیان شدہ خباثتوں کی وجہ سے ہم نے اہلِ کتاب کو لعنت کا مستحق ٹھہرایا، اور ان کی اس بات کی وجہ سے بھی کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت مسیح عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کو قتل کر دیا، جو اللہ تعالیٰ کے رسول کہلاتے تھے۔ مفسر سید آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول تو نہ مانتے تھے، مگر پھر بھی ان کو رسول اللہ کہا، ان کا یہ کہنا بطور استہزاء و مذاق بنانے کے لئے تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اس کی جگہ کوئی اور لفظ کہا ہو، مگر اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ان کی شانِ رفیع ظاہر فرمانے کے لئے لفظ رَسُوۡلَ اللّٰهِ بڑھا کر ان کی صفت بیان فرمادی۔ [روح المعانی]

امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہود حضرت مسیح علیہ السلام کے دشمن تھے، کیونکہ وہ انہیں بے دینی، ہٹ دھرمی، تعصب اور تورات میں تحریف وغیرہ، اور ہر قسم کی برائیوں سے منع کرتے تھے۔ ان کے علماءِ سوء نے تورات کی شریعت کو بگاڑ دیا تھا، اور اخلاقی لحاظ سے نہایت پست ہو چکے تھے۔ جب مسیح علیہ السلام ان کے سامنے صحیح دین پیش فرماتے تو وہ برا مانتے تھے، اور یہ قاعدہ ہے کہ برے معاشرے میں جو کوئی امر

بالمعروف ونہی عن المنکر کا بیڑا اٹھا کر تبلیغ کرتا ہے تو وہ لوگوں کی نظر میں معتوب اور غیر پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر، یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ لوگ شریعتِ الٰہی کا مذاق اڑائیں؟ اور غیر شرعی زندگی میں محبوس ہوں؟ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس نافرمان قوم کے ہاتھوں سینکڑوں انبیاء علیہم السلام اسی دینی اور اصلاحی تبلیغ کی پاداش میں بے دردی سے شہید ہو چکے ہیں، اور انہی قریبی دنوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کے رفیقِ خاص اور خالہ زاد بھائی حضرت یحیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیلی قوم اور یہودی حکمران نے شہید کر دیا تھا، مگر عیسیٰ علیہ السلام کسی صورت ان کی دشمنی اور مخالفت کی وجہ سے تبلیغِ دین اور اصلاحِ خلق کے اہم فریضہ سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔

چنانچہ یہودیوں نے فیصلہ کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو زندہ نہیں چھوڑ دیں گے، اور انہیں بھی اسی طرح شہید کریں گے جس طرح بہت سے انبیاء کرام علیہم السلام کو شہید کیا تھا، حالانکہ وہ ان انبیاء کرام علیہم السلام کو نبی برحق بھی مانتے تھے، جبکہ حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت کے وہ منکر بھی تھے، اور انہیں اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا نبی نہیں مانتے تھے۔

مفسرین کرام نے اس بارے میں کئی باتیں لکھیں ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو ایک جگہ قید کیا تھا، آپ علیہ السلام نے ان کے لئے بددعا کی، اور وہ بندر اور خنزیر بنا دئے گئے، جب یہ بات یہودیوں کے سردار کو معلوم ہوئی جس کا نام یہودا تھا، اس نے یہودیوں کو جمع کیا، اور سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کیا جائے۔

جب قتل کرنے کے لئے چلے، تو ربّ العزّت سبحانہ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام اُترے، اور انہوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کو اٹھا کر آسمانوں پر پہنچایا، اس موقع پر یہودیوں کا ایک شخص اس مکان میں داخل ہوا جہاں حضرت مسیح علیہ السلام موجود تھے، جس کا نام طیطانوس تھا، وہاں حضرت مسیح علیہ السلام کو نہیں پایا، اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت کے مشابہ بنا دی، جب وہ باہر نکلا تو یہودیوں نے اسے پکڑ کر سولی پر لٹکایا، وہ ہر چند چیختا رہا کہ میں تمہارا آدمی طیطانوس ہوں، کسی نے بھروسہ نہیں کیا، پھر سولی دینے کے بعد اشتباہ میں پڑ گئے کہ اگر یہ مسیح ہیں تو ہمارا ساتھی کہاں گیا، اور اگر یہ ہمارا ساتھی ہے تو مسیح علیہ السلام کہاں گئے۔ اسی شش و پنج میں وہ آج تک بھٹک رہے ہیں۔

اور حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ستر حواری تھے، جو ایک

گھر میں جمع تھے۔ قتل کرنے والے جب آئے (بعض روایات میں ہے کہ وہ چار ہزار لوگ تھے) اور گھر میں داخل ہونے لگے، تو دیکھا کہ ہر شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت پر ہے، یہ دیکھ کر وہ کہنے لگے کہ تم نے ہم لوگوں پر جادو کر دیا، تم میں عیسیٰ کون ہے؟ وہ سامنے آجائے، ورنہ ہم تم سب کو قتل کر دیں گے، یہ سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں ایسا کون شخص ہے جو آج اپنی جان کو جنت کے بدلے میں فروخت کر دے؟ ان میں سے ایک شخص نے کہا: میں حاضر ہوں، لہٰذا وہ شخص باہر نکلا، اور اس نے حاضرین سے کہا کہ میں عیسیٰ ہوں، لہٰذا انہوں نے اسے قتل کر دیا، اور سولی چڑھا دیا، اور اللہ تعالیٰ سبحانہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اوپر اٹھالیا۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہما وغیرہما کا بھی یہی قول ہے۔

ایک قول یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں میں ایک شخص منافق تھا، جب یہودیوں نے انہیں قتل کرنے کا ارادہ کیا، تو اس منافق نے کہا کہ تمہیں میں بتا دیتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں، اور یہ شخص تین درہم یہودیوں سے اجرت لے کر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گھر میں داخل ہوا، تو آپ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے جا چکے تھے، منافق کی صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جیسی صورت بنا دی گئی، لہٰذا ان لوگوں نے اندر داخل ہو کر اسی کو پکڑ کر قتل کر دیا، اور سولی پر چڑھالیا، اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا، ان کے علاوہ اور بھی اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ [روح المعاني]

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک گھر میں بند کر دیا تھا، اور ان پر ایک نگراں مقرر کیا تھا، جب وہ قتل کرنے کے لئے آئے، تو اللہ تعالیٰ نے اس نگران کی صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت بنا دی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اوپر اٹھالیا، اور لوگوں نے اس نگراں کو عیسیٰ علیہ السلام سمجھ کر قتل کر دیا۔ [معالم التنزیل] اس کے علاوہ دوسرے بعض اقوال بھی مؤرخین اور مفسرین نے نقل کئے ہیں، مگر خلاصہ ومطلب سب کا ایک ہی ہے، چونکہ قرآن حکیم نے نہایت عمدہ اختصار کے ساتھ صورت حال بیان فرمائی، اور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث کے ذریعہ کوئی وضاحت سامنے نہیں آئی، اس لئے واقعات بکثرت مذکور ہوئے، جن میں سے چند ہم نے لکھ دیئے۔ واللہ اعلم

بہر حال! اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت وحفاظت کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اوپر اٹھالیا، اور کافروں کے ارادوں اور شرارتوں سے انہیں بچالیا۔ پس جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا فیصلہ کیا تھا وہ ناکام ہو گئے،

اور طرح طرح کے شکوک واشتباہ میں پڑ گئے۔ ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭوَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ [آل عمران: ۵۴] (اور انہوں نے تدبیر کی، اور اللہ نے بھی تدبیر کی، اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والوں میں سے ہے)۔

فرمایا: ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ کہ ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ قتل کیا، اور نہ سولی پر چڑھایا، لیکن ان کو اشتباہ ہوگیا، اور وہ آج تک اس اشتباہ میں سرگرداں ہیں۔

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ﴾ کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے معاملہ میں اختلاف کیا وہ اس کے قتل کے متعلق تردد میں ہیں، اور وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان کا اختلاف یہ تھا کہ یہودی قتل کے مدّعی تھے کہ ہم نے قتل کیا، اور نصاریٰ کا ایک گروہ کہتا تھا کہ ہم نے قتل کیا (یہ کفارہ والے لوگ ہیں) اور نصاریٰ کا ایک گروہ کہتا ہے کہ نہ یہودیوں نے قتل کیا، اور نہ نصاریٰ نے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اوپر اٹھالیا، اور ہماری نظروں سے غائب کردیا۔

اور شک کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طیطانوس کی شکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل کی طرح کردی، باقی جسمانی حالت اس کی اپنی تھی، صورت دیکھنے والوں نے کہا یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، جو قتل ہوگئے۔ جسم اور بدن دیکھ کر کہنے لگے: یہ کوئی اور ہے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسم نہیں ہے۔ اور دیگر لوگوں نے کہا کہ اگر یہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں تو ہمارا آدمی کہاں گیا، اور اگر یہ ہمارا آدمی ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کہاں گئے۔ یہ حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ [مظھري وغيره]

پھر فرمایا: ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ﴾ (اور یہ یقینی واقعی سچی بات ہے کہ انہوں نے ان کو قتل نہیں کیا، بلکہ ربّ تعالیٰ شانہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ مقتول ہوئے، نہ انہیں ابھی تک طبعی موت آئی ہے۔ معراج کی رات انہوں نے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوسرے آسمان میں ملاقات کی، پھر وہ قیامت کے قریب آسمانوں سے زمین پر نزول فرمائیں گے، اور دجال کو قتل کریں گے، اور زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ اور یہ بات اجماع امت اور تواتر سے ثابت ہے، جو کوئی انکار کرے گا وہ کافر ہوکر دائرۂ اسلام سے خارج ہوجائے گا۔

یہی سارے مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ اور عقیدہ ہے، چاہئے کہ مسلمان خاص کر علماء کرام سید المحققین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی بے نظیر کتاب "التصريح بما تواتر في نزول المسيح" کا مطالعہ کریں۔

اور جو لوگ (قادیانی، پرویزی، چکڑالوی وغیرہ) قرآن وحدیث کو مانتے نہیں، تو وہ اس کے خلاف باتیں کر کے اپنا ایمان کھو چکے ہیں۔ اور سورۂ آل عمران کی آیت: ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ [آل عمران: ۵۵] (جب اللہ نے کہا تھا کہ: اے عیسیٰ! میں تمہیں صحیح سالم واپس لے لوں گا، اور تمہیں اپنی طرف اٹھالوں گا) کو دوبارہ مطالعہ کیا جائے۔

فرمایا: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ اللہ تعالیٰ غلبہ والا، حکمت والا ہے۔ اگر وہ کسی کی صورت دوسرے کی طرح بنادے وہ اس پر قادر ہے، کیوں نہیں، وہی تو ہے "المصور" صورتوں اور شکلوں کا اپنی مرضی سے بنانے والا، اور وہی ہے حکمت والا۔ حکمتوں کے ساتھ سارے جہاں کی تخلیق کرنے والا، وہ جسے چاہے زمین پر رکھے، جسے چاہے آسمان پر اٹھائے، اس کا ہر حکم اور ہر فیصلہ حکمتوں پر مبنی ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ (اہل کتاب میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں جوان پر اپنے مرنے سے پہلے ایمان نہ لائے، اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوں گے)۔ یہ ترجمہ، یعنی: "اپنے مرنے سے پہلے"۔ اس صورت میں ہے جبکہ "مَوْتِهٖ" کی ضمیر اہل کتاب کی طرف راجع ہو۔

حضرات مفسرین نے یہ احتمال بھی بتایا ہے کہ "مَوْتِهٖ" کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع کی جائے۔ پہلی صورت اختیار کی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہودی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ورسالت کے منکر ہی ہیں، اور نصرانی اپنے خیال میں ان کو مانتے تو ہیں، لیکن ان کے بارے میں غلط عقیدہ رکھتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے ہیں جو کہ سراسر کفر اور تکذیب ہے۔ اسی وجہ سے یہود اور نصاریٰ دونوں کافر ہیں، تو ان میں سے جو شخص مرنے لگتا ہے جان نکلنے سے پہلے جب اسے برزخ کے احوال نظر آنے لگتے ہیں، تو یہ ایمان لے آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے، اور اس کے رسول ہیں۔

لیکن یہ ایمان اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر نہیں ہے، کیونکہ یہ ایمان اضطراری بھی ہے، اور ایمان بالغیب کا حصہ بھی نہیں ہے، لہٰذا ایسے لوگوں کا خاتمہ کفر پر ہی ہوگا، نہ کہ ایمان پر۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے "مَوْتِهٖ" کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں دونوں قول لکھے ہیں، پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ، مجاہد، ضحاک رحمہم اللہ کا یہی قول بتایا کہ "مَوْتِهٖ" کی ضمیر اہل کتاب کی طرف راجع ہے، اور یہی پہلا معنی ہی مراد ہے۔

دوم احتمال کہ اگر ''مَوْتِہٖ'' کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہو تو آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ: کوئی بھی اہل کتاب ایسا نہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، قریب ہے کہ تمہارے اندر ابن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے، جو فیصلے کرنے والے ہوں گے، انصاف کرنے والے ہوں گے، وہ صلیب کو توڑ دیں گے، جسے نصرانی پوجتے ہیں (اور یہ توڑنا نصرانی دین سے بیزاری ظاہر کرنے، اور اس کے بطلان کا اعلان ہوگا)، اور خنزیر کو قتل کریں گے (یہ بھی نصرانیت سے بیزاری کی علامت ہوگی)، اور جزیہ ختم کریں گے، (یعنی کافروں سے جزیہ قبول نہیں کریں گے، اور اسلام کے سوا کوئی اور بات، یعنی دین قبول نہ کریں گے)، اور مال کو بہادیں گے، اور اس قدر بخشش کریں گے کہ کوئی شخص قبول کرنے والا بھی نہ ہوگا، اس وقت ایک سجدہ ساری دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ان سب سے بہتر ہوگا۔ یہ بیان کر کے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم چاہو تو ﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ پڑھ لو۔ [بخاري]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد نبوی بیان کرنے کے بعد (جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ دنیا میں تشریف آوری کا ذکر ہے) مذکورہ آیت پڑھنے کے لئے جو فرمایا، اس سے ان کا مقصد یہی ہے کہ اس زمانہ کے جو اہلِ کتاب یہودی اور نصرانی ہوں گے، سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے۔

معالم التنزیل میں اس کی تصریح ہے کہ: ''قَبْلَ مَوْتِہٖ'' تک پڑھ کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ''قَبْلَ مَوْتِ عِيسَى ابْنِ مَرْيَم'' کہا، اور اسے تین مرتبہ دہرایا۔ اس طرح سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ''مَوْتِہٖ'' کی ضمیر کا مرجع واضح طور پر بیان فرما دیا۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ ''مَوْتِہٖ'' کی ضمیر کے بارے میں یہ دوسرا قول بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور حسن بصری اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما سے بھی منقول ہے۔

تو واضح طور پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا، اس وقت جتنے بھی اہل کتاب موجود ہوں گے سب ان کی طبعی موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئیں گے، اور اس وقت سارے ادیان ختم ہو جائیں گے، صرف ایک دینِ اسلام باقی رہے گا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال یا ساٹھ سال دنیا میں رہیں گے، پھر وفات پائیں گے، اور روضۂ اقدس کے اندر ان کے لئے جو جگہ ابھی سے خالی ہے، وہاں دفن ہو جائیں گے، جس کے بعد قیامت کے آثار نمودار ہو جائیں گے، طلوعِ شمس مغرب سے ہوگا، توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا،

قرآن کریم صدور وقلوب اور اوراق سے رخصت ہو جائے گا، وغیرہ۔

بہر حال! علماء تفسیر نے ''مَوْتِہٖ'' کی ضمیر کے متعلق دو قول پیش کئے، وہ دونوں صحیح ہیں، ہر ایک کے متعلق انہوں نے توجیہات بھی پیش کیں، کسی نے پہلے احتمال کو راجح بتایا، کسی نے دوسرے احتمال کو۔ صاحب مظہری نے عمدہ توجیہ کر کے اول احتمال کو راجح فرمایا، اور دوسرے احتمال کو رد فرمایا، فلیُراجع۔ واللہ اعلم

﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا﴾ اور قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اہل کتاب پر گواہ ہوں گے، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ [النساء: ۴۱] (پھر اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لے کر آئیں گے، اور ہم تم کو ان لوگوں کے خلاف گواہ کے طور پر پیش کریں؟)۔ قیامت کے روز ہر نبی اپنی امت کے حق میں بھی اور مخالفت میں بھی گواہی دیں گے، یعنی ماننے والوں کے حق میں، اور نہ ماننے والوں کے خلاف گواہی دیں گے۔

❁ ❁ ❁

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّ
هِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾

ترجمہ: سو جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ہم نے ان کے ظلم کی وجہ سے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو ان کے لئے حلال کر دی گئی تھیں، اور اس وجہ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے میں زیادہ مشغول رہے ہیں ﴿۱۶۰﴾ اور اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقے پر کھاتے رہے، اور ہم نے کافروں کے لئے دردناک عذاب تیار کیا ہے ﴿۱۶۱﴾

معارف ومنازل

حرام خوری سے پاکیزہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں:

ان آیات میں پاکیزہ اور حلال چیزوں کی حرمت، اور ان سے محروم ہونے کے اسباب کا بیان ہو رہا ہے۔

اس دارالاسباب دنیا میں خوشی اور غمی، حِلّت وحرمت ہر ایک کے اسباب ہیں، کوئی جو بھی سبب اختیار کرے گا

اسی کا ثمرہ اور پھل اسے حاصل ہو جائے گا، تو ارشاد فرمایا کہ یہودیوں پر وہ پاکیزہ اور حلال چیزیں حرام کر دی گئیں جو ان کے لئے پہلے حلال تھیں، اور یہ اس وجہ سے حرام کر دی گئیں کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کیا، جن میں عہد شکنی، انبیاء علیہم السلام کا قتل، کتمانِ حق، سود خوری، وغیرہ شامل ہیں۔

نیز وہ کثرت کے ساتھ یہ کام بھی کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے لوگوں کو روکا، اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو جھٹلایا، اور انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں، انہیں بے دردی سے شہید کیا۔ اور اس وجہ سے بھی پاکیز چیزیں ان پر حرام کر دی گئیں کہ وہ سود لیتے رہے، اور رشوت کے دلدادہ بنے، حالانکہ ان کی شریعت میں یہ سارے حرام تھے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کے اموال باطل طریقے سے ہڑپ کر کھاتے رہے، اور ان کے علماء اور حکام نے حرام خوری اور رشوت کو اپنا شعار اور بنیادی حق بنایا۔

سورۂ انعام میں بعض ان چیزوں کا ذکر آنے والا ہے، جو کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے ان پر حرام کر دی گئیں۔ آخر میں ارشاد ہے:

﴿ذٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ﴾ کہ ہم نے ان کو یہ بدلہ دیا ان کی بغاوت کی وجہ سے۔ حق تعالیٰ جس طرح بندوں کی فرمانبرداری اور شکر گزاری پر انعامات میں اضافہ فرماتے ہیں، اسی طرح معاصی اور ناشکری پر رزق و روزی روک دیتا ہے، اور بطور سزا حلال چیزوں کو مجرموں پر حرام فرماتے ہیں۔

سودی کاروبار سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے:

سودی کاروبار، سود کھانا یہودیوں کی بہت پرانی عادت ہے، تورات نے اس سودی کاروبار سے انہیں سختی کے ساتھ منع کیا تھا، مگر وہ کہاں تورات کی تعلیمات پر عمل کرتے؟ انہوں نے تورات کے سارے اچھے اور پاکیزہ حکموں کے ساتھ بغاوت کر کے علی الاعلان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا مذاق اڑانا شروع کیا تھا۔ وہ مال کی محبت اور دنیا کی کثرت پر اتنے دلدادہ رہتے تھے کہ ساری شریعت کو اپنی خواہشات پر قربان کرنے سے نہیں شرماتے۔

آج بھی دنیا میں راتوں رات سیٹھ بننے اور کروڑ پتی بننے کا جو طریقہ رائج ہے ان میں سب سے بڑا کامیاب اور آسان طریقہ سود خوری ہی کا ہے۔ سود خور حاجتمندوں کو قرض دیتا ہے، اصل مال پر بھی سود لیتا ہے، اور سود پر بھی سود لگاتا ہے، حتیٰ کہ اصل سرمایہ کم رہ جاتا ہے، اور سود کا مال زیادہ ہو جاتا ہے۔ پھر مقروض بیچارہ ایک ایسے دلدل میں پھنس کر غرق ہو جاتا ہے کہ پوری زندگی اس سودی غرقاب سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا ہے، اس میں حاجتمندوں کے

ساتھ کتنا بے رحمانہ سلوک ہوتا ہے؟ جو کہ معاشرے کے لئے سراسر تباہ کن ہوتا ہے، اور غریبوں کے کندھوں پر ایک ایسا ناجائز ظالمانہ بوجھ ہے جو ان کے اور ان کے بچوں کا خون چوسنے کے برابر ہے۔

اس بے دردی اور بے رحمی والے عمل پر اللہ تعالیٰ شانہ نے ہر نبی کی شریعت میں پابندی لگائی، کہ اس عمل کو خدا اور رسول کے ساتھ جنگ کرنے کا مترادف اور برابر قرار دیا۔ پوری تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ مگر جس طرح یہودیوں نے اس عمل کو نہیں چھوڑا اسی طرح آج کل کے مسلمان بھی ان کے نقش قدم پر چل کر قرآن وسنت کے احکامات سے انحراف کرر ہے ہیں، اور خوب زوروشور سے سودی عمل میں لگے ہوئے ہیں۔

بینکاری کا سارا نظام سود پر ہی ہے، جو لوگ یہودی ہیں ان کے بڑے بڑے ذاتی بینک ہیں، اور بینکوں میں ان کے شیئرز ہیں۔ پوری دنیا کی دولت وسرمایہ اس وقت یہودیوں کے تسلط وقبضہ میں ہے۔ تمام عالمی بینکوں پر ان کا قبضہ ہے۔ سارے ممالک ان کے دست نگر اور محتاج ہیں، اور پوری آبادی پر ان کا کنٹرول اور گرفت اتنی مضبوط ہے کہ ان کے مشوروں کے بغیر کسی قسم کی ترقی اور معاشی وغیرہ نظام نہ آگے بڑھ سکتا ہے، نہ چل سکتا ہے، وہ جس طرح دنیاوی ممالک کو مشورہ دیتے ہیں وہ مجبوراً ان پر عمل کرنے کے پابند رہتے ہیں، وغیرہ۔

کچھ لوگ مسلمان ہوتے ہوئے اس ملعون غلامیت اور ملعونیت کے کام میں لگے ہوئے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حکموں کی نہ پرواہ کرتے ہیں، اور نہ ان پر دھیان دیتے ہیں، بلکہ الٹا سود کو جائز کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرتے ہیں، اور اس کا نام کاروبار اور پیسے کی تجارت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کسی کی عبادت اور حلال خوری اور تقویٰ کا محتاج نہیں ہے، سارے جہاں کا تقویٰ اسے فائدہ نہیں دیتا، اسی طرح سارے جہاں کا کفر اسے نقصان نہیں دیتا، اس کی ہر قدرت وبرتری اعلیٰ اور بے مثال ہے، وہ "اللہ الصمد" ہر چیز اس کی محتاج ہے، اور وہ کسی چیز کا ضرورت مند اور محتاج نہیں ہے۔ پس جو لوگ اس سودی عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں وہ بدنصیب وگمراہ ہیں، وہ اپنی جانوں پر ظلم کرر ہے ہیں، اور خود کو جہنم کے لئے تیار کرر ہے ہیں، اور اپنی اولاد بیوی بچوں کے ساتھ بھی دشمنی کرر ہے ہیں۔ صرف مال کی خاطر اپنے ایمان کا سرمایہ تباہ کرر ہے ہیں، جبکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ سارے جہان کے اموال ومتاع اور پورا سامان ایک ادنیٰ مسلمان کے ایمان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اور نہ ہی ایمان کی قیمت بن سکتا ہے۔

کچھ حریص اور لالچی مالدار لوگ علماء کرام کو نشانہ بناتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دوسری قومیں (یہود، نصاریٰ،

ہندو، بدھ مت وغیرہ) سودی تجارت کی بنیاد پر بامِ عروج پر پہنچ چکی ہیں، اور علماء کرام سود حرام کر کے مسلمانوں کو افلاس کے گہرے غاروں میں ڈال چکے ہیں۔ بھلا مولوی کی کیا طاقت ہے کہ کسی چیز کو حرام کر دے؟ یا کسی حرام کو حلال کر دے؟ وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ کرتا ہے، جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے حلال ہے اسے حلال بتاتا ہے، اور جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام ہے اسے حرام بتاتا ہے۔

علماء کرام کو بُرا کہنے سے لعنت سے نہیں بچیں گے۔ اور حرام حلال نہیں ہو جائے گا، اور حلال وحرام کا فرق صرف اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ مخصوص ہے، اسلام ہی جائز وناجائز اور حلال وحرام کا تعین کرتا ہے، جبکہ دیگر اقوام میں حلال وحرام کا تصور تک نہیں ہوتا۔

پس افسوس ہے کہ اسلام کا دعویٰ کرنے والے مال کی محبت میں یہودیوں پر بھی سبقت لے جا چکے ہیں۔ یہودیوں سے نفرت بھی کرتے ہیں، اور ان سے اپنا بغض بھی ظاہر کرتے ہیں، اور صفات واعمال ان کے اختیار کرتے ہیں۔ مال خواہ کسی بھی طریقے سے حاصل ہو اس کی کثرت اور فراہمی سے خوش ہوتے ہیں، لیکن انہیں آخرت کے دردناک عذاب کا احساس نہیں ہوتا۔

اگر سچ پوچھیں تو جس طرح یہودیوں پر تشریعی طور پر پاکیزہ چیزیں حرام کر دی گئی تھیں، اسی طرح ہمارے زمانے میں تکوینی طور پر پاکیزہ چیزوں سے ہم لوگ محروم ہو رہے ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے چیزوں میں جو لذت تھی وہ اب نہیں رہی، اور جانوروں کے گوشت یورپ امریکہ وغیرہ میں اور ایشیا کے بہت سے ملکوں میں بسم اللہ کے بغیر مشین کے ذریعہ ذبح ہو رہے ہیں، اور مختلف علاقوں میں بھیجے جا رہے ہیں، اور بلا تأمل بڑے شوق سے کھائے جا رہے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ حلال چیزوں کو حرام کر کے کھا رہے ہیں، اور بڑی رغبت سے حرام کھا کر خوش ہو رہے ہیں۔ حلال ذبیحہ کا جو مزہ اور لطف وکیف ہوتا تھا اس سے یکسر محروم ہیں، اور حرام کھانے کا جو گناہ ہے وہ اپنی جگہ ہے۔

﴿وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ دنیا کی سزا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر پاکیزہ چیزوں کو حرام کر دیا، اور آخرت کی سزا یہ ہے کہ ان میں سے جو کفر پر برقرار رہیں گے، اور کفر ہی پر مریں گے، تو قیامت میں دردناک عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

ترجمہ: لیکن ان میں سے جو علم میں پختہ ہیں، اور جو ایمان لانے والے ہیں، وہ ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا آپ پر، اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے، اور جو لوگ قائم کرنے والے ہیں نماز کو، اور دینے والے ہیں زکوٰۃ کو، اور جو ایمان لانے والے ہیں اللہ تعالیٰ پر، اور آخرت کے دن پر ایسے لوگوں کو عنقریب ہم بڑا ثواب عطا کریں گے ﴿۱۶۲﴾

معارف ومنازل

اس سے پہلے بھی کئی مقامات پر اچھے اور ایماندار لوگوں کا استثنا ہو چکا ہے، جیسے ارشاد فرمایا: ﴿لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۱۳] (سارے اہل کتاب ایک جیسے نہیں ہیں، اہل کتاب ہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو (راہِ راست پر) قائم ہیں، جو رات کے اوقات میں اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں، اور جو سجدہ ریز ہوتے ہیں)۔

اس آیت میں بھی یہی بتایا کہ سارے اہل کتاب صفاتِ ذمیمہ سے متصف نہیں ہیں، جن کا ذکر اوپر ہوا، بلکہ ان میں وہ اچھے لوگ بھی ہیں، (اگرچہ قلّت میں ہوں) جو علم میں پختہ ہیں، اصحابِ فہم وبصیرت ہیں۔ وہ سابقہ کتبِ الٰہیہ اور موجودہ کتابِ الٰہی، یعنی قرآن کریم پر ایمان لاتے ہیں، نمازیں قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہیں، اور ان لوگوں کو ہم اجرِ عظیم عطا کریں گے جو ایمان اور اعمالِ صالحہ والوں کے لئے مقرر اور موعود ہے۔

گو ایسے لوگ یہودیوں میں کم ہیں، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے چند رفقاء ساتھی۔ رضي الله عنهم۔ جس طرح کفر پر جمے رہنے والوں کے لئے عذابِ الیم تیار فرمایا ہے، اسی طرح ایمان قبول کرنے والوں اور اعمالِ صالحہ اختیار کرنے والوں سے اجرِ عظیم اور ابدی سعادت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں بھی نوازے۔ آمین

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَ
إِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ۝١٦٣ وَ
رُسُلًا قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ۝١٦٤
رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا
حَكِيمًا ۝١٦٥ لَّٰكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَآ أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُۥ بِعِلْمِهِۦ ۖ وَالْمَلَٰٓئِكَةُ يَشْهَدُونَ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝١٦٦

ترجمہ: بیشک ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی، جیسا کہ وحی بھیجی نوح کی طرف، اور ان نبیوں کی طرف جو ان کے بعد آئے، اور ہم نے وحی بھیجی ابراہیم، اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب کی طرف، اور یعقوب کی اولاد کی طرف، اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف، اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی ۝١٦٣ اور ہم نے بہت سے ایسے رسول بھیجے جن کا ہم نے آپ سے اس سے پہلے حال بیان کیا، اور بہت سے ایسے رسول بھیجے جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا، اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے خاص طور پر کلام کیا ۝١٦٤ ہم نے رسول بھیجے جو خوشخبری سنانے والے تھے، اور ڈرانے والے تھے، تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت باقی نہ رہے، اور اللہ تعالیٰ عزیز ہے، حکمت والا ہے ۝١٦٥ لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے اس چیز کی جو آپ کی طرف اتاری اس کو اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے، اور فرشتے گواہی دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی شہادت ہی کافی ہے ۝١٦٦

معارف ومنازل

شانِ نزول اور ربط:

عدی بن زید اور مسکین دونوں یہودیوں نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی شخص پر کوئی کتاب نازل کی ہو، بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ پچھلی آیت میں ﴿يَسْـَٔلُكَ أَهْلُ الْكِتَٰبِ أَن تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ [النساء: ۱۵۳] (اہل کتاب آپ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے ایک کتاب اتاریں) سے یہود کے معاندانہ سوال کا الزامی جواب بالتفصیل دیا گیا تھا، اب آیات: ﴿إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ﴾ سے اسی سوال کا دوسرے انداز سے جواب دیا جا رہا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تمہارے ایمان لانے کی یہ شرط کہ آپ ہمارے لئے ایک آسمانی کتاب اور ایک

دستاویز لائیں، تب ہم آپ پر ایمان لائیں گے، اگر تسلیم کرلی جائے تو ان مذکورہ انبیاء کرام علیہم السلام کو تو تم یہود برحق پیغمبر تسلیم کرتے ہو، حالانکہ تم نے ان سے یہ مطالبات نہیں کئے تھے، اور ان پر ایمان لانے کی یہ شرط کیوں نہیں لگائی؟ اور بغیر آسمانی کتاب کے ان کا اتباع کیوں کیا؟ اور صرف اس آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے کی بے جا فرمائش کا آخر مقصد کیا ہے؟

الغرض! تمہاری یہ فرمائش مبنی بر عداوت اور ضد وعناد کا نتیجہ ہے، جسے کوئی عقلمند تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، حالانکہ سب انبیاء کرام علیہم السلام نے ایک ہی حقیقت کی دعوت پیش کی ہے، اور بنی نوع انسان کی ہدایت اور فوز وفلاح کے لئے ایک ہی بنیاد اور اصول کی تبلیغ کی ہے۔ وہ اول سے آخر تک ایک دوسرے کی تصدیق کرتے چلے آئے ہیں، اور ایک دینِ الٰہی پر ان کا اتفاق چلا آرہا ہے۔ ان کے شرائع اگرچہ مختلف رہے ہیں، مگر اصول میں وہ سب متفق ہیں، جیسے ارشاد ہے: اَبُوْهُمْ وَاحِدٌ وَاُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى۔ اگرچہ ان کی مائیں متفرق ہیں (شرعی احکام) مگر باپ سب کا (بنیادی اصول) ایک ہی ہے۔ [بخاري]

﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ﴾ ہم نے آپ کے پاس اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح علیہ السلام کے پاس وحی بھیجی تھی۔ پیغمبروں میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر اس لئے کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرح آپ علیہ السلام بھی آئندہ تمام انسانوں کے باپ تھے، کیونکہ طوفان کی وجہ سے سب لوگ ہلاک ہوگئے تھے، اور جو کشتی میں بچ رہے تھے ان میں حضرت نوح علیہ السلام کی نسل کے علاوہ کسی شخص کی نسل باقی نہیں رہی۔

آگے صرف حضرت نوح علیہ السلام کی نسل چلی، اور آپ علیہ السلام کے تینوں بیٹے سام، حام، یافث سے قیامت تک آنے والے انسانوں کا سلسلہ چلا، اسی لئے آپ علیہ السلام ابوالبشر ثانی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ارشاد ہے: ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ﴾ [الصافات:۷۷] (ان ہی کی نسل ہم نے باقی رکھی)۔ اس کے علاوہ حضرت نوح علیہ السلام کی خصوصیات یہ تھیں کہ آپ علیہ السلام سے پہلے سارے انبیاء علیہم السلام گزرے تھے۔ آپ علیہ السلام سب سے پہلے رسول اور صاحب شریعت تھے۔ آپ علیہ السلام سب سے پہلے پیغمبر ہیں جنھوں نے لوگوں کو شرک سے ڈرایا، اور منع کیا۔

سب سے پہلے دعوت کو رد کرنے سے آپ علیہ السلام کی امت پر طوفان کا عذاب آیا۔ آپ علیہ السلام ہی کی بددعا

سے روئے زمین کے تمام باشندے عذاب میں ہلاک ہوئے۔ تمام پیغمبروں سے آپ علیہ السلام کی عمر زیادہ تھی، اور اس کو بجائے خود آپ علیہ السلام کا معجزہ قرار دیا گیا، فرمایا: ﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾ [العنکبوت: ۱۴] (نوح ان میں ہزار سال رہے، سوائے پچاس سال)۔ آپ علیہ السلام کا کوئی دانت نہیں گرا، اور کوئی بال سفید نہیں ہوا، جسمانی طاقت میں کوئی کمی نہیں آئی، اتنی لمبی عمر تک آپ علیہ السلام نے قوم کی ایذ ءارسانی پر، اور بیوی کی نافرمانی اور کفر پر صبر کیا۔

﴿وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ﴾ اور جیسے نوح علیہ السلام کے بعد پیغمبروں پر وحی بھیجی، جن کا بیان عنقریب آنے والا ہے۔

﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ﴾ اور جیسے ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب (علیہم السلام) کے پاس وحی بھیجی، اور اولادِ یعقوب کے پاس بھی۔ اسباط سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے ہونے والے پیغمبر ہیں۔

﴿وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ﴾ اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان علیہم السلام کے پاس۔ الْأَسْبَاطِ میں سے ان پیغمبروں کے ناموں کا خصوصی ذکر اس لئے کیا کہ یہ بڑے صاحب قدر و منزلت تھے۔

﴿وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا﴾ اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔ زبور اس کتاب کا نام ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر اتاری گئی تھی، جس میں ایک سو پچاس سورتیں تھیں۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ زبور میں صرف اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اور مجد و بزرگی کا بیان تھا، کوئی شرعی احکام نہیں تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام شہر سے باہر جنگل میں جاکر کھڑے ہوکر نہایت خوش آوازی کے ساتھ زبور کی تلاوت کرتے تھے، اس وقت علماء بنی اسرائیل آپ علیہ السلام کے پیچھے صف بستہ ہوتے تھے، اور علماء کے پیچھے دوسرے لوگ، اور سب آدمیوں کے پیچھے جنات حسبِ تفاوت درجہ کھڑے ہوتے تھے، پہاڑی درخت وحوش وطیور اور دیگر جانور سب جمع ہوکر جھوم جھوم کر تلاوت سنتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے، پرندے عجیب کیفیت کے ساتھ بازو پھیلائے لوگوں کے سروں پر سایہ افگن رہتے تھے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رات کو میں نماز تہجد میں تمہاری قرأت سن رہا تھا، تم کو حضرت داؤد علیہ السلام کے سُروں (لہجوں) میں سے ایک سُر دیا گیا ہے، أُوتِيتَ مِزْمَارًا مِنْ

مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ میری قرأت سن رہے ہیں تو خدا کی قسم میں خوب خوش آوازی وخوش ادائیگی سے کام لیتا۔ [بخاري]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جب حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوتی تو آپ رضی اللہ عنہ فرماتے: ابوموسیٰ! ہم کو کچھ قرآن پڑھ کر سناؤ، تاکہ ہم کچھ نصیحت حاصل کریں، تو حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کچھ پڑھ کر سناتے، اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نہایت خوش ہوتے، اور لذّت پاتے۔

﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ﴾ اور ہم نے کچھ پیغمبر بھیجے، جن کا ذکر ہم نے پہلے تم سے کردیا، جیسے حضرت آدم، ادریس، زکریا، اور یحیٰ علیہم السلام، وغیرہ۔ یہ آیت کریمہ قرآن حکیم میں دوجگہ مذکور ہے: ایک یہی سورۃ النساء میں، دوئم سورۂ غافر میں۔

قرآن کریم میں جن انبیاء علیہم السلام کے اسماء گرامی بیان ہوئے ہیں، وہ کل پچیس (۲۵) ہیں جس ترتیب کے ساتھ وہ یکے بعد دیگرے دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ یہاں اسی ترتیب کے ساتھ ان کے مقدس اسماء تحریر کرتے ہیں، تاکہ تقدیم وتاخیر کا اشتباہ نہ رہے، وہ یہ ہیں:

(۱) حضرت آدم (۲) حضرت ادریس علیہ السلام (۳) حضرت نوح علیہ السلام (۴) حضرت ہود علیہ السلام (۵) حضرت صالح علیہ السلام (۶) حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام (۷) حضرت لوط علیہ السلام (۸) حضرت اسمٰعیل علیہ السلام (۹) حضرت اسحٰق علیہ السلام (۱۰) حضرت یعقوب علیہ السلام (۱۱) حضرت یوسف علیہ السلام (۱۲) حضرت شعیب علیہ السلام (۱۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام (۱۴) حضرت ہارون علیہ السلام (۱۵) حضرت یونس علیہ السلام (۱۶) حضرت ذوالکفل علیہ السلام (۱۷) حضرت داوٗد علیہ السلام (۱۸) حضرت سلیمان علیہ السلام (۱۹) حضرت ایوب علیہ السلام (۲۰) حضرت الیاس علیہ السلام (۲۱) حضرت الیسع علیہ السلام (۲۲) حضرت زکریا علیہ السلام (۲۳) حضرت یحیٰ علیہ السلام (۲۴) حضرت مسیح عیسیٰ علیہ السلام (۲۵) اور خاتم الانبیاء وافضل المرسلین سید العٰلمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

اور کچھ انبیاء کرام علیہم السلام کے اسماء گرامی احادیث میں بھی مذکورہ ہیں، اگرانہیں معلوم کرنا ہوتو حافظ ابن کثیر کی قصص الانبیاء، اور علامہ نجار، اور علامہ سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہم کی کتب میں دیکھیں۔

البتہ جن انبیاء کرام علیہم السلام کا قرآن مجید میں ذکر نہیں ہے، ان کے بارے میں اختلاف ہے، کہ ان کی تعداد کیا ہے؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث [مشکوۃ:۵۱۱] اس سلسلے میں مشہور ہے، چنانچہ امام ابن

مردویہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں، اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنی مسند میں ان سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! انبیاء علیہم السلام کی تعداد کیا ہے؟ فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں۔ میں نے سوال کیا: یارسول اللہ! ان میں سے رسول کتنے تھے؟ فرمایا: تین سو تیرہ کا جم غفیر۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ان میں پہلے رسول کون ہیں؟ فرمایا: آدم علیہ السلام۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ نبی مرسل تھے؟ فرمایا: ہاں! اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، پھر ان میں روح پھونکی، اور اپنے سامنے ان کو درست کیا، پھر فرمانے لگے: اے ابوذر! چار انبیاء سریانی ہیں: حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت نوح اور حضرت اخنوخ، یعنی حضرت ادریس علیہم الصلوٰۃ والسلام، اور انہوں نے سب سے پہلے قلم سے لکھا۔ اور چار عرب میں ہیں: حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام، اور تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

اے ابوذر! بنی اسرائیل کے پہلے نبی موسیٰ علیہ السلام ہیں، اور آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اول نبی آدم علیہ السلام ہیں، اور آخری نبی تمہارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ (جو روایت مشکوٰۃ میں ہے وہ مختصر ہے)

اس پوری حدیث کو حافظ ابوحاتم ابن حبان بستی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی مشہور کتاب "التقاسیم والأنواع" میں روایت کیا ہے، جس کو وہ صحیح کے نام سے موسوم کرتے ہیں، لیکن حافظ ابوالفرح ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی مخالفت کی ہے، اور اپنی مشہور کتاب "الموضوعات" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ اسی سلسلے میں اس حدیث کے ایک راوی ہشام بن حسان کو متہم گردانتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: وَلَاشَکَّ اَنَّہٗ قَدْ تَکَلَّمَ فِیْہِ غَیْرُ وَاحِدٍ مِنْ أَئِمَۃِ الْجَرْحِ وَالتَّعْدِیْلِ مِنْ اَجْلِ ھٰذَا الْحَدِیْثِ۔ [ابن کثیر]

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے متعلق بہت سے ائمہ جرح وتعدیل نے اسی حدیث کی بنا پر کلام کیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اس روایت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کا پہلا نبی بتایا گیا ہے، حالانکہ یہ صفت حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے، اور وہ ہی بنی اسرائی کے پہلے نبی ہیں۔ اس بات سے بھی حافظ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (حضرت ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً یہی تعداد نقل کی ہے، لیکن یہ روایت بھی نہایت ضعیف ہے، اور مسند احمد میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کے توسط سے خود حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی بھی مذکورہ بالا روایت منقول ہے، لیکن اس کی سند بعینہ وہی ہے جو ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ کی ہے...... حاکم، ابونعیم، ابویعلی، اور حافظ ابوبکر اسماعیلی رحمۃ اللہ علیہم اپنی صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری بعثت آٹھ ہزار انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد عمل میں آئی ہے، جن میں سے چار ہزار انبیاء علیہم السلام بنی اسرائیل میں گزرے ہیں۔ [عمدة القاري: ج ۷ ص ۳۰۷]

لیکن اس روایت کے ایک راوی احمد بن طارق کے متعلق حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ مجھے اس کی عدالت یا جرح کا علم نہیں ہے۔ [ابن کثیر] جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں ایک ہزار یا اس سے زیادہ انبیاء کرام علیہم السلام کا خاتم ہوں۔ [ابن کثیر حوالہ بالا]

ان دونوں روایتوں کی سندیں صحیح ہیں، اس لحاظ سے تعداد انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق یہی قول زیادہ صحیح اور قوی معلوم ہوتا ہے۔ [لغات القرآن، ابن کثیر]

﴿وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ﴾ اور کچھ پیغمبر اور بھی بھیجے، جن کا ہم نے تم سے ذکر نہیں کیا۔ آیت کریمہ بتا رہی ہے کہ ایمان کے لئے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی الگ الگ ناموں کے ساتھ شناخت ضروری نہیں، اگر ہر ایک پر تفصیلی ایمان ضروری ہوتا تو اللہ تعالیٰ شانہ سب انبیاء کرام علیہم السلام کا تفصیلی ذکر فرماتا، بلکہ سب پر ایمان اجمالاً کافی اور لازم ہے۔ [مظهري]

﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے براہ راست کلام فرمایا۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ازلیہ میں صفتِ کلام بھی ہے، اور قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اس کی کیفیت سمجھنے سے بندے عاجز ہیں۔ کیفیت کا ذکر کتاب وسنت میں نہیں ہے، اس لئے یہ ایمان لانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام فرمانا صحیح ہے، برحق ہے، تو ہم اس کی کیفیت نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ محلِ حوادث نہیں ہے، وہ ذات وصفات دونوں کے اعتبار سے قدیم ہے، تو اس نے اس طرح کلام فرمایا جو اس کی شان کے لائق ہے۔ پھر فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (ہم نے رسول بھیجے خوشخبری دینے والے ڈرانے والے تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ پر حجت باقی نہ رہے)۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں علیہم السلام کو بھیجا، ان کے واسطہ سے اپنے بندوں کو توحید اور عبادت کا حکم دیا، رسولوں نے اہل ایمان کو اور اعمالِ صالحہ اختیار کرنے والوں کو اجر وثواب اور آخرت کی نعمتوں کی بشارت دی، اور منکرین کفار کو دوزخ کے عذاب وعقوبتوں سے ڈرایا، اور بتایا کہ اگر ایمان وتوحید قبول نہ کروگے تو دوزخ میں جاؤ

گے، اس سے بندوں پر حجت قائم ہوگئی، تاکہ وہ قیامت میں یوں نہ کہیں: ﴿لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى﴾[طٰہٰ:۱۳۴] (کیوں نہیں بھیجا آپ نے کوئی رسول ہماری طرف سے؟ ہم آپ کی آیات کا اتباع کرتے، اس سے پہلے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہوتے)۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنے رسول علیہم السلام بھیج دیئے، کتابیں بھیج دیں، تو بندوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت قائم نہیں رہی۔

نیز انہیں حواس ظاہری و باطنی، عقل و فراست سے بھی نوازا، پس بندوں پر ہر طرح اللہ تعالیٰ کی حجت قائم ہوگئی، اب وہ کوئی عذر و معذرت نہیں کرسکیں گے۔ پھر فرمایا:

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے، وہ جسے چاہے عذاب دے سکتا ہے، اور وہ حکمت والا بھی ہے، اس نے اپنی حکمت کے مطابق رسول علیہم السلام بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں، تاکہ لوگوں پر حجت قائم ہوجائے۔ پھر فرمایا:

﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ (لیکن اللہ تعالیٰ اس چیز کی گواہی دیتا ہے جو اس نے آپ کی طرف اپنے علمی کمال کے ساتھ اتاری، اور فرشتے گواہی دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی شہادت کافی ہے)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رؤساء مکہ کفار قریش آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، اور انہوں نے کہا: اے محمد! ہم نے آپ کے بارے میں یہودیوں سے دریافت کیا کہ تمہاری کتابوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفات بیان کی گئی ہیں، یا نہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم تو ان کو نہیں جانتے، تھوڑی دیر میں یہودیوں کی ایک جماعت آگئی، ان سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ تم جانتے ہو میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ ہم تو نہیں جانتے، اس پر آیات کریمہ کا نزول ہوا۔ [معالم، مظهري]

اور یہ فرمایا کہ آپ کی نبوت اور رسالت کی حقانیت ان کے ماننے پر موقوف نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو کتاب اپنے علمی کمال کے ساتھ نازل فرمائی ہے (جو ایک عظیم معجزہ ہے) وہ اس کتاب کے ذریعہ آپ کی نبوت و رسالت کی گواہی دیتا ہے، اور فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اگر ان بیوقوفوں اور معاندوں نے نہ مانا، اور گواہی نہ دی، تو اس سے حقیقت واقعیہ میں فرق نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ کا گواہ ہونا ہی کافی ہے، کسی اور کی تصدیق اور تسلیم کی آپ کو حاجت نہیں ہے۔ ﴿قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ﴾[الأنعام:۱۹]

(کہو: کونسی چیز ایسی ہے جو گواہی دینے کے لئے سب سے اعلیٰ درجے کی ہو؟ کہو: اللہ (اور وہی) میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے)۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے، تمام بندوں پر غالب وقاہر ہے، پس اس کی شہادت سے زبردست اور بے لوث شہادت کس کی ہوسکتی ہے؟ پس میرے اور تمہارے درمیان وہی سچا اور باعظمت گواہ ہے، اس کی گواہی سارے جہان والوں کی گواہی سے پختہ بھی ہے، اور برحق بھی۔ تمام گواہوں کی گواہیاں اس کی گواہی کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ قَدۡ ضَلُّوۡا ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَظَلَمُوۡا لَمۡ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغۡفِرَ لَہُمۡ وَلَا لِیَہۡدِیَہُمۡ طَرِیۡقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِیۡقَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرًا ﴿۱۶۹﴾

ترجمہ: بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکا، بیشک وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑے ﴿۱۶۷﴾ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا، اور ظلم کیا، اللہ تعالیٰ ان کو نہیں بخشے گا ﴿۱۶۸﴾ اور نہ جہنم کی راہ کے علاوہ انہیں اور کوئی راہ بتائے گا، وہ اس میں ہمیشہ اَبدالآباد رہیں گے، اور یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے ﴿۱۶۹﴾

معارف ومنازل

ان آیتوں میں ان لوگوں کے لئے وعیدِ شدید ہے جنہوں نے خود بھی کفر اختیار کیا، اور دوسروں کو بھی اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکا۔ یہ لوگ نہ خود اسلام قبول کرتے ہیں، اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے ہیں، اس کی وجہ سے بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑے۔ چونکہ جو شخص خود بھی گمراہ ہو، اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے پر کمر باندھ لے، اس سے واپس ہدایت کی طرف آنے کی امید نہیں کی جاسکتی، کفر اختیار کرنے والوں کو ظالم بھی بتایا، جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ﴾ [لقمان: ۱۳] (یقیناً شرک کرنا بڑا ظلم ہے)۔

کیونکہ اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور دوسروں پر بھی ظلم کیا، جس نے انہیں حق قبول کرنے سے روکا، تو واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت نہیں فرمائیں گے، اور جب قیامت کے دن حاضر ہوں گے تو ان کو صرف دوزخ ہی کا راستہ بتایا جائے گا، تاکہ اس میں داخل ہوجائیں، اور فرشتے انہیں پکڑ پکڑ کر دوزخ کے حوالے کریں گے۔ دنیا میں جب

انہوں نے جنت کی راہ اختیار نہیں کی تو آخرت میں بھی جنت اور سعادتوں سے محروم ہی رہیں گے، اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہایت آسان ہے کہ کسی ظالم کو اس کے ظلم کی پاداش میں ابدی سزا دیدے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ
وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

ترجمہ: اے لوگو! بیشک تمہارے پاس حق کے ساتھ تمہارے ربّ کی طرف سے رسول آگیا، سوتم ایمان لاؤ، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اور اگر تم کفر اختیار کرو سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو آسمانوں میں ہے، اور زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، حکیم ہے (حکمت والا ہے) ﴿۱۷۰﴾

معارف ومنازل

نہایت شفقت ورحمت کے ساتھ تمام عالم کے انسانوں کو خطاب فرمایا، اور انہیں واضح طور پر آگاہ فرمایا کہ تمہارا ربّ تمہیں ہدایت وسلامتی کے ساتھ نواز کر فرما رہے ہیں، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿واللہ یَدْعُوْا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ﴾ [یونس:۲۵] یعنی اللہ تعالیٰ تم کو ایمان وہدایت اور جنت کی طرف دعوت دیتا ہے، تا کہ تم ہر قسم کے عذاب سے نجات پاؤ۔

تو فرمایا کہ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ حق لے کر پہنچے ہیں، ان کا تشریف لانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لہٰذا ان پر ایمان لاؤ، اگر ایمان لاؤ گے تو تمہارے لئے بہتر ہوگا، کیونکہ حق قبول کرنا مستقل خیر ہے، اور پھر اس کے سبب سے دائمی عذاب سے بچنا، اور ہمیشہ کے لئے جنت اور جنت کی نعمتوں کا حاصل ہو جانا یہ سب خیر ہی خیر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہے، اسے تمہارے مؤمن ہونے کی کوئی حاجت نہیں ہے، تم کفر اختیار نہ کرو، کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے، اور تم بھی اسی کے ہو، وہ خالق بھی ہے، اور مالک بھی ہے، اسی کا اختیار ہے، اپنی مخلوقات میں جو چاہے تصرف کرے، کفر کی پاداش میں انہیں عذاب دینے کی بھی پوری طرح قدرت حاصل ہے۔ جس طرح ایمان کے بدلے میں انہیں سعادت اور جنت دینے کی پوری قدرت حاصل

ہے۔ وہ نیک لوگوں کے نوازنے، اور بُرے لوگوں کی گوشمالی پر ہر طرح قادر وتوانا ہے، اور اللہ تعالیٰ علیم ہے، اسے سب کے احوال معلوم ہیں، اس پر کسی کا کفر اور ایمان پوشیدہ نہیں ہے، وہ حکیم بھی ہے، اپنی حکمت کے موافق جزاوسزا عطا فرمائے گا۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾

ترجمہ: اے اہل کتاب! غلو نہ کرو اپنے دین میں، اور مت کہو اللہ کی شان میں مگر حق بات، مسیح جو عیسیٰ ابن مریم ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم تک پہنچایا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روح ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور مت کہو کہ تین خدا ہیں، اس سے باز آجاؤ، یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا، معبود صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، جو اکیلا ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو، اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کارساز ہونے کے لئے کافی ہے ﴿۱۷۱﴾

معارف ومنازل

سابقہ آیات میں تمام عالمِ انسانیت کو عمومی خطاب ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برحق رسول ﷺ پاکیزہ اور برحق دین کے ساتھ تمہارے پاس تشریف لائے، تم سب کی خیر ومنفعت اسی میں ہے کہ سارے مل کر ان پر ایمان لاؤ۔ موجودہ آیت کریمہ میں خطاب خاص ہے اہل کتاب یہود ونصاریٰ کے لئے، کہ تم اپنے دین میں اعتدال پر رہو، اپنے انبیاء علیہم السلام کی ہدایت وفرمودات پر مکمل پابندی کے ساتھ عمل کرو، اور ہر قسم کے افراط وتفریط سے بچو، اور دین میں تعصب وغلو اور حد سے تجاوز کرنے سے پرہیز کرو، کیونکہ حدود اللہ اور حدود شرعیہ میں تجاوز قطعاً حرام بھی ہے، اور مفضي إلى الكفر (کفر تک پہنچانے والا) بھی ہے، پس غلو ہر حال حرام ہی ہوگا۔

دین میں غلو حرام اور ناجائز ہے:

جیسا کہ اہل کتاب کو غلو کرنے سے منع فرمایا کہ دین میں غلو نہ کرو، ایسے ہی امت محمد یہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو بھی دین میں غلو کرنے سے ممانعت فرمائی ہے۔ آج امت محمدیہ بھی یہود ونصاریٰ کی طرح دین میں طرح طرح کے غلو میں مبتلا ہے۔ نصاریٰ نے اپنے دین میں غلو کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود، اور اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنا دیا، اور کفارہ کا عقیدہ قائم کیا، جو کہ حد سے تجاوز اور افراط ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگوں نے سرور عالم ﷺ کے لئے علم غیب کلی ثابت اور تجویز کر کے ایک نامعقول اور غلط عقیدہ ایجاد کیا، کیونکہ یہ عقیدۂ علم غیب کلی اللہ تعالیٰ کے برابر آپ ﷺ کا علم ثابت کرنے کے مترادف ہے۔

اس سے لازم آتا ہے کہ آپ ﷺ کے لئے خدائی اختیارات کا اثبات ہو جائے، حالانکہ سرور عالم ﷺ نے پہلے ہی سے اس کی بندش فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: لَاتُطْرُوْنِیْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰى عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللهِ وَرَسُوْلُهٗ۔ [متفق علیه] یعنی تم میری تعریف میں مبالغہ (غلو) نہ کرو، جیسا کہ نصاریٰ نے ابن مریم علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ کیا، بس میں تو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، تم میرے بارے میں یوں کہو کہ: اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اور رسول ہیں۔ (پس ظاہر ہے کہ بندہ اور رسول کسی صورت اللہ تعالیٰ کے ساتھ برابر نہیں ہوسکتا)۔

علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ الموضاعات الکبیر میں فرماتے ہیں: وَمَنِ اعْتَقَدَ تَسْوِيَةَ عِلْمِ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ يَكْفُرُ اِجْمَاعًا كَمَا لَا يَخْفٰى۔ [الموضوعات الكبير للقاري] کہ جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کا علم برابر ہے، تو اس کو بالا جماع کافر کہا جائے گا۔ پھر چند سطر کے بعد کہتے ہیں:

وَلَارَيْبَ اِنَّ هٰؤُلَاءِ عَلٰى هٰذَا الْغُلُوِّ اِعْتِقَادُهُمْ اَنَّهٗ يُكَفِّرُ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ وَكُلَّمَا غَلَوْا كَانُوْا اَقْرَبَ اِلَيْهِ وَاَخَصَّ بِهٖ فَهُمْ اَعْصَى النَّاسِ لِاَمْرِهٖ وَاَشَدُّهُمْ مُخَالَفَةً لِسُنَّتِهٖ وَهٰؤُلَاءِ فِيْهِمْ شِبْهٌ ظَاهِرٌ مِنَ النَّصَارٰى غَلَوْا اَعْلَى الْمَسِيْحِ اَعْظَمَ الْغُلُوِّ وَخَالَفُوْا شَرْعَهٗ وَدِيْنَهٗ اَعْظَمَ الْمُخَالِفَةِ۔ [الموضوعات الكبير لعلي القاري]

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ اس غلو کے ساتھ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گناہوں کو معاف کرتے ہیں، اور انہیں جنت میں داخل کرتے ہیں، اور اپنے غلو کو قرب کا سبب سمجھتے ہیں، اور اپنے کو

خواص میں شمار کرتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ تمام لوگوں سے زیادہ نافرماں ہیں، اور سنت مطہرہ کے مخالف بھی، اور یہ عقیدہ انہیں عیسائیوں سے حاصل ہوا ہے، جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔

پھر یہ غلو ترقی کرتے ہوئے اولیاء کرام تک پہنچ گیا، کہ اولیاء کرام کو مخلوق میں تصرف کرنے والا، اور غیب جاننے والا مان لیا گیا۔ لوگ اولیاء کرام اور خاندانی پیروں فقیروں سے حاجتیں مانگتے ہیں، اور ان کے نام کی نذر مانتے ہیں، اور ان کی قبروں پر چراغ جلاتے ہیں، اور محفلِ عرس و میلہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ نیز بزرگوں کے مزاروں پر سجدہ کرتے ہیں، اور ان کی قبروں پر طواف کرتے ہیں، حالانکہ طواف صرف کعبہ شریف کے ساتھ خاص ہے، اور نذر و نیاز ایک مالی عبادت ہے، جو کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، اور ہر قسم کا سجدہ بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہے۔

عرب کے مشرک کسی جانور کی عبادت تو نہیں کرتے تھے، لات، منات، عزیٰ، ہبل، نائلہ وغیرہ تو انسان ہی تھے، جن کے مجسموں کی وہ پوجا کرتے تھے۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کی امت جن بتوں یعنی وَدّ، سُوَاع، یَغُوث، یَعُوق اور نسر کے مجسموں کی عبادت اور پوجا کرتی تھی، یہ بھی ان کے آباء واجداد کے زمانے کے پیر و فقیر اور نیک لوگ گزرے تھے۔

پس آج کی قبر پرستی، اور ان کی بت پرستی میں کوئی ذرہ برابر بھی فرق نہیں، جس طرح وہ مشرک و کافر جہنمی قرار پائے، اسی طرح آج کا قبر پرست بھی مشرک و کافر اور جہنمی ہی ہوگا۔ پس یہود و نصاریٰ کی گمراہی اور عاد ثمود و دیگر اقوام کی گمراہی، اور آج کی گمراہی میں کوئی خاص فرق نہیں۔

اس آخری امت کا مخصوص لقب جب "جماعۃ الموحدین" قرار پایا، تو چاہئے کہ شرک کی تمام اقسام سے بچ کر ہمیں خالص توحید کا گرویدہ ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی ادنیٰ ذرّہ شرک کرنے سے آدمی "جماعۃ الموحدین" کی فہرست سے خارج ہو جاتا ہے، اور کفر و شرک کی گمراہی اور تاریکیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔

فرمایا:

﴿يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ وَلَا تَقُولُواْ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلۡحَقَّ﴾ کہ اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو، یعنی وہ باتیں نہ کہو جو تمہارے دین میں نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں صرف وہی کہو جو حق ہے، ناحق باتیں کر کے اللہ تعالیٰ پر تہمت دھرنے والے نہ بنو۔ نصاریٰ نے اللہ تعالیٰ کے حق میں وہ موشگافیاں کیں جنہیں شاید آسمان و زمین اور کوہ و جبال و دریا بھی برداشت نہ کریں، انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا

بیٹا تجویز کرلیا تھا، تین خدا مانتے تھے، اور اب بھی مانتے ہیں، اور یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا تجویز کرلیا تھا، اس کے ساتھ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے منکر ہو گئے، اور ان کے قتل کے درپے ہو گئے، حتیٰ کہ اپنے خیالِ باطل میں ان کو قتل ہی کر دیا، اور آج تک ان کو اس پر اصرار ہے۔ اور نصاریٰ نے عقیدۂ تکفیر بھی اپنی طرف سے گڑھ لیا، اور یہ کہنے اور ماننے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے کو قتل کروا کر ہمارے گناہوں کا کفارہ کر دیا۔ العیاذ باللہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفائی پر پورا قرآن مجید گواہ ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ کہ عیسیٰ بن مریم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اور اس کا کلمہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام تک پہنچایا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روح ہیں۔ اِنَّمَا کا کلمہ عربی زبان میں حصر کے لئے آتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ مسیح جو عیسیٰ بن مریم ہیں اس کے بارے میں جو عقیدے تم نے اپنی طرف سے تجویز کر لئے ہیں، وہ سب غلط ہیں، وہ نہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اور نہ ہی معبود، ان کو جو سب سے بڑی فضیلت حاصل ہے وہ یہی ہے کہ دوسرے رسولوں کی طرح وہ بھی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام تک پہنچایا، اور ان کے باطن میں ڈالا، اور چوتھی بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح ہے۔

وَكَلِمَتُهٗ اس لفظ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہیں۔ مفسرین حضرات نے اس کے مختلف معانی بیان کئے ہیں۔

☆...... امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی بچے کی پیدائش میں دو عوامل کارفرما ہوتے ہیں: ایک عامل نطفہ ہے، اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا کلمۂ ''کُنْ'' فرمانا، جس کے بعد وہ بچہ وجود میں آجاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں چونکہ پہلا عامل منتفی ہے، اس لئے دوسرے عامل کی طرف نسبت کر کے آپ علیہ السلام کو كَلِمَةُ اللّٰهِ کہا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ علیہ السلام مادی اسباب کے واسطہ کے بغیر صرف کلمۂ ''کُنْ'' سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس صورت میں ﴿اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ﴾ کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کلمہ حضرت مریم علیہا السلام تک پہنچا دیا، جس کے نتیجہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عمل میں آگئی۔

☆...... بعض نے فرمایا کہ كَلِمَةُ اللّٰهِ بِشَارَتُ اللّٰهِ کے معنی میں ہے، اور مراد اس سے حضرت عیسیٰ علیہ

السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے فرشتوں کے ذریعہ حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو بشارت دی تھی، اس میں کَلِمَةُ کا لفظ استعمال کیا گیا۔ فرمایا: ﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ﴾ [آل عمران: ۴۵] (جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ آپ کو کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے)۔

☆......بعض نے فرمایا کہ کَلِمَةُ آیۃ اور نشانی کے معنی میں ہے، جیسا کہ دوسری جگہ یہ لفظ آیۃ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، فرمایا: ﴿وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ﴾ [التحریم: ۱۲] (اور انہوں نے اپنے ربّ کی آیتوں اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی)۔ پھر فرمایا:

﴿وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ اس لفظ میں دو باتیں قابل غور ہیں: ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہنے کے کیا معنی ہیں؟ اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی طرف جو اس کی نسبت کی گئی ہے اس نسبت کا مطلب کیا ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین حضرات کے متعدد اقوال منقول ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) بعض نے فرمایا عرف کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی شے کی طہارت اور پاکیزگی کو بیان کرنا ہوتا ہے تو مبالغہ کے لئے اس پر روح کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں چونکہ کسی باپ کے نطفہ کا دخل نہیں تھا، اور وہ صرف اللہ تعالیٰ جل شانہ کے ارادہ، اور کلمۂ "کُنْ" کا نتیجہ تھے، اس لئے اپنی طہارت ونظافت میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اسی وجہ سے عرف کے محاورہ کے مطابق ان کو روح کہا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف ان کی نسبت تعظیم وتشریف کے لئے ہے، جیسے کعبۃ اللہ، بیت اللہ، مساجد اللہ، ناقۃ اللہ وغیرہ۔ سورۂ بنی اسرائیل میں سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ صیغہ استعمال کیا گیا ہے، فرمایا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ [الاسراء: ۱] (پاک ہے وہ ذات جو اپنا بندہ رات کو لے گئے)۔

(۲) بعض حضرات نے فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے مردہ دلوں میں روحانی حیات ڈال کر پھر زندہ کر دیں، چونکہ وہ روحانی حیات کا سبب تھے، جس طرح روح جسمانی حیات کا سبب ہوا کرتی ہے، اس لئے اس اعتبار سے ان کو روح کہا گیا، جیسا کہ قرآن کریم کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ [الشوریٰ: ۵۲] (اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح بطور وحی نازل کی ہے) کیونکہ قرآن کریم بھی روحانی حیات کا سبب ہے۔

(۳) بعض نے فرمایا کہ روح کا استعمال راز کے معنی میں ہوتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی عجیب

وغریب پیدائش کی وجہ سے چونکہ اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی اور راز تھے، اس لئے انہیں روح اللہ کہا گیا۔

(۴) بعض نے کہا کہ یہاں مضاف محذوف ہے، اور اصل عبارت یوں ہے: ذُوْرُوْحٍ مِّنْهُ۔ اور چونکہ ذي روح ہونے میں سب حیوانات برابر ہیں، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا امتیاز اس طرح ظاہر کیا گیا کہ ان کی نسبت اللہ جل شانہ نے اپنی طرف فرمائی رُوْحٌ مِّنْهُ۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ روح نفخ اور پھونک کے معنی میں ہیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کے گریبان میں اللہ جل شانہ کے حکم سے پھونک مارا تھا، اور اسی سے حمل قرار پا گیا تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بطور معجزہ اسی پھونک سے ہوئی تھی، اسی لئے آپ کو روح اللہ کہا گیا جیسے ﴿فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا﴾ سے اشارہ ہے

(۶) بعض نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو احیاء موتی کا معجزہ دیا گیا تھا آپؑ مردوں کو زندہ کرتے تھے اور ان سے کلام فرماتے تھے پھر دوبارہ قبر میں لوٹا دیتے تھے تو اسی وجہ سے آپ علیہ السلام کو روح اللہ کا لقب دیا گیا۔

(۷) بعض نے کہا کہ آپ علیہ السلام گارے سے پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارتے تو مٹی سے بنے ہوئے پرندے زندہ ہو کر اڑتے، اور میدانوں کی سیر کرتے، ہدہد پرندہ جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے سراغ رسانی کی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت محبت کرتا تھا، اسی طرح صاحب حیاۃ الحیوان نے لکھا ہے کہ خفاش پرندہ، یعنی چمگاڈر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی پیداوار اور تخلیق ہے، جب بے جان مٹی کے گارے میں روح ڈال کر (بِإِذْنِ اللّٰهِ تَعَالىٰ) اس کو زندہ پرندہ بنا کر اڑاتے، تو اس وجہ سے آپ علیہ السلام کو روح اللہ کہا گیا۔

علماء کرام نے اس کے علاوہ اور کئی احتمالات بیان کئے ہیں۔ بہر حال عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک جزء ہے، نہایت قبیح اور باطل عقیدہ ہے۔ ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ﴾ [الأنعام: ۹۱] (انہوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی)۔ اللہ تعالیٰ شانہ تمام مخلوقات کی صفات سے پاک ومنزہ ہے، اور اس کی کوئی صفت کسی مخلوق کا حصہ نہیں۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ سورہ براءت میں آنے والی ہے۔

حکایت:

علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے روح المعانی میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ہارون رشید عباسی خلیفہ کے دربار میں ایک نصرانی طبیب نے حضرت علی بن حسین واقدی رحمۃ اللہ علیہ سے مناظرہ کیا، اور ان سے کہا کہ تمہارے قرآن حکیم میں

ایسا لفظ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ جل شانہ کا جزو ہیں، اور دلیل میں یہ آیت پیش کی جس میں "رُوْحٌ مِّنْہُ" کے الفاظ ہیں۔ حضرت علامہ واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے جواب میں ایک دوسری آیت پڑھ دی: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ [الجاثیۃ: ۱۳] (اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کو اس نے اپنی طرف سے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے)۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اسی اللہ ذوالجلال سے ہے، اور "مِّنْهُ" کے ذریعہ سے سب چیزوں کی نسبت اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف کر دی گئی ہے، اور فرمایا کہ: ﴿رُوْحٌ مِّنْهُ﴾ کا اگر مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا جزو ہیں، تو اس آیت کا پھر مطلب یہ ہوگا کہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ شانہ کا جزو ہے؟ یہ جواب سن کر نصرانی طبیب لاجواب ہو گیا، اور اسلام قبول کیا۔

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ﴾ نزول قرآن کریم کے وقت نصاریٰ جن بڑے بڑے فرقوں میں تقسیم تھے تثلیث کے متعلق ان کا عقیدہ تین جدا جدا اصولوں پر مبنی تھا: ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح خود خدا ہیں، اور خدا ہی بشکل مسیح دنیا میں اتر آیا ہے۔ دوسرے فرقہ کا کہنا یہ تھا کہ مسیح ابن اللہ ہیں۔ اور تیسرا فرقہ یہ کہتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے: باپ، بیٹا، ماں (مریم علیہا السلام)۔ اور اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے۔ دوسرا گروہ حضرت مریم علیہا السلام کی جگہ روح القدس کو اقنوم ثالث کہتا تھا۔

غرض یہ کہ یہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ تسلیم کرتے تھے، اس لئے قرآن کریم میں تینوں کو جدا جدا بھی مخاطب کیا ہے، اور یکجا بھی، اور نصاریٰ پر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ حق ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ مسیح علیہ السلام مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور اللہ تعالیٰ شانہ کے سچے اور برگزیدہ رسول ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ لغو اور باطل ہے، خواہ اس میں وہ تفریط ہو جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے، کہ العیاذ باللہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام شعبدہ باز اور مفتری تھے، یا افراط اور حد سے تجاوز ہو، جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے، کہ وہ خدا ہیں، یا خدا کے بیٹے ہیں، یا تین میں سے تیسرے ہیں (نعوذ باللہ)۔

قرآن کریم نے بے شمار آیات میں، اسی طرح ذخیرۂ احادیث شریفہ میں ایک طرف تو یہود و نصاریٰ کی گمراہی کو واضح کیا، دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان رفیع اور عند اللہ تعالیٰ ان کے مقامِ اعلیٰ کو واضح فرمایا ہے، تاکہ افراط و تفریط کے لغو اور بیہودہ منگھڑت خیالات وعقائد سے اجتناب ہو، اور صراط مستقیم پر چلنا ممکن اور

آسان ہو۔

﴿اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ بیشک معبود صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، جو اکیلا اور ایک ہے، اور وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے لئے کوئی بیوی یا اولاد ہو۔ مطلب یہ ہے کہ صرف یہی نہیں کہ اس کی اولاد نہیں، بلکہ اس کی اولاد ہو نہیں سکتی، کیونکہ اولاد ہونا اس کے لئے عیب ہے، وہ جس طرح نیند اور سونے سے پاک ہے، اسی طرح کھانے پینے سے پاک ہے، اسی طرح وہ تمام عیوب ونقائص سے بھی پاک اور منزہ ہے۔ ﴿لَمْ يَلِدْ ڏ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ [الإخلاص] (نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ محترمہ کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ﴾ [المائدة:۷۵] (اور ان کی ماں صدیقہ تھیں، یہ دونوں کھانا کھاتے تھے)۔ پس مخلوق کی صفات کو خالق کے لئے ثابت کرنا سراسر شرک اور کفر ہی ہے۔ اسی طرح خالق کی صفات مخلوق کے لئے ثابت کرنا بھی کفر ہی ہوگا۔ پھر فرمایا:

﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اسی کی مخلوق اور مملوک ہے، پھر کوئی کیسے اس کا شریک اور اس کا بیٹا ہو سکتا ہے؟

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾ اور اللہ تعالیٰ کافی ہے کارساز ہونے کے لئے، جس نے سب کو پیدا فرمایا، وہی سب کا کارساز ہے، اسے اپنی مخلوق کے کام بنانے اور ان کی تمام حاجتیں پوری کرنے کے لئے کسی شریک یا اولاد کی کوئی ضرورت نہیں، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک مانو، اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور ان کی تعلیمات پر خوب عمل کرو، اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین میں ہر قسم کے غلو کرنے سے پرہیز کرو، غیر شرعی بدعات اور ہر طرح کے شرک وکفر سے دور رہو، یہود نصاریٰ کی رسوم اور اہل کتاب کے نقش قدم پر چلنے سے اجتناب کرو، ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ﴾ [الفاتحة:۷] (نہ وہ جن پر غضب نازل ہوا ہے، اور نہ وہ جو گمراہ ہوئے) پڑھا کرو، اور دشمنانِ خدا اور رسول کے طور وطریقوں پر لعنت بھیجا کرو۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ
عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿١٧٢﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ
اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٧٣﴾

ترجمہ: مسیح ہرگز اس کو عار نہیں سمجھے گا کہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بنے، اور نہ مقرب فرشتے اور جو کوئی شخص عار کرے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے اور تکبر کرے، تو وہ ان کو عنقریب اپنے پاس جمع فرمائے گا ﴿١٧٢﴾ سو جو لوگ ایمان لائے، اور نیک عمل کئے، ان کو پورے پورے بدلے عطا فرمائے گا، اور اپنے فضل سے اور زیادہ دے گا، اور جن لوگوں نے عار کی، اور تکبر کیا، سو ان کو دردناک عذاب دے گا، اور یہ لوگ اپنے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی یار اور مددگار نہ پائیں گے ﴿١٧٣﴾

معارف ومنازل

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، اور واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے اسباب النزول میں اس قول کی نسبت کلبی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کی ہے کہ نجرانی وفد کے نمائندوں نے کہا کہ: اے محمد! آپ ہمارے صاحب پر عیب لگاتے ہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں کیا کہتا ہوں ہوں نے کہا کہ آپ ان کو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور رسول کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا نا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے باعثِ عار نہیں، بلکہ باعثِ افتخار ہی ہے، اس پر یہ آیت اتری۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دنیا میں تھے، انہوں نے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، جیسے کہ کسی برگزیدہ پیغمبر کی شان ہوتی ہے، اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور عبادت کی طرف مسلسل دعوت دیتے رہے، اور اللہ تعالیٰ کو اپنا اور سب کا رب بتایا۔ سورۂ آل عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد موجود ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل سے خطاب کر کے فرمایا تھا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ [آل عمران: ۵۱] (بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا رب ہے، اور تمہارا رب ہے، سو تم اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے)

سورۂ مریم میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے (جبکہ وہ نومولود تھے) حاضرین سے فرمایا تھا: ﴿اِنِّيْ

عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا﴾ [مریم: ۳۱] (میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے، اور مجھے نبی بنایا، اور مجھے برکت والا بنایا، جہاں بھی میں ہوں۔ اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے، جب تک میں زندہ رہوں)۔ پہلا کلمہ جو ان کی زبان سے نکلا ہے وہ یہی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔

اور سورۂ مائدہ میں ہے: ﴿وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ﴾ [المائدۃ: ۷۲] (اور مسیح نے کہا: اے اسرائیل کے بیٹو! اللہ کی عبادت کرو، جو میرا ربّ اور تمہارا ربّ ہے۔ بیشک جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو اللہ نے اس پر جنت کو حرام کردیا ہے، اور اس کا ٹھکانا آگ ہے)۔

جس کسی بندہ کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو وہ بڑی محبت وشوق کے ساتھ فخریہ طور پر اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ کاملہ اور اپنی عبدیت وبندگی کا اعتراف کرتا ہے، اور جیسے جیسے معرفت بڑھتی جاتی ہے عبدیت کا اقرار بھی بڑھتا جاتا ہے، اور ہر عارف باللہ کو اس بات پر فخر اور خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور تمام فرشتے علیہم السلام ساری مخلوقات سے بڑھ کر معرفتِ الٰہیہ کی عظیم نعمت سے مشرف ہیں، اور ان سب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اور اس بندگی پر اتنے خوش اور راضی رہتے، اور فخر محسوس کرتے ہیں کہ سارے جہاں پر اس بندگی کو قیمتی اور افضل شمار کرتے ہیں۔

سید کائنات خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن حکیم میں بار بار اپنا بندہ بتایا، اور اپنی طرف نسبت فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرف فرمایا، جیسے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا﴾ [الإسراء: ۱] (پاک ہے وہ ذات جو اپنا بندہ رات کو لے گئے)۔ اسی طرح: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ﴾ [الفرقان: ۱] (برکت والی ہے وہ ذات فرقان نازل کیا اپنے بندے پر)۔ اور فرمایا: ﴿فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى﴾ [النجم: ۱۰] (پس وحی بھیجی اپنے بندے کی طرف جو وحی بھیجی)۔

درحقیقت کسی مخلوق کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ کی بندگی کی نعمت حاصل ہو، اور وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جائے۔ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے بندگی کی صفت کے ساتھ یاد فرما کر ان کی قدر ومنزلت کو واضح فرما کر ارشاد فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ﴾ [ص: ۱۷] (ہمارے بندے داوٗد کو یاد کرو)۔ ﴿وَاذْكُرْ

عَبْدَنَآ اَیُّوْبَ﴾[ص: ۴۱] (ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو)۔ ﴿وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ﴾ [ص: ۴۵] (اور یاد کرو ہمارے بندے ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو)۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونا سب سے زیادہ فخر اور شرف کی بات ہے، کوئی پیغمبر اور فرشتہ اس کو اپنے لئے کیسے عار سمجھ سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندہ ہونے کا اقرار کرے؟ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جائے، اور اللہ تعالیٰ اسے اپنا بندہ فرما کر خطاب فرمائے، اس سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں، اگر اس نعمت پر پورے جہاں کو چھوڑنا پڑے تو آسان ہے۔ ؎

وَمِمَّا زَادَنِیْ عَجَباً وَتِیهاً ★ وَكِدْتُ بِاَخْمَصِیْ اَطَأُ الثُّرَیَّا

دُخُوْلِیْ تَحْتَ قَوْلِکَ یَا عِبَادِیْ ★ وَاَنْ صَیَّرْتَ اَحْمَدَ لِیْ نَبِیَّا

مخلوق اور مملوک ہونے کے اعتبار سے تو سبھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، لیکن اپنے علم و معرفت اور اقرار و اعتراف کے ساتھ جو اطاعت گزاری کے ساتھ اپنے بندہ ہونے کا اقرار کرے، اور اس کو فخر و سعادت جانے، اور اپنے عمل سے عبدیت کا مظاہرہ کرے، یہ سب سے بڑا اشرف اور اونچا مقام ہے، اور کسی مخلوق کی ذلت اس سے بڑھ کر اور نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کی بجائے کسی غیر اللہ کی بندگی کرے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی عاجز مخلوق کا بندہ بنے جو لوگ اللہ تعالیٰ کا بندہ نہیں بنتے، وہ اپنی طرح کی مخلوق کے سامنے سر جھکاتے ہیں، اور کبھی زندہ پیروں اور فقیروں کے قدموں پر سر رکھتے ہیں، اور سجدہ ریز ہوتے ہیں، کبھی قبروں اور مزاروں پر سجدہ کرتے ہیں، اور اس کے علاوہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو چھوڑ کر اس کی بندگی کی بجائے حکام امراء وزراء کے سامنے رکوع و سجدہ کر کے ان کے حکموں کو اللہ تعالیٰ کے حکموں پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی بندگی ہے، جو کہ حرام ہے۔

دراصل یہ سارے مشرکانہ ناجائز کام یہود و نصاریٰ سے سیکھ کر مسلمانوں نے اپنائے ہوئے ہیں۔ نصاریٰ کی یہ جہالت کی بات تھی کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے بندہ ہونے کو عار سمجھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور تمام فرشتے ان کو ہرگز اس بات سے عار نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اور انہیں اللہ تعالیٰ کے بندہ ہونے کا اقرار ہے، اور فرمایا:

﴿وَمَنْ یَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیَسْتَكْبِرْ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا﴾ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی سے استنکاف کرے، یعنی اسے اپنے لئے عار سمجھے، اور تکبر کرے، تو وہ ان سب کو اپنی طرف جمع فرمائے گا۔ بندگی کا اقرار کرنے والوں، اور خالق و مالک کی عبادت میں مشغول ہونے والوں کو پورا پورا اجر عطا فرمائے گا، اور مزید اپنے

فضل سے بہت زیادہ عطا فرمائے گا، اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا بندہ بننے کو اپنے لئے عار سمجھا، اور تکبر کیا ان کو درد ناک عذاب دے گا، اور وہاں کوئی حمایتی و مددگار نہ ملے گا۔

بدقسمتی سے کچھ لوگ مسلمان ہوتے ہوئے نماز و روزہ اور زکوٰۃ و حج و دیگر عبادات سے پہلو تہی کرتے ہیں، اور خاص کر نماز و روزہ کو اپنے لئے عار سمجھ کر سجدہ کرنے سے شرم محسوس کرتے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ اپنی عاقبت کی بربادی اور برے انجام سے توبہ کرلیں۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾

ترجمہ: اے لوگو! بیشک آئی ہے تمہارے پاس دلیل تمہارے ربّ کی طرف سے، اور ہم نے اتارا ہے تمہاری طرف واضح نور، سو جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اور اسے مضبوطی سے پکڑا، تو عنقریب ان کو اپنی رحمت اور فضل میں داخل فرمائے گا، اور ان کو اپنی طرف سے سیدھے راستہ پر پہنچادے گا ﴿۱۷۵﴾

معارف ومنازل

نصاریٰ کی تردید فرمانے کے بعد پھر تمام انسانوں کی راہنمائی فرماتے ہوئے ان کو خطاب فرمایا: اے لوگو! بیشک آئی تمہارے پاس ربّ تعالیٰ کی طرف سے برہان و دلیل، جس سے تمہاری راہنمائی اور ہدایت کا راستہ واضح ہوگا، اور ہم نے تمہاری طرف واضح نور روشنی اتاری ہے۔

برہان دلیل کو کہتے ہیں، اور نور مبین سے آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔ مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جریج اور صاحب درمنثور نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ نور مبین سے مراد قرآن کریم ہے، جس کے ساتھ اَنْزَلْنَا کہا گیا ہے۔

درحقیقت یہ کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ قرآن کریم برہان و حجت بھی ہے، اور نور مبین بھی۔ اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس بھی حجت ہے، اور نور مبین بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزات کثیرہ کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ساری مخلوقات کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے

ایک عظیم حجت ہے۔ اور آپ ﷺ کی دعوت توحید اور دلائل توحید اس قدر واضح ہیں کہ کسی بھی شخص کے لئے جو اپنی عقل کو ذرا بھی صحیح استعمال کرے، ان سے منحرف ہونے اور کفر اختیار کرنے کا کوئی بھی جواز نہیں ہے۔

آپ ﷺ کی ذات گرامی حجت ہے، اور نور مبین ہے کہ آپ ﷺ نے کھول کر ہدایت کے راستے بتائے، اور دکھائے، اور خیر وشر، نیز سعادت وشقاوت کا امتیاز واضح فرمایا۔ پھر جس طرح آپ ﷺ کی ذات گرامی لوگوں پر حجت ہے، اور نور مبین ہے، اسی طرح قرآن کریم بھی عظیم معجزہ ہونے کے اعتبار سے لوگوں پر حجت ہے، اور برہان ہے، جس نے واضح طور پر توحید کے دلائل آفاقی وانفسی بیان کئے، اور کافروں اور مشرکوں کی گمراہی بیان کی، اور اچھے برے تمام لوگوں کا انجام بتادیا، اور حجت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نور مبین بھی ہے جس نے خالق ومالک جل شانہ کو راضی کرنے کے طریقے سکھائے، احکامِ شرعیہ واضح فرمائے، اور صلاح وفلاح کے راستے بتائے، جہالت کی تاریکیوں سے لوگوں کو نکال کر روشنی کے منارے قائم کئے، وغیرہ۔

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ پس جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اور مضبوطی سے اسے پکڑا تو وہ عنقریب ان کو اپنی رحمت اور فضل میں داخل فرمائے گا، اور ان کو اپنی طرف سیدھے راستے پر پہنچادے گا۔ سیدھے راستہ پر پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ان کو فرمانبرداری اور ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے گا، اور اسی اعمالِ صالحہ اور اتباعِ حق کی بدولت آخرت میں انہیں جنت میں پہنچائے گا۔ [روح المعاني]

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

ترجمہ: لوگ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے: اللہ تعالیٰ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے، اگر کوئی شخص مرجائے اس کی کوئی اولاد نہیں، اور اس کی ایک بہن ہے، تو اس کے لئے اس مال میں کا آدھا ہے جو مرنے والے نے چھوڑا، اور وہ بہن کے پورے مال کا وارث ہوگا، اگر اس بہن کی کوئی اولاد نہ ہو، پس اگر

دو بہنیں ہیں، تو ان کے لئے اس مال میں سے دو تہائی ہے، جو مرنے والے نے چھوڑا، اور اگر یہ لوگ بہن بھائی ہوں تو ایک مرد کے لئے دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بیان فرماتا ہے، تاکہ تم گمراہ نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۝

معارف ومنازل

سورۂ نساء کے شروع میں میراث کے مسائل، خاص کر ذوی الفروض کے حصص اور حقوق تفصیلاً بیان ہوئے۔ وہاں بھی کلالہ کا ذکر ہو چکا تھا، یہاں دوبارہ تفصیل کے ساتھ حقیقی اور علاتی بہن بھائی کی میراث کے مسائل کا بیان ہے۔ اس کے ساتھ سورت کے اختتام اور ابتداء کا ربط بھی واضح ہے۔

کَلٰلَۃً: کلالہ اس کو کہتے ہیں جس کے نہ اصول ہوں اور نہ فروع ہوں۔ یعنی ماں باپ دادا کوئی نہ ہو، اسی طرح اولاد، یعنی بیٹے بیٹیاں اور بیٹوں کی اولاد کوئی نہ ہو، ایسا شخص اگر مر جائے اور اس نے بہن بھائی چھوڑے ہوں، تو ان کو جو میراث ملے گی۔ اس کا کچھ بیان سورت کے دوسرے رکوع میں بیان فرمایا، اور کچھ یہاں فرما رہے ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ بہن بھائی تین قسم کے ہوتے ہیں: عینی، یعنی سگے بہن بھائی۔ علاتی، یعنی باپ شریک بہن بھائی۔ اخیافی، یعنی ماں شریک بہن بھائی۔

ان میں سے آخر الذکر، یعنی اخیافی بہن بھائی کا حصہ سورۂ نساء کے دوسرے رکوع میں بتا دیا، اور وہ یہ کہ جب کسی کلالہ مرد یا عورت کی وفات ہو جائے، اور اس نے ماں شریک ایک بھائی یا ایک بہن چھوڑی ہو، تو ہر ایک کو مرنے والے کے مال سے چھٹا چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر ان کی تعداد اس سے زیادہ ہو، مثلاً دو بہنیں ہوں، یا اس سے زیادہ ہوں، یا دو بھائی ہوں، یا اس سے زیادہ ہوں، یا ایک بھائی ہو اور بہنیں ایک سے زیادہ ہوں، اور یا ایک بہن ہو، اور بھائی ایک سے زیادہ ہوں، تو یہ سب لوگ مرنے والے کے تہائی مال میں برابر کے شریک ہوں گے، اور ان میں مرد وعورت کا حصہ برابر ہوگا، لڑکے کو لڑکی سے دوگنا نہیں ملے گا۔ اور باقی مال دوسرے وارثوں کو پہنچ جائے گا [النساء:۱۲]

اور یہاں سورۂ نساء کے آخر میں عینی اور علاتی، یعنی سگے بہن بھائی اور باپ شریک بہن بھائی کا حصہ بتایا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص مر جائے جو کلالہ ہو، اور اس نے ایک بہن چھوڑی ہو جو عینی ہو یا علاتی ہو،

تو اس بہن کو (بعد اداء قرض ونفاذِ وصیت) کُل مال کا آدھا ملے گا، اور اگر کسی ایسی عورت کی وفات ہوگئی جو کلالہ تھی، اور اس نے ایک بھائی عینی یا علاتی چھوڑا، تو وہ بھائی اپنی مذکورہ بہن کے کُل مال کا وارث ہوگا، اگر کسی مرد کلالہ نے دو عینی یا علاتی بہن چھوڑیں تو ان کو مرنے والے کے مال سے دو تہائی ملے گا۔

اور اگر عینی یا علاتی متعدد بہن بھائی چھوڑے تو مرنے والے کا مال ان بہن بھائیوں پر اس طرح تقسیم ہوگا کہ ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ دیدیا جائے گا۔ البتہ عینی بھائی کی وجہ سے علاتی بہن بھائی سب ساقط ہوجاتے ہیں، اور عینی بہن کی وجہ سے علاتی بہن بھائی کا حصہ کبھی ساقط ہوجاتا ہے اور کبھی گھٹ جاتا ہے، جس کی تفصیل کتب فرائض میں مذکور ہے۔ فرمایا:

﴿یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ﴾ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بیان فرماتا ہے تا کہ تم گمراہ نہ ہوجاؤ۔ یہاں حرف لا مقدر ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ [انوار البیان]

الحمدللہ سورۂ نساء کی تفسیر اختتام کو پہنچی۔

سُورَةُ الْمَائِدَة

مَدَنية آياتها ١٢٠ ركوعاتها ١٦

سورۂ مائدہ مدنی ہے، اس میں ایک سوبیس (١٢٠) آیات، اور سولہ (١٦) رکوع ہیں

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

نام اور کوائف:

اس سورۃ کا نام المائدۃ ہے۔ یہ سورۃ بالاتفاق مدنی ہے۔ سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، اور سورۂ نساء کی طرح مدنی ہے، کیونکہ اس کا اکثر حصہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوا ہے، تاہم اس کی تیسری آیت کا حصہ: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدۃ:٣] حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات (مكة المكرمة) میں نازل ہوا۔

اس سورۃ کا نام "سورۃ المائدۃ" کے علاوہ "سورۃ العقود" بھی ہے۔ اسی طرح اس کا نام "سورۃ منجیہ" بھی ہے۔ مگر مشہور نام۔ المائدۃ ہے۔

یہ قرآن کریم کی ترتیب تلاوت میں پانچویں سورت ہے، اور ترتیب نزول کے اعتبار سے یہ ١١٢ نمبر پر ہے۔ اس کے بعد سورۂ توبہ اور آخر میں سورۃ النصر کا نزول ہوا ہے، نزول کے اعتبار سے سب سے آخری سورۃ ہے۔ سورۃ المائدہ کا نزول سورۃ الفتح کے بعد ہے۔ سورۂ مائدہ میں کُل رکوع ١٦، آیت ١٢٠، کلمات ٢٨٤٢، اور حروف ١٢٤٦٤ ہیں۔ چونکہ اس سورت میں مشہور واقعہ مائدۃ (دسترخوان) کا ہے، ارشاد ہے: ﴿رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ [المائدۃ:١١٤] اسی لئے سورۃ کا نام "سورۃ المائدۃ" مقرر ہوا۔

ربط:

سورۃ النساء میں توحید خالص کا بیان ہے، اور ردّ شرک خاص کر نصاریٰ کے باطل اور مذموم عقائد کی مکمل تردید ہے۔ اسی طرح سورۂ مائدہ میں بھی انہی چیزوں کا مکمل بیان ہے۔ اور نصرانی ودیگر مشرکین کی مکمل تردید ہے۔ اسی طرح سورۃ النساء کے آخر میں ارشاد ہے: ﴿يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا﴾ [النساء:۱۷۶] (اللہ تمہارے لئے بیان فرماتا ہے تا کہ تم گمراہ نہ ہوجاؤ) یہ ایک اجمالی حکم ہے، سورۂ مائدہ میں اس کی مکمل تفصیل ہے۔

مختصر موضوع، اور سورۃ کا خلاصہ:

(۱) عہد و میثاق کی پابندی، عدل وانصاف کی ترغیب، اسلام کا سارے ادیان پر غلبہ، مشرکینِ عرب کی مایوسی اور ذلت کا بیان، تحریماتِ عباد کی تردید، تحریماتِ الٰہیہ کا بیان، نیاز غیر اللہ کی تردید، نیازاتِ الٰہیہ کا بیان، تذکیراتِ ثلاثہ، احوالِ قیامت کا بیان، حسد و عناد کی مذمت، اعمالِ صالحہ کے فضائل، قرآن کریم اور تمام کتبِ سماویہ کی حقانیت کا بیان، کتبِ الٰہی قرآن وتورات اور انجیل سے استفادہ کرنے والوں کی تعریف، اور نہ کرنے والوں کی مذمت، محرماتِ ابدیہ اور محرماتِ وقتیہ کی تشریح، صداقتِ قرآن، رسالتِ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم، کامیابی اور گمراہی کے اسباب کا بیان، اہلِ کتاب کی گمراہی اور خباثتوں کا بیان، چوری اور ڈاکہ زنی کی حد کا بیان، طہارت اور تیمم کا بیان، احکام واعمالِ شرعیہ اور تقویٰ کا بیان، توسُّل بالاعمال کا بیان، انبیاء کرام علیہم السلام سے علم غیب کی نفی، ضرورتِ تبلیغ وطریقۂ اصلاحِ خلق، تورات وانجیل کے فضائل، قانونِ مساوات کا بیان، مرتدین کے خبائث، تنبیہاتِ مؤمنین، امہال المجرمین، فرائضِ انبیاء علیہم السلام فضائلِ بیت اللہ، دلائلِ توحید ودلائلِ اثباتِ قیامت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین ومخالفین کے نتائج، اہلِ کتاب کے ساتھ مناظرہ، مائدہ کا نزول، اور فضائل وبرکاتِ اسلام، اور اسلام کی حقانیت وسربلندی کا بیان، وغیرہ۔

شانِ نزول:

مسند احمد میں بروایت حضرت عبد اللہ بن عمرو اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہم منقول ہے کہ سورۂ مائدہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں ''عضباء'' نامی اونٹنی پر سوار تھے، نزولِ وحی کے وقت جو غیر معمولی ثقل اور بوجھ ہوا کرتا تھا حسبِ دستور اس وقت بھی یہی ہوا، یہاں تک کہ اونٹنی عاجز اور بے قابو ہوگئی، تو آپ

صلی اللہ علیہ وسلم اس سے نیچے اُتر آئے۔

یہ سفر بظاہر حجۃ الوداع کا سفر تھا، جیسا کہ بعض روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ حجۃ الوداع ہجرت کے دسویں سال ہوا۔ اور اس سے واپسی کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی حیات تقریباً اسی (۸۰) دن رہی۔ مفسر ابن حیان اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے بحر المحیط میں فرمایا کہ سورۂ مائدہ کے بعض اجزاء سفر حُدیبیہ میں، اور بعض اجزاء فتح مکہ کے سفر میں، اور بعض اجزاء سفر حجۃ الوداع میں نازل ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ نزول قرآن کے آخری مراحل میں نازل ہوئی ہے، خواہ بالکل آخری سورت نہ ہو (جیسے ابھی چند سطر پہلے بیان ہوا)۔

تفسیر روح المعانی میں بحوالہ ابو عبید حضرت حمزہ بن حبیب اور عطیہ بن قیسؒ کی یہ روایت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے "اَلْمَائِدَۃُ مِنْ اٰخِرِ الْقُرْاٰنِ تَنْزِیلاً فَاَحِلُّوا حَلَالَھَا وَحَرِّمُوا حَرَامَھَا"، یعنی سورہ مائدہ ان چیزوں میں سے ہے جو نزول قرآن کے آخری دور میں نازل کی گئی ہیں، پس اس میں جو چیز حلال کی گئی ہے اس کو ہمیشہ کے لئے حلال سمجھو اور جو چیز حرام کی گئی ہے اس کو ہمیشہ کے لئے حرام سمجھو۔ [روح المعانی]

اسی قسم کی ایک روایت حافظ ابن کثیر نے مستدرک حاکم کے حوالہ سے حضرت جبیر بن نفیر رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ وہ حج کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئے، تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جبیر! تم سورۂ مائدہ پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! میں پڑھتا ہوں۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ سورۃ قرآن حکیم کی آخری (باعتبار نزولی) سورۃ ہے، اس میں حلال وحرام کے جو احکام آئے ہیں وہ محکم ہیں، ان میں نسخ کا احتمال نہیں ہے، ان کا خاص اہتمام کرو۔

سورۂ مائدہ میں بھی سورۂ نساء کی طرح فروعی احکام، معاملات، معاہدات وغیرہ بیان کئے گئے ہیں، اسی لئے صاحب روح المعانی نے فرمایا ہے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران باعتبار مضامین کے متحد ہیں، کیونکہ ان میں زیادہ تر احکام اصول عقائد توحید، رسالت، قیامت وغیرہ کے آئے ہیں۔ فروعی احکام ضمنی ہیں، اور سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ باعتبار مضامین کے متحد ہیں، کہ ان دونوں میں بیشتر فروعی احکام کا بیان ہے، اصول کا بیان ضمنی ہے۔

سورۂ نساء میں باہمی معاملات اور حقوق العباد پر زور دیا گیا ہے، میاں بیوی کے حقوق، یتیموں کے حقوق، والدین اور دوسرے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں بھی ان تمام معاملات اور معاہدات کی پابندی اور انہیں پورا کرنے کی ہدایت آئی ہے، اسی لئے سورۂ مائدہ کا دوسرا نام

''سورۂ عقود'' بھی ہے۔[بحر محیط]

سید کائنات ﷺ نے جب عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو یمن کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجا، اور ایک فرمان لکھوا کر ان کے حوالہ کیا، تو اس فرمان کے سرِ نامہ پر آپ ﷺ نے یہی آیت سورۃ المائدہ کی تحریر فرمائی تھی: ﴿اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ اس پہلی آیت: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ کا یہ جملہ ایک ایسا جامع جملہ ہے کہ زندگی کے تمام عہود و مواثیق اور عقود و معاملات اس میں آجاتے ہیں۔ اگر کوئی اس کی تفسیر و تشریح کرنا چاہے تو شاید مستقل تصنیف عمل میں آجائے۔ سورۂ نحل میں فرمایا: ﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾ [النحل: ۹۱] یعنی تم اللہ تعالیٰ کا عہد پورا کرو، جب تم عہد کرو، اور مت توڑو قسموں کو ان کو پکا کرنے کے بعد، حالانکہ تم نے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کو ضامن بنالیا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا﴾ [الإسراء: ۳۴] (اور تم عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا)۔

سورۂ رعد میں فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۙ﴿۱۹﴾ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ﴾ [الرعد] (وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں، جو پورا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے عہد کو، اور نہیں توڑتے ہیں عہد کو)۔

سورۂ نحل میں ﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ﴾ فرمایا، اور یہاں سورۂ مائدہ میں ﴿اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ فرمایا۔

''عقود'' عقد کی جمع ہے۔ ''عقد'' عربی زبان میں باندھنے کو کہتے ہیں۔ آپس میں جو معاملات طے کئے جاتے ہیں وہ بھی عقد ہی ہوں گے۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو، عہدوں کو پورا کرنا ایمانی تقاضا ہے، اور بدعہدی ایمان کے خلاف ہے، بلکہ کفر اور نفاق کی علامت ہے۔ پھر اس میں وہ عہد بھی داخل ہے جو بندوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہے۔ جب کسی نے اسلام قبول کیا تو گویا اس نے یہ عہد کرلیا کہ میں اللہ تعالیٰ کے تمام حکموں کو مانوں گا، اور جو بھی احکام ہوں گے ان سب پر عمل کروں گا، اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سب سے بچتا رہوں گا، خواہ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن حکیم میں اوامر و نواہی ہوں، اور خواہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعہ بھیجے

ہوں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ﴿اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ اَيْ بِالْعُهُوْدِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ وَمَا حَرَّمَ وَمَا فَرَضَ وَمَاحَدَّ فِي الْقُرْاٰنِ كُلِّهٖ لَا تَغْدِرُوْا وَلَا تَنْكُثُوْا۔ [در منشور بحواله بیهقي] یعنی عہد پورا کرو، اللہ تعالیٰ نے جو حلال قرار دیا ہے، اور جو حرام قرار دیا ہے، اور جن چیزوں کو فرض کیا، اور جو حدود قرآن کریم نے بیان کئے، اُن سب احکام پر عمل کرو، ان کی ادائیگی میں کوئی غدر نہ کرو، اور عہد شکنی نہ کرو۔

عُقود اور عُہود کی قسمیں:

حضرت زید بن اسلم تابعی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ مائدہ کی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ عقود پانچ ہیں، اور وہ یہ ہیں:

(۱) عقد نکاح۔ (۲) عقد شرکت۔ (۳) عقد یمین، یعنی قسم۔ (۴) عقد حلف۔ حلف سے مراد ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے حلیف ہو جائیں، اور آپس میں یہ طے کریں کہ فلاں فلاں امور میں ہم آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے (یعنی جائز امور میں)۔ (۵) عقد عہد، یعنی آپس میں جو وعدہ کرلیا جائے، اگرچہ دونوں جانب سے نہ ہو۔ جماعتوں یا حکومتوں کے جو باہمی معاہدات ہیں، یا دو انسانوں کے آپس میں جو معاملات ہیں، نکاح، بیع وشرا، شرکت، مضاربت، اجارہ وغیرہ، ان سب معاہدات میں ان سب شرطوں کی پابندی لازم ہے جو آپس میں طے ہو جائیں، بشرطیکہ خلاف شرع نہ ہوں۔

اگر کوئی نذر مان لے تو نذر کا پورا کرنا بھی واجب ہے، لیکن گناہ کی نذر ماننا جائز نہیں ہے، اگر کوئی شخص گناہ کی نذر مان لے تو اس پر عمل نہ کرے، اور خلاف ورزی کا کفارہ ادا کرے، اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم توڑنے کا کفارہ ہے۔ ابوداؤد میں ہے: "وَمَنْ نَذَرَ نَذْرًا فِيْ مَعْصِيَةٍ فَكَفَّارَتُهٗ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ"۔ دوسری حدیث میں ہے: "اِنَّهٗ لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِيْ مَعْصِيَةٍ وَلَا فِيْمَا لَا يَمْلِكُهُ ابْنُ اٰدَمَ"۔ [أبو داؤد]

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ معاہدات کی جتنی قسمیں ہیں سب اس لفظ کے حکم میں داخل ہیں، (یعنی اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ کے حکم میں)۔

فائدہ:

واضح ہو کہ ہر بندہ فطرتاً اور طبعاً اللہ تعالیٰ کے ساتھ اطاعت وفرمانبرداری کا عہد کر چکا ہے (ازل میں بھی اور

دنیا میں بھی) جیسے ہر انسان فطرتاً جانتا ہے کہ والدین کی خدمت کرنا اس کے ذمہ ضروری ہے، خواہ اس نے اپنے والدین سے خدمت کا عہد کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اسی طرح تمام مخلوق جانتی ہے خالق کے احکام کی تعمیل کرنا ضروری ہے، خواہ ہم کو یومِ میثاق کا جواب یاد ہو یا نہ ہو، یہی وہ فطری عہد ہے جس کا اعلان قرآن مجید بار بار کر چکا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَہِیۡمَۃُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا
یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ ①

ترجمہ: اے ایمان والو! قول وقرار (عہد ومیثاق) کو پورا کرو، چوپایوں کی قسم کے تمام جانور تمہارے لئے حلال کر دیئے گئے ہیں، سوائے اُن کے جن کی حرمت تم کو سنا دی جائے گی، مگر ایسی حالت میں جب کہ تم احرام میں ہو، شکار کو کسی وقت بھی حلال نہ سمجھنا، بیشک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے ①

معارف ومنازل

"بَهِيمَة" ہر اس ذی روح کو کہتے ہیں جو غیر ذَوِی العقول ہو۔ "أَنْعَام" اُن چوپایوں کو کہتے ہیں جو چار ہاتھ پاؤں پر چلتے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "بَهِيمَة" سے مراد وہ جانور ہوں جو قوائمِ اربعہ پر چلتے ہوں اور "أَنْعَام" سے مراد اونٹ، گائے، بکری، اور بھیڑ ہو، کیونکہ عام طور پر قرآن کریم میں "أَنْعَام" انہی چار قسموں پر بولا گیا ہے، جیسا کہ ان شاء اللہ سورۂ انعام آٹھویں پارہ میں "ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ" کے تحت آجائے گا۔

"بَهِيمَة" کی اضافت "أَنْعَام" کی جانب عام مطلق کی اضافت خاص کی طرف ہے، پھر کسی نے بمعنی لام رکھا، اور کسی نے بمعنی مِن رکھا ہے۔ صاحب کشاف اور بیضاوی کا رجحان یہی ہے کہ یہ اضافت "خَاتَمُ فِضَةٍ" اور "ثَوْبُ خَزٍ" کے اسی قبیل سے ہے۔

اور ہوسکتا ہے کہ یہ اضافت مشبہ بالمشبہ بہ کے قبیل سے ہو، اور یہ طریقہ آسان ہے سمجھنے کے اعتبار سے بھی اور ترکیب کے اعتبار سے بھی، اور چونکہ بہیمہ اور انعام میں قول مختلف ہو گئے، اس لئے اضافت میں بھی اختلاف ہو گیا ہے، اگرچہ مطلب میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

بہر حال! مطلب یہ ہے کہ جو بہائم جو کچلیاں نہیں رکھتے (یعنی نوک دار دانت) اور جگالی کرتے ہیں، اور چار پاؤں سے چلتے پھرتے، اور چرتے ہیں، وہ تمہارے لئے حلال ہیں، اور انہی کا حکم بیان کرنا ہے، لہٰذا درندے اور کچلیوں (نیش) والے جانور شامل نہیں ہیں۔

﴿اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ﴾ سے مراد آنے والی آیت ہے۔ آیت کریمہ کا خلاصہ اور مطلب یہ ہے کہ اے اہلِ ایمان! تم اپنے عہد و پیمان کو پوری طرح پورا کرو، خواہ یہ عہد و پیمان تمہارا آپس میں ہوا ہو، یا وہ عہد ہو جو تم نے اللہ تعالیٰ سے کر رکھا ہے، اور فطرتاً تم اس کو پورا کرنے کے پابند ہو۔ اور دیکھو! ہم نے تمہارے لئے تمام بہائم جو چار پاؤں سے چلتے، اور جگالی کرتے ہیں، اور جن کی کچلیاں نہیں ہوتیں، وہ سب بہائم حلال کر دیئے ہیں۔

البتہ ان بہائم میں سے وہ بہائم حرام ہیں جن کو ہم تمہیں پڑھ کر سنائیں گے، اور وہ بہائم بھی حرام سمجھو جن کو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم کو وقتاً فوقتاً بتاتے رہے، اور ان کی شریعت کے اصول سے جن بہائم کی حرمت ثابت ہوتی ہو، (کما فی الحدیث)۔

لیکن حالتِ اِحرام میں، یا حدودِ حرم میں شکار کرنا حرام ہے، اور اسی طرح اِحرام کی حالت میں کئے ہوئے شکار کا گوشت کھانا بھی حرام ہے، اور دیکھو! اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم دے دیتا ہے، وہ جس جانور کو چاہے حرام کر دے، اور جس کو چاہے ہمیشہ کے لئے حلال کر دے، اور جس حلال کو چاہے کسی خاص موقع (مثلاً اِحرام) پر حرام کر دے، اور جس حرام کو چاہے حالتِ اضطراری میں حلال کر دے، کیونکہ اس کا ہر حکم حکمت و مصلحت اور فوائد پر مبنی ہے۔ حرام اشیاء اور حرام جانور انسانی صحت کے لئے اسی طرح انسانی اقدار و اخلاق کے لئے یقیناً مضر اور نقصان دہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ حاکمِ مطلق اور فاعلِ مختار ہے:

جاننا چاہیئے کہ ربّ العزّت سبحانہ حاکمِ مطلق اور فاعلِ مختار ہے، اسے پورا اختیار ہے کہ جو چاہے حکم دے بندوں کو، اس کے احکام میں چون و چرا کرنے کا کوئی حق اور اختیار نہیں۔ اگر چہ اس کے تمام احکام حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں، لیکن بندۂ مسلم اس کے حکم کی اطاعت اس حیثیت سے نہیں کرتا کہ وہ اسے مناسب اور مبنی بر حکمت پاتا ہے یا مبنی بر مصلحت سمجھتا ہے، بلکہ اس کی اطاعت صرف اس بناء پر کرتا ہے کہ یہ میرے مالک کا حکم ہے۔ جو چیز اس نے حرام کر دی ہے وہ صرف اس لئے حرام ہے کہ میرے مالک نے حرام کی ہے، اور اسی طرح جو اس نے حلال کر دی ہے وہ بھی دوسری بنیاد پر نہیں، بلکہ صرف اس بنیاد پر حلال ہے کہ جو خدا ان ساری چیزوں کا مالک ہے وہ اپنے غلاموں کو

اس چیز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے، لہٰذا قرآن کریم پورے زور کے ساتھ یہ اصول قائم کرتا ہے کہ اشیاء کی حلت و حرمت کے لئے مالک کی اجازت وعدمِ اجازت کے سوا کسی اور بنیاد کی قطعاً ضرورت نہیں، اور اسی طرح بندے کے لئے کسی کام کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خداوند تعالیٰ جس کو جائز رکھے وہ جائز ہے، اور جسے ناجائز قرار دے وہ ناجائز ہے، پس بندہ حکم کا تابع ہی ہوگا، نہ کہ حکمتوں اور مصلحتوں کا۔

حکایت یا لطیفہ:

کسی عالم نے ایک فلسفی دانشور کو قرآن مجید دے کر کہا: جناب فلسفی صاحب! ہم کو آپ سے اس کتاب کا جواب لکھوانا ہے۔ فلسفی نے کہا: بہت اچھا! یہاں رکھ جاؤ، اور جواب کا انتظار کرو، جواب لکھ دیا جائے گا۔ چند دن بعد مولانا صاحب اس فلسفی کے پاس گئے، اور کہا کہ جناب آپ نے اس کا اگر جواب لکھ دیا ہے تو دے دیجئے، اس فلسفی نے کہا: بھائی میں اس کے جواب کی قدرت نہیں رکھتا، اور میرے خیال میں کوئی بھی اس کا جواب نہیں لکھ سکتا، میں نے جب اس کو کھولا تو میری نظر سورۂ مائدہ پر پڑی، تو میں نے دیکھا کہ دو سطروں میں عہد کا پورا کرنا اور نقض عہد سے بچنا بھی ہے۔ عام تحلیل بہائم کا اعلان بھی ہے، پھر استثناء بھی ہے۔ پھر حالتِ احرام میں شکار کی حرمت بھی ہے۔ پھر آخر میں اپنی قدرت اور حکمت کا اظہار بھی ہے، دو سطروں میں اس قدر مضامین اور مسائل کا بیان واظہار کسی انسان کے لئے قطعاً ناممکن ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ آسمانی اور الہامی صحیفۂ حیات ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ②

ترجمہ: اے ایمان والو! مت حلال کرو اللہ تعالیٰ کے شعائر کو، اور نہ شہر حرام کو، اور نہ ہدی کو، اور نہ پٹے ڈالے ہوئے جانوروں کو، اور نہ ان لوگوں کو جو بیت حرام کا قصد کر کے جا رہے ہوں، وہ اپنے ربّ کا فضل اور رضا مندی تلاش کرتے ہیں، اور جب تم حلال ہو جاؤ تو شکار کر لو، اور ہرگز کسی قوم کی دشمنی کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے

روکا ہے، اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کرو، اور آپس میں نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ اور زیادتی پر آپس میں مدد نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے ②

معارف ومسائل

اس آیت کریمہ کا سبب نزول بعض علماء نے غزوۂ حُدیبیہ بتایا ہے، اور بعض نے فتح مکہ۔ اور راجح قول یہی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ شریح بن ضبیعہ کندی یمامہ سے مدینہ منورہ آیا (یمامہ وہ علاقہ ہے جہاں مسلیمہ کذاب ہوتا تھا) اس نے اپنے قافلہ کے ساتھیوں کو جو گھوڑوں پر سوار تھے مدینہ کے باہر چھوڑ دیا، اور اکیلا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوگیا، اور کہنے لگا کہ آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "میں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی، اور نماز قائم کرنے کی، اور زکوٰۃ ادا کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ کہنے لگا: یہ تو اچھی بات ہے، مگر میرے چند امراء ہیں، میں ان کے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا، امید ہے کہ میں مسلمان ہوجاؤں گا، اور ان کو بھی ساتھ لے آؤں گا۔

اس کے آنے سے پہلے ہی سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا کہ ایک آدمی آرہا ہے، جو شیطان کی زبان سے بات کرے گا، اور مکر وفریب کے ساتھ چلا جائے گا۔ جب چلا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ شخص کافر چہرہ لے کر داخل ہوا، اور دھوکہ باز کے پاؤں کے ذریعہ چلا گیا، اور یہ شخص مسلم نہیں ہے۔

جب یہ شخص مدینہ سے باہر نکلا تو وہاں باہر مسلمانوں کے جو جانور اونٹ وغیرہ چر رہے تھے انہیں ہانک کر لے گیا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اطلاع ملنے پر اس کا پیچھا کیا، مگر وہ نکل چکا تھا، اسے پکڑ نہ سکے۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرۃ القضاء کے موقع پر تشریف لے جارہے تھے تو یمامہ سے آئے ہوئے حجاج کی تلبیہ کی آواز سنی، جو اسی راستے سے جارہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ حطم ہے، اور اس کے ساتھی ہیں (حطم شریح بن ضبیعہ کا لقب ہے)۔ اُن لوگوں نے اُن جانوروں کے گلے میں قلادے یعنی پٹے ڈال رکھے تھے، جو مدینہ کے باہر چرنے والے جانوروں میں سے لُوٹ کرلے گئے تھے، اور ان لُوٹے ہوئے جانوروں کو بطور ہدی کعبہ شریف کی طرف لے جارہے تھے، اور اُن کے ساتھ بہت سا تجارت کا سامان بھی تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ حطم جارہا ہے، حج کے لئے نکلا ہے، آپ اجازت دیجئے، ہم

اس کو لوٹ لیں، اور اپنے اموال اس سے وصول کریں۔ سرور عالم ﷺ نے فرمایا کہ اس نے ہدی کے جانوروں کو قلادہ ڈال رکھا ہے، لہٰذا ان کا لوٹنا صحیح نہیں ہے۔ مسلمانوں نے کہا: (یہ تو کوئی رکاوٹ کی چیز معلوم نہیں ہوتی) یہ کام تو ہم جاہلیت میں کیا کرتے تھے، سرور عالم ﷺ نے انکار فرمایا، اور اجازت نہیں دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت ۔ لا نازل فرمائی، جس میں شعائر اللہ کی بے حرمتی سے منع فرمایا۔ [روح المعاني، مظهري]

شعائر اللہ کی تعریف:

شعائر اللہ، یعنی وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ذمہ نشان بندگی ٹھہرائے ہیں۔ [لغات القرآن] یعنی وہ حدود واحکام، فرائض واعمال، اوامر ونواہی، یا طرز فکر وعمل جو کہ دینِ الٰہی کے ساتھ مخصوص ہوں، اور اسے دوسرے باطل ادیان سے ممتاز کریں۔ حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے اپنی بے نظیر تالیف حجۃ اللہ البالغہ میں ایک مستقل باب میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے، ان کے جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہٗ نے اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

شعائر دراصل شعیرۃ یا شعارۃ کی جمع ہے، بمعنی نشانی وعلامت۔ شعائر اللہ عرف شریعت میں مکانات، ازمنہ، وعلامات واوقاتِ عبادت کو کہتے ہیں۔ پس عبادت کے مکانات سے مراد مثلاً کعبۃ اللہ شریف، عرفات، مزدلفہ، منیٰ، تینوں جمرات، صفا ومروہ اور تمام مساجد ہیں۔ ازمنہ سے مراد مثلاً رمضان، اشہر حرم، عید الفطر، عید الاضحیٰ۔ ایامِ تشریق اور جمعۃ المبارک ہیں۔ باقی علامات اس سے مراد، مثلاً اذان، اقامت، ختنہ، نماز باجماعت، نماز جمعہ اور نماز عیدین ہیں، کیونکہ ان سب چیزوں میں علامت کا معنی متحقق ہے۔ [تفسير عزيزي]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شعائر اللہ سے مراد مناسکِ حج ہیں۔ مشرکین حج بھی کرتے تھے، اور کعبہ شریف کی طرف جانوروں کو بطور ہدی لے جایا کرتے تھے۔ جب مسلمانوں نے ان کو لوٹنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا۔ اور حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ شعائر اللہ سے اللہ تعالیٰ کی حدود اور اوامر اور نواہی اور احکام وفرائض مراد ہیں۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: شعائر اللہ سے مراد پورا دین ہے، اور دین کے مقرر کردہ واجبات اور فرائض ہیں۔ امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ ودیگر محققین نے اسی قول کو سراہا، اور پسند کیا ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ شعائر اللہ سے صفا ومروہ اور وہ جانور مراد ہیں جو کعبہ شریف کی طرف بطور ہدی لے جائے جاتے ہیں۔ محققین حضرات کہتے ہیں کہ سب سے بڑے شعائر اللہ یہ ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ۔ (۲) کتاب اللہ الکریم۔ (۳) کعبۃ اللہ شریف۔ (۴) نماز، ان کے علاوہ تمام احکام شریعت درجہ بدرجہ شعائر اللہ کے افراد کہلاتے ہیں، جو دینِ الٰہی کے لئے امتیازی شان کے حامل ہیں۔ واللہ أعلم

شعائر اللہ کی تعظیم فرض ہے:

چنانچہ ارشاد ہے: ﴿لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی مقرر کردہ نشانیوں اور شعائر کی بے احترامی نہ کرو، اور شعائر اللہ کی بے حرمتی ایک تو یہ ہے کہ سرے سے ان احکام کو نظر انداز کر دیا جائے۔

دوسرا یہ ہے کہ ان پر عمل تو کریں مگر ادھورا اور ناقص عمل نہ ہو۔

تیسرا یہ کہ مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر کے آگے بڑھنے لگیں۔ ﴿لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ﴾ میں تینوں صورتوں سے منع فرمایا گیا ہے۔

یہی ہدایت قرآن کریم نے دوسرے مقام سورۃ الحج میں جاری فرمائی، ارشاد فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ [الحج: ۳۲] یعنی جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو وہ دلوں کے تقویٰ کا اثر ہے۔ آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں شعائر اللہ کی مخصوص اقسام، یعنی شعائر حج کی تفصیلات بتائی گئی ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا﴾ یعنی شہر حرام میں قتل وقتال کر کے اس کی بے حرمتی نہ کرو۔ اشہر حُرُم وہ چار مہینے ہیں جن میں باہمی جنگ کرنا شرعاً حرام تھا: ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم، اور رجب۔ بعد میں یہ حکم جمہور علماء کے نزدیک منسوخ ہو گیا۔ اور ہدی کی بے حرمتی سے بھی منع فرمایا۔ ہدی وہ جانور ہے جو کعبہ شریف کی طرف لے جایا جائے، اور حدودِ حرم میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ذبح کر دیا جائے۔

اور قَلَآئِد کی بے حرمتی سے بھی منع فرمایا۔ قَلَآئِد قلادۃ کی جمع ہے۔ ہدی کے جانوروں کے گلوں میں پٹے، رسی وغیرہ ڈال دیا کرتے تھے، تاکہ معلوم ہو کہ یہ ہدی ہے، اور کوئی اس سے تعرض نہ کرے۔ قلائد کی بے حرمتی کی ممانعت سے مراد یہ ہے کہ جن جانوروں کے گلے میں یہ پٹے پڑے ہوں ان کو لوٹا نہ جائے، ان کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ بعض مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ اس سے اصحاب قلائد، یعنی لوگ مراد ہیں، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں عرب کے لوگ اپنے تحفظ کی خاطر مکہ معظمہ کے درختوں کی چھال لے کر اپنے گلوں میں ڈال دیا کرتے تھے، جب اشہر الحرم گزر

جاتے اور لوگ گھروں کو واپس جانا چاہتے، تو اپنے گلوں میں اور جانوروں کے گلوں میں یہ پٹے ڈالے رکھتے تھے، تا کہ اپنے گھروں میں امن وسلامتی کے ساتھ پہنچ جائیں، اور ہر طرح سے محفوظ رہیں۔ اسی طرح فرمایا:

﴿وَلَآ اٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا﴾ جو لوگ بیت اللہ الحرام کا قصد کر کے حج وعمرہ کے لئے جارہے ہوں، ان کی بھی بے حرمتی نہ کرو، اور ان سے تعرض نہ کرو۔ آمِّیْنَ جمع مذکر اسم فاعل کا صیغہ ہے، بمعنی قصد کرنے والے لوگ۔ یہ حجاج اور معتمرین دونوں کو شامل ہے، ان کی صفت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے رب کا فضل اور اس کی رضامندی چاہتے ہیں۔ فضل سے مالِ تجارت کا نفع بھی مراد ہے، جیسے سورۃ البقرہ میں فرمایا: ﴿لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ [البقرة:۱۹۸] (تمہارے اوپر کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو)۔

اور رِضْوَان سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے۔ مشرکین جو حج کرتے تھے اپنے خیال میں وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے حج کرتے تھے، اور جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت تک مشرکین کو حج کرنے سے منع نہیں کیا گیا تھا، اور مکہ معظّمہ بھی فتح نہیں ہوا تھا۔ بعد میں جب (سنہ ۸ ہجری) میں مکہ معظّمہ فتح ہوگیا، اور (سنہ ۹) میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امارت میں حج ہوا، تو یہ اعلان فرمادیا: ’’اَلَا لَا یَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِک وَلَا یَطُوْفَنَّ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ‘‘، کہ خبردار! اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے، اور کوئی ننگا ہو کر بیت اللہ کا طواف نہ کرے۔ ارشاد ہوا: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ [التوبہ:۲۸] (اے ایمان والو! مشرکین ناپاک ہیں، سو مسجد حرام کے قریب نہ جائیں اس سال کے بعد) لہٰذا اب کسی کافر کو حج وعمرہ کرنے کی اجازت نہیں۔ اب اگر مشرک ہدی اور قلائد لے کر آئے گا تو مامون نہ ہوگا۔

- آیت کا مطلب مسلمانوں کے لئے اب بھی بدستور باقی ہے، مسلمان حج کرنے اور عمرہ کرنے والے اب بھی بلکہ قیامت تک مامون رہیں گے۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ جب تم حلال ہو جاؤ، یعنی قاعدہ شرعیہ کے مطابق احرام سے نکل جاؤ، تو شکار کرلو، اگر چاہو، کیونکہ یہ امر اباحت کے لئے ہے، کیونکہ احرام کی وجہ سے جو عارضی پابندی تھی وہ ختم ہوگئی۔ باقی تفاصیل کتب فقہ میں دیکھیں۔

☆☆☆

مسلمانوں کو بلند اخلاق اور عدل وانصاف کی تعلیم:

فرمایا: تمہیں کسی قوم کی دشمنی اور زیادتی ناانصافی پر آمادہ اور مجبور نہ کرے۔ ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا﴾ کہ تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس وجہ سے کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روک دیا (حدیبیہ کے مقام پر) یہ بات تمہیں کسی انتقامی کارروائی پر آمادہ نہ کرے، کہ تم زیادتی کرو۔

سنہ ٦ میں جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ڈیڑھ ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ صرف عمرہ کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے جارہے تھے، تو مشرکین مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عمرہ کرنے نہیں دیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محصر ہونے کی وجہ سے جانور ذبح کر کے احرام سے نکل گئے، اور مشرکین سے چند شرطوں پر صلح ہوگئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس مدینہ طیبہ تشریف لائے، اور اگلے سال عمرہ کی قضاء کی۔

مشرکینِ مکہ نے صلح کی بعض شرطوں کی خلاف ورزی کی، جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا لشکر لے کر ماہ رمضان سنہ ۸ میں مکہ معظمہ تشریف لے گئے، اور مکہ معظمہ فتح ہوا۔

اب جب مسلمانوں کے ہاتھ میں اقتدار آگیا، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مشرکین سے انتقامی بدلہ لینے پر قادر ہوئے، مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں منع فرمایا، کہ کسی قوم کی ظلم وزیادتی تمہیں ظلم وزیادتی پر آمادہ نہ کرے۔

جب مسجد حرام سے روکنے والے لوگوں کے بارے میں یہ ارشادِ عالی ہے کہ ان کی دشمنی تمہیں ظلم وزیادتی پر آمادہ نہ کرے، تو دنیاوی اعتبار سے جو رنجشیں اور دشمنیاں پیدا ہوجاتی ہیں ان کی وجہ سے کسی پر ظلم وزیادتی کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ اگر کوئی شخص ظلم کرے تو زیادہ سے زیادہ اس کے ظلم کے بقدر (یعنی برابر) بدلہ لیا جاسکتا ہے، مگر معاف کرنا بہتر ہے، اور یہی مسلمان کی شان ہے۔ ظلم کے بدلے ظلم کرنا یعنی جس سے کوئی تکلیف پہنچی ہے اس سے زیادہ تکلیف پہنچانا ہرگز جائز نہیں ہے۔

مسلمانوں پر فرض ہے کہ ہمیشہ تمام معاملات میں عدل وانصاف پر قائم رہیں، اور دوست و دشمن، اپنے پرائے سب کے ساتھ عدل ومساوات قائم کریں، اور یہ خصوصیت صرف اسلام کی ہے کہ دوست و دشمن کے ساتھ برابری کا سلوک قائم کرتا ہے، جبکہ ان سنہرے اصول سے اقوامِ عالم کا دامن یکسر خالی ہے۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ کہ آپس میں نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔ سبحان اللہ! یہ وہ صفاتِ عظیمہ ہیں جن کے نام سے ہمارے موجودہ زمانہ کی غیر اقوام واقف تک نہیں، اور لطف یہ ہے کہ اس آیت

کریمہ میں قرآن حکیم نے ایک ایسے پائیدار اصول اور بنیادی مسئلہ کے متعلق ایک حکیمانہ عالمگیر فیصلہ دیا ہے، جو پورے نظامِ عالم کا روح رواں ہے، اور جس پر انسان کی ہر صلاح وفلاح، بلکہ خود اس کی زندگی اور بقا موقوف ہے، وہ مسئلہ ہے باہمی تعاون وتناصر، رواداری کا۔

ہر ذی ہوش انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ اس جہاں کا پورا انتظام انسانوں کے باہمی تعاون وتناصر پر قائم ہے، اگر ایک انسان دوسرے انسان کی مدد نہ کرے تو کوئی اکیلا انسان خواہ وہ کتنا ہی عقلمند یا کتنا ہی زور آور یا مالدار ہو اپنی ضروریاتِ زندگی کو تنہا حاصل نہیں کرسکتا۔ اکیلا انسان نہ اپنی غذا کے لئے غلّہ اگانے سے لے کر کھانے کے قابل بنانے تک کے تمام مراحل کو طے کرسکتا ہے، نہ لباس وغیرہ کے لئے روئی کی کاشت سے لے کر اپنے بدن کے موافق کپڑا تیار کرنے تک بیشمار مسائل کا حل کرسکتا ہے، اور نہ اپنے بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرسکتا ہے۔

غرض ہر انسان اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں دوسرے ہزاروں لاکھوں انسانون کا محتاج ہے، ان کے باہمی تعاون وتناصر سے ہی ساری دنیا کا نظام چلتا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو یہ تعاون دنیوی زندگی ہی میں ضروری نہیں، مرنے سے لے کر قبر میں دفن ہونے تک کے سارے مراحل بھی اسی تعاون کے محتاج ہیں، بلکہ اس کے بعد بھی اپنے پیچھے رہنے والوں کی دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا محتاج رہتا ہے۔

ربّ العزّت جل شانہ اپنی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ سے اس جہاں کا ایسا محکم نظام بنایا ہے کہ ہر انسان کو دوسرے انسان کا محتاج بنادیا ہے۔ غریب آدمی پیسوں کے لئے مالدار کا محتاج ہے، اور بڑے سے بڑا مالدار بھی محنت ومشقت کے لئے غریب مزدور کا محتاج ہے۔ سوداگر گاہکوں کا محتاج ہے، اور گاہک سوداگروں کا۔ مکان بنانے والا معمار اور لوہار کا محتاج ہے، اور یہ سب اس کے محتاج ہیں۔ اسی طرح دوسرے چھوٹے اور بڑے تمام معاملات میں قدم قدم پر احتیاجات کا سلسلہ شب وروز جاری رہتا ہے۔

اگر یہ ہمہ گیر احتیاج نہ ہوتی، اور تعاون محض اخلاقی برتری پر ہوجاتا، تو کون کسی کا کام کرتا؟ اس کا وہی حشر ہوتا جو عام اخلاقی قدروں کا اس دنیا میں ہورہا ہے۔ اور اگر یہ تقسیمِ کار کسی حکومت یا بین الاقوامی ادارہ کی طرف سے بصورتِ قانون کردی جاتی، تو اس کا بھی وہی انجام ہوتا جو آج پوری دنیا میں دنیا کے قانون اور ضابطوں کا ہورہا ہے، کہ قانون ایکٹوں میں محفوظ ہے، اور بازار اور دفاتر میں رشوت، بے جا رعایت، اقربا پروری، ریاکاری، فریب دھوکہ اور فرض ناشناسی، اور بے عملی کا راج چل رہا ہے۔ مشہور محاورہ ہے قانون در کتاب لاقانونیت در شباب، یہ محض حکیم

الحکماء قادرِ مطلق کا الٰہی نظام ہے کہ مختلف لوگوں کے دلوں میں مختلف کاروبار کی امنگ اور صلاحیت پیدا کردی، اور انہوں نے اپنی اپنی زندگی کا محور اور مطلب یا غرض وغایت اسی کام کو بنالیا، اور اسی کو اپنی خوشحالی اور ترقی کا ذریعہ سمجھا، اور اسی میں لگ گیا۔

ہر یکے را بہر کارے ساختند ☆ میل اورا در دلش انداختند

یہ ربّ العزّت عزّوجل نے نظامِ عالم کی ترقی وخوشحالی اور بندوں کی آبادی صلاح وفلاح اور اصلاح معاشرہ کی بقاء کے لئے تکوینی طور پر یہ پائیدار تقسیمِ کار جاری فرمایا ہے، اور ہر مقصد کے لئے رجالِ کار پیدا فرمائے ہیں، ورنہ اگر کوئی بین الاقوامی ادارہ یا کوئی حکومت لوگوں میں تقسیمِ کار کرتی، اور کسی جماعت کو بڑھئی کے کام کے لئے کسی کو کاشت کے لئے، کسی کو اینٹ بنانے کے لئے، کسی کو سڑکوں، کسی کو خاکروب وغیرہ کے لئے مقرر کرتی، تو کون اس کے حکم کی ایسی اطاعت کرتا کہ دن کا چین اور رات کی نیند خراب کر کے اس کام میں تندہی سے لگ جاتا؟ اگر کوئی روزِ روشن کی طرح کا فرق دیکھنا چاہے تو حکومتی باغوں اور نجی باغوں، اور حکومتی کارخانوں اور شخصی کارخانوں، اور اسی طرح حکومتی نظامِ مواصلات اور لوگوں کی ذاتی مواصلات میں آسمان وزمین کا واضح فرق دیکھ سکتا ہے۔

خالقِ کائنات جو کہ خالقِ نظام بھی ہے، اس پاک ذات نے ہر انسان کو جس کام کے لئے پیدا کیا ہے، اس کام کا شوق ورغبت اس کے دل میں پیدا فرمایا ہے، وہ شخص بغیر کسی قانونی مجبوری کے اس خدمت ہی کو اپنا مقصدِ زندگی سمجھتا ہے، اور پوری رغبت کے ساتھ اسے انجام دیتا ہے، اور اس کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ اس خدائی نظامِ محکم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ساری ضروریاتِ زندگی چند پیسے خرچ کرنے سے بآسانی کم قیمت پر حاصل ہوجاتی ہیں۔

پکا پکایا کھانا، سلا سلایا کپڑا بنا بنایا برتن اور فرنیچر، تیار شدہ مکان، تیار سبزی، فروٹ وغیرہ ہزاروں اشیاء سب کچھ ایک انسان چند پیسے خرچ کر کے بازار سے حاصل کرلیتا ہے، اگر یہ قدرتی تکوینی نظام نہ ہوتا تو ایک کروڑ پتی انسان اپنی پوری دولت لٹا کر بھی گندم کا ایک دانہ حاصل نہ کرسکتا، بازار سے ماچس کا ڈبہ ایک روپیہ میں خریدو، اگر اسے خود بنانا چاہو تو سو روپیہ میں نہیں بنتا۔

اسی قدرتی نظام کا نتیجہ ہے کہ آپ کسی ہوٹل میں قیام پذیر ہوکر جس جس چیز سے فائدہ اٹھاتے ہیں اگر ان کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آٹا امریکہ کا، گھی پنجاب کا، گوشت سندھ کا، مصالحہ ہندوستان کا، برتن اور فرنیچر مختلف علاقوں

کا، پکانے والے باورچی اور بیرے کہاں کہاں کے، یہ سب آپ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، اور ایک لقمہ جو آپ کے منہ تک پہنچتا ہے اس میں لاکھوں مشینوں، جانوروں اور انسانوں نے کام کیا ہے، تب یہ آپ کے منہ کا ذائقہ بنا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرے تکوینی حقائق کو بھی شامل کیا جائے، مثلاً موسمی تبدیلیاں، سردی گرمی، مختلف ہوائیں، دھوپ، چاندنی روشنی بادل، گرج چمک وغیرہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تکوینی طور پر پوری کائنات کی گردش اور نشیب و فراز انسانی فلاح و بقاء اور خوشحالی و ترقی اور نشوونما کے لئے ہے، اور اسی تکوینی امور کی تنظیم و نظام سے دنیا قائم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری دنیا کا نظام باہمی تعلق پر قائم ہے۔ لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے، کہ اگر جرائم، چوری، ڈاکہ، قتل و غارتگری وغیرہ کے لئے یہ باہمی تعاون ہونے لگے، چوروں اور ڈاکوؤں کی بڑی بڑی اور منظم بڑی قوی جماعتیں بن جائیں، تو یہی تعاون و تناصر اس جہاں کے سارے نظام کو درہم برہم بھی کرسکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ باہمی تعاون ایک دودھاری تلوار ہے، جو اپنے اوپر بھی چل سکتی ہے، اور نظامِ عالم کو برباد بھی کرسکتی ہے۔ اس لئے اس کا سدِّ باب فرماتے ہوئے ارشاد ہوا:

﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ اور نہ مدد کرو گناہ پر، اور ظلم پر۔ یہ الفاظ دراصل تصویر کے دوسرے رخ کے سدِ باب اور بندش کے لئے ہیں، تاکہ نظامِ عالم اور بقاءِ عالم مجروح نہ ہو۔ قرآن حکیم کا یہ دوسرا حکم کتنا اہم اور معیاری ہے؟ جسے معاشرے کی اصلاح اور خوشحالی کی کنجی قرار دینا عین انصاف اور تمام حقائق کا ترجمان قرار دیا جاسکتا ہے، کہ جلبِ منفعت اس وقت صحیح اور بہتر ہوسکتا ہے کہ جس کے ساتھ دفعِ مضرت کا پہلو بھی نمایاں ہو۔

پس اسی چیز کے پیشِ نظر دنیا کے عقلمندوں نے اپنے تحفظ کے لئے مختلف نظریوں پر مبنی خاص خاص جماعتوں یا قوموں یا تنظیموں کی بنیاد ڈالی، کہ ایک جماعت یا ایک قوم، یا ایک تنظیم کے خلاف جب کوئی دوسری جماعت یا دوسری تنظیم یا قوم حملہ آور ہو تو یہ سب ان کے مقابلہ میں باہمی تعاون کی قوت کو استعمال کرکے مدافعت کریں، اور ہر قسم کے فتنہ و فساد کا راستہ روکیں۔

قومیتوں کی تقسیم غیر شرعی اور حرام ہے:

رئیس المتکلمین علامہ عبدالکریم شہرستانی رحمۃ اللہ علیہ کی ملل و نحل میں ہے کہ شروع میں جب تک انسانی آبادی زیادہ نہیں تھی تو دنیا کی چار سمتوں کے اعتبار سے چار قومیں بن گئی تھیں: مشرقی، مغربی، جنوبی، شمالی۔ ان میں سے ہر ایک سمت کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم، اور دوسری کو دوسری قوم سمجھتے تھے۔ اور اسی بنیاد پر تعاون و تناصر قائم کرلیا

کرتے تھے۔

اس کے بعد جب دنیا کی آبادی بڑھ گئی تو ہر سمت کے لوگوں میں نسبی اور خاندانی بنیادوں پر قومیت اور اجتماعیت کا تصور ایک اصول بن گیا۔ عرب کا سارا نظام اسی نسبی اور قبائلی بنیاد پر تھا۔ اسی پر جنگیں لڑا کرتے تھے۔ قریش، بنوھاشم ایک قوم، بنوتمیم دوسری قوم، بنوخزاعہ تیسری قوم، اسی طرح سینکڑوں قبائل اور ان کی شاخیں ہوتی تھیں۔

یورپی اقوام کے دورِ جدید نے نہ کوئی اپنا نسب باقی رکھا، نہ دنیا کے انساب کو کچھ سمجھا۔ جب دنیا میں ان کا عروج ہوا تو نسبی اور قومی و قبائلی تقسیمیں اور قومیتیں ختم کر کے ان کی جگہ علاقائی، صوبائی، وطنی اور لسانی بنیادوں پر انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے الگ الگ قومیں بنائی گئیں۔

آج ساری دنیا میں یہی سکہ چل رہا ہے، یہاں تک کہ یہ جادو مسلمانوں پر بھی چل گیا۔ عربی، ترکی، پنجابی، بلوچی، عراقی، ایرانی، افغانی، سندھی، ہندی وغیرہ کی الگ الگ قومیں بن گئیں۔ حکومت کے سب کاروبار انہی بنیادوں پر چلائے گئے، یہاں تک کہ صوبائی عصبیت نے زہرِ قاتل بن کر مسلمانوں میں افتراق و دشمنیوں کا سبب بن کر انہیں ملّتِ اسلامیہ کے دینی و مذہبی اقدار سے سراسر محروم کیا۔ وطنی و لسانی تعصّبات نے ان کے رگ و پے میں سرایت کر کے انہیں ایک بے رحمی کے معاشرے میں دھکیل دیا۔ سیاسی لیڈروں نے قرآن و سنت کی پاکیزہ تعلیمات کی جگہ نفرتوں کی تخم ریزی کر کے امت کے اتحاد کو پارہ پارہ کیا۔ بہت سے اچھے خاصے پابند صوم وصلوٰۃ مذہبی لوگ بھی اس سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے، اور اسلامی محبتوں سے محروم ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

قومیت و اجتماعیت کے متعلق قرآنی تعلیم:

قرآن کریم نے انسان کو پھر بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ سورۂ نساء کی ابتدائی آیات میں یہ واضح فرمایا کہ تم سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہو۔ سرورِ عالم ﷺ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے حجۃ الوداع کے خطبہ میں (یہ خطبہ ساری انسانیت کے لئے عالمگیر پیغام تھا) اعلان فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر، کسی گورے سفید رنگ والے کو کالے سیاہ فام پر کوئی فضیلت و برتری نہیں ہے۔ فضیلت و برتری کا مدار تقویٰ اور اطاعتِ الٰہی پر ہے۔

قرآن کریم نے بھی سارے انسانوں (مسلمانوں) کو ایک ہی اخوت کے رشتے میں منسلک فرما کر اعلان فرمایا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ [الحجرات: ۱۰] (بیشک مؤمن لوگ آپس میں بھائی بھائی ہیں) یہ پکی بات ہے کہ سارے مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے ایک حبشی کالے شخص کو ترکی، عربی،

مصری، قریشی، ہاشمی، رومی لوگوں کے ساتھ برابر کا بھائی قرار دے کر، رنگ، نسل ذات پات کا فرق ہمیشہ کے لئے کالعدم فرمایا۔ قومیت اور برادری اس بنیاد پر قائم فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ماننے والوں کو ایک قوم قرار دیا (مسلم قوم) اور نہ ماننے والوں کو دوسری اور جدا قوم (کفار قوم) قرار دے دیا۔ یہی وہ بنیاد تھی جس نے ابوجہل، ابولہب اور کفارِ قریش کے خاندانی رشتوں کو سرور عالم ﷺ سے توڑ کر الگ کر دیا، اور بلال حبشی اور صہیب رومی رضی اللہ عنہما کا رشتہ سرور عالم ﷺ کے ساتھ جوڑ دیا۔

حسن از بصرہ بلال از حبش صہیب از روم ☆ زخاک مکہ ابوجہل این چہ بوالعجبی ست

امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شہادت کی وفات سے قبل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اجتماعی محفل میں حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن، حضرت سعد، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت سعید رضی اللہ عنہم یہ سارے عشرہٴ مبشرہ کے خوش قسمت حضرات ہیں، ان کی موجودگی میں نماز جنازہ کے متعلق حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کرتے ہیں، آخر اس کا کوئی داعی اور مخفی راز ہی ہوگا جسے امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے سمجھا ہوگا، وہ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ﴾ [البقرة:۲۰۷] (اور لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو اپنے آپ کو بیچ دیتا ہے) آیت کریمہ کے تحت بیان ہوا، وہاں دیکھا جائے۔

غرض یہ ہے کہ اسلام میں فضیلت و برتری کا معیار نہ مال ونسب ہے، اور اقتدار و دنیوی عزّت وشرف، اور نہ ہی شکل وصورت اور قومیت ہے، بلکہ بِرّ وَتَقْوٰی اور اعمالِ صالحہ ہی اصلی معیار ہیں۔ پس تعاون وتناصر صرف خیر اور تقویٰ کی باتوں میں منحصر ہونا چاہئے، جو چیزیں خیر اور تقویٰ کے دائرہ سے خارج ہوں وہاں تعاون وتناصر ناجائز اور حرام ہوگا۔

سید الانبیاء ﷺ کی ساری تعلیمات کا یہی خلاصہ ہے کہ خود متقی بنو، اور برّ وتقویٰ پر کاربند رہو، اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم اور دعوت دو، اسی طرح شر ومعاصی سے خود بھی دور رہو، اور دوسروں کو بھی دور رہنے کی دعوت اور تعلیم دو۔ اگر کسی آدمی نے کسی نیک کام کی بنیاد رکھ دی، یا لوگوں کو کسی نیکی پر جمع کر کے آمادہ کیا، تو جب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا یہ سارے اثرات اور نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھے جائیں گے۔ اگر کسی شخص نے کسی برائی کی بنیاد رکھی، یا لوگوں کو برائی پر آمادہ کیا، تو جب تک یہ برائی موجود رہے گی اس کے نامۂ اعمال میں برائیوں کی بھرمار ہوگی۔

حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ جو شخص کسی نیکی کا راستہ بتادے تو اس کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے اس نیکی کو اس

نے خود کیا ہو۔ [ابن کثیر]

اسی طرح حدیث میں ارشاد ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لئے چلا وہ شخص اسلام سے نکل گیا، یعنی اسلام سے خارج ہوگیا۔ [ابن کثیر، طبرانی]

اسی حدیث اور دیگر اس طرح کی بہت سی حدیثوں کی بنیاد سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ نے ظالم اور بے انصاف حاکموں، سرداروں، وزیروں کی ملازمت سے اور ان کے عہدہ قبول کرنے سے سخت منع کیا ہے، کہ اس ملازمت اور عہدہ کی وجہ سے ان کے ظلم وستم اور دیگر گناہوں پر امداد اور اعانت ہوتی ہے، تفسیر روح المعانی نے: ﴿فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ﴾ [القصص: ۱۷] (میں ہرگز مجرم لوگوں کا مددگار نہیں بنوں گا) آیت کریمہ کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ کہاں ہیں ظالم لوگ اور ان کے مددگار؟ یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے ظالموں کی دوات اور قلم کو درست کیا ہے وہ بھی، پھر یہ سب ایک لوہے کے تابوت میں جمع کر کے جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔ [روح المعانی]

بہت سے نادان وناعاقبت اندیش لوگ دوسروں کی دنیا بنانے کے لئے اپنی آخرت تباہ کرتے ہیں، یعنی ظلم اور گناہ پر مدد کرتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں غیر اسلامی ناپاک جمہوریت کا یہی حال ہے کہ اس غیر شرعی جمہوریت کے ذریعہ وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو انہیں نہیں کرنا چاہئے تھا۔ غیبتوں اور بہتانوں، رشوتوں، تہمتوں کا بازار چاروں طرف گرم کر کے لوگوں سے ووٹ لیتے ہیں، جب اِقتدار کی کرسی تک رسائی حاصل کرتے ہیں تو پھر سب بھول جاتے ہیں، اور لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انہیں کے متعلق ارشاد نبوی ہے: "مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَبْدٌ أَذْهَبَ اٰخِرَتَهُ بِدُنْيَا غَيْرِهٖ" [ابن ماجہ]

یہ ان بیوقوف اور احمق کارکنوں یا ملازموں یا ناداں شاگرد ومریدوں کے بارے میں ہے کہ اپنے بڑوں کی دنیا اور اقتدار کی خاطر اپنی آخرت برباد کرتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی حماقت ہے کہ دنیا دوسرے کی بنائی اور آخرت کی بربادی اپنے سر تھوپ لی؟ حدیث شریف نے انہی لوگوں کو "شر الناس" بدترین لوگ بتایا۔ یہ سب 'تَعَاوُنْ عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" کے زمرہ میں شامل ہوگا، جو کہ حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

آیت کریمہ کے آخر میں تنبیہ کے طور پر ارشاد فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ اے لوگو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، یہ زندگی عارضی ہے، ہمیشہ کے

لئے نہیں ہے، یہ دنیا ایک روز ختم ہو جائے گی، اس کے ختم ہونے سے پہلے موجودہ دور کے لوگ اپنی موت مر جائیں گے، اس ذرا سی زندگی کے لئے ابدی زندگی کو خراب کرنا کوئی دانشمندی نہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سخت ترین عذاب سے بچنے کا واحد ذریعہ بِرّ وتقوٰی ہے، اسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر اپناؤ، اور اِثم و عُدوَان اور دیگر تمام معصیتوں سے احتراز واجتناب کرو، یہ تب ممکن ہوگا جب تم تقویٰ اختیار کرو۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ
الْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا
ذَكَّيْتُمْ ۗ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۚ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ

ترجمہ: حرام کیا گیا تم پر مردہ جانور، اور خون، اور خنزیر کا گوشت، اور وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا، اور وہ جانور جو گلا گھٹنے سے مر جائے، اور وہ جانور جو کسی ضرب سے مر جائے، اور وہ جانور جو اوپر سے گر کر مر جائے، اور وہ جانور جو کسی سے ٹکرا کر مر جائے، اور وہ جانور جسے کسی درندہ نے کھالیا، مگر وہ جسے تم ذبح کر لو۔ اور حرام کیا گیا وہ جانور جو ذبح کیا گیا پرستش گاہوں پر، اور یہ بھی حرام کیا گیا کہ تقسیم کرو تیروں کے ذریعہ سے، یہ سب گناہ کے کام ہیں۔

معارف ومنازل

گزشتہ آیت میں حلال جانوروں کا بیان تھا، وہاں فرمایا تھا کہ: ﴿اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ اب آیت کریمہ میں حرام جانوروں کا بیان ہو رہا ہے، جن جانوروں کا گوشت انسان کے لئے مضر ہے، خواہ جسمانی طور پر کہ اس سے انسان کے بدن میں بیماری کا خطرہ ہے، یا روحانی طور پر کہ اس سے انسان کے اخلاق یا قلبی کیفیات خراب ہونے کا خطرہ ہے، ان کو قرآن کریم نے خبائث قرار دیا، اور حرام کر دیا، اور جن جانوروں میں کوئی جسمانی یا روحانی مضرت نہیں ہے، قرآن کریم نے ان کو طیب پاکیزہ قرار دیا، اور حلال کر دیا۔

اس آیت کریمہ میں حرام کردہ جانوروں کا بیان ہو رہا ہے: پہلا مردار جانور ہے، مردار سے مراد وہ جانور ہے جو بغیر ذبح کے کسی بیماری کے سبب یا طبعی موت مر جائے، ایسے مردار جانور کا گوشت طبعی موت کی وجہ سے طبی طور پر بھی انسان کے لئے سخت مضر ہے، اور روحانی وشرعی طور پر بھی حرام ہے۔

البتہ! حدیث شریف میں سرور عالم ﷺ نے دو چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے: ایک مچھلی، دوسرے ٹڈی کہ ان کے لئے ذبح شرط نہیں ہے۔ [مشکوٰۃ وغیرہ]

دوسری چیز جس کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ خون ہے، اس سے "دَمِ مَسفُوح" یعنی بہتا ہوا خون مراد ہے، جس کا بیان آئندہ آنے والا ہے: ﴿اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا﴾ [الأنعام: ۱۴۵]۔ ''مَسْفُوْحًا'' کی قید لگانے سے تلی اور جگر مستثنیٰ قرار پائیں گے، جو کہ حلال ہیں اور دَمِ مَسفُوح کے اخراج کے بعد جو خون بوٹیوں میں رہ جاتا ہے، وہ بھی حلال ہے۔

مسئلہ:

خون کا جس طرح کھانا پینا حرام ہے اسی طرح اس کی فروخت بھی حرام ہے۔ بعض لوگ جو ہسپتالوں میں خون فروخت کرتے ہیں، وہ قطعاً حرام ہے۔

تیسری چیز ﴿لَحْمِ خِنْزِیْر﴾ یعنی سور کا گوشت، اور اس کے سارے اجزاء، ہڈی، چربی، چرم، پٹھے وغیرہ سب حرام اور نجس العین ہیں۔ جو قومیں خنزیر کھانے پالنے کے عادی ہیں اوّل درجہ کے بے حیا اور ناپاک ہیں، وہ خنزیر اور کتوں سے بڑھ کر بے غیرت ہیں۔

چوتھی چیز ﴿وَمَا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ وہ جانور جو غیر اللہ کے لئے نامزد کیا گیا ہو۔ پھر اگر ذبح کے وقت بھی اس پر غیر اللہ کا نام لیا ہے تو یہ کھلا شرک اور بدترین کفر ہے، اور جانور بالاتفاق حرام ہے، جیسا کہ مشرکینِ عرب اپنے بتوں کے نام پر ذبح کیا کرتے تھے، یا آج کل کے بدعقیدہ بدعتی لوگ پیروں، فقیروں، قبروں اور اولیاء کرام کے مزاروں پر جانور ذبح کرتے ہیں، یہ سب حرام ہیں، اور ذبح کرنے والے مشرک ہیں۔

اور اگر بوقت ذبح اللہ تعالیٰ کا نام لیا مگر جانور کسی غیر اللہ کے نام پر نذر کیا ہو، اور اس کی رضامندی کے لئے قربان کیا ہو، تو جمہور علماء وفقہاء نے اس کو بھی حرام قرار دیا ہے، اور ﴿وَمَا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ کا اس پر اطلاق کیا ہے، کیونکہ حرام جانور بسم اللہ اور اللہ اکبر کہنے سے ہرگز حلال نہیں ہوتا۔

پانچویں چیز ﴿مُنْخَنِقَه﴾ یعنی وہ جانور حرام ہے جسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہو، یا خود کسی رسی یا جال میں پھنس کر دم گھٹنے سے مر گیا ہو، "منخنقة اور موقوذة" اگرچہ "میتة" میں داخل ہیں، مگر جاہلیت کے لوگ انہیں حلال سمجھتے تھے، اس لئے خصوصی ذکر کیا گیا۔

چھٹی چیز ﴿مَوْقُوْذَة﴾ یعنی وہ جانور جو کسی ضربِ شدید سے ہلاک ہو، جیسے لاٹھی، پتھر وغیرہ سے مارا گیا ہو۔

اس میں وہ جانور بھی داخل ہے جس کو شکاری نے تیر مارا، لیکن تیر دھار کی طرف سے نہ لگا، ویسے ہی ضرب سے مرجائے، وہ بھی مَوْقُوْذَة ہے، اگرچہ شکاری نے بسم اللہ پڑھ کر تیر پھینکا ہو۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں ایسے تیر سے شکار کرتا ہوں جس میں پر نہیں ہوتے (تو کیا اس کا کھانا حلال ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس جانور کو تیرا تیر زخمی کر دے اس کو کھالے، اور جس جانور کو تیرے مذکورہ تیر کا چوڑائی والا حصہ قتل کر دے تو وہ مَوْقُوْذَة اور حرام ہے۔ [متفق عليه]

بندوق کا شکار:

بندوق کی گولی سے جو شکار ہلاک ہو جائے وہ بھی حرام ہے، اگرچہ بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر گولی ماری گئی ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ بندوق کے ذریعہ قتل شدہ جانور "مَوْقُوْذَة" کے حکم میں ہے۔ [جصاص] ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم کا یہی متفقہ فیصلہ ہے۔ [قرطبي]

معلوم ہونا چاہئے کہ بندقہ اور بندوق دو الگ الگ چیزیں ہیں، بندقہ جس کو عام عرف میں "غلیل" کہتے ہیں وہ واقعی پتھر ہوتا ہے، جس کی ضرب شدید اور سخت ہوتی ہے، اس کے لگنے سے جانور زخمی نہیں ہوتا، اور وہ شدتِ ضرب سے مرجاتا ہے۔ تو موقوذہ ہی شمار ہوگا، جو حرام ہے۔ مگر آج کل جو بندوق سے لوگ پرندے یا چھوٹے بڑے جانور شکار کرتے ہیں، یہ بندوق کی گولی شکار کو زخمی کرتی ہے، اور پھاڑ دیتی ہے، اور یہ سب بارود مصالحہ کے زور سے ہوتا ہے، نہ کہ ضربِ شدید سے، لہٰذا اسے موقوذہ میں شمار کرنا اچھی بات نہیں ہے، بلکہ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت پر حمل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جہاں معراض کی تیزی والا شکار حلال ہوا، تو گولی اور معراض دونوں کی تیزی برابر اور یکساں زخم کرنے والے ہیں۔ واللہ اعلم

ساتویں چیز: ﴿مُتَرَدِّيَة﴾ ہے، یعنی وہ جانور جو کسی پہاڑ، مکان، ٹیلہ یا کسی بھی اونچی اور بلندی سے گر کر مر جائے، اس جانور کا کھانا بھی حرام ہے۔

آٹھویں: ﴿نَطِيْحَة﴾ یعنی وہ جانور جو کسی تصادم، ٹکر سے ہلاک ہو گیا، جیسے بعض اوقات جانور آپس میں لڑتے، اور ایک دوسرے کو سینگوں سے مارتے ہیں، یا ریل گاڑی، موٹر وغیرہ کے ٹکر سے کوئی جانور ہلاک ہو، یہ بھی حرام ہوگا۔

نویں چیز: ﴿وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ﴾ وہ جانور جس کو درندوں نے چیر پھاڑ کر کھایا ہو، یا ہلاک کیا ہو، تو یہ بھی حرام

ہو گیا، کیونکہ ذبحِ شرعی سے اس کو موت نہیں آئی، حرام چیزوں کی مذکورہ نو قسمیں بیان فرمانے کے بعد:

''اِلَّا مَا ذَكَّيْتُم'' فرمایا۔ یہ استثناء ''مُنْخَنِقَة، مَوْقُوْذَة، مُتَرَدِّيَة، نَطِيْحَة، وَمَا اَكَلَ السَّبُعُ'' سب سے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس جانور کا گلا گھٹ گیا، یا اوپر سے گر پڑا، یا کسی لاٹھی مارنے سے گر گیا، یا ٹکر لگنے سے مرنے لگا، یا کسی درندہ سے چھڑا لیا، اور اس میں ابھی تک اتنی زندگی باقی ہے جو ذبح کے وقت ہوتی ہے، تو یہ جانور ذبحِ شرعی کرنے کی وجہ سے حلال ہو جائے گا۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک بھیڑئے نے ایک بکری کو اپنے دانت سے پکڑ لیا، پھر وہ کسی طرح سے چھوٹ گئی، جسے مالکوں نے تیز پتھر سے ذبح کیا، پھر آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے کی اجازت دیدی۔ [النسائي]

یاد رہے! یہ استثناء شروع کی چار قسموں سے متعلق نہیں ہو سکتا، کیونکہ ''میتة'' اور ''دم'' میں تو اس کا امکان ہی نہیں، اور خنزیر اور ﴿مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ الله﴾ اپنی ذات سے حرام ہیں، ان میں ذبح کرنا نہ کرنا برابر ہے، اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بصری، حضرت قتادہ اور دیگر سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ استثناء ابتدائی چار کے بعد یعنی ''مُنْخَنِقَة'' اور اس کے مابعد سے متعلق ہے، جیسے ابھی اس کا مطلب بیان ہوا۔

دسویں وہ جانور حرام ہے جو ﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ جو نُصب پر ذبح کیا گیا ہو۔ نُصب وہ پتھر ہیں جو جاہلیت میں کعبۃ اللہ شریف کے ارد گرد کھڑے کئے ہوئے تھے، اور اہلِ جاہلیت ان کی پوجا کرتے تھے، اور ان کے پاس جانوروں کی قربانی کرتے تھے، اور ان کی رضا و قرب کے خواہاں ہوتے تھے، جیسے آج کل بدعتی مشرک، پیروں کے مزاروں پر بکثرت نذر و نیاز کے جانور ذبح کرتے ہیں۔ میری معلومات میں کہ ضلع چاٹی کے پیر بلانوش کے مزار پر ایک شخص نے ایک ہی مہینہ میں ایک سو گایوں کی قربانی کر کے ذبح کرایا تھا، وغیرہ۔

گیارہویں چیز جس کو آیت کریمہ نے حرام قرار دے کر بیان فرمایا وہ ''اِسْتِقْسَام بِالْاَزْلَام'' ہے۔ اہلِ عرب کا جاہلیت میں طریقہ تھا کہ تیروں کے ذریعہ اونٹ کا گوشت تقسیم کیا کرتے تھے، اور یہ ان کا ایک قسم کا قُمار، یعنی جوا ہوتا تھا، جس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک اونٹ میں دس آدمی برابر کے شریک ہوتے تھے، پھر اس اونٹ کے گوشت کو تیروں کے ذریعہ تقسیم کرتے تھے۔ اور یہ دس تیر ہوتے تھے، سات تیروں پر حصے لکھے ہوتے تھے، اور تین تیر ایسے

ہوتے تھے، جن کا کوئی حصہ مقرر نہ تھا، پھران دس تیروں کو کسی تھیلی میں ڈالتے تھے، اور شرکاء کے نام سے ایک ایک تیر نکالتے تھے، جن تین تیروں کا کوئی حصہ مقرر نہ تھا، جس کے نام پر ان تیروں میں سے کوئی نکل آتا تھا اسے کوئی حصہ نہ ملتا تھا، حالانکہ اونٹ کی قیمت میں وہ بھی شریک تھا، اس کا حصہ دوسروں کو مل جاتا تھا، اور اس طرح سے یہ شخص جوئے میں ہار جاتا تھا، اور دوسرے حصہ پانے والے لوگ جیت جاتے تھے۔

پس راجح تفسیر یہی ہے اور محرماتِ طعام کے ذکر کے ساتھ اس کی مناسبت بھی ہے۔ بعض علماء اور مفسرین نے اس کی دوسری تفسیر یہ بیان کی ہے کہ کعبۃ اللہ شریف کے پاس مشرکین کا مشہور بت ''ھُبَل'' رکھا ہوتا تھا، اس کے پاس ایک بہت خوبصورت چمڑے کا تھیلہ ہوتا تھا، اس میں تقریباً سات تیر رکھے ہوئے ہوتے تھے، کسی پر ''اَمَرَنِي رَبِّي'' کسی پر ''نَهَانِي رَبِّي''، کسی پر ''نعم'' کسی پر ''لا، عَلٰی هٰذَا الْقِيَاس'' کچھ کلمات لکھے ہوئے ہوتے تھے، جب کوئی سفر پر جاتا، یا کسی کے ساتھ کوئی عقد یا بیع وشرا کرتا، یا کسی کو کوئی قرض دیتا، یا نکاح وطلاق کا کوئی ارادہ کرتا، تو ''ہبل'' بت کے مجاور کے پاس آتا، کچھ نذرانہ پیش کرتا، وہ تیروں کو گھما کر ایک تیر نکالتا، اگر اس پر ''نعم'' لکھا ہوا ہوتا۔ یا ''لا'' یا کوئی اور، تو اسی پر فیصلہ کر کے وہ عمل کرتا، علیٰ ہذا القیاس، وہ کاہنوں کے پاس جاتے اور ان سے غیب کی باتیں معلوم کرتے، پھر اس پر عمل کرتے تھے۔

قرآن کریم نے ان تمام غیر شرعی تدبیروں کو حرام قرار دیا، اور سختی سے ان کی مذمت کی، چنانچہ فرمایا:

﴿ذٰلِكُمْ فِسْقٌ﴾ یہ چیزیں جو بیان ہوئیں، ان سب کو خالق و مالک جل شانہ نے فسق اور حرام قرار دیا ہے، اور ان پر عمل کرنا فسق اور گناہ کبیرہ اور شرک ہے۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳

ترجمہ: آج کافر تمہارے دین سے ناامید ہو گئے، سو اُن سے نہ ڈرو، اور مجھ سے ڈرو، آج میں نے پورا کر دیا تمہارا دین، اور میں نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر اختیار

کرنے کے لئے پسند کرلیا، سو جو کوئی شخص مجبور ہو جائے سخت بھوک میں جو گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو، سو یقیناً اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے ③

معارف ومنازل

یہ آیت ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع کے موقع پر یوم عرفہ میں سرور عالم ﷺ پر نازل ہوئی، جبکہ مکہ معظمہ اور تقریباً سارا عرب فتح ہو چکا تھا، پورے جزیرۃ العرب پر اسلامی قانون جاری ہو چکا تھا۔ اس پر فرمایا کہ اب سے پہلے جو مشرکین یہ منصوبے بنا رہے تھے کہ مسلمانوں کو دبائیں گے، انہیں صفحۂ ہستی سے مٹادیں گے، کیونکہ وہ ہمارے مقابلے میں کم بھی ہیں، اور کمزور بھی، لہٰذا ان کے منصوبے اور تدابیر خاک میں مل گئے، اور سارا عرب اسلام کا حلقہ بگوش ہوا، اب تمہارے دشمن مشرکین دب گئے، اور مایوس ہو گئے، اب تم ان سے کسی قسم کا خوف نہ کرو، صرف اپنے ربّ سے ڈرو، اور شب وروز اس کی اطاعت وعبادت میں لگ جاؤ۔

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ اس آیت کے نزول کی خاص شان ہے، اور عظیم خوشخبری بھی ہے۔ عرفہ کا دن ہے، جو تمام سال کے دنوں میں سید الایام ہے، اور اتفاقاً یوم جمعۃ المبارک بھی ہے، مقامِ وقوف میدان عرفات کے جبلِ رحمت کے قریب ہے۔ اس پہاڑی پر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک، اور پھر آپ علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء ﷺ تک سارے انبیاء علیہم السلام کا قیام رہا ہے۔ یہ نزولِ رحمت کا مخصوص پہاڑی مقام ہے، اور وقت عصر کا ہے، جو کہ عام اوقات سے متبرک ہے، خاص کر یومِ جمعہ میں کہ قبولیتِ دعاء کی گھڑی ہے۔ بہت سی روایات سے ثابت ہے کہ ساعۃ اجابۃ یہی بعد العصر کا وقت ہے۔

یومِ جمعہ میں آج حجِ اکبر کے لئے مسلمانوں کا سب سے پہلا بڑا اجتماع، اور پہلا عظیم اجتماع، جس کی مثال کبھی دیکھنے میں نہیں آئی ہو، اس اجتماع میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شریک رہے۔ سید الانبیاء رحمۃ للعلمین ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جبلِ رحمت کے دامن میں بڑی بڑی ضخیم چٹانوں پر اپنی ناقہ "عضباء" پر سوار تھے، جب ان برکات وفضائل اور رحمتوں کے سایہ میں اس آیت کریمہ کا نزول ہو رہا تھا، تو ایک عجیب وغریب کیفیتوں کے ساتھ فضاء میں انوار وبرکات کی چمک کے ساتھ نورانیت پھیل رہی تھی، جسے لوگ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے، اور حسب دستور وحی کا ثقل اور بوجھ ایسا نمایاں محسوس ہو رہا تھا کہ آپ ﷺ کی اونٹنی برداشت نہ کرتے ہوئے بے بسی اور مجبوری کی وجہ سے بیٹھ گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت تقریباً قرآن حکیم کی آخری آیت ہے، اس کے بعد کوئی آیت احکام سے متعلق نازل نہیں ہوئی، صرف ترغیب وترہیب کی چند آیتیں ہیں، جن کا نزول اس آیت کے بعد بتلایا گیا ہے۔

اس آیت کے نزول کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فِدَاہُ اَرْوَاحنا) اس دنیا میں صرف اکیاسی روز جلوہ افروز رہے، کیونکہ سنہ ۱۰ ہجری کی نویں ذی الحجہ میں یہ آیت نازل ہوئی، اور سنہ ۱۱ ہجری کی بارہویں ربیع الاول کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جہاں سے رخصت ہوئے، اور ملاء اعلیٰ کو تشریف لے گئے۔ یہ آیت جو اس خاص شان اور اہتمام سے نازل ہوئی اس کا مفہوم بھی ملّتِ اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک بشارتِ کبریٰ اور عظیم خوشخبری اور بھاری انعام اور اسلام کا طغرائے امتیاز ہے، جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ:

دینِ الٰہی اور نعمتِ الٰہی کا انتہائی معیار جو اس عالم میں بنی نوع انسان کو عطا ہونے والا تھا، آج اس کی تکمیل ہوگئی۔ گویا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے جو دینِ حق اور نعمتِ الٰہیہ کا نزول اور ترویج شروع کی گئی تھی، اور ہر زمانہ اور ہر خطہ کے مناسبِ حال اس نعمت کا ایک حصہ اولادِ آدم علیہ السلام کو عطا ہوتا رہا، آج وہ دینِ حق اور نعمتِ الٰہیہ مکمل صورت میں رحمۃ للعٰلمین خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو عطا کر دی گئی، اور اس عظیم نعمت کی تکمیل کر دی گئی۔

اس میں تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کے زمرہ میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سعادت وشرف اور امتیازی شان کا تو اظہار ہے ہی، اس کے ساتھ تمام امتوں کے مقابلہ میں امت محمدیہ کی بھی ایک خاص امتیازی شان کا واضح ثبوت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ چند علماء یہود حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ تمہارے قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو اگر یہود پر نازل ہوتی تو وہ اس کے نزول کا ایک جشن عید مناتے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ وہ کونسی آیت ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ یہ آیت: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ: ہاں! ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت کس جگہ اور کس دن نازل ہوئی؟ اس دن ہمارے لئے دو عیدیں ہیں: ایک عید یومِ عرفہ۔ دوم یومِ جمعہ۔

مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں دن مبارک اور عظمت والے ہیں، جہاں ہم لوگ بڑے اہتمام وشوق کے ساتھ عبادت واطاعت کے جشن اور خوشی مناتے ہیں۔ فرمایا:

﴿اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ﴾ کہ آج کافر تمہارے دین کی طرف سے ناامید ہو گئے، اب تک تو وہ سمجھتے تھے کہ اسلام چند دن کا مہمان ہے، اور جو لوگ مسلمان ہوئے ہیں وہ عنقریب دینِ اسلام چھوڑ کر پھر ہمارے ساتھ آئیں گے، لیکن اب وہ بالکل ناامید ہو گئے، اور سمجھ گئے ہیں کہ یہ شمع نہ بجھنے والی ہے، اور نہ مٹنے والی، اور یہ پروانے اسے چھوڑنے والے بھی نہیں، یہ مسلسل ترقی کناں بڑھتے رہیں گے، اور ہمیں کاٹتے رہیں گے، پس یہ تمہارے مٹانے اور تم پر غالب آنے سے ناامید ہو گئے ہیں، اب انہیں یہ خیال نہیں رہا کہ تمہارے دین پر غالب ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا جو حقیقی وعدہ تھا کہ دینِ اسلام کو سارے ادیان پر غالب کرے گا وہ اس نے پورا فرمایا، اور کافروں نے اس کا مشاہدہ کر لیا (فتح مکہ کے بعد)۔

اب جبکہ اللہ تعالیٰ شانہ نے غلبہ عطا فرما دیا، تو کافروں سے جو ظاہری ڈر تھا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوا، اب تو بس ظاہراً و باطناً اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرنا ہے، پس اسی کی فرمانبرداری کرو، اور اس کی نافرمانی سے ڈرو، اور بچو۔

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ﴾ پس تم ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو۔ پھر فرمایا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر لیا، یعنی پورا کر دیا، جس دینِ حق کا روزِ ازل فیصلہ ہو چکا تھا، رفتہ رفتہ چلتے چلتے آج اس کی تکمیل کر دی گئی، ہر چیز کی تکمیل ہو گئی، کوئی ادنیٰ جزء ایسا نہیں رہا جس کی نشاندہی نہ ہو۔ تمام انبیاء علیہم السلام اپنی بعثت کے جو جو مقاصد لے کر دنیا میں تشریف لاتے رہے، آج ان سب کے مقاصد کی تکمیل ہو گئی۔

دین اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے:

دینِ اسلام انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، اجتماعی اور انفرادی اعمال و احوال سب کے بارے میں احکام موجود ہیں، آپس کے حقوق، خاندانی حقوق، ہمسایہ پڑوسیوں کے حقوق، خدمت گاروں، ملازموں کے حقوق، مہمان و میزبان دوست، رفیقِ کار و احباب کے حقوق، والدین، اولاد اور عزیز و رشتہ داروں کے حقوق، جنگ و صلح، دشمنوں کے ساتھ برتاؤ، عدل اور انصاف کے تقاضے، ریاستی، ملکی، شہری حقوق، مردوں، عورتوں بچوں، پاگلوں، بیماروں، بیواؤں، یتیموں مسکینوں، محتاجوں، امراء خلفاء، سرداروں، حاکموں، عوام الناس کے حقوق، آداب و اخلاق، حسن سلوک اور اچھا برتاؤ، حتّٰی کہ مویشیوں، مال و حیوانات جانوروں کے حقوق، اگر ان میں سے ہر ایک کو الگ عنوان دے کر بیان کیا جائے تو کئی دفتر شاید تیار ہوں۔ یہ سارے کے سارے قرآن و سنت اور کتب فقہ وغیرہ میں نہایت

تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

کوئی اس ایک بات سے اندازہ لگا کر اسلامی تعلیمات کی جامعیت کا اقرار کر لے کہ صرف حنفی مسلک کے مسائل احکامات وجزئیات تیرہ لاکھ ہیں، باقی تینوں فقہوں کے مسائل ان سے الگ ہیں۔ اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، اعتقادات، عبادات، بدنیہ مالیہ، معاملات، معاشرت، آداب، اخلاق سپہ گری، سیاست وغیرہ بے شمار چیزوں کا نام ہے۔ اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو، بجز چند تصورات اور خیالات کے دوسرے ادیان میں کچھ بھی نہیں، اگر اسلام میں کسی آنکھیں بند کرنے والے کو کچھ بھی نظر نہ آئے تو یہ دین کا جامع وکامل ہونا ہی ایک منصف مزاج سمجھ دار انسان کے لئے اسلام کے دینِ حق ہونے کی دلیل کے طور پر کافی ہے۔

اس اعتبار سے انبیاء سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام کا دین بھی کامل تھا، کہ اس کو اختیار کرنے پر ان کے اپنے اپنے زمانے میں آخرت کی نجات کا مدار تھا، اور اس کو اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کافی تھا، سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دین لائے، وہ تمام انسانوں تمام جہانوں اور آئندہ آنے والے تمام زمانوں کے لئے ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا آخری دین ہے، اور سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے ادیان کا مجموعہ اور خلاصہ ہے۔ اس کے بعد قیامت تک کوئی دین آنے والا نہیں ہے، جو اس کو منسوخ کردے، اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، اور ہر شعبے کے احکام کا جامع اور مظہر ہے۔ دنیا کتنی بھی ترقی کر جائے، اور کیسے ہی حوادث اور طرح طرح کے نوازل کا ظہور ہو جائے، اور سائنسی ایجادات کی بھر مار ہو جائے، ان سب کا حکم شرعی پہلے سے موجود ہے، اور قرآن وسنت میں ان کے جوابات موجود ہیں، انہی عالمگیر اور عمومی ہدایات وفرامین کی وجہ سے اس کو کامل فرمایا۔

﴿وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ﴾ اور پوری کر دی میں نے تم پر اپنی نعمت۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ مخاطبین پر نعمت کا پورا فرمانا اس طرح ہوا کہ ان کے لئے مکہ معظّمہ فتح ہوا، اور وہ مکہ معظّمہ میں امن وامان اور غلبہ اسلام کے ساتھ داخل ہوئے، اور جاہلیت کی چیزیں ختم کر دی گئیں، اور مشرکین کو حج کرنے اور مسجد حرام میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔

اِتمام نعمت کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ ہدایت عام ہوگئی، اسلام کا غلبہ ہوا، کفر وشرک کا راج ختم ہو گیا، اور کفر کا زور ٹوٹ گیا۔ اور ﴿وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِىۡ عَلَيۡكُمۡ﴾ [البقرۃ: ۱۵۰] (اور تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں) کا وعدہ

پورا ہو گیا، اور امورِ دین کی تکمیل ہو گئی، وغیرہ۔ پھر فرمایا:

﴿وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ اور میں نے تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو برحق دینِ اسلام ہے اس کو تمہارے لئے انتخاب فرمایا، اور تمہیں اس پر چلا کر اپنے فضل و کرم سے نوازا، کیونکہ دینِ اسلام ہی امن وامان اور آخرت کی نجات کا ضامن ہے، جو اسلام پر ہو گا وہ جنتی ہو گا، اور جسے اسلام نصیب نہ ہو وہ اصحابِ نار میں سے ہو گا۔ اسلام کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی دوسرا دین قابلِ قبول نہ ہو گا۔ کوئی دوسرے دین والا چاہے کیسی ہی عبادتیں کرے، اور ریاضتیں کرے، ہزاروں زہد و قناعت بجالائے، تارکِ دنیا ہو، راہب و درویش ہو، وہ دوزخی ہی ہو گا، جیسے سورۃ الغاشیہ کی تفسیر میں لکھا جائے گا۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اعمال آئیں گے، نماز آئے گی، وہ کہے گی کہ اے ربّ! میں نماز ہوں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو گا: تو خیر پر ہے، پھر صدقہ آئے گا، وہ عرض کرے گا: اے ربّ! میں صدقہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو گا: تو خیر پر ہے۔ پھر روزہ آئے گا، اور عرض کرے گا: اے ربّ! میں روزہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو گا: تو خیر پر ہے۔ پھر دوسرے اعمال اسی طرح آتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو گا: تم خیر پر ہو۔ پھر اسلام آئے گا، وہ عرض کرے گا: اے ربّ! آپ سلام ہیں، اور میں اسلام ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو گا: تو خیر پر ہے، تیری ہی وجہ سے میں آج مؤاخذہ کروں گا، (جس نے تجھے قبول نہ کیا تھا وہ خیر سے محروم ہو گا، اور عذاب میں جائے گا) اور تیری ہی وجہ سے آج عطا کروں گا (آج جو انعامات ملتے ہیں تیری ہی وجہ سے ملیں گے)۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ [آل عمران: ۸۵] (اور جو کوئی شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کا طلبگار ہو گا تو اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہو گا)۔ [رواہ احمد کما فی المشکوۃ]

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ علی صَاحِبِهَا الصَّلٰوةُ وَالسلام والتَّحِيَة کو تین خصوصی انعام عطا فرمائے:

(۱) اِکمالِ دین۔ (۲) اِتمامِ نعمت۔ (۳) نعمتِ اسلام، جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، اور جس کے بغیر کسی کے لئے آخرت میں کسی نعمت کا کوئی حصہ نہیں۔ امت محمدیہ افضل الامم ہے، اس کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) افضل الانبیاء

والمرسلین ہیں، اس کے پاس افضل الکتب ہے، اس کا دین افضل الادیان اور اکمل الادیان ہے، جو رہتی دنیا تک کے لئے ہے، اس میں جامعیت ہے، نسخ اور تبدیلی نہیں ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ دینِ الٰہی اسلام ربّ العزّت کا واحد پسندیدہ دین ہے، جو کہ رہتی دنیا تک ہر قسم کی تحریف وتبدیلی سے محفوظ رہے گا۔

تحریف کرنے والے آئیں گے، ہر طرح تحریف کرنے کی کوشش کریں گے، اور کر رہے ہیں، مگر اوپر سے ایک ایسا تکوینی نظام قائم ہے جو کہ ہر قسم کی تبدیلیوں کے لئے ایک ننگی تلوار ہے، اللہ تعالیٰ شانہ ہر زمانہ ہر خطہ میں ایسے رِجال کار پیدا فرمارہے ہیں جن کے متعلق سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ اس علم کو ہر صحیح جانشین سے آگے ثقہ لوگ لیتے رہیں گے، وہ اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف، جھوٹوں کی منگھڑت باتوں اور جاہلوں کی (باطل) تاویل دور کرتے رہیں گے۔ [مشکوۃ]

جب آیت بالا نازل ہوئی تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رونے لگے، اور انہوں نے اس آیت سے یہ سمجھا کہ اب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مزید اس دنیا میں تشریف نہیں رکھیں گے، کیونکہ جس مقصد کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے وہ پورا ہوگیا، اور انہوں نے یہ بھی سمجھا کہ کسی چیز کی تکمیل کے بعد عموماً اس کا انحطاط شروع ہوتا ہے، اور اس میں نقصانات پیدا ہوتے ہیں۔ دراصل فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حقیقت میں ٹھیک سمجھا، چنانچہ نزول آیت کے اکیاسی (۸۱) روز بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، اور سلسلۂ وحی بند ہوا۔ [روح المعاني] پھر فرمایا:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (پس جو شخص مجبور ہو جائے، سخت بھوک میں، جو گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو، سو یقیناً اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے)۔ اوپر جو حرام جانوروں کی تفصیل مذکور ہوئی، ان کے بارے میں اب یہاں ارشاد ہے کہ جو شخص سخت بھوک سے ایسا مجبور ہو کہ جان کا خطرہ ہو، اور اس کے پاس حلال چیزوں میں سے کھانے اور جان بچانے کے لئے کچھ بھی نہ ہو، تو وہ حرام چیزوں میں سے اپنی جان بچانے کے لئے اتنا سا (تھوڑا سا) کھالے کہ جس سے جان بچ جائے، اور صرف اتنا ہی کھا سکتا ہے جس سے جان بچ جائے، مزید مجبوری کو گناہ کا ذریعہ نہ بنائے، یعنی جان بچانے کی مقدار سے زیادہ نہ کھائے، حد سے تجاوز کر کے گناہ کا ارتکاب نہ کرے، اسی کو ﴿غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ﴾ سے تعبیر فرمایا۔ اور سورۂ بقرہ رکوع ۲۱ اور سورۂ نحل رکوع ۱۵ میں ﴿غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ﴾ سے تعبیر فرمایا۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے۔ آخر میں فرمایا:

﴿فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ یعنی ضروری مقدار میں کھانا اگرچہ حرام ہی ہے، مگر اضطراری مجبوری کی وجہ

سے معاف ہے۔اس میں ان نام نہاد برائے نام بے عمل مسلمانوں کے لئے تنبیہ ہے جو دنیا اور مال کی محبت میں شرابیوں کی طرح مست ہیں، نہ حلال وحرام کا فرق جانتے ہیں، اور نہ جائز وناجائز کا، گدھے کتوں کی طرح سب کچھ بغیر مجبوری کے جمع کر کے کھاتے ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ
مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ
عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴

ترجمہ: وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کیا ہے جو ان کے لئے حلال کیا گیا ہے؟ آپ فرمادیجئے: حلال کی گئی ہیں تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں، اور جن شکاری جانوروں کو تم نے تعلیم دی اس حال میں کہ تم ان کو سدھار نے والے ہو، ان کو سکھاتے ہو، اس کے ذریعہ سے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں سکھایا۔سو اس میں سے کھالو، جو انہوں نے تمہارے لئے روک لیا، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بیشک اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے ۝۴

معارف ومنازل

صاحب روح المعانی طیبات کا مطلب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: پاکیزہ چیزیں وہ ہیں جن کو طبائعِ سلیمہ پاکیزہ جانتی ہیں، اور ناپاک نہیں سمجھتی ہیں، اور جن سے نفرت نہیں کرتیں۔اس کے عموم میں ہر پاکیزہ چیز کا حلال ہونا، اور ہر خبیث چیز کا حرام ہونا داخل ہے۔اور یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جس انسان کی طبیعت پاکیزہ ہوگی وہی پاکیزہ چیزوں میں رغبت کرے گا، اور خبیث چیزوں سے اسے نفرت ہوگی۔

بہت سے ملکوں میں ایسے انسان بستے ہیں جو ہر چیز کو کھا جاتے ہیں، خنزیر کھانے والے تو معلوم ہی ہیں، اسے عموماً نصرانی عیسائی لوگ رغبت سے کھاتے ہیں، لیکن بندر، کتا، چوہا، سانپ، گرگٹ، چھپکلی اور ہر طرح کے کیڑے مکوڑے کھانے والے لوگ کروڑوں اربوں کی تعداد میں مشرقی ایشیا کے ملکوں میں موجود ہیں، چونکہ ان لوگوں کے طبائعِ سلیمہ اور طیبہ نہیں ہیں اس لئے ان کی طبعی رغبت اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ جو کچھ کھاتے ہیں وہ طیب و پاکیزہ ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور وحی الٰہی سے محروم ہونے کی وجہ سے کفر میں بھی غرق ہیں، اور ان کی روحوں پر تہہ بہ تہہ ظلمت اور گندگی چڑھ گئی ہے، اس لئے وہ ہر جانور، کیڑے مکوڑے کھانے کے لئے تیار ہیں۔

طیبات کی تخصیص سے تمام ناپاکیوں اور غلاظتوں کے کھانے کی حرمت بھی معلوم ہوگئی۔ حشرات الارض (کیڑے مکوڑے) کھانا بھی حرام ہیں، کیونکہ طبائعِ سلیمہ کے نزدیک یہ طیبات سے خارج ہیں، پاکیزہ طبیعتیں ان سے نفرت کرتی ہیں، بلکہ ان کے تصور سے بھی گھبرا جاتی ہیں۔

حلال اور حرام کی تفصیل:

حلال جانوروں کی تفصیل تو عموماً سب لوگوں کو معلوم ہے، گائے، بھینس، اونٹ بکری بھیڑ سب میں مذکر و مؤنث، نر و مادہ، یہ پالتو جانوروں میں سے ہیں، اور جنگلی جانوروں میں ہرن، نیل گائے خرگوش وغیرہ، پرندوں میں کبوتر، فاختہ، مرغی، بطخ، بلبل، مور، تیتر، بٹیر، مرغابی، چڑیا، طوطا، مینا وغیرہ سب حلال ہیں، اور جو پرندہ شکار کر کے کھاتا ہو، ٹانگوں والا ہو یا پروں والا، اس کو کھانا حرام ہے۔

غذا کھانے والے انسان کے اخلاق پر غذا کا اثر پڑتا ہی ہے، پھاڑ چیر کر کھانے والے جانوروں کو کھایا جائے تو انسان میں بھی اسی طرح کے اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے ان کے کھانے سے منع فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر ایسے جانور کے کھانے سے منع فرمایا جو اپنے دانتوں سے چیر پھاڑ کر کھاتا ہے (جیسے، شیر، چیتا، بھیڑیا، بجو، بلی، کتا، لومڑی وغیرہ) اور ہر ایسے پرندہ کے کھانے سے منع فرمایا جو پنجے والا ہو، یعنی پنجے سے دوسرے جانور کو شکار کر کے کھاتا ہو۔ [مسلم]

گِدھ، چیل مردار کھاتے ہیں، وہ بھی حرام ہیں۔ حضرت خزیمہ بن جزء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بجّو کے کھانے کے متعلق دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بجّو کو بھی کوئی کھائے گا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھیڑیئے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا بھیڑیئے کو ایسا شخص کھائے گا جس میں کوئی خیر ہو؟ [ترمذی]

سنن ابن ماجہ میں بجّو کی جگہ لومڑی کا ذکر ہے۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھنے والوں نے قنفذ (یعنی سیہ) کا ذکر کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: خَبِيثَةٌ مِنَ الْخَبَائِثِ۔ یہ خبیث چیزوں میں سے ایک خبیث ہے۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پالتو گدھوں کے کھانے سے بھی منع کیا، اور اس کے ساتھ

عورتوں کے متعہ کو بھی حرام قرار دیا۔[متفق علیه] اسی طرح خچر بھی حرام جانور ہے۔اسی طرح بندروغیرہ جو کہ سارے نجس اور خبیث ہیں۔

شکاری جانوروں کے احکام:

اس کے بعد شکاری جانوروں کا ذکر فرمایا، جو شکاری جانوروں کے ذریعہ شکار کیا جائے۔ عام طور سے مخصوص نسل کے کتوں کو سکھانے اور سدھارنے کا رواج ہے؛ ان کے ذریعہ شکار کیا جاتا ہے۔ الجوارح سے مراد شکار کرنے والے جانور ہیں، جیسے کتا، باز، شکرا وغیرہ۔ اس آیت کریمہ میں شکاری جانور کے متعلق چار شرطیں مذکور ہیں:

(۱) وہ شکاری جانور جس کو تم نے تعلیم دی ہو، وہ تمہارے کہنے پر جائے اور واپس آجائے۔

(۲) تم نے اپنے ارادے سے شکار پر چھوڑا ہو۔

(۳) تم نے بسم اللہ پڑھ کر اس کو چھوڑا ہو۔

(۴) وہ شکار کو خود نہ کھائے، بلکہ تمہارے لئے لے آئے، یا رکھے۔

(۵) وہ شکاری جانور اس کو زخمی بھی کردے۔

پہلی چاروں شرطیں تمام ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ آخری شرط صرف امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے۔ واضح ہو کہ تعلیم یافتہ جانور کی علامت یہ ہے کہ مالک کے کہنے پر حملہ کرے، اور اس کے منع کرنے سے رک جائے، جب یہ حالت کم از کم تین مرتبہ تجربہ میں آجائے تو وہ تعلیم یافتہ سمجھا جائے گا، ورنہ نہیں۔

خلاصہ بحث:

آیت کریمہ نے طیبات کے حلال ہونے کا واضح بیان کر کے یہ بتلادیا کہ انسان جو کہ اشرف المخلوقات کے منصب پر فائز ہے عموماً، اور مسلمان قوم خصوصاً اتنا قابلِ احترام ہے کہ جس غذا اور خوراک سے اس کی نشوونما ہوتی ہے وہ مکمل پاکیزہ ہو، تاکہ اس کے بدن جسم کے سارے اعضاء اور اس کے دل ودماغ اور اخلاق پر اچھے پسندیدہ اثرات مرتب ہوں۔

سورۂ اعراف میں بھی اس کی وضاحت کے ساتھ طیبات کی ضد، یعنی خبائث کا تذکرہ فرما کر اشارہ فرمایا کہ پاکیزہ خوراک پاکیزہ لوگوں کے لئے اور خبائث ناپاک لوگوں کے لئے ارشاد ہے: ﴿يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ [الأعراف:۱۵۷] یعنی حلال کرتا ہے ان کے لئے طیبات، اور حرام کرتا ہے ان پر خبائث۔ اس

میں طیبات کے بالمقابل خبائث لاکران دونوں لفظوں کی حقیقت دونوں قوموں کے لئے واضح کردی گئی۔

دوسرے مقام پر مزید وضاحت فرمائی ارشاد ہے: ﴿يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾ [المؤمنون: ۵۱] (اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ، اور نیک عمل کرو)۔ اس کی تشریح آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

لغت میں طیبات صاف، ستھری پاکیزہ چیزوں کو کہا جاتا ہے، اور خبائث اس کے بالمقابل گندی اور ناپاک و قابلِ نفرت چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس لئے آیت کے اس جملہ نے یہ بتلادیا کہ جتنی چیزیں صاف، ستھری، مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لئے حلال کی گئیں، اور جو گندی قابلِ نفرت اور مضر چیزیں ہیں وہ حرام کی گئی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان دوسرے جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصدِ زندگی دنیا میں کھانے پینے سونے جاگنے اور جینے مرنے تک محدود ہو، بلکہ اس کو قدرت نے اسے مخدومِ جہاں، سردارِ کائنات کسی خاص مقصد سے بنایا ہے، اور وہ مقصد اعلیٰ، پاکیزہ اخلاق و نیک اعمال کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، اسی لئے بداخلاق انسان درحقیقت انسان کہلانے کے قابل اور حقدار نہیں ہے۔

اسی لئے قرآن حکیم نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا: ﴿أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ [الأعراف: ۱۷۹] (وہ لوگ جانوروں جیسے ہیں، بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں)۔ اور جب انسان کی انسانیت کا مدار اصلاحِ اخلاق پر ہو تو ضروری ہے کہ جتنی چیزیں انسانی اخلاق کو گندہ اور خراب کرنے والی ہیں ان سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ انسان کے اخلاق پر اس کے گردوپیش کی چیزوں سے انسانی اخلاق متاثر ہوتے ہیں، تو جو چیزیں انسان کے بدن کا جزو بنتی ہیں ان سے اخلاق کس قدر متاثر ہوں گے؟ اس لئے کھانے پینے کی ساری چیزوں میں اس کی احتیاط لازمی ہوئی۔ چوری، ڈاکہ، رشوت، سود، قمار وغیرہ کی حرام آمدنی جس کے بدن کا جزو بنے گی وہ لازمی طور پر اس کو انسانیت سے دور اور شیطانیت سے قریب کردے گی، اسی لئے فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾ [المؤمنون: ۵۱] (اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ، اور نیک عمل کرو)۔

عملِ صالح کے ساتھ اُکل حلال کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ اُکل حلال کے بغیر عملِ صالح متصور نہیں، بالخصوص گوشت، جو انسانی بدن کا جزوِ اہم بنتا ہے، اس میں اس کی احتیاط سب سے زیادہ ضروری ہے، کہ کوئی ایسا گوشت اس کی غذا میں شامل نہ ہو جو اس کے اخلاق کو خراب کرے۔ اسی طرح وہ گوشت جو جسمانی طور پر انسان کے لئے مضر ہے

کہ بیماری اور ہلاکت کے جراثیم اس میں ہیں، اس سے انسان کے پرہیز کا ضروری ہونا تو سب جانتے ہیں۔

جتنی چیزیں شریعت نے خبائث قرار دی ہیں وہ یقینی طور پر انسان کے جسم یا روح یا دونوں کو خراب کرنے والی، اور انسانی جان یا اخلاق کو تباہ کرنے والی ہیں، اس لئے ان کو حرام کر دیا گیا۔ اس کے بالمقابل طیبات سے انسان کے جسم و روح کی تربیت اور اخلاقِ فاضلہ کی نشو ونما ہوتی ہے، ان کو حلال قرار دیا گیا۔ الغرض قرآن کریم نے حلّت و حرمت کا فلسفہ بتلا دیا، اور اصول و بنیاد بھی۔

اب یہ بات کہ کونسی چیزیں طیبات، یعنی صاف، ستھری، مفید اور مرغوب ہیں؟ اور کونسی خبائث، یعنی گندی، مضر، اور قابلِ نفرت ہیں؟ اس کا اصل فیصلہ طبائعِ سلیمہ کی رغبت و نفرت پر ہے، یہی وجہ ہے کہ جن جانوروں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے ہر زمانہ کے سلیم الطبع انسان ان کو گندہ اور قابلِ نفرت سمجھتے رہے ہیں، جیسے مردار جانور، خون۔

البتہ! بعض اوقات جاہلانہ رسوم طبیعت پر غالب آجاتی ہیں تو اچھے اور برے کی تمیز اُٹھ جاتی ہے، یا بعض چیزوں کا خبث مخفی ہوتا ہے، ایسے معاملات میں انبیاء علیہم السلام کا فیصلہ سب کے لئے حجت ہے، کیونکہ افرادِ انسانی میں سب سے زیادہ سلیم الطبع انسان انبیاء علیہم السلام ہیں، جن کو اللہ جل شانہ نے مخصوص طور پر فطرتِ سلیمہ سے نوازا، اور ان کی تربیت کا خود تکفّل فرمایا، ان کے گرد و پیش اپنے فرشتوں کا پہرہ لگا دیا، جس سے ان کے قلب و دماغ اور اخلاق کسی غلط ماحول سے متاثر نہیں ہوسکتے۔

انہوں نے جن چیزوں کو خبائث قرار دیا وہ حقیقۃً خبائث ہیں، اور جن کو طیبات قرار دیا وہ حقیقۃً طیبات ہیں۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک ہر پیغمبر نے مردار جانور اور خنزیر وغیرہ کو حرام کرنے کا اپنے اپنے وقت میں اعلان فرمایا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ایسی خبائث ہیں کہ ہر زمانے سلیم الطبع حضرات نے ان کو گندی، ناپاک اور مضر چیز سمجھا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں فرمایا ہے کہ جتنے جانور شریعت اسلام نے حرام قرار دیئے ہیں ان سب پر غور کیا جائے تو سمٹ کر یہ سب دو اصولوں کے تحت آجاتے ہیں: ایک یہ کہ کوئی جانور اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے خبیث ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کے ذبح کا طریقہ غلط ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ذبیحہ کے بجائے ''میتۃ'' یعنی مردار قرار دیا جائے گا۔ اس سورۂ مائدہ کی تیسری آیت میں جن نو چیزوں کو حرام بتلایا وہ یہ ہیں:

(۱) مردار جانور۔ (۲) دم مسفوح۔ (۳) سور کا گوشت۔ (۴) مذبوحہ لغیر اللہ۔ (۵) جو گلا گھٹنے سے

مرجائے۔(٦) جو چوٹ کھا کر مرجائے۔(٧) اوپر سے گر کر مرجائے۔(٨) جو سینگ مارنے سے مرجائے۔(٩) وہ جانور جس کو درندہ پھاڑ کھائے۔(١٠) وہ جانور جو کسی تھان پر ذبح کیا جائے۔

ان میں خنزیر قسمِ اول میں داخل ہے، یعنی اپنی ذات اور فطرت کے اعتبار سے خبیث ہے، باقی اقسام قسمِ دوئم میں داخل ہیں۔ قسم اول ہو یا قسم دوئم ان کی حرمت منصوص اور قطعی ہے، ان کے علاوہ بہت سے جانور ایسے ہیں جن کی حرمت احادیث مبارکہ سے ثابت ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے وضاحت کے ساتھ بیان کیا، خاص کر وہ جانور جن کی شکل پر اللہ تعالیٰ نے نافرماں قوموں کو مسخ فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہے:﴿وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيرَ﴾[المائدة: ٦٠] (اور ان میں سے بعض کو بندر اور سور بنا دیا)۔

ایک حدیث میں ممسوح جانوروں کی فہرست میں چوہے کو بھی شامل کیا گیا ہے۔[بخاري]

فائدہ:

یہاں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ انسان جو کچھ کھاتا پیتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں، مگر جانوروں کے سوا کسی اور چیز کے کھانے پکانے پر یہ پابندی نہیں کہ بسم اللہ یا اللہ اکبر کہہ کر ہی پکایا جائے کہ اس کے بغیر وہ حلال ہی نہ ہو۔ البتہ بسم اللہ پڑھنا استحبابی ہے، اور نہ پڑھنے سے چیز حرام نہیں ہوتی۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جاندار ہونے میں انسان اور دوسرے حلال جانور سب برابر ہیں، پس جب انسان کسی اپنے جیسے جاندار جانور کو اپنے لئے ذبح کرتا ہے، تو اسے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ یا اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے، ورنہ جانور حرام ہوگا۔ اور یہ بات دوسرے ماکولات اور مشروبات میں نہیں، لہٰذا وہاں یہ حکم بھی نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اہلِ شرک مذبوحہ جانور پر اپنے بتوں کا نام لیتے ہیں، اہلِ اسلام کو حکم ہوا کہ تم اپنے ربّ کا نام لے کر ذبح کیا کرو۔ یہ وجہ نہایت اہم بھی ہے اور معقول بھی۔ پوری تفصیل سورۂ انعام میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ
طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْۤ

اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۠ ۵

ترجمہ: آج تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کردی گئیں، اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی، ان کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے، اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے۔ اور پاک دامن عورتیں جو مسلمان ہیں اور وہ پاک دامن عورتیں جو ان لوگوں میں سے ہیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تمہارے لئے حلال ہیں، جبکہ تم ان کو ان کے مہر دے دو، اس طریقہ پر کہ تم پاک دامنی اختیار کرنے والے ہو، خفیہ طریقہ پر دوستی کرنے والے نہ ہو۔ اور جو کوئی شخص ایمان کا انکار کردے تو اس کے اعمال اکارت ہوگئے، اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا ۵

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں گزشتہ سے متعلق چند احکام کا بیان ہے (بطورِ ضابطہ اور قانون)۔ اول بات یہ ہے کہ پاکیزہ چیزوں کے حلال کئے جانے کا دوبارہ ذکر ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ حکم ابدی اور ناقابلِ تنسیخ ہے۔ دوئم یہ کہ تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی ان کا کھانا (ذبیحہ) تمہارے لئے حلال ہے، جن لوگوں کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی ان سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں، اور ان کے کھانے کی چیزوں سے ان کا ذبیحہ مراد ہے، کیونکہ عام کھانا تو غیر مسلم کے ہاتھ کا بھی جائز ہے۔

یہود و نصاریٰ اگر بسم اللہ پڑھ کر کسی جانور کو ذبح کریں، جس جانور کا کھانا اسلام میں حلال ہے، اور پھر اس گوشت میں سے مسلمانوں کو کھلائیں، تو مسلمانوں کے لئے حلال ہے۔ یہ حکم یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ کے ساتھ متعلق ہے۔ مطلق کھانا مثلاً روٹی چاول، ترکاری، پھل، سبزی، مصالحہ، چائے وغیرہ مراد نہیں ہے، اس میں اہلِ کتاب کی تخصیص نہیں۔

زمانۂ رسالت اور اس سے پہلے اہلِ کتاب مسلمانوں کی طرح ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کرتے تھے، یہ ذبیحہ ہمارے لئے اسی شرط پر حلال ہے، پس اگر اہلِ کتاب اللہ تعالیٰ کا نام نہ لے، اور اسی طرح ذبح کرے جیسے آج کل کے اہلِ کتاب کرتے ہیں تو پھر وہ ذبیحہ حرام ہی ہوگا۔

اہلِ کتاب کیا اگر ذبیحہ پر مسلمان نے قصداً و ارادۃً بسم اللہ ترک کی، تو مسلمان کا ذبیحہ بھی حرام ہوگا۔ البتہ بھول جانے پر حرمت لازم نہیں آئے گی۔ سورۂ انعام میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ

﴿اِنَّهٗ لَفِسۡقٌ﴾ [الأنعام:۱۲۱] (اوران جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو، اور یہ بڑا گناہ ہے) یعنی حرام ہے۔ اسی وجہ سے مسلم اور کتابی کے علاوہ عام کافر جیسے ہندو، سکھ، مجوسی، صابی، دہریہ وغیرہ کا ذبیحہ حرام ہے، اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر بھی ذبح کرے، کیونکہ کفار سارے نجس اور ناپاک ہیں، اور کافر کا ذبیحہ مطلقاً حرام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے، اگر بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرے، اگر نسیان ہو گیا پھر بھی ذبیحہ حلال ہے، بشرطیکہ عمداً نہ ہو۔ اگر مجوسی اور کافر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کرے تب بھی اس کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔ [مصنف عبد الرزاق رحمہ اللہ]۔

آئندہ اہل کتاب کی پاک دامن عورتوں سے نکاح کا مسئلہ آنے والا ہے، پس معلوم ہونا چاہئے کہ موجودہ زمانے کے اہلِ کتاب برائے نام اہلِ کتاب ہیں، ان کی اکثریت نہ کسی مذہب کی قائل ہے، نہ کسی آسمانی کتاب کی، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ شانہ کی، یہ سارے ملحد اور دہریہ قسم کے لوگ ہیں، برائے نام چند ایک ساعت ہفتہ اور اتوار کو عبادت خانوں میں جمع ہو کر کچھ شرکیہ اعمال ادا کرتے ہیں، جن کا کوئی ثبوت آسمانی کتابوں میں نہیں، جیسے مشرکینِ مکہ مکرمہ بھی نماز پڑھتے تھے، اور چند ایک شرکیہ اعمال انجام دے تھے، جنہیں قرآن حکیم نے رد فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمۡ عِنۡدَ الۡبَيۡتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصۡدِيَةً﴾۔ [الأنفال:۳۵] (اور بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کے سوا کچھ نہیں)۔

لہٰذا موجودہ اہل کتاب ویسے بھی کافر ہیں کہ انہوں نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم اور پوری شریعتِ اسلامیہ کی تکذیب کر کے حق کو جھٹلایا، پس ان کا ذبیحہ ہر حال میں حرام ہی ہوگا، اور ان کی عورتوں سے نکاح بھی ناجائز و حرام ہوگا۔ پوری تفصیل سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے، جہاں مشرک مرد اور عورتوں کے نکاح کا حکم بیان ہوا تھا۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَطَعَامُكُمۡ حِلٌّ لَّهُمۡ﴾ یعنی تمہارا ذبیحہ ان کے لئے حلال ہے، جب وہ کسی حلال وحرام کے پابند نہیں، شراب وخنزیر تک کھاتے پیتے ہیں، تو ہمارے ذبیحہ کا ان کے لئے حلال ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم مسلمانوں کے لئے یہ جائز ہے کہ تم انہیں بوقتِ ضرورت اگر کچھ کھلاؤ، اور اپنے ذبیحہ سے ان کی خبر گیری کرو تو اس کی اجازت ہے، اور ان کو کھلانا تمہارے لئے جائز ہے۔ پھر فرمایا:

﴿وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ﴾ یعنی پاک دامن عفت مآب مؤمن عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئیں،

ان سے نکاح کرنا درست ہے۔ محصنہ سے مراد کبھی خاوند والی عورت ہوتی ہے، اور کبھی پاک دامن، یہاں عفت شعار عورت مراد ہے، جو کہ آزاد اور بدکار نہ ہو۔ شرم وحیاء وعفت دراصل عورت کا اصلی زیور ہے، اس لئے مردوں کو ترغیب دی جارہی ہے کہ حسن وجمال اور مال ودولت پر پاک دامنی اور عفت وتقویٰ کو ترجیح دیدیں۔

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ یعنی تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی ان میں جو پاک دامن عورتیں ہیں وہ بھی تمہارے لئے حلال ہیں، ان سے بھی نکاح کر سکتے ہو۔ معلوم ہوا کہ مسلمان کو پاک دامن یہودی اور نصرانی عورت سے نکاح کرنے کی بھی اجازت ہے۔ واضح ہو کہ یہ اجازت مباح کے درجہ میں ہے، نہ کہ مصلحت وحکمت۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی طرف سے کتابی عورتوں کے نکاح پر پابندی:

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں مصلحت وحکمت کی بناء پر اہلِ کتاب عورتوں کے نکاح پر روک لگایا تھا۔ امام محمد بن الحسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں لکھا ہے کہ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے مدائن میں ایک یہودی عورت سے نکاح کرلیا تھا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ملی تو انہوں نے خط لکھا کہ یہودیہ کو طلاق دیدو۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو خط ملا تو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ اے امیر المؤمنین! کیا یہودیہ سے نکاح کرنا حرام ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اے حذیفہ! میں تمہیں مضبوطی کے ساتھ پختہ طور پر حکم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط پڑھ کر اس وقت تک نیچے نہ رکھنا جب تک کہ تم اس عورت کو چھوڑ نہ دو، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ دوسرے مسلمان بھی تمہاری اقتداء کرلیں گے، اور اس طرح سے ذِمّی عورتوں سے نکاح کرنے کو ترجیح دیں گے، کیونکہ ان میں حسن وجمال زیادہ ہے، اور مسلمان عورتوں کو چھوڑ دیں گے، اور یہ مسلمان عورتوں کے لئے بہت بڑا فتنہ ہوگا۔

روایت ختم کرنے کے بعد امام محمد رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "وَبِهٖ نَاْخُذُ لَا نَرَاهُ حَرَامًا وَلٰكِنَّا نَرٰى اَنْ يَّخْتَارَ عَلَيْهِنَّ نِسَاءَ الْمُسْلِمِيْنَ وَهُوَ قَوْلُ اَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللهُ"۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو فرمایا ہمارا بھی وہی مذہب ہے، ہم اس کو حرام قرار تو نہیں دیتے، لیکن اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ مسلمان عورتوں سے نکاح کیا جائے، اور انہیں یہودی اور نصرانی عورتوں پر ترجیح دی جائے۔ یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دور اندیشی اور مصلحت بینی ضرب المثل ہے۔ ان کا وہ اندیشہ بالکل صحیح اور برحق تھا،

چنانچہ آج کے زمانہ یورپ میں بسنے والے مسلمان لوگ وہاں کی مغربی عورتوں سے بکثرت شادیاں کرکے مسلمان عورتوں کے لئے مصائب اور پریشانی پیدا کررہے ہیں۔ مسلمان لڑکیاں بے بیاہی رہ گئی ہیں، جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں، جس کی وجہ سے وہ سخت پریشان ہیں۔

دوسری طرف یورپی یہودی اور نصرانی عورتیں مسلمان مردوں سے نکاح کرکے شوہروں اور اپنے بچوں کو نصرانیت پر ڈالنے کی کوششوں میں ہمہ وقت مستعد رہتی ہیں، جس کا نتیجہ نہایت خطرناک ثابت ہورہا ہے کہ مسلمان لڑکے اور ان کے بچے اسلام سے کٹ کر نصرانیت کا شکار ہورہے ہیں۔ دراصل یہ بہت بڑا خطرناک فتنہ ہے کہ یہود، نصاریٰ، قادیانی، شیعہ وغیرہ باطل قسم کے لوگ عورتوں اور مال کے ذریعہ اپنا مذہب پھیلا رہے ہیں، مسلمان ناعاقبت اندیش جوانوں کو لڑکیاں دے کر ان کے مذہب وایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں، اور انہیں عیسائیت کی گود میں دھکیل رہے ہیں۔

ایک مسلمان کا ایمان اتنا قیمتی ہوتا ہے کہ سارا جہاں اور دنیا کی تمام چیزیں اس کی قیمت نہیں بن سکتیں، لیکن ناقدر شناس نالائق لوگ کبھی عورت پر، کبھی کسی معمولی دنیوی چیز پر اپنا قیمتی ایمان بیچ رہے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ دنیا وآخرت دونوں میں ذلیل وخوار اور ہلاک ہوجائیں گے۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس اندیشہ کا اظہار کیا تھا وہ بالکل صحیح تھا کہ مرد جتنا ہوشیار ہو یہودی اور نصرانی بیوی کے مکروفریب سے اپنا ایمان اور تقویٰ، نیز اس عورت سے پیدا شدہ اپنے بچوں کے ایمان کا ہرگز تحفظ نہیں کرسکتا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ پورے خاندان پر کافرہ عورت کا راج ہوگا، اور سارا خاندان کفر وفسق اور قہر خداوندی میں مبتلا ہوکر تباہ ہوجائے گا۔ لہٰذا احتیاط ضروری ہے۔

یہ مسئلہ نکاح کا ہے، جب کہ ان دونوں قوموں کی دوستی اور محبت سے قرآن حکیم نے سختی سے منع فرمایا، پس جس قوم کی دوستی خطرناک اور ممنوع ہو تو نکاح بطریقِ اولیٰ خطرناک ثابت ہوگا، جیسے ارشاد ہے: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ﴾ [المائدة: ۵۱] (اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بناؤ)۔

پھر فرمایا کہ پاک دامن مؤمنہ عورتوں سے شادی کرو، یا اہلِ کتاب کی پاک دامن عورتوں سے ان کی رضامندی کے ساتھ نکاح کرو۔ بہر صورت! حسنِ اخلاق اور بہتر سلوک ورواداری کے ساتھ ان کا حق مہر ادا کرو، جیسا کہ سورہ بقرہ میں گزر چکا۔

﴿غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ﴾ یعنی نکاح کا جو مقصد ہے کہ عفت و پاکدامنی کا حصول ہو، تو اسی کے پیش نظر پاک دامنی اختیار کرو۔ ایامِ جاہلیت میں دستور تھا، (اور اب بھی یہ رسمِ بد کا سلسلہ جاری ہے) کہ مرد و عورت آپس میں دوستی و آشنائی طے کر رہے ہوتے تھے، اکٹھے رہتے تھے کھلم کھلا بدکاری اور زنا کا ارتکاب کرتے تھے جب سیر ہو جاتے پھر جدائی اختیار کرتے تھے، یہ سب طریقے زنا کے ہیں، خواہ کھلم کھلا ہوں، یا خفیہ صیغۂ راز میں ہوں، سب ممنوع اور حرام ہیں۔ شیعوں کا مروّجہ متعہ بھی اسی کا حصہ ہے، جو کہ بدکاری کے سوا کچھ نہیں، اور حرام ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنی نفسانی خواہشات کو غیر شرعی طریقہ پر پورا نہ کرو، نہ کھلم کھلا زانی بنو، اور نہ چھپ چھپا کر عورتوں سے دوستی اور آشنائی پیدا کرو، کتابی عورتوں سے نکاح کرنے کا جواز بتانے کے بعد خاص طور سے اس بات کا ذکر کر دینا کہ علانیہ یا خفیہ زنا نہ کرو۔ اس بات پر تنبیہ ہے کہ ذمی عورتیں خفیہ آشنائی کی راہیں نکال سکتی ہیں، تم ہر طرح کے زنا سے بچو، علانیہ اور خفیہ ہر طرح کی بدکاری سے بچو، عَلَّامُ الْغُیُوْب جل شانہ کو ہر ذرّہ کا حال اور مستقبل کا علم ہے، وہ جن چیزوں سے منع فرماتے ہیں اسے معلوم ہے کہ آئندہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مغرب، یورپ، امریکہ و دیگر ممالک میں وہ وہ حیا سوز دوستی و آشنائیوں کا دور دورہ ہے جنہیں سن کر اور دیکھ کر انسانیت کا سر نیچے جھک جاتا ہے، حرامزادوں کی اتنی کثرت ہے، پناہ بخدا پوری آبادی زنا کاری اور شراب نوشی کی لعنت میں ڈوبی ہوئی ہے، اور شرافت کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ اور جو شخص ایمان کا انکار کر دے تو اس کا عمل اکارت اور ضائع ہو گیا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والے تباہ کاروں میں سے ہوگا، کیونکہ ہر کوئی مرتد ہو یا اصلی کافر آخرت میں اس کی بربادی ظاہر اور یقینی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ
امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ
مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً
فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ

عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّلٰكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ وَلِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ۝٦

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم نماز کی طرف اٹھو تو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو، اور اپنے سروں کا مسح کرلو، اور دھولو اپنے پیروں کو ٹخنوں تک۔ اور اگر حالتِ جنابت میں ہو تو اچھی طرح سے پاک ہو جاؤ، اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کی جگہ سے آیا ہو، یا تم نے عورتوں سے قربت کی ہو، پھر تم پانی کو نہ پاؤ تو ارادہ کرلو پاک مٹی کا، سو اس سے اپنے چہروں کا اور اپنے ہاتھوں کا مسح کرلو۔ اللہ تعالیٰ ارادہ نہیں فرماتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے، لیکن وہ ارادہ فرماتا ہے تاکہ تم کو پاک کرے، اور تاکہ تم پر اپنی نعمت پوری کرے، تاکہ تم شکر کرو۝٦

معارف ومنازل

ربط آیات:

طہارت کی دو قسمیں ہیں: (۱) طہارتِ باطنی، ایمان۔ (۲) طہارتِ ظاہری۔

☆ **طہارتِ باطنی** ایمان کو کہتے ہیں۔ مؤمن کا باطن صاف، ستھرا اور پاک ہوتا ہے، اس پر نجاست کا ورود نہیں ہوتا، جیسے حدیث میں وارد ہے: ''اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ''۔ [بخاري] یعنی ظاہری جنابت کے باوجود مؤمن کا باطن پاک رہتا ہے، بخلاف کافر کے، جیسے ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ [التوبة:۲۸] (بیشک مشرک لوگ ناپاک ہیں)۔

☆ **دوئم طہارتِ ظاہری** وضو کو کہتے ہیں۔ اس سے پہلے طہارتِ باطنی کا ذکر تھا، اب طہارتِ ظاہری وضو کا بیان ہے۔ ان آیات میں حدثِ اصغر اور حدثِ اکبر دور کرنے کا، اور مشروعیتِ تیمم کا بیان ہے۔

نظافت کے لئے طہارت لازمی ہے، اور طہارت سے مراد روح اور جسم دونوں کی طہارت ہے، لہٰذا مسلمانوں کو طہارتِ جسمی کا پابند بنایا جاتا ہے، اور یہ وضو سے ہوگی، اور طہارتِ روحانی بھی سکھائی جاتی ہے، جو نماز سے ہوگی۔

آیت کریمہ میں وضو کے چار فرائض بیان ہوئے ہیں: (۱) چہرہ کو دھونا۔ (۲) ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونا۔ (۳) سر کا مسح کرنا۔ (۴) پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھونا۔ فرائضِ وضو کے علاوہ دیگر تمام مسائل کا کتبِ فقہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہے، وہاں دیکھا جائے۔

﴿وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ اس میں وضو کے چوتھے فرض کا ذکر ہے۔ "اَرْجُلَكُمْ" میں دو قرأتیں ہیں، اور دونوں متواتر ہیں: ایک "لام" کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور دوسری "لام" کے جر یعنی کسرہ کے ساتھ ہے۔ اگر لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا عطف "وَاَيْدِيَكُمْ" پر ہوگا، اور معنی ہوگا کہ اور اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھویا کرو، یہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے، جو کہ ۳۴ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

اگر "لام" کے جر کے ساتھ قرأت ہو تو اس کا عطف لفظ "بِرُءُوْسِكُمْ" پر ہوگا، اور معنی ہوگا کہ اپنے سروں پر، اور اپنے پیروں پر مسح کیا کرو، اور یہ روافض شیعہ امامیہ کا مذہب ہے۔ اور وقتِ واحد میں دونوں قرأتیں متواتر ہیں، اور بمنزلۂ دو آیتوں کے ہیں، اور وقتِ واحد میں دونوں عمل (غسل و مسح) اس آیت کے مطابق نہیں ہو سکتے، جیسے کہ ظاہر ہے۔

لہٰذا اب یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی منشاء اس سے کونسا معنیٰ مراد لینے سے پوری ہوگی؟ تو اس اجمال اور اشتباہ کو دور کرنے کے لئے احادیثِ متواترہ نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور تعاملِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین کی طرف رجوع کرنا ضروری معلوم ہوا، پس احادیثِ متواترہ صحیحہ اور صریحہ سے یہ بات واضح اور ثابت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے امت کو جو وضو کی تعلیم دی ہے اس میں پیروں کے دھونے کا حکم دیا ہے، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے زندگی بھر نہ سفر میں اور نہ حضر میں پاؤں کا مسح کیا ہے، بلکہ جن لوگوں نے پاؤں کے دھونے میں کوتاہی کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو بآوازِ بلند تین مرتبہ فرمایا: "وَيْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ"۔ یعنی ان ایڑیوں کے لئے ہلاکت اور عذابِ نار ہے جن کو پانی نہیں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وضو میں پیروں کا دھونا فرض ہے، مسح کافی نہیں۔

باقی جر والی قرأت کی سب سے آسان توجیہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے کہ دونوں قرأتوں میں کوئی تعارض نہیں، ہر ایک قرأت میں ایک جداگانہ حالت کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ قرأۃ "جر" جس سے مسحِ قدمین معلوم ہوتا ہے، یہ حکم اس حالت میں ہے کہ جب قدمین پر موزے پہنے ہوئے ہوں، تو پاؤں کا مسح کرے، یعنی مسح علی الخفین کرے۔ اور اگر پیروں پر موزے نہ ہوں تو ایسی حالت میں پاؤں کو دھونا فرض ہے، یہاں قرأت "فتحہ" پر عمل ہوگا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ دونوں قرأتیں دو مختلف حالتوں پر محمول ہیں، اس لئے کہ عقلاً یہ ناممکن ہے کہ وقتِ واحد اور حالتِ واحدہ میں ایک ہی عضو کو دھونا بھی فرض ہو، اور مسح بھی فرض ہو، جس سے واضح معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو

قرأتوں میں دومختلف حالتوں کا حکم بیان کیا گیا ہے۔[فتح الباري]

علامہ بحر العلوم رحمۃ اللہ علیہ ''شرح مسلم الثبوت'' میں لکھتے ہیں کہ فخر الاسلام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، اور یہ توجیہ نہایت ہی لطیف ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرأت ''جر'' میں ''اِلَى الْكَعْبَيْنِ'' کا لفظ مسح کی غایت نہیں، اس لئے کہ مسح تو ظاہر خفین پر کافی ہے، کعبین تک مسح بالاجماع ضروری نہیں، بلکہ یہ تخفف کی غایت ہے کہ جو سیاقِ کلام سے مفہوم ہوتی ہے، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ پیروں پر مسح کرلیا کرو، درآں حالیکہ تم ٹخنوں تک موزے پہنے ہوئے ہو، اور اگر موزے ٹخنوں سے نیچے ہوں تو پھر موزوں پر مسح درست نہ ہو۔[فواتح الرحموت بحوالہ معارف کاندھلوی]

فائدہ:

اگر وضو مسنون طریقہ پر ہو، اور وضو کے تمام آداب کا خیال رکھا گیا ہو، تو اس سے انسان کے تمام گناہ صغیرہ پانی کے قطروں کے ساتھ جھڑ جاتے ہیں، حتیٰ کہ پانی کا آخری قطرہ آخری گناہ لے کر زمین پر گرتا ہے۔

کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوں گے۔ البتہ دو عمل ایسے عظیم ہیں کہ جن سے کبیرہ گناہ بھی معاف ہوجاتے ہیں:

(۱) میت کو غسل دینے سے۔ علامہ شیخ المحدثین ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''شرح نقایۃ'' میں اس کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔

(۲) صلوٰۃ التسبیح پڑھنے سے۔ یہ بہت بابرکت نماز ہے، اس پر استقامت اور دوام اگر کوئی اختیار کرے تو اس کی بڑی خوش قسمتی ہوگی۔ واللہ اعلم

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ اوپر طہارتِ صغریٰ، یعنی وضو کا ذکر تھا، اب طہارتِ کبریٰ یعنی جنابت کی حالت طاری ہوجائے تو کس طرح طہارت حاصل کرنی چاہئے؟ اس کا بیان ہے۔ بے وضو ہونے کو حدثِ اصغر کہتے ہیں، اور جنابت طاری ہونے کو حدثِ اکبر کہتے ہیں۔ جنابت کا معنی دوری ہے، جب یہ حالت طاری ہوجاتی ہے تو فرشتے انسان سے دور ہوجاتے ہیں، اور جب مکمل طہارت حاصل کرلیتا ہے تو پھر فرشتے اس کے قریب آجاتے ہیں۔ اور حالتِ جنابت اس وقت طاری ہوجاتی ہے جب مباشرت یا احتلام کی وجہ سے مادۂ تولید کا بدن سے خروج ہو، یا مستورات کو حیض ونفاس وغیرہ کا عارضہ اور کیفیت درپیش ہو، پس غسل فرض ہوگا۔ اور غسل کے فرض تین ہیں:

(۱) کلی کرنا، یعنی اچھی طرح حلق تک پانی پہنچانا۔ (۲) ناک میں پانی ڈالنا، یعنی اہتمام کے ساتھ استنشاق کرنا۔ (۳) پورے بدن پر پانی بہانا، یعنی اس طرح کہ بال برابر کوئی جگہ خشک نہ رہے، خاص کر سر کے بالوں میں وغیرہ۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى﴾ اوپر وضو اور غسل کے فرائض کا ذکر تھا۔ اب آگے تیمم کا ذکر ہے۔ تیمم کی مشروعیت کے لئے چار چیزوں کا بیان:

(۱) اگر تم بیمار ہو یا بیماری کی ایسی نوعیت ہو کہ پانی کے استعمال سے بیماری کے بڑھ جانے کا یا اس سے بڑا کوئی موت کا خطرہ ہو۔ (۲) یا تم حالت سفر میں ہو، اور پانی تم سے ایک میل کے فاصلہ پر دور ہو، یا سرے سے پانی کا وجود ہی نہ ہو۔ (۳) یا تم میں سے کوئی شخص پیشاب و پاخانہ کی ضرورت سے فارغ ہو کر آیا ہو۔ (۴) یا تم میں سے کسی نے عورتوں کے ساتھ مباشرت کی ہو، تو ان سب صورتوں میں جب پانی نہ پاؤ، یا وضو پر قدرت حاصل نہ ہو، یا اس کے استعمال سے مہلک بیماری کا خطرہ ہو تو پاک مٹی سے، یا ہر اس چیز سے جو کہ زمین کی جنس میں سے ہو تیمم کرو، چہرہ اور ہاتھوں پر مسح کرو، باقی سر پر اور پاؤں پر کسی مسح کی حاجت نہیں۔ تفصیلی مسائل کتب فقہ میں دیکھ لیں۔ پھر فرمایا:

﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝٦﴾ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی مشقت ڈالے، لیکن وہ ارادہ فرماتا ہے کہ تم کو پاک کرے، اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے، تا کہ تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ شرعی احکام میں تو ویسے بھی تکلیف مالا یطاق نہیں، اور حدیث شریف بھی اسی پر ناطق ہے کہ شرعی احکام میں نہایت آسانی ہے، اگر بظاہر چند ایک احکام میں کچھ سختی معلوم ہوتی ہے تو وہ درحقیقت سختی نہیں، وہ بندگی کے تقاضوں کے پورے کرنے کے ساتھ رفعِ درجات اور حصولِ درجات کے اسباب ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ متقی لوگ ایسے اعمال کی بجا آوری میں تکلیف تو کیا، بلکہ خوشی اور راحت محسوس کرتے ہیں، پس وضو ہو یا غسل یا تیمم یا دیگر طاعات یہ سارے ہمارے مفاد، طہارت، ثواب، رفعِ درجات کی چیزیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں، جنہیں ہمارے ذمہ واجب فرما کر اپنی نعمتوں کی تکمیل فرمائی، اور مسلمانوں کو ان کے شکر ادا کرنے کا حکم فرما کر مزید احسان و کرم سے نوازا کہ شکر کرنے والوں کی نعمتوں میں مزید اضافہ کا وعدۂ الٰہی ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ

سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ⑦

ترجمہ: اور اس پختہ عہد کو یاد کرو جو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ کیا ہے، جبکہ تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور مانا، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے ان باتوں کو جو سینوں میں ہیں ⑦

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں خواہ ظاہری ہوں یا باطنی، روحانی ہوں یا مادی، خصوصی ہوں یا عمومی اتنی بکثرت اور زیادہ ہیں جن کا نہ احاطہ ہوسکتا ہے نہ شمار۔ آیت کریمہ میں نعمتوں کے یاد کرنے کا جو حکم ہے اس سے اجمالی طور پر یاد کرنے کا حکم ہے، کیونکہ تفصیلی ممکن نہیں۔ اسی طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس عہد کو یاد کرو جو تم نے مضبوطی کے ساتھ پختہ عہد کیا، اور تم نے ﴿سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا﴾ کہہ کر پکا اور مضبوط عہد کرلیا۔

حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ہم نے "لیلۃ العقبۃ" سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ ہم بات سنیں گے، اور فرمانبرداری کریں گے، آسانی میں بھی اور سختی میں بھی، خوشی میں بھی اور ناگواری میں بھی، یعنی ہر حال میں فرمانبرداری کریں گے۔ [مسلم]

میثاق سے مراد یہی عہد و میثاق ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ میثاق سے بیعت الرضوان بھی مراد ہوسکتی ہے، جو حُدیبیہ کے موقع پر ہوئی تھی۔ امام مجاہد اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ میثاق مراد ہے جو ذرّیتِ آدم علیہ السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کے بعد سب سے اللہ تعالیٰ نے پختہ عہد لیا تھا۔ [مظھري]

چونکہ ہر مسلمان توحید و رسالت پر ایمان لاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات اور ہر حکم ماننے کا اقرار و اعلان کرتا ہے، اور یہی پختہ اقرار مراد لینا ہی مراد ہے، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی۔ آخر میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور ہرگز اس کی نافرمانی نہ کرو، اور اس کے ہر حکم پر عمل کرو، کیونکہ وہ جس طرح تمہارے ظاہر سے باخبر ہے اسی طرح تمہارے چھپے ہوئے دلوں کے راز سے بھی خبردار ہے۔

❁ ❁ ❁

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۡ وَلَا یَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ

اِعۡدِلُوۡا ۟ هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ⑧ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا

الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ⑨ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ⑩

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے لئے پوری پابندی کرنے والے انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے ہوجاؤ، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ہرگز اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف نہ کرو انصاف کرو، وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بیشک اللہ تعالیٰ ان کاموں سے باخبر ہے جنہیں تم کرتے ہو⑧ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ فرمایا جو ایمان لائے، اور نیک عمل کئے کہ ان کے لئے مغفرت ہے، اور اجر عظیم ہے⑨ اور جن لوگوں نے کفر کیا، اور ہماری آیات کو جھٹلایا، یہ لوگ دوزخ والے ہیں⑩

معارف ومنازل

سورۂ نساء میں ارشاد ہوا تھا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾ [النساء: ۱۳۵] (اے ایمان والو! انصاف قائم کرنے والے بنو، اللہ کی خاطر گواہی دینے والے، چاہے وہ گواہی تمہارے اپنے خلاف پڑتی ہو، یا والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف)۔

اور یہاں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ دونوں آیات کا ترجمہ ومطلب تقریباً قریب قریب ہے۔ البتہ سورۂ نساء میں جس بات کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی جانوں اور رشتہ داروں کی رعایت کرکے سچی گواہی سے نہ رُکنا، اور عدل وانصاف کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ اور سورہ مائدہ کی اس آیت میں فرمایا کہ کسی قوم کا بغض اور دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم عدل وانصاف نہ کرو۔

دراصل بات یہ ہے کہ انسان کو عدل وانصاف سے اور سچی گواہی دینے سے روکنے والی تین چیزیں ہوتی ہیں: ایک تو اپنا نفس اور اپنے قرابت داروں اور دوستوں کی طرف داری۔ دوسرے کسی قوم کی دشمنی اور عداوت۔ تیسرے مال کی محبت اور رشوت۔ مسلمان کے خاص اوصاف میں سے یہ بھی ہے ہمیشہ حق کا ساتھ دے، حق کی سچی گواہی دے، کبھی کسی حالت میں بھی عدل وانصاف کو نہ چھوڑے۔ مزید تشریح وتوضیح کے لئے سورۂ نساء کی آیت مذکورہ کی تفسیر، اور سورۂ مائدہ کی آیت: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا﴾ [المائدۃ: ۲] (اور کسی قوم کے ساتھ تمہاری یہ دشمنی کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا تمہیں اس

بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کرنے لگو) کی تفسیر دیکھ لی جائے۔

پھر فرمایا: ﴿اِعۡدِلُوۡا ۟ هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى﴾ انصاف کرو، انصاف تقویٰ سے قریب تر ہے، جب کوئی شخص عدل وانصاف کی صفت سے متصف ہوگا تو تقویٰ کی صفت سے بھی متصف ہوگا، عدل تقویٰ کی طرف اور تقویٰ عدل کی طرف کھینچتا ہے۔

پھر فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ﴾ اس میں اشارہ ہے کہ قیامت کی پیشی ہونے والی ہے، ابھی سے اپنے اعمال درست رکھو، اور قیامت کے عذاب سے نجات کا راستہ تلاش کرو۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ‌ۙ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ۝ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِيۡمِ ۝﴾ ایمان لانے والے اور اعمالِ صالحہ بجالانے والے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اجرِ عظیم کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ابدی سعادتوں کا وعدہ فرمایا، اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا، اور حق کی تکذیب کی، ان کے لئے وعید شدید کا بیان ہوا کہ وہ مغفرت اور اجرِ عظیم سے محروم رہیں گے، اور ابدی دوزخ میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ابدی سعادتوں سے نوازے، اور جہنم کے عذاب سے بچائے۔ آمین

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ هَمَّ قَوۡمٌ اَنۡ يَّبۡسُطُوۡۤا اِلَيۡكُمۡ
اَيۡدِيَهُمۡ فَكَفَّ اَيۡدِيَهُمۡ عَنۡكُمۡ‌ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر جو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اسے یاد کرو، جبکہ ایک قوم نے تم پر دست درازی کا ارادہ کیا، سو اس نے ان کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے روک دیا، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور ایمان والوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کریں۔

معارف ومنازل

اسبابِ نزول میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص جس کا نام غورث تھا، اس نے اپنی قوم بنی غطفان اور بنی محارب سے کہا کہ کیا میں محمد کو قتل نہ کروں؟ وہ لوگ کہنے لگے کہ تو کیسے قتل کرے گا؟ اس نے کہا کہ اچانک ایسی صورت بنا کر قتل کردوں گا کہ اس کی طرف دھیان بھی نہ جائے گا۔ یہ کہہ کر

وہ سرور عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ ﷺ کی گود میں آپ کی تلوار تھی۔ یہ شخص کہنے لگا کہ اے محمد! کیا میں آپ کی تلوار کو دیکھ سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں دیکھ لو۔ اس نے تلوار لے لی، اور نیام سے باہر نکال لی، وہ ہاتھ میں تلوار لے کر ہلاتا رہا، اور ارادہ کرلیا کہ آپ ﷺ پر حملہ کرے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ارادہ میں ناکامی ہوتی رہی۔

پھر وہ کہنے لگا اے محمد! کیا آپ مجھ سے نہیں ڈرتے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ پھر کہنے لگا: آپ مجھ سے نہیں ڈرتے؟ حالانکہ میرے ہاتھ میں تلوار ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ میری حفاظت فرمائے گا۔ اس کے بعد اس نے تلوار نیام میں رکھ دی، اور تلوار سرور عالم ﷺ کو واپس کردی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی۔

اس کے علاوہ دشمنوں نے بارہا سید الانبیاء ﷺ اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے اور قتل وغارت کردینے کے بہت سے منصوبے بنائے، مگر اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے سب کو خائب وخاسر کردیا، اور ناکام بنایا۔ مجموعی حیثیت سے تو ایسے واقعات تاریخِ اسلام میں بے شمار ہیں کہ کفار کے منصوبے فضلِ خداوندی سے خاک میں مل گئے، ان واقعات میں سے چند کا تعلق مکی زندگی کے ساتھ ہے، بعض کا تعلق مدینہ کے یہود کعب بن اشرف اور دیگر یہودیوں کے ساتھ ہے، بعض کا منافقین اور دیگر دشمنوں کے ساتھ ہے۔ یہ سب طبقات ابن سعد، دلائل النبوۃ ابونعیم، دلائل النبوۃ بیہقی، مصنف عبدالرزاق، صحیحین وغیرہ کتب میں موجود ہیں، انہیں اکثر مفسرین کرام نے نقل کیا ہے۔

دراصل ان متعدد واقعات میں کوئی تضاد نہیں، سب کے سب مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کی وجہ سے پیش آئے، اور سب کے سب آیت کریمہ کا مصداق ہوسکتے ہیں۔ آیت مذکورہ میں سرور عالم ﷺ اور مسلمانوں کی غیبی حفاظت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اس میں ایک ارشاد تو یہ ہے کہ یہ انعام خداوندی صرف سرور عالم ﷺ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اس نصرت وامداد اور غیبی حفاظت کا اصلی سبب تقویٰ اور توکل ہے، جو قوم یا فرد جس زمانہ اور جس مکان میں ان دونوں صفتوں کو اختیار کرے گا اس کی بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت وحمایت ہوگی، اب بھی اس نصرت وحمایت کا وعدہ موجود ہے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو ☆ اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار

اب بھی ان ہی دونوں صفات کی بدولت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے سروسامانی کے باوجود پوری دنیا پر چھا گئے، اور اپنے سے ہزار گنا زیادہ جرار لشکروں پر غالب آ گئے، دنیا کی عظیم سلطنتوں قیصر و کسریٰ کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر دم لیا۔ جہاں گئے فتح ونصرت نے ان کا استقبال کیا، انہی صفات سے متصف ہو کر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔

آج اگر ہمارے حکام ورؤسا ایمانی جذبات کے ساتھ تقویٰ وتوکل علی اللہ کو اپنا مذہبی ہتھیار بنا کر کفر واستبداد کا مقابلہ کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کامیاب اور کامران نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے قومِ مسلم کو تقویٰ اور توکل کا راستہ بتا کر ہر محاذ پر فتح ونصرت کا وعدہ فرمایا ہے، تجربہ شرط ہے۔

وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ‌ ۚ وَبَعَثۡنَا مِنۡهُمُ اثۡنَىۡ عَشَرَ نَقِيۡبًا‌ ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىۡ مَعَكُمۡ‌ ؕ لَـئِنۡ اَقَمۡتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيۡتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنۡتُمۡ بِرُسُلِىۡ وَعَزَّرۡتُمُوۡهُمۡ وَاَقۡرَضۡتُمُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَلَاُدۡخِلَـنَّكُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ‌ ۚ فَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰ لِكَ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: اور بلاشک اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا، اور ہم نے ان میں سے بارہ نمائندے بھیجے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلاشبہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور ان کی مدد کرو، اور اللہ تعالیٰ کو اچھے طور پر قرض دیتے رہو، میں ضرور تمہارے گناہوں کا کفارہ کردوں گا، اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کردوں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، سو اس کے بعد تم میں سے جو شخص کفر اختیار کرے وہ راہِ راست سے دور جا پڑا ﴿۱۲﴾

معارف ومنازل

اس سے پہلے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ سے عہد کیا ہے، اور ''سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا'' کہہ کر جو فرمانبرداری کرنے کی ذمہ داری لے لی ہے، اس کو پورا کرو، ان ذمہ داریوں اور عہد ومیثاق کے پورا کرنے کا بہت بڑا صلہ اور عظیم اجر ہے، اور عہد ومیثاق کے نقض وعہد شکنی کا انجام نہایت مہلک اور خطرناک ہے۔ اگر نمونہ دیکھنا

چاہو تو آنے والی آیات وضاحت کے ساتھ تمہارے سامنے ہیں، پس نمونہ کے طور پر ان آیات کریمہ میں بنی اسرائیل سے جو عہد لیا تھا اس عہد کے پورا کرنے پر جس انعام کا وعدہ فرمایا تھا اس کا ذکر ہے، پھر اس عہد شکنی پر جو انہیں سزا ملی اس کا تذکرہ فرمایا۔

اس میں مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ عہد پورا نہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہو جاتی ہے، ایسا نہ ہو کہ عہد شکن نافرمان قوم بنی اسرائیل کے نقش قدم پر چل کر ان کی طرح معتوب و مبغوض بن جاؤ، جن کی عہد شکنی اور ہٹ دھرمی کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اول یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا (جو ان کے جلیل القدر پیغمبر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے لیا گیا تھا)، پھر فرمایا کہ ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کردیئے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے، ہر ہر قبیلہ کا ایک سردار مقرر فرمادیا، جو ان کو اللہ تعالیٰ کا عہد و میثاق یاد دلاتا رہے، اور عہدوں پر چلنے کی تلقین کرتا رہے، اور عہد شکنی سے انہیں ڈراتا رہے۔

اللہ تعالیٰ شانہ نے یہ بھی فرمایا کہ بلاشبہ میں تمہارے ساتھ ہوں، مجھے تمہارے ہر عمل کی خبر ہے، نیکی اور گناہ کا علم ہے، بنی اسرائیل سے جو عہد لیا تھا اسے ﴿لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ﴾ سے ﴿قَرْضًا حَسَنًا﴾ تک بیان فرمایا، پھر ﴿لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ﴾ سے ﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ تک پورا کرنے کا اجر و ثواب ذکر فرمایا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم نماز قائم کرتے رہے، اور زکوٰۃ ادا کرتے رہے، اور میرے رسولوں علیہم السلام پر ایمان لائے، اور رسولوں علیہم السلام کی مدد و نصرت کرتے رہے، تو تمہیں اچھا اور بہتر بدلہ دوں گا کہ تمہیں ایسی راحتوں والی جنتوں میں داخل کردوں گا جن کے نیچے ہمیشہ ہمیشہ نہریں جاری ہوں گی۔

اس سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ نماز و زکوٰۃ اور صدقات کا حکم پہلی امتوں کو بھی تھا، رسولوں علیہم السلام پر ایمان لانے اور ان کی نصرت کرنے کا عہد اس لئے لیا کہ بنی اسرائیل میں بہت سے نبی پیدا ہوئے، ایک نبی چلے جاتے تو دوسرے نبی آجاتے، بسا اوقات کئی پیغمبر بیک وقت موجود ہوتے، اس کا بیان عنقریب آنے والا ہے۔

﴿اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا﴾ کے تحت جب کوئی نبی آجاتے تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا ان پر فرض ہو جاتا تھا، حتّٰی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا، اور بڑے بڑے معجزات دے کر بھیجا، اور ان کے بعد خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت ہوئی، لیکن بنی اسرائیل نافرمان قوم دونوں رسولوں علیہما السلام کے منکر ہو گئے، پھر قرض حسن کا ذکر فرمایا:

﴿وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے مصارف خیر میں بھی خرچ کرتے رہو۔قرض حسن کا مطلب یہ ہے کہ اس کا بدلہ ادھار ہے، جو آخرت میں ملے گا، اور اس کو حسن اس لئے فرمایا کہ وہ بہت بڑا ہے جیسے ایک کے عوض بیس لاکھ۔[درمنثور أبو هريرة]

اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے آخرت میں پہاڑوں جتنے بڑے بڑے اجور ملیں گے۔بعض روایات میں ایک کھجور کا ثواب پہاڑوں کے برابر ہوگا۔[عمدة القاري، ج:٧] قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کی وضاحت فرمائی: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾[البقرة:٢٦١](اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے کئی گنا اضافہ کردیتا ہے، اللہ بہت وسعت والا، بڑے علم والا ہے)۔﴿فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾[البقرة: ٢٤٥](تو وہ اس کے لئے بڑھائے چڑھائے بدرجہاز یادہ)۔﴿فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾[الحديد:١١] (تو اس کے لئے کئی گنا بڑھادے، اور اس کے لئے بہترین اجر ہے)۔﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ﴾[التغابن:١٧] (اگر تم اللہ کو اچھی طرح قرض دو گے تو اللہ اس کو بڑھائے گا تمہارے لئے)۔

یہ اللہ تعالیٰ شانہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ مال اسی کا دیا ہوا ہے، جب کوئی اسے خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ذمہ قرض شمار فرماتا ہے۔ جب مال اس نے دیا تو اسے پورا اختیار ہے کہ سارے مال کو خرچ کرنے کا حکم فرمادے، اور ذرا سا بھی اجر نہ دے، لیکن یہ محض اس کا کرم ہے کہ جو کچھ اس کی رضا کے لئے خرچ کیا جائے اسے اپنے ذمہ قرض شمار فرمالیا، اور اس کا اجر خوب بڑھا چڑھا کر دس سے سات سو، پھر وہاں سے بیس لاکھ تک دینے کا وعدہ فرمایا۔کھجور جتنے صدقہ کا ثواب پہاڑ برابر یہ محض لطف وکرم ہی تو ہے، پھر فرمایا:

﴿فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ کہ اس کے بعد جو شخص تم میں سے کفر اختیار کرے سو وہ سیدھے راستہ سے دور بھٹک گیا۔اس سے مراد عہد شکنی ہے، جس کا بیان ابھی آنے والا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ
عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ
اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ⑬

ترجمہ: سو ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان کو لعنتی (ملعون) قرار دے دیا، اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت بنا دیا، وہ کلمات کو ان کے مواقع سے بدل دیتے ہیں، اور وہ اس نصیحت کا بہت بڑا حصہ بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی، اور آپ برابر ان کی طرف سے کسی نہ کسی خیانت پر مطلع ہوتے رہیں گے، باستثناء تھوڑے سے لوگوں کے، سو آپ انہیں معاف فرمائیے، اور درگزر کیجئے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جل شانہ خوبی کا معاملہ کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے ⑬

معارف ومنازل

بنی اسرائیل کی عہد شکنی کا وبال:

یہاں سے بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور اس کے وبال کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس سے قبل سورۂ بقرہ میں بھی اس کی نشان دہی ہو چکی ہے، تو ارشاد فرمایا:

﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً﴾ یعنی چونکہ انہوں نے عہدوں کو توڑ دیا، اور مسلسل نافرمانیوں پر اُتر آئے، اس لئے ہم نے ان پر لعنت کر دی۔ یہ لعنت بار بار عہد شکنیوں کا نتیجہ اور ان کی سزا ہے۔ لعنت کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے دوری اور محرومی، اور ہم نے ان کے قلوب کو پتھر کی طرح سخت کر دیا۔ دوسرے موقع پر ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ [البقرۃ: ۷۴] (پھر تمہارے دل سخت ہو گئے، تو وہ پتھر کی طرح ہیں، یا اس سے بھی سخت ہیں)۔

جب دل سخت ہو جاتا ہے تو اس میں حق قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، اور فطری ہدایت کی استعداد ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [المطففین: ۱۴] (ہرگز نہیں! بلکہ جو عمل یہ کرتے رہے ہیں اس نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے)۔

پس اسی ملعونیت اور قساوتِ قلب کی وجہ سے وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرتے تھے، اور انہیں مختلف اوقات میں قتل بھی کرتے تھے۔ وہ اپنی اسی عادتِ مذمومہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے درپے ہوئے، اور حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تکذیب کی، اور یہ جانتے ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برحق آخری پیغمبر ہیں آپ کے منکر ہوئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں کیں، پھر فرمایا:

﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ مزید ان کی شناعت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ اتنے شدید

عہد شکن اور ہٹ دھرم ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات میں تحریف کرکے انہیں بدل دیتے ہیں، اور انہوں نے ایک بہت بڑا حصہ چھوڑ دیا، جس کے ذریعہ انہیں نصیحت کی گئی۔

جب انسان بار بار گناہ کرتا رہے تو اس میں سرکشی کی شان پیدا ہو جاتی ہے، اور سرکشی سے دل میں قساوت اور سختی آجاتی ہے، جس کی وجہ سے توبہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اور نفس امارہ پورے زوروں کے ساتھ برائیوں پر آمادہ کرنے لگ جاتا ہے، ایسے وقت میں موعظت ونصیحت کی بات بُری لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کی اسی مذموم عادت کو بیان کرکے فرمایا کہ ان کے دل ایسے سخت اور ناکارہ ہوگئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ شانہ کے کلام کو بدل دیا۔

ان کے علماء سوء توریت شریف میں تحریف کرکے احکامِ الٰہی کو بدل دیتے تھے، اور جو کچھ اپنی خواہشات پوری کرنے کے لئے اپنی طرف سے بناتے اور لکھتے تھے، پھر اپنے عوام سے کہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ عوام کو خوش وراضی رکھ کر ان سے مالی مراعات اور پیسہ لے لینا، اور علم کے بجائے ان کو جہل میں مبتلا کردینا، اور ہدایت کے بجائے انہیں گمراہی پر ڈالنا، اور اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنا آخرت کے حساب وکتاب سے بے پرواہ ہوجانا، یہ کتنی بڑی قساوتِ قلبی ہے؟ لیکن انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

ان کے علماء سوء نے جب توریت شریف میں تحریف کرلی، تو توریت کا بہت بڑا حصہ ان کے حافظہ سے نکل گیا، اور کتاب اللہ کا اصل حلیہ بگاڑ کر اتنا ردوبدل کرلیا کہ اب یہ کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ کوئی آسمانی صحیفہ ہے۔ اس طرح وہ اصل کتاب کے الفاظ ومعانی سے محروم ہوگئے، اور جہالت کے اندھیروں میں گر کر ملعون ومبغوض ہوگئے۔

پھر فرمایا:

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ﴾ (اور آپ ہمیشہ ان کی طرف سے کسی نہ کسی خیانت پر مطلع ہوتے رہیں گے، سوائے تھوڑے سے چند لوگوں کے)۔ اس میں یہود کی خیانت بیان فرمائی، اور واضح کیا کہ یہ برابر خیانت کرتے رہیں گے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی خیانتوں کا علم ہوتا رہے گا۔ خیانت ان کے مزاج کا حصہ ہے، ان کے اسلاف نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک خیانتوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور خیانت کیا ہوسکتی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں لفظی ومعنوی ہر قسم کی تحریف کی؟ اب موجودہ یہود اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر کبھی بھی خیانتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ ہاں! وہ چند لوگ جنہوں نے اسلام قبول کیا، وہ ان خیانتوں سے مستثنیٰ رہیں گے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام، اور ان

کے ساتھی رضی اللہ عنہم جو صفتِ ایمان کی بدولت خیانتوں سے بچ گئے، اور امانتدار ہو گئے۔

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ آپ ان کو معاف کیجئے، اور درگزر فرمائیے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسندیدہ اعمال والوں کو دوست رکھتا ہے۔ صاحب روح المعانی اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اَيْ اِذَا تَابُوْا اَوْ بَذَلُوا الْجِزْيَةَ"۔ یعنی جب وہ توبہ کرلیں، یعنی اسلام قبول کرلیں، اور خیانت سے باز آجائیں، یا جزیہ دے کر عہد کی پابندی کرتے رہیں، تو ان کو معاف کیجئے، اور درگزر فرمائیے۔

اگر یہ معنی لئے جائیں تو آیت میں کوئی نسخ نہیں ہے۔ اس کے بعد صاحب روح المعانی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ معافی اور درگزر کا حکم پہلے تھا، اور جب کافروں کے ساتھ جنگ و جہاد کرنے کا حکم آگیا تو عفو و درگزر کا حکم منسوخ ہوگیا۔ حضرت حکیم الامۃ صاحب رحمۃ اللہ علیہ "بیان القرآن" میں فرماتے ہیں کہ جب تک شرعی ضرورت نہ ہو ان کی خیانتوں کا اظہار اور ان کی فضیحت نہ کیجئے، یہ معنی ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ سے قریب تر ہے۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۪ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝۱۴ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ڛ قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۵ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۶

ترجمہ: اور جن لوگوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں، ان سے ہم نے پختہ عہد لیا، سو وہ اس چیز کا بڑا حصہ بھول گئے جس کے ذریعہ ان کو نصیحت کی گئی، سو ہم نے قیامت کے دن تک ان کے درمیان دشمنی اور بغض کو ڈال دیا، اور عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں بتلادے گا جو کام وہ کیا کرتے تھے ۝۱۴ اے اہل کتاب! تحقیق آیا تمہارے پاس ہمارا رسول، جو تم سے بہت سی ان چیزوں کو بیان کرتا ہے، جن کو تم اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے چھپاتے تھے، اور بہت سی چیزوں سے درگزر کرتا ہے، بیشک تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور اور ایک ایسی کتاب آئی ہے جو واضح بیان

کرنے والی ہے⑮ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ ان لوگوں کو سلامتی کے راستے بتاتا ہے، جو اس کی رضامندی کے طلب میں لگے رہتے ہیں، اور ان کو اپنے حکم سے اندھیروں سے نور کی طرف نکالتا ہے، اور انہیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے⑯

معارف ومنازل

مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہود سے عہد لیا تھا اسی طرح ان لوگوں سے بھی جو اپنے کو فخریہ طور پر نصاریٰ کہتے ہیں عہد لیا تھا۔ یہ پختہ عہد انجیل کے واسطے سے، یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے لیا گیا، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ شانہ کی نافرمانی اور عہد شکنی میں نصاریٰ یہود سے کوئی کم نہیں، اس لئے وہ بھی یہود کی طرح عہد شکن اور خائب وخاسر ثابت ہوئے، اور عہد و پیمان پر قائم نہ رہے۔

جو کچھ ان کو نصیحتیں کی گئی تھیں ان میں سے ایک بہت بڑا حصہ ضائع کیا، تحریف کی، اور بھول گئے۔ ان کی عہد شکنی اور نصیحتوں کی ناقدری اور فراموشی کی وجہ سے ہم نے ان کے درمیان دشمنی اور بغض کو ڈال دیا، وہ قیامت تک مذہبی سطح پر ایک دوسرے کے دشمن رہیں گے۔ اگر ''بَیْنَہُمْ'' کی ضمیر سے صرف نصاریٰ مراد ہوں تو یہی مطلب ہوگا۔ اور اگر ''بَیْنَہُمْ'' سے مراد اہل کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ دونوں ہوں، تو بات بالکل واضح ہے کہ یہود و نصاریٰ کے آپس کے اختلافات اور دشمنی وعداوت کا سب کو اور سارے جہاں کو علم ہے، اور اگر کسی وقت ان میں کوئی سیاسی اتحاد (جیسے کہ آج ہمارے زمانہ میں اسلام کے خلاف وہ سیاسی اتحاد کر چکے ہیں) نظر آئے تو وہ مذہبی اختلافات کے منافی نہیں ہے، کیونکہ ان کے مذہبی اختلافات قیامت تک اس طرح جاری رہیں گے کہ مذہبی اتحاد کے امکانات ہر طرح معدوم رہیں گے۔

بہر حال! نصاریٰ آپس میں مختلف فرقوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے دشمنی اور بغض رکھتے ہیں، اسی طرح مذہبی سطح پر ان کے اور یہود کے درمیان بھی دشمنی اور بغض قیامت تک جاری رہے گا، اور یہ قدرت کی طرف سے ان کی سزا ہے۔

﴿فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾ سے خصوصی مراد سید الانبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات وثناء ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ہے، جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی ''اَحْمَد'' لے کر لوگوں کو

بتایا تھا: ﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ﴾ [الصف:٦] (اور اس رسول کی خوشخبری سنانے والا جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہے)۔ اہل کتاب نے جس طرح دیگر بہت سے احکامِ الٰہی عموماً چھپائے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام صفات کو خصوصیت کے ساتھ چھپا کر کفر اختیار کرلیا۔ قرآن کریم نے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [الأعراف:١٥٧] (جس کو وہ لوگ اپنے ہاں لکھا ہوا پاتے ہیں تورات اور انجیل میں، ان کو اچھائی کا حکم دیتا ہے، اور برائی سے روکتا ہے)۔

پس اس عہد شکنی، اور تحریف اور کتمانِ حق کی سزا انہیں دنیا میں ملی، اور ملتی رہے گی۔ پھر فرمایا:

﴿وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ یعنی عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں بتلادے گا جو کام وہ کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد اہل کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ دونوں کو خطاب فرمایا:

﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا﴾ اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) آیا ہے، وہ بہت سی وہ باتیں بیان کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے تم چھپاتے تھے، اور بہت سی چیزوں سے درگزر کرتا ہے، اس رسول کا اتباع فرض ہے۔ مزید فرمایا کہ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا نور آیا ہے، اور واضح بیان کرنے والی کتاب آئی ہے)۔

نور سے مراد سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، اور کتاب مبین سے قرآن کریم مراد ہے۔ دونوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سلامتی کے راستے کی ہدایت فرماتا ہے۔ یہ ہدایت ان لوگوں کو ملتی ہے جو رضائے الٰہی کے طالب ہوں، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت بھی دیتا ہے، اور طرح طرح کی اندھیریوں سے نکال کر (کفر و شرک کی اندھیری اتباعِ نفس و شیطان کی اندھیری وغیرہ)۔ نور کی طرف لے آتا ہے، کفر چونکہ تمام ظلمتوں کا سرکردہ ہے، جیسے اسلام تمام انوار و روشنیوں کا سردار اور مرکز ہے۔ قرآن حکیم تمام ظلمتوں کو مٹا کر اسلام کے نور و روشنی تک پہنچا دیتا ہے، کفر کے راستے چونکہ بہت سے ہیں، اس لئے لفظ ظُلُمٰت بصیغۂ جمع استعمال فرمایا، اور نور چونکہ ایک ہی ہے (اسلام، اللہ کی ہدایت) اس لئے لفظ نُوْر کو واحد لایا گیا۔

☆☆☆

فائدہ:

یہ جو فرمایا: ﴿یَّهۡدِیۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا طالب ہوگا اللہ تعالیٰ ضرور اسے ہدایت عطا فرمائے گا، کیونکہ ہدایت کے لئے طلب شرط ہے، اور بغیر طلب کے کوئی مقصد پورا نہیں ہوتا۔ جو لوگ اسلام کے مخالف ہیں، اور جو لوگ مسلمان ہونے کے دعوے دار ہیں، لیکن ضروریات دین کے منکر ہیں، انہیں تنبیہ کی جاتی ہے کہ کفریہ عقائد کے ہوتے ہوئے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنت میں لے جانے والے اعتقادیات اور اعمال کو ''سُبُلَ السَّلٰمِ'' فرمایا، اور جنت کو دار السلام فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا نام اَلاِسلام رکھا، اور اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام اَلسَّلامُ بھی ہے، اور نماز جیسی عبادت کے اختتام پر دونوں طرف اَلسَّلامُ کہہ کر نماز سے فارغ ہوجاتے ہیں، اور مسلمان آپس میں ملاقات کرکے اَلسَّلامُ عَلَیکُم کہتے ہیں، جنتیوں کو جنت میں فرشتے سلام کرتے ہیں۔ فرض نمازوں کی دعا: ''اَللّٰھُمَّ اَنتَ السَّلَامُ وَمِنکَ السَّلَام'' اللہ تعالیٰ نے تعلیم فرمائی۔ در حقیقت اللہ تعالیٰ کے دین میں سلامتی ہی سلامتی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نور بھی تھے، اور بشر بھی:

آیت بالا میں ﴿قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ﴾ جو فرمایا ہے اس میں نُوۡرٌ سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔ ذات کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں، آپ کا اور سارے انبیاء علیہم السلام کا نسب حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ملتا ہے، یہ سارے انبیاء علیہم السلام بشر اور انسان گزرے ہیں۔ ہاں! صفات کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نور کامل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت دنیا کی ساری ظلمتیں مٹ گئیں، اور پورا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے منور و روشن ہوگیا۔

نُور روشنی کو کہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے سارا عالم کفر و شرک کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا، توحید کے ماننے والے خال خال ہی دنیا کے کسی گوشہ میں اکاّ دُکاّ پائے جاتے تھے۔ خاتم النبیین شمس الرسالۃ سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری انسانیت کو توحید کی دعوت دی، اور اس بارے میں بہت زیادہ محنت کی، اور بڑی بڑی مشقتیں برداشت کیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے سارا عالم جگمگا اٹھا،

اور روشن ہوا، کفر وشرک کی ظلمتیں چھٹ گئیں، اور ایمان ویقین کے نور سے قلوب روشن ومنور ہوگئے۔

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ ☆ کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ

حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ ☆ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ

صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم

بہت سے لوگ نُوْر کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر (انسان) نہیں تھے۔ دراصل یہ عقیدہ نصرانی عقائد سے مأخوذ ہے، جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں غلو کرکے انہیں خدا کا درجہ دیا، اسی طرح ان لوگوں نے بھی اسی غلو میں غرق ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشریت سے انکار کرکے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملا دیا، جیسے وہ کہتے ہیں:

وہی جو مستویٔ عرش ہے خدا ہوکر ☆ اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہوکر

(اعلیٰ حضرت)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کے فرقہ یعقوبیہ کا یہی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کی شکل میں زمین پر اترے، پھر خدا کی شکل میں واپس آسمان پر تشریف لے گئے۔ یہ لوگ عیسائیوں کے عقیدۂ کفارہ کے منکر ہیں، جیسے آنے والی آیت میں اس کی تصریح ہے۔[تفسير حقاني]

ایسے لوگ نہایت جاہل اور قرآن کریم کے نص قطعی کے منکر ہیں۔ فرمایا: ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾[الإسراء:٩٣] (آپ کہہ دیں: میرا ربّ پاک ہے، میں نہیں ہوں مگر بشر اور بھیجا ہوا)۔ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾[الكهف:١١٠] (آپ کہہ دیں: بیشک میں بشر ہوں تمہاری طرح)۔ جو لوگ اس نص قطعی کو جھٹلا کر کونسی محبت کے دعویدار ہیں؟ کہیں ایسے لوگوں کا حشر عیسائیوں کے ساتھ نہ ہو۔ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِی السَّبِيْلَ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ اَتَمُّ وَاَكْمَلُ۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا

اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: البتہ تحقیق انہوں نے کفر کیا جنہوں نے یوں کہا کہ: بیشک اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم ہے، آپ فرمادیجئے کہ: اگر اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم اور ان کی والدہ کو، اور جو کچھ بھی زمین میں ہے ان سب کو ہلاک فرمانے کا ارادہ فرمائے تو کون ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ سے بچا سکے؟ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے ملکیت آسمانوں کی اور زمینوں کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ﴿۱۷﴾

معارف ومنازل

ویسے تو عیسائیوں کے بہت سے فرقے ہیں، مگر بڑے بڑے تین ہیں پہلا یعقوبیہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ متحد اور ایک مانتے ہیں۔ دوسرا نسطوریہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ یعنی خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ تیسرا ملکائیہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو تین خداؤں میں سے ایک مانتے ہیں، یعنی ''ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ''۔ آیت کریمہ میں فرقہ یعقوبیہ کی تردید ہے، جو کہ (معاذ اللہ) حضرت مسیح علیہ السلام کو عین اللہ مانتے ہیں۔ مگر تردید جس دلیل سے کی گئی ہے وہ تمام فرقوں کے عقائد باطلہ پر حاوی ہے، جو بھی توحید کے خلاف ہو، خواہ خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ ہو، یا تین خداؤں میں سے ایک خدا ہونے کا عقیدۂ باطلہ ہو۔ آیت کریمہ سے سب کی تردید ہوگئی۔

تو ارشاد فرمایا: بتاؤ! اگر اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم اور ان کی والدہ کو، اور روئے زمین کے تمام افراد کو ہلاک کرنا چاہے تو انہیں کون بچا سکتا ہے؟ چونکہ وہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کی موت کے قائل تھے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے موت دی ہے، اس لئے ان سے سوال کر کے خود ان پر حجت قائم کی گئی، تو جسے موت آئے وہ کیسے خدا ہو سکتا ہے؟ لفظ ''اِنْ اَرَادَ'' اس لئے فرمایا کہ مسیح علیہ السلام ابھی زندہ ہیں، اگر چہ یہود ونصاریٰ ان کی موت کے قائل ہیں۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا﴾ کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے، جو مملوک ہو وہ کیسے معبود بن سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ سب کا خالق ہے، اس کو اختیار ہے، وہ جو چاہے، اور جس طرح چاہے پیدا فرمائے۔ اس نے مریم علیہا السلام کو بھی پیدا فرمایا، اور مریم علیہا السلام کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی پیدا فرمایا۔

چونکہ مسیح علیہ السلام کی پیدائش عادتِ معروفہ کے مطابق نہ تھی، اس لئے یہ لوگ ان کو خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ تو مخلوق کس طرح معبود ہوسکتی ہے؟ کیونکہ اس کا وجود اس کے خالق کا دیا ہوا ہے، خالق جل شانہ نے جس طرح بھی وجود دیا ہو پھر بھی مخلوق مخلوق ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا فرما کر اپنی قدرت کا ملہ دکھادی، اس سے یہ کیسے لازم آیا کہ وہ عین خدا یا مستقل معبود ہو جائیں۔ ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ [الأنعام: ۹۱] (ان لوگوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی) ان کو اُلوہیت کے مفہوم کا اندازہ کہاں؟

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۭ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۡ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ⑱ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰي فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَاۗءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۡ فَقَدْ جَاۗءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑲

ترجمہ: اور یہود ونصاریٰ نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اور اس کے پیارے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ: پھر وہ تمہیں تمہارے گناہوں کے سبب کیوں عذاب دے گا؟ بلکہ تم اس کی مخلوق میں سے بشر ہو، وہ بخشے گا جس کو چاہے، اور عذاب دے گا جس کو چاہے، اور اللہ تعالیٰ ہی کا مُلک ہے آسمان اور زمین، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اور اسی کی طرف لوٹ جانا ہے ⑱ اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے، جو ایسے وقت میں تمہارے لئے بیان کرتا ہے جبکہ رسولوں کا سلسلہ موقوف تھا، تاکہ تم یوں نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا، سو تمہارے پاس بشارت دینے والا اور ڈرانے والا آگیا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ⑲

معارف ومنازل

جرأت وبے باکی اور بے حیائی کی انتہائی حد پار کر کے اس قوم نے پہلے اپنے آپ کو نبیوں کی اولاد کہہ کر جنتی ہونے کا دعویٰ کیا، یا اپنے پیغمبروں حضرت عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو ابن اللہ کہہ کر صریح شرک کا ارتکاب کیا، آج وہ ترقی کرتے ہوئے اس درجہ پر پہنچے کہ پوری قوم کے لئے ''اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ'' کا برملا اثبات کیا، کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور پیارے (چہیتے) ہیں۔

دراصل اللہ تعالیٰ اور پیغمبروں علیہم السلام کی مسلسل نافرمانیوں سے نفس وشیطان ان پر مسلط ہوئے اور انہیں گمراہ کیا، اور یہ سمجھایا کہ تم تو اللہ تعالیٰ کی اولاد ہو، اور اس کے پیارے محبوب ہو، تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، اور تم کیسے ہی اعمال کرو تمہارا سب کچھ معاف ہے، تمہیں کوئی عذاب نہ ہوگا۔ ''دروغ گورا حافظہ نباشد''۔

کبھی انہوں نے خود اقرار کر کے اپنے لئے عذاب کا اثبات بھی کیا تھا، اور کہا تھا: ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ [البقرة: ٨٠] (ہم کو آگ نہیں چھوئے گی مگر چند دن)۔ اور دنیوی مہلک اور تباہ کن ذلت آمیز عذابوں کو ان کے آباء واجداد دیکھ چکے تھے کہ ان کی پوری بستیاں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں بندر اور خنزیر بن چکے تھے، تو کیا خدا تعالیٰ کے بیٹوں اور پیاروں پر ایسا تباہ کن ذلت آمیز عذاب آسکتا ہے؟ اسی کے پیش نظر الزامی جواب ارشاد ہوا:

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ﴾ یہ ان کے دعوے کا ابطال ہے۔ فرمایا: اے پیغمبر! آپ ان سے فرما دیجئے: اگر معاملہ ایسا ہے جو تم کہتے ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور پیارے ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ تم پر خطرناک اور ذلت آمیز عذاب کیوں نازل کرتا ہے؟ دنیا میں تو قید اور قتل کئے جاتے ہو، تمہاری شکل وصورت مسخ ہو جاتی ہے، اور دیگر مختلف سزاؤں میں بھی مبتلا ہو جاتے ہو، اور آخرت کی سزا کا تم خود اقرار کر کے کہتے ہو: ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ تو تمہارا دعویٰ غلط اور بے بنیاد ہوا، کیونکہ قیامت کا عذاب جسے تم نے مان لیا وہ واقعی عذاب اور جرائم کی سزا ہے، وہ کوئی تادیبی کارروائی نہیں ہے، کیونکہ وہاں آئندہ نہ کرنے کا احتمال بھی نہیں ہوتا، اور جب تم اس دعوے میں جھوٹے ثابت ہوئے تو سنو! اصل حقیقت یہ ہے:

﴿بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ﴾ بلکہ تم بشر آدمی ہو، جیسے دوسرے انسان ہیں، ایسے ہی تم ہو، جیسے دوسرے انسانوں سے اللہ تعالیٰ کا کوئی رشتہ ناطہ نہیں ہوتا، اسی طرح تم سے بھی نہیں ہو سکتا، بیٹا، بیٹی تو دور کی بات ہے، اس ذات پاک کا نہ کوئی شریک ہے، نہ کوئی ہمسر، بلکہ اس کا کوئی وزیر و مشیر بھی نہیں، اور اس کے دین کی اصلی بنیاد اس کی توحید (ذاتی وصفاتی) ہے، دیگر تمام اعتقادیات اور اعمال اسی درخت مبارک (توحید) کی شاخیں اور پتے ہیں، جس کا پھل جنت ہے۔

رہا یہود ونصاریٰ کا یہ کہنا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں، تو کیسے ہو سکتا ہے کہ پاکیزہ خدا کی ناپاک خنزیر اور مردار کھانے والے لوگوں سے دوستی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ پاک ہے، اور اس کی دوستی پاک لوگوں کے ساتھ ہے۔ اسی وجہ

سے اس کی محبوبیت کا تعلق ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ ہے۔ پھر انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر کے کافر ہو گئے ہو، اور کفر کرنے والے اللہ تعالیٰ کے دشمن ہی ہوں گے، نہ کہ دوست۔ تمہیں حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا تھا، اور صاف واضح ہی فرمایا تھا: ﴿إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ﴾ [المائدة: ۷۲] (بلاشبہ جو شخص شرک کرے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام فرما دے گا، اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے)۔ کفر و شرک بدترین گمراہی ہے، اس کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا دعویٰ کرنا گمراہی پر گمراہی ہے۔

﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ﴾ یہ باری تعالیٰ شانہ کا جاری کردہ عام قانون وقدرت ہے، وہ جس کی چاہے بخشش و مغفرت فرمادے، اور جسے چاہے عذاب دے۔ کوئی شخص زبردستی اور چاپلوسی سے مغفرت نہیں کروا سکتا، کیونکہ:

﴿وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے ملک و بادشاہت آسمانوں اور زمین کا، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اور سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اور یہ اس کا قانون ہے کہ مشرک اور کافر کی بخشش نہیں ہوگی، جب سارے لوگ اس کے پاس لوٹ کر پہنچیں گے تو ذرّہ ذرّہ کا حساب ہوگا، اور کچھ بھی نہ چھپے گا، حیلے بہانے سارے بیکار ہو جائیں گے، اور حقیقت واضح ہو کر اس پر فیصلہ ہوگا۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہود کے پاس تشریف لائے، اور ان کو دعوت دی کہ اللہ تعالیٰ کو جیسا کہ اس کا حق ہے اسی طرح مانیں، اور اس کے عذاب سے ڈریں، یہ سن کر وہ کہنے لگے کہ: اے محمد! ہمیں کیا ڈراتے ہو؟ ہم اللہ تعالیٰ کے لاڈلے بیٹے اور پیارے ہیں۔ نصاریٰ نے یہ بات پہلے کہی تھی، یہودیوں نے یہ بات کہہ دی، اس پر آیت بالا کا نزول ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے مزعومات اور باطل خیالات کا سختی سے ابطال فرما کر ان کی پُرزور تردید فرمائی۔

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَى فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ﴾ اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے، جو واضح طور پر تمہیں بتاتا ہے، اور اس کی آمد ایسے وقت میں ہوئی ہے جب کہ رسولوں کے آنے کا سلسلہ مدت دراز سے موقوف تھا۔

فترۃ کے لغوی معنی: سست اور کمزور ہونے کے ہیں۔ یہاں فترۃ سے مراد یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی

تشریف آوری میں چند مدت کا تعطل اور انقطاع ہوا، خصوصاً وہ عرصہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی درمیانی مدت ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے نبیوں کی تشریف آوری کا سلسلہ جاری رہا، ایک نبی وفات پا جاتے تو ان کی جگہ دوسرے نبی مبعوث ہو جاتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد سلسلۂ نبوت منقطع ہو گیا تھا۔ انہوں نے بشارت دی تھی کہ میرے بعد ایک رسول آئیں گے جن کا اسم گرامی ''احمد'' ہوگا۔ احمد سرور عالم محمد رسول اللہ ﷺ کا دوسرا نام گرامی ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے درمیان کوئی نبی نہیں آیا۔ آیت کریمہ بالا سے، اور سورۂ صف کی آیت: ﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ﴾ [الصف: ٦] (اور اس رسول کی خوشخبری سنانے والا جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہے) سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کے درمیان کوئی نبی نہیں تھے، جیسا کہ صحیح البخاری میں اس کی تصریح ہے:

فَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَقُوْلُ: اَنَا اَوْلَى النَّاسِ بِابْنِ مَرْيَمَ وَالْاَنْبِيَاءُ اَوْلَادُ عَلَّاتٍ لَيْسَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ نَبِيٌّ۔ [رواه البخاري وأحمد في المسند وابن حبان في صحيحه]

بعض علماء جیسے علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ تبعاً لصاحب الکشاف زمانہ فترت میں چار انبیاء کرام علیہم السلام کے مبعوث ہونے کا ذکر کیا ہے، جن میں سے ایک خالد بن سنان عربی تھے۔ اور بقیہ تین بنی اسرائیلی انبیاء کے متعلق صاحب کشاف نے کہا، اور بیضاوی نے اس کا اتباع کیا، وہ تینوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مبلغ اور مقرر تھے، جن کا ذکر سورۂ یٰس میں ہے، وہ نبی نہیں تھے، صرف مبلغ تھے۔

رہا حضرت خالد بن سنان، اور حنظلہ بن صفوان، اوّل تو ان کی نبوت و بعثت کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں، دوئم یہ کہ یہ صحیح اور صریح حدیث کے خلاف ہے، جو ابھی گزری۔ اور کچھ علماء نے کہا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے گزرے ہیں۔ صاحب روح المعانی وغیرہ حضرات کا بھی یہی خیال ہے۔

وَقَدْ قَالَ غَيْرُ وَاحِدٍ مِنَ الْعُلَمَاءِ اِنَّ اللهَ تَعَالٰى لَمْ يَبْعَثْ بَعْدَ اِسْمٰعِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامِ نَبِيًّا مِنَ الْعَرَبِ اِلَّا مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمَ الْاَنْبِيَاءِ الَّذِيْ دَعَا بِهٖ اِبْرَاهِيْمَ وَبَشَّرَ بِهِ الْاَنْبِيَاءُ وَاللهُ تَعَالٰى يَقُوْلُ: ﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ [القصص: ٤٦] (تاکہ آپ ایک ایسی قوم کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا)۔

وَقَوْلُهٗ: ﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ [یٰس:٦] (تا کہ آپ ایک ایسی قوم کو ڈرائیں جن کے باپ دادے نہیں ڈرائے گئے، پس وہ غافل ہیں)۔

بہرحال! صحیح اور بے غبار قول جمہور علماء محققین کا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی نبی اور رسول نہیں آیا۔

فترت کا زمانہ:

زمانہ فترت جس میں انبیاء علیہم السلام کے آنے کا سلسلہ منقطع رہا، اس کی کُل مدت کیا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کرام، اصحاب سیر اور مؤرخین نے مختلف ومتعدد اقوال نقل کئے ہیں، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان چھ سو سال کا فاصلہ تھا۔ [بخاري] بعض حضرات نے پانچ سو ساٹھ سالوں کا فاصلہ بتایا ہے۔ ان دونوں میں اس طرح تطبیق ہوسکتی ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع إلی السماء کے بعد سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک چھ سو سال مراد لئے ہوں، اور دوسرے علماء نے جو پانچ سو ساٹھ سالوں کی بات کہی ہے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت تک کا زمانہ مراد لیا ہو۔ سیرت حلبیہ میں جو چار سو کا قول مذکور ہے وہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ واللہ اعلم

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قول چھ سو بیس سال کا بھی نقل کیا ہے، اور پھر فرمایا ہے کہ چھ سو اور چھ سو بیس میں کوئی منافات نہیں، جس نے چھ سو سال کہا اس نے چھ سو سال شمسی مراد لیے، اور جس نے چھ سو بیس سال کہا اس نے چھ سو بیس سال قمری مراد لئے ہیں، کیونکہ سو سال شمسی میں تقریباً تین سال قمری زائد ہوجاتے ہیں۔

یہ جو فترت کا زمانہ تھا اس میں جہالت کفر وشرک اور گمراہی کا جو حال تھا اس کا نقشہ نہایت جامع کلمات کے ساتھ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یوں کھینچا ہے:

یعنی اللہ تعالیٰ جل شانہ نے سیدنا خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے وقت مبعوث فرمایا جب رسولوں کی آمد کا سلسلہ منقطع تھا، اور ہدایت کے راستے مٹ گئے تھے، اور دین بدل گئے تھے، اور بت پرستی اور آتش پرستی اور صلیب پرستی کی کثرت ہوگئی تھی، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمانا اللہ تعالیٰ کی کامل ترین نعمت ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے کی سب کو ضرورت تھی۔ تمام شہروں میں فساد عام تھا، سرکشی اور جہالت تمام بندوں میں پھیل گئی تھی، بجز چند ایسے لوگوں کے جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے دین کو پکڑے ہوئے تھے، جن میں بعض احبار یہود تھے،

اور بعض وہ لوگ تھے جو نصاریٰ اور صابئین میں سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگے ہوئے تھے۔

اندازہ لگائیں، یہ ایک ملک یا ایک خطہ یا ایک علاقہ کا حال نہیں جو بیان ہوا، بلکہ یہ پورے عالم اور کرۂ ارضی کا حال ہے، جو کہ شرک وکفر اور دیگر معاصی کی ظلمتوں اور بھیانک ناگفتہ بہ تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ساری مخلوقات کا رشتہ اپنے خالق جل شانہ سے (زمانۂ فترت کی طرح) منقطع ہو چکا تھا۔ انسانیت اور انسانی شرافت کے نام سے لوگ سراسر ناواقف تھے، اور سارے لوگ جہنم کے خطرناک گڑھوں کے کنارے پہنچے ہوئے تھے، تب تو اعلان ہوا: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ [آل عمران:۱۶۴] (یقیناً اللہ نے بڑا احسان کیا مؤمنوں پر کہ ان کے اندرانہی میں سے ایک رسول کو بھیجا)۔

خالق کائنات کی حکمت اور رحمت کی وسعت کا یہی تقاضا رہا کہ طویل زمانۂ فترت کے بعد جبکہ کرۂ ارض کے چاروں اطراف کفر وشرک اور حیا سوز معاصی کی ظلمتوں سے بھرے پڑے تھے، عین اس وقت جبکہ دنیا سکرات الموت کی کشمکش میں سسکیاں لے رہی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اس قریب الموت جہاں کے لئے پیغامِ حیاتِ جاودانی ثابت ہوئی، اسی کو فرمایا:

﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ [آل عمران:۱۰۳] (اور تم آگ کے گھڑے کے کنارے تھے، تو اللہ نے تمہیں اس سے نجات دی)۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور تربیت نے اس تاریک اور مردہ جہاں کو ایسا آباد اور روشن کر دیا جس کی نظیر کسی پچھلے دور میں نظر نہیں آتی۔ اسی طرح شرک وکفر کی ظلمتوں میں ڈوبے ہوئے درندہ صفت جنگلی جانوروں سے بدتر انسانوں میں وہ نورانی اور ملکی صفات پیدا کیں جن کی مثال گزشتہ اقوام میں نہ مل سکتی ہے، نہ اس کا امکان ہے، یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت تھی۔

درفشانی نے ترے قطروں کو دریا کر دیا ☆ دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے ☆ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا
تیری فیاضی نے ذروں کو بنایا آفتاب ☆ بن گئے اونٹوں کے چرواہے زمانے کے امام

اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اگرچہ بے شمار ہیں، مگر یہ معجزہ سب سے بڑا اور کارآمد ہے کہ پوری مردہ دھرتی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تن تنہا روح ڈال کر ساری خلقت کو ابدی حیات بخشی۔ کائنات کے ربّ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھربوں صلوٰۃ وسلام نازل ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ساری خلقت پر حجت پوری فرما دی، کسی کے

پاس یہ بات کہنے کا موقع اور بہانہ نہ رہا کہ ہمارے پاس کوئی بشیر ونذیر نہیں آیا تھا۔

﴿فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ سو تمہارے پاس بشیر اور نذیر آ گیا، تم پر حجت پوری ہوگئی۔ اس کا پیغام ابدی ہے رہتی دنیا تک اس کا پیغام باقی رہے گا، وہ آخری لوگ جن پر قیامت آئے گی ان کے لئے بھی بطورِ اتمام حجت یہی ابدی پیغام کارآمد اور حجت ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، ہدایت وضلالت ہو یا جزا وسزا، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ: اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کو یاد کرو، جو اس نے تمہیں عطا فرمائی، جبکہ اس نے تم میں انبیاء بنائے، اور تمہیں بادشاہ بنایا، اور تم کو وہ کچھ دیا جو جہانوں میں سے کسی کو نہیں دیا، ﴿۲۰﴾ اے میری قوم! مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ، جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے، اور پیچھے واپس مت لوٹو، ورنہ نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے ﴿۲۱﴾ وہ کہنے لگے کہ: اے موسیٰ! یہ واقعی بات ہے کہ اس سرزمین میں بڑے بڑے زبردست لوگ ہیں، اور بیشک اس بستی میں ہرگز داخل نہ ہوں گے، جب یہ لوگ نکل نہ جائیں، سوا گروہ اس سے نکل جائیں تو ہم داخل ہو جائیں گے ﴿۲۲﴾ دو آدمیوں نے کہا: جو ڈرنے والے تھے (اللہ تعالیٰ سے) اللہ تعالیٰ نے ان پر انعام فرمایا تھا کہ تم لوگ ان پر دروازے سے داخل ہو جاؤ، سو جب تم اس میں داخل ہو گے

تو بلاشبہ تم غلبہ پانے والے ہو گے، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو اگر تم مؤمن ہو ﴿۲۳﴾ وہ کہنے لگے کہ: اے موسیٰ! ہم ہرگز کبھی بھی اس میں داخل نہ ہوں گے، جب تک کہ وہ اس میں موجود ہیں، لہٰذا تو اور تیرا ربّ دونوں جائیں، پھر دونوں جنگ کر لیں، بیشک ہم تو یہیں بیٹھے ہیں ﴿۲۴﴾ موسیٰ نے کہا کہ: اے میرے ربّ! بیشک میرے بس میں صرف میری جان اور میرا بھائی ہے، لہٰذا ہمارے اور فاسق قوم کے درمیان فیصلہ فرما دیجئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سو یہ سرزمین ان لوگوں پر چالیس سال تک حرام رہے گی، زمین میں حیران پھرتے رہیں گے سو آپ نافرمان قوم پر رنجیدہ نہ ہوں ﴿۲۶﴾

معارف و منازل

گزشتہ آیات میں اہل کتاب نے جو غلط اور باطل دعویٰ کیا تھا اس کے جواب میں ارشاد ہوا تھا: ﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ﴾ اس آیت کریمہ میں ان کی ایک خاص عہد شکنی کے بیان کے ساتھ میدانِ تیہ میں چالیس سالہ سرگردانی اور حیرانی کا بیان ہے، جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سخت عذاب ہے، چونکہ یہ سارے واقعات وحی الٰہی کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے، تو سید الانبیاء ﷺ کی نبوت پر صریح اور واضح دلیل ہیں کہ آپ ﷺ نے وحی الٰہی کی مدد سے یہ تاریخی حالات وضاحت کے ساتھ بیان فرمائے، جو کہ وحی کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے۔

مختصر واقعہ یہ ہے کہ قوم بنی اسرائیل نے جب فرعون کی چار سو سالہ غلامی سے آزادی حاصل کر لی، اور ان کا دشمن فرعون پوری فوج و حشم کے ساتھ ان کی آنکھوں کے سامنے غرق ہو کر تباہ ہوا، اور قوم بنی اسرائیل والے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت و سرپرستی میں دریا سے پار ہوئے، اور سرزمین شام کے حدود میں داخل ہوئے، تو اب انہیں اپنے آباء و اجداد کے وطن فلسطین میں جانا تھا، یہ لوگ کئی سو سال کے بعد مصر سے لوٹے تھے۔ (تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے)۔

ان کے پیچھے قوم عمالقہ نے ان کے پورے وطن پر قبضہ کر لیا تھا، یہ لوگ قوم عاد کا بقیہ تھے، جو عرصہ سے یہاں آباد ہوئے تھے، اور بڑے قد و قامت اور بڑے ڈیل ڈول والے اور قوت و طاقت والے تھے۔ بعض مؤرخین نے ان کے قد و قامت اور قوت کے بارے میں جو خلافِ عقل و واقع مبالغہ آمیز حقائق بیان کئے ہیں وہ سب واہیات اور اسرائیلیات و بے بنیاد باتیں ہیں، خاص کر عوج بن عنق وغیرہ کے بارے میں، لہٰذا انہیں نظر انداز ہی کیا جائے۔

اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ شانہ نے مقدر فرمایا تھا کہ یہ سرزمین بنی اسرائیل ہی کو ملے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ

السلام نے اوّل تو ان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلائیں، اور انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی تم پر بڑی بڑی مہربانیاں ہیں۔ آئندہ زمانہ میں تم میں کثرت کے ساتھ نبی ہوں گے، اور تم میں بہت سے بادشاہ ہوں گے، اب تک سینکڑوں سالوں سے تم لوگ قبط، یعنی مصری قوم کے ماتحت تھے، نہ تمہارے اندر نبی مبعوث ہوئے، اور نہ ہی تمہارا کوئی اقتدار رہا، اور نہ ہی تم خودمختار آزاد رہے، بلکہ خواری اور ذلت کے ساتھ مصریوں کے ماتحت غلام بنے رہے۔

ابھی اللہ تعالیٰ کا تمہارے بارے میں یہ فیصلہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے فریضۂ جہاد کے لئے، اور اپنی خوشحالی وتمدنی ترقی کی خاطر اپنی سرزمین جس پر کفار قابض ہیں ان کے ساتھ جہاد کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری نصرت فرمائیں گے، تمہیں غلبہ عطا کریں گے، کفار مغلوب ہوکر بھاگ جائیں گے، پورا ملک شام تمہارے قبضہ میں آئے گا، اور شام وفلسطین پورے خطے پر تمہارا اقتدار قائم ہوگا؛ اس طرح تمہاری کامیابی یقینی ہوگی، اب تم اپنے وطن میں داخل ہوجاؤ، یہ مقدس سرزمین تمہاری ہے، اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمادی ہے، تم پشت پھیر کر واپس نہ ہو، آگے بڑھو، جنگ کرو، تمہارے آگے بڑھنے کے ساتھ قابض کفار شکست سے دوچار ہوکر بھاگ جائیں گے، ہلاک ہوجائیں گے۔ اگر ایسا نہیں کروگے تو نقصان اٹھاؤگے۔

اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارہ نقیب اور نمائندگان کو منتخب کر کے قوم عمالقہ کی خبرگیری کے سلسلے میں بھیجا تھا، اور انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہاں کے حالات معلوم کر کے واپس آجاؤ، یہ لوگ وہاں پہنچے، جب انہوں نے قوم عمالقہ کا ڈیل ڈول، قدوقامت اور بے پناہ قوّت کا ملاحظہ کیا تو سوائے دوآدمیوں کے، یعنی یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا کے باقی سارے حواس باختہ اور بزدل ہوگئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تاکید فرمائی کہ وہاں کے لوگوں کا حال پوشیدہ رکھو، لوگوں کو ہرگز نہ بتاؤ، تاکہ بزدلی پیدا نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی نصرت ہمارے ساتھ ہے، مگر وہ لوگ نہ مانے، انہوں نے اپنے اپنے رشتہ داروں کو صورت حال، یعنی عمالقہ کی قوت سے آگاہ کیا، جس سے انہیں ڈر اور خوف پیدا ہوا، جس کے نتیجے میں پورے لشکر نے بزدلی اختیار کر کے آگے بڑھنے سے انکار کیا۔

البتہ! حضرت یوشع بن نون اور حضرت کالب بن یوقنا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات پر عمل کیا، اور نہ صرف یہ کہ بنی اسرائیل سے عمالقہ کا حال پوشیدہ رکھا، بلکہ بنی اسرئیل کو ہمت اور حوصلہ دلایا کہ چلو آگے بڑھو، دروازہ میں داخل ہوجاؤ، پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی نصرت ہوتی ہے؟ جوں ہی تم داخل ہوجاؤگے وہ نکل بھاگیں گے، اور تم

کو فوری غلبہ حاصل ہوگا۔ مؤمن ہو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو، کیونکہ مؤمن کا کام اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پکا اور سچا ہے، جب تمہیں یہ بشارت مل رہی ہے کہ یہ سرزمین اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے، اور ابھی ابھی تمہارے حق میں فیصلہ ہونے والا بھی ہے، پھر کیوں سستی اور دیر کرتے ہو؟ بسم اللہ کر کے جہاد شروع کرو۔

اسی کے ساتھ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام نے بھی انہیں حوصلہ دلایا، اور ہر ممکن سمجھایا، مگر انہوں نے ایک نہ مانی، اور اپنی ضد پر قائم رہے، اور آپس میں کہنے لگے: اے کاش! ہم مصر سے یہاں نہ آتے، وہیں رہ جاتے، اس وقت وہ سارے دھاڑیں مار کر روتے رہے، اور کہتے رہے کہ ہم مصر ہی میں ہوتے تو اچھا تھا، ہم کیوں یہاں آکر مصیبت میں پھنس گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے برملا کہہ دیا کہ ہم ہرگز اس دروازہ میں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ وہاں سے نکل نہ جائیں، انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی کہا کہ ان کے شہر میں ہوتے ہوئے نہ ہم داخل ہو سکتے ہیں، اور نہ ہی لڑ سکتے ہیں، لڑنا ہمارے بس کا نہیں، تو اور تیرا ربّ دونوں وہاں جا کر لڑیں، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کا یہ ڈھنگ اور انکار دیکھا، اور سنا تو بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ: اے میرے ربّ! میرا بس ان لوگوں پر نہیں چلتا، مجھے اپنے نفس پر قابو ہے، اور اپنے بھائی پر، ہم دونوں کچھ بھی نہیں کر سکتے، اور آپ کے کسی بھی حکم سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے، مگر ہم دونوں ایک طاقتور دشمن کے ساتھ کیا لڑ سکتے ہیں، اور کیا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں، لہٰذا ہمارے اور فاسقوں کے درمیان فیصلہ فرما دیجئے۔

تو اللہ تعالیٰ شانہ نے فیصلہ فرما دیا کہ یہ سرزمین ان فاسقوں پر چالیس سال تک حرام ہے، اور وہ اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے چالیس سال داخلہ سے محروم رہیں گے۔ اس چالیس سالہ مدت میں زمین کے ایک محدود قطعہ میں محبوس ہوکر سرگرداں اور حیران پھرتے رہیں گے۔ یہ قطعہ لمبائی میں ستائیس اور چوڑائی میں نو فرسخ کے قریب قریب تھا، وہ چالیس سال تک اونٹوں کی طرح اسی میں گھومتے پھرتے رہے، صبح کو جہاں سے چلتے تھے، شام کو اسی جگہ میں کھڑے ہوتے تھے۔ اس وقت ان کی تعداد چھ لاکھ تھی۔

اس عرصہ میں حضرت ہارون علیہ السلام کی پہلے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چند وقت بعد وفات ہوگئی، اسی طرح اس چالیس سالہ مدت میں جتنے معمر بنی اسرائیلی لوگ تھے ہزاروں کی تعداد میں وفات پاگئے، یعنی تقریباً

نافرمان لوگ اکثر بیشتر مرتے گئے، اور نئی نسل میدان میں اتر گئی۔ اس وقت نئی نسل کی قیادت وسرپرستی حضرت یوشع علیہ السلام اور آپؑ کے دست راست رفیق حضرت کالب کے ہاتھ میں تھی، تو نئی نسل کی دینی صلاحیتوں کو ابھار کر حضرت یوشع علیہ السلام نے مقدس سرزمین کو فتح کرلیا، اور عمالقہ مشرکین کو تہہ تیغ کر کے قتل کیا، اور باقی لوگوں کو مار بھگایا، اس طرح یہ منصوبہ اپنی تکمیل کو پہنچا۔

فائدہ:

مفسرین کرام اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں ایک ہزار نبی مبعوث ہوئے۔

﴿وَآتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو باقی تمام امتوں پر فضیلت دے دی گئی ہے، حالانکہ امت محمدیہ خیر الامم ہے، اس کو تمام امتوں پر فضیلت وبرتری حاصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی فضیلت جزوی ہے، اور امت محمدیہ کی فضیلت کُلی ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کے زمانہ تک جو امتیں تھیں ان کو جو عطا فرمایا تھا ان میں سے سب سے زیادہ بنی اسرائیل کو دیا تھا، اگلی پچھلی تمام امتیں اس سے مراد نہیں ہیں۔ اس لئے مفسرین کرام "اَلْعٰلَمِيْنَ" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "اَلْمُرَادُ مِنْهُ عَالَمِي زَمَانِهِمْ"۔

اور اور علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یوں نقل کیا ہے، یعنی: "اَلْمَنُّ، وَالسَّلْوٰى، وَالْحَجَرُ، وَتَظْلِيلُ الْغَمَامِ"۔ یعنی آیت میں جو یہ فرمایا ہے کہ تمہیں وہ کچھ دیا ہے جو کسی کو نہیں دیا، اس سے یہ چند مخصوص چیزیں مراد ہیں، جیسے منّ وسلویٰ، پانی کا پتھر جس سے چشمے جاری ہوئے، اور بادلوں کا سایہ وغیرہ۔ عمومی فضیلت کوئی مراد نہیں، کیونکہ یہ مخصوص چیزیں بحیثیتِ امت کے بنی اسرائیل کے علاوہ اور کسی امت کو نہیں دی گئیں۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ وہ لوگ میدانِ تیہ میں صبح سے شام تک سفر کر کے چلتے تھے، اور شام کو اسی جگہ کھڑے ہوئے ہوتے تھے، ان کا روزانہ کا یہ سفر مصر تک پہنچنے کے لئے ہوتا تھا، جو ان کے مقدر میں نہ تھا، ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے۔ ہاں وہ سرزمینِ مصر سے بہت مانوس تھے، اس لئے وہاں جانا چاہتے تھے۔

رہا یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی: ﴿فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴾ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے اور نافرمان قوم کے درمیان فیصلہ فرمادیجئے کہ یہ لوگ جس سزا کے مستحق ہیں ان کو وہ سزا دے دیں، اور

ہم جس انعام کے مستحق ہیں ہمیں وہ انعام عطا فرما دیجئے۔ یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔[روح المعاني]

فائدہ:

بنی اسرائیل کے بدبختوں نے اپنے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا کہ ہم لوگ یہیں بیٹھے ہیں، تو اور تیرا ربّ دونوں جا کر لڑو۔ یہ کتنا بزدلانہ اور حماقت سے بھرا کافرانہ قول ہے؟ مگر ہمارے پیغمبر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترجمانی کرتے ہوئے میدان بدر میں حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: یارسول اللہ! آپ ہمیں حکم دیں جو آپ کا حکم ہوگا ہم اس پر جان کی بازی لگا کر پورا کریں گے، ہم آپ کے دائیں بائیں آگے پیچھے سے، یعنی ہر سمت سے لڑنے پر تیار ہیں، ہم وہ نہیں کہتے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اپنے نبی سے کہا تھا کہ تو اور تیرا ربّ دونوں جا کے لڑو۔[بخاري وغيره]

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ ۘ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ ۚ
قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ ۖ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴿٢٧﴾ لَئِنْ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا
بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ ۖ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿٢٨﴾ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ تَبُوءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ
فَتَكُونَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ﴿٢٩﴾ فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُ
فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٣٠﴾ فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِي سَوْءَةَ أَخِيهِ ۚ
قَالَ يَا وَيْلَتَا أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَٰذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِيَ سَوْءَةَ أَخِي ۖ فَأَصْبَحَ مِنَ النَّادِمِينَ ﴿٣١﴾

ترجمہ: اور آپ ان کو آدم کے دو بیٹوں کا قصہ صحیح طور پر پڑھ کر سنائیے، جبکہ ان دونوں نے ایک ایک نیاز پیش کی، سو ان میں سے ایک کی نیاز قبول کر لی گئی، اور دوسرے کی نیاز قبول نہ کی گئی، اس نے کہا: میں تجھے ضرور بالضرور قتل کر دوں گا، دوسرے نے کہا کہ: اللہ تعالیٰ صرف تقویٰ والوں سے قبول فرماتا ہے ﴿٢٧﴾ یہ یقینی بات ہے کہ اگر تو نے میرے قتل کرنے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے تیری طرف اپنا ہاتھ بڑھانے والا نہیں ہوں گا، بیشک میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں جو سب جہانوں کا پروردگار ہے ﴿٢٨﴾ بلاشبہ میں چاہتا ہوں کہ تو

میرے گناہ اور اپنے گناہ اپنے سر دھر لے، پھر تو دوزخ والوں میں سے ہو جائے، اور یہ ظالموں کی سزا ہے۞ سو اس کے نفس نے اسے اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کرلیا، سو اس نے اسے قتل کر دیا جس کی وجہ سے وہ نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا۞ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا، وہ زمین کو کُرید رہا تھا تاکہ وہ اسے دکھادے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کیسے چھپائے، کہنے لگا: افسوس میری حالت پر! کیا میں اس سے عاجز ہو گیا کہ اس کوے کی طرح ہو جاؤں، سو اپنے بھائی کی لاش کو چھپادوں؟ پھر وہ پچھتانے والوں میں سے ہو گیا۞

معارف ومنازل

ہابیل وقابیل کا واقعہ:

قرآن کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کے ان دونوں بیٹوں کا نام ذکر نہیں کیا، صرف ''اِبْنَیْ اٰدَمَ'' کہہ کر مجمل چھوڑ دیا۔ البتہ تورات میں ان کے یہی نام مذکور ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں ان کی شادی کا قصہ بھی مذکور نہیں ہے، صرف قربانی (نذر) کا ذکر ہے۔ مشہور یہی ہے کہ یہ دونوں حضرت آدم علیہ السلام کے صلبی بیٹے تھے، حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے البدایہ والنہایہ میں حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ سے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے، جو حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس اور بعض دوسرے صحابہ (رضوان اللہ علیہم) سے منقول ہے۔

اس کا مضمون یہ ہے کہ نسل انسانی میں اضافہ کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کا یہ دستور تھا کہ حضرت حوا علیہا السلام سے جڑواں (جوڑیا) پیدا ہونے والے لڑکی اور لڑکے کا عقد نکاح دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے جڑواں بچوں (لڑکا اور لڑکی) کے ساتھ کر دیا کرتے تھے، اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ پیش تھا، قابیل عمر میں بڑا تھا، اور اس کی ہمشیرہ ہابیل کی ہمشیرہ سے حسین وجمیل خوبصورت تھی، اس لئے قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمشیرہ سے اس کی شادی ہو، اور ہابیل کی شادی اس کی ہمشیرہ سے ہو۔

معاملہ کو ختم کرنے کے لئے حضرت آدم علیہ السلام نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کریں جس کی قربانی منظور ہو جائے وہی اپنے ارادہ کے پورا کر لینے کا مستحق ہے، جیسا کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے، اس زمانہ میں قربانی (نذر) کی قبولیت کا یہ الہامی دستور تھا کہ نذر و قربانی کی چیز کسی اونچی جگہ پر رکھ دی جاتی اور آسمان سے قدرتی آگ نمودار ہو کر اس کو جلا دیتی تھی۔ اس قانون کے مطابق ہابیل نے اپنے ریوڑ میں سے

ایک بہترین دنبہ خدا تعالیٰ کی نذر کیا، اور قابیل نے اپنی کھیتی کے غلہ میں سے ردّی قسم کا غلہ قربانی کے لئے پیش کیا، دونوں کی حُسنِ نیت اور بُری نیت کا اندازہ اسی عمل سے ہو گیا، لہٰذا حسبِ دستور آسمانی آگ نے آ کر ہابیل کی نذر (قربانی) کو جلا دیا، اور اس طرح قبولیت کا شرف اس کے حصہ میں آیا۔ قابیل اپنی اس ناکامی اور توہین کو کسی طرح برداشت نہ کر سکا، اور اس نے غیظ و غضب میں آ کر ہابیل سے کہا کہ میں تجھ کو قتل کئے بغیر نہ چھوڑوں گا، تاکہ تو اپنی مراد کو نہ پہنچ سکے۔ ہابیل نے جواب دیا کہ میں تو کسی طرح تجھ پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، باقی تیری جو مرضی ہو وہ کر لے، میں اپنے ربّ سے ڈرتا ہوں، اور تجھے مارنے سے پرہیز کرتا ہوں۔

رہا قربانی کا معاملہ، سو اللہ تعالیٰ کے یہاں تو نیک نیت ہی کی قربانی قبول ہو سکتی ہے، وہاں بدنیت کی نہ دھمکی کام آسکتی ہے، اور نہ بے وجہ کا غم و غصہ۔ قابیل پر اس نصیحت کا اُلٹا اثر پڑا، اور اس نے غصہ سے مشتعل ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔ [قصص القرآن]

قتل کے بعد قابیل حیران تھا کہ اس نعش کا کیا کرے، ابھی تک نسلِ آدم موت سے دوچار نہیں ہوئی تھی، اور اسی لئے حضرت آدم علیہ السلام نے میت کے بارے میں کوئی حکمِ الٰہی کسی کو نہیں سنایا تھا۔ یکایک اس نے دیکھا کہ ایک کوّے نے زمین کرید کرید کر گڑھا کھودا، قابیل کو تنبہ ہوا کہ مجھے بھی اپنے بھائی کے لئے اسی طرح گڑھا کھودنا چاہئے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ کوّے نے دوسرے مردے کوّے کو اس گڑھے میں چھپا دیا۔ قابیل نے یہ دیکھا تو اپنی ناکارہ زندگی پر بے حد افسوس کیا، اور کہنے لگا کہ میں اس حیوان سے بھی گیا گزرا ہوں کہ اپنے اس جرم کو چھپانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا، ندامت سے سر جھکا لیا، اور پھر اسی طرح اپنے بھائی ہابیل کی نعش کو سپردِ خاک کر دیا۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ: ''سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا میں جب بھی کوئی ظلم سے قتل ہوتا ہے تو اس کا گناہ حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے (قابیل) کی گردن پر ضرور ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ظالمانہ قتل کی ابتدا کی، اور یہ ناپاک طریقہ جاری کیا۔ [أحمد وغیرہ]

دمشق کے شمال میں جبل قاسیون پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے، جو مقتل ہابیل کے نام سے مشہور ہے۔

ہابیل اللہ تعالیٰ کا مقبول بندہ تھا، جس کو ابدی سعادت نصیب ہوئی، اور وہ اولادِ آدم علیہ السلام میں پہلا مرنے والا اور پہلا مدفون فی الارض، اور پہلا شہید ہے، جبکہ قابیل راندۂ درگاہ، اور پہلا قاتل ہے، جو ابلیس کی تعلیم اور سکھانے پر

اپنے بھائی کو قتل کر کے ابدی جہنمی اور کافر ہوا۔ شیطان نے اسے قتل کا طریقہ سکھایا، مگر تدفین کا طریقہ نہیں بتایا، تاکہ وہ ذلیل ہو کر بھائی کی لاش کندھوں پر اٹھا کر خواری کے ساتھ گھومتا پھرے، اور خوار ہو جائے، حتیٰ کہ کوے نے اسے تدفین کا طریقہ بتا کر اس کی جان خلاصی کرا دی۔

جب فتنے زیادہ ہوں تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

اخیر زمانہ میں فتنے زیادہ ہوں گے، اس وقت قتل وخون بہت زیادہ ہوگا، ادنیٰ چیزوں پر اور بلا وجہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کریں گے، ایسے وقت میں مسلمانوں کو تعلیم اور ہدایت دی جاتی ہے کہ حضرت ہابیل کی سنت پر عمل کریں، اور کسی پر دست درازی نہ کریں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت سے پہلے اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح فتنے ہوں گے، ان فتنوں میں انسان صبح مؤمن ہوگا اور شام کو کافر ہوگا، اور شام کو مؤمن ہوگا اور صبح کو کافر ہوگا، بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا، اس وقت تم اپنی کمانوں کو توڑ دینا، اور ان کی تانتوں کو کاٹ دینا، اور اپنی تلواروں کو پتھروں سے کچل دینا، اور اپنے گھروں کے اندر بیٹھ جانا، پھر بھی اگر تم میں سے کسی کے پاس کوئی شخص قتل کرنے کے لئے پہنچ جائے تو آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں جو اچھا بیٹا تھا اس کی طرح ہو جانا۔ [مشکوۃ]

یعنی ہابیل شہید کی طرح ہو جانا قتل منظور کر لینا، اور خود قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھانا۔ حضرت ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: اس امت میں سے سب سے پہلے جس نے اس سنت ہابیل پر عمل کیا وہ حضرت امیر المؤمنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے، وہ قتال اور دفاع سب کچھ کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے مقتول ہونا پسند کر لیا، اور قتال کرنا منظور نہ کیا۔ فرمایا:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ﴾ اور ان کو سنایئے حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں کی سچی خبر، یعنی ایسی خبر جو گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی کتابوں کی صراحت کے موافق ہے۔

﴿اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا﴾ جب دونوں نے قربانی پیش کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی میں آپ کی اولاد اور اولاد کی نسل چالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ [مظهري]

﴿فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ﴾ پس تقویٰ واخلاص کی بناء پر ہابیل کی قربانی قبول کر لی گئی، اور آسمانی آگ نے اس کو کھا لیا، اور دوسرے قابیل بدنیت کی قربانی نہیں قبول کی گئی، جس سے وہ برافروختہ

ہوا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام شام سے کعبۃ اللہ شریف کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے تو قابیل بڑے غصے میں ہابیل کے پاس پہنچا، اور دھمکی دے کر کہا:

﴿قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ﴾ ہابیل سے کہا میں ضرور تجھے قتل کروں گا۔ ہابیل نے کہا کیوں؟ قابیل نے کہا کہ تیری قربانی قبول ہوئی اور میری نہیں ہوئی؟ اور میرا نکاح روک لیا گیا؟ تو ہابیل نے کہا: اس میں میرا ہاتھ نہیں، اور تیرا ہی قصور ہے۔

﴿قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ انہی کی قربانی قبول کرتا ہے جو اس سے ڈرتے ہیں۔ یہاں متقی سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق پر ہوتے ہیں، وہی لوگ ڈرنے والے ہوتے ہیں، اور یہ امر مسلّم اور واضح ہے کہ تقویٰ کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ تقویٰ کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے کسی عمل کو قبولیت کا شرف بخشا ہے تو یہ بات زمین بھر سونے سے مجھے زیادہ محبوب ہوگی۔ [مظهري، ابن عساكر] قبول شدہ عمل اگر چہ قلیل ہو مگر اس کا مقام نہایت بلند اور اونچا ہوگا، اور یہ شرف تقویٰ اور اخلاص کا ثمرہ ہے۔ [عمر بن عبد العزيز رحمه الله]

﴿لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ہابیل نے جواب میں کہا: اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے لئے دست درازی نہیں کروں گا، کیونکہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، جو سارے جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے فرمایا: خدا کی قسم! مقتول قاتل سے زیادہ طاقتور تھا، لیکن تقویٰ نے اس کو دست دراز کرنے سے روک دیا۔

﴿اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ﴾ یہ قابیل کو خطاب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اپنا گناہ بھی لے، اور میرا گناہ بھی لے، ان سب کو اپنے اوپر اٹھا لے، اور دوزخ والوں میں سے ہو جائے، اور یہ ظالموں کی جزا ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرے جو گناہ ہیں ان کا بوجھ تو تیرے اوپر ہے ہی، اور ان میں میرے قتل کا گناہ بھی اپنے سر پر دھر لے، یہ سب گناہ مل کر تیرے دوزخ میں جانے کا سبب بن جائیں گے۔

﴿فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ پھر اس کے نفس نے اس کو اپنے

بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا، پھر اس نے اسے قتل ہی کر دیا، اور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، حضرت آدم علیہ السلام کے دستور کی خلاف ورزی، والدین کی نافرمانی اور ان کی ناراضی، بھائی کا قتل، صلہ رحمی کی پامالی، بلاوجہ ارتکابِ گناہِ کبیرہ، ظلم وزیادتی، اور گناہوں کا بوجھ، قیامت تک جتنے قتل ہوں گے ان کا ایک حصہ اس پر ڈالا جائے گا، جہنم کا استحقاق، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے محرومی وغیرہ۔ یہ سارے خسارے کے اسباب ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قتل کے بعد اس کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مقتول بھائی کی نعش کا کیا کرے، کیونکہ روئے زمین پر یہ پہلا مردہ تھا، لاش بوری میں ڈال کر کندھوں پر ڈال دی، چالیس روز یا، ایک سال تک پھرتا رہا، جب لاش بگڑنے لگی، اور پرندے درندے بھی گھیرے رہے کہ کب لاش کو پھینکے اور وہ اسے نوچ لیں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے دو کوّے بھیجے، دونوں باہم لڑ پڑے، ایک مر گیا، دوسرے کوّے قاتل نے پنجوں اور چونچ سے زمین میں گڑھا کھودا، مردہ کوّے کو گڑھے میں ڈال کر اس پر مٹی ڈال کر اسے دفن کر کے چھپا دیا۔ قابیل یہ سارا ماجرا معائنہ کرتا ہے، تب اسے سمجھ آیا، اور اس نے کوّے کی نقالی کر کے مقتول بھائی کو دفنایا، اور اپنی حماقت ونادانی پر افسوس کرتا رہا۔ اسی کو فرمایا:

﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ﴾ ہائے افسوس! کیا میں اس کوّے کی طرح ہونے سے بھی گیا گزرا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا؟

﴿فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ﴾ پھر سال بھر تک پشت پر لادے پھرتے پر پشیمان ہو گیا۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي
الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ
جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝

ترجمہ: اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ جو بھی کوئی شخص کسی شخص کو بلا عوض جان کے یا بغیر کسی فساد کے جو زمین میں ہو قتل کر دے، تو گویا اس قاتل نے سب لوگوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی جان کو زندہ رکھا تو گویا

اس نے سب لوگوں کو زندہ کر دیا، اور یہ واقعی بات ہے کہ ان کے پاس ہمارے رسول کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے، پھر اس کے بعد ان میں سے بہت سے لوگ زمین میں زیادتی کرنے والے ہیں ﴿۳۲﴾

معارف ومنازل

﴿مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ﴾ یعنی اس وجہ سے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی پر ظلم وزیادتی کرتے ہوئے اسے قتل کیا، ہم نے بنی اسرائیل پر یہ بات لکھ دی، یعنی ان کے لئے شریعت بنادی، اور اس کا اعلان کر دیا کہ جو بھی کوئی شخص کسی شخص کو قتل کر دے، اور یہ قتل کسی جان کے عوض نہ ہو، اور زمین میں جو فساد ہوا سے روکنے کیلئے بھی نہ ہو، تو گویا کہ اس قاتل نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی جان کو زندہ کر دیا، یعنی کسی جان کو ہلاکت سے بچایا، تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندہ کر دیا۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس آیت میں جو تشبیہ ہے اس کے بارے میں مفسرین حضرات نے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، ان میں ایک قول حضرت مجاہد تابعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے، اور وہ یہ کہ جو شخص کسی بھی ایک جان کو بلا وجہ شرعی قصداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم کا داخلہ اور اللہ تعالیٰ کا اس پر غضب ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی اس پر لعنت ہوگی، اور اس کے لئے بڑا عذاب ہے، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۹۳ میں اس کی تصریح ہے۔ اگر کوئی شخص تمام لوگوں کو قتل کر دے تو اس کی سزا بھی یہی ہے، اس سے زیادہ نہیں ہے، لہٰذا ایک جان کا قتل کرنا اور سب جانوں کا قتل کرنا برابر ہوا، الہٰذا کوئی شخص کسی ایک جان کو بھی قتل نہ کرے۔ اور اسی طرح سے جو شخص قتل کر رہا تھا، اور وہ قتل سے باز آیا، یعنی رُک گیا تو گویا اس نے سب آدمیوں کو بچا لیا۔

اور ایک قول علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نقل کیا ہے کہ ایک جان کو قتل کرنے والے کو ایسا گناہ ہوتا ہے جیسا کہ سب لوگوں کو قتل کرنے کا گناہ ہے۔ یہ قول آیت کے ظاہری الفاظ سے قریب تر ہے، اور حدیث شریف میں جو یہ فرمایا ہے: "لَاتُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا اِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ الْاَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا لِاَنَّهٗ اَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ" کہ جو شخص بھی ظلماً قتل ہوگا آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے پر بھی اس کے قتل کی شرکت رہے گی، کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کی بنیاد ڈالی۔ [متفق علیہ] اس حدیث سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص ہے، ان پر عذاب میں تغلیظ اور تشدید

فرمائی۔ اس تغلیظ کی وجہ بعض مفسرین نے لکھی ہے کہ بنی اسرائیل پر سب سے پہلے کتاب الٰہی، یعنی تورات شریف میں قتلِ نفس کا ممنوع وحرام ہونا نازل ہوا تھا، اگر چہ اس سے پہلے بھی قتل نفس ممنوع تھا، لیکن کسی کتابِ الٰہی میں ممانعت وارد نہیں ہوئی تھی، اوران لوگوں میں سرکشی اور طغیانی بھی بہت زیادہ تھی، حتیٰ کہ بہت سے انبیاء کرام علیہم السلام کو انہوں نے قتل کیا، اس کے بعد کسی جان کو بچانے کی فضیلت بیان فرمائی:

﴿وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ﴾ اور جس کسی نے کسی جان کو زندہ رکھا، یعنی کسی کی زندگی کے بچانے کا ظاہری سبب بن گیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندہ کیا۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی نافرمانی کا ذکر فرمایا:

﴿وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ؗ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝﴾

اوران کے پاس ہمارے رسول کھلی دلیلیں لے کر آئے، پھر بھی ان میں سے بہت سے لوگ زمین میں اسراف کرنے والے، یعنی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اس سے یہ مطلب بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ: ﴿فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ﴾ سے وہ زیادتیاں اور بدعنوانیاں مراد ہوں جو نبی آخر الزمان سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اہلِ کتاب کرتے رہتے تھے، اور مسلمانوں کے عموماً اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصاً درپے آزار رہتے تھے، اور طرح طرح کے فساد برپا کرتے رہتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قابیل کی اس سفاکی کے باعث ہم نے سب لوگوں کو عموماً، اور بنی اسرائیل کو خصوصاً یہ حکم دے دیا، اوران کے لئے یہ فرمان وقانون مقرر کردیا کہ دیکھو! قتل بہت بری چیز ہے، جو شخص کسی انسان کو بلا کسی انسان کے قتل کئے، اور بدون زمین میں فساد برپا کئے قتل کر ڈالے گا، کیونکہ یہ دونوں باتیں تو یقیناً اس قابل ہیں کہ ان میں سے کسی ایک یا دونوں کے مرتکب کو قتل کرنے کی اجازت ہے، باقی ان کے علاوہ اگر کوئی شخص کسی بے گناہ کو قتل کرے گا، تو یوں سمجھو کہ گویا اس نے ایک ایسا سلسلہ قائم کردیا کہ جس کی وجہ سے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا۔ اور جس شخص نے کسی کو قتل سے بچالیا، اور ہلاکت سے چھڑالیا، تو یوں سمجھو کہ اس نے ایک ایسا کام کیا جس سے تمام بنی نوع انسان کی بقا کا سامان ہوگیا۔ اور ہم نے اس مضمون کی تاکید کے لئے دلائل بھیجے، اور ہمارے رسول اس قتل کی مذمت میں بڑے بڑے دلائل لے کر آتے رہے۔

لیکن باین ہمہ یہ لوگ اپنی شرارتوں اور بدعنوانیوں سے باز نہ آئے، یہاں تک کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم

کے زمانے میں بھی ان لوگوں کی زیادتیاں اور حد سے تجاوز کرنا برابر جاری ہے، بلکہ اس نافرمان قوم کا ظلم وستم اور ہر قسم کی بے انصافی، کبر وغرور اور استبداد قیامِ قیامت تک نہ محض اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ، بلکہ تمام اقوامِ عالم کے ساتھ جاری رہا ہے، کیونکہ جس قوم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیظ وغضب اور ضلالت وگمراہی کی مہر لگ چکی ہے اس سے کسی خیر وبھلائی کی توقع رکھنا سراسر عبث اور بے سود ہے۔

موجودہ دنیا میں یہودیت ونصرانیت کا اقوامِ عالم کے لئے جو منفی کردار ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ یہ لوگ کسی قابیل سے کم نہیں ہیں، اسی وجہ سے سیاق وسباق کے تحت ان کے حالات کے ضمن میں قابیل جیسے مردود ورانده درگاہ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ قابیل کے کفر کے متعلق کوئی صحیح روایت اگر چہ نہیں، بعض محققین نے اس کے مؤمن عاصی ہونے کا قول کیا ہے، مگر صاحب تفسیر مظہری جن کا شمار اصحاب باطن محققین میں ہے نے بیان کیا ہے کہ قابیل اپنی بہن اقلیمہ کو لے کر عدن کی طرف چلا گیا، اور وہاں آتش پرستی کرنے لگا، اور اس کی اولاد نے آلات لہو ولعب اور گانے بجانے کی چیزیں ایجاد کیں، اور یہ سب طوفان نوح میں غرق ہوئے، یہ مضمون مظہری میں قدرے تفصیل کے ساتھ ہے، اور قرینِ قیاس بھی ہے کہ وہ کفر پر مرا، جس نے حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت کا کھلم کھلا انکار کیا، اور حضرت آدم علیہ السلام کے فیصلے سے منحرف ہوا، اور اپنی جڑواں ہمشیرہ اقلیمہ کے ساتھ نکاح کر لیا۔ واللہ اعلم

إِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٣٣﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٤﴾

ترجمہ: جو لوگ اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں، اور زمین میں فساد کے لئے دوڑتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ ان کو قتل کیا جائے، یا ان کو سولی پر چڑھایا جائے، یا ان کے ہاتھ پاؤں جانب مخالف سے کاٹ دیئے جائیں، یا ان کو جلاوطن کیا جائے، یہ ان لوگوں کے لئے دنیا میں رسوائی ہے، اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے ﴿٣٣﴾ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کر لی اس سے پہلے کہ تم ان پر قدرت پاؤ، سو جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ غفور ہے، رحیم ہے ﴿٣٤﴾

معارف ومنازل

زمانۂ نبوت میں ایک واقعہ پیش آیا، جو آیت بالا کے نازل ہونے کا سبب بن گیا،اور رہزنوں، ڈکیتی کرنے والوں کے بارے میں مستقل ایک قانون بن گیا۔صاحب اسباب النزول نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ بنی عکل اور بنی عرینہ کے چند آدمی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ؛ جو آٹھ افراد تھے، ان لوگوں نے (ظاہری طور پر اسلام قبول کرلیا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسلام پر بیعت کا شرف بھی بخشا، پھر ان کو مدینہ کی آب وہوا راس نہیں آئی، ان کو جلندھر استسقاء ہوگیا، ان کے پیٹ بڑے ہوئے اور مسلسل بخار میں مبتلا ہوئے۔

جب آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کے مرض کی کیفیت بیان کی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرض کے علاج کے متعلق ان سے فرمایا: تم جاؤ جنگل میں صدقہ (بیت المال) کے جو اونٹ چرتے ہیں ان کے محافظ گلہ بانوں کے ساتھ رہو، اور ان اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پیتے رہو، ان لوگوں نے اس مشورے کو بطیب خاطر منظور کیا، اور مدینہ سے نکلے، وہاں جا کر جنگل میں چرواہوں کے ساتھ رہنے لگے، اور انہوں نے اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پیا، پھر جب مکمل تندرست اور صحت یاب ہو گئے، تو چرواہے کو قتل کیا، جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا بیٹا تھا، جن کا نام یسار تھا، رضی اللہ عنہ، اور تمام اونٹوں کو ہانک کر لے گئے۔

ان کا علاقہ مکہ شریف سے مشرق کی جانب عرفات کے قریب تھا، وہ وہاں جا رہے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعۂ وحی اس کی اطلاع ہوئی، تو ان کے پیچھے آدمی بھیجے، ان کو پکڑ کر لایا گیا، اور خدمتِ عالیہ میں پیش کیا گیا، اس بارے آیات کریمہ کا نزول ہوا، اور ان کی سزا بتائی گئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے گئے، اور ان کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیر دی گئی (جس سے وہ اندھے ہوگئے، کیونکہ انہوں نے چرواہوں کو بھی اسی طرح ہلاک کیا تھا، اور ان کے ہاتھ پاؤں تلف کیے تھے) پھر حرہ کے میدان میں دھوپ میں ڈال دیئے گئے، یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ [متفق علیه، أسباب النزول]

بعض علماء نے اس آیت سے مشرکین مراد لئے ہیں۔ بعض نے مرتدین مراد لئے ہیں۔ بعض نے کہا وہ باغی مسلمان مراد ہیں جو مسلمان حاکم کی اطاعت سے نکل جائیں اور ملک میں لوٹ مار کرتے پھریں، اور بدامنی پھیلائیں۔ مگر راجح یہی ہے کہ آیت کو عام رکھیں تاکہ تمام جارحانہ غیر شرعی کارروائی کرنے والوں پر منطبق ہو جو اسلامی مملکت کے نظام کو درہم برہم کرنے کے درپے ہوں۔

فائدہ:

احناف رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک اونٹ کا پیشاب ناپاک ہے نجاستِ خفیفہ کے ساتھ۔ دیگر حضرات اسی روایت سے استدلال کر کے اسے طاہر اور پاک کہتے ہیں۔ یہ مسئلہ کتبِ حدیث کی شروحات میں تفصیلاً مذکور ہے۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ اونٹ کے پیشاب پینے کی جو اجازت ان لوگوں کو دی گئی تھی وہ اس وجہ سے تھی کہ ان لوگوں کے بارے میں آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دے دی گئی تھی کہ وہ مرتد ہو جائیں گے، پوری تفصیل شروحات میں دیکھیں۔

ڈاکو اور رہزنوں کی چار سزائیں:

آیت کریمہ میں ڈاکوؤں کے لیے چار سزاؤں کا ذکر ہے:

(۱) قتل کرنا۔ (۲) سولی پر چڑھانا۔ (۳) جانب مخالف سے ہاتھ پاؤں کاٹنا۔ (۴) شہر بدر یعنی جلاوطن کرنا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ چار سزائیں مختلف جرائم کے اعتبار سے مقرر ہیں، اگر ڈاکوؤں نے قتل بھی کیا ہو اور مال بھی لیا ہو تو قتل کیے جائیں گے، اور سولی پر چڑھائے جائیں گے۔ اور اگر قتل کیا ہو اور مال نہ لیا ہو تو قتل کیے جائیں گے۔ اور اگر مال لیا ہو اور قتل نہ کیا ہو ہاتھ پاؤں جانب مخالف سے کاٹ دیئے جائیں گے۔ اور اگر صرف کہیں رہزنی کے لئے بیٹھ گئے ہوں جس سے لوگ خوفزدہ ہوں تو ان کو شہر بدر یعنی جلاوطن کیا جائے گا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ جلاوطن کر کے آبادی سے دور رکھا جائے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جیل میں ڈال دیا جائے جب تک توبہ نہ کریں جیل ہی میں رکھا جائے، اگرچہ یہ سلسلہ موت تک ہو۔ علامہ محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ نے دونوں باتوں کو جمع کر دیا، وہ کہتے ہیں کہ اسے اپنے شہر سے دور کسی دوسرے شہر کی جیل میں ڈال دیا جائے یہاں تک کہ توبہ کرے۔

حضرت مکحول تابعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے جیل میں رکھنے کا سلسلہ جاری فرمایا، اور فرمایا: میں بند و قید میں رکھوں گا تاکہ یہ وہاں کے لوگوں کے لئے مصیبت نہ بنیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ امیر المؤمنین کو اختیار ہے کہ چاروں سزاؤں میں سے جو بھی سزا جس ڈاکو کے لئے اختیار کرے کر سکتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک یہ چاروں سزائیں مختلف احوال کے لئے نہیں ہیں، لیکن امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہوئی ہے۔

فائدہ:

حدود میں کبھی کوئی حد حق شرع ہوتی ہے، کبھی بندہ کا حق ہوتا ہے، یہ قتل کرنا اور ہاتھ پاؤں کاٹنا حق شرع ہے، شرعی سزا کے طور پر ہے، جس کو قتل کرنا ہو اس کے اولیاء اگر معاف کردیں تب بھی معاف نہیں کیا جائے گا، ان کے معاف کرنے کے باوجود اسے قتل کردیا جائے گا۔ اسی طرح سے اگر اس نے مال معاف کردیا جس کا مال لیا ہے تب بھی سزا معاف نہیں ہوگی۔

ڈکیتی کے طور پر مال لوٹنے میں چونکہ چوری سے بڑھ کر جرم ہے جس کی وجہ سے امن عامہ فوت ہوجاتا ہے، اور معاشرہ غیر یقینی شکل اختیار کرلیتا ہے، اس لئے ڈکیتی کی سزا دہری ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ چوری کرنے کی وجہ سے پہلی بار داہنا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، اگر دوبارہ چوری کرلے تو بایاں پاؤں کاٹا جاتا ہے، لیکن ڈکیتی میں پہلی ہی مرتبہ دونوں سزائیں مشروع کی گئی ہیں، اور بیک وقت دونوں کاٹے جائیں گے۔ اسی طرح سے قتل کرنے کی صورت میں تمام ڈاکوؤں کو قتل کیا جائے گا جنہوں نے کسی جگہ جماعتی طور پر بیٹھ کر کسی کو قتل کیا ہو۔ اگر ان میں سے ایک ہی شخص نے کسی کو قتل کیا ہو تب بھی سب کو قتل کیا جائے گا، کیونکہ یہ قتل قصاص کے اصول پر نہیں ہے، بلکہ عامۃ الناس کا امن و سلامتی فوت کرنے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرنے کے لئے نکلنے کی سزا کے طور پر ہے۔

﴿ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ کہ یہ ان لوگوں کی دنیا میں رسوائی ہے، مصلوب ہوں گے، سولی پر چڑھیں گے، اور ہاتھ پاؤں کٹے پھریں گے، اور جلاوطن و قید میں رہیں گے، اور آخرت میں بھی ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

یہاں ایک پانچویں صورت بھی ہے جو کہ صاحب ہدایہ نے ذکر کی ہے، اور وہ یہ کہ نہ تو انہوں نے مال لیا، اور نہ ہی قتل کیا، بلکہ کسی شخص کو زخمی کردیا، اس کے بارے میں صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ جن زخموں میں قصاص لیا جاتا ہے ان میں قصاص لیا جائے گا، اور جن میں دیت لی جاتی ہے ان میں دیت لی جائے گی۔ پھر ارشاد ہے:

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾﴾ مگر وہ لوگ جنہوں نے اس سے پہلے توبہ کرلی کہ ان پر تم قابو پاؤ، تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے۔ مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ حکومت کے گھراؤ میں آنے سے اور گرفتار ہونے سے پہلے اگر یہ لوگ توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی توبہ قبول ہے، لیکن اس توبہ سے صرف حد شرعی ساقط ہوجائے گی، بندہ کا حق ہرگز معاف نہ ہوگا، اگر عملاً قتل کیا ہو

تو مقتول کے اولیاء کو اختیار ہے کہ قتل کرادیں یا معاف کردیں، اگر مال لیا ہو تو اس کا واپس کرنا واجب ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ توبہ سے حق شرعی اور حد معاف ہوسکتی ہے، اور حق العبد معاف نہ ہوگا۔

جرائم اور ان کی سزائیں:

بعض خاص خاص جرائم ایسے ہیں جن میں اسلام نے سزائیں متعین فرمائی ہے، لیکن جن جرائم کی سزاؤں کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، ان کا اختیار قضاۃ اور حکام کو دے دیا کہ وہ، زمانہ، ماحول، مقام کی رعایت سے جیسی اور جتنی چاہیں سزائیں متعین کردیں، جن سے انسدادِ جرائم میں مدد ملے، اور یہ بھی ممکن ہے حالات و واقعات کی رعایت کرتے ہوئے اسلامی حکومتیں شرعی قوانین کو سامنے رکھ کر جرائم کی سزاؤں کا پیمانہ مقرر کردیں، اور قاضیوں اور حکام کے اختیارات پر بھی پابندیاں لگادیں، علماء متاخرین ایسا کرتے رہے ہیں، اور مسلم ملکوں میں یہی صورت رائج ہے۔

جن سزاؤں کو قرآن وسنت نے متعین کردیا ہے ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن میں اللہ تعالیٰ کا حق غالب قرار دیا گیا، ان کی سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے، ان کی تفصیل آنے والی ہے، اور دوسرے وہ جن میں شریعت نے انسانوں کا حق زیادہ مانا ہے، ان کی سزا کو قصاص کہا جاتا ہے، اور جن جرائم کی کوئی سزا قرآن وسنت نے متعین نہیں کی، بلکہ حکام وقضاۃ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ان کو شرعی اصطلاح میں تعزیرات کہا جاتا ہے۔ حدود وقصاص کا بیان خود قرآن کریم نے تفصیل وتشریح کے ساتھ کردیا ہے، باقی تعزیرات کو حکام وقضاۃ کے حوالہ کردیا ہے۔ حدود، قصاص، تعزیرات کے احکام بہت سی چیزوں میں مختلف ہیں، جو لوگ ان تینوں اصطلاحات اور ان کے فرق سے واقف نہیں اور عرف عام کے لحاظ سے سب کو تعزیرات سمجھتے اور کہتے ہیں وہ بہت سے احکام میں مغالطہ کا شکار ہوجاتے ہیں۔

حدود پانچ ہیں:

اسلامی شریعت میں حدود صرف پانچ ہیں:

(۱) ڈاکہ رہزنی۔ (۲) چوری۔ (۳) زنا۔ (۴) قذف یعنی تہمت زنا۔ (۵) شراب نوشی۔

ان میں سے پہلی چار حدود قرآن کریم میں منصوص ہیں، اور پانچویں یعنی شراب کی حد، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے ثابت ہے۔ یہ پانچوں حدود ایسی ہیں کہ ان میں نہ سفارش چلتی ہے، اور نہ کسی امیر، قاضی یا حاکم کو معاف کرنے کا اختیار ہے، اور نہ توبہ کرلینے سے دنیاوی سزا معاف ہوسکتی ہے۔ البتہ مخلصانہ توبہ کرلینے سے آخرت کا

حساب ختم ہوسکتا ہے۔

البتہ یہاں صرف ڈاکو کی سزا میں اتنا استثناء اور ہے کہ اگر وہ گرفتاری سے پہلے سچی توبہ کرلے، اور معاملات میں تجربہ کرنے سے اس کی صداقت پر اطمینان ہوجائے، تو ان کی حد معاف ہوجائے گی، مگر گرفتاری کے بعد اس کی توبہ کا اعتبار نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ (یعنی ڈاکو کے علاوہ) دوسری حدود یعنی چوری، زنا، شراب تہمت زنا وغیرہ توبہ کے ذریعہ دنیاوی اعتبار سے معاف نہیں ہوں گی، چاہے توبہ گرفتاری سے پہلے ہو یا بعد میں، کسی قسم کی معافی نہیں ہوسکتی۔

تعزیری سزاؤں میں معافی اور کمی بیشی ہوسکتی ہے:

برخلاف تعزیرات کے تمام تعزیری جرائم میں حق کے موافق سفارشات بھی قبول ہوسکتی ہیں، اور حالات واقعات کا لحاظ کرتے ہوئے تعزیری سزاؤں کو سخت سے سخت اور ہلکے سے ہلکا اور بالکل معاف بھی کیا جاسکتا ہے۔

تعزیرات کے سلسلہ میں حکام کے اختیارات زیادہ وسیع ہیں۔ البتہ حدود میں کچھ بھی نہیں ہوسکتا، تاہم حدود میں جہاں سزائیں سخت ہیں، اور ان کے نفاذ کا قانون بھی سخت ہے کہ نہ ان کو کوئی معاف کرسکتا ہے، اور نہ ان میں کسی حال کی کمی بیشی کی جاسکتی ہے، وہاں جرم اور ثبوت واثبات جرم کی تکمیل کے لئے شرائط بھی کڑی رکھی گئی ہیں۔ ان شرائط میں سے ایک شرط بھی اگر کم ہو تو حد ساقط ہوجاتی ہے، حتیٰ کہ ثبوت میں اگر ذرا سا بھی شبہ ہوجائے تو شبہ کا فائدہ مجرم کو پہنچاتے ہوئے حد ساقط ہوجاتی ہے۔ ارشاد نبوی ہے: "اِدْرَؤُا الْحُدُوْدَ بِالشُّبْهَاتِ"۔

تو شبہات سے حدود ساقط ہوجاتی ہیں، مگر شبہ کی صورت میں حد ساقط کرنے کا مطلب مجرم کو کھلی چھٹی دینا ہرگز نہیں کہ وہ جرم کرنے پر مزید جری ہوجائے، بلکہ حاکم یا قاضی مناسب حال تعزیری کارروائی کرسکتا ہے، جیسے زنا کے اثبات میں تین ثقہ گواہ ہیں، اور شہادت کا نصاب چار ہے، تو ایسی صورت میں حد زنا جاری اگرچہ نہیں ہوسکتی، مگر مجرم کو کھلی چھٹی بھی نہیں ہوگی، بلکہ حاکم قاضی اپنی رائے سے مناسب حال سزا تجویز کرسکتا ہے، ورنہ ثقہ تینوں گواہوں کی تکذیب لازم آئے گی، اور مجرم ونیز دیگر غنڈہ قسم کے لوگ مزید بے لگام ہوجائیں گے۔ یہی حال دیگر حدود کا بھی ہے کہ اگر حد ساقط ہوگئی تو اس سے کم درجہ کا تعزیری حکم مناسب ہوگا، تاکہ جرائم کی مکمل بیخ کنی ہو، اور لوگوں میں خوف ووحشت برابر جاری ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

قصاص کے احکام:

حدود کی طرح قرآن کریم میں قصاص کی سزا بھی متعین ہے، یعنی جان کے بدلے جان، اور زخموں کے

بدلے ان کے مساوی زخم کی سزادی جائے گی۔ حدود تو جیسے بیان ہوا کہ معاف کرنے سے معاف نہیں ہوسکتیں، کیونکہ وہ خالص اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں، بخلاف قصاص کے کہ یہ بندہ کا حق ہے، اور بندہ کو معاف کرنے کا پورا اختیار ہے، کہ اگر قاتل سے قصاص کا مطالبہ کرے، یا قصاص چھوڑ کر دیت پر فیصلہ کرے، یا قصاص اور دیت دونوں سے دستبردار ہوکر فی سبیل اللہ معاف کرے۔ اسی طرح دیگر زخموں کا بھی یہی حکم ہے۔ اسی طرح حاکم وقاضی کو تعزیرات نافذ کرنے کا بھی مکمل اختیار ہے، تاکہ جرائم پر قابو پایا جاسکے۔ تفصیلات کتب فقہ میں دیکھیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: اے اہلِ ایمان! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور اللہ تعالیٰ تک رسائی کا ذریعہ تلاش کرو، اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو، شاید تمہیں کامیابی نصیب ہوجائے ﴿۳۵﴾ یقیناً جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کر رکھی ہے اگر ان کے قبضہ میں دنیا بھر کی دولت ہو، اور اتنی ہی اور بھی ہو، اور وہ چاہیں کہ اسے فدیہ بنا کر قیامت کے عذاب سے بچ جائیں تب بھی ان سے وہ قبول نہیں کیا جائے گا، اور دردناک دائمی عذاب ہوکر رہے گا ﴿۳۶﴾ وہ چاہیں گے کہ دوزخ کی آگ سے نکل بھاگیں، مگر اس سے نہیں نکل سکیں گے، اور انہیں دائمی عذاب رہے گا ﴿۳۷﴾

معارف ومنازل

﴿اَلْوَسِيْلَة﴾ سین اور صاد دونوں سے ایک ہی معنی میں مستعمل ہے۔ لغت میں وسیلہ: مَا يُتَوَصَّلُ بِهٖ اِلَى الشَّيْءِ وَيُتَقَرَّبُ بِهٖ اِلَيْهِ۔ یعنی جس چیز کے ذریعہ کسی چیز تک پہنچا جائے اور اس کا قرب حاصل ہو اسے وسیلہ کہتے ہیں۔ البتہ عرف میں وسیلہ کے اندر رغبت ومحبت کی جہت ضرور شامل رہے گی۔ یہاں وسیلہ سے مراد ایمان، اعمالِ صالحہ، تقویٰ، عبادات وطاعات، اتباعِ سنت، اجتناب عَنِ الْمَعَاصِي۔ یہ سب اللہ تعالیٰ سبحانہ تک پہنچنے، اور اس کا قرب حاصل کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ ہر وہ چیز ہے جو بندہ کو محبت ورغبت کے ساتھ اپنے معبود برحق کے قریب کردے، اس لئے سلف صالحین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین نے وسیلہ کی تفسیر طاعات، قربات، ایمان واعمالِ صالحہ سے کی ہے۔[رواہ الحاکم] کہ اللہ تعالیٰ کا قرب ورضا حاصل کرو بذریعۂ اعمالِ صالحہ کے، اسی کے ساتھ صحیح احادیث میں وارد ہے کہ وسیلہ ایک درجہ اور عالی مرتبہ ہے، اس سے اوپر کوئی درجہ نہیں ہے، جو شخص اذان کے اختتام پر میرے لئے اللہ تعالیٰ سے وسیلہ کا سوال کرے گا قیامت کے دن میری شفاعت اس کو نصیب ہوگی، وہ دعاء یہ ہے:
اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّامَّۃِ وَالصَّلٰوۃِ الْقَائِمَۃِ اٰتِ مُحَمَّدَ نِالْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَالدَّرَجَۃَ الرَّفِیْعَۃَ وَابْعَثْہُ مَقَامًا مَحْمُوْدَ نِالَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ۔

پس معلوم ہو کہ وسیلہ جنت کا ایک خاص درجہ ہے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے، اور آیت کریمہ میں ہر مؤمن کو وسیلہ طلب کرنے اور تلاش کرنے کا حکم ہے، وہ اس طور پر کہ جس طرح ہدایت وتقویٰ کا اعلیٰ مقام سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اس کے لئے دعا کیا کرتے تھے، مگر ان کے ابتدائی اور متوسط درجات تمام مؤمنین کے لئے عام ثابت ہیں۔ اسی طرح وسیلہ کا اعلیٰ درجہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہے، اور پریشانی میں مبتلا ہو، یا اس کا کوئی کام اٹکا ہوا ہو، یا کوئی خاص حاجت ہو، تو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ، انبیاء کرام، ملائکہ، اور اعمالِ صالحہ کے توسل ووسیلہ سے دعاء کرے۔

جیسے تین اشخاص نے بنی اسرائیل میں سے اپنے اپنے نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا کی اور نجات پا گئے، اسی طرح نیک اعمال اور پاکیزہ ومقرب ہستیوں کے وسیلہ کا حکم ہے، اور "وَسِیلَۃٌ بِالذَّوَاتِ الفَاضِلَۃِ وَالأَعمَالِ الصَّالِحَۃ" مستحب اور جائز ہے، مگر بشرطیکہ غلو اور حد سے تجاوز نہ ہو، جو کہ حرام ہے۔ تفصیل آئندہ آنے والی ہے۔

لفظ وسیلۃ میں محبت ورغبت کا مفہوم شامل ہونے سے اس طرف اشارہ ہے کہ وسیلہ کے درجات میں ترقی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر موقوف ہے، اور محبت موقوف ہے اتباعِ سنت پر، جیسے ارشاد ہے:
﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللہُ﴾[آل عمران: ۳۱] (آپ کہہ دیں: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم کو محبوب رکھے گا)۔ اس لئے کوئی شخص تمام امور اور احکام میں جتنا اتباعِ سنت پر گامزن اور عامل رہے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی محبت اسے حاصل رہے گی، اور وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جائے گا۔ جتنا اتباع زیادہ ہوگا اتنی محبت بڑھے گی اتنا قرب حاصل ہوگا۔

آیت کے شروع میں تقویٰ کا حکم ہوا، پھر وسیلہ کا بیان ہوا، آخر میں وسیلہ کے اسباب میں سے اہم اور ضروری سب جہاد کا بیان ہوا، یہ تخصیص بعد التعمیم کے قبیل سے ہے، کیونکہ جہاد بہت ہی عظیم سرمایہ ہے، جسے حدیث شریف میں: "وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ" کا لقب دیا گیا کہ اسلام کی سربلندی کا واحد ذریعہ جہاد ہے۔ یہ جہاد فساد فی الارض کے خاتمہ کے لئے شروع ہوا ہے، یہ جہاد لوگوں کی آزادی اور حقوق سلب کرنے کے لئے نہیں، بلکہ یہ ایک تأدیبی اصلاحی کارنامہ ہے، جس کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ سارے فتنے اور فساد پر قابو پایا جائے، اور تمام مادی وروحانی بیماریوں کا اَحسن طریقے سے علاج کیا جائے۔ جیسے ڈاکٹر آپریشن کے ذریعہ مریضوں کا علاج کرتے رہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو جنگ ومحاربہ، لوٹ مار، رہزنی صرف حطامِ دنیا اور مال حاصل کرنے کے لئے ہو وہ حرام اور بدامنی ہے، انسان دشمنی کے زمرے میں شامل ہے، اور جو جنگ وقتال دین کے لئے ہو، جس کا مقصد قیام امن ہو اور فساد کا خاتمہ ہو، وہ جہاد اور بابرکت عمل ہوگا، جسے جہاد فی سبیل اللہ کے نام سے یاد کیا جائے گا، اور یہ عمل نہایت پاکیزہ اور جنت کی ضمانت ہوگا۔

دوسری آیت: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٣٦﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٣٧﴾﴾

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک کفر ہی پر قائم رہتے ہیں، اور ان کا خاتمہ کفر ہی پر ہوتا ہے، ایسے لوگ ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ اگر بالفرض ایسے کافروں کے پاس دو دفعہ تمام روئے زمین کا مال ومتاع ہو، اور تمام خزانے اور دفینے ہوں، اور ان اموال وخزائن کے ساتھ اور بھی اسی قدر اموال وخزائن ہوں اور ان کافروں میں سے ہر ایک کافر یہ چاہے کہ یہ سارے متاع واموال اور تمام ساز وسامان قیامت کے عذاب سے بچنے کے لئے اپنے لئے فدیہ اور جان چھڑائی میں دے دے، اور عذاب سے خلاصی حاصل کرلے تب بھی اس سے یہ سب کچھ قبول نہ کیا جائے گا، اور اس کو دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے گا، اور وہ ہرچند اس عذاب سے نکل بھاگنے کی تمنا یا تدبیر کرے گا، تو اس کی یہ خواہش اور تمنا بے مقصد ہوکر، وہ ہرگز اپنی خواہش میں کامیاب نہیں ہوگا، اور متواتر دائمی عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

ان کو ابدی نجات کا اور ابدی سعادتوں کا آسان طریقہ وعمل بتایا گیا تھا کہ دنیا میں صرف کلمہ پڑھ کر توحید کا اقرار کریں فقط، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ [الحدیث]

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۳۸ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۳۹ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۴۰

ترجمہ: جو چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت ہو سو ان کے کردار کے عوض ان کے ہاتھ کاٹ دو، یہ بطور سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے ۳۸ سو جو شخص اپنے ظلم کے بعد توبہ کرے، اور اصلاح کرلے سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا، بے شک اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے ۳۹ کیا تجھے معلوم نہیں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے ملک آسمانوں کا اور زمینوں کا؟ وہ عذاب دیتا ہے جسے چاہے، اور بخشتا ہے جسے چاہے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ۴۰

معارف ومنازل

چوری کا نصاب:

آیت کریمہ میں چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے، چونکہ قرآن حکیم کا یہ حکم دوسرے احکام کی طرح مجمل ہے، یعنی مقدارِ مالِ مسروقہ اور نصابِ سرقہ کا کوئی ذکر نہیں، اس لئے احادیثِ شریفہ کی طرف رجوع ضروری ہے، اور احادیثِ مبارکہ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ چور کا داہنا ہاتھ گٹہ سے کاٹ دیا جائے گا۔

نصابِ سرقہ کے بارے میں علماء امت کے مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم، اور عمر بن عبدالعزیز اور امام اوزاعی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا کہ ۴/۱ دینار کی مالیت کا سامان چرائے تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، سفیان ثوری اور امام اعظم رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ دس

درہم یا ان کی مالیت کی چوری کرنے پر ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، اس سے کم میں نہیں۔ اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تین درہم یا اتنی مالیت کا سامان چرانے پر ہاتھ کاٹا جائے گا۔

بہر حال! نصاب مختلف فیہ ہی رہا، اگر ہر فریق کے نصاب سے کم مالیت کی چوری ہو تو ہاتھ نہ کاٹا جائے گا، صرف تعزیر کے طور پر حاکم یا قاضی جو بھی فیصلہ کریں انہیں مکمل اختیار ہے۔

شرعی حدود میں کسی معافی اور سفارش کی گنجائش نہیں:

چور مرد ہو خواہ عورت، اور چوری کا نصاب پورا ہو تو ہاتھ کاٹنا لازمی ہوگا، اس میں کسی بھی قسم کی رعایت نہ ہو گی، اور نہ کسی شخصیت کی سفارش قبول کی جائے گی، حتیٰ کہ صاحبِ شریعت کو بھی معاف کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ قبیلہ بنی مخزوم کی فاطمہ نامی عورت نے چوری کر لی، اور قریش کے لوگ یہ چاہتے تھے کہ اس اونچے قبیلے کی بدنامی نہ ہو، اور شرعی حد معاف ہو، قریش والوں نے معافی لینے کے لئے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا، کہ وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیارے ہیں، اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں سفارش کر لیں شاید کام بن جائے۔

جب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے سفارش کی بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم حدود اللہ میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی لئے ہلاک ہوئے کہ ان میں جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا تھا، اور اگر کمزور آدمی چوری کرتا تھا تو اس پر حد جاری کرتے تھے۔ پھر ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی قسم! محمد کی بیٹی فاطمہ (خدانخواستہ) اگر چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ [بخاری] اللّٰھم صلّ و سلّم علیٰ سیدنا محمد و آلہ و أصحابہ أجمعین۔

جب کوئی مرد یا عورت پہلی بار چوری کرلے تو اس کا سیدھا ہاتھ گٹے سے کاٹ دیا جائے، اس کے بعد دوبارہ چوری کرلے تو ٹخنہ سے بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے، یہاں تک تو تمام ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم کا اتفاق ہے۔ اس کے بعد اگر تیسری مرتبہ چوری کرلے تو کیا کیا جائے؟ اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اب کوئی ہاتھ یا پاؤں نہ کاٹا جائے، بلکہ اس کو جیل میں ڈال دیا جائے، یہاں تک کہ توبہ کرلے۔ حضرت امام ابو حنیفہ، امام احمد بن حنبل اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی قول ہے۔

اور حضرت امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا کہ اگر تیسری بار چوری کرلے تو بایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے، اور چوتھی بار چوری کرلے، تو دایاں پاؤں کاٹ دیا جائے، اگر اس کے بعد بھی چوری کرلے تو اسے دوسری کوئی

سزادی جائے، یہاں تک کہ توبہ کرلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ایسا مروی ہے۔

چور کے ہاتھ کاٹنے میں حکمت و مصلحت ہے:

چور مرد و عورت کی سزا بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا﴾ یہ سزا ہے اس فعلِ بد کی جو انہوں نے کیا، اور ساتھ ہی:

﴿نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ بھی فرمایا۔ نکال اس سزا کو کہتے ہیں جو دوسروں کے لئے عبرت ہو۔ اللہ تعالیٰ شانہ عالم الغیب ہے، اسے معلوم تھا کہ چوری کی سزا جو ہاتھ کاٹنے کی صورت میں ہے، اس پر اعتراض کا جواب:

﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ میں دے دیا۔ اللہ تعالیٰ شانہ خالق و مالک ہے، احکم الحاکمین ہے، اسے اختیار ہے کہ بندوں کو جو چاہے حکم دے، اور جو قانون تشریعی طور پر چاہے نافذ کردے، اور پھر وہ عزیز ہے، وہ سب پر غالب ہے، اور حکیم بھی ہے، اس کا ہر فعل ہر فیصلہ اور ہر قانون حکمت کے مطابق ہے، وہ اپنی مخلوق کو اچھی طرح جانتا ہے، انسانوں میں کیسے کیسے جذبات ہیں، ان میں مصلحین بھی ہیں اور مفسدین بھی، چور بھی ہیں اور ڈاکو بھی، اور ان فسادیوں کا فساد کونسے قانون کے نافذ کرنے سے روکا جاسکتا ہے؟ اور کونسی ایسی عبرت ناک سزا ہے جو مفسدین کو فساد سے باز رکھ سکتی ہے؟ اور عامۃ الناس کے جان و مال کی حفاظت کس قانون کے نافذ کرنے سے ہوسکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ کو ان سب کا علم ہے۔

سورۂ ملک میں فرمایا: ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ [الملک: ۱۴] (کیا وہ نہ جانے جس نے پیدا کیا، اور وہ باریک بین ہے، باخبر ہے)۔ جو مغرب زدہ یہودیت کے دلدادے، نصرانیت کے بادہ نوش، اسلامی سزاؤں اور شرعی حدود، مجرمین کی سزاؤں کو وحشیانہ یا ظالمانہ قرار دیتے ہیں، وہ سب کے سب کائنات کے پروردگار کے باغی ہیں، یہ تو کھلے کافر ہیں، اسلام کی حقانیت پر انہیں ایمان ہی نہیں ہے، وہ نہ صرف یہ کہ شرعی سزاؤں پر معترض نہیں، بلکہ انہیں اسلام کے ہر شرعی حکم پر اعتراض ہے، ان کے اعتراض پر نہ تعجب ہونا چاہئے، اور نہ دل گیر و پریشان۔ یہ حق و انصاف سے محروم اور صداقت سے کوسوں دور ہیں، یہ یہود و نصاریٰ مستشرقین، مغرب نواز اپنے اپنے دین کو باطل سمجھتے ہوئے بھی اس پر جمے ہوئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے لئے شرکاء اور اولاد تجویز کرکے اور حضرات انبیاء علیہم السلام کو قتل کرکے خوش ہیں، اور راضی بھی، دوزخ میں جانے کو تیار ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ اسلامی سزاؤں کے نفاذ کی مخالفت کررہے ہیں، اور انہیں ظالمانہ کہتے ہیں، ان کو

ڈاکوؤں اور چوروں پر تو رحم آتا ہے، کہ ہائے ہائے اس کا ہاتھ کٹ جائے گا، یہ مقتول ہوں گے، سولی پر چڑھا دیئے جائیں گے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے۔ لیکن ان کو عامۃ الناس بے گناہ خلقِ خدا پر رحم نہیں آتا، جو صبح وشام بدامنی اور شر وفساد کا شکار رہتے ہیں، کیسی بھونڈی احمقانہ سوچ ہے کہ عام مخلوق کو چوروں اور ڈاکوؤں کے ظلم سے محفوظ وماٗمون کرنے کے لئے چند افراد کو سخت سزا دینے کے روادار نہیں ہیں، اور امن وامان کے دشمنوں کو چوری ڈکیتی، لوٹ مار کے مواقع فراہم کرنے کو تیار ہیں؟

بہر حال! اسلام کے قانون کا ملاحظہ کریں، اور چوروں کی سزا پر غور کریں، اسی طرح ڈاکوؤں کی سزا جو اوپر بیان کردی گئی ہے جس کی چار صورتیں بیان کی گئی ہیں، یہاں چور مرد اور چور عورت کی سزا بیان ہوئی، کہ ان کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ اب آپ بسم اللہ کریں، ان سزاؤں کو نافذ کردیں، چند افراد کو ڈکیتی کی سزا دے دیں، چند زانیوں کو زنا کی سزا دے دیں، چند چوروں کا ہاتھ کاٹ دیں، چند قاتلوں سے قصاص لے لیں، پھر دیکھیں کہ کیسے امن وامان قائم ہوتا ہے۔ اور کیسے لوگ آرام کی نیند سوتے ہیں، اور کیسے بلاخوف وخطر لوگ سفر کرتے ہیں، تمہارا پورا ماحول اور سارا معاشرہ جنت نظیر ہوگا، اور لوگوں کی جان وعفت اور مال ہر طرح کے خطرات سے محفوظ رہیں گے، اور سارے چور، ڈاکو، شرابی اپنے بُرے اعمال سے تائب ہوجائیں گے۔ خیر القرون کا دور اس کی جیتی جاگتی نظیر اور مثال ہے، تو ہے کوئی عمل کرنے والا جراٗت مند؟

خلاصہ یہ کہ ﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا﴾ کے ساتھ ﴿نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ جو فرمایا ہے اس میں واضح اشارہ ہے کہ چور کی سزا صرف اس کے کرتوت کا بدلہ نہیں ہے، بلکہ ساری خلقت کے لئے سامانِ عبرت ہے، اور عوام کے لئے باعثِ حوصلہ افزائی بھی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ کہ اللہ تعالیٰ غلبہ والا بھی ہے، اور حکمت والا بھی ہے۔ اس کا قانون حکمت اور ہر مصلحت پر مبنی ہے، اس کے خلاف کوئی بھی قانون بنی نوع انسان کے حق میں نہ بہتر ہے اور نہ فائدہ مند۔

دیکھیں! چند ممالک جن میں چور کا ہاتھ کاٹنے کا قانون نافذ ہے وہاں کے بازاروں میں اب بھی یہ حال ہے کہ اذان کے ساتھ جنرل سٹور، سونے جواہرات سے بھری دکانوں کے دروازوں پر کپڑے کے پردے ڈال کر نمازوں کے لئے چلے جاتے ہیں، اور بعض دکانوں کے باہر رات بھر قیمتی سامان پڑا رہتا ہے، مجال نہیں کہ کوئی طالع آزما میلی نگاہ سے کچھ دیکھے، یا سوچے۔

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ﴾ جولوگ قرآن حکیم کواپنی بدقسمتی سے چھوڑ چکے ہیں، اور یورپ کی حمد و مدح میں غرق ہو کر یورپ کی پوجا کرتے ہیں، انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہر لمحہ ہر منٹ کے مختصر وقفہ میں بہادر امریکہ میں ایک نہ ایک واردات ڈاکہ، چوری، قتل یا کسی بے گناہ کی عصمت دری ضرور ہوتی ہے، جبکہ سعودی عرب جیسے ملک میں لوگ ان جرائم کے تصور تو کیا نام سے بھی واقف نہیں ہوتے، حالانکہ وہاں مکمل قرآنی قانون کا نفاذ نہیں ہے۔

ہمارے نام نہاد دانشوروں، مدعیانِ اسلام کے لئے یہ ایک طمانچہ اور قدرتی سزا ہے کہ اسلام کے قوانین سے محروم ہو کر یورپ کے ظالمانہ قانون کو اپنی نجات کا سامان سمجھ کر سونے کے عوض مردار نالی کے گندے پانی میں بہہ گئے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم ☆ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

پھر ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ پس جو شخص اپنے ظلم کے بعد توبہ کرلے، اور اصلاح کرلے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے۔ بڑے سے بڑے مجرم کی توبہ قبول فرمانا یہ تو اللہ تعالیٰ شانہ کا عام قانون ہے، پس اگر فرعون ونمرود جیسے مجرم توبہ کرلیتے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی توبہ قبول نہ ہوئی ہوتی۔

کوئی شخص کتنا ہی بڑا ظلم کرے، اور اس کے بعد نادم ہو کر سچے دل سے توبہ کرلے، اور یہ توبہ اصولِ شریعت پر پوری اترتی ہو، تو اللہ تعالیٰ جل شانہ معاف فرمادیں گے۔ یہاں چونکہ چور کی سزا کے بعد توبہ کا ذکر فرمایا ہے، اس لئے علماء کرام اور مفسرین حضرات نے آیت کا ترجمہ یہ لکھا ہے کہ جو بھی کوئی چور اپنے ظلم، یعنی چوری کرنے کے بعد توبہ کرلے، اور پھر اصلاح حال کرلے، یعنی جو مال اس نے چرایا ہے وہ واپس کردے، اور آئندہ چوری نہ کرنے کا پختہ عزم کرلے، تو اللہ تعالیٰ جل شانہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا، اس کی توبہ کا یہ فائدہ ہوگا کہ چوری کر کے اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی جو کی ہے آخرت میں اس پر عذاب نہ ہوگا۔ رہا ہاتھ کاٹنے کا مسئلہ تو یہ معاف نہ ہوگا، (تفصیل گزر چکی)۔

یعنی حاکم یا قاضی کے سامنے اگرچہ توبہ کرلے تو حاکم یا قاضی ہاتھ کاٹنے کی سزا رفع دفع نہیں کرسکتا، توبہ کا تعلق صرف آخرت کی معافی سے ہے، جو بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے، اور ہاتھ کاٹنے کا قانون جو فیمابین

العِبَاد ہے، بحیثیتِ شرعی حد اس پر ہر حال میں عمل کیا جائے گا۔

فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر ڈاکو گرفتار ہونے سے پہلے توبہ کرلے تو ڈکیتی کی سزا اس پر جاری نہ ہوگی۔ البتہ لوگوں کی جو حق تلفی کی ہے اس کا ازالہ کرنا ہوگا، مال واپس کرے گا، یا صاحبِ حق سے معاف کرائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص چوری کرنے کے بعد گرفتاری سے پہلے یا اس کے بعد توبہ کرلے تو چوری کی شرعی دنیاوی سزا معاف نہ ہوگی، یعنی حاکم یا قاضی توبہ کے بعد بھی ہاتھ کاٹ دے گا (یہ فرق خوب سمجھو، اور آیت نمبر ۳۱ پر دوبارہ غور کرو)۔ مطلب واضح ہے کہ ڈاکو گرفتاری سے پہلے اگر توبہ کرلے تو صرف حد شرعی معاف ہوگی، نہ کہ حق عبد۔ اگر چور توبہ کرلے تو نہ حد شرعی معاف ہوگی، اور نہ حق عبد۔ البتہ آخرت کی سزا معاف ہوسکتی ہے، جیسے کہ اس کی تفصیل ہم نے بیان کی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، حکومت سب آسمانوں کی اور زمینوں کی، وہ جس کو چاہے سزا دے، اور جس کو چاہے معاف کردے، اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے۔

قرآن حکیم جو بھی حکم جاری کرتا ہے اس کے اختتام پر اللہ تعالیٰ شانہ کی مخصوص اور عالمگیر کسی صفت کو بیان کرتا ہے، جس سے وہ حکم پختہ اور مضبوط ہوجاتا ہے، اور یہ صفات اس کے لئے دلیل بن جاتی ہیں۔ اس آیت میں بتا دیا کہ آسمان اور زمین سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، اور کائنات کے ہر حصہ پر اس کی حکومت اور بادشاہت ہے، اسے ہر چیز پر پورا پورا اختیار ہے، جسے چاہے عذاب دے جسے چاہے معاف کردے، جس کی توبہ قبول کرے، اور جس کی چاہے توبہ قبول نہ کرے، اور توبہ کے باوجود چور کے ہاتھ کٹوانے کا حکم برقرار رکھے۔

یہاں تین آیات ہیں، ہر آیت کے ختم پر اس کی عظمت اور مخصوص صفات کا بیان ہے:

پہلی آیت کے ختم پر ﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ فرمایا۔ اور دوسری آیت کے ختم پر ﴿وَاللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ فرمایا۔ اور تیسری آیت کے ختم پر ﴿اِنَّ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ یعنی وہ عزیز ہے غلبہ کا مالک ہے، کسی مخلوق کو اس کے کسی فعل یا قانون پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، وہ جسے چاہے سزا دے جسے چاہے بخش دے، اسے پورا پورا اختیار ہے، وہ حکیم ہے، اس کے سب افعال اور سب فیصلے اور ضابطے حکمت کے مطابق ہیں، کسی کو کسی چون وچرا کی جرأت نہیں ہے۔ نیز ہر چیز اس کے تصرف وقبضہ قدرت میں ہے، وہ ہر چیز پر قادر وتوانا ہے۔

قرآن کریم کے تمام مقامات پر مغفرت کا ذکر پہلے ہے، اور عذاب کا بعد میں، مگر یہاں عذاب کا ذکر موقع اور مقام کے لحاظ سے پہلے ہے، اور مغفرت کا بعد میں، تاکہ نافرمانوں کو اچھی طرح تنبیہ ہو، اور واضح ہو کہ حدود اللہ میں معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ چور ہزار دفعہ توبہ کرلے، پھر بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، اور کوئی ظالم خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں یا دونوں میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچے گا۔

گندم از گندم بروید جو ز جو ☆ از مکافات عمل غافل مشو

عبرت کا واقعہ:

کبھی ایسا بھی ہوا کہ مظلوم کے پسینہ یا آنسو خشک ہونے سے پہلے ظالم عذابِ الٰہی کے شکنجے میں پھنس گیا۔ شہرِ عدن میں ایک شریف خاندان کے فقیر کے گھر میں دو تین دن سے فاقہ رہا، وہ بیچارہ شرم کے مارے کسی سے سوال بھی نہیں کرسکتا تھا، اور بدنی کمزوری کی وجہ سے کوئی مزدوری بھی نہیں کرسکتا تھا، مسجد سے گھر لوٹا تو بچے بیہوشی کے عالم میں بلبلا رہے تھے، بیوی سے پوچھا: یہ کیوں تکلیف میں ہیں؟ جواب ملا: بھوک کی وجہ سے۔

بیچارہ باہر نکلا، شاید کوئی میری مدد کرے، واپس آیا تو دیکھا کہ بچوں کی ماں بیہوش تڑپ رہی ہے، آنکھوں میں بے اختیار آنسوؤں کا دریا موجزن ہوا، خیال پیدا ہوا کہ دریا نزدیک ہے، شاید کوئی مچھلی ہاتھ آئے۔ دریا کے کنارے پر ایک مچھلی شاید اسی انتظار میں تیراکی میں مصروف تھی، اسے اٹھا کر کندھے پر رکھا، تھوڑا آگے چلا دیکھا کہ ایک نوجوان سردارزادہ گھوڑے پر سوار ہے، گھڑسوار ظالم سردارزادہ نے کہا: یہ مچھلی مجھے دے دو، فقیر نے کہا: میرے گھر میں تین دن سے فاقہ ہے، بیوی بچے سب نڈھال اور بیہوش ہیں، سردارزادہ نے کہا: یہ دے دو، ورنہ تمہیں نیزہ مار کر ہلاک کردوں گا، اور نیزہ اس کے ہاتھ میں تھا، چنانچہ زبردستی مچھلی اس سے لے لی، ادھر سے سورج غروب ہورہا تھا، یہ بیچارہ دوبارہ دریا کے پاس بھی نہیں جاسکتا تھا، دوڑتا ہوا پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا، دیکھا بچے خوش وخرم کھیل رہے ہیں، بیوی بھی ہشاش بشاش ہنس رہی ہے، پوچھا: کیا ماجرا ہے؟ بیوی نے کہا: ایک شخص ثابت مچھلی کا کباب لاکر رکھ گیا، اور چلا گیا، میں نے اٹھا کر بچوں کو کھلایا، اور خود بھی کھالیا، تمہارا حصہ وہ رکھا ہے۔

بیچارہ نے حیران ہوکر تعجب کیا، اور سب خوش راضی ہوئے۔ دوسری طرف سردارزادہ کے چلتے چلتے ہاتھ پاؤں خشک ہوگئے، اور اس نے گھر پہنچ کر خدمت گاروں کو آواز دے کر کہا کہ مجھے گھوڑے پر سے اتاردو، اتنے میں اس کے خاندان والوں نے وجہ دریافت کی، کہنے لگا: میں نے ایک شخص پر ظلم کیا، جس کے نتیجے میں میرا یہ حال ہوا،

اور مچھلی بھی میرے ہاتھوں سے گر گئی، اس غریب کی تلاشی شروع ہوگئی، وہ بھی نہیں ملا، یہ نوجوان فالج زدہ چند روز بعد بینائی سے محروم ہوگیا، اور مختصر وقت میں داعی اجل نے اس کی زندگی کا فیصلہ کیا۔ ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ [الحشر: ۲] (اے بصیرت والو! عبرت حاصل کرو) [کتاب الکبائر]

فائدہ:

چوری ہمارے عرف میں بہت ساری چیزوں کا نام ہے، اور اس کا بہت بڑا وسیع میدان ہے۔ مگر اصطلاحِ شریعت میں جس چوری کی سزا قطع ید ہے، وہ ایک خاص قسم کی چوری ہے، اس کی تفصیل کتبِ فقہ اور مطولات میں مذکور ہے۔ اس لئے علماء کرام نے وضاحت کر کے لکھ دیا، اور کہا: چوری کا ثبوت کس طرح ہوتا ہے؟ اور مال لینے کی کون کون سی صورتیں ہیں جو چوری میں شمار ہوتی ہیں؟ جن سے ہاتھ کاٹا جاتا ہے، اور کون کون سے مقامات ہیں جہاں چوری سے ہاتھ نہیں کاٹا جاتا؟ مثلاً مسجد کے مال کی چوری کرنے سے ہاتھ نہیں کاٹا جاتا، وغیرہ۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ښ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ جَاۗءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَـيْـــًٔا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ: اے رسول! آپ کو وہ لوگ رنجیدہ نہ کریں جو دوڑ دوڑ کر کفر میں گرتے ہیں، جو ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زبانوں سے کہا: ہم ایمان لائے، اور حال یہ ہے کہ ان کے دل ایمان نہیں لائے، اور ان لوگوں میں سے جو یہودی ہیں، یہ لوگ جھوٹ کو بہت زیادہ سننے والے ہیں، جو لوگ تمہارے پاس نہیں آئے ان کو باتیں

پہنچانے کے لئے خوب دھیان سے سنتے ہیں، یہ لوگ کلمات کو ان کی جگہوں سے بدل دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں: اگر تم کو یہ حکم ملے تو اس کو لے لینا، اور اگر تم کو یہ حکم نہ ملے تو اس سے پرہیز کرنا، اور اللہ تعالیٰ جس کو فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ فرمائے، تو اے مخاطب! اس کے لئے اللہ تعالیٰ پر تیرا کوئی زور نہیں چل سکتا، یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ نہیں فرمایا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے، ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے، اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے ﴿۴۱﴾ یہ لوگ جھوٹ کو خوب زیادہ سننے والے ہیں، خوب حرام کھانے والے ہیں، سو اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو ان کے درمیان فیصلہ فرما دیجئے، یا ان سے اعراض فرمالیجئے، اور اگر آپ اعراض کریں تو یہ آپ کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے، اور اگر آپ فیصلہ دیں تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ فرمائیے، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ﴿۴۲﴾ اور وہ آپ سے کیسے فیصلہ کراتے ہیں؟ حالانکہ ان کے پاس تورات ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، پھر اس کے بعد وہ روگردانی کرتے ہیں، اور وہ لوگ مؤمن نہیں ہیں ﴿۴۳﴾

معارف ومنازل

سورۂ مائدہ کے تیسرے رکوع سے اہل کتاب کا ذکر چلا تھا، درمیان میں چند دیگر مضامین آگئے، اب یہاں سے آخر سورت تک دوبارہ اہل کتاب اور ان کے بُرے عزائم وغیر اسلامی اعمال اور ان کے عواقب ونتائج کا بیان ہو رہا ہے۔ یہاں یہود، نصاریٰ، اور منافقین جو کہ اصل میں یہود ہی تھے انہی کا تذکرہ ہو رہا ہے کہ یہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں، آپ ان کی حرکتوں سے دل شکستہ اور پریشان نہ ہوں۔

اس کی مختصر تشریح یہ ہے، یعنی جن کی ذہانتیں اور سرگرمیاں ساری کی ساری اس کوشش میں صرف ہو رہی ہیں کہ جاہلیت کی جو حالت پہلے سے چلی آرہی ہے وہی برقرار رہے، اور اسلام کی یہ اصلاحی دعوت اس بگاڑ کو درست کرنے میں کامیاب نہ ہونے پائے، یہ لوگ تمام اخلاقی بندشوں سے آزاد ہو کر سرور عالم ﷺ کے خلاف ہر قسم کی رقیق سے رقیق چالیں چل رہے تھے، جان بوجھ کر حق دشمنی میں پیش پیش رہتے تھے، نہایت بے باکی وجسارت کے ساتھ جھوٹ، فریب، دغا اور مکر کے ہتھیاروں سے اس پاک وعالی مرتبت پیغمبر (ﷺ) کے کام اور مشن کو شکست دینے کی کوشش کررہے تھے، جو کامل بے غرضی کے ساتھ سراسر خیر خواہی کی بناء پر عام انسانوں کی اور خود ان کی فلاح وبہبود کے لئے شب وروز محنت کررہے تھے، ان کی ناشائستہ معاندانہ حرکات کو دیکھ کر سرور عالم ﷺ کا دل کُڑھتا تھا۔

اور یہ کڑھنا فطری امر تھا، جب کسی پاکیزہ انسان کو پست اخلاق لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے، اور وہ محض اپنی جہالت وخودغرضی وتنگ نظری کی بناء پر اِس کی خیرِ خواہانہ مساعی کو روکنے کے لئے گھٹیا درجہ کی چال بازیوں سے کام لیتے ہیں، تو فطرۃً اس کا دل رنجیدہ ہوتا ہی ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ان حرکات پر جو فطری رنج آپ کو ہوتا ہے وہ نہ ہونا چاہئے، بلکہ منشا در اصل یہ ہے کہ اس سے آپ دل شکستہ نہ ہوں، ہمت نہ ہاریں، صبر جمیل کے ساتھ آپ بندگانِ خدا کی اصلاح کے لئے کام کرتے چلے جائیں۔ رہے یہ لوگ، تو جس قسم کے ذلیل اخلاق انہوں نے اپنے اندر پرورش کئے ہیں ان کی بناء پر یہ روش ان سے عین متوقع ہے، کوئی چیز ان کی اس روش میں خلاف توقع نہیں ہے۔

شانِ نزول:

آیت کریمہ کا نزول اس وقت ہوا جب خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق پیدا ہوا، اور وہ زنا کے مرتکب ہوئے۔ توارت کے مطابق ان کی سزا رجم تھی، یعنی دونوں کو سنگسار کیا جائے، لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدمہ کو سرورِ عالم محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ اور خدمتِ عالیہ میں پیش کیا جائے، اگر وہ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کر لیا جائے، اور اگر رجم ہی کا حکم دیں تو قبول نہ کیا جائے۔

چنانچہ مقدمہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے لایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رجم کا حکم دے دیا، انہوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پوچھا: تمہارے مذہب میں اس کی سزا کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کوڑے مارنا، اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا، بازار میں پھرا کر تشہیر کرنا، وغیرہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے علماء کو قسم دے کر ان سے پوچھا: کیا توارت میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی یہی سزا ہے؟ انہوں نے پھر وہی جھوٹا جواب دیا۔ لیکن ان میں سے ایک شخص ''ابن صوریا'' جو خود یہودیوں کے بیان کے مطابق اپنے وقت میں توارت کا سب سے بڑا عالم ومفتی تھا خاموش رہا، اور سب کچھ سنتا رہا، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں تجھے اُس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا، اور جبلِ طور پر تمہیں شریعت توارت عطا فرمائی، کیا واقعی توارت میں زنا کی یہی سزا لکھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ: اگر آپ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں نہ بتاتا، واقعہ یہ ہے کہ سزا زنا کی تو رجم ہی ہے، مگر ہمارے ہاں جب زنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حکام نے یہ

طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ اگر زنا کرتے تو انہیں چھوڑ دیا جاتا، اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو انہیں رجم کیا جاتا۔ پھر جب اس سے عوام میں ناراضگی پیدا ہونے لگی، تو ہم نے تورات کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنا لیا کہ زانی اور زانیہ دونوں کو کوڑے لگائے جائیں، اور انہیں منہ کالا کر کے گدھے پر اُلٹے منہ سوار کیا جائے۔

اس کے بعد یہودیوں کے لئے کچھ بولنے کی گنجائش نہ رہی، اور سارے شرمندہ ہو کر خاموش رہے، اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے مسجد نبوی کے دروازہ کے باہر زانی اور زانیہ کو سنگسار کر دیا گیا۔

علماءِ تفسیر نے اسی طرح کے دوسرے واقعات بھی درج کئے ہیں، مگر مطلب سب کا ایک ہی ہے، جس کا خلاصہ اختصار کے ساتھ درج ہوا۔ واللہ اعلم

﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ لَا یَحۡزُنۡكَ الَّذِیۡنَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡكُفۡرِ﴾ اے رسول مقبول! آپ کو غمزدہ و پریشان نہ کریں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں، وہ لوگ منافقین ہیں، جن کا حال یہ ہے:

﴿مِنَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَلَمۡ تُؤۡمِنۡ قُلُوۡبُهُمۡ﴾ وہ ایسے لوگ ہیں جن کے دلوں میں کفر ہے، اور منہ سے ایمان کے مدّعی ہیں۔ یہ ان منافقین کا ذکر ہے جن کی اکثریت مدینہ کے یہودیوں میں سے تھی، اور یہ لوگ یہود اور مشرکین کے گماشتے اور جاسوس تھے، اور انہی کے لئے کام کرتے تھے۔

﴿وَمِنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا﴾ دوسرا گروہ یہودیوں کا ہے، جن کا حال یہ ہے:

﴿سَمّٰعُوۡنَ لِلۡكَذِبِ﴾ جو بہت سننے والے ہیں جھوٹ کو، اور جھوٹی باتوں کی تشہیر بھی کرتے ہیں، اسی کے ساتھ وہ بڑے بڑے یہودیوں اور مشرکوں کے سرداروں کے لئے جاسوسی بھی کرتے ہیں، یعنی وہ سردار جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں غرور کی وجہ سے نہیں آتے، تو فرمایا:

﴿سَمّٰعُوۡنَ لِقَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ ۙ لَمۡ یَاۡتُوۡكَ﴾ یہ سننے والے اور جاسوسی کرنے والے ہیں، ایک ایسی قوم کے لئے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نہیں آئی، اور نہیں آتی، یہ لوگ اُن کے لئے کام کرتے ہیں، اور پکے منافق و یہودی ہیں، اس جاسوسی کے علاوہ ان کے کفر اور پست اخلاقی کا یہ حال ہے کہ:

﴿یُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِهٖ﴾ یہ لوگ کلامِ الٰہی کو اپنے موضع و محل سے دور کر کے اس میں تحریف اور ردو بدل کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے تورات و انجیل میں تحریف کر کے بہت سے احکام تبدیل کئے، اس کی ایک مثال یہی آیتِ رجم ہے، جس کو انہوں نے تورات سے نکال دیا تھا، جس کا بیان ابھی ہوا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منصف

تسلیم کرنے کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ ہماری منشاء کے مطابق اگر فیصلہ ہوا کہ رجم نہیں تو اس کو تسلیم کرو، اور اگر رجم ہی کا فیصلہ ہوا تو اسے تسلیم نہ کرو۔ ارشاد ہے:

﴿يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ﴾ اگر تمہاری مرضی کا فیصلہ ہوا تو اسے قبول کرلو، اور اگر:

﴿وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا﴾ اور اگر تمہیں مطلب کا فیصلہ نہ ملے تو اس سے بچ جاؤ، یعنی قبول کرنے سے انکار کرو، اس پر ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ یعنی جس کو اللہ تعالیٰ فتنے میں ڈالنے کا ارادہ کرے، یعنی اسے گمراہ کرنے کا ارادہ کرے تو اس کے لئے آپ کسی بھی چیز کے مالک نہیں ہو سکتے، یعنی آپ انہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔ پھر اس کی وجہ بتادی:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ﴾ یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ پاک کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ظاہر بات ہے دل کی صفائی ایسے لوگوں کو نصیب ہوتی ہے کہ جن کو ایمان اور طہارت کی طلب ہو، اور یہ لوگ طلب ہدایت سے کوسوں دور ہیں، یہ لوگ: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [البقرة:۷] (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے) ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [المطففين:۱۴] (ہرگز نہیں، بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھادیا ہے) کے مصداق بنے ہوئے ہیں، لہٰذا یہ فیصلہ ہوا:

﴿لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ ان کے لئے دنیا میں رسوائی مقدر ہے، اور آخرت میں بڑا عذاب ہے، کیونکہ نفاق کا عذاب عام کفار کے عذاب سے سخت اور بڑا ہے، اب استحقاقِ عذاب کی وجوہات بیان فرمائیں:

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾ یہ جھوٹے لوگوں کے جاسوس ہیں، جھوٹی باتوں کو شوق سے سننے والے اور قبول کرنے والے ہیں، اور حرام خور بھی ہیں، جو خوب حرام کھاتے ہیں، احکامِ الٰہی میں پیسوں کی خاطر تبدیلی کرتے ہیں، فیصلوں میں رشوت لے کے بے انصافی کرتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ﴾ [التوبة:۳۴] (یہودی احبار اور عیسائی راہبوں میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھاتے ہیں، اور دوسرں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں)۔

بڑے صدمے کی بات ہے جیسے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت قدم قدم پر بنی اسرائیلیوں کی خصلتوں اور بداعمالیوں کا اتباع کرے گی، اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میری امت میں وہ ساری بیماریاں پیدا ہوں گی جن بیماریوں نے بنی اسرائیل کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ [المقاصد الحسنہ] آج ہم دیکھتے ہیں کہ حاملینِ تورات احبار ور ہبان کی یہ خصلت مسلمان مولویوں اور پیروں میں بھی پیدا ہو چکی ہے۔ ان حضرات کے پاس حلال و حرام کی کوئی تخصیص اور پابندی نہیں، مقصد صرف مال ہے، خواہ کسی راستے سے آئے، گنڈہ تعویذوں کا سلسلہ بڑے زور شور سے جاری ہے، جاہل مرد اور بکثرت جاہل و بدعقیدہ عورتیں خود ساختہ پیروں، سیدوں مولویوں کے دام فریب میں گرفتار ہیں، ہر جائز و ناجائز مقصد کے لئے بڑی کثرت سے مال خرچ کرتے ہیں، اور قسمت کے ستارے درست کرنے پر کم از کم پچاس ہزار روپیہ کا شکرانہ وصول کرتے ہیں۔ جھوٹ بول کر اس طرح جو مال حاصل کیا جاتا ہے یہ سب حرام اور سُحت کا حصہ ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حرام پر جس کا گزارہ ہو، یا حرام روزی سے جس کی پرورش ہو، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ [مشکوٰۃ]

آگے ارشاد ہے: ﴿فَإِنْ جَآءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾ فرمایا: اگر یہ لوگ آپ کے پاس کوئی مقدمہ برائے تصفیہ لے کر آجائیں تو آپ کو ان کے درمیان فیصلہ کرنے اور نہ کرنے کا اختیار ہے، آپ اپنی صوابدید پر عمل کر کے فیصلہ فرمائیں، یا انہیں جواب دے دیں۔

﴿وَإِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئًا﴾ اگر آپ فیصلہ پسند نہ کریں، اور ان کو جواب دے دیں تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں، یہ لوگ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یعنی جس طرح ان کے خلاف فیصلہ کرنے میں آپ کو ضرر نہیں ہوگا (جیسے کہ رجم کے معاملہ میں ہوا) اسی طرح جواب دینے میں بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہے۔

البتہ! فیصلہ کی صورت میں آپ کو یہ ہدایت ہے:

﴿وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ آپ چونکہ سارے جہانوں کے لئے رحمت ہیں، فیصلہ کے معاملہ میں آپ کے نزدیک دوست و دشمن اپنے اور پرائے کا کوئی فرق نہیں ہوتا، تو آپ انصاف سے فیصلہ فرمائیں، اور اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو دوست رکھتا ہے، اور آپ اللہ تعالیٰ کے حبیب و محبوب ہی تو ہیں۔ پھر فرمایا:

﴿وَكَيۡفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِندَهُمُ ٱلتَّوۡرَىٰةُ فِيهَا حُكۡمُ ٱللَّهِ﴾ یہ لوگ تعجب ہے کیسے آپ کو منصف بنائیں گے، جب کہ وہ آپ کی نبوت پر عقیدہ نہیں رکھتے ؟ ہاں ! ہوسکتا ہے وہ تورات کے کسی سخت حکم سے منحرف ہوں، اور آپ کے پاس اِس لئے آتے ہوں کہ شاید آپ کی شریعت میں اس سخت حکم کے خلاف کوئی آسانی ہو، جیسے ابھی مسئلۂ رجم میں گزرا کہ وہ آپ کے پاس اس امید سے آئے تھے کہ شاید آپ بجائے رجم کے کوئی آسان فیصلہ کرلیں گے، جیسے کوڑے مارنا وغیرہ۔

مطلب یہی ہے کہ تورات اور تورات میں حکمِ الٰہی کے ہوتے ہوئے آپ کے پاس یہ لوگ کوئی عقیدت لے کر نہیں آتے، بلکہ حیلہ و بہانہ کے پیش نظر آپ کے پاس آتے ہیں کہ شاید آپ ان کی مرضی کے مطابق فیصلہ صادر کریں، تو ایسی صورت میں آپ حق وانصاف کا فیصلہ فرمائیں، جیسے کہ زانی وزانیہ کے متعلق آپ نے رجم کا حکم دے دیا۔

﴿ثُمَّ يَتَوَلَّوۡنَ مِنۢ بَعۡدِ ذَٰلِكَۚ وَمَآ أُوْلَٰٓئِكَ بِٱلۡمُؤۡمِنِينَ﴾ پس یہ اعراض کر کے منحرف ہوتے ہیں، حالانکہ وہ آپ کے پاس فیصلہ ہی کے لئے تو آئے تھے، مگر جب آپ کا فیصلہ (رجم والا) ان کی مرضی کے خلاف ہوا تو انکار کر بیٹھے۔

دراصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہیں ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے، نہ آپ کی کتاب پر نہ تورات پر، اگر ان کا تورات پر ایمان ہوتا تو اس پر عمل کرتے، آپ کے پاس نہ آتے، اگر آپ پر ایمان ہوتا تو فیصلہ تسلیم کرتے، تو ظاہر ہوا کہ یہ مؤمن نہیں کافر ہیں، جیسے آئندہ بیان ہوگا۔ اس کی تفصیل گزر چکی، حتیٰ کہ ابن صوریا نے جب حق تسلیم کیا تو یہ بے بس ہوگئے۔ واللہ اعلم

عذابِ الٰہی کے چند اسباب:

''سُحت'' عربی زبان میں کسی چیز کو بالکل جڑ سے ختم کرنے کے لئے موضوع ہے، اس کو حرام اور رشوت کے لئے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ جہاں حاکموں، قاضیوں، افسروں اور دیگر سرکردہ شخصیتوں اور سربراہوں وغیرہ میں رشوت کا لین دین ہوجائے وہاں حق اور انصاف جڑ سے ہی ختم ہوجاتا ہے، اور خدائی اور حکامِ ملکی ریاستی قوانین معطل ہوکر ان کی بیخ کنی ہوجاتی ہے، اور پورا معاشرہ اللہ تعالیٰ کے خاموش عذاب کی لپیٹ میں آجاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی تکوینی حفاظت اور نگہداشت کی طناب کٹ کر منقطع ہوجاتی ہے، اور قدم قدم پر چوری، ڈکیتی، کشت وخون، ظلم وزیادتی

اور جرائم عام ہو جاتے ہیں۔

پھر یہ بات قابلِ غور ہے کہ رشوت صرف یہی نہیں ہے کہ حاکم وقاضی کو کچھ دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرالیا جائے، بلکہ ہر وہ کام جو کسی کے ذمہ شرعاً فرض یا واجب ہو، اور ہر وہ کام جو تنخواہ لینے کی وجہ سے کسی نے اپنے ذمہ کرلیا ہو، اس کام پر نقد رقم یا کوئی اور چیز لینا رشوت ہے۔

رشوت کی بہت سی صورتیں ہیں، جو کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔ جو شخص کسی محکمہ میں ملازم ہو، اگر اس محکمہ میں کام کرنا شرعاً جائز ہو (اور اگر وہ محکمہ ہی حرام ہو تو اس کی نوکری ہی حرام ہے، جیسے سودی بینک یا این جی اوز وغیرہ) تو جو کام بحیثیتِ ملازم اس کے ذمہ واجب ہے، اگر وہ عوام سے پیسہ لے کر کرے تو یہ پیسہ لینا قطعاً حرام ہے، کیونکہ اس کام کی تنخواہ اسے سرکار سے مل رہی ہے۔ حاکم قاضی اگر صحیح فیصلہ کرے تب بھی اس کو کسی فریق سے پیسہ لینا حرام ہے، کیونکہ وہ صحیح فیصلہ کرنے کا پابند ہے، اور اگر رشوت بھی لی، اور فیصلہ بھی غلط کیا تو رشوت تو حرام ہے ہی، لیکن تنخواہ بھی حرام ہوگی، کیونکہ جس کام پر وہ مامور ہے، اور جس کی تنخواہ وہ لے رہا ہے اس نے وہ کام نہیں کیا۔

جو لوگ کسی عہدہ پر پہنچ جاتے ہیں لوگ دوڑ دوڑ کر ان کے پاس مال لاتے ہیں، اور ہدیہ بنا کر تحفہ پیش کرتے ہیں یہ حقیقت میں ہدیہ نہیں ہے، یہ خالص رشوت ہے۔ ان لوگوں نے کسی وقت اس سے کام لینا ہے، ابھی پیشگی اسے کچھ دے کر اسے حامی اور طرف دار بنانا مقصود ہوتا ہے، یہ ظاہر میں ہدیہ ہے، حقیقت میں رشوت ہے۔ اسی لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جو شخص حاکم بنا اس کا ہدیہ لینے دینے کا جن لوگوں سے پہلے سے تعلق تھا وہ اب بھی ہدیہ سمجھا جائے گا، لیکن جو لوگ اب ہدیہ دینا شروع کریں گے وہ رشوت میں شمار ہوگا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت میں ان کے ایک قریبی عزیز نے بطور ہدیہ کچھ پیش کیا، انہوں نے اسے واپس کر دیا، جو غلام ہدیہ لے کر آیا تھا اس نے کہا کہ آپ ہدیہ نہیں لیتے، ہدیہ تو سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے بھی لیا ہے، اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ان کے لئے یہ ہدیہ تھا، اور آج یہ ہمارے لئے رشوت ہے۔

رشوت باتفاق علماء وفقہاء گناہ کبیرہ ہے، اور جو لوگ متقی پرہیزگار ہوتے تھے وہ اپنے شاگردوں، مریدوں، عقیدت مندوں سے بھی ہدیہ قبول نہیں کرتے تھے، کہ مبادا یہ رشوت شمار نہ ہو، پس رشوت کی حرمت متفق علیہ اور نہایت سخت گناہ ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بڑے صاحبزادے سرکاری ملازم (قاضی) تھے، مگر امام صاحب اس کے گھر کے پانی سے وضوء نہیں کرتے تھے۔

ایک خادم شاگرد نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا بڑا بیٹا متقی پرہیز گار ہے، اس کا تقویٰ پورے شہر میں ضرب المثل ہے، وہ کسی سے ہدیہ قبول نہیں کرتے ہیں، امام صاحب نے فرمایا: ہوسکتا ہے کبھی وہ نادانستہ طور پر پانچ دس منٹ سرکاری اوقات کار سے پہلے چھٹی کی ہو، تو اس کی تنخوہ حرام ہوئی، تو میں کیسے اس کے گھر کے پانی سے نماز کے لئے وضوء کروں؟ یہ ہے تقویٰ، جسے ہر شخص حاصل نہیں کرسکتا، الا ماشاء اللہ

آنحضرت سرور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لَعَنَ اللهُ الرَّاشِي وَالْمُرْتَشِيَ وَالرَّائِشَ"۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے رشوت دینے والے، اور لینے والے پر، اور اس شخص پر جو ان کے درمیان واسطہ بنے۔ [مشکوۃ]

اس حدیث سے اندازہ یہی ہوا کہ رشوت خور اللہ تعالیٰ کی لعنت کی گرفت میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی لعنت کوئی معمولی چیز نہیں، یہ اتنی سخت بھاری چیز ہے جسے سوائے کفار کے اور کوئی نہ ہضم کرسکتا ہے، نہ برداشت، پس کتنے ناعاقبت اندیش ہیں وہ لوگ جو رشوت لے کر خود جہنم میں گر رہے ہیں؟ اور اپنے معصوم بچوں اور بے گناہ خاندان کو حرام کھلا کر ان کی عاقبت بھی تباہ کررہے ہیں؟

اور جب یہ ناسور پورے معاشرے میں عام ہوجاتا ہے، جیسے سودی کاروبار ہے، تو سارے مسلمانوں سے خوفِ خدا، تقویٰ اور حلال خوری رخصت ہوجاتی ہے، جس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اسلامی زندگی اور اسلامی اقدار معاشرے سے معدوم ہوجاتے ہیں، پھر تازیانۂ عبرت کے طور پر اللہ تعالیٰ کا خاموش عذاب لوگوں پر مسلط ہوجاتا ہے۔ سب سے پہلے امن وامان اور تحفظ جان ومال تباہ ہوجاتا ہے، اس کے بعد دوسرے طرح طرح کے عذاب مسلط ہوجاتے ہیں، مثلاً فقر، فاقہ، گرانی، بیماریوں کی کثرت، زلزلے، بھوک، پیاس، پانی کی قلت، عداوت، بغض وحسد، قتل وقتال، چوری، ڈکیتی، جھگڑے، فساد وغیرہ ہر قسم کے عذاب۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس کسی قوم میں زنا کاری پھیل جائے تو قحط کے ذریعہ ان کی گرفت ہوگی، اور جس قوم میں رشوتوں کا لین دین رواج پاجائے تو رعب کے ذریعہ ان کی گرفت ہوجائے گی، وہ ہمیشہ اپنے دشمنوں سے مرعوب اور خوفزدہ رہیں گے۔ [أحمد، مشکوۃ]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب کسی قوم میں خیانت کا رواج ہوجائے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں رعب ڈال دے گا، اور جس قوم میں زنا کی کثرت ہو وہاں اموات بکثرت ہوں گی، اور جس قوم میں ناپ تول اور وزن کی کمی ہو ان پر قحط اور گرانی مسلط ہوگی، اور جس قوم کی عدالتوں میں انصاف نہ ہو وہاں قتل وقتال

کا عذاب مسلط ہوگا، اور جس قوم میں بدعہدی کا رواج ہوا ان پر دشمن کو مسلط کیا جائے گا۔ [مشکوۃ]

ان سب چیزوں کی تباہ کاریاں گزشتہ قومیں بھگت چکی ہیں، اور اب بھی بہت سی قوموں میں یہ اعمال ہیں جن کی وجہ سے ان کی زندگیاں تلخ ہیں۔ جو لوگ پاکیزہ دین اسلام کے دعوے دار ہیں وہ غور کریں اور اپنے حالات کو سامنے رکھیں، اپنے معاشرے کے شب و روز کا اچھی طرح مطالعہ کریں، اور سوچ لیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں۔ اللہ ہی رحم فرمائے، ایسا لگتا ہے کہ مسلمان لوگ جہنم کی ٹرین میں بیٹھ کر جنت جانا چاہتے ہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَ
الرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوۡا عَلَيۡهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخۡشَوُا النَّاسَ وَ
اخۡشَوۡنِ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾

ترجمہ: بے شک ہم نے توریت نازل کی، اس میں ہدایت ہے اور روشنی ہے، اس کے ذریعہ انبیاء کرام فیصلہ کرتے تھے، (انبیاء) جو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے یہ فیصلے ان لوگوں کو دیتے تھے جو یہود تھے، اور اللہ والے اور علم والے بھی فیصلہ دیتے تھے بوجہ اس کے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو محفوظ رکھنے کا حکم دیا گیا تھا، اور وہ اس پر گواہ تھے، تو تم لوگوں سے نہ ڈرو، اور مجھ سے ڈرو، اور میری آیتوں کے ذریعہ تھوڑی سی قیمت مت خریدو، اور جو شخص اس کے موافق حکم نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے سو یہی لوگ کافر ہیں ﴿۴۴﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں بتادیا کہ اہل کتاب خاص کر یہود تورات کو بھی نہیں مانتے ہیں، جس طرح وہ قرآن اور صاحب قرآن کو نہیں مانتے، اب ان آیات میں آخر رکوع تک تینوں بابرکت کتابوں کی عظمت و بزرگی کا بیان ہے، اور یہ وضاحت ہے کہ ان کے نہ ماننے والے کافر، ظالم اور فاسق ہیں تو ارشاد ہے:

﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ﴾ ہم نے تورات نازل کی ہے جس کے اندر ہدایت اور نور ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے احکام معلوم ہوجاتے ہیں، اور اگر لوگوں کے دل پتھر کی طرح سخت نہ ہوں، اور ظاہری آنکھوں کا نور بھی سلامت ہو، تو تورات کے نور کی روشنی کارآمد ہوجاتی ہے، کیونکہ دل اور آنکھوں کا اندھا کتابِ الٰہی سے

استفادہ نہیں کرسکتا، جیسے اندھے لوگ سورج کی روشنی سے محروم رہتے ہیں، یہی حال قوم یہود کا ہے۔

﴿يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ہزاروں پیغمبر علیہم السلام مبعوث ہوئے، ان سارے انبیاء علیہم السلام نے تورات شریف پر عمل کیا، اور اس کے احکام پر قوم بنی اسرائیل کے فیصلے کئے، یہاں تک کہ آخری پیغمبر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تورات کے حکم پر فیصلہ فرمایا، اور اپنی آنکھوں کے سامنے بدکاروں کا رجم کرایا، اور کہا: الحمد للہ! میں اللہ تعالیٰ کا پہلا بندہ ہوں جو اللہ تعالیٰ کے مردہ حکم کو زندہ کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔

حسن بصری اور سدی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا کہ صیغہ جمع ''اَلنَّبِيُّوْنَ'' سے مراد سارے انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام ہیں، جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان مبعوث ہوئے، وہ انبیاء علیہم السلام کیسے تھے؟ فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا﴾ وہ سارے اسلام والے تھے، اللہ تعالیٰ کے مطیع وفرمانبردار تھے۔ اسلام درحقیقت سارے انبیاء علیہم السلام کے دین کا مشترک اصلی نام ہے، پھر عرف نے اس کو آخری دین اور آخری امت کے ساتھ خاص کیا، کیونکہ مکمل تسلیم ورضا اس آخری امت کا طغرۂ امتیاز ہے، اور یہ نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عطیہ وبخشش ہے۔ فرمایا: ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [الحج: ٧٨] (تمہارے باپ ابراہیم کی ملّت، انہوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا) تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی۔

﴿لِلَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ یعنی انبیاء کرام علیہم السلام جو تورات کے حکموں کا فیصلہ کرتے تھے، یہ سارے فیصلے یہود کے لئے ہوتے تھے، کیونکہ تورات کا نزول یہود کے حق میں ہوا، اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت بھی یہود کے لئے ہوئی۔

دراصل یہ یہود کو تنبیہ اور سرزنش ہے کہ کتاب بھی تمہاری اور انبیاء علیہم السلام بھی تمہارے، اور ان کے فیصلے بھی تمہارے لئے، اور وہ سارے اللہ تعالیٰ کے مطیع وفرمانبردار رہے، جبکہ تم نے سوائے گمراہی اور نافرمانی کے کچھ حاصل نہیں کیا، اور مسلسل تورات میں اور انبیاء علیہم السلام کے احکام میں تحریف کرتے رہے، دنیا کے چند مال ودراہم کے عوض دین ومذہب فروشی میں آخرت برباد کرتے رہے، جبکہ تورات نے تمہیں تعلیم دی اور ہدایت دی کہ جب کوئی رسول تمہارے نبی اور تمہاری کتاب کی تصدیق کرنے والا آئے تو اس پر ضرور ایمان لانا، اور اس کی مدد کرنا، مگر تم نے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی پھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور نصرت ومدد کی بجائے ان کے خلاف ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔

﴿وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ﴾ ربّ والے، اللہ والے، یعنی عابد، زاہد، صوفی، باعمل اپنے مریدوں اور متعلقین کے اخلاق کو درست کرنے اور دلوں کو صاف شفاف بنانے کے لئے تورات کے مطابق لوگوں کو حکم دیتے تھے۔

﴿وَالْاَحْبَارُ﴾ اور ماہر علماء بھی۔ احبار کا واحد حِبْرٌ ہے۔ ماہر عالم کو حبر کہتے ہیں۔ بعض علماء نے حِبر کا معنی جمال لکھا ہے۔ حدیث میں آیا ہے: دوزخ سے ایک آدمی ایسی حالت میں نکلے گا کہ اس کا حسن و جمال جا چکا ہوگا "اَیْ: زَالَ حِبْرُہٗ"۔ علماء کو اس وجہ سے حِبر کہتے ہیں کہ وہ امت کے جمال ہیں، اور جمالِ علم سے آراستہ ہیں۔

پہلے جو عالم و حبر ہوتا تھا وہ ضرور ربانی عابد و زاہد تارک الدنیا بھی ہوتا تھا، اور ہر ربانی حِبر و عالم بھی ہوتا تھا، دونوں میں لزوم کی صفت موجزن رہتی۔ ابھی قرب قیامت کی وجہ سے لزوم نہ رہا، اس لئے بہت سے عبادت گزار عالم نہیں ہوتے، اور بہت سے علماء عابد و زاہد بھی نہیں ہوتے، اس لئے عوام پر اچھے اثرات مرتب نہیں ہو رہے، اور بے عملی کا دور دورہ ہے۔ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا وَاغْفِرْ لَنَا وَعَافِنَا۔

الحمد للہ! بکثرت وعموم نہ سہی اب بھی اس امت میں ایسے لوگ ہر مقام اور ہر محاذ پر موجود ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم ظاہر اور علم باطن دونوں سے نوازا ہے، وہ شب و روز دونوں محاذوں پر امت کی تعلیم و تربیت اور اصلاح حال میں مصروف، اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر رواں دواں ہیں۔

﴿بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ یعنی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے نائبین، ربانیین اور احبار توریت کے احکام جاری کرنے کے اس لئے پابند تھے کہ اللہ تعالیٰ نے توریت کو محفوظ رکھنے کا فریضہ ان کے ذمہ لگایا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کو چونکہ تورات کی نگہداشت و حفاظت پر مامور کیا گیا تھا، تا کہ اس کے الفاظ اور معانی و مطالب میں کاٹ چھانٹ اور تبدیلی نہ ہو، اور کما حقہ اس پر عمل جاری ہو۔

﴿وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ﴾ اور وہ اس بات پر گواہ بھی تھے کہ ہاں ہمارے ذمہ حفاظت کی ذمہ داری کی گئی ہے، اور ہم اس کے نگراں اور محافظ ہیں، اس ذمہ داری کو جب تک علماء یہود نے پورا کیا توریت شریف کو تحریف سے محفوظ رکھا، جب اس ذمہ داری کا احساس ختم کر دیا تو توریت میں خود ہی تحریف کر بیٹھے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی علماء یہود نے توریت میں تحریف کر لی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے علماء یہود بھی تحریف کرتے تھے، اور اسی پر لوگوں سے پیسے، مال، مراعات حاصل کرتے تھے۔ اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات توریت میں لکھی ہوئی تھیں ان کو چھپاتے تھے، اسی لئے متصلاً فرمایا:

﴿فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ کہ تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو، اور میری آیات کے بدلے میں دنیا کا متاعِ قلیل حاصل نہ کرو، نہ مالی رشوت لو اور نہ اپنی ریاست و سرداری برقرار رکھنے کے لئے میری آیات کو تبدیل کرو، اور نہ حق بات کو چھپاؤ، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کرے تو وہی کافر ہے۔ یہود نے آیت رجم کو بدلا تورات کے حکم کو نہ مانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ تورات اور قرآن کریم دونوں کے مطابق تھا اسے تسلیم نہ کیا، ابن صوریا کی حق بات کو بھی نہ مانا، تو ان کے کفر میں کوئی شک نہیں کرنا چاہئے۔

اگر ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ﴾ سے عام معنی مراد ہو، یعنی یہود اور غیر یہود خواہ مسلمان بھی، تو کفر سے مراد فسق ہی ہوگا، حقیقی کفر مراد نہیں ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور طاوس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ وہ کفر نہیں جو دین سے خارج کردے (جیسے خوارج کہتے ہیں) جیسے اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت کا انکار دین سے خارج کردیتا ہے، بلکہ حکمِ خداوندی کو چھپانا، یا اس کے خلاف حکم دینا مراد ہے، اس سے کفر لازم نہیں آتا۔ بہتر توجیہ یہ ہے کہ شریعت کا انکار اور استخفاف و مذاق عقیدۃً یہ صراحۃً کفر ہے، اور عملاً ترکِ شریعت کفر نہیں فسق ہے، جیسے کہ منکر صلوٰۃ کافر ہے، اور تارکِ صلوٰۃ فاسق ہے، بات عقیدہ اور عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

ترجمہ: اور ہم نے ان پر توریت میں لکھ دیا کہ جان جان کے بدلہ، اور آنکھ آنکھ کے بدلہ، اور ناک ناک کے بدلہ، اور کان کان کے بدلہ، اور دانت دانت کے بدلہ اور زخموں کا بدلہ ہے (برابر) سو جو شخص معاف کردے وہ اس کے لئے کفارہ ہے، اور جو شخص اس کے موافق حکم نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا سو یہی لوگ ظالم ہیں ﴿۴۵﴾

معارف ومنازل

یہاں سے قصاص فی النفس اور قصاص فی الاعضاء کا بیان ہورہاہے۔تورات میں قصاص کے جو احکام تھے یہود نے عملی طور انہیں بھی تبدیل کیا تھا۔شریف، وضیع، بڑے خاندانوں، مالداروں، سرمایہ داروں کے لئے مراعات وضع کئے تھے،غرباء ومساکین فقراء وعوام الناس کسی رعایت کے مستحق نہیں ہوتے تھے۔

مدینہ منورہ میں یہودیوں کے دو بڑے قبیلے آباد تھے: ایک قبیلہ بنی نضیر، دوسرا قبیلہ بنوقریظہ۔ یہ دونوں ہر وقت آپس میں جھگڑتے فتنے کرتے اور لڑائیاں لڑتے تھے۔ بنی نضیر اپنے آپ کو اعلیٰ واشرف سمجھتے تھے، اور بنوقریظہ کو کمزور جانتے تھے، جب بنی نضیر کا کوئی شخص بنوقریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تھا تو اسے قصاص میں قتل نہیں ہونے دیتے تھے، اور اس کی دیت میں ستر (۷۰) وسق کھجوریں دیتے تھے، اور اگر بنوقریظہ کا کوئی شخص بنی نضیر کے آدمی کو قتل کر دیتا تو قاتل کو قصاص میں قتل بھی کرتے تھے، اور دیت میں دگنا، یعنی ایک سو چالیس وسق کھجوریں بھی لیے تھے۔ اسی طرح بنونضیر کی عورت کے عوض بنوقریظہ کا مرد، اور بنونضیر کے غلام کے عوض بنوقریظہ کا آزاد آدمی قتل ہوتا تھا، جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

اسی طرح کے غیر منصفانہ قوانین جراحات کے عوض کے بنا رکھے، اور وضع کئے تھے۔ بنوقریظہ کو تاوان کم دیتے تھے اور بنونضیر ان سے دوگنا لیتے تھے۔آیت کریمہ بالا کے نزول سے یہ محقق ثابت ہوا کہ قصاص فی النفس ہو یا قصاص فی الاعضاء سب میں مساوات اور برابری واجب ہے، اور یہی قرآنی حکم بعینہٖ تورات شریف کا بھی ہے، جسے یہود نے دوسرے احکام کی طرح تبدیل کیا ہوا ہے، اور بنوقریظہ وبنونضیر کے معاملات ہوں یا عام قوم یہود کے سب ظالمانہ اور غیر منصفانہ ہیں، اور توریت کے احکام کے خلاف ہیں۔

﴿وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴾ اور جو شخص اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تو یہی لوگ ظالم ہیں۔قصاص کا یہ قانون ہمارے لئے بھی اسی طرح مشروع ہے کہ جان کو جان کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا، بشرطیکہ قاتل نے قصداً قتل کیا ہو، اس میں مرد عورت، چھوٹا بڑا، امیر غریب، تندرست بیمار، بینا اور نابینا سب برابر ہیں، کسی بڑے کو دوسرے غریب پر، اسی طرح کسی قبیلے کو دوسرے قبیلہ پر فضیلت وفوقیت حاصل نہیں۔

البتہ قتل عمد میں مقتول کے ورثاء کو اختیار حاصل ہے، چاہے قصاص لے لیں، چاہے دیت قبول کریں،

چاہے معاف کرلیں، جیسے تفصیلاً سورۂ بقرہ میں بیان ہوا۔ مزید تفصیلات مع جزئیات کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ اسی طرح زخموں کی تفصیلات بھی وہاں دیکھیں۔

﴿فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ﴾ کا مطلب:

مفسرین کرام نے اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں: پہلا یہ کہ ''لَهٗ'' کی ضمیر جریح (مجروح) اور مقتول کے ولی کی طرف راجع ہو، تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مجروح نے یا مقتول کے ولی نے اگر جارح اور قاتل کو معاف کردیا، اور اپنے حق کو صدقہ کردیا، یعنی جارح اور قاتل کو معاف کردیا، جو کہ ایک صدقہ ہے، تو یہ اس کے لئے کفارہ ہے، اس کے گناہوں کے لئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما، حسن بصری، شعبی، قتادہ اور ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہم سے ایسا ہی مروی ہے۔

اور اگر ''لَهٗ'' کی ضمیر جارح اور قاتل کی طرف راجع ہو تو پھر معنی یہ ہوں گے کہ مجروح نے یا مقتول کے ولی نے جب جارح اور قاتل کو معاف کردیا تو یہ صدقہ جارح اور قاتل کے گناہ کا کفارہ ہوگیا، اب اس پر قیامت میں مؤاخذہ نہ ہوگا۔ [قرطبی] رہا معاف کرنے کا اجر وثواب تو وہ یہ ہے:

﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ [الشوری: ۴۰] (تو جس نے معاف کیا اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ پر ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ابراہیم نخعی، مجاہد اور زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہم سے ایسا ہی مروی ہے۔ [معالم، مظہری وغیرہ]

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

ترجمہ: اور ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا، جو اس کتاب کی تصدیق کرنے والے تھے جو ان کے سامنے تھی، یعنی تورات، اور ہم نے ان کو انجیل دی جس میں ہدایت تھی اور روشنی تھی، اور وہ تصدیق کرنے والی تھی اس چیز کی جو ان کے سامنے تھی، یعنی تورات اور وہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے ہدایت اور نصیحت تھی ﴿۴۶﴾ اور چاہیے

کہ انجیل والے حکم کریں اس کے موافق جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، اور جو شخص اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا سو وہی لوگ نافرمان ہیں ۴۷

معارف ومنازل

انجیل شریف میں ہدایت تھی اور نور تھا (روشنی):

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توریت کی فضیلت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے فضائل کا تذکرہ فرمارہے ہیں، یعنی ان انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد جو توریت کے مطابق حکم کرتے تھے، ہم نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو بھیجا جو توریت شریف کی تصدیق کرنے والے تھے، اور ہم نے ان کو انجیل عطا کی، توریت کی طرح اس میں ہدایت اور روشنی تھی۔

چونکہ سارے انبیاء علیہم السلام مبعوث من اللہ اور معصوم ہیں، ان سب کا دین ایک ہے (شرائع مختلف ہیں) وہ عصبیتوں اور مخالفتوں سے معصوم اور پاک ہیں، وہ آپس میں سب بھائی ہیں، وہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں، ان پر نازل شدہ کتابیں بھی ایک دوسری کی تصدیق کرنے والی ہیں، اور ان کی کتابیں بنیادی اصول دین کے علاوہ احکام، ہدایت، نصیحت اور راہنما اصول اخلاق کی روشنی پر مشتمل ہیں۔

انبیاء کرام علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کا سرچشمہ اور مرکز ایک ہی ہے، جس میں کسی قسم کی تفریق کا تصور تک محال ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کے نام لیواؤں نے نفسیاتی خواہشات کی بنیاد پر گروہ بندیاں اور اختلافات شروع کئے، دینِ الٰہی جو کہ متحد تھا اس میں طرح طرح کے رخنے ڈال دیئے، خاص کر یہود قوم جو کہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کے علاوہ پیغمبروں کے قاتل بھی ہے، برائیوں اور منافقتوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اور اللہ تعالیٰ کو فقیر کہنے سے بھی نہیں شرمائی۔

ایک عرصہ تک یہودیت ونصرانیت میں رقابت واختلاف رہا، ایک دوسرے پر کفر ونفاق کا الزام لگاتے رہے، اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے۔ جب پیغمبر آخر زمان صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو دونوں فریق سیاسی گٹھ جوڑ کر کے آپس کے اختلاف کو بھلا کر اسلام اور پیغمبر اسلام اور قرآن حکیم کی مخالفت میں متحد ہو گئے اور آج تک اسلام کے خلاف متحد ہیں۔

تورات وانجیل جو آسمانی کتابیں ہیں اور ان کے لئے ہدایت کے سرچشمے ہیں، ان میں اتنی تحریفات کیں کہ اصل کتاب مشکوک ہوگئی، اور اس کی بنیادی باتیں ختم ہوگئیں۔ انہیں حکم تھا کہ تورات وانجیل کے مطابق فیصلہ کرو، فیصلہ بجائے خود، انہوں نے تورات وانجیل کا حلیہ تبدیل کیا، اسی بنیاد پر پہلے انہیں کٰفِرُوْنَ کہا پھر ظٰلِمُوْنَ اور آخر میں فٰسِقُوْنَ کہا، اور قانونِ الٰہی کے باغی اور دشمن، پھر مبغوض وملعون بھی ہوئے "خذلهم الله"۔ تورات وانجیل کی حقانیت وفضیلت بیان کرنے کے بعد قرآن حکیم کا تذکرہ فرمایا۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۴۸

ترجمہ: اور ہم نے حق کے ساتھ آپ کی طرف کتاب اتاری، وہ ان کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئیں، اور وہ ان کتابوں کی محافظ ہے؟ جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمایا، اور آپ ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کیجئے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، اور جو حق آپ کے پاس آیا ہے اسے چھوڑ کر آپ ان کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجئے، تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے شریعت اور خاص راہ مقرر کردی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن (اس نے ایسا نہیں کیا) تاکہ تم کو اس کے بارے میں آزمائے جو تم کو دیا، سو تم خیر کے کاموں کی طرف دوڑو، اللہ تعالیٰ ہی کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے، سو وہ ان باتوں کے بارے میں تم کو باخبر فرمائے گا (بتائے گا) جن میں تم اختلاف رکھتے تھے ۝۴۸

معارف ومنازل

﴿اَلْمُهَيْمِنُ﴾ کا ترجمہ بروایت والبی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے شاہد کیا ہے یہی قول مجاہد، قتادہ، سدی اور کسائی رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا: "بتانے والا"۔ سعید بن جبیر اور ابو عبید رحمۃ اللہ علیہما نے کہا: "صاحب امانت"۔ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: "امین"۔ سعید بن مسیب اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما نے کہا: "حاکم"۔

اور خلیل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ''نگران ومحافظ''۔

یہ تمام معانی قریب قریب ہیں، مقصد سب کا یہ ہے کہ جس کتاب کے متعلق قرآن کریم یہ شہادت دے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، وہ ضرور اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ قرآن کریم گزشتہ کتبِ الٰہیہ کا امین ہے، اگر اہلِ کتاب اپنی کتابوں سے کچھ بیان کریں، اور وہ بیان قرآن مجید میں بھی ہو تو اس کی تصدیق کرو، ورنہ جھوٹ سمجھو، یعنی قرآن میں اگر اس کی تصدیق ہو تو صحیح سمجھو، اگر قرآن کریم میں اس کی تکذیب ہو تو اس کو غلط قرار دو۔ اور اگر قرآن اس کے بارے میں خاموش ہو تو تم بھی خاموش رہو، نہ تصدیق کرو نہ تکذیب، کیونکہ اہلِ کتاب کے بیان میں صدق وکذب دونوں کا احتمال ہے۔ [مسلم]

﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ﴾ ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی ہے حق کے ساتھ، اور اس سے پہلے جو اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں ان کی بھی تصدیق کرنے والی ہے، تو کسی اہل کتاب کو اس سے منحرف ہونے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ یہ کتاب ان کی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، اور نہ صرف یہ کہ وہ سابقہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، بلکہ ان کے مضامین کی نگراں ومحافظ بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا خود وعدہ فرمایا ہے، بخلاف کتب سابقہ کے، چونکہ انہیں قیامت تک باقی رکھنے کا پرگرام نہ تھا، تب اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا، اور قرآن حکیم چونکہ قیامت تک کے لئے ہے اس لیے اس کی حفاظت وبقاء کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا، اور فرمایا: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ﴾ [الحجر: ۹] (ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔

اب یہ قرآن خود بھی محفوظ ہے، اور ان مضامین کا بھی محافظ ہے جو سابقہ کتابوں میں بیان ہوئے تھے، پھر فرمایا:

﴿فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَـقِّ﴾ کہ جو حق آپ کے پاس آیا ہے اس کی روشنی اور ہدایات کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ فرمادیجئے، اور جو حق آپ کے پاس ہے اس کو چھوڑ کر آپ ان کی خواہشوں کے مطابق فیصلہ نہ کریں۔

﴿لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا﴾ کہ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک خاص شریعت اور ایک خاص طریقہ عمل مقرر کردیا ہے۔ عقائد واصول تو تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے مشترک اور ایک جیسے ہیں، اور

بہت سے احکام اور اوامر ونواہی میں بھی اتفاق ہے۔

البتہ! دیگر فروعی احکام میں اختلاف ہے، اور چونکہ یہ تمام احکام اللہ تعالیٰ ہی کے اوامر ونواہی کے تحت ہیں، اس لئے جس امت نے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کے رسول (علیہ السلام) کی ہدایات کے مطابق عمل کیا اس نے اللہ تعالیٰ ہی کی صحیح فرمانبرداری کی، پہلی امتوں کو جو بعض احکام دیئے گئے تھے وہ قرآن حکیم کی آمد کے ساتھ منسوخ ہوگئے، توریت کے بعض احکام انجیل کے نزول کے ساتھ منسوخ ہوگئے تھے، حتیٰ کہ آخری کتابِ رحمت قرآن حکیم نے ساری کتابیں ہمیشہ کے لئے منسوخ کردیں، تو جب اللہ تعالیٰ نے گزشتہ تمام شریعتوں کو منسوخ کردیا، اور سب سے آخری شریعت یعنی شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی کو مدارِ نجات قرار دے دیا، تو اب دوسری شریعتوں پر چلنے کی اجازت ختم ہوگئی، اب اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو انہیں بھی کوئی چارہ نہ ہوتا سوائے اس آخری شریعت پر عمل کرنے کے، اور جب قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے تو اس آخری شریعت پر عمل پیرا رہیں گے، کیونکہ انجیل کی شریعت منسوخ ہوگئی ہے۔

﴿وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک ہی امت بنانا پسند نہیں فرمایا، بلکہ امتوں کو مختلف شریعتیں عطا فرمائیں، تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس دین اور اس شریعت کے بارے میں آزمائے جو تمہیں عطا فرمائی۔ آزمائش یہ تھی کہ دین پر عمل کرنے والے اللہ تعالیٰ کے حکم کے فرمانبردار رہیں گے، یا جس شریعت پر پہلے سے عمل ہو رہا ہے اس شریعت پر جامد ہونا مقصود ہے، کیونکہ وہ آباء واجداد کی شریعت بن چکی تھی۔ احکام میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کو دیکھنا ہے، نہ کہ باپ دادوں کی نسبتوں کو۔ جو شخص اللہ تعالیٰ شانہ کا فرمانبردار ہے اس کے نفس پر شریعت سابقہ کا چھوڑنا کیسا ہی شاق ہو، وہ اللہ تعالیٰ ہی کا حکم مانے گا۔

اختلافِ شرائع میں ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ امتدادِ زمانہ کے اعتبار سے عالم میں جو تغیُّر احوال ہے، اس کے اعتبار سے احکام کا بدلنا مناسب ہوا، تاکہ ہر زمانہ کے لوگ اپنے اپنے زمانوں کے احوال کے اعتبار سے احکامِ الٰہیہ پر عمل کریں، لیکن اپنے طور پر کسی حکم کو بدلنے کی اجازت نہیں، ورنہ وہ شریعتِ الٰہیہ نہ رہے گی، اور شریعتِ اسلامیہ کو بدلنے یا منسوخ ہونے کا کوئی احتمال ہی نہ رہا جو آخر انبیاء سرور عالم ﷺ کو آخر میں عطا کی گئی، کیونکہ اس میں قیامت تک آنے والے تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے احکام ومسائل موجود ہیں۔

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اِلَى اللهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ نیک کاموں کی طرف سبقت کرو ایک، دوسرے سے آگے بڑھو، تم سب کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے، پس خیرات و صالحات پر سبقت کرنے والے کتنے اکرام واعزاز کے ساتھ میدانِ محشر میں درجات حاصل کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے بارے میں خبر دے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے، جزاوسزا کے اعتبار سے پتہ چل جائے گا کہ حق پر کون تھا اور باطل پر کون۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان نقل کیا ہے کہ کعب بن اشرف، عبداللہ ابن صوریا اور شاس بن قیس نے باہم مشورہ کیا اور کہا کہ چلو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس چلیں، شاید ہم ان کو ان کے دین سے بہکا سکیں، یہ مشورہ کر کے خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ: محمد! آپ جانتے ہیں کہ ہم یہود کے علماء اور سردار ہیں، اگر ہم آپ کا اتباع کریں، تو سب یہود آپ کے پیچھے آجائیں گے، اور ہمارے خلاف نہیں کریں گے، ہمارا اپنی قوم سے کچھ جھگڑا ہے، ہم آپ کے پاس مقدمہ لے کر آئیں گے، آپ قوم کے خلاف ہم کو ڈگری دے دیں، اگر آپ نے ایسا کیا تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا یہ مطالبہ مسترد فرمایا، اور انہیں مایوس کیا، اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ [درمنثور]

۞ ۞ ۞

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ
اَنْزَلَ اللهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا
مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۞٤٩ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۞٥٠

ترجمہ: اور یہ کہ آپ ان کے درمیان اسی کے موافق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے اتارا، اور ان کی خواہشوں کا اتباع نہ کریں، اور اس بات سے پرہیز کریں کہ یہ لوگ آپ کو اللہ تعالیٰ کے دئے ہوئے احکام میں سے کسی حکم سے ہٹا دیں، سو اگر وہ روگردانی کریں تو آپ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے ان کو سزا دے دے، اور بیشک لوگوں میں بہت سے ایسے ہیں جو نافرمان ہیں ۞٤٩ کیا یہ جاہلیت کے حکم کو چاہتے ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلہ کرنے والا ان لوگوں کے لئے کون ہے جو یقین کرتے ہیں؟ ۞٥٠

معارف ومنازل

﴿وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ﴾ اس میں مکرر حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نازل فرمودہ احکام کے مطابق فیصلہ دیں، اور فیصلہ طلب کرنے والوں کے درمیان ان کی خواہشوں کے مطابق فیصلہ نہ دیں، اس حکم کو دوبارہ بطورِ تاکید بیان فرمایا کہ ان چال باز یہودی علماء اور سرداروں کے مکروفریب سے ڈریں، اور پرہیز کریں، اور ہوشیار رہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بعض احکام سے ہٹانہ دیں، کیونکہ یہ یہودیوں کا ایک مکر تھا، مقصود اسلام قبول کرنا نہ تھا، وہ آپ سے غیر منصفانہ غلط فیصلہ کرانا چاہتے تھے، آپ نے انکار فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی تائید فرمائی، اور صاف بتادیا کہ اس لالچ میں کہ لوگ مسلمان ہوجائیں گے، حق کے چھوڑنے اور جانبدارانہ فیصلہ دینے کی کوئی گنجائش نہیں، جسے اسلام قبول کرنا ہو وہ حق کے لئے اسلام قبول کرے، جسے شروع ہی سے حق پر چلنا منظور نہیں وہ بعد میں کیا حق پر چلے گا؟

جھوٹے مدّعیانِ اسلام کو اپنا بناکر اپنی اکثریت ثابت کرنا، یا کسی کو کوئی لالچ مال وغیرہ دے کر اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کرنا، یہ اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ باطل ادیان جتنے بھی ہیں وہ سب اسی طرزِ عمل کو اپنائے ہوئے ہیں کہ لوگوں کو مراعات رشوت وغیرہ دے کر اپنے دام مکروفریب میں قید کرکے انہیں اپنے مذہب میں داخل کرتے ہیں، جیسے روافض، شیعہ، عیسائی، یہودی، ہندو اور سب سے زیادہ نمایاں قادیانی وغیرہ کا طریقہ ہے، جبکہ دینِ الٰہی برحق ہے، اسے یہ ہرگز لالچ نہیں کہ رشوتوں اور مراعات کے بل بوتے پر لوگوں کو مسلمان بنایا جائے، یہاں تو بے مثال استغناء کا اعلان ہورہا ہے۔ ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ [البقرة: ٢٥٦] (دین میں کوئی زبردستی نہیں)۔ اسی طرح ﴿فَمَنْ شَاۗءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاۗءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الکھف: ٢٩] (جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کفر کرے)۔

اسی طرح بعض جاہل کہتے ہیں کہ گمراہ فرقے جو اپنے عقائد کی وجہ سے حدودِ کفر میں جاپڑے ہیں انہیں کافر نہیں کہنا چاہئے، تاکہ اسلام کے ماننے والوں کی نفری کم نہ ہو، یہ احمقانہ سوچ ہے، اسلام کو ایسے بدعقیدہ لوگوں کی بالکل ضرورت ہی نہیں ہے، جو اسلام کے مدّعی ہیں، لیکن عقائد کے اعتبار سے کافر ہیں، اسلام حق بتاتا ہے، اور حق کا حامی وسرپرست ہے، اور حق کو ظاہر کرتا ہے، مداہنت کی اجازت نہیں دیتا۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ﴾ اگر یہ لوگ اس فیصلے سے اعراض کریں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے تو آپ جان لیں کہ (یہ چونکہ اللہ

کی تشریع کو قبول نہیں کرتے اس لئے) ان پر تکوینی طور عذاب آنے والا ہے، اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے ان کو عذاب دے۔ان کے جرائم تو بہت سے ہیں، بعض جرموں کی سزا بھی ان کی بربادی اور ہلاکت کے لئے کافی ہے، بلاشبہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو فاسق اور نافرمان ہیں، ان میں سرکشی اور حکمِ عدولی بڑھی ہوئی ہے، اور وہ اپنے کفر پر راضی اور مُصر ہیں، ایسے لوگ سزا ہی کے مستحق ہیں۔

﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، اور فیصلہ کرنے کے اعتبار سے ان لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے اچھا کون ہے جو یقین رکھتے ہیں؟ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف دوسرا حکم تلاش کرتے ہیں ان کی توبیخ کے لئے سوال کے پیرایہ میں ارشاد فرمایا: کیا یہ لوگ پرانی جاہلیت کے فیصلے کو چاہتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے نبی نے سنایا ہے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس سے اعراض کر رہے ہیں، اور تسلیم نہیں کر رہے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ماننے سے انکار ہے تو اب کونسا فیصلہ چاہتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے خلاف تو جاہلیت ہی کا فیصلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو چھوڑنا اور جاہلیت کے فیصلے کو اختیار کرنا کس لئے ہے؟ کیا جاہلیت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے اچھا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اچھا فیصلہ دینے والا کوئی نہیں، لیکن اس حقیقت کو یقین والے بندے جانتے اور مانتے ہیں جن لوگوں کو کفر و سرکشی پر جمے رہنے کی نیت ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی نہیں ہوتے، انہیں جاہلیت کا فیصلہ مطلوب اور محبوب ہے، یہ عجیب حماقت اور کھلم کھلا کفر اور نہایت درجہ قبیح و غلط سوچ ہے، جب انسان اللہ تعالیٰ شانہ کی نظرِ رحمت سے محروم ہو جاتا ہے تو جانوروں سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔

دورِ حاضر کے نام نہاد مسلمان بھی جاہلیت کے دلدادہ ہیں:

گزشتہ آیات میں یہودیوں کی حکمِ عدولی اور گمراہی کا تذکرہ ہے، ان لوگوں نے رجم کے سلسلہ میں توریت کے حکم کو چھوڑ کر زانی اور زانیہ کی سزا اپنے طور پر تجویز کر لی تھی، اور قصاص کے حکم کو بھی بدل دیا تھا، اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے بجائے اپنے تجویز کردہ فیصلوں کو بطورِ قانون نافذ کر دیا تھا، جب حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ معلوم کرنے کے لئے اپنے جاسوس اور نمائندے بھیجے تو ان سے کہہ دیا کہ تمہارے موافق ہو تو فیصلہ قبول کر لینا، اگر تمہارے موافق نہ ہو تو اس سے گریز کرنا، یعنی تسلیم نہ کرنا۔ یہ تھا حال مغضوب قوم یہود کا جنہیں اللہ تعالیٰ کے حکموں پر چلنا نہیں تھا۔

آج یہی حال ان لوگوں کا ہے جو مسلمان ہونے کے مدّعی ہیں، اور حکومتیں لئے بیٹھے ہیں، اور نہ صرف وہ

لوگ جنہیں حکومت مل جاتی ہے بلکہ عوام بھی قرآن کریم کے فیصلوں سے منحرف ہیں، اور قرآنی فیصلوں پر راضی نہیں ہیں، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلوں کو ماننے سے انکاری ہیں۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآنی نظام نافذ کرو، تو کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں، اور ان کے چہروں کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے، ان میں سے بہت سے لوگ نمازی بھی ہیں، لیکن یہ لوگ بھی قرآنی نظام نافذ کرنے اور کروانے کے حق میں نہیں ہیں۔ دشمنانِ دین و مذہب بدخواہانِ اسلام یورپی اقوام جو ظالمانہ باغیانہ قوانین بنائے ہیں ان ہی کو سینے سے لگا کر انہیں باقی رکھنے کے حق میں ہیں، ان پر آیت کریمہ کا مضمون پوری طرح صادق آرہا ہے: ﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ﴾ کیسے ان پر منطبق ہے؟

مقدمات لڑاتے ہیں، برسوں کیس چلتا ہے، دونوں طرف کے وکیل فیس کھاتے اور ہضم کرتے چلے جا رہے ہیں، مال بھی خرچ ہوتا ہے، اور وقت بھی ضائع ہوتا ہے، معمولی سا حق حاصل کرنے کے لئے بیس تیس گنا مال خرچ کرنا پڑتا ہے، مگر پھر بھی جاہلیت کے نظام پر راضی ہیں، اور فخر کرتے ہیں اور اس بات پر راضی نہیں کہ عالمِ دین قاضی اسلام کے پاس جائیں، گواہ یا قسم کی بنیاد پر قرآن و حدیث اور علمِ فقہ کے موافق فیصلہ ہو جائے۔ جاہلانہ، یہود و نصاریٰ کے قانون کا سہارا لے کر دوسروں کو کھینچ کر عدالت میں لا کر ان کی جائیداد رشوتوں اور جھوٹی گواہوں کے ذریعہ دبا لیتے ہیں، ادھر مرحوم باپ کی میراث سے ماں بہنوں کو محروم کر دیتے ہیں، اور ضعیف و کمزور لوگوں کے حقوق پر طرح طرح سے ڈاکہ ڈالتے ہیں۔

یہی ظالم منافع خور تو قانونِ اسلام کے نافذ کرنے کی حمایت نہیں کرنے دیتے، کافرانہ نظام کا سہارا لے کر اگر دنیا میں کسی کا حق مار لیا تو جب مالک یوم الدین جل جلالہ کی بارگاہ میں پیشی ہوگی اس وقت خلاصی اور نجات مشکل ہو جائے گی۔ اگر غیر مسلم نظامِ قرآن کو نہیں مانتا تو کوئی حیرانی نہیں، مگر مسلمان اور مدعی اسلام قرآنی نظام پر راضی نہیں، پتہ نہیں اس کا خاتمہ کس دین پر ہوگا؟ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

❁ ❁ ❁

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ

مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ
اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ
الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو کوئی شخص تم میں سے ان سے دوستی کرے تو بلاشبہ وہ ان میں سے ہوگا، بے شک اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۵۱﴾ سو آپ دیکھیں گے ان لوگوں کو جن کے دل میں مرض ہے کہ دوڑ کر ان میں گھسے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے، سو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ فتح کو لے آئے گا، یا اپنے پاس سے کسی اور چیز کو، پھر اس بات پر نادم ہوں گے جو انہوں نے اپنے نفسوں میں چھپائی ﴿۵۲﴾ اور اہلِ ایمان یوں کہیں گے: کیا یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے خوب مضبوطی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھائیں کہ وہ ضرور تمہارے ساتھ ہیں؟ ان کے اعمال اکارت ہوگئے جس کی وجہ سے نقصان میں پڑنے والے ہوگئے ﴿۵۳﴾

معارف ومنازل

آیات مذکورہ میں ایک اہم بنیادی اصول کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو کن لوگوں کے ساتھ دوستی کی اجازت ہے، اور کن لوگوں کے ساتھ دوستی کی اجازت نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان غیر مسلموں سے رواداری، ہمدردی، خیر خواہی، عدل وانصاف مراعات، احسان وسلوک سب کچھ کر سکتے ہیں، اور ان کو اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ اس طرح کا سلوک تمام انسانوں کے ساتھ کرنا چاہئے، لیکن غیر مسلموں سے ایسی گہری دوستی اور اختلاط جس سے اسلام کے امتیازی نشانات متاثر ہوں، یا کفار کے ساتھ اسی طرح امتزاج ہو جیسے کہ مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے، یہ قطعاً حرام اور ممنوع ہے، اسی کا نام ترکِ موالات ہے، جو کہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔

مسلمان قوم کو کسی ناپاک قوم کفار کی دوستی کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جبکہ اسے ایک ایسی دوستی اور قرب و ولایت کا مژدہ سنایا جا رہا ہے جس کی قیمت ادا کرنے سے سارا جہان عاجز ہے، وہ ہے اللہ تعالیٰ شانہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مؤمنین کی ولایت ودوستی، جس کا بیان عنقریب آنے والا ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو انصار کے قبیلہ خزرج میں سے تھے، انہوں نے عرض کیا:

یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہودیوں میں میرے بہت سے دوست ہیں، جن کی تعداد کثیر ہے میں ان کی دوستی سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کی دوستی کو پسند کرتا ہوں۔ اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول (رئیس المنافقین) نے کہا کہ مجھے تو زمانہ کی نیرنگیوں اور گردشوں کا خوف ہے، جن لوگوں سے میری دوستی ہے (یعنی یہود سے) میں ان سے بیزار نہیں ہوتا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ یہود اور مشرکین کا پلہ اگر بھاری رہا، اور وہ کامیاب وغالب رہے، اور مسلمان مغلوب ہوجائیں، تو ہمیں ان لوگوں سے بھی ایسا معاملہ رکھنا چاہئے کہ اس وقت ہمارے لئے مصیبت نہ ہوجائے، لہٰذا ہمیں ان کے ساتھ دوستی برقرار رکھنا چاہئے، تاکہ ہمیں فائدہ ہو۔ اس پر ان آیات کا نزول ہوا۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ ؔۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ اے ایمان والو! ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے قطع تعلق کرو، اور منافقوں کی طرح یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ کسی طرح تمہارا دوست نہیں بن سکتے، وہ تو باہم ایک دوسرے کے دوست ہیں، یعنی اگرچہ ان میں باہم اختلاف ہے مگر تمہاری مخالفت اور عداوت میں وہ سب ایک ہیں، ''اَلْکُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ''، وہ سب اسلام دشمنی میں اور کفر ونفاق اور سرکشی میں متحد اور ایک ہیں، پس تم میں سے جو شخص ان کو دوست بنائے گا سو وہ بلاشبہ ان ہی میں سے شمار ہوگا، یا یہ کہا جائے کہ ان کے اختلاط سے متاثر ہوکر رفتہ رفتہ ان ہی کا کفر اختیار کرے گا، یعنی مرتد ہوگا جس کا بیان عنقریب آنے والا ہے، یا یہ معنی ہو کہ عملاً وہ یہود ونصاریٰ اور منافقین کا دوست وخیرخواہ ہوگا۔ اور فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ باعتبار اطلاق کے اعتقاد اور عمل دونوں کو شامل ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ بے راہوں اور ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا، یعنی جو شخص دشمنانِ اسلام سے موالات رکھے تو وہ ظالم ہی ہوگا، اور ایسے بدخواہانِ اسلام اور خیرخواہانِ کفر ونفاق پر ہدایت کا راستہ ضرور بند ہی ہوگا۔

﴿فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْهِمْ یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآىِٕرَةٌ ؕ فَعَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَاۤ اَسَرُّوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ﴾ پس اے دیکھنے والے! تو اپنی آنکھ سے مشاہدہ کرلے گا کہ جن لوگوں کے قلوب وباطن میں نفاق کی بیماری ہے وہ دوڑ دوڑ کر کافروں میں گھسے جاتے ہیں بڑی تیز گامی کے ساتھ کافروں میں شامل ہوجاتے ہیں، اور اگر کوئی انہیں فہمائش کرتا ہے، تو کہتے ہیں کہ ہم

کو ڈر لگتا ہے کہ زمانہ کا کوئی حادثہ اور تنگی ہم کو نہ آ پہنچے۔

ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو یقین نہیں آتا کہ سرور عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گے، اور فاتح بن کر کفار کا خاتمہ کریں گے، اگر کوئی وقت ایسا آگیا کہ دشمن اس پر غالب آگیا، اور وہ جنگ اُحد کی طرح شکست کھا گئے، اور مغلوب ہوئے تو دشمن ہماری تباہی کر کے رہیں گے، تو ہم دشمن سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتے، اور ابھی سے اُسے اپنا بدخواہ نہیں بنانا چاہتے۔

اس پر ربّ العزّت سبحانہ نے ارشاد فرمایا کہ منافقین کا مفروضہ سراسر غلط ہے، عنقریب ربّ العزّت مسلمانوں کو فتح وغلبہ عطا فرمائے گا، اور منافق کفِ افسوس ملتے ہوئے پچھتائیں گے، اور شرمندہ ہو کر ہر طرف سے خسارہ میں گر کر ندامت اور پشیمانی کے سیلاب میں بہہ جائیں گے۔

فتح سے مراد فتح مکہ ہے۔ اَمْرٌ مِّنْ عِنْدِهٖ سے مراد ایک غیبی نصرت ہے جو مسلمانوں کو نصیب ہوئی کہ بنونضیر اور بنوقریظہ پر اللہ تعالیٰ شانہ کا غضب نازل ہوا، بنونضیر مدینہ سے جلاوطن ہوئے، اور بنوقریظہ محاصرہ کے بعد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے منصفانہ فیصلہ کے بعد تہہ تیغ ہو کر فنا ہوئے۔ اب منافقین ہر طرف سے خوار وزار ذلیل ہو کر نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے، جس وقت منافقین کے نفاق کا پردہ چاک ہوگیا اس وقت اہلِ ایمان تعجب سے آپس میں یہ کہیں گے:

﴿وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۤءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ﴾ یعنی جب منافقین کا نفاق کھل کر سامنے آئے گا تو اہلِ ایمان تعجب سے کہیں گے: کیا یہ وہی لوگ ہیں جو بڑی مضبوطی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں؟ ان کا باطن تو اور ہی کچھ نکلا، جھوٹے آدمی کو جب اپنی بات کو باور کرانا ہوتا ہے تو وہ بار بار بڑی تاکید کے ساتھ قسمیں کھاتا ہے، منافقین بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ سچے آدمی کو قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے اعمال اور اخلاق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص سچا ہے، قسموں کے بغیر لوگ اس پر اعتماد کرتے ہیں، تو منافقوں نے جو نفاق کی چالیں چلیں اور دکھانے کو بظاہر جو نیک اعمال کئے وہ اکارت وضائع ہوگئے، ان سے کچھ فائدہ نہ ہوا، اور ہمیشہ کے لئے خسران میں پڑ گئے۔ اسی کو فرمایا: ﴿حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ﴾ ان کے اعمال اکارت ہوگئے، اور وہ نقصان

اٹھانے والے ہوئے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے سو عنقریب اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم کو پیدا فرمادے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی، اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے ہوں گے، وہ مسلمانوں پر نرم دل ہوں گے، اور کافروں پر زبردست وسخت ہوں گے، وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریں گے، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، وہ دیتا ہے جسے چاہے، اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا، بڑا علم والا ہے۔

معارف ومنازل

اس سے پہلے مسلمانوں کو بتایا گیا کہ کفار اور یہود ونصاریٰ سے گہری دوستی نہ کرو، اور اپنے دین پر مکمل جمے رہو، اور یہ ضروری سمجھو کہ تمہاری استقامت تمہارے ہی مفاد میں ہے۔ اگر اہل کتاب سے دوستی کرو گے تو تمہارا ہی نقصان ہوگا، نہ کہ اسلام کا، اسلام اللہ کا دین ہے، اس کی ترقی واستحکام تمہارے رویہ پر ہرگز موقوف نہیں، اگر (خدانخواستہ) تم مرتد ہوجاؤ، اور اسلام سے پھر جاؤ، تو اسلام پھر بھی اپنی شان وشوکت کے ساتھ باقی رہے گا، اسلام کی خدمت وترقی کے لئے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پیدا فرمائے گا، یعنی بروقت تیار بھی کرے گا جو ایمان کی دولت سے مسلح ہوں گے، اور ایمان کے تقاضوں پر چلنے والے ہوں گے، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے ہوں گے، یہ لوگ اہل ایمان سے تواضع اور نرمی اور مہربانی کے ساتھ پیش آئیں گے، اور کافروں کے مقابلہ میں سخت گیر، قوت اور طاقت اور غلبہ کی شان دکھائیں گے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بے لوث جہاد کریں گے، اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور عظمت کے لئے جان ومال کی قربانی پیش کریں گے، اور کافروں سے خوب لڑیں گے، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اور طعن تشنیع سے نہیں ڈریں گے۔

ان لوگوں کی قیمتی اور زرّین صفات حمیدہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل اور کرم ہے جس کو چاہے عطا فرمائے، اگر وہ ایک تنکے میں شہتیر کی قوّت پیدا کرے تو یہ اس کی عنایت ہے۔ یہ ساری صفاتِ حمیدہ ایمانی درخت کی شاخیں ہیں، جب اصل درخت جو کہ ایمان ہے اس کی عطا اور بخشش سے ہے تو اس کی شاخیں بھی اس کے فضل کے کرشمے ہی ہیں۔ یہاں سے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ ہر قسم کی فتح و نصرت اور فتوحات پر غرّہ نہ ہونا، کہ ہم نے کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا، اور یہ ہمارا ذاتی کمال اور جد جہد کا نتیجہ ہے، اس پر مغرور نہ ہوں، یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہے، اور اسی کی نظرِ رحمت کا نتیجہ ہے، وہ جسے چاہے ایمان و اعمالِ صالحہ سے نوازے، جسے چاہے عزّت و مال سے نوازے، جسے علم و عمل یا کسی اور پسندیدہ بخشش سے نوازے وہی ''مٰلِكَ الْمُلْكِ'' ہے، ہر قسم کی وسعتوں کا مالک ہے، بڑا صاحب علم ہے۔ جَلّ جلالُہٗ وعَمّ نوالُہٗ وفضلُہٗ۔

فائدہ:

اس آیت میں جہاں یہ ذکر فرمایا کہ مسلمان اگر مرتد ہو کر دینِ الٰہی سے پھر جائیں تو کوئی نقصان نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت اور خدمت کے لئے ایک دوسری جماعت کھڑی کر دے گا جیسے سرور عالم ﷺ (فِدَاہُ اَزْوَاحِنَا) کے وصال کے بعد بہت سے قبائل اسلام سے پھر گئے، کچھ لوگ صاف صاف مرتد ہو گئے، کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کا انکار کیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سترہ اٹھارہ محاذوں پر ان کے خلاف جہاد کا اعلان فرمایا، اسی کے ساتھ مدّعیانِ نبوت مسیلمہ کذاب وغیرہ بھی اپنی طاغوتی قوتوں کے ساتھ میدان میں اترے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جنہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں صفاتِ حمیدہ کے ساتھ متصف فرمایا تھا بڑی جرأت و دلیری کے ساتھ ﴿اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ ﴿وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لئے جہاد کیا، یہاں تک کہ سارے فتنے دب گئے، اور اسلام کی شوکت دوبارہ بحال ہوئی۔

آیت کریمہ کے سیاق سے یہی معلوم ہوا کہ ارتداد ہو، یا عام سرکشی اور بے دینی، اس کا مقابلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن میں اتباعِ سنت اور محبتِ الٰہی کا جوہر موجود ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کے لئے اتباعِ سنت اولین شرط ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران: ۳۱]

(کہہ دیں: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا)۔

فتنہ ارتداد کا طوفان ہو یا جھوٹی نبوتوں کا فتنہ ہو یہ سارے فتنے ایک مختصر وقت میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس اعلان کے بعد: اَیَنْقُصُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے ہماری زندگی میں لوگ دین میں نقصان پیدا کریں؟ میں کس مرض کا علاج ہوں؟ کہ انہیں دبا کر نہ رکھ دوں، اور ختم کر کے نہ چھوڑوں؟ تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعتِ حقہ آیت کریمہ کی اوّلین مصداق ثابت ہوئی۔ مزید تفصیل کتبِ سیرت میں ہے۔

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَهُمْ رٰکِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾

ترجمہ: تمہارا ولی (دوست) بس اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہے، اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، جو نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اس حال میں کہ وہ رکوع کرنے والے ہیں ﴿۵۵﴾ اور جو کوئی شخص دوست رکھے اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے، سو اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جو جماعت ہے وہی غالب ہونے والی ہے ﴿۵۶﴾

معارف ومنازل

سابقہ چار آیات میں مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ گہری دوستی رکھنے سے منع فرمایا، پانچویں آیت میں مثبت طور پر یہ بتلایا گیا کہ مسلمانوں کو گہری دوستی اور خاص رفاقت کا تعلق جن ہستیوں سے ہوسکتا ہے وہ کون ہیں، ان میں سب سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ، اور پھر اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہے، کہ درحقیقت مؤمن کا ولی ورفیق ہر حال ہر وقت میں صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہی ہے، اور وہی ہوسکتا ہے، اور اس کے تعلق کے سوا ہر تعلق اور ہر دوستی فانی ہے۔

اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق ودوستی درحقیقت اللہ تعالیٰ کا تعلق اور دوستی ہے، اس سے الگ نہیں۔ تیسرے درجے میں مسلمانوں کے رفیق اور مخلص دوست ان مسلمانوں کو قرار دیا جو صرف نام کے مسلمان نہیں، بلکہ کردار کے سچے مسلمان ہیں، جن کی پہلی صفت اقامتِ صلوٰۃ، دوسری صفت اداءِ زکوٰۃ، تیسری صفت تواضع، انکساری، فروتنی بتلائی، یعنی فخر وغرور نہیں کرتے۔ تو فرمایا:

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ﴾ تمہارا ولی بس اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہے، اور ایمان والے ہیں، جو کہ نماز کو پابندی وقت کے ساتھ پورے آداب وشرائط کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ دوئم یہ کہ وہ مال سے سالانہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، سوئم یہ کہ وہ فروتنی کرنے والے کبر وغرور سے پاک ہیں۔

اہل ایمان کی دوستی کو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور اہلِ ایمان کی دوستی میں منحصر فرمادیا، اور واضح فرمایا کہ ان تینوں کے علاوہ مسلمانوں کا کوئی دوست نہیں ہوسکتا۔ پس اگر کوئی شخص ان کے علاوہ کسی سے دوستی کرے گا تو وہ غلطی اور دھوکے کا شکار ہو کر نقصان اٹھائے گا، جیسے پہلے بیان ہوا۔

یہاں ﴿وَهُمْ رٰكِعُوْنَ﴾ کے مفہوم میں متعدد اقوال بیان ہوئے ہیں۔ بعض مفسرین نے رکوع کا وہی معنی بتایا جو کہ نماز کا رکن ہے، اور ﴿يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ کے بعد مستقل رکوع کا ذکر اس لئے ہے تاکہ ہماری نماز یہود کی نماز سے ممتاز ہو، کیونکہ یہود کی نماز میں رکوع نہیں ہوتا، رکوع صرف مسلمانوں کی نماز کا امتیازی وصف ہے۔

مگر جمہور مفسرین نے فرمایا کہ لفظ رکوع سے یہاں اصطلاحی رکوع مراد نہیں، بلکہ اس کے لغوی معنی مراد ہیں، یعنی جھکنا، عاجزی، تواضع اور انکساری کرنا۔ تفسیر بحر محیط اور تفسیر کشاف نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ تفسیر مظہری و بیان القرآن میں بھی اسی کو لیا گیا ہے، تو معنی یہ ہوئے کہ ان لوگوں کو اپنے اعمالِ صالحہ پر ناز نہیں، بلکہ ان کی خصلت تواضع اور انکساری ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ یہ جملہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے بارے ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوا ہے، وہ یہ کہ ایک روز حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نماز میں تھے، جب آپ رضی اللہ عنہ رکوع میں گئے تو کسی سائل نے آکر سوال کیا، آپ رضی اللہ عنہ نے اسی حالت رکوع میں اپنی ایک انگلی سے انگوٹھی نکال کر اس کی طرف پھینک دی، غریب فقیر کی حاجت روائی میں اتنی دیر پسند نہیں فرمائی کہ نماز سے فارغ ہو کر اس کی حاجت پوری کریں، یہ مسابقت فی الخیرات اللہ تعالیٰ شانہ کو پسند آئی، اور اس جملہ میں اس کی قدر افزائی فرمائی گئی۔

اس روایت کی سند میں علماء ومحدثین کو کلام ہے، لیکن روایت کو اگر صحیح قرار دیا جائے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی گہری دوستی کے لائق نماز وزکوٰۃ کے پابند عام مسلمان ہیں، اور ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اس دوستی کے زیادہ مستحق ہیں، جیسا کہ ایک دوسری صحیح حدیث میں سرور عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ"۔ [رواه أحمد از مظهري] یعنی میں جس کا دوست ہوں تو علی (رضی اللہ عنہ) بھی اس کا دوست ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوست نہیں رکھا تو اس نے مجھے بھی دوست نہیں رکھا۔ ایک اور حدیث میں بھی سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ۔ یعنی یا اللہ! آپ محبوب بنالیں اس شخص کو جو محبت رکھتا ہے علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے، اور دشمن قرار دیں اس شخص کو جو دشمنی کرے علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اس خاص شرف کے ساتھ غالباً اس لئے نوازا گیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آئندہ پیش آنے والا فتنہ منکشف ہو گیا تھا، کہ کچھ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عداوت و دشمنی رکھیں گے، اور ان کے مقابلہ پر عَلَم بغاوت اٹھائیں گے، جیسا کہ خوارج کے فتنہ میں اس کا ظہور ہوا۔ [معارف]

بہر حال! آیت کریمہ کا سبب نزول خواہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا عمل ہی ہو، لیکن الفاظ کے عموم راکعین، اور خاشعین اور مُتواضعین اور تمام زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو شامل ہیں۔ اور یہ مُسلَّم قاعدہ ہے کہ قرآن کا ہر حکم قیامت تک آنے والے سب لوگوں کے لئے ہوتا ہے، خواہ سببِ نزول کچھ بھی ہو۔

علامہ ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ نماز میں تھوڑی سی حرکت کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نفلی صدقہ کو بھی لفظ زکوٰۃ شامل ہے۔ سورۃ الروم میں ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ﴾ [الروم: ۳۹] (اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو)۔ یہاں زکوٰۃ سے نفلی صدقہ مراد ہے۔ پھر فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾ اس میں ارشاد فرمایا کہ ان احکامِ الٰہیہ کی تعمیل کرنے والے مسلمان اللہ تعالیٰ کا گروہ، اور اس کی جماعت ہیں۔ پھر یہ خوشخبری بھی سنادی کہ اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی انجام کار سب پر غالب آکر رہے گا۔

اس آیت کے نزول کے بعد کے واقعات نے اس کی ایسی تصدیق کردی کہ ہر شعور رکھنے والے نے دیکھ کر مشاہدہ کیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بے سروسامان جماعت نے سب پر غلبہ حاصل کیا، اور پورے افق پر وہ چھاگئے، جو بھی طاقت ان سے ٹکرائی پاش پاش ہوگئی۔ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم نے اسلام کی وہ بے مثال خدمات انجام دیں جنہیں فرشتوں نے بھی سراہا، خاص کر شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کا دور فتوحات کا دور رہا۔

خلافت صدیقی میں اندرونی اور قرب وجوار کی بیرونی فتنے ہمیشہ کے لئے مٹ گئے، اور خلافت فاروقی تو خلافت فاروقی تھی، جس میں ایک ہزار سے زائد بڑے بڑے شہر فتح ہوئے۔ سورۂ مجادلہ میں فرمایا: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ [المجادلة: ۲۱] (اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب آئیں گے۔ یقین رکھو کہ اللہ بڑا قوت والا، بڑے اقتدار والا ہے)۔ اسی طرح سورۂ صافات میں ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝﴾ [الصافات] (اور ہم پہلے ہی اپنے پیغمبر بندوں کے بارے میں یہ بات طے کر چکے ہیں۔ کہ یقینی طور پر ان کی مدد کی جائے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لشکر کے لوگ ہی غالب رہتے ہیں)۔ اسی طرح ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۹] (تم نہ کمزور پڑو، اور نہ غمگین رہو، اگر تم واقعی مؤمن رہو، تو تم ہی سربلند ہو گے)۔ فرمایا: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ [الغافر: ۵۱] (یقین رکھو کہ ہم اپنے پیغمبروں اور ایمان لانے والوں کی دنیوی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں، اور اس دن بھی کریں گے جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے)۔

حزب اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کا لشکر اور اس کی صفات:

ہر کلمہ گو مسلمان اللہ تعالیٰ کی فوج کا ممبر اور سپاہی شمار نہیں ہوگا، جب تک کہ وہ فوجیوں والی عسکری صفات اپنے اندر جذب کر کے پیدا نہ کرے۔ آیات بالا نے انہی صفات میں سے موٹی صفات کی نشاندہی کر کے ہماری رہنمائی فرمائی، اور پھر ان صفات کے مکمل اپنانے پر حزب اللہ کے ممبر بننے، اور فتح ونصرت کے حصول کا وعدہ فرمایا، بلکہ غلبہ اور نصرتِ الٰہی کے لئے ان صفات کے وجود کو شرط قرار دیا، وہ یہ ہیں:

پہلی صفت: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَاءَ﴾ اس آیت میں پہلی صفت ایمان ہے۔ دوئم غیر مسلموں سے ترکِ موالات ہے۔

تیسری اور چوتھی صفت: ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ کہ مسلمانوں پر نرمی، شفقت، مہربانی کرنے والے اور کافروں پر زبردست سختی کرنے والے۔

پانچویں صفت: ﴿يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے۔

چھٹی صفت: ﴿وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ کسی کی ملامت طعن وتشنیع سے نہ ڈرنے والے۔

ساتویں صفت: ﴿وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جل شانہ سرور عالم ﷺ اور مؤمنوں سے دوستی اور محبت واطاعت کرنے والے، پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا گروہ اور اس کی جماعت جس کے لئے فتح ونصرت اور غالب رہنے کا وعدہ ہے، وہ یہی لوگ ہیں جن میں یہ صفات موجود ہیں۔

بعض علماء نے ان صفات کے ساتھ ایک اور صفت کا بھی اضافہ کیا ہے، یعنی اتحاد واتفاق، اور ہر قسم کے افتراق واختلاف سے اجتناب، مگر غور سے دیکھنے کے بعد یہ صفت اتباعِ سنت کے تحت موجود ہے، اس کو علٰحدہ ذکر کرنے کی ضرورت شاید نہ ہو، کیونکہ محبتِ الٰہی اور محبتِ رسول اکرم ﷺ کے ضمن میں مکمل اتباع مندرج اور موجود ہے، کیونکہ بغیر اتباع کے دعویٰ محبت جھوٹ ہے۔

مسلمانوں کی غالبیت اور مغلوبیت کے اسباب:

عالمِ اسلام کی غالبیت اور سربلندی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ ان مذکورہ صفات کے ساتھ متصف ہوں، اگر ہمارے عوام اور خواص ان صفاتِ عالیہ اور ملکاتِ فاضلہ کو اپنے اندر پیدا کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو اقوامِ عالم پر برتری حاصل نہ ہو، اور وہ ہر محاذ پر غالب نہ ہوں۔

گزشتہ تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ انہی صفات اور دینی اقدار کی بدولت مسلمانوں نے عرب وعجم افریقہ ویورپ اور ہندوسندھ میں سینکڑوں سالوں تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی، اور چاروں طرف دشمنوں پر غلبہ حاصل کرتے رہے۔ آج سے چارسو سال قبل جب ہمارے حکمرانوں نے اپنے دینی اقدار اور مذکورہ صفات سے کنارہ کشی کی، اور دنیوی عیش وعشرت کی ریختہ بختہ تاریکیوں میں ڈوب گئے، اور جہاد جیسے عمل سے بیگانہ ہوگئے، اللہ تعالیٰ کی محبت ان کے دل ودماغ سے محو ہو کر نکل گئی، یہود ونصاریٰ جیسے دشمنان اسلام سے ان کی دوستی اور ازدواجی رشتے قائم ہوگئے۔ نبوت کے شعار فقر اور دنیا سے بیزاری کو عیب سمجھ کر مال ودولت کے عشق میں مجنون ہوگئے، ارکانِ اسلام کا حقیقی تصور ان کے دلوں سے محو ہوگیا، تو قدرت کی طرف سے عزت کی بجائے ذلت ملی، اور مغلوبیت کے سیلاب میں بہہ گئے۔

اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ تھا کہ سربلندی اور کامرانی تمہارے مقدر میں لکھی ہوئی ہے، بشرطیکہ تم جادۂ حق پر برقرار رہو، مگر ہم نے غلطی کی، پھسل گئے، قرآن وسنت کی سنہری تعلیمات سے منحرف ہوگئے، آسمان کی بلندیوں سے گر کر ذلت وخواری کی کنویں میں پہنچ گئے، اب نہ جائے ماندن نہ پائے گریختن۔ دوسروں کے رحم وکرم پر جی رہے ہیں، اور

ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں، گمنامی کی موت مر رہے ہیں، کوئی پرسانِ حال نہیں۔

یہ سب کچھ اس لئے کہ ہم نے قصداً جان بوجھ کر احکامِ الٰہی سے بغاوت کی، اور قدرت کے باغی کی سزا اسی طرح بھیانک تباہ کن ہوتی ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے خلیل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سات باتوں کا حکم دیا ہے: مسکینوں سے محبت رکھنے، اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا، اور دنیوی امور میں اپنے سے کم درجے کے لوگوں کو دیکھنے کا، اور اپنے سے بڑے لوگوں کو نہ دیکھنے کا، اور صلہ رحمی کرتے رہنے کا، گو دوسرے نہ کرتے ہوں، اور کسی سے کچھ بھی نہ مانگنے کا، اور حق بات بیان کرنے کا، اگرچہ سب کو تلخ اور کڑوی لگے، اور دین کے معاملات میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے کا، اور بکثرت "لَا حَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم" پڑھنے کا، کیونکہ یہ کلمہ عرش عظیم کے نیچے کا خزانہ ہے۔ [تفسیر ابن کثیر بحوالہ مسند أحمد]

فائدہ:

"لَا حَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم" معنی سمجھ کر بیداری میں ایک ہزار مرتبہ روزانہ پڑھنے کا معمول بنا کر پڑھیں۔ بیداری کا مطلب یہ ہے کہ غفلت نہ ہو، خوب دھیان رکھ کر۔ اس بابرکت وظیفہ سے ساری مشکلات حل ہوجاتی ہیں، اور پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ جو پڑھے گا سب کچھ پائے گا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾
وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! ان کو دوست نہ بناؤ جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنالیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، اور ان کے علاوہ جو دوسرے کافر ہیں ان کو بھی دوست نہ بناؤ، اور اللہ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو﴿۵۷﴾ اور جب تم نماز کے لئے پکارتے ہو تو وہ اسے ہنسی اور کھیل بنالیتے ہیں، یہ اس لئے کہ وہ سمجھ نہیں رکھتے﴿۵۸﴾

معارف ومسائل

ان آیات میں اولاً تو اسی مضمون کا اعادہ فرمایا جو گزشتہ رکوع کے شروع میں تھا کہ کافروں، مشرکوں، یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہاں یہود و نصاریٰ کا نام لے کر ان کی دوستی سے منع فرمایا، یہاں ﴿وَالْكُفَّار﴾ کا اضافہ فرما کر واضح کیا کہ تمام کفار سے دوستی حرام اور ممنوع ہے، خواہ یہود ہو یا نصاریٰ، یا کافر و مرتدین، و مشرکین، منافقین، ملحدین، صائبین و مجوس، یہ سب کفار ہی تو ہیں۔

اول تو ان کا کفر ہی دوستی نہ کرنے کا بہت بڑا سبب ہے، لیکن ساتھ ہی ان کی ایک اور بدترین حرکت کا بھی تذکرہ فرمایا، وہ یہ کہ انہوں نے دینِ اسلام اور اس کے شعائر و احکام کو ہنسی اور کھیل و تماشا بنالیا ہے، خاص کر جب نماز کے لئے اذان شروع ہوجاتی ہے تو یہ سارے ملحد مذاق و استہزاء اور ہنسی میں کوئی کمی نہیں کرتے۔

اس کا واقعہ بحوالہ ابن ابی حاتم تفسیر مظہری میں یہ نقل کیا ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک عیسائی تھا وہ جب اذان میں "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰه" کا لفظ سنتا تو یہ کہا کرتا تھا: "اَحْرَقَ اللّٰهُ الْكَاذِبَ"۔ یعنی اللہ تعالیٰ جھوٹے کو جلادے، آخر کار اس کا یہ کلمہ ہی اس کے پورے خاندان کے جل کر خاکستر ہونے کا سبب بن گیا۔ اور واقعہ اس طرح پیش آیا کہ رات کو جب یہ لوگ سو رہے تھے، اس کا خادم کسی ضرورت سے آگ کا شعلہ لے کر گھر میں آیا، اس کی چنگاری اُڑ کر کسی کپڑے پر گر پڑی، اور وہ کپڑا جل کر پورے گھر میں آگ پھیل گئی، اور وہ جتنے لوگ سو رہے تھے سب جل کر خاکستر ہوگئے۔ آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ﴾ دین اور احکام و شعائرِ دین پر استہزاء بیوقوفی، بے عقلی، بے شعوری اور نادانی کی وجہ سے ہے، یہ لوگ اور ہر طرح کے گمراہ لوگ، دنیاوی امور اور دنیاوی معاملات میں سنجیدہ ہوتے ہیں، مگر کفر اور شومئ قسمت کی وجہ سے امورِ دین اور امورِ آخرت سے سراسر بے خبر اور ناں رہتے ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ [الروم:۷] (وہ دنیوی زندگی کے صرف ظاہری رخ کو جانتے ہیں، اور آخرت کے بارے میں ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس سے بالکل غافل ہیں)۔

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ ہَلۡ تَنۡقِمُوۡنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاَنَّ اَکۡثَرَ
کُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۵۹﴾ قُلۡ ہَلۡ اُنَبِّئُکُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِکَ مَثُوۡبَۃً عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ مَنۡ لَّعَنَہُ اللّٰہُ وَغَضِبَ عَلَیۡہِ وَجَعَلَ
مِنۡہُمُ الۡقِرَدَۃَ وَالۡخَنَازِیۡرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوۡتَ ؕ اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا وَّاَضَلُّ عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ ﴿۶۰﴾ وَاِذَا
جَآءُوۡکُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَقَدۡ دَّخَلُوۡا بِالۡکُفۡرِ وَہُمۡ قَدۡ خَرَجُوۡا بِہٖ ؕ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡتُمُوۡنَ ﴿۶۱﴾ وَتَرٰی
کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ وَاَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۲﴾ لَوۡ
لَا یَنۡہٰہُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِہِمُ الۡاِثۡمَ وَاَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۶۳﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے: اے اہلِ کتاب! تم ہم سے صرف اس لئے ناراض ہوتے ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اور اس پر بھی ایمان لائے جو ہماری طرف اتارا گیا، اور جو ہم سے پہلے اتارا گیا اور ایک یہ بات ہے کہ تم میں اکثر نافرمان ہیں ﴿۵۹﴾ آپ فرمادیجئے: کیا میں تمہیں وہ طریقہ بتاؤں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سزا کے اعتبار سے اس سے زیادہ برا ہے؟ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کردی، اور جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا، اور ان میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ نے بندر اور سور بنادیا، جنہوں نے شیطان کی عبادت کی، یہ لوگ جگہ کے اعتبار سے بدترین لوگ ہیں، اور سیدھے راستہ سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں ﴿۶۰﴾ اور جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالانکہ وہ کفر کے ساتھ داخل ہوئے، اور کفر ہی کی حالت میں نکل گئے، اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جس کو وہ چھپاتے ہیں ﴿۶۱﴾ اور آپ ان میں سے بہت سوں کو دیکھیں گے جو گناہ میں اور ظلم میں اور حرام کھانے میں تیزی کے ساتھ دوڑتے ہیں، یہ واقعی بات ہے کہ وہ اعمال برے ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں ﴿۶۲﴾ کیوں نہیں منع کرتے ان کو درویش اور اہلِ علم گناہ کی باتیں کرنے سے اور حرام کھانے سے واقعی وہ کرتوت برے ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں ﴿۶۳﴾

معارف ومنازل

اہلِ کتاب جو کہ ضد وعناد اور ہٹ دھرمی میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور سرکشی وشرارت میں بڑے ماہر تیز رفتار ہیں، انہیں ناصحانہ انداز میں سمجھایا جارہا ہے، اور تنبیہ کی جارہی ہے کہ تم کیوں ہم سے ناراض ہو؟ ہماری کونسی چیز اور کونسا عمل تمہیں ناگوار ہے؟ تم ہم میں کونسا عیب پاتے ہو؟ تمہاری ناگواری اور بیزاری کی صرف یہ بات ہے کہ ہم

اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اور اللہ تعالیٰ نے جو کتاب ہماری طرف نازل کی، اس پر ایمان لائے، اور اس سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئیں ان پر بھی ایمان لائے۔

یہ بہت اچھی باتیں ہیں، یہ باتیں ناگواری اور ناراضگی اور عیب کی نہیں ہیں، ان اچھی باتوں کو تم نے ناراضگی کا سبب بنالیا، یہ تمہاری حماقت ہے، حق تو یہ ہے کہ تم خود کو جب اہلِ کتاب کہتے ہو تو ان پسندیدہ باتوں پر ہماری تائید کرتے، اور ہم سے راضی رہتے۔

اور دوسرا سبب تمہاری ناراضگی کا یہ ہے کہ تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری سے خارج ہیں، (کیونکہ ان میں سے صرف معدودے چند صرف آٹھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا) اس لئے فرمایا کہ تم میں اکثر اللہ تعالیٰ کے نافرمان فاسق ہیں، اور اپنے کفر پر مصر ہیں۔

اگر مسلمان اللہ تعالیٰ پر تمام انبیاء علیہم السلام پر تمام کتابوں پر ایمان لائے، یہ تو ناراضگی کا سبب نہیں ہوسکتا۔ ہاں! اہل کتاب کا نافرمان ہونا، اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری سے ہٹنا، اور کفر پر مصر رہنا، یہ مسلمانوں سے ناراضگی کا سبب ہوسکتا ہے، اور حقیقت میں کافروں کی ناراضگی کا یہی سبب تھا، اور اب بھی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ شریف آدمی چوروں اور غنڈوں کی برائیوں کی وجہ سے ان سے ناراض ہو، لیکن الٹا چور اور غنڈے لوگ شرفاء سے ناراض ہیں، کہ وہ برائیوں میں ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے، یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

اہلِ کتاب کو اس میں تنبیہ ہے، اور ہدایت بھی ہے کہ تم ضد و سرکشی سے باز آؤ، اور مسلمان ہوکر مسلمانوں کے پسندیدہ اعمال پر جمے رہو۔ فرمایا:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ آپ یہ کہہ دیجئے: اے اہلِ کتاب! تم ہم میں سوائے اس کے کیا عیب پاتے ہو کہ ہم ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے ہیں، اور اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل کی گئی، اور ان کتابوں پر بھی جو اس سے پہلے نازل ہوئیں، یعنی ہم تمہاری طرح انبیاء علیہم السلام میں اور آسمانی کتابوں میں تفریق نہیں کرتے، اور یہ کہ تم اکثر فاسق بدکار ہو، یعنی تم اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کے حکموں کے منکر اور نافرمان ہو، اور تم گوسالہ پرست اور تثلیث کے مدعی ہو، تمہارا شیوہ کفر و سرکشی ہی ہے، اسی وجہ سے تم ہمارے صراط مستقیم اور خالص توحید سے متنفر ہو، اور ہمارے طریقوں پر بوجہ اپنی گمراہی کے معترض ہو، تمہیں اپنے عیبوں پر تو نظر نہیں، اور ہمارے محاسن اور

کمالات اور خلوص للہ فی اللہ تم کو عیوب نظر آتے ہیں، اہلِ تثلیث اور اہلِ تجسیم اور اہلِ فسق اور وہ بے مثال فسق جو قتل انبیاء کرام علیہم السلام پر مشتمل ہوا، انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ اہلِ توحید پر طعن وعیب جوئی کریں؟ ؎

چشم بداندیش کہ برکندہ باد ☆ عیب نماید ہنرش درنظر

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٦٠﴾

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے: آؤ! میں تم کو ایسی قوم کا پتہ اور راز بتاتا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعتبار جزا اور سزا کے اس سے زیادہ بدتر اور بُرے ہیں، یعنی تم اس دین اسلام کو بُرا کہتے ہو، آؤ! میں تم کو اس سے بھی بُرے لوگوں کی نشاندہی کردوں (وہ یہی یہود ہی تو ہیں) وہ لوگ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی، اور وہ مغضوب ہوئے، اور ان میں سے کچھ کو بندر اور سور بنا دیا، ان کی شکل وصورت مسخ ہو کر مردار جانور بنے، اور جنہوں نے شیطان کی پرستش کی، یعنی گوسالہ کو معبود بنایا۔

مطلب یہ ہے کہ بُرے لوگ وہ نہیں جو مسلمان ہیں، اہل توحید ورسالت ہیں، بلکہ بُرے لوگ وہ ہیں جو لعنتی اور مغضوب ہوئے جن کی شکلیں بندر اور سور بنائی گئی ہیں، جنہوں نے شیطان کی پرستش کی، یہی برے لوگ ہیں، اور یہ تم اور تمہارے اسلاف ہی تو ہیں، جنہوں نے یوم السبت کی بے احترامی میں ستر ہزار کے قریب بندر اور خنزیر بن گئے۔ مزید تفصیل سورۂ اعراف میں ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

یہی لوگ باعتبارِ مکان (یعنی دوزخ) بدترین خلائق ہیں، اور سب سے زیادہ بھکے ہوئے گمراہ ہیں۔ "عَبَدَ" ماضی کا صیغہ ہے، "اَلطَّاغُوْتَ" مفعول، اس کا عطف "لَعَنَهٗ" پر ہے۔ الطاغوت سے مراد شیطان ہے، یا گوسالہ، جسے شیطان نے ان کا معبود بنایا۔

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿٦١﴾

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٢﴾

ترجمہ: اور (منافق جو کہ یہود میں سے ہیں) جب آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم آپ پر ایمان لائے (حالانکہ دلوں میں کفر چھپائے ہوتے ہیں) باوجود کفر کے آپ کے پاس آئے تھے، اور کفر لے کر ہی نکلے (وہ ایمان کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کفر کے ساتھ آئے، اور اسی کفر کے ساتھ آپ کی مجلس سے اٹھ کر باہر نکلے) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ چھپائے رکھتے ہیں، اور ان یہودیوں اور منافقوں میں سے آپ بہت سوں کو دیکھیں گے کہ وہ تیزی کے ساتھ گھستے ہیں گناہوں میں، اور ظلم وحرام خوری میں۔

معارف ومنازل

یہاں سے یہود اور منافقوں کو تنبیہ ہے کہ جس طرح مسلمان نیکیوں میں اور اعمالِ خیر اور تقویٰ میں دوڑ لگا کر مسابقت کرتے ہیں، اسی طرح تم لوگ گناہوں، ظلم ورشوت اور حرام خوری میں دوڑ لگاتے ہو، پس خوب ثابت ہوا کہ مسلمان اچھے ہیں، اور تم بُرے اور بدتر ہو۔ بلاشبہ یہود اور منافق بہت ہی بُرے عمل والے اور بدکردار ہیں، پہلے وہ بد عقیدہ ثابت ہوئے، اور اب بدعمل اس طرح ان کا نفاق کامل ہوا۔

﴿لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ مشائخ درویش اور علماء ان کو جھوٹ کہنے سے، گناہ اور ظلم اور حرام خوری ورشوت سے کیوں منع نہیں کرتے؟ یہاں سے علماء ومشائخ کو زجر وتوبیخ ہے، کیونکہ یہ ان کا فرض تھا کہ ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرلیں، بلکہ انہوں نے بجائے نہی عن المنکر کے خود منکرات کا ارتکاب کیا، جیسے کہ پہلے واضح ہوا تھا کہ رشوت اور حرام خوری، کتمانِ حق، تحریف فی الکتاب، ثمن قلیل کے عوض حق باتوں میں ہیر پھیر، یہ سب کچھ ان کے علماء کا پیشہ اور کردار رہا، جیسے فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾ [التوبۃ: ۳۴] (اے ایمان والو! یہودی احبار، اور عیسائی راہبوں میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھاتے ہیں)۔

﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ پہلے يَعْمَلُوْنَ فرمایا، اب يَصْنَعُوْنَ فرما کر خواص کی مذمت میں زیادتی کی۔ صاحب مدارک نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآن مجید میں یہ شدید ترین آیت ہے کہ برائی سے باز داشت نہ کرنے والے کو مرتکب گناہ کی طرح وعید کی گئی ہے، بلکہ برائی سے نہ روکنے والوں کو

دھمکی زیادہ قوت کی حامل ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک دن خطبہ دیا، اور حمد وصلوٰۃ کے بعد فرمایا: اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اس لئے ہلاک ہوگئے کہ وہ گناہ کرتے تھے، اہلِ علم اور درویش انہیں نہیں روکتے تھے، جب گناہوں میں بڑھتے چلے گئے تو ان پر عذاب نازل ہوگیا، لہٰذا تم امر بالمعروف کرو، اور نہی عن المنکر کرو، اس سے پہلے کہ تم پر وہ عذاب اسی دنیا میں آئے، اور یہ بات جان لو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وجہ سے نہ رزق منقطع ہوتا ہے، اور نہ موت وقت سے پہلے آتی ہے۔ سنن ابوداؤد اور ابن ماجہ میں ہے کہ یہ عذاب موت سے پہلے آئے گا۔ [ابن کثیر]

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ آپ کی قوم کے ایک لاکھ آدمی عذاب سے ہلاک کئے جائیں گے، جن میں سے چالیس ہزار نیک لوگ ہیں، اور ساٹھ ہزار بدعمل۔ حضرت یوشع علیہ السلام نے عرض کیا کہ: ربّ العٰلمین! بدکرداروں کی ہلاکت کی وجہ تو ظاہر ہے، لیکن نیک لوگوں کو کیوں ہلاک کیا جارہا ہے؟ تو ارشاد ہوا کہ یہ نیک لوگ بھی ان بدکرداروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں، ان کے ساتھ کھانے پینے اور ہنسی دل لگی کے ساتھ شریک رہتے ہیں، میری نافرمانیاں اور گناہ دیکھ کر کبھی ان کے چہروں پر کوئی ناگواری کا اثر پیدا نہیں ہوا۔ معلوم ہوا کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ترک سخت گناہ اور ہلاکت ہے۔ [بحر محیط]

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ اَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدٰهُ
مَبْسُوطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ
طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ كُلَّمَآ اَوْقَدُوا
نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۞

ترجمہ: اور کہا یہودیوں نے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بند ہوگیا ہے، بند ہوئے ان کے ہاتھ، اور ان کے قول کی وجہ سے، ان پر لعنت کی گئی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ خرچ فرماتا ہے جیسے چاہے، اور آپ کے ربّ کی طرف سے جو آپ پر نازل کیا گیا، وہ ان میں سے بہت سوں کو سرکشی اور کفر کے زیادہ ہونے کا سبب بن جائے گا، اور ہم نے ڈال دی ان کے درمیان دشمنی اور بغض قیامت کے دن تک، انہوں نے جب کبھی لڑائی کی آگ جلائی اللہ

تعالیٰ نے اسے بجھا دیا، اور یہ لوگ فساد کے لئے دوڑتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ فسادیوں کو دوست نہیں رکھتا۞

معارف ومنازل

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہود بہت بڑے مالدار تھے، وہ اسی کثرت مال کی وجہ سے مزید مغرور تھے، جب انہوں نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حد سے زیادہ مخالفت کی، قرآن کریم اور دینِ اسلام کا انکار کر کے گویا توریت کی بھی مخالفت کی، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جو مال ودولت بکثرت دیا تھا اور بڑی مقدار میں جو پیداوار ہوتی تھی اس کو ایک حد تک روک دیا، اس پر فنحاص بن عازورا، نباش ابن قیس اور دیگر نے یہ بات کہی کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ خرچ کرنے اور دینے سے بند ہو گیا، اور رک گیا، یا یہ کہ اس نے سخاوت چھوڑ دی، اس غلط بات پر سارے یہودی راضی رہے، انہوں نے ایسے لوگوں کو نہیں روکا، تو یہ بات سب کی طرف منسوب ہوئی۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ﴾ سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾[آل عمران:۱۸۱] (یقیناً اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے، اور ہم مالدار ہیں]۔ یہ مفسد لوگ جہاں انبیاء کرام علیہم السلام کی بے دھڑک تکذیب اور نافرمانی کرتے تھے، وہاں انہوں نے ربّ العزت جل شانہ کی تکذیب اور شان عالی میں گستاخی کرنے میں بھی کوئی کمی نہیں کی۔ [معالم، ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ]

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جھٹلانے پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی، اور سزا کے طور پر یہود کی روزی تنگ کردی، تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، یعنی (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ بخل کرنے لگا ہے، گویا کہ اس کا ہاتھ گردن سے بندھا ہوا ہے۔

عرف میں ہاتھ کی کشادگی کو سخاوت سے، اور ہاتھ کی بندش کو بخل سے عام تعبیر کرتے ہیں، چونکہ یہ ایک ایسا جملہ یا عقیدہ ہے کہ اس سے کفر لازم آتا ہے، علماء اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے کہ تمام حوادث، سارے عیوب ونقائص اور مخلوقات کی صفات کو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرنا حرام اور کفر ہے، بلکہ ان تمام مذکورہ چیزوں سے اس کی ذات عالی کی تقدیس وتنزیہ واجب ولازم ہے۔ یہی مطلب سبحانہ کے کلمہ حق کا ہے، لہٰذا اگر ابھی کوئی ایسا عقیدہ رکھے، یا اس طرح کا کوئی کلمہ ادا کرے تو اس کے کفر میں کوئی شک نہ ہوگا۔ مزید تفصیل کتب عقائد میں دیکھیں۔

﴿غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ انہیں کے ہاتھ باندھے گئے ہیں، یعنی وہی ہر خیر سے محروم کردیئے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ تو جواد وکریم مطلق ہے، ساری کائنات کا خالق و مالک ہے، سب کا رازق اور روزی رساں ہے، کرۂ ارض کا کیا سوچیں، سات دریاؤں کی تہہ میں چھ سو سے زائد مخلوقات کا رازق اور پالنے والا پالن ہار ہے، فضاؤں میں، ویران صحراؤں پہاڑوں میں جہاں آج تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی ہے مجال نہیں کہ وہاں کا کوئی جاندار کیڑا یا اور کوئی مخلوق رزق سے محروم ہو، یا بھوک سے مرا ہو۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی آٹھ ماہ سے مسلسل جنات اور انسانوں کے ہاتھوں سے تیار شدہ پہاڑوں کے برابر خوراک کو ایک مچھلی ایک لقمہ کرکے کھاتی اور ختم کرتی ہے، اور دوگنا مزید خوراک کا مطالبہ کرکے کہتی ہے کہ میری خوراک روزانہ تین لقمہ ہے، جس کے دو حصے مزید ابھی باقی ہیں۔

یہ کون ہے؟ اتنی بے شمار مخلوقات کا روزی رساں سب جانتے ہیں کہ صرف خداوند تعالیٰ ہی ہے۔ ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا﴾ [هود: ٦] (اور زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ نے اپنے ذمے نہ لے رکھا ہو، وہ اس کے مستقل ٹھکانے کو بھی جانتا ہے، اور عارضی ٹھکانے کو بھی)۔

پس جس مریض ذہنیت کے لوگ اگر اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ وہ فقیر ہے، یا اس نے (معاذ اللہ) بخل کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے، ایسے مریض ومخبوط الحواس پاگلوں کے مرض کا علاج ہی ضروری ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو فاسقین لَا يَعْلَمُوْنَ وَلَا يَعْقِلُوْنَ اور لَا يَشْعُرُوْنَ ہیں، مگر کیا کیا جائے معالج بھی تشریف لائے نسخۂ شفاء بھی ساتھ لائے، مفت علاج کا اہتمام فرمایا، مگر یہودی ونصرانی یا ان کے ہمنوا اپنی بدقسمتی سے مستفید نہیں ہوئے، اور شفاء طلب نہیں کی، اور آمادہ بھی نہیں ہوئے۔

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [الإسراء: ٨٢] (اور ہم وہ قرآن نازل کررہے ہیں جو مؤمنوں کے لئے شفا اور رحمت کا سامان ہے۔ البتہ ظالموں کے حصے میں اس سے نقصان کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہیں ہوتا)۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کریم، مطلق مالک، جود اور خالق جود ہے، اس کے خزائن غیر محدود ہیں: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ [الحجر: ٢١] () وہی ہے الخافض وہی ہے الرافع وہی ہے ﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ﴾ [الرعد:

۲۶] (اللہ رزق کشادہ کر دیتا ہے جس کے لئے چاہے، اور تنگ کر دیتا ہے)۔ وہی ہے حکیم مطلق۔ فرمایا: ﴿وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاۗءُ﴾ [الشوری:۲۷] (اور اگر اللہ اپنے تمام بندوں کے لئے رزق کو کھلے طور پر پھیلا دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کرنے لگتے، مگر وہ ایک خاص اندازے سے جتنا چاہتا ہے اتارتا ہے)۔ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ [الذاریات:۵۸] (اللہ تو خود ہی رزاق ہے، مستحکم قوت والا ہے)۔

﴿غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ کہ خود یہودیوں کے ہاتھ خیر وخیرات سے رُکے ہوئے ہیں، اور باندھے ہوئے ہیں، اور وہ ہر خیر سے محروم ہیں، اور ایسی باتوں اور بے خیری کی وجہ سے وہ ملعون ورانده درگاہ ہیں۔

﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ﴾ بلکہ اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے پھیلائے ہوئے ہیں (اعلان فرماتے رہتے ہیں: ہے کوئی مانگنے والا جس کی حاجت پوری کر دوں؟) وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

یہودی بڑی بیہودہ قوم تھی، انہوں نے ایسی بیہودگی پر کمر باندھی کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ عالی میں اور اس کی ذات مقدس کے بارے میں بھی نازیبا اور بے سروپا کلمات استعمال کئے، جب کسی قوم میں ایمان نہ رہے ان کا حال یہی بے ادبی ہی ہوتی ہے، ہاں! اگر ایمان کی دولت کسی قوم کا حصہ ہو تو وہ یہ کہتے رہتے ہیں۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب ☆ ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

"سُبْحَانَهٗ مَا اَعْظَمَ شَانُهٗ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ"۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سید الصادقین ورئیس الحامدین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، اسے کوئی خرچہ کم نہیں کرتا، وہ شب وروز (مخلوقات پر) خرچ کرتا ہے، تم ہی بتاؤ! اس نے کتنا خرچ فرمادیا جب سے آسمان اور زمین کو پیدا فرمادیا؟ جو کچھ اس کے ہاتھ میں تھا اس میں ذرا بھی کم نہیں ہوا، اور اس کا عرش پانی پر تھا"۔ [متفق علیہ]

عرش کے پانی پر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عرش معلّٰی اور سمندر کے درمیان کچھ نہ تھا، ابھی تو ساری مخلوقات پر عرشِ عظیم محیط ہے، اور تمام مخلوقات عرشِ معلّٰی اور سمندر کے درمیان میں واقع ہیں۔

جاننا چاہئے کہ جب کسی کے مال میں کمی کا خوف ہوتا ہے تو وہ بخل کرتا ہے، اور بخل صفتِ ذمیمہ ہے، اس

سے اللہ تعالیٰ پاک ہے، اور وَرَاءُ الْوَرَاء ہے، اور جب اس کے خزانوں میں کسی ایک ذرّہ کی کمی کا امکان نہیں، تو کمی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہا یہ کہ وہ اپنے اکثر بندوں کا رزق تنگ کرتا ہے، یہ اس لئے نہیں کہ اس کے خزانوں میں کمی ہے، بلکہ یہ اس کی حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے۔ ؎

آں کس کہ توانگرت نمی گرداند ☆ او مصلحت تو از تو بہتر داند

حدیث قدسی میں ہے: عَطَائِیْ کَلَامٌ وَعَذَابِیْ کَلَامٌ اِنَّمَا اَمْرِیْ لِشَیْءٍ اَنْ اَقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ [مشکوٰۃ] میرا عطا کرنا کلام ہے (صرف یہ کہنا کن) اور عذاب دینا بھی کلام ہے، جب میں کسی چیز کا ارادہ کرتا ہوں تو کُن کہہ دیتا ہوں، پس وہ چیز موجود ہو جاتی ہے۔

یہ باری تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور ارادۂ عالیہ کا ایک نمونہ ہے کہ سارے جہاں کی آبادی اور بربادی صرف ایک لفظِ کُن کے ساتھ مربوط ہے، گویا ساری کائنات کی چابی ایک لفظ ہی کُن ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے سمجھانے کے انداز میں بیان فرمایا کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا فرمایا ہے اس وقت سے اس نے اپنی مخلوق پر کتنا خرچ کر دیا ہے؟ اس پر خوب غور کرو، اتنا خرچ کرنے پر اس کے خزانوں میں سے کچھ بھی کم نہیں ہوا، اور خرچ برابر ہو رہا ہے، اور ہوتا رہے گا، اور ابدالآباد تک اہلِ جنت پر خرچ ہوگا۔

ایسے خالق و مالک کو یہودیوں نے فقیر کہہ دیا، یہ ان کی نادانی حماقت اور کفر و ناشکری ہے، حالانکہ انہوں نے اپنی کانی آنکھوں سے اس کی رحمتوں کا مشاہدہ کیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی مارنے پر بحر قلزم بارہ حصوں میں تقسیم ہوا، پوری قوم نجات پائی، سلامتی کے ساتھ دریا عبور کر لی، اور ستر لاکھ چاق و چوبند فرعونی لشکر بمع اپنے سربراہ کے غرق ہوا۔ اس ناشکرو کافر قوم نے ناشکری کی حد کر لی، اور کوئی سبق و عبرت نہیں سیکھی۔

متشابہات کی بحث:

اس قسم کی آیتیں جن میں اللہ تعالیٰ کے منہ، اور ہاتھ وغیرہ کا ذکر آتا ہے معاذ اللہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہ بھی مخلوق کی طرح کوئی جسم یا اعضاء رکھتا ہے، اس لئے کہ ربّ العزّت سبحانہ جسمانیت اور لوازمِ جسمانیت سے منزّہ اور پاک ہے۔ سلف صالحین اور علماء محققین کا مذہب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور وجود اور حیات اور علم اور سمع اور بصر وغیرہ تمام صفات سے بے مثل و بے مثال اور بے چون و بے چگون ہے، اس کی ذات و صفات کی کوئی نظیر اور مثال اور کیفیت اس کے سوا کچھ نہیں بیان کی جاسکتی: ؎

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم ☆ واز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایان رسید عمر ☆ ما ہمچنان در اوّل وصف تو ماندہ ایم

اس قسم کی آیات معلوم المعنی ومجہول الکیف ہیں، یعنی یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ید کے معنی ہاتھ، اور وجہ کے معنی منہ کے ہیں، مگر یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اور منہ کی کیفیت کیا ہے؟ یہ واضح ہے کہ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ تو کہنا پڑے گا کہ جس طرح اس کی ذات اقدس انسانوں کی فہم، عقل، ادراک سے وراء الوراہے، اس تک عام آدمی تو کیا خواص الخواص انبیاء کرام علیہم السلام کی رسائی بھی ممکن نہیں، پس جس طرح اس کی ذات عالی کی یہ شان ہے اسی طرح اس کی صفات کا بھی یہی حال ہوگا کہ ان تک رسائی ممکن نہیں، پس کیفیت معلوم کرتے بغیر الفاظ کے معانی پر ایمان لانا فرض ہے، اور کیفیت معلوم کرنے کے لئے جد وجہد ممنوع اور بدعت ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا قول نقل کیا، اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا، اور کہا:

اَلْمَعْنِي مَعْلُومٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ وَالسُّوَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ وَالْاِيْمَانُ بِهٖ لَازِمٌ۔ [شرح عقیدۃ الطحاویۃ]

﴿وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا﴾ (اور آپ کے ربّ کی طرف سے جو آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ ان میں سے بہت سوں کی سرکشی اور کفر کے زیادہ ہونے کا سبب بن جائے گا)۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب نازل فرمائی وہ تو ہدایت کے لئے ہے جوں جوں مؤمن اس پر ایمان لاتے رہیں گے، ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا رہے گا، اور کافر جتنے اور جب بھی انکار کرتے رہیں گے، ان کے کفر میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس مضمون کی تفصیل سورۂ توبہ کے آخری رکوع میں آنے والی ہے، ان شاء اللہ۔

قرآن کریم ہدایت اور رحمت وغذا روحانی ہے، مگر ان معاندین کی فطرت اس درجہ فاسد ہو چکی ہے کہ قرآن ان کی ہدایت کی بجائے ان کی گمراہی میں اضافہ کرتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [الإسراء: ۸۲] (اور ہم وہ قرآن نازل کر رہے ہیں جو مؤمنوں کے لئے شفا اور رحمت کا سامان ہے۔ البتہ ظالموں کے حصے میں اس سے نقصان کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہیں ہوتا) ۔ اگر کسی مریض کا معدہ فاسد ہو تو عمدہ غذا سے بھی اس کو نقصان ہوگا، قصور غذا کا نہیں فاسد معدہ کا ہے کہ اس میں ہضم کی قوت نہیں، جب قوت ہاضمہ غذائیہ فاسد ہو جاتی ہے تو کھانا ہضم نہیں ہوتا، اگر عقلیہ روحانیہ قوت فاسد ہو تو ہدایت وروحانی غذا ہضم نہیں ہوتی۔ آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

﴿وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ اور ہم نے قیامت تک ان میں دشمنی کو اور بغض کو ڈال دیا کہ جب کبھی انہوں نے لڑائی کی آگ جلائی تو اللہ تعالیٰ نے اسے بجھا دیا، اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا فساد کرنے والوں کو۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آپس میں ایسا الجھا دیا کہ یہود بہتر (۷۲) فرقے ہو گئے، اسی طرح نصاریٰ بھی، پھر یہ سارے فرقے ایک دوسرے کے دشمن اور بدخواہ بن گئے۔ البتہ یہ لوگ سیاسی سطح پر جب مسلمانوں کے خلاف متحد ہو کر لڑائی اور جنگ کی آگ جلانا اور تیز کرنا شروع کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی آگ بجھا دیتا ہے، ان کا یہ سیاسی اتحاد اختلافات کا شکار ہو جاتا ہے، اس طرح ان کے سارے منصوبے درہم برہم اور ناکام ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ دوسرے ذرائع سے فساد پھیلانے میں لگ جاتے ہیں، مگر وہاں بھی انہیں ناکامی ہو جاتی ہے، اسی کشمکش میں وہ پریشان اور سرگرداں رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ایسے فسادکاروں کو نہ پسند کرتا ہے، نہ انہیں کسی خیر کی راہنمائی کرتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾
وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ
وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٦﴾

ترجمہ: اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ضرور ان کے گناہوں کا کفارہ کر دیتے، اور ہم انہیں ضرور نعمتوں کے باغوں میں داخل کر دیتے، اور اگر وہ قائم کرتے توریت کو اور انجیل کو اور اس کو جو کچھ نازل ہوا ہے ان پر ان کے ربّ کی طرف سے تو ضرور کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے، ان میں ایک جماعت سیدھی راہ اختیار کرنے والی ہے، اور ان میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو بُرے کام کرتے ہیں ﴿٦٦﴾۔

معارف ومنازل

سورۂ نساء پارہ پنجم کے آخر میں ارشاد فرمایا تھا: ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا﴾ [النساء:۱۴۷] (کیا کرے گا اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر اگر تم شکر گزار بنو، اور ایمان

لے آؤ، اللہ بڑا قدردان ہے، پوری طرح علم رکھتا ہے)۔ اللہ تعالیٰ کو کسی کے عذاب دینے میں کوئی فائدہ نہیں اور اللہ تعالیٰ کو کسی مخلوق کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں، اگر وہ فرمانبردار ہو۔

جولوگ اللہ تعالیٰ کو بخل کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ان کی پیداوار میں اس نے کمی کی ہے، یہ کسی ضد پر مبنی نہیں، یہ ان کے بُرے اعمال کا نتیجہ ہے۔ نبوت اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے، یہ کسی بنی اسرائیلی کی جاگیر نہیں۔ اگر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم بنو اسماعیل کے خاندان کے فرد ہیں تو کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ ربّ العزّت کا فیصلہ ہے، جہاں چاہے نبوت منتقل کردے۔

اہلِ کتاب یہ نہ سمجھیں کہ ہم اختلاف کرکے بہت دور جا پہنچے ہیں، اب شاید ہماری توبہ قبول نہ ہو۔ تو آیات مذکورہ میں ان تمام خدشات کا خاص کر آخری خدشہ کا نہایت پیارے اور ناصحانہ انداز میں جواب ہے، کہ اے اہل کتاب! گھبراؤ مت، اگر اب بھی اسلام کے خیمے میں آنا چاہتے ہو تو بسم اللہ کرکے آؤ! ایمان وتقویٰ اختیار کرو! اوّل انعام مغفرت کا، دوئم انعام ابدی جنت اور سعادتوں کا حاصل کرو۔ ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ﴾۔ [النساء:۱۴۷] (کیا کرے گا اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر اگر تم شکر گزار بنو، اور ایمان لے آؤ)۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اوپر آسمان، نیچے زمین سے تمہاری پیداوار کی کمی کا ازالہ کیا جائے گا، اور تمام نقصانات کی تلافی ہوجائے گی، بشرطیکہ توریت اور انجیل کے احکام پر چلو، اور جن صفات محمدی کو تم نے چھپائے رکھا آج عَلٰی رُؤُوْسِ الْاَشْهَاد کھول کر اس کا اعلان کرو، اور امت اجابت سے اتحاد واتفاق کرکے اس میں شامل ہوجاؤ، اور امت دعوت کو خیرباد کہتے ہوئے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کا ترانہ پڑھو، اسلام لانے سے سارے گناہوں کا کفارہ اور معافی ہوجائے گی، مگر کیا کیا جائے کہ انہوں نے اس پیشکش پر کان نہ دھرا۔ ؎

کلیم بخت کسی را کہ بافتند سیاہ ☆ بآب زمزم وکوثر سفید نتوان کرد

خلاصہ:

فرمایا: اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ضرور ان کے گناہوں کی مغفرت کرتے، سارے گناہوں پر پانی پھیر دیتے، اور ابدی سعادتوں والی ہمیشہ رہنے کی جنتوں میں انہیں داخل کرتے، اور آرام و سکون کی زندگی نصیب کرتے، اور اگر وہ توریت اور انجیل کو اور جو کچھ ان کی طرف نازل ہوا ہے (اس سے مراد قرآن حکیم ہے، جو سارے جہان کیلئے روشنی اور نور وہدایت ہے) مطلب یہ ہے کہ اگر اہل کتاب توریت اور انجیل کے

احکام پر عمل کرتے، اور اب جو کچھ خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس پر عمل کرتے، تو انہیں عقبیٰ میں بھی نوازا جاتا، جیسا کہ بیان ہوا، اور دنیا میں بھی انہیں خوب نوازا جاتا، جیسے ارشاد ہے کہ اوپر سے بھی کھاتے، اور پاؤں کے نیچے سے بھی کھاتے، عیش کرتے، اور گم شدہ پیداوار کی تلافی ہو جاتی۔

امام فراء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مراد رزق کی وسعت اور فراوانی ہے۔ یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ بارشوں کی کثرت سے پیداوار کی کثرت اور منافع مراد ہے۔ آخر میں فرمایا کہ بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو چند لوگ ہیں، تقریباً آٹھ اشخاص، جو سیدھی راہ پر چلتے ہیں، اور اکثریت فاسقوں نافرمانوں کی ہے، جو بُرے عمل کرنے والے ہیں، اور ان کے بُرے اعمال نے انہیں ایمان وتقویٰ اور اتباعِ حق سے روکا ہوا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۶۷﴾

ترجمہ: اے رسول! آپ پہنچا دیجئے جو کچھ آپ کے ربّ کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا، اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام نہ پہنچایا، اور اللہ تعالیٰ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا، بے شک اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راہ نہیں دکھائے گا ﴿۶۷﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں اہلِ کتاب کی شرارتوں اور کفر ونافرمانیوں کا بیان کا ذکر کر کے توریت انجیل اور قرآن کریم، یعنی تمام کتب سماوی پر عمل کی ترغیب دی گئی۔ قرآن کریم تمام کتبِ آسمانی کا جامع، عطر اور نچوڑ ہے، جس شخص نے قرآن کریم پر عمل کیا تو ایسا سمجھو کہ اس نے تمام کتبِ سماویہ پر عمل کیا۔ اسی طرح قرآن مجید کی تبلیغ تمام کتبِ سماویہ کی تبلیغ کہلائے گی۔

اب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو فریضۂ تبلیغ ادا کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ پوری کائنات کے پیغمبر ہیں، سارے انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، ساری آسمانی کتابوں کے حامل ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے حکم دیا جا چکا ہے:

﴿قُمْ فَأَنذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ [المدثر: ۳] (اٹھواور لوگوں کو خبر دار کرو۔ اور اپنے پروردگار کی تکبیر کہو)۔ اس نئے حکم کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ذمہ داری کا بھی اعلان کیا جا رہا ہے۔

اس آیت کے نزول سے پہلے آنحضرت سرور عالم ﷺ کو کفار، منافقین، یہود، معاندین سے جسمانی اذیتیں پہنچیں ہیں، اس آیت کے نزول کے بعد کوئی شخص آپ کو تکلیف نہیں پہنچا سکا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم رات کو باری باری آپ ﷺ کی حفاظت کے لئے پہرہ دیا کرتے تھے، جب آیت: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ نازل ہوئی تو آنحضرت سرور عالم ﷺ نے خیمہ سے اپنا سر مبارک نکال کر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ اب تم میرے پاس سے چلے جاؤ، اللہ تعالیٰ میرا نگہباں ہے، اس نے خود میری حفاظت کی ذمہ داری لے لی ہے۔ یہ روایت جامع ترمذی میں ہے، قریب قریب اسی طرز کی روایت متفق علیہ میں بھی ہے۔

حکمِ تبلیغ رسالت اور وعدۂ حفاظت:

اس آیت کریمہ میں ربّ العزّت جل شانہ نے سرور عالم مبلغ اعظم ﷺ کو احکامِ الٰہی کی ہمہ گیر تبلیغ کا حکم دیا، اور فرمایا: کہ جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا اس کو لوگوں تک پہنچا دیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے: کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے رسول ﷺ کو مبعوث فرمایا تو آپ ﷺ کے قلب مبارک پر بوجھ محسوس ہوا، اور آپ ﷺ کو یہ خیال دامن گیر ہوا کہ لوگ میری تکذیب کریں گے، کیونکہ پورے کرۂ ارض اور چاروں افق احکام الٰہی سے خالی اور محروم تھے، اس پر یہ آیت اتری، تو آپ ﷺ نے عرض کیا کہ: اے ربّ! میں تنہا اکیلا یہ مشکل کام کیسے انجام دوں گا؟ کیونکہ لوگ میرے خلاف اٹھیں گے، اور میرے لئے مشکلات پیدا کریں گے۔ فرمایا:

﴿فَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ اور مزید اطمینان قلب کے لئے ارشاد ہوا:

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ یہ کتنی بڑی حوصلہ افزائی اور تسلی ہے؟ اس کے نزول کے ساتھ آپ نے تمام جان نثار محافظوں اور پہرہ داروں کو رخصت دے دی، اور آرام سے رہے۔ [معالم، لباب]

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِينَ﴾ جن کی قسمت میں ہدایت نہیں وہ کبھی آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، بہت سے لوگ مختلف مقامات میں اور متفرق حالات میں یا تو آپ ﷺ تک نہیں پہنچ سکے، یا پہنچ کر عاجز و ناتواں رہے، کچھ نہ کر سکے، بلکہ الٹا خود ذلیل ہو کر گرفتار ہوئے، یا قتل ہوئے، یا کلمہ پڑھ کر مسلمان

ہوئے۔ تفصیل دیکھنا ہو تو تفسیر ابن کثیر وغیرہ کا مطالعہ کریں۔

حجۃ الوداع کا تاریخی خطبہ، اور پوری امت کو پیغام:

آنحضرت سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا اس میں بہت سی اہم اور ہمہ گیر و عالمگیر ضروری باتوں کا تذکرہ فرمایا، ایسا لگتا تھا کہ بے شمار ستاروں اور چمکدار تاروں کے عین وسط میں چودھویں رات کا چاند محو سفر رواں دواں ہے۔ سفید چادروں کے احرام میں ملبوس ایک لاکھ سے زائد نورانی چہروں والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر بات ہر اشارے ہر ادا سننے اور دیکھنے کے لئے تڑپ رہے ہیں، اور بڑی خاموشی اور ادب کے ساتھ مجسم کان بنے ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درمیان میں اونٹنی پر سواری کی حالت میں خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں، اونٹنی کی مہار مشہور سردار سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہے۔ اونٹنی کے منہ سے جھاگ مسلسل گر رہی ہے، سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ ان جھاگوں کو زمین پر نہیں گرنے دیتے، بلکہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے چہرے اور سر کے بالوں پر، اور پورے بدن پر مل رہے ہیں۔

یہ وہ سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ ہیں جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بیٹھ کر کفار قریش کی طرف سے نمائندہ بن کر آئے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ میدانِ حدیبیہ میں مشہور صلح حدیبیہ کی شرائط طے کی تھیں۔ جب بات پہنچی **"محمد رسول اللہ"** پر، تو سہیل رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ کو رسول اللہ تسلیم نہیں کرتا، یہ **رسول اللہ** کا لفظ کاٹ دو، **محمد بن عبد اللہ** لکھو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صبر و تحمل پہاڑوں سے زیادہ وزنی تھا، فرمایا: اچھی بات ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کاتب وحی سے فرمایا: **رسول اللہ** کا لفظ کاٹ دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے ہاتھوں میں یہ حوصلہ اور جرأت کہاں کہ **رسول اللہ** کا مبارک لفظ کاٹ دوں؟ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اچھا وہ لفظ مجھے نشاندہی کر کے بتاؤ، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نشاندہی کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے داہنے ہاتھ مبارک سے کاٹ کر اسے مطمئن کر دیا۔ ؎

اگر ہو عشق تو ہے کافری مسلمانی ☆ نہ ہو تو بندۂ مومن بھی کافر و زندیق

(اقبالؒ)

یہ وہی سہیل رضی اللہ عنہ ہیں، جو آج اونٹنی کی جھاگ پر جان دینے کے لئے تیار اور قربان ہیں، جبکہ چار سال قبل وہ **رسول اللہ** کے لفظ کو برداشت و تسلیم کرنے کے منکر تھے۔

میدان عرفات کا یہ خطبہ کیا خطبہ تھا؟ پوری شریعت اور دینِ الٰہی کا نچوڑ اور عرق کشیدہ عطر تھا۔ جب آپ

صلی اللہ علیہ وسلم یہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، انسان تو انسان تھے، قرب وجوار کے درخت، سبزے، جڑی بوٹیاں پتھر، پہاڑ سارے خاموشی کے ساتھ سن رہے ہوں گے، اور فرطِ محبت وعقیدت سے جھوم رہے ہوں گے، یہ وہ تاریخی خطبہ تھا جس کی سماعت اور سننے کے لئے عالمِ بالا آسمانوں سے لاکھوں فرشتے آئے ہوئے تھے، جنہوں نے تخلیقِ آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جامع، معطر، عالمگیر خطبہ نہ سنا تھا، اور نہ ان کے خیال وگمان میں تھا۔

دوسری طرف سے سید الملئکہ حضرت جبریل علیہ السلام تکمیلِ دین واتمامِ نعمتِ الٰہی کے پیغام کا مژدہ سنانے کے لئے فرشتوں کی ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ بارگاہِ نبوت میں حاضری دے کر اعلان کر رہا تھا: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدۃ:٣] (آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمہارے لئے اسلام بطور دین پسند کیا)۔

یہ خطبہ کیا خطبہ تھا؟ جس میں اعلان ہو رہا تھا کہ سارے جہاں کی خدائی اللہ ربّ العزّت وحدہٗ لاشریک کے لئے ہے، جاہلیت کے تمام رواج ورسوم میرے پاؤں کے نیچے دبے ہوئے ہیں، ہاتھ مبارک کے اشارہ سے فرمایا: دیکھو! وہ ہے ابلیس، اپنے بال نوچ رہا ہے، چہرے پر ہاتھوں سے طمانچہ مار رہا ہے، اور ویل واویلا کرتے ہوئے چیختے ہوئے اپنے سر پر مٹی ڈال رہا ہے، اور اپنی ناامیدی کا اعلان کر رہا ہے، اسے یقین ہو گیا ہے کہ قیامت تک اس خطے میں شرک نہیں ہوگا، اور غیر اللہ کی عبادت نہیں ہوگی۔ آج پورا جزیرۂ عرب توحید کا گہوارہ بنا ہوا ہے، اور یہ سلسلہ قربِ قیامت تک قائم رہے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس خطبے میں اصنام، اوثان، بتوں، پتھر، سونے چاندی، تانبے سے بنے ہوئے تمام مورتیوں کو پاش پاش کر کے ہمیشہ کے لئے انہیں نیست ونابود فرمایا۔ قومیتوں، لسانی، علاقائی، کالے سفید، سرخ ہر قسم کی عصبیتوں کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا، اور تمام شرافتوں اور فضیلتوں کا معیار صرف تقویٰ اور پرہیز گاری کو قرار دیا۔ آخر میں ارشاد فرمایا کہ: قیامت کے دن میرے متعلق تم سے پوچھا جائے گا تو کیا جواب دو گے؟ سارے مجمع نے بیک زبان اعلان کیا کہ: ”نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ“۔ ہم گواہی دیں گے کہ بلاشبہ آپ نے پہنچایا رسالت کو، اور پورا ادا کیا امانت کو، اور خیر خواہی فرمائی امت کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی، پھر لوگوں کی طرف جھکائی، اور تین بار ربّ العزّت کے حضور میں شہادت کی انگلی اٹھا کر عرض کیا: ”اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ“ اے اللہ! تو گواہ ہو جا! [رواہ مسلم]۔ پھر دسویں ذوالحجہ یوم

النحر کے روز منیٰ شریف میں آپ ﷺ نے دوبارہ خطبہ ارشاد فرمایا، اور کہا: "اَلَا هَلْ بَلَّغتُ"۔ خبردار! ٹھیک بتاؤ، کیا میں نے پہنچادیا؟ حاضرین نے بیک زبان جواب دیا: "نَعَمْ قَدْ بَلَّغتَ" ہاں! آپ نے اللہ کا حکم پہنچادیا۔

پھر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا: "اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ"۔ اے اللہ! تو گواہ ہوجا! پھر ساتھ ہی فرمایا: "فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ"۔ جو حاضر ہو وہ یہ پیغام غائب کو پہنچادے۔ [بخاري]

قرآن مجید کی تصریح سے معلوم ہوا کہ اللہ جل شانہ نے سرور عالم نبی اکرم ﷺ کو حکم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی آپ کی طرف نازل فرمایا ہے وہ سب پہنچادیجئے، اور آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی ایسی تعمیل کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا کہ بتاؤ کیا میں نے اللہ تعالیٰ کی سپرد شدہ امانت پہنچادی؟ سب نے ایک زبان ہوکر جواب دیا کہ ہاں! آپ نے پہنچادی، اور حق ادا کیا، اور سب نے وعدہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور ہم سب گواہی دیں گے کہ آپ نے سب کچھ پہنچادیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جو کوئی شخص تم میں سے یہ بیان کرے سید الانبیاء ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے نازل فرمودہ امور میں سے کچھ بھی چھپایا تو وہ جھوٹا ہے۔ [بخاري مسلم، معالم، ابن كثير، مظهري وغيره]

روافض شیعوں کا حضور پرنور ﷺ پر تہمت اور افتراء:

روافض گرزند طعنہ بہ یار غار پیغمبر ☆ مکن عیبش کہ اولعنت زمیراث پدر دارد

(احمد علی)

یہ تو قرآن وحدیث کی تصریحات ہیں، لیکن کچھ منکرینِ رسالت ایسے ہیں جن کا یہ جاہلانہ اور کافرانہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو حکم دیا تھا کہ اپنے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان فرمادیں، لیکن آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ڈر سے اعلان نہیں فرمایا، ان لوگوں کا بے سروپا جھوٹا دعویٰ ہے، اور صاحب اہلِ بیت ﷺ کے بارے میں یہ غلط عقیدہ رکھتے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کیا، اور اللہ تعالیٰ کا صحیح حکم نہیں پہنچایا۔

یہ لوگ صرف چار پانچ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مؤمن سمجھتے ہیں، ان کے علاوہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کافر کہتے ہیں، اور حضرت جبریل امین علیہ السلام کو وحی پہنچانے کے سلسلہ میں خائن سمجھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس سے غلطی ہوسکتی ہے، اور اس سے علم غیب کی نفی کرتے ہیں، یعنی "بدا" اور قرآن مجید کی تحریف کا

عقیدہ بھی رکھتے ہیں، اور موجودہ قرآن کو تسلیم بھی نہیں کرتے، اور کہتے ہیں کہ اصل قرآن ایک غار میں چھپا ہوا ہے، جس میں سترہ ہزار آیتیں ہیں، وہ غار "سُرَّ مَنْ رَّای" ہے، جو عراق میں ہے، اور وہ ابوطالب کو نبی تسلیم کرتے ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کبھی خدا کہتے ہیں، کبھی پیغمبر، اور ان کی موت کے قائل نہیں۔ بارش میں گرج کی آواز کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آواز کہتے ہیں، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو "امین" بھی تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں بہت گندے عقائد رکھتے ہیں، تو یہ ایک عجیب دھوکہ اور فریب ہے کہ اہلِ بیت سے محبت ہو، اور جس ذات والا صفات کی وجہ سے اہلِ بیت سے محبت ہوئی اس کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ منصب رسالت کی ذمہ داری اس نے پوری نہیں کی (العیاذ باللہ)۔ یہ کتنے اور کیسے خرافات ہیں؟

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے یہ عقیدہ ایک کافر مجاہر کا شاید ہوسکتا ہے، مگر کسی مدعی ایمان کا نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی کا یہی عقیدہ ہو تو وہ بالاتفاق کافر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی مخلوق سے ڈر جائیں، اور احکامِ الٰہیہ کو چھپائیں، اور ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ [الحجر: ۹۴] (لہٰذا جس بات کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے اسے علی الاعلان لوگوں کو سنادو) کی خلاف ورزی کریں، تو پھر کون حق قائم کرے گا؟

حیرت ہے ان لوگوں پر کہ جس رسول کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا، اور: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ فرماکر حفاظت کی ضمانت دیدی، اس رسول کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ڈر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا حکم چھپایا، اور پھر ایسے دو شخصوں کا نام لیتے ہیں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تن من دھن سب کچھ قربان کیا، اور پوری زندگی اطاعت وخدمت گزاری میں صرف کی، پوری جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ان کی خدمات، فرمانبرداری اور قربانی ضرب المثل ہے، انہوں نے زندگی بھر ایک ادنیٰ ذرّہ جتنا خلافِ نبوت کوئی کام انجام نہ دیا، اور خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کے جنّتی ہونے کا اعلان ہوا، اور ان کی مقدس پاکیزہ بیٹیوں سے اللہ تعالیٰ کے حکم وفرمان کے ساتھ نکاح کیا، اور ان دونوں کو اپنا وزیر بنایا، اور انہیں اپنی خواب گاہ قبر شریف میں رفیق بنایا، اور مرض وفات میں پوری جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کو وصیت کی کہ میرے بعد ہر بات میں ان دونوں کی اقتدا وتابعداری کرو، وغیرہ۔

ع بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی ست

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا، اس وعدہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو

بھروسہ نہیں تھا (العیاذ باللہ)۔ ایک ادنیٰ مؤمن بھی اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ رکھتا ہے، کیا یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو سچ نہ سمجھا ہو، اور لوگوں سے ڈرتا ہو؟

اور پھر عجیب بات ہے کہ جن کی خلافتِ بلا فصل کے یہ لوگ مدعی ہیں جب چھبیس (۲۶) سال کے بعد انہیں خلافت ملی تو انہوں نے تو یہ نہ کہا کہ میں خلیفہ بلا فصل تھا، مجھ سے خلافت چھین لی گئی، یہ ان کے مدعی سست گواہ چست حمایتی (یعنی شیعہ) ان کو بھی مطعون کرتے ہیں کہ باوجود شجاع و بہادر ہونے کے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے ڈرتے رہے، اور ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے، اور ان کے مشوروں اور محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔

اللہ تعالیٰ ان جھوٹے حمایتیوں کے عقائد اور مکائد اور کافرانہ خیالات وخرافات سے عالم اسلام کو محفوظ رکھے۔ ولقد صدق اللہ تعالٰی حیث قال:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَٰفِرِينَ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت کی راہ نہ دکھائے گا۔

قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا۟ التَّوْرَىٰةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَٰنًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَٰفِرِينَ ۞ إِنَّ الَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَالَّذِينَ هَادُوا۟ وَالصَّٰبِـُٔونَ وَالنَّصَٰرَىٰ مَنْ ءَامَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْءَاخِرِ وَعَمِلَ صَٰلِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۞

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب! تم کسی راہ پر نہیں ہو، یہاں تک کہ توریت کو اور انجیل کو اور اس چیز کو قائم کرو جو تمہارے ربّ کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے، اور ضرور ضرور ان میں سے بہت سوں کی سرکشی کو اور کفر کو وہ مضمون زیادہ کردے گا جو آپ کی طرف نازل کیا گیا، سو آپ کافر قوم پر افسوس نہ کیجئے ۞ بیشک جو لوگ ایمان لائے، اور جو لوگ یہودی ہیں، اور فرقہ صابئین اور نصاریٰ ہیں ان میں سے جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، اور اعمالِ صالحہ کرے تو ان پر کوئی خوف نہیں، اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۞

معارف ومنازل

تفسیر درمنثور میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہودی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی

میں حاضر ہوئے، اور کہا: کیا آپ کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ آپ دینِ ابراہیمی پر ہیں؟ اور توریت پر بھی آپ کا ایمان ہے؟ آپ گواہی دیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ہاں! یہ بات درست ہے۔ (ان لوگوں کا مطلب یہ تھا کہ ہم بھی دینِ ابراہیمی پر ہیں، اور آپ کی گواہی کے مطابق توریت بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، لہٰذا ہم حق پر ہوئے)۔

آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ: تم حق پر نہیں ہو، کیونکہ تم نے دینِ ابراہیمی میں اپنے پاس سے بہت سی نئی چیزیں نکالی ہیں، اور توریت میں جو تم سے عہد لیا گیا تھا تم اس کے منکر ہو گئے ہو، اور تمہیں جس چیز کے بیان کرنے کا حکم دیا گیا تھا اسے تم چھپا رہے ہو۔ اس پر انہوں نے کہا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے، ہم اسے مانتے ہیں، اور ہم ہدایت پر ہیں، اور حق پر ہیں، اور ہم آپ پر ایمان نہیں لاتے، اور آپ کا اتباع نہیں کرتے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ﴾ مطلب یہ ہے کہ آپ اہل کتاب سے فرما دیجئے کہ تم کسی ایسے دین پر نہیں ہو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہو، جب تک کہ تم توریت اور انجیل کے احکام اور ارشادات پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہو، اور جب تک کہ اس پر ایمان نہ لاؤ جو تمہارے ربّ کی طرف سے بواسطہ حضرت محمد ﷺ تم پر نازل کیا گیا۔ سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ پر، اور قرآن حکیم پر ایمان لانا توریت اور انجیل کے فرمان کے مطابق لازمی اور فرض ہے۔ فرمایا: ﴿يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ [الأعراف: ١٥٧] (آپ (ﷺ) کو اپنے یہاں لکھا ہوا پاتے ہیں تورات اور انجیل میں)۔

اگر تم نے توریت اور انجیل کے بعض احکام کو مانا، اور بعض کو نہ مانا، تو اس طرح توریت اور انجیل پر بھی تمہارا ایمان نہیں ہے، اور جو تمہارا دعویٰ ہے کہ ہم ہدایت پر ہیں یہ دعویٰ جھوٹ اور غلط ہے۔ اور تم جس دین پر ہو وہ آخری نبی کا انکار کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا:

﴿وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا﴾ کہ یہ لوگ قرآن کریم سے ہدایت لینے والے نہیں، بلکہ قرآن کا نازل ہونا ان کے لئے اور زیادہ سرکشی کرنے اور کفر میں اضافہ و ترقی کرنے کا باعث بنے گا، جیسے کہ ابھی بیان ہوا: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [الإسراء: ٨٢] (اور ہم وہ قرآن نازل کر رہے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت کا

سامان ہے، البتہ ظالموں کے حصے میں اس سے نقصان کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہیں ہوتا)۔

جس طرح ایمان والوں کے ایمان کی ترقی قرآن مجید پر ایمان لانے اور عمل کرنے سے ممکن ہے، اسی طرح قرآن مجید منکرین کے انکار وسرکشی میں زیادتی کا سبب بھی ہے۔ جب یہ لوگ باوجود واضح ہدایات کے سرکشی وگمراہی پر جمے ہوئے مصر ہیں تو اللہ تعالیٰ کے شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے، لہٰذا:

﴿فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ پس آپ کافر قوم پر رنجیدہ نہ ہوں، افسوس نہ کریں، جس نے ایمان قبول نہیں کرنا آپ اس پر رنجیدہ نہ ہوں۔

مدارِ نجات صرف ایمان ہی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـُٔوْنَ مَنْ اٰمَنَ﴾ بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے، اور جو یہودی ہیں، اور جو صابئین ہیں، اور جو نصاریٰ ہیں، ان میں سے جو شخص اخلاص کے ساتھ ایمان لایا، اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر، اور اعمالِ صالحہ کرے تو ان پر قیامت کے دن ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، اور نہ ہی یہ لوگ غمگین ہوں گے۔

یہ مضمون سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ ان تینوں، یعنی یہود ونصاریٰ اور صابئین کا وہاں تعارف بھی ہو چکا۔ آیت کریمہ کا مقصد یہ ہے کہ مدارِ نجات صرف ایمان ہے، اعمال صالحہ کامیابی کے اسباب ہیں، ایمان سے مراد حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا، اور قرآن کریم کی تصدیق کرنا ہے، یہی مدارِ نجات ہے۔

ظاہراً ایمان اور باطناً کفر جسے نفاق کہتے ہیں، یہ مدارِ نجات نہیں۔ اسی طرح یہودیت ونصرانیت اور صابئیت بھی مدارِ نجات نہیں، ان سب کا شمار کفر میں ہے، اور کفر کی کئی اقسام ہیں۔

یہاں ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے مراد ہم نے منافقین لیا۔ اگر اس سے خالص مؤمنین مراد ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون سب کے لئے یکساں برابر ہے، موافق ہو (مؤمن) یا مخالف ہو (یہودی نصرانی، صابی) سب کے لئے مدارِ نجات ایمان ہے اصالۃً، اور اعمالِ صالحہ ہیں تبعاً، جیسے کہ ہر جگہ بیان ہوتا ہے۔ بالفرض اگر ایمان کے ساتھ عملِ صالح نہ بھی ہو تب بھی اکیلا ایمان بھی مدارِ نجات ہے۔ وَعَلَيْهِ الْجُمْهُوْرُ وَ اللّٰهُ تَعَالٰى يَقْبَلُ الْإِيْمَانَ بِدُوْنِ الْعَمَلِ وَلَا يَقْبَلُ الْعَمَلَ بِدُوْنِ الْإِيْمَانِ وَهُوَ الْحَقُّ۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِیْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِیْقًا یَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَحَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

ترجمہ: بلا شبہ ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا، اور ان کی طرف ہم نے رسول بھیجے، جب بھی کوئی رسول ان کے پاس ایسا حکم لے کر آیا جو ان کی خواہشوں کے مطابق نہیں تھا، تو انہوں نے نبیوں کی ایک جماعت کو جھٹلا دیا، اور ایک جماعت کو قتل کر دیا﴿۷۰﴾ اور انہوں نے گمان کیا کہ کچھ بھی فتنہ نہ ہوگا پھر وہ اندھے اور بہرے ہو گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر توجہ فرمائی، پھر ان میں سے بہت سے لوگ اندھے اور بہرے ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ ان کاموں کو دیکھتا ہے جن کو وہ کرتے ہیں﴿۷۱﴾

معارف ومنازل

بنی اسرائیل کی عہد شکنی، اور عذابِ الٰہی کا نزول:

ایمان باللہ ایک پختہ عہد و میثاق کا نام ہے، جب کوئی شخص ایمان قبول کرتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم پر چلنے کا پابند ہوتا ہے، خواہ وہ حکم کسی بھی نوعیت کا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ بنی اسرائیل کی طرح میٹھے حکموں کو ماننا، اور کڑوے حکموں سے دور بھاگنا ہو۔ یہ اہلِ کتاب بجائے خدا پرستی کے نفس پرست ہوتے تھے، یہی وجہ تھی جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ: جاؤ تم اور تمہارے خدا کافروں سے لڑو، ہم نہیں لڑتے، خواہ مخواہ اپنی جانوں کو خطرہ میں کیوں ڈالیں؟

یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس جب کوئی رسول کوئی حکم لاتا جو ان کے مزاج کے مطابق نہ ہوتا، تو عہد و پیمان توڑ کر خدا اور رسول سے غداری کرتے پھرتے، اللہ کے حکموں کو نہ مانے اندھے بہرے ہو گئے، جب کوئی نبی آیا تو پھر اندھے بہرے ہو گئے، اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں میں سے کسی کو جھٹلایا، کسی کو قتل کیا، یہ تو ان کے ایمان باللہ کا حال تھا، نہ عملِ صالح پر اور نہ ہی آخرت پر ان کا صحیح رجحان رہا، شتر بے مہار ہو کر خواہشات پوری کرتے رہے۔

ادھر سے ان کے احبار و رہبان نے توریت میں تحریفات کر کے ان کے مذاق کے مسائل ترتیب دے کر سخت سخت احکام کو جو نفس پر شاق تھے کتابِ الٰہی سے نکالتے رہے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ

رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ [البقرة:۸۷] (پھر یہ آخر کیا معاملہ ہے کہ جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس کوئی ایسی بات لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہشات کو پسند نہیں تھی، تو تم اکڑ گئے؟ چنانچہ بعض (انبیاء) کو تم نے جھٹلایا، اور بعض کو قتل کرتے رہے)۔

یہ تمام احکامِ الٰہی متروک ہو گئے، اور خیالی اعمال پر گزارہ کرتے رہے، اور مسلسل اندھے بہرے رہے، حتّٰی کہ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر جیسے ظالم کو ان پر مسلط فرمایا۔ اس ظالم نے انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا، ہزاروں کی تعداد میں مر گئے، اور لاکھوں کی تعداد میں قید ہوئے۔ اللہ جانے کتنے زخمی و ناکارہ ہوئے۔ تھوڑی سی تفصیل سورۂ بقرہ حضرت عزیز علیہ السلام کے واقعہ میں لکھ چکے ہیں، وہاں دیکھیں۔

پھر مدّت دراز کے بعد ملوک فارس نے بخت نصر کی قید و ذلّت و رسوائی سے انہیں چھڑا کر بابل سے بیت المقدس کو لوٹا دیا۔ پھر انہوں نے توبہ کی، اور اصلاحِ حال کی طرف متوجہ ہوئے، اللہ تعالیٰ نے معافی دے دی، مگر کچھ وقت کے بعد پھر سے اندھے بہرے ہوئے، اور انبیاء کرام علیہم السّلام کے ساتھ زیادتیاں شروع کیں، حتّٰی کہ کثرت سے فسق و فجور اور زناکاریوں میں لگ گئے۔ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السّلام کو شہید کیا، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے ان کے قتل کے منصوبے بنائے، جو ناکام ہوئے۔

۞ ۞ ۞

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۭ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

ترجمہ: بلاشبہ وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے یوں کہا کہ: اللہ تعالیٰ ہی مسیح بن مریم ہے، حالانکہ مسیح نے کہا

ہے کہ: اے بنی اسرائیل! تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا ربّ ہے۔ اور تمہارا ربّ ہے، بلاشبہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے تو اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کردی، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ﴿۷۲﴾ بلاشبہ وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ: اللہ تعالیٰ تین معبودوں میں سے ایک معبود ہے، حالانکہ ایک معبود کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اور اگر اس بات سے باز نہ آئے جو وہ کہتے ہیں تو ضرور ضرور ان لوگوں کو جو ان میں کفر ہی پر جمے رہیں دردناک عذاب پہنچ جائے گا ﴿۷۳﴾ کیا وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں توبہ نہیں کرتے؟ اور اس سے مغفرت نہیں چاہتے؟ اور اللہ تعالیٰ غفور ہے، رحیم ہے ﴿۷۴﴾ نہیں ہے مسیح بن مریم مگر ایک رسول، ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، اور ان کی ماں صدیقہ اور سچی ہیں، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھ لیجئے! ہم کیسے ان کے لئے دلائل بیان کرتے ہیں؟ پھر دیکھئے کہ وہ لوگ کہاں اُلٹے جا رہے ہیں؟ ﴿۷۵﴾ آپ فرما دیجئے: کیا تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے ضرر اور نفع کا اختیار نہیں رکھتے؟ اور اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے ﴿۷٦﴾

معارف منازل

نصاریٰ کے فرقہ یعقوبیہ کا رد:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ آیت کریمہ میں نصاریٰ کے فرقہ یعقوبیہ کے مشہور باطل عقیدہ کی تردید اور ابطال ہے۔ نصاریٰ کا فرقہ ملکانیہ بھی یہی عقیدہ رکھتا ہے۔ یہ لوگ حلول کے قائل ہیں، جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کر گیا ہے۔ (یہی عقیدہ شیعوں کے فرقہ اسماعیلی آغا خانیوں کا بھی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے ائمہ میں حلول کا عقیدہ رکھتے ہیں) یعنی اللہ تعالیٰ بعینہٖ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود بنی اسرائیل سے کہہ چکے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، جیسے کہ سورۂ مریم میں انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، جو میرا اور تمہارا سب کا معبود و پروردگار ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت میں کسی غیر کو شریک بنائے گا جنت ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہے، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور ایسے مشرکوں کا قیامت کے دن کوئی دستگیر و مددگار نہ ہوگا۔

پھر فرمایا: بلاشبہ وہ لوگ کافر ہوئے، جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین معبودوں میں سے ایک معبود ہے۔ یہ نصاریٰ کے تیسرے فرقہ مرقوسیہ کا عقیدہ ہے۔ ان کا موجودہ نام رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ ہے۔ یہ لوگ عقیدۂ

تثلیث کے قائل ہیں، اور کہتے ہیں کہ خدا تین ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت تینوں میں مشترک ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، عیسیٰ اور مریم میں۔ اور بعض کے نزدیک بجائے مریم علیہاالسلام کے حضرت روح القدس جبیریل علیہ السلام ہے۔ یہ لوگ اُلوہیت کے اشتراک کی اس طرح توجیہہ کرتے ہیں، کہ تین اقانیم ہیں: باپ، بیٹا، روح القدس۔ یعنی روح، حیات اور یہ تینوں مل کر ایک معبود ہیں، اور یہ تینوں علٰحدہ علٰحدہ بھی معبود ہیں۔

اور کبھی کہتے ہیں: ایک تین ہے، اور تین ایک۔ بقول ان کے یہ متشابہات میں شمار ہے، پھر اس کی مثال یوں دیتے ہیں جس طرح ''آفتاب'' آفتاب کی ٹکیہ اور شعاع اور حرارت سب کے مجموعہ کا نام آفتاب ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی تینوں اقانیم کے مجموعہ کا نام ہے: (۱) ذات۔ (۲) کلمہ۔ (۳) حیات۔ ان تینوں کے مجموعہ کا نام ''إلٰـه''۔ پس باپ ''إلٰـه'' اور ''کلمة الله'' بیٹا اِلٰہ اور رُوح یعنی حیات ''إلٰـه''۔ ان تینوں کا مجموعہ ''إلٰـه''۔ [تفسیر خازن]

بہر حال! یہ عقائد سارے کفر اور شرک ہیں، یہ عقل ونقل دونوں کے ساتھ متصادم ہیں، خالق کا مخلوق میں حلول ماننا اور اتحاد کا قائل ہونا بہت بڑی گمراہی ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ اسی شخصیت کو خدا بتارہے ہیں جس نے واضح طور پر قوم کو سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، جو ہم سب کا ربّ ہے، اور وہ خود کو بار بار اللہ تعالیٰ کا بندہ اور رسول بتارہا ہے، تو فرمایا:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ﴾ پھر فرمایا: ﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ پھر فرمایا: ﴿وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ﴾ اگر یہ لوگ اپنے اس باطل قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے جو لوگ کفر پر جمے رہیں گے ان کے لئے دردناک عذاب ہے، اور جو لوگ توبہ کرلیں گے، اور ایمان لے آئیں گے وہ عذاب سے بچ جائیں گے۔ پھر فرمایا:

﴿اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ﴾ کیا یہ اپنے عقائدِ باطلہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں توبہ نہیں کرتے؟ اور اس سے مغفرت نہیں مانگتے؟ یعنی انہیں کفریہ عقائد پر مسلسل اصرار ہے، اگر یہ کفر پر اصرار چھوڑ دیں اور توبہ کرکے ایمان لائیں، اور گزشتہ گناہوں پر استغفار کرلیں، تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، ان کی مغفرت فرمادے گا۔ آگے ارشاد ہے:

﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ مسیح بن مریم صرف رسول ہیں، نہ اور کچھ، رسول اس کو کہتے ہیں جو منصب نبوت پر فائز ہو، جس کا انتخاب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنی

مخلوق کی ہدایت کے لئے اسے پیغام دے کر مبعوث فرماتا ہے، اس کی حیثیت ایک خدائی پیغام رساں قاصد کی ہے، نہ اور کچھ، پس پیغام لانے والا کس طرح پیغام بھیجنے والے کا عین ہوسکتا ہے؟ اور پیغام بھیجنے والے کی خدائی میں کیسے شریک ہوسکتا ہے؟

اس سے پہلے جتنے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے وہ سارے اللہ تعالیٰ کے بندے اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرح رسول تھے، اور خدا کی اُلوہیت میں شریک نہیں تھے، ایسے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں۔ مطلب یہ کہ سارے انبیاء علیہم السلام بندہ اور رسول ہی ہوا کرتے ہیں، ان میں اُلوہیت کا تصور ان کے منصب و مرتبہ کے خلاف ہے۔

﴿وَأُمُّهٗ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ ان کی والدہ عابدہ زاہدہ صادقہ صدیقہ تھیں۔ ﴿وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ﴾ [التحریم: ۱۲] (اور انہوں نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی، اور وہ طاعت شعار لوگوں میں شامل تھیں)۔

صدق اور تصدیق، زہد و عبادت یہ سب بندوں کے اوصاف اور بلند اور اونچے کمالات ہیں، ان کمالاتِ عالیہ کی وجہ سے کوئی مرد یا عورت معبود نہیں بن سکتا، اور نہ کوئی شخص بغیر باپ کے پیدا ہو جانے سے عبادت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مستحق عبادت نہیں، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام مستحق عبادت نہیں، وہ تو بغیر ماں اور باپ کے پیدا ہوئے تھے، اور سارے فرشتے نفوس قدسیہ طیبہ جو ماں باپ کے بغیر پیدا کئے گئے ہیں۔

لطف یہ کہ مخلوقیت میں جو عجز و ضعف اور احتیاج ہے وہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ کوئی عاجز مخلوق مستحق عبادت ہو اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام معجزات کی وجہ سے بھی معبود نہیں ہوسکتے، ان کے علاوہ دیگر انبیاء علیہم السلام سے معجزات صادر ہوئے تھے، ان سے یا کسی دیگر نبی کے ہاتھ سے معجزہ اگر صادر ہوا، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا، جس کو "بِاِذْنِ اللّٰهِ" بتا کر سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ کے آخر میں بیان فرمایا ہے، پس معجزات انبیاء اکرام علیہم السلام کے اختیار میں نہیں، اور نبوت کی صداقت پر دلیل ہیں، نہ کہ کسی اُلوہیت پر۔

ہمارے سردار انبیاء (فِدَاهُ اَزْوَاحِنَا) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتنے بکثرت معجزات ہیں کہ سوا لاکھ پیغمبروں کے معجزات ایک طرف اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات سب سے زیادہ ہیں، ایک شخص خدمت گرامی میں حاضر ہوا، اور کہا: "مَاشَاءَ اللّٰهُ! وَشِئْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ"۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناراض ہو کر اسے جھڑک دیا، اور فرمایا: "اَتَجْعَلُنِىْ لِلّٰهِ نِدًّا؟" کیا تو نے اللہ تعالیٰ کی مشیت میں مجھے شریک کیا؟ خبردار! آئندہ ایسا نہ کرنا، جو کہ شرک ہے،

پس صرف ''ماشاء اللہ'' ہی کہا کرو، فقط۔ [مشکوٰۃ]

پھر ارشاد فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کھانا کھاتے تھے، جو کوئی عاجز و درماندہ ہو، کھانے پینے، لباس پہننے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہوا دھوپ، سردی، گرمی، علاج معالجہ، موت و حیات وغیرہ چیزوں کا محتاج ہو وہ کیسے معبود بن سکتا ہے؟ معبود کا مقام اتنا اونچا ہوتا ہے جسے مخلوقات پر قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا، وہ مخلوقیت کی تمام صفات و علامات سے بلند و بالا منزہ پاک ہوتا ہے، یہاں تک کہ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾[الشوریٰ:١١] (اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں)۔ وہ کسی مخلوق کی طرح نہیں ہوتا، اور نہ کوئی مخلوق اس کی طرح ہو سکتی ہے، اس تک کسی بھی مخلوق کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ جَلَّ شَانُهٗ وَعَزَّ بُرْهَانُهٗ وَعَمَّ سُلْطَانُهٗ

معبود تو وہ ہے کہ سارا جہاں اس کا محتاج ہو، اور وہ کسی چیز کا محتاج نہیں، وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور جو دوسروں کا محتاج ہو، اور جسے روٹی پانی وغیرہ کی ضرورت و احتیاج ہو وہ معبود نہیں ہو سکتا، ارشاد ہوا:

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ﴾ آپ دیکھ لیجئے ہم ان کے لئے کس طرح دلائل و آیات بیان کرتے ہیں۔ طرح طرح سے سمجھاتے ہیں، دلائل پیش کرتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ اپنے عقائد شرکیہ سے باز نہیں آتے۔

﴿ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴾ پھر دیکھ لیجئے وہ کس طرح ہٹائے جا رہے ہیں؟ حق و صداقت کو چھوڑ کر باطل کی طرف جا رہے ہیں، روشنی و ہدایت کو چھوڑ کر ظلمت و ضلالت میں گر رہے ہیں۔ فرمایا:

﴿قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ آپ فرما دیجئے: کیا تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے لئے ضرر اور نفع کا مالک نہیں؟ یہ نصاریٰ کو خطاب ہے، لیکن الفاظ کا عموم قیامت تک آنے والے سارے انسانوں کو شامل ہے، جو کوئی اپنے نفع و نقصان کا مالک نہ ہو وہ تمہیں کیا فائدہ پہنچائے؟ اور جو تمہارے ضرر و نفع کا مالک نہ ہو وہ کیسے معبود بن جائے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہو یا ان کی والدہ ہو، یا ان کے علاوہ مخلوق میں سے کوئی بھی شخصیت ہو، نبی ہو یا ولی غوث قطب ہو، کوئی بھی کسی کے لئے نفع نقصان کا مالک نہیں، تو پتھروں کے تراشیدہ بت کیسے نفع و نقصان کے مالک ہوں گے؟

پس جو ضرر و نفع کا مالک ہے اسے چھوڑ کر غیروں کی عبادت کرنا سراسر کفر ہے، اور خلاف عقل بھی ہے۔ سورۃ یونس میں فرمایا: ﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [یونس:١٠٦] (اور مت پکار اس کو جو تجھے نہ نفع دے نہ ضرر دے، سو اگر تو ایسا کرے تو اس وقت تو ظالموں میں ہو

جائے گا)۔ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے، وہ ہر جہری اور سری آوازوں کو سنتا ہے، بلکہ قلبی ارادوں کو سنتا ہے، دل کی آواز ہو یا حرکتِ قلب ہو، وہ سب کو سنتا اور جانتا ہے، وہ اسی کے مطابق جزا وسزا دیتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ساتوں سمندروں کی تہ میں چلنے والی چیونٹی کے پاؤں کی آواز بھی سنتا ہے۔ سبحان اللہ

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے: اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں ناحق کا غلو نہ کرو، اوران لوگوں کی خواہشات کا تباع نہ کرو جو پہلے گمراہ ہو چکے ہیں، اور انہوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا، اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے (بہک گئے) ﴿۷۷﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں یہود ونصاریٰ دونوں کو خطاب ہے، اور ناحق غلو کے دونوں رخ ممنوع قرار دیئے گئے۔ یہود نے تفریط سے کام لیتے ہوئے انبیاء علیہم السلام کو اس قدر حقیر سمجھا کہ ان کو جھٹلانے اور قتل کرنے سے بھی نہ شرمائے ﴿فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ز وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ [البقرة:۸۷] (بعض کو تم نے جھٹلایا، اور بعض کو قتل کر دیا)۔ اور نصاریٰ نے اِفراط سے کام لیتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی تخت پر جا بٹھلایا، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ [التوبة:۳۰] (یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے)۔

اہلِ عرب کا مشہور مقولہ ہے: "اَلْجَاهِلُ اِمَّا مُفْرِطٌ اَوْ مُفَرِّطٌ"۔ یعنی جاہل یا اِفراط میں مبتلا ہوتا ہے، یا تفریط میں، اُسے اعتدال ومیانہ روی پسند نہیں ہوتا، یہی اہلِ کتاب جہلاء جنہوں نے پیغمبروں علیہم السلام کو ان کے بلند منصب سے گرا کر ان کی تکذیب کی، یا انہیں قتل کیا، یا دوسرے رخ پر چل کر انہیں معبود اور اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا۔

غلو کا اطلاق اِفراط اور تفریط دونوں پر ہوتا ہے، جبکہ صحیح مقام اعتدال کا ہے، جس کو قرآن حکیم نے وسط سے تعبیر فرمایا: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ [البقرة: ۱۴۳] (اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانہ امت بنایا)۔ جو کام اِفراط یا تفریط کا شکار ہوگا اس کا انجام برا اور تباہ کن ہوگا، جبکہ اعتدال اور میانہ روی کارآمد اور فائدہ مند ہوگا، اور اس کا انجام بھی بہتر ہوگا۔

امورِ دینیہ میں غلو نہایت تباہ کن ہے:

یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والی اور چلانے والی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، اور اس کی مخلوق میں سب سے برگزیدہ اور برتر اور بہتر اشرف المخلوقات انسان ہے، جس کو اس کی مرضیات پر چلنے اور غیر مرضیات سے بچنے کا پابند بنایا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات کیسے اور کس طرح معلوم ہوں؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے دو (۲) ذریعے مقرر فرمادیئے: ایک اپنی کتابیں جن میں ہر قسم کی ہدایات اور قوانین ہیں۔ دوسرے انبیاء و رسل کرام علیہم السلام۔ دراصل کتاب اللہ کی صحیح مرادات و مطالب ''رجال اللہ'' کی معرفت ہی سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ اور فطری طور پر انسان کا مُصلِح و مُرَبِّي اور معلم انسان ہی ہوسکتا ہے۔ انبیاء و رسل علیہم السلام کے بعد ان کے نائبین علماء و مشائخ ان کے نقش قدم پر چل کر اصلاح و تربیت کا کام بحسن وخوبی انجام دیتے رہے ہیں۔

دنیا میں ''رجال اللہ'' سے متعلق اِفراط و تفریط کی گمراہیاں ہمیشہ پھیلتی رہی ہیں، ایک طرف جاہلوں نے انبیاء کرام علیہم السلام اور مرشدوں کو بھی خدائی صفات کا حامل قرار دے دیا، اور پیر و مرشد پرستی اور قبر و مزارات پرستی تک نوبت پہنچ گئی، اور دوسری طرف انہی ناعاقبت اندیشوں نے حد درجہ حقیر سمجھ کر انہیں ان کے مقام سے نیچے گرادیا، اور ان میں اور عام انسانوں میں کوئی فرق ہی نہیں رکھا گیا۔

مختلف مذاہب میں جتنے فرقے پیدا ہوتے رہے وہ سب اسی ایک غلطی کی پیداوار ہیں، اس لئے ان آیات میں رسولوں علیہم السلام کی توہین کرنے والوں کو جس طرح کافر کہا گیا اسی طرح ان کو حدود سے بڑھا کر خدائی درجہ تک پہنچانے والوں کو بھی کافر کہا گیا۔ آیت کریمہ میں ''غلو ناحق'' کو جمہور مفسرین نے تاکید پر محمول کیا ہے، کیونکہ غلو فی الدین ہمیشہ ناحق ہی ہوا کرتا ہے۔

غُلو فی الدین چونکہ تباہ کن اور سراسر گمراہی ہے اس لئے فرمایا:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَاۗءَ قَوْمٍ﴾ اور یہ غلو صرف نفسانی اور شیطانی خواہشات کی وجہ سے ہوتا ہے، جس میں حق وانصاف کا قطعاً کوئی پہلو نہیں ہوتا، بلکہ مکمل گمراہی اور تباہی اس کا انجام ہوتا ہے، اس لئے سرور عالم ﷺ نے اپنی امت کو سختی سے خبردار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "لَاتُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُهٗ" [بخاري] یعنی تم میری تعریف میں مبالغہ نہ کرنا، جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا، میں تو بس اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، میرے بارے میں یوں کہو کہ: اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔

کہاں آپ ﷺ کی یہ زرّین ہدایات اور کہاں نصاریٰ کے نقش قدم پر چلنے والے اہلِ بدعت؟ ادھر سے سرور عالم ﷺ کی تنبیہ کو دیکھیں، ادھر سے ان بدعتیوں کو دیکھ لیں، جو آنحضرت سرور عالم ﷺ کو تمام خدائی اختیارات سونپ دیئے جانے کا عقیدہ رکھتے ہیں، اور آپ ﷺ کی توہین کرتے ہوئے آپ ﷺ کو مختارِکُل کا لقب دیتے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ خدائی اختیارات کے مکمل مالک ہیں، (العیاذ باللہ)۔

یہی نصاریٰ کا عقیدہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق، جسے قرآن کریم نے بدترین کفر سے تعبیر فرمایا۔

اس کے علاوہ قرآن کریم کی تصریحات کے باوجود آپ ﷺ کی بشریت کے منکر ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ اس عقیدہ کی وجہ سے ہم رسول پاک ﷺ سے بہت بڑی محبت کرنے والے بن گئے، سورۃ الاسراء میں ارشاد ہے: ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ [الإسراء:۹۳] (آپ فرما دیجئے کہ: میرا ربّ پاک ہے، میں نہیں ہوں مگر ایک بشر رسول)۔

ایک عالم نما جاہل نے تو غضب ہی کر دیا، سورۂ کہف کی آیت: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ [الکھف: ۱۱۰] (کہہ دیں: بیشک میں تمہاری طرح بشر ہی ہوں) کے بارے میں کہہ دیا کہ اس میں "ما" نافیہ ہے۔ اپنے خیال میں بہت دور کی کوڑی لائی، لیکن انہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ اِنَّ جملہ مثبت کی تحقیق کے لئے آتا ہے، جملہ منفیہ کے لئے نہیں آتا۔ صحیح بخاری میں متعدد مقامات میں یہ حدیث مذکور ہے: "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ" کہ میں ایک بشر ہی ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے فرمایا کہ آپ اپنے بارے میں اعلان کر دیں کہ میں تمہارے جیسا بشر ہوں، لیکن بے مقصد محبت کے دعوے دار کہتے ہیں کہ نہیں آپ ﷺ بشر نہیں تھے۔

یہ عجیب قسم کی محبت ہے کہ کہیں غلو کی وجہ سے شیعوں کو ہلاک کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کہ اسے معبود

کہتے رہے، اور کہیں مشرک بدعتیوں کا بیڑا غرق کر دیا۔ اعلیٰ حضرت نے کہا: شریعت کا ڈر ہے نہیں صاف کہہ دوں خدا خود رسول خدا بن کے آیا ہے۔

اسلام میں پیوند لگا لگا کر جس طرح اہل کتاب نے اپنے دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا، اسی طرح اہل بدعت نے سنتوں کی جگہ بدعتوں کی ترویج کر کے پوری شریعت کو مشکوک و متنازعہ بنا دیا۔ ان کے مجتہد کبھی یہ بھی کہتے ہیں: "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ" کا مطلب یہ ہے کہ میں ظاہر میں بشر ہوں۔ یہ لفظ ظاہراً اپنی طرف سے بڑھا دیا، ان لوگوں کے نزدیک قرآن میں تحریف ہو جائے تو کچھ حرج نہیں، مگر ان کی بات کی بیچ باقی رہے (العیاذ باللہ)۔

شروع میں مسیحیوں کو جس چیز نے گمراہ کیا وہ محبت و عقیدت کا غلو تھا، اسی کے نتیجہ میں ابن مریم کو اِبْنُ اللّٰہِ، اور ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ کے الفاظ استعمال ہوئے، اور کفّارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ ہمارے زمانہ کے اہلِ بدعت اسی مسیحی عقیدہ اور خیالات کی پیداوار ہیں، اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ
بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا
كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ
لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ: بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کافر تھے وہ ملعون ہوئے داؤد کی زبان پر اور عیسیٰ بن مریم کی زبان پر، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی، اور وہ زیادتی کرتے تھے ۝ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو برے کام سے نہیں روکتے تھے جو انہوں نے کیا، واقعۃً برے تھے وہ افعال جو وہ کرتے تھے ۝ تو ان میں سے بہت سوں کو دیکھے گا کہ ان لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا، واقعۃً برے ہیں وہ افعال جو ان کی جانوں نے آگے بھیجے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان پر ناراض ہوا، اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں ۝ اور اگر وہ ایمان لاتے اللہ تعالیٰ پر اور نبی پر اور اس پر جو اتارا گیا ہے نبی کی طرف تو کافروں کو دوست نہ بناتے، لیکن بہت سے لوگ ان میں سے

فرمانبرداری سے خارج ہیں (یعنی فاسق ہیں)۝۸۱

معارف ومنازل

درختے کہ اکنون گرفت ست پا ☆ بہ نیروئے شخصے بر آردز جا
دگر ہمچنان روز گارش ہلی ☆ بہ گردونش از بیخ برنگسلی (سعدی)

کسی قوم کا بگاڑ چند افراد ہی سے شروع ہوتا ہے، اگر قوم کا ضمیر زندہ ہو اور انہیں ابتداء ہی میں قابو میں کیا جائے، اور خرابی آگے نہ بڑھنے دی جائے تو قوم بحیثیت مجموعی بگڑنے سے محفوظ رہتی ہے، اور خرابی دب کر ختم ہو جاتی ہے، لیکن اگر بگڑنے والے افراد کو چھٹی اور ڈھیل دے دی جائے، اور انہیں من مانی کرنے اور کھیل کھیلنے کا موقع دے دیا جائے، تو رفتہ رفتہ یہ خرابی جڑ پکڑ کر بہت مضبوط ہو جاتی ہے، اور آئے دن مضبوط ومحکم ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ پوری قوم اسی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے، اور مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔قوم بنی اسرائیل کی تباہی اسی طرح ہوئی۔

آیات بالا میں ان کی ملعونیت اور مغضوبیت اور بداعمالیوں کا تذکرہ ہے، ان بداعمالیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو گناہوں سے منع نہیں کرتے تھے۔تفسیر ابن کثیر میں مسند احمد سے نقل کیا ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: بنی اسرائیل جب گناہوں میں پڑ گئے تو ان کے علماء نے ان کو منع کیا، وہ لوگ گناہوں سے باز نہ آئے، پھر یہ منع کرنے والے ان کے ساتھ مجلسوں میں اٹھتے بیٹھتے رہے، اور ان کے ساتھ کھاتے پیتے رہے، اور اس میل جول اور تعلق کی وجہ سے انہوں نے گناہوں سے روکنا چھوڑ دیا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بعض کے دلوں کو بعض پر مار دیا، یعنی یکساں کر دیا، اور ان کو حضرت داؤد، حضرت عیسیٰ بن مریم علیہم السلام کی زبانی ملعون کر دیا، ان دونوں پیغمبروں نے خصوصیت کے ساتھ ان پر لعنت کی، اور انہیں ملعون قرار دیا، پھر آپ ﷺ نے:

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ تلاوت فرمائی۔اس موقع پر آپ ﷺ تکیہ لگائے بیٹھے تھے، آپ ﷺ تکیہ چھوڑ کر بیٹھ گئے، اور ارشاد فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم اپنی ذمہ داری سے اس وقت تک سبکدوش نہ ہو گے جب تک گناہ کرنے والوں کو گناہ سے منع کر کے حق پر نہ لاؤ گے۔ [ابن کثیر]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ سب سے پہلے جو بنی اسرائیل میں نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے سے ملاقات کرتا تھا، اور اسے گناہ پر دیکھتا تھا، تو کہتا

تھا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور یہ کام چھوڑ دو، کیونکہ یہ تیرے لئے جائز نہیں ہے، پھر کل کو اسی آدمی سے ملاقات کرتا، اور اسے گناہ میں مشغول پاتا تو اسے دوبارہ منع نہ کرتا تھا، کیونکہ اس کا اس کے ساتھ کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے میں شرکت کرنے والا آدمی ہوتا تھا، سو جب انہوں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب کو آپس میں ایک دوسرے پر مار دیا، یعنی یکساں بنا دیا، پھر آپ ﷺ نے آیت بالا: ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے فٰسِقُوْنَ﴾ تک تلاوت فرمائی۔

پھر فرمایا: اچھی طرح خوب سمجھو، اللہ تعالیٰ کی قسم تمہاری یہ ذمہ داری ہے کہ امر بالمعروف کرتے رہو، اور نہی عن المنکر کرتے رہو، اور ظالم کا ہاتھ پکڑتے رہو (یعنی اس کے ہاتھ ظلم سے روکو) اور اسے حق پر جماتے رہو (برائی سے اس کو چھڑا دو)۔ [أبو داؤد]

نیز سنن ابو داؤد میں ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: بلا شبہ جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ عام عذاب لے آئے، جس میں سب لوگ مبتلا ہو جائیں۔

نیز سنن ابو داؤد میں یہ بھی ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جو بھی کوئی شخص کسی قوم میں گناہ کرنے والا ہو، اور جو لوگ وہاں موجود ہوں، قدرت رکھتے ہوئے اس کے حال کو نہ بدلیں، یعنی اس سے گناہ کو نہ چھڑائیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی موت سے پہلے ان پر عذاب عام بھیج دے گا۔ [أبو داؤد، ابن ماجة، ابن کثیر]

یہ نقص جو بنی اسرائیل میں تھا دورِ حاضر کے مسلمانوں میں بھی ہے۔ گناہوں سے روکنے کی قدرت کے باوجود لوگ نہی عن المنکر نہیں کرتے، بلکہ گنہگاروں سے بخوشی ملتے جلتے ہیں، ان سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں، اور تعلقات کشیدہ ہونے کے ڈر سے ان کو گناہ سے نہیں روکتے۔ خالق مالک جل شانہ کا لحاظ نہیں کرتے، اور مخلوق کی ناراضگی کا خیال کرتے ہیں کہ اگر اسے گناہ سے روک دیا تو یہ ناراض ہو جائے گا۔

یاد رکھیں! جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا خیال نہیں کرتے، آخر کار وہ ان ہی گناہگار دوستوں کے ہاتھوں ذلیل بھی ہو جائیں گے، اور مبتلائے عذاب بھی، پس جس عمل نے یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے بے اعتنائی اور لاپرواہی نے جس طرح بنی اسرائیل کو عذاب میں مبتلا کر دیا یہی چیز بعینہٖ ہمارے لئے باعثِ عذاب بن سکتی ہے، بلکہ بن گئی ہے۔ اگر مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہم بنی اسرائیل سے پیچھے نہیں ہیں، اسی وجہ سے اہلِ اسلام دنیا میں عام عذاب وعقاب، بدامنی اور دیگر طرح طرح کی مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔

☆☆☆

مشرکینِ مکہ سے یہودیوں کی دوستی، اور اہلِ اسلام سے دشمنی:

سورۂ نساء میں گزر چکا ہے کہ حسد وعناد اور ضد کی بنیاد پر یہودیوں نے عالمِ اسلام کے ساتھ بغض رکھا، اور کفارِ مکہ کے ساتھ دوستی کی۔ اور جب مشرکینِ مکہ نے یہودیوں کے وفد اور اس کے سربراہ کعب بن اشرف سے پوچھا کہ تم لوگ اہلِ کتاب ہو، تمہارے پاس آسمانی کتاب اور علم ہے، ہمیں صاف بتاؤ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین برحق ہے یا ہمارا دین، جو کہ ہمارے آباء واجداد کا دین ہے؟ اور ہم لوگ کعبۃ اللہ اور حجاج و معتمرین کی خدمت بھی کرتے ہیں، اور ہم ملتِ ابراہیمی کے پیروکار ہیں۔

یہودیوں نے کہا کہ تمہارا دین اصلی اور برحق ہے، اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین کے مقابلے میں تمہارا دین اچھا ہے، حتیٰ کہ یہودیوں کے وفد اور اس کے سربراہ نے مشرکین کی حوصلہ افزائی اور انہیں خوش رکھنے کی خاطر ان کے بُت کا سجدہ کیا، اور اسے سراہا، اور یہودیوں کے وفد نے مشرکینِ مکہ کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں سے جنگ کرنے پر آمادہ کیا، اور انہیں ہر قسم کی مالی امداد اور اسلحہ کی پیش کش بھی کی، حالانکہ وہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق پر جانتے تھے، مگر ضد وعناد نے انہیں جنت کے راستے سے محروم کر کے دوزخ کا ایندھن بنا دیا۔ یہ مضمون تفصیل کے ساتھ سوۂ نساء آیت ۵۱ کے تحت گزر چکا ہے، وہاں دیکھا جائے۔

﴿تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ﴾ تو ان میں بہت سوں کو دیکھے گا کہ وہ کافروں سے دوستی کرتے ہیں۔ البتہ وہ عمل برے ہیں جو انہوں نے اپنے آگے بھیجے، اور وہ اعمال ایسے ہیں، جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوا، اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ پھر فرمایا:

﴿وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ اور اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور اس چیز پر ایمان لاتے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کی گئی، تو کافروں کو دوست نہ بناتے، لیکن ان میں بہت سے وہ ہیں جو نافرمان فاسق ہیں۔ اس میں منافقوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں، سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں، ان کا دعوائے ایمان غلط تھا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں سے کیوں دوستی کرتے؟

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

ترجمہ: تُو اہلِ ایمان کے لئے سب سے زیادہ دشمن یہودیوں اور مشرکین کو پائے گا، اور ضرور بالضرور اہلِ ایمان سے محبت میں سب سے زیادہ قریب تر تو ان لوگوں کو پائے گا جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس وجہ سے کہ ان میں علماء ہیں، اور درویش ہیں (تارک الدنیا فقراء) اور وہ تکبر نہیں کرتے ﴿۸۲﴾

معارف ومنازل

یہ آیت اور اس کے بعد کی چار آیتیں حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں اتری ہیں۔ جب حبشہ کے ملک میں ان کے سامنے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قرآن شریف پڑھا، تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، اور وہ اس قدر روئے کہ ان کی پوری داڑھیاں تر ہو گئیں (لیکن یہ خیال رہے کہ یہ آیتیں مدینہ طیبہ میں اتری ہیں، اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے)۔

یہ بھی مروی ہے کہ یہ آیتیں اس وفد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، جس کو بادشاہ نجاشی نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا، کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن سنیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات وصفات دیکھیں، جب یہ لوگ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات حکیمانہ وحمیدہ کا مطالعہ کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام سنا، اور قرآن کریم کی تلاوت کا ذوق وشوق کے ساتھ ساعت کیا، تو ان کے قلوب نرم ہو گئے، اور زار وقطار رونے لگے، اور انہوں نے اسلام قبول کیا، اور واپس جا کر حضرت نجاشی رحمۃ اللہ علیہ سے سارا واقعہ بیان کیا۔

جب اس خوش قسمت بادشاہ کا حبشہ میں انتقال ہو گیا تو انتقال کے روز شفیع المذنبین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کے انتقال کی خبر دی، اور ان کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی۔ بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ اس وفد میں سات علماء تھے، اور پانچ زاہد تھے، یا پانچ علماء تھے، اور سات زاہد تھے۔ بعض کہتے ہیں: یہ کُل پچاس آدمی تھے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ ساٹھ سے کچھ اوپر تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ ستر لوگ تھے۔ واللہ اعلم [ابن کثیر]

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جن کے اوصاف کا بیان آیت میں ہے یہ اہل حبشہ ہیں، مسلمان

مہاجرین حبشہ جب ان کے پاس پہنچے تو یہ سب مسلمان ہو گئے تھے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلے یہ دین عیسوی پر قائم تھے، لیکن جب انہوں نے مسلمانوں کو دیکھا، اور قرآن کریم سنا، تو سب مسلمان ہو گئے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ ان سب اقوال کو ٹھیک کرتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیتیں ان لوگوں کے بارے میں ہیں جن میں یہ اوصاف ہوں، خواہ وہ حبشہ کے ہوں یا اور کہیں کے۔

یہودیوں کو مسلمانوں سے سخت دشمنی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سرکشی اور انکار و عناد کا مادہ زیادہ ہے، اور وہ جان بوجھ کر کفر کرتے ہیں، اور ضد کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کرتے ہیں، حق والوں کو بری نظر سے دیکھتے ہیں، علم سے کورے اور بیگانہ ہیں، تمام بری خصلتوں کے عادی ہیں، علم اور علماء کی بے قدری کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی، اور ایک بڑی جماعت انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا، اور پیغمبر اسلام سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کئی مواقع پر قتل کی سازشیں کی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زہر دیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا، جس کی تفصیل آخری دو سورتوں (مُعوّذتین) میں آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ابن مردویہ میں ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: جب کبھی کوئی یہودی کسی مسلمان کو تنہائی میں پاتا ہے تو اس کے دل میں اس کے قتل کا ارادہ و عزم پیدا ہوتا ہے۔

آیت کریمہ میں جو نصاریٰ کو اہلِ ایمان کی محبت کے اعتبار سے قریب تر بتایا ہے اس سے تمام نصاریٰ مراد نہیں ہیں، کیونکہ وہ اہلِ اسلام سے دشمنی رکھتے ہیں، وہ یہود اور مشرکین ہی کی طرح ہیں، مسلمانوں کو قتل کرنا اور قید کرنا اور ان کے شہر و آبادی کو تباہ و برباد کرنا، اور ان کی مسجدوں کو گرا دینا، اور قرآن کریم کی بے احترامی کرنا، اور اسے نذر آتش کرنا، یہ سب نصاریٰ کے کرتوت ہیں۔

یہ پورے جہاں کے ساتھ مصالحت کر سکتے ہیں، مگر مسلمانوں کے ساتھ کسی مصالحت پر آمادہ نہیں ہوتے۔ تمام مذاہب کے ساتھ ان کی دوستی قائم رہتی ہے، مگر مسلمانوں کے ساتھ ہر وقت ان کی دشمنی عروج پر رہتی ہے، گویا پورے عالم میں سوائے مسلمانوں کے ان کا کوئی دشمن نہیں، لہٰذا تمام نصاریٰ ﴿أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً﴾ کا مصداق نہیں ہو سکتے، بلکہ اس آیت کریمہ میں وہ مخصوص طبقہ مراد ہے جنہوں نے دینِ عیسوی پر استقامت اختیار کی، اور مسلمانوں کو دیکھ کر اپنی نرم دلی اور پاکیزگی کی وجہ سے متأثر ہوئے، اور وہ فوراً اسلام کے خیمہ میں داخل ہو کر مسلمان ہوئے، جو ملکِ حبشہ سے مدینہ منورہ میں تشریف لائے، اور اپنے بادشاہ کا پیغام پہنچایا، اور اسلام قبول کیا۔

اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ تمام کفار خواہ اہلِ کتاب ہوں یا بدھ مت، یا ہندو یا دھریہ، آپس میں مذہبی سطح پر قرب قریب دوست اور متحد ہیں ہوسکتے ہیں، سیاسی سطح پر کبھی ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہوں، مگر مذہبی سطح پر سارے کفار ایک ہیں، اور ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

ہاں! ان سب کا اختلاف صرف اسلام اور دینِ الٰہی کے ساتھ ہے، کیونکہ اسلام تمام خوبیوں اور نیک اعمال کا جامع اور پسندیدہ دین ہے، اور کفار جن بے شمار جرائم اور برائیوں میں ملوث ہیں اسلام ان تمام برائیوں سے منع کرتا ہے، اسی بنیاد پر کفار اسلام کے دشمن ہیں۔

زاغ چون فارغ ز بوئے گل بود ☆ نفرتش از صحبت بلبل بود

بہر حال! یہاں نصرانی اور مدعی عیسائیت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ ان نصرانیوں کا ذکر ہے جو اپنے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور انجیل کا پابند سمجھتے تھے، اور دینِ مسیحی پر چلنے اور عمل کرنے کی وجہ سے ان کے قلوب صاف اور نرم تھے۔ زمانۂ رسالت تک ایسے کچھ لوگ مختلف مقامات میں موجود ہوتے تھے، پھر آہستہ آہستہ ایسے لوگ ختم ہوگئے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ بھی اسی قسم کے لوگوں میں شمار ہوتے تھے، اور یہی لوگ قِسِّیۡسِیۡنَ جیسے درویشوں کے صحبت یافتہ اور ان کی تعلیمات سے متأثر نظر آتے تھے۔ حدیثِ ہرقل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ راہب و علماء ایسے موجود تھے جو نبی آخر زمان حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کے منتظر رہتے تھے، جیسے ضغاطر اور ابن ناطور اور بحیرا راہب، جنہوں نے بخوشی و رغبت اسلام قبول کیا۔ قرآن کریم نے انہی کے بارے میں فرمایا:

﴿وَهُمۡ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ﴾ یہ لوگ اسی صفت کی وجہ سے یہود سے ممتاز ہیں، اور یہی صفت ان کی اسلام دوستی کا سبب بنی کہ وہ ضد و عناد میں یہودیوں کی طرح مبتلا نہیں ہوئے، اور یہی وصف قرب و مودت کا ذریعہ بنا۔ اب ان کی دیگر خوبیوں اور صفاتِ حمیدہ کا یوں تذکرہ ہو رہا ہے، ارشاد فرمایا:

اَلْجُزْءُ السَّابِعُ

وَإِذَا سَمِعُوا مَآ أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰٓ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَآ ءَامَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّٰهِدِينَ ﴿٨٣﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّٰلِحِينَ ﴿٨٤﴾ فَأَثَٰبَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٨٥﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِـَٔايَٰتِنَآ أُولَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ الْجَحِيمِ ﴿٨٦﴾

ترجمہ: اور جب انہوں نے اس چیز کو سنا جو نازل کی گئی رسول کی طرف تو تو دیکھے گا کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں، اس وجہ سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا، وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اے ہمارے ربّ! ہم ایمان لے آئے، سو آپ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو تصدیق کرنے والے ہیں ﴿٨٣﴾ اور ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور حق پر ایمان نہ لائیں، جو ہمارے پاس آ گیا، اور ہم اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ ہمارا ربّ ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ داخل فرمائے گا ﴿٨٤﴾ سو اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کی وجہ سے ایسے باغ ثواب میں دیدیئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ اچھے کام کرنے والوں کا بدلہ ہے ﴿٨٥﴾ اور جنہوں نے کفر کیا، اور ہماری آیات کو جھٹلایا، یہ لوگ دوزخ والے ہیں ﴿٨٦﴾

معارف ومنازل

مفسرین کرام اور علماء سیرت نے لکھا ہے کہ کفار قریش نے جو کہ اولین مخاطبین تھے باہم مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر دینِ اسلام سے برگشتہ کریں گے، چنانچہ طرح طرح سے دکھ اور جسمانی تکلیفیں دینے لگے۔

مسلمانوں نے ہر چند اذیتیں برداشت کیں، مگر یہ سلسلہ آئے دن بڑھتا گیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ملک حبشہ ہجرت کرنے کا مشورہ دیا، اس وقت جہاد کا حکم بھی نہیں تھا، اور مسلمان نہتے کمزور بے سرو سامان ہونے کے علاوہ نہایت قلت میں تھے، یعنی سو سے بھی کم تھے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا کہ حبشہ کا بادشاہ بہت نیک اور صالح انسان ہے، نہ خود ظلم کرتا ہے نہ اپنے ملک میں کسی ظلم کی اجازت دیتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے پہلی دفعہ گیارہ مرد اور چار عورتیں ترکِ وطن کر کے مکہ سے پوشیدہ طور پر نکلے، اور حبشہ روانہ ہوئے۔ ان حضرات کے نام یہ ہیں:

حضرت عثمان بن عفان، اور آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہ بنت الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت زبیر بن العوام، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ، اور ان کی اہلیہ حضرت سہلہ بنت سہیل بن عمرو، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد، اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت ام سلمہ بنت امیہ، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عامر بن ربیعہ، اور ان کی اہلیہ حضرت لیلیٰ بنت ابی حیثمہ، حضرت حاطب بن عمرو، اور حضرت سہیل بن بیضا۔ رضوان اللہ علیہم أجمعین

اس پہلی ہجرت کے کچھ مدت بعد حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی ہجرت کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد ایک بہت بڑی جماعت جس میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ صرف مردوں کی تعداد بیاسی ۸۲ ہوگئی، جو کہ براستہ دریا کشتی کے ذریعہ حبش پہنچ گئے، جب کفار قریش کو یہ بات معلوم ہوئی کہ سو کے قریب مسلمان حبشہ پہنچ کر وہاں آرام سے رہ رہے ہیں، تو انہیں یہ بات سخت ناگوار گزری، تو انہوں نے کچھ قیمتی تحفے تحائف حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بادشاہ نجاشی اور ان کے رفقاء ودرباری سرداروں کی خدمت میں روانہ کیے، اور ان سے درخواست کی کہ یہ ہمارے بھگوڑے غلام ہیں، جو باپ دادوں کا مذہب چھوڑ کر آپ کے ملک میں آئے ہیں، اور پناہ گزیں ہو چکے ہیں، یہ بہت برے لوگ ہیں، براہ کرم انہیں ہمارے پاس واپس بھیج دیں۔ وغیرہ۔

یہ بادشاہ کی عقلمندی اور خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے یک طرفہ فیصلہ نہیں کیا، بلکہ انہیں اپنے دربار میں بلا کر پوری تفصیل معلوم کی، اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مع لائے ہوئے تحفوں کے واپس کر دیا، اس مرحلے میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کی مراعات ومدارات کا حکم دیا، چنانچہ وہ بہت زیادہ آرام وسکون سے رہنے لگے۔ الحمدللہ

پھر جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ وہاں سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے غزوۂ خیبر کے موقع پر واپس ہوئے، تو حضرت اصحمہ شاہ نجاشی ؒ نے وفد کے ساتھ اپنے بیٹے حضرت ارہا رضی اللہ عنہ کو بھی آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں بھیجا، ان کا یہ وفد ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا، مگر قدرت کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا کہ یہ وفد کشتی سمیت دریا میں غرقاب ہوا۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جن کی تعداد ستر ۷۰ تھی دوسری کشتی پر سوار ہوئے تھے، یہ لوگ

خیبر کے موقع پر حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی خدمت میں سلامتی کے ساتھ پہنچ گئے، ان میں یمن کے چند حضرات ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی معیت میں بھی آ گئے تھے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے وفد میں بہتر ۷۲ آدمی حبشہ کے تھے، اور آٹھ افراد شام کے تھے۔ یہ سب مسیحی لوگ تھے، جب خدمت گرامی میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں مکمل سورۃ یٰس شریف تلاوت فرما کر سنائی، یہ لوگ متواتر سنتے رہے، اور روتے رہے، اور سب نے اسلام قبول کیا، اور کہنے لگے کہ: جو کچھ ہم نے سنا ہے یہ بالکل اسی طرح ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝﴾ ۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت بالا نجاشی کے بھیجے ہوئے وفد کے بارے میں نازل ہوئی۔ [معالم]

بعض حضرات نے جو یہ فرمایا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب ہجرت کر کے حبشہ پہنچے تھے، اور شاہِ حبشہ کے دربار میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جو بیان دیا تھا، اور سورۂ مریم پڑھ کر سنائی تھی اس سے متاثر ہو کر شاہی دربار کے لوگ رو پڑے تھے، اس آیت میں ان کا ذکر ہے۔

بعض مفسرین نے اس کو تسلیم نہیں کیا، ان حضرات کا کہنا ہے کہ سورۂ مائدہ مدنی ہے، جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی، لہٰذا جو واقعہ ہجرت سے پہلے پیش آیا وہ اس آیت میں مذکور نہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ آیات مکی ہوں، اور یہ بات اکثر سورتوں میں واقع بھی ہے۔ نصاریٰ کے بارے میں یہ جو فرمایا کہ وہ مودّت و محبت کے اعتبار سے بہ نسبت دوسرے لوگوں کے مسلمانوں سے قریب تر ہیں، اس کا سبب یہ بتایا کہ ان میں قِسِّيْسِيْنَ لوگ ہیں، اور رہبان لوگ ہیں، اور یہ کہ وہ تکبر و غرور نہیں کرتے۔ قِسِّیس رومی زبان میں عالم کو کہتے ہیں، اور رُهْبَان راہب کی جمع ہے، جو لوگ تارکِ دنیا ہو کر جنگلوں اور صحراؤں میں عبادت خانے گرجے بنا لیتے تھے، اور وہیں عبادت و ریاضت کے ساتھ مشغول ہوتے تھے، جفاکشی کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، ان کو راہب یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے تارکُ الدنیا کہا جاتا تھا۔

آج موجودہ زمانہ میں ان تینوں صفات کا نام ونشان نہیں، اب نصاریٰ میں نہ راہب کوئی ہے، اور نہ قسیس اور نہ ہی متواضع منکر المزاج کوئی ہے، اب پوری نصرانیت دہریت اور بدترین الحادوزندقہ اور کفر کی لپیٹ میں ہے، صرف نام کے عیسائی کہلاتے ہیں، سارے منکرینِ خدا ہی ہیں۔

اور جولوگ پادری بنے ہوئے ہیں وہ نصرانی حکومتوں کے تابع ہیں، اور ان کے اشاروں پر چلتے ہیں، پوری دنیا میں عیسائی عوام ہوں یا ان کے مذہبی راہنما پادری ہوں، یہ سب اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، یہاں تک کہ کسی وقت برطانوی وزیر اعظم نے پارلیمنٹ کے اجلاس میں قرآن کریم کو ہاتھوں میں اٹھا کر لہرایا تھا، اور کہا تھا کہ یہ کتاب جب تک زندہ ہے دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا، یہ وہ کتاب ہے جو دہشت گردی کی تعلیم دیتی ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ☆ چشمہ آفتاب را چہ گناہ

دراصل وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا میں اگر امن قائم ہوسکتا ہے تو اسی کتاب کی بدولت، اور پورے جہاں میں بچا کچا جو امن وخوشحالی باقی ہے وہ اسی کتاب کی مرہونِ منت ہے۔ اگر اس کا قانون دنیا میں نافذ ہوتو انسانوں کا کیا کہنا جنگل کے جانور، حیوانات، کیڑے مکوڑوں کو بھی امن وسکون حاصل ہوگا، جس پر انسان بھی رشک کریں گے، مسلمانوں کی حکمرانی کے ادوار اس پر شاہد اور گواہ ہیں۔

جن نصاریٰ نے قرآن کریم سنا، اور حق کے پہچاننے کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، انہوں نے فوراً اپنے ایمان کا اعلان کردیا، اور کھلے دل سے کہنے لگے:

﴿وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ﴾ ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لائیں، اور اس پر ایمان نہ لائیں جو ہمارے پاس حق آیا، اور ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارا ربّ ہمیں صالحین کے ساتھ داخل فرمادے گا۔ یعنی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل فرمادے، اور ان کو جو انعامات ملے ہمیں بھی ان میں شامل و شریک فرمادے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ان نصاریٰ نے اپنے مؤمن ہونے کا اعلان کردیا تو یہودیوں نے ان کو عار دلائی، اور ان سے کہا کہ تم کیوں ایمان لائے؟ اس پر انہوں نے وہ جواب دیا جو اوپر مذکور ہوا۔

درحقیقت جب قلوب میں ایمان کی لہر دوڑ جاتی ہے، اور ایمان دل میں راسخ و پختہ ہوجاتا ہے، تو دنیا کی کوئی طاقت ایمان کے خلاف آمادہ نہیں کرسکتی، اور کسی جاہل کا عار دلانا ایمان سے واپس نہیں کرسکتا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے

اہل ایمان کا انعام اور کافروں کی سزا بیان فرمائی:

﴿فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ﴾ سو اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کی وجہ سے ان کو ایسے باغیچے عنایت فرمائے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بدلہ ہے اچھے کام کرنے والوں کا، اور جنہوں نے کفر کیا، اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہ دوزخ والے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں کو حرام مت قرار دو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں، اور حد سے آگے تجاوز نہ کرو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ﴿۸۷﴾ اور کھاؤ اس میں سے جو اللہ تعالیٰ نے تم کو حلال پاکیزہ رزق عطا فرمایا، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو ﴿۸۸﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں قِسِّيْسِيْنَ اور رُهْبَان کی مدح ہوئی، عموماً دینِ عیسوی کے رُہبان رہبانیت پر عامل رہتے تھے، تمام حلال چیزوں کے استعمال کو حرام قرار دیتے تھے۔ ان آیات میں اسی چیز کا بیان ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں، اس لئے محتاط رہو، اور حدود سے تجاوز نہ کرو۔ اگرچہ ترکِ دنیا اور ترکِ شہوات ولذات اعتدال کے درجہ میں پسندیدہ ہے، مگر کلیۃً حلال چیزوں سے اجتناب کرنا جیسے کہ راہبوں کا طریقہ ہے، یہ جائز نہیں ہے۔

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجات:

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے ہیں: ایک یہ کہ اعتقاداً اس کو حرام سمجھ لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قولاً کسی حلال کو اپنے اوپر حرام کردے۔ تیسرے یہ کہ اعتقاد اور قول کچھ نہ ہو محض عملاً کسی حلال چیز کو چھوڑنے کا عزم کرے۔

پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر اس چیز کا حلال ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو، تو اس کا حرام سمجھنا قانونِ الٰہی

کے ساتھ متصادم ہے، تو اس کی صریح مخالفت سے کفر ہی لازم آئے گا۔ اسی طرح قطعی دلائل سے حرام شدہ چیز کو حلال سمجھنا بھی کفر ہی ہوگا، کیونکہ شرعی حلال کو حرام سمجھنا اور حرام کہنا کفر ہے، یہ ایک قسم کا انکار ہی ہے۔

اور دوسری صورت میں اگر قسم کھا کر اس چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے تو یہ قسم ہو جائے گی، قسم کے الفاظ بہت ہیں، جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔ ان میں ایک مثال یہ ہے کہ صراحۃً کہے: میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں کہ فلاں چیز کو نہ کھاؤں گا، فلاں بھائی کے گھر نہ جاؤں گا، یا فلاں چیز یا فلاں کام اپنے اوپر حرام کرتا ہوں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ بلا ضرورت ایسی قسم کھانا اور حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرنا گناہ ہے۔ اس پر لازم ہے کہ ایسی قسم کو توڑ دے، اور کفارہ ادا کرے۔ چند آیت بعد اس کی تفصیل آنے والی ہے۔

تیسری قسم جس میں اعتقاد اور قول سے کسی حلال کو حرام نہ کیا ہو، بلکہ عملاً ایسا معاملہ کرے کہ کسی حلال کے استعمال کو کسی بے رغبتی یا طبعی وعلاج کے طور پر چھوڑ دے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر حلال کو چھوڑنا ثواب سمجھتا ہے تو یہ بدعت ہے، اور عیسائی راہبوں کی بے بنیاد رہبانیت کا حصہ ہے، جس کا گناہ عظیم ہونا قرآن واحادیث میں منصوص ہے، اور یہ قطعاً غیر شرعی عمل ہے، اور اس پر پابندی حرام ہے۔

البتہ! اگر یہ پابندی بہ نیت ثواب نہ ہو، بلکہ کسی دوسری وجہ سے ہو، مثلاً کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے سبب سے کسی خاص چیز کو کچھ وقت کے لئے یا ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بعض صوفیاء کرام، بزرگوں، ڈاکٹروں اور طبیبوں کے کہنے سے بہت سی حلال چیزوں کے چھوڑنے کا جو مشورہ ہوتا ہے، یہ سب جائز ہیں، اور مبنی بر حکمت ہیں۔ یہ حکمت جسمانی، روحانی اور طبعی علاج سب کو شامل ہے۔ آخر میں فرمایا:

﴿وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود سے آگے نہ بڑھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ حد سے بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حلال، حرام، جائز، ناجائز، فرض، واجب، کراہت، اباحت وغیرہ تمام تر چیزوں کے لئے حدودِ شرعیہ مقرر کی ہیں، پس مسلمان مکلف پر ضروری ہے کہ ان تمام امورِ شرعیہ میں شرعی حدودِ مقررہ کے تحت عمل کرے، اور ہر طرح اِفراط وتفریط سے اجتناب کرے، اور اعتدال پر گامزن رہے۔

پس بغیر انتہائی ضرورت اور دلیلِ شرعی کے کسی چیز کے حکم میں تجاوز نہ کرے، اور تقویٰ اسی احکامِ شرعیہ پر چلنے اور عمل کرنے کا نام ہے۔ یہ کوئی تقویٰ نہیں کہ حلال چیزوں کو ہمیشہ کے لئے ترک کرے، اور اسی کو ثواب سمجھے۔

البتہ اعتدال ضرور ہر کام اور ہر چیز میں ملحوظ نظر رہے۔

ایک شخص نے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کھانے پر اپنے گھر بلایا، دسترخواں پر گوشت اور گھی دو سالن پیش کئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک سالن اٹھاؤ ایک رہنے دو، ورنہ میں اٹھ کر چلا جاؤں گا۔ میز بان نے کہا: کیا یہ دو سالن ایک دسترخواں پر حرام ہیں؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حرام نہیں، مگر خلافِ سنت ضرور ہے، اور سنت کے مطابق کھانے سے تجاوز و تعدی ہے۔ [سیرت فاروق ابوالکلام آزاد]

فائدہ:

حدود اللہ سے تجاوز کرنا آگے بڑھنا ناجائز اور حرام بلکہ ظلمِ عظیم ہے۔ ہزاروں رسوم و بدعات اور مروّجہ اعمال جن کا کتاب و سنت مطہرہ میں ثبوت نہیں، اور بدعتی علماء اور واعظوں نے یا باطل فرقوں کے لوگوں نے ایجاد کئے ہیں، یہ سب کے سب غیر شرعی اور ناجائز ہیں، اور حدود اللہ سے آگے بڑھنے اور تجاوز کرنے کی چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے ایمان کی قوت اور استحکام و بقاء کی خاطر ہر اس عمل سے پرہیز کریں جس کا ثبوت کتاب اللہ اور سنت مطہرہ میں نہ ہو، اور باطل فرقوں کے تراشیدہ غیر شرعی اعمال کو اپنے معاشرہ میں جذب نہ کریں۔ اور یاد رکھیں کہ جو کوئی کسی باطل فرقے کے کسی عمل کو اپنائے گا قیامت کے دن اس کا حشر انہی لوگوں میں ہوگا۔

ہمارے معاشرہ میں اہل بدعت ہندوؤں اور شیعوں کے بہت سے رسوم و جاہلانہ غیر شرعی اعمال کا اضافہ کر کے سنت مطہرہ سے بہت تجاوز کر چکے ہیں۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''اصلاح الرسوم'' اس سلسلے میں نہایت مفید تالیف ہے، اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٨٩﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ایسی قسموں پر تمہارا مواخذہ نہیں فرماتا جو لغو ہوں، لیکن وہ ایسی قسموں پر مواخذہ فرماتا

ہے جن کو تم عقد کرو (یعنی باندھ دو، پختہ کرو) سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، جو اس کھانے کا درمیانہ ہو، جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا ان (دس مسکینوں) کو کپڑا پہنا دینا ہے، یا ایک غلام آزاد کرنا ہے، سو جو شخص نہ پائے تو تین دن کے روزے ہیں، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسمیں کھاؤ، اور تم اپنی قسموں کی حفاظت کرو، اسی طرح اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے اپنی آیات کو تا کہ تم شکر کرو ﴿۸۹﴾

معارف ومنازل

اوپر کی آیات میں یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں ان کو حرام قرار نہ دو، چونکہ حلال کو حرام کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی حلال چیز کے نہ کھانے یا استعمال نہ کرنے کی قسم کھالی جائے، اس لئے اب قسم کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

قسم کی کئی قسمیں ہیں:

اول یمین لغو۔ دوسری یمین غموس۔ تیسری یمین منعقدہ۔ (عربی میں قسم کو یمین کہتے ہیں)۔

☆ یمین لغو کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جو شخص قسم کی نیت کئے بغیر بات کرتے ہوئے لَاوَاللہِ یا بَلٰی واللہِ کہہ دے، یہ لغو یمین ہے، بمعنی فضول و بے مقصد۔ [بخاری]

اہلِ عرب کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے محاورات میں باتیں کرتے کرتے اس طرح کے الفاظ بول جاتے تھے، اور بعض فقہاء نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص کسی گزشتہ واقعہ کو اپنے نزدیک سچا جان کر قسم کھائے، حالانکہ واقعۃً وہ غلط ہو، تو یہ یمینِ لغو ہے۔

بہر حال! یمین لغو کی جو بھی تفسیر ہو اس پر مؤاخذہ نہیں ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ میں اس کی تصریح ہے، اور اس میں کوئی کفارہ بھی نہیں ہے۔

☆ یمین غموس یہ ہے کہ کسی گزشتہ واقع پر جانتے بوجھتے جھوٹی قسم کھالی جائے۔ مثلاً کوئی کام نہیں کیا، اور قسم کھا کر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قسم میں نے یہ کام کیا ہے، یا اس کے برعکس، یہ یمین غموس ہے، اس کا گناہ بہت بڑا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بڑے گناہ یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا۔ (۲) ماں باپ کو تکلیف دینا۔ (۳) کسی جان کو قتل کرنا۔ (۴) یمین

غموس، یعنی کسی خلاف واقعہ بات پر جھوٹی قسم کھانا۔ [بخاري]

لفظ "غَمُوس" ، غمس سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں: گھسا دینا، ڈبو دینا، چونکہ جھوٹی قسم یہاں اس دنیا میں گناہ میں گھسا دیتی ہے، پھر آخرت میں پہنچ کر دوزخ کے عذاب میں گھسا دینے کا سبب بنے گی، اس لئے اس کا نام "یمین غموس" رکھا گیا۔

☆**یمین منعقدہ:** قسم کی تیسری قسم یمین منعقدہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی آنے والے زمانہ میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھالے، مثلاً یوں کہے: اللہ تعالیٰ کی قسم میں فلاں کام ضرور کروں گا، یا یہ کہے: اللہ تعالیٰ کی قسم میں فلاں کام نہیں کروں گا، یا فلاں چیز نہیں کھاؤں گا، یا فلاں سے بات نہیں کروں گا، وغیرہ۔

اس یمین منعقدہ کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کی خلاف ورزی ہوجائے تو کفارہ ادا کرنا فرض ہوجاتا ہے۔ کفارہ کی تفصیل آیت کریمہ نے خود بتلادی، وہ یہ کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلادے، یعنی دو وقت صبح وشام یا دس مسکینوں کو کپڑے پہنادے، یا ایک غلام آزاد کردیں۔ اگر ان تینوں چیزوں میں سے کسی بھی ایک کی استطاعت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھ لیں۔ تین دن کے روزوں میں شرط ہے کہ لگاتار پے در پے ہوں۔ البتہ اگر اول تینوں چیزوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنے کی استطاعت ہو تو روزہ رکھنے کی اجازت نہیں۔

کفارۂ قسم کے ضروری مسائل:

مسئلہ: یمین منعقدہ کی خلاف ورزی جسے عام طور قسم توڑنا کہتے ہیں، اس کا کفارہ حانث ہونے، یعنی قسم ٹوٹنے سے پہلے ادا کرنا صحیح نہیں۔ اگر پیشگی کفارہ ادا کردیا تو صدقہ شمار ہوگا، کفارہ میں شمار نہ ہوگا۔

مسئلہ: اگر دس مسکینوں کو کھانا کھلانے کی صورت اختیار کرے تو صبح وشام پیٹ بھر کے کھانا کھلادے، ان دس مسکینوں میں کوئی بچہ نہ ہو، اور ایسا کوئی شخص بھی نہ ہو جس نے پہلے سے کھا کے پیٹ بھر دیا ہو۔

مسئلہ: اگر کھانا کھلانے کے بدلہ مال دینا چاہے تو یہ بھی جائز ہے جس کی صورت یہ ہے کہ ہر مسکین کو صدقۂ فطر کے برابر جنس یا نقد ادا کرے، یعنی اس کی قیمت۔

مسئلہ: دس (۱۰) ہی مسکینوں کو دینا لازم ہے، اگر ایک ہی مسکین کو دس مسکینوں کا غلہ، چاول، گیہوں وغیرہ دے دیا تو اس سے پوری ادائیگی نہ ہوگی، نو مسکینوں کو پھر دیدے۔

مسئلہ: اور اگر کپڑا دینے کی صورت اختیار کرے تو ہر مسکین کو اتنا کپڑا دیدے جس سے ستر ڈھک جائے، اور اس

میں نماز ادا ہو سکے، اور اگر عوت کو کپڑا دے تو اتنا بڑا کپڑا دے جس سے اس کا سارا بدن ڈھک جائے، جس میں وہ نماز ادا کر سکے۔

مسئلہ: مسکینوں کو جو کھانا کھلائے تو گھٹیا کھانا یا خشک روٹی نہ کھلائے، اپنے اہل وعیال کو جو کھانا کھلاتا ہو اس کی درمیانی حیثیت کا کھانا ہو۔ آیت کریمہ میں اسی کی تصریح ہے: ﴿مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ﴾ (یعنی جو اس کھانے کا درمیانہ ہو، جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو)۔

مسئلہ: اگر کھانا کھلانے اور کپڑا پہنانے کی مالی طاقت نہ ہو تو لگا تار تین دن روزے رکھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت: ﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ مُتَتَابِعَاتٍ﴾ جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو پہنچی، اسی لئے انہوں نے لگا تار روزے رکھنے کا فیصلہ فرمایا، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے۔

مسئلہ: گناہ کی قسم کھانا جائز نہیں، اگر گناہ کی قسم کھالے، مثلاً یہ کہ نماز نہیں پڑھوں گا، یا یہ کہ صلہ رحمی نہیں کروں گا، یا یہ کہ صدقہ نہیں کروں گا، یا یہ کہ شادی نہیں کروں گا، تو ایسی قسم کو پورا کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اسے توڑنا واجب ہے۔ قسم توڑ دے کفارہ دیدے۔ نذر فی المعصیۃ کا بھی یہی حکم ہے کہ اسے پورا نہ کرے، کفارہ دیدے۔

مسئلہ: غیر اللہ کی قسم کھانا حرام ہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ"۔ [ترمذي] جس نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز کی قسم کھائی تو اس نے شرک کیا اسی طرح ارشاد فرمایا کہ اپنے باپوں اور داداؤں اور ماؤں اور بڑوں کی قسم مت کھاؤ، اور اللہ تعالیٰ کی قسم بھی جب ہی کھاؤ جبکہ تم سچے ہو۔ [مشکوۃ]

غیر اللہ کی قسم اور جھوٹی قسم دونوں سے ممانعت فرمائی، جس کی برائی اور عدم جواز ہر طرح واضح ہے۔ آخر میں فرمایا:

﴿وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ﴾ کہ اپنی قسموں کی حفاظت کرو، یعنی اپنی قسموں کا خیال رکھو، ایسا نہ ہو کہ قسم ٹوٹ جائے اور کفارہ ادا کرنے میں غفلت کر جاؤ۔ یا یہ مطلب ہے کہ قسم کھالو تو اسے پوری ہی کردو۔ جب اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائی ہے تو اب اسے پورا ہی کردو، لیکن یہ اسی صورت میں ہے کہ جب گناہ کی قسم نہ کھائی ہو جیسا کہ پہلے گزرا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جُوا اور بت اور جوئے کے تیر گندی چیزیں ہیں، شیطان کے کاموں میں سے ہیں، لہٰذا تم ان سے بچو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۹۰﴾ شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے آپس میں دشمنی اور بغض واقع کر دے، اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، سو کیا تم باز آنے والے ہو ﴿۹۱﴾ اور فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی، اور فرمانبرداری کرو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور ڈرتے رہو، سو اگر تم نے روگردانی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ واضح طور پر پہنچا دینا ہے ﴿۹۲﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں یہ بتلانا منظور ہے کہ خالق و مالکِ کائنات نے ساری کائنات کو انسان کی خدمت وراحت کے لئے پیدا فرمایا، اور ہر ایک چیز کو انسان کی خاص خاص خدمت پر مقرر فرمایا، اور انسان کو مخدوم کائنات بنا دیا، انسان پر صرف ایک پابندی لگا دی کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات سے نفع اٹھانے کی جو حدود اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کیا جائے، اور جن چیزوں کو تمہارے لئے حلال، طیب و پاکیزہ بنا دیا ہے ان سے احتراز کرنا بے ادبی اور ناشکری ہے، اور جن چیزوں کے کسی خاص استعمال کو حرام قرار دیا ہے ان میں خلاف ورزی کرنا سراسر بغاوت ہے۔

بندگی کا مطلب یہ ہے کہ تمام اوامر و نواہی اور سارے احکام الٰہی پر ہر وقت پابند و کاربند رہے۔ ان آیات میں شراب اور جوئے اور جوا کھیلنے کے تیروں کو گندی چیز، یعنی ناپاک بتایا، اور یہ بھی فرمایا کہ یہ چیزیں شیطانی کاموں میں سے ہیں۔ عرب کے لوگ بت پرست ہوتے تھے، اور بتوں کی پوجا کرتے تھے، اور بتوں کے پجاریوں کے پاس رکھے ہوئے تیروں سے اپنی قسمت، کاروبار اور زندگی کے تمام معاملات معلوم کراتے تھے، اور ان تیروں کے ذریعہ جوا بھی کھیلتے تھے، جس کی تشریح سورۂ مائدہ کی آیت ۳ کے ذیل میں گزر چکی۔

سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۚ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۚ وَاِثْمُهُمَاۤ

أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا﴾[البقرة:۲۱۹] (لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں، آپ فرمادیجئے کہ: ان میں بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کیلئے منافع ہیں، اور ان کا گناہ ان کے منافع سے زیادہ بڑا ہے)۔

اس سے واضح ہوا کہ شراب اور جوئے میں اگرچہ کچھ نفع بھی ہے، مگر ان کا جو گناہ ہے وان کے نفع سے بہت زیادہ بڑا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی چیز کے جائز ہونے کیلئے یہی کافی نہیں کہ وہ نفع مند ہو۔ بہت سے لوگ شراب اور جوئے اور سود وغیرہ کے صرف منافع کو دیکھتے ہیں، اور شریعتِ اسلامیہ میں جو ان کی حرمت بیان کی گئی ہے اس کی طرف دھیان نہیں کرتے، اور صرف غیر شرعی نفع کو دیکھ کر حلال قرار دینے کی بے جا جسارت کرتے ہیں۔

تو کیا کسی ظاہری نفع کی وجہ سے حرام چیز حلال ہوسکتی ہے؟ جتنے بھی گناہ ہیں وہ ضرور کسی نہ کسی فائدہ پر مشتمل ہوتے ہیں، پس فائدہ کی شق کو دیکھ کر سارے گناہوں کو خدانخواستہ جائز قرار دیدیا جائے، یہ شریعت کے ساتھ کھلم کھلا مذاق ہوگا، اور یہ ملحدوں اور زندیقوں کا طریقہ ہے کہ وہ غیر شرعی مصلحتوں پر قانع ہوتے ہیں۔ ابھی چند آیت پہلے بیان ہوا کہ محرّمات شرعیہ کو حلال سمجھنا سراسر کفر ہی ہے۔

قرآن کریم نے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری اور اتباع کا حکم دے کر فرمایا، اور آپ ﷺ کی صفات کا یوں اظہار فرمایا:﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَٰٓئِثَ﴾ [الأعراف:۱۵۷] یعنی نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں نیکیوں کا امر فرماتے ہیں، اور برائیوں سے منع کرتے ہیں، اور پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتے ہیں، اور گندی مردار چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔

پس واضح ہوا کہ قرآن وسنت میں جن چیزوں کی طہارت وحلّت ثابت ہو وہ حلال قرار پائیں گی، اور جن چیزوں کی گندگی اور حرمت ثابت ہو وہ ہمیشہ کیلئے حرام قرار پائیں گی۔ اس تشریح کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص شراب اور جوئے کو حرام نہ سمجھے تو اس کے بے دین ہونے میں کیا شک ہے؟ ایسا شخص صاف کافر ہی ہوگا۔

شراب اور جوئے کی حرمت سات وجوہ سے ثابت ہے:

سورۂ مائدہ کی آیت بالا میں شراب اور جوئے کو "رِجْس" یعنی گندی چیز بتایا ہے، یہی چیز شراب وجوئے کی حرمت کا واضح ثبوت ودلیل ہے۔ پہلی بات کہ ''شراب'' اور ''جوا'' رِجس یعنی ناپاک ہیں۔

دوئم یہ کہ فرمایا: ﴿مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَٰنِ﴾ یہ شیطانی کاموں میں سے ہیں۔

سوئم فرمایا: ﴿فَاجْتَنِبُوهُ﴾ تم اس سے بچو۔

چہارم فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ تاکہ تم فلاح حاصل کرو۔ معلوم ہوا کہ شراب اور جوئے کے ترک میں ہی فلاح ہے، اور استعمال میں ناکامی ہے۔

پنجم فرمایا: ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے اندر دشمنی اور بغض ڈال دے۔

ششم فرمایا: ﴿وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ شیطان شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہیں ذکرِ الٰہی سے روکنا چاہتا ہے، اور یہ تجربہ سے ثابت ہے کہ ایسے لوگ ذکرِ الٰہی سے محروم رہتے ہیں۔

ہفتم فرمایا: ﴿وَعَنِ الصَّلٰوةِ﴾ شیطان تمہیں نماز، بلکہ تمام تر نمازوں سے روکنا چاہتا ہے۔ آخر میں بطور نصیحت فرمایا: ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ کیا تم ان گندی اور خطرناک چیزوں سے باز نہیں آنے والے؟

سبحان اللہ! کیا ہی بلیغ انداز میں بصورتِ استفہام باز رہنے پر ترغیب دلائی، گویا یوں کہا گیا کہ مذکورہ بالا مفاسد خَمْرٌ و مَيْسِرٌ سننے کے بعد کیا اب تم ان سے باز رہو گے؟ یا سُنی ان سُنی کر دو گے، اور باز نہ آؤ گے؟ تمہیں ضرور باز آنا ہی چاہئے۔ اور خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں جن چار چیزوں کا حرام ہونا مذکور ہے ان میں سے دو، یعنی "مَیسر" اور "اَزلَام" نتیجہ کے اعتبار سے ایک ہی ہیں، باقی دو میں ایک "اَنصاب" ہے، جو نُصب کی جمع ہے۔ نَصبَ ایسی چیز کو کہتے ہیں جو عبادت کے لئے کھڑی کی گئی ہو، خواہ بت ہو یا درخت یا قبر وغیرہ۔

شراب اور جوئے کے جسمانی اور روحانی مفاسد:

آیت کے شانِ نزول اور اس کے بعد والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں اصل مقصود دو چیزوں کی حرمت اور مفاسد کا بیان کرنا ہے، یعنی شراب اور جوا، اَنصاب یعنی بتوں کا ذکر اس کے ساتھ اس لئے ملا دیا گیا ہے کہ سننے والے سمجھ لیں کہ شراب اور جوئے کا معاملہ ایسا سخت جرم ہے جیسے بُت پرستی۔

ابن ماجہ کی ایک حدیث میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ الْوَثَنِ"۔ یعنی شراب پینے والا ایسا مجرم ہے جیسے بُت کو پوجنے والا۔ اور بعض روایات میں ہے: "شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ اللَّاتِ وَالْعُزّٰى"۔ یعنی شراب پینے والا ایسا ہے جیسا لاتْ وعُزّٰی کی پرستش کرنے والا۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ یہاں شراب اور جوئے کی شدید حرمت، اور ان کے روحانی اور جسمانی نقصانات کا بیان ہے۔ اول روحانی نقصان کا ﴿رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ میں بیان ہوا۔ جب شراب کی ناپاکی، گندگی

اور شیطانی عمل ہونے کا بیان ہوا تو ظاہر ہے کہ یہ بے شمار مفاسد و نقصانات پیدا کر کے روحانی اقدار کی تباہی کا باعث بنے گی۔ یہ روحانی مفاسد بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ یعنی اس سے بچو، پرہیز کرو۔ پھر فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ دنیا و آخرت میں تمہاری فلاح اسی میں ہے کہ ان گندی چیزوں سے دور رہو۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ شیطان تمام معاصی کے ذریعہ تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور خاص کر شراب وجوئے اور اَنْصابْ وَاَزْلام یہ سارے گمراہی کے اسباب اور شیطانی جال ہی ہیں، جن کے ذریعہ وہ تمہیں شکار کر کے تمہارے درمیان طرح طرح کی دشمنی اور بغض وعداوتوں کا بازار گرم کر کے گھر گھر میں فساد برپا کرتا ہے، اور انہی چیزوں کے ذریعہ تمہارے تقویٰ و پرہیز گاری پر چھاپہ مار کر تمہیں یادِ الٰہی اور نمازوں سے غافل کرتا ہے، کیونکہ تمہارے لئے قابلِ نظر اور قابلِ توجہ آخرت کی زندگی ہے، جو کہ دائمی اور باقی ہے، اور وہ ذکرِ الٰہی اور نمازوں پر موقوف ہے، اور جو لوگ ذکرِ الٰہی اور نمازوں میں سستی کرتے ہیں وہ ابدی سعادتوں سے محروم ہوتے ہیں، اور یہی شیطان کی کارستانیوں کا نتیجہ ہے، جس سے وہ خوش ہوتا ہے۔

بخلاف ان لوگوں کے کہ وہ ان جرائم سے پرہیز کر کے شیطانی جال میں نہیں پھنستے، وہ ذکرِ الٰہی اور نمازوں پر پابندی کرتے ہیں، اور سعادت و فلاح حاصل کرتے ہیں۔ پس غفلت خواہ کسی طرح بھی ہو، جسم و روح دونوں کی دشمن ہے، اور بیداری جسم و روح دونوں کے لئے تریاق اور مفید ہے، اسی وجہ سے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ مطلب یہ ہے کہ شیطانی چالوں اور شیطانی اعمال سے دوری تمہاری نجات اور خوشحالی کا ذریعہ وسبب ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمانبرداری اور اتباع میں تمہاری خیر اور سعادت مضمر ہے، تم ہر وقت اتباع میں سبقت کرو، دوست و دشمن کی پہچان کرو۔

ہاں! اگر تم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات نہیں مانو گے، اور نیکیوں میں سبقت نہیں کرو گے، شراب وجوئے وغیرہ کے معاملہ میں اجتناب نہیں کرو گے، اور شیطانی اعمال اختیار کرو گے، تو یاد رکھو کہ اس میں نہ اللہ تعالیٰ کا نقصان ہے، نہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا، پس سارا نقصان دنیا و آخرت میں صرف تمہارا ہی ہوگا۔ یہ بات ہر حکمِ شرعی کے ساتھ متعلق اور مُعلق ہے کہ بے عملی اور نافرمانی کا نقصان مکلّف انسان کے کھاتے میں جائے گا، شرع اور صاحبِ شریعت کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٣﴾

ترجمہ: جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں کہ انہوں نے کھایا پیا، جبکہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا، اور ایمان لائے، اور نیک عمل کئے، پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے، پھر تقویٰ اختیار کیا اور نیک اعمال میں لگے، اور اللہ تعالیٰ اچھے عمل والوں کو دوست رکھتا ہے ﴿۹۳﴾

معارف ومنازل

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت ابوطلحہ، ابوعبیدہ بن الجراح، اور معاذ بن جبل، سہیل بن بیضاء اور ابودجانہ رضی اللہ عنہم کو شراب پلا رہا تھا، پیالہ میرے ہاتھ میں تھا، جسے میں بھر بھر کر ایک دوسرے کو دے رہا تھا، اسی حال میں ہم نے آواز سنی کہ کوئی شخص پکار کر آواز دے رہا ہے: اَلَاۤ اِنَّ الْخَمْرَ قَدْ حُرِّمَتْ۔ خبردار! شراب حرام کردی گئی ہے۔ آواز کا سننا تھا کہ نہ کوئی اندر آیا، اور نہ کوئی باہر نکلا۔ (بخاری کی روایت میں ہے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انس! تم باہر نکلو دیکھو یہ کیا آواز ہے؟ میں باہر نکلا تو میں نے واپس آکر بتایا کہ یہ پکارنے والا یوں پکار رہا ہے کہ خبردار! شراب حرام کردی گئی ہے۔ یہ سن کر ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: جاؤ یہ جتنی شراب ہے سب کو گرادو)۔ پس ہم نے ساری شراب گرادی، اور مٹکے توڑ دیئے، جس کی وجہ سے مدینہ کی گلی کوچوں میں شراب پانی کی طرح بہنے لگی۔ [درمنثور وصحیح مسلم بحذف بعض الأسماء]

اندازہ لگائیں! جو شراب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گھٹی میں پڑی ہوئی (جیسے موجودہ زمانہ کی چائے) تھی، پورا معاشرہ شراب نوشی میں آباء واجداد کے زمانہ سے غرق تھا، اور سارے لوگ شراب کے دلدادہ عاشق تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عجیب شان تھی، جب شراب حرام ہونے کی خبر سنی، تو بغیر کسی پس وپیش کے اسی وقت گرادی، اور مٹکے توڑ دیئے۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے بھائیوں کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم میں سے بہت سے لوگ شہید ہو چکے، یا طبعی موت مر چکے ہیں، ان کے پیٹوں میں شراب تھی، اور آج اس کی حرمت کا فیصلہ ہوا، لہٰذا جو صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے پیٹوں میں یہ شراب لے کر دنیا سے رخصت ہوئے، پتہ نہیں ان کا کیا حال ہوگا، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

آیت کریمہ میں بتایا گیا کہ جو لوگ اہل ایمان تھے، اور اعمالِ صالحہ کرتے تھے، وہ حرمت کا قانون نازل ہونے سے پہلے وفات پا گئے تھے، انہوں نے اس زمانہ میں جو شراب پی تھی، اس کا کوئی گناہ نہیں۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب تک تشریف فرما تھے احکام میں نسخ ہونے کا احتمال ہوتا تھا، پہلے شراب حلال تھی، پھر حرام قرار دے دی گئی، تو حلال ہونے کی صورت میں کوئی گناہ نہیں ہوتا، حرمت کے بعد استعمال کرنے سے گناہ لازم آتا ہے، تمام احکام کا یہی حکم ہے۔ آیت کریمہ کا نزول اگرچہ خاص ہے، لیکن آیت کے عموم میں زندوں کے بارے میں بھی حکم بتادیا کہ حرمت کا قانون آنے سے پہلے نہ شراب پینے میں کوئی گرفت تھی، نہ آئندہ کسی عمل پر گرفت ہوگی، جو حرمت کا قانون آنے سے پہلے کرلیا جائے۔

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ﴾ ان لوگوں پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں کہ انہوں نے کھایا پیا (حرمت سے پہلے شراب نوشی کی) جبکہ وہ تقویٰ اختیار کرتے ہوں، یعنی شراب کے علاوہ دوسری حرام چیزوں سے بچتے ہوں۔ شراب پینے پر مواخذہ تو اس لئے نہیں کہ وہ اس وقت حرام نہیں تھی، اور جب وہ دوسرے محرمات وممنوعات سے بچتے رہے تو ظاہر ہے کہ وہ دنیا سے بے گناہ چلے گئے، اور انہوں نے نہ صرف ممنوعات سے پرہیز کیا، بلکہ دوسرے اعمال صالحہ بھی انجام دیتے رہے۔

﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا﴾ پھر تقویٰ اختیار کئے رہے، اور ایمان پر باقی رہے، یعنی اس کے بعد جب بھی کسی چیز کی حرمت نازل ہوگئی یہ ایمان پر اور تقویٰ پر رہے، اور حرام چیز سے بچتے رہے۔

﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا﴾ پھر تقویٰ پر رہے، اور اچھے کام کرتے رہے۔ (احسان کے درجہ پر رہے) یعنی جب کسی چیز کی حرمت آگئی تو اس کی خلاف ورزی نہ کی، اور جن نیک کاموں میں لگے ہوئے تھے بدستور ان کے انجام دینے میں لگے رہے، اور اعمالِ صالحہ میں کبھی کمزوری اور سستی نہ دکھائی۔

اس مقام پر تقویٰ کا ذکر تین مرتبہ ہے: پہلی بار جو تقویٰ مذکور ہے اس کا تعلق تمام ممنوعات سے بچنے سے ہے، پھر دوسری بار کسی حلال چیز کی حرمت نازل ہونے کے بعد اس سے پرہیز کرنے سے متعلق ہے، پھر تیسری بار یا تو سابقہ حالت استقامت کے ساتھ تمام ممنوعات سے پرہیز کرنے سے متعلق، یا اس طرف اشارہ ہے کہ جب کبھی بھی کوئی چیز حرام ہوئی اس سے پرہیز کرتے رہے۔

محققین نے لکھا ہے کہ تقویٰ (یعنی مضار دینی سے مجتنب ہونے کے) کئی درجے ہیں، اور ایمان ویقین کے

مراتب بھی بلحاظِ قوت وضعف متفاوت ہیں۔ تجربہ اور نصوص شرعیہ سے ثابت ہے کہ جس قدر آدمی ذکر وفکر، عملِ صالح اور جہاد فی سبیل اللہ میں ترقی کرتا ہے اسی قدر خدا کے خوف اور اس کی عظمت وجلال کے تصور سے قلب معمور اور ایمان ویقین مضبوط ومستحکم ہوتا رہتا ہے۔ مراتب سیر الی اللہ کی اس ترقی وعروج کی طرف اس آیت کریمہ میں تقویٰ اور ایمان کے تکرار سے اشارہ فرمایا، اور سلوک کے آخری مقام احسان، اور اس کے ثمرہ پر بھی تنبیہ فرمادی۔ [تفسیر عثمانی]

پس ظاہر ہے کہ پہلی مرتبہ کا تقویٰ مبتدیوں کیلئے ہے، دوسرا درجہ درمیانی درجہ کے لوگوں کیلئے ہے، اور آخری مقام احسان واستحضار منتہی لوگوں کیلئے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے آمین

فائدہ:

جوئے، قمار، شطرنج، لاٹری، پتنگ بازی، کبوتر بازی کے ذریعہ جوئے کھیلنا اور گھوڑ دوڑ، اونٹ دوڑ، سائیکل، موٹر وغیرہ کی ریس میں جوا بازی، یہ جتنی قسمیں جوا بازی والے کھیلوں کی ہیں جو موجودہ دور میں رائج ہیں، یہ سب شیطانی اعمال غیر شرعی اور حرام ہیں۔ جسمانی وروحانی، مالی نقصان اور عداوت وبغض کے ذرائع کے علاوہ ذکرِ الٰہی، نماز اور دیگر ہر قسم کی طاعات اور دینی اقدار کیلئے سراسر مضر اور نقصان دہ ہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اس قسم کے کبائر سے اجتناب کریں، اور دنیا وآخرت کی بربادی سے پرہیز کریں، اور اپنے اوقات گرانمایہ کو محرمات سے بچائیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ
لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٩٤﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ تم کو قدرے شکار سے ضرور آزمائے گا، تمہارے نیزے شکار کو پہنچیں گے اور ہاتھ، تا کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ بن دیکھے اس سے کون ڈرتا ہے، سو جس نے اس کے بعد زیادتی کی اس کیلئے دردناک عذاب ہے ﴿٩٤﴾

معارف ومنازل

حالتِ احرام میں شکار والے جانوروں کے ذریعہ آزمائش کا بیان ہو رہا ہے، حج یا عمرہ کا اگر کوئی شخص احرام باندھ لے تو احرام سے نکلنے تک بہت سے جائز کام حرام ہو جاتے ہیں، ان حرام شدہ چیزوں میں خشکی کا شکار بھی ہے،

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ شانہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس طرح آزمایا کہ احرام کی حالت میں تھے، اور شکاری جانور میدانوں سے خوب بڑھ چڑھ کر آرہے تھے، یہ ایسی آزمائش تھی جیسے بنی اسرائیل کو آزمایا گیا تھا، ان کے لئے ہفتہ کے دن مچھلیوں کا شکار کرنا ممنوع تھا، لیکن ہفتہ کے دن مچھلیاں خوب اُبھر اُبھر کر پانی کے اوپر آجاتی تھیں، اور دوسرے دنوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ سورۂ اعراف میں اس کی تفصیل آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

تفسیر در منثور میں ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ آیت بالا عمرۂ حدیبیہ کے بارے میں نازل ہوئی، وحشی جانور اور پرندے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ٹھہرنے کی جگہوں میں بکثرت چلے آرہے تھے، اس سے پہلے ایسے مناظر انہوں نے کبھی نہیں دیکھے تھے، ان کو ہاتھوں سے پکڑنا اور نیزوں سے مارنا بہت ہی زیادہ آسان تھا، اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا تھا کہ احرام کی حالت میں شکار قطعاً نہ کرنا، جو شکار کرنے سے پرہیز کرے گا وہ امتحان میں کامیاب ہوگا، اور بڑا اجر و ثواب پائے گا، اور یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ دیکھے بغیر اللہ تعالیٰ سے کون ڈرتا ہے؟ جو شخص شکار کرے گا وہ گناہ کا ارتکاب کرے گا، اور آزمائش میں ناکام ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! شکار قتل نہ کرو اس حالت میں کہ تم احرام میں ہو، اور تم میں سے جو شخص شکار کو قصداً قتل کر دے تو اس کا بدلہ اس جانور کا جیسا ہوگا جس کو قتل کیا، تم میں دو انصاف والے آدمی اس کا فیصلہ کریں گے، اس طرح سے کہ وہ بدلہ والا جانور بطور ہدی کے کعبہ شریف تک پہنچنے والا ہو، یا مسکینوں کو کفارہ کے طور پر کھانا دیدیا جائے، یا اس کے برابر روزے رکھ لے، تاکہ اپنے کئے کی سزا چکھ لے، اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا جو پہلے گزر چکا، اور جو شخص پھر ایسی حرکت کرے گا، پھر تو اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لے گا، اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے انتقام لینے والا ﴿۹۵﴾

تمہارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے جو تمہارے نفع کیلئے، اور مسافروں کے واسطے ہے، اور تم پر حرام کر دیا گیا خشکی کا شکار جب تک کہ تم احرام میں ہو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کی طرف تم جمع کئے جاؤ گے ﴿۹۶﴾

معارف ومنازل

یہاں سے تحریمات وقتیہ سببیہ کے احکام بتائے جا رہے ہیں، کہ جب تم اپنے اصلی دینی مرکز بیت اللہ شریف کی طرف آؤ تو ان کے آداب کا خوب لحاظ رکھو جس طرح احرام میں سلے ہوئے کپڑوں پر پابندی ہے، اور مردے کے کفن کی چادریں پہن کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر لبیک کہتے ہوئے آتے ہو، اسی طرح عجز و نیاز لے کر ایسے طریقے سے آؤ کہ تم سے اور تمہارے ہاتھ سے کسی ذی روح جانور کو تکلیف نہ ہو، اور زیب و زینت چھوڑ کر ایسی سادگی اختیار کرو کہ اپنے ناخن اور بالوں کی کٹائی سے بھی اجتناب کرو۔

اب آیت کا مطلب یہ ہے کہ حالتِ احرام میں حج کا احرام ہو یا عمرہ کا، خشکی کا جانور شکار کرنا حرام ہے، اگر کوئی شخص قصداً حالتِ احرام میں خشکی کا جانور شکار کرے، خواہ اس جانور کا گوشت کھایا جاتا ہو یا نہ کھایا جاتا ہو، تو اس کی سزا اس آیت میں مذکور ہے۔

اور یہ واضح ہو کہ صید یعنی شکار ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو وحشی ہوں، انسانوں سے مانوس نہ ہوں، اور انسانوں سے دور بھاگتے ہوں، جیسے ہرن، نیل گائے، گورخر، بارہ سینگا، فاختہ، خرگوش، شیر، بھیڑیا، گیدڑ، وغیرہ۔ اور جو جانور انسانوں سے مانوس ہیں، اور انسانوں کی پرورش یا خبر گیری میں رہتے ہیں جیسے اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکری، مرغی یہ شکار میں داخل نہیں ہیں، ان کو محرم حالتِ احرام میں بخوشی ذبح کر سکتا ہے، ان کے ذبح میں کوئی پابندی نہیں ہے۔

اور جو وحشی جانور ہوں ان میں سے بعض جانوروں کا مارنا حالتِ احرام میں بھی جائز ہے، یہ استثناء احادیث شریف میں وارد ہوئی ہے، ان میں چیل، کوا، بھیڑیا، سانپ، بچھو، چوہا اور پاگل کتا وغیرہ شامل ہیں۔ یعنی ان کا قتل بحالتِ احرام محرم کیلئے جائز ہے، اور اگر کوئی جانور محرم پر حملہ آور ہو اس کا قتل بھی جائز ہے، اگرچہ ان جانوروں میں سے نہ ہو جن کا قتل جائز ہے۔

احرام کی حالت میں شکار مارنے کی جو جزاء آیت کریمہ میں مذکور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو جانور قتل کیا

اس کا ضمان واجب ہوگا، اور اس ضمان کی ادائیگی یا تو اس طرح کردے کہ جانور خرید کر بطور ہدی کعبہ شریف کی طرف یعنی حدودِ حرم میں بھیج دے، جسے وہاں ذبح کر دیا جائے، اور اگر ایسا نہ کر سکے تو اس کی قیمت مسکینوں کو دیدے، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اس کے بدلے روزے رکھ لے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے جس محرم نے شکار کیا ہے ﴿فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ﴾ یعنی جو جانور قتل کیا ہے اس جانور کا مثل بطور جزا کے واجب ہوگا۔

اس کے بارے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جسامت میں اتنا بڑا جانور ہو جتنا بڑا جانور اس نے قتل کیا ہے، مثلاً شتر مرغ کے بدلے میں اونٹ، ہرن کے بدلے بکرا، خرگوش اور دوسرے جانوروں میں اسی جسامت کا لحاظ ہوگا، جو شکار ہوا۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے مثلیّتْ میں جسامت کا لحاظ نہیں ہوگا، یعنی مثل صوری کا لحاظ نہ ہوگا، بلکہ مثلِ معنوی یعنی قیمت کا اعتبار ہوگا، پس قیمت سے جانور خرید کر حدودِ حرم میں ذبح کیا جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ محرم کو اختیار ہے کہ قیمت کے عوض ہدی کا جانور حدودِ حرم میں ذبح کر دے، یا کسی اور شخص کے ذریعہ ذبح کرادے۔ اور اگر ہدی کا جانور ذبح کرانے کی بجائے اس قیمت کو مسکینوں پر صدقہ کرنا چاہے تو یہ بھی کرسکتا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ فی مسکین بقدر صدقہ فطر غلّہ یا اس کی قیمت صدقہ کردے۔ اور اگر غلّہ یا اس کی قیمت دینا نہ چاہے تو بحساب فی مسکین نصفِ صاع گندم کے حساب سے شمار کے برابر روزے رکھ لے۔ اگر فی مسکین بقدرِ صدقہ فطر حساب کر کے دینے کے بعد اتنے پیسے بچ گئے جن میں ایک صدقہ فطر کے برابر غلّہ نہیں خریدا جاسکتا تو اختیار ہے کہ یہ پیسے ایک مسکین کو دیدے، یا اس کے عوض ایک روزہ رکھ لے۔

جس جانور کو قتل کیا ہے اس کی قیمت کون مقرر کرے؟ ارشاد ہے:

﴿يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ یعنی مسلمانوں میں سے دو انصاف والے سمجھدار آدمی اس کی قیمت کا تخمینہ لگائیں۔ یہ تخمینہ اس جگہ کے اعتبار سے ہوگا جہاں وہ جانور قتل ہوا ہے، اگر جنگل میں قتل ہوا تو وہاں قریبی آبادی کا اعتبار ہوگا۔

شکار کے متعلق چند ضروری مسائل:

مسئلہ: اگر جانور کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اس سے بڑا جانور خریدا جاسکتا ہے تو اونٹ اور گائے حدودِ حرم میں ذبح

کردے۔البتہ بکری، اونٹ اور گائے میں قربانی کے جانور کی شرائط اور قربانی کے جانور کی عمروں کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔

مسئلہ: اگر مقتول جانور کی قیمت کے برابر ہدی کا جانور تجویز کیا، اور جانور خریدنے کے بعد کچھ قیمت بچ گئی، تو اس بقیہ قیمت کے بارے میں اختیار ہے، خواہ دوسرا جانور خرید کر حدودِ حرم میں ذبح کردے، یا اس کا غلّہ خرید کر دیدے، یا غلّہ کے حساب سے فی نصف صاع گیہوں، یا ایک روزہ رکھ لے۔

مسئلہ: مسکینوں کو غلّہ دینے اور روزہ رکھنے میں حرم کی قید نہیں ہے۔البتہ جانور کے ذبح کرنے میں حدودِ حرم میں ہونا شرط ہے، تاکہ گوشت فقراءِ حرم پر صرف ہو۔

مسئلہ: محرم کو جن جانوروں کا شکار کرنا حرام ہے اگر اس نے ان میں سے کسی جانور کو قتل کردیا تو وہ جانور میتہ، یعنی مردار کے حکم میں ہوگا، اور اس کا کھانا سب پر حرام ہوگا۔

مسئلہ: محرم کو جس جانور کا قتل کرنا حرام ہے اس کو زخمی کرنا یا پَر اکھاڑ دینا یا ٹانگ توڑ دینا بھی حرام ہے۔اگر ان میں سے کوئی صورت پیش آجائے تو تخمینہ کرایا جائے کہ اس جانور کی کتنی قیمت ہوگی پھر اس قیمت کے بارے میں انہیں تین صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرلی جائے جو قتل کی سزا میں مذکور ہوئیں۔

مسئلہ: مذکورہ جانوروں کا انڈا توڑنا ممنوع ہے، اگر محرم نے کسی جانور کا انڈا توڑ دیا تو اس پر اس کی قیمت واجب ہوگی، اگر انڈے میں سے مرا ہوا بچہ نکل آیا تو اس کی قیمت واجب ہوگی۔

مسئلہ: اگر دو محرموں نے مل کر شکار کیا تو دونوں پر الگ الگ جزاء کامل واجب ہوگی۔

مسئلہ: اگر محرم نے حاملہ ہرنی کی پیٹ میں مار دیا، اور اس میں سے زندہ بچہ ثابت نکلا، اور مرگئی تو دونوں کی جزاء واجب ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی غیر محرم نے شکار کیا، پھر احرام باندھ لیا، اس پر واجب ہے کہ اگر وہ شکار زندہ ہے تو اس کو چھوڑ دے، اگر نہ چھوڑا اور اس کے ہاتھ میں مرگیا تو جزا واجب ہے۔

مسئلہ: مچھر کے قتل میں کوئی جزا نہیں، چیونٹی اور مکھی کا بھی یہی حکم ہے۔

مسئلہ: ٹڈی کے مارنے میں ایک کھجور کا صدقہ ہے۔

مسئلہ: شکار قصداً ہو یا خطاءً ہر حال میں جزا واجب ہے۔

مسئلہ: شکار کا امر کرنا، یا اشارہ کرنا، یا شکاری کی رہنمائی کرنا یا مدد دینا محرم کے لئے سب ممنوع ہیں، اور اس پر جزا

واجب ہے۔

مسئلہ: غیر محرم کا شکار اس کیلئے حلال ہے، اور محرم کیلئے بھی بشرطیکہ محرم امرو اشارہ نہ کرے۔

مسئلہ: محرم اگر حج قران کے احرام میں شکار کرے تو اس پر دو جزائیں واجب ہوں گی۔

مسئلہ: محرم کیلئے حرم وغیر حرم دونوں میں شکار ممنوع ہے۔

مسئلہ: حرم کا شکار محرم وغیر محرم سب کیلئے حرام ہے، اور قتل پر دونوں پر جزا واجب ہے۔

مسئلہ: مکہ مکرمہ کے حرم کی گھاس کاٹنا، اور ایسے درخت کو کاٹنا جو کسی کی مملوک نہیں، جسے لوگ بوتے اور لگاتے نہیں اس کا کاٹنا بھی ممنوع ہے۔ اگر کوئی شخص محرم یا غیر محرم حرم کا شکار مارے تو اس کی جزا دینا واجب ہوگی۔ اسی طرح اگر گھاس کاٹ دی، یا غیر مملوک درخت کاٹ دی، تو اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہوگا۔

مسئلہ: اگر کوئی درخت حدودِ حرم میں کسی شخص کی ملکیت میں اُگ آیا، تو اس کے کاٹنے پر ایک قیمت حرم کی وجہ سے واجب ہوگی جس کا صدقہ کرنا لازم ہوگا، اور ایک قیمت بطورِ ضمان اس کے مالک کو دینی ہوگی۔ اور اگر حرم کے کسی ایسے درخت کو کاٹ دیا جسے لوگ اگاتے ہیں تو اس صورت صرف ایک ہی مالک کو قیمت دینا واجب ہوگا۔

مکہ مکرمہ کی چاروں طرف سرزمین حرم ہے، جس کی مسافتیں ہر سمت مختلف ہیں۔ جدہ کی طرف تقریباً پندرہ کلومیٹر ہے، اور عرفات کی طرف تقریباً چودہ کلومیٹر ہے، منیٰ اور مزدلفہ دونوں حرم میں داخل ہیں، اور تنعیم یعنی مسجد عائشہ جو مدینہ منورہ کے راستہ میں آتا ہے، یہ حرم سے خارج ہے، مگر موجودہ وقت میں شہر مکہ مکرمہ تنعیم سے بہت آگے تک پھیلا ہوا ہے، اسی طرح منیٰ شہر مکہ سے خارج تھا مگر اب شہر مکہ کا حصہ ہے، اسی وجہ سے علماء کرام کا فتویٰ ہے کہ حجاج کیلئے منیٰ کی بیتوتت (رات گزارنا) اور مکہ کی بیتوتت برابر ہے، حاجی کی مرضی ہے کہ منیٰ میں رہے یا مکہ میں۔

احرام میں سمندری شکار جائز ہے:

فرمایا: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ﴾ مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے سمندر کا شکار کرنا اور اس کا کھانا حلال ہے۔ اس میں محرم اور غیر محرم دونوں برابر ہیں۔ پہلے سے دریائی شکار کر کے سفر میں جاتے وقت ساتھ لے گئے، یا سفر میں دریائی شکار کر لیں یہ مسافروں کیلئے درست ہے، محرم ہوں یا غیر محرم، اور خشکی کا شکار محرم کیلئے حرام قرار دیا گیا، خواہ کسی قسم کے احرام میں ہو (احرام حج یا عمرہ یا قران)۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ جملہ احکام کی پابندی کرو، اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے اوامر و نواہی

کی مخالفت ہرگز نہ کرو، اس کی طرف سب کو جمع ہونا ہے، وہاں پیشی ہے، حساب ہے، اس کیلئے ابھی سے فکر مند رہو۔

جَعَلَ اللهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ۚ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۚ وَاللهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

ترجمہ: کعبہ شریف جو احترام والا گھر ہے اللہ تعالیٰ نے اسے لوگوں کے قائم رہنے کا سبب قرار دیا ہے، اور حرمت والے مہینہ کو اور ہدی کے جانوروں کو اور ان کے گلے جو پٹے پڑے ہوں ان سب کو لوگوں کے قائم رہنے کا ذریعہ بنایا ہے، یہ اس لئے کہ تم جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، اور بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے ﴿۹۷﴾ تم جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے، اور اللہ تعالیٰ بلاشبہ بخشنے والا مہربان ہے ﴿۹۸﴾ رسول کے ذمہ صرف پہنچانا ہے، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، اور جو چھپاتے ہو ﴿۹۹﴾

معارف ومنازل

"کعبہ" عربی زبان میں اوپر کو اٹھے ہوئے چوکور مربع گھر کو کہتے ہیں، کعبہ شریف کی جگہ نشیب وادی میں ہے، اور کعبہ شریف دور سے اوپر اٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں کو امن واطمینان اور لوگوں کے قیام وبقاء کا ذریعہ وسبب بتلایا کہ جب تک ان چاروں چیزوں کا قیام رہے گا اسی وقت تک لوگ اور جہاں بھی باقی رہیں گے، اور جب یہ چار چیزیں اور ان کا وجود واحترام ختم ہوجائے گا تو نہ دنیا باقی رہے گی، اور نہ ہی لوگ۔

پہلی چیز مرکز اصلی کعبۃ اللہ شریف ہے، اس کی تشریح آل عمران آیت ۹۶ کے تحت گزر چکی ہے۔ دوسری حرمت والے چار مہینے جن کی تفصیل سورۂ بقرہ آیت ۱۹۰ کے تحت گزر چکی ہے۔ تیسری ہدی۔ چوتھی قلائد۔ ان دونوں کا مکمل بیان سورۂ مائدہ کے شروع میں گزر چکا۔

تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ کعبہ شریف بذات خود اور اس کے تینوں متعلقات لوگوں کے قیام وبقاء کا سبب ہیں، جب تک یہ چیزیں دنیا میں رہیں گی، اور کعبہ کا استقبال اور حج وعمرہ کا، اور اسی طرح کعبہ کے ادب واحترام کا

سلسلہ بھی باقی رہے گا، تو دنیا میں امن و اطمینان کے ساتھ لوگوں کے قیام اور بقاء کا سلسلہ باقی رہے گا، اور جب قربِ قیامت کعبہ کا استقبال واحترام اور حج وعمرہ کا سلسلہ بند ہوجائے گا، بمطابقِ صحیح حدیث حج موقوف ہوگا، اور بیت کا احترام منقطع ہوجائے گا، ہَدی اور قلائد موقوف ہوں گے، رُوئے زمین پر اللہ اللہ کہنے والا کوئی باقی نہیں رہے گا، پھر جب چاروں طرف شرار الخلق بُرے لوگوں کا راج ہوگا، تو فَعَلَيهِمْ تَقُوْمُ السَّاعَةُ پس ایسے لوگوں پر قیامت قائم ہوجائے گی۔

کعبہ شریف اسی طرح اس کے متعلقات کا ادب واحترام اور محبت وچاہت یہ کوئی نئی چیز نہیں، ابتداء آفرینش دنیا سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی بقولِ مورخین چالیس روز تک کعبہ کا طواف کرتی رہی، پھر دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے زمانہ میں بھی یہ سلسلہ بدستور جاری رہا، حتیٰ کہ کفر وجاہلیت کے بدترین دور جو نمرود بن کنعان کا زمانہ رہا، جہاں ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ کی از سرِ نو تعمیر کی، اور تمام مناسکِ حج کا احیاء فرمایا، اس کے ساتھ حرم مقدس کا ادب واحترام جو صدیوں سے ختم ہوچکا تھا، دوبارہ از سرِ نو زندہ ہوکر لوٹ آیا۔

اسلام کی آمد سے پہلے مشرکینِ عرب میں کعبہ شریف اور اَشہرِ حُرم اور دیگر متعلقات کا اتنا ہمہ گیر سختی کے ساتھ ادب واحترام جاری رہا جس کی مثال نہیں۔ کتبِ تواریخ مکہ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکہ اور کعبہ نیز متعلقاتِ کعبہ کی عزّت واحترام میں جاہلیت کے لوگوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہاں تک کہ ننگے ہوکر طواف کرتے رہے، اور یہ سب کچھ ادب واحترام کے جذبات کے تحت تھا۔ واللہ اعلم

تفسیر درمنثور میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کوئی شخص کوئی جرم کرکے حرم میں پناہ لے لیتا تو اسے قتل نہیں کرتے تھے، بسا اوقات مقتول کے بیٹے اور وارث قاتل کو آمنے سامنے دیکھ کر آنکھیں بند کرکے گزر جاتے۔

آیت بالا میں ارشاد فرمایا کہ کعبہ شریف جو بیت محترم ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے لوگوں کے قائم رہنے اور امن وامان کا ذریعہ بنایا، اسی کے ساتھ وہ بے شمار انسانوں کے قیام یعنی ان کی معیشت رزق وروزی کا عجیب ذریعہ بنا ہوا ہے۔ زمین کے دور دراز گوشوں سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ حج وعمرہ کی ادائیگی کیلئے مکہ معظمہ آتے ہیں، موسمِ حج اور ماہِ رمضان میں اتنا بڑا اجتماع منعقد ہوتا ہے جس کی نظیر ومثال نہیں۔

یہ سارے لوگ اتنے آرام وسکون سے رہتے ہیں کہ کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں کرتے ہیں، پانی سے لے

کر دیگر اشیاء خورد و نوش اتنی کثرت اور وافر مقدار میں دستیاب ہوتی ہیں کہ انسانی عقل حیران رہتی ہے۔ اگر اتنے کثیر لوگ دنیا کے کسی ترقی یافتہ (امریکہ جیسے) ملک کے دار الحکومت میں بالفرض جمع ہو جائیں تو شاید ایک روز میں سارا نظام مفلوج ہو کر درہم برہم ہو جائے۔ مگر ربّ العزّت سبحانہ نے اپنے مرکزِ تجلیات میں ایسا جامع تکوینی بے مثال نظام جاری فرمایا ہے جس کی جامعیت تک انسانی عقل نہیں پہنچ سکتی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چاروں طرف انسانوں کا ایک ایسا سیلاب رواں دواں ٹھاٹیں مارتا ہوا نظر آتا ہے، کہ زمین کا ایک میٹر جتنا قطعہ بھی نظر نہیں آتا، یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہنے کے باوجود کوئی ہنگامہ اور بدنظمی دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہی حال اور یہی سلسلہ منیٰ اور مزدلفہ اور عرفات شریف کے میدان میں جاری رہتا ہے۔

ان لاکھوں انسانوں کے آنے اور قیام کرنے اور رہنے اور ضرورت کی اشیاء خریدنے کے باعث اہلِ عرب اور خاص کر اہلِ مکہ کی معیشت مستحکم رہتی ہے، اور اس تاریخی اجتماعی خریداری کے اثرات پورے عالم کی فیکٹریوں اور کمپنیوں پر پڑتے ہیں۔

اہلِ مکہ کیلئے تو کعبۃ اللہ شریف ذریعہ قیام اور خوشحالی و بقاہی ہے۔ بعض اعتبار سے پورے عالم کی بقاء کا ذریعہ بھی ہے۔ بحری جہازوں، بسوں، مختلف گاڑیوں سے لوگوں کی آمد اور ہوائی جہازوں کی اڑان، کروڑوں روپے کے کرائے اور بسوں، کاروں کے سفران سب کے ذریعہ جو عرب و عجم میں مالی آمدنی ہے، پورے عالم کو اس کا اقتصادی فائدہ پہنچتا ہے، اور پھر چونکہ حج ایک عظیم مثالی عبادت ہے جو سراپا اللہ تعالیٰ کے ذکر سے معمور ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی اس عالم کی روح ہے، اس لئے بھی کعبہ شریف سارے عالم کی بقاء کا ذریعہ ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک دنیا میں ایک مرتبہ بھی اللہ اللہ کہا جاتا رہے گا۔ [مسلم]

جب سارے مؤمنوں کی ارواح ریح طیبہ کے ذریعہ قبض ہو جائیں گی، اور ایمان والا کوئی نہیں رہے گا، اور کعبہ شریف کا استقبال اور حج بھی ختم ہو جائے گا، یہی دنیا کی بربادی کا سبب اور ذریعہ ہوگا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی ☆ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

﴿ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ اور یہ اس لئے کہ تم جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، اور بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

شیخ ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم محیط کے بارے میں خبر دی ہے کہ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے، اس نے دین ودنیا کے منافع حج میں رکھ دیئے۔ یہ تدبیر ایسی عجیب ہے کہ جس میں امت کیلئے اول سے لے کر آخر تک، یعنی قیامت کا دن آنے تک سب کی صلاح کا انتظام ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ عالم الغیب نہ ہوتا اور تمام اشیاء کو ان کے وجود سے پہلے نہ جانتا تو ایسی تدبیر نہ ہوسکتی تھی جس میں بندوں کی دین ودنیا کی صلاح ہے۔ پھر فرمایا:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾٩٨ بلاشبہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس میں تنبیہ ہے کہ احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی نہ کرو، اور احیاناً کہیں خلاف ورزی ہوجائے تو جلدی سے توبہ کرو، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہوجاؤ، وہ غفور ہے، رحیم ہے۔ پھر فرمایا:

﴿مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴾٩٩ رسول کے ذمہ کچھ نہیں ہے، مگر پہنچانا، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ اس میں اس پر تنبیہ ہے کہ تمام احکام کی پابندی کرو، رسول کے ذمہ صرف پہنچادینا ہے، آگے عمل کرنا تمہارا کام ہے، ہر طرح کے اعمال ظاہرہ اور باطنہ کو صحیح طریقہ پر انجام دو، اللہ تعالیٰ تمہارے تمام ارادوں سے اور اعمال ظاہرہ وباطنہ سے مکمل باخبر ہے، وہ تم سے حساب لے گا۔

.......❁.......❁.......❁.......

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ
الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ١٠٠

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ خبیث اور طیب برابر نہیں ہیں، اگرچہ (اے مخاطب!) تجھے خبیث کی کثرت بھلی معلوم ہوتی ہو، سوائے عقل والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ ١٠٠

معارف ومنازل

لباب النقول میں آیت کریمہ کا سببِ نزول یہ بیان کیا ہے کہ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی

حرمت بیان فرمائی، تو ایک دیہات کا رہنے والا آدمی کھڑا ہوا اور کہا کہ میں شراب کی تجارت کرتا تھا، اس کے ذریعہ میں نے مال حاصل کیا، اگر میں یہ مال اللہ تعالیٰ کی طاعت میں خرچ کروں تو کیا یہ مال مجھے نفع دے گا؟ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا مگر پاکیزہ مال کو، اس پر اللہ تعالیٰ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق فرماتے ہوئے یہ آیت:

﴿قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ﴾ نازل فرمائی، کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے، پاکیزہ مال قبول فرماتے ہیں، ناپاک مال اور ہر قسم کی ناپاک چیز کو قبول نہیں فرماتے ہیں۔

اکثر مفسرین کرام کے نزدیک خبیث سے حرام، اور طیب سے حلال مراد ہے، اور یہ الفاظ اپنے عموم کے لحاظ سے ہر حلال وحرام، اچھے بُرے، حق وباطل، متقی انسان، فاسق انسان، مؤمن وکافر، سچ، جھوٹ وغیرہ، غرض یہ ہے کہ یہ الفاظ ہر قسم کے اچھے اور برے انسان اعمال، کردار، مال وغیرہ سب کو شامل ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے اس کو عموم پر رکھنے کی خاطر اس کا موصوف ذکر نہیں فرمایا، اور یہ بات واضح ہے کہ اچھے اور برے کبھی برابر نہیں ہو سکتے، جیسے کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ سارے جہاں کے خبیث کفار ایک مؤمن انسان کے ساتھ برابر نہیں ہو سکتے، اور سارے غیر متقی فاسق وفاجر ایک متقی دیندار آدمی کے ساتھ برابر نہیں ہو سکتے۔ [بخاری]

خلاصہ یہ ہے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دیہاتی سے فرمایا کہ تم اگر شراب سے حاصل شدہ مال کو اللہ تعالیٰ کی طاعت میں خرچ کروگے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر بھی اس کی حیثیت نہیں ہوگی، کیونکہ خبیث مال کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی پزیرائی نہیں۔

یہ تو اُخروی پہلو ہے، لیکن دنیاوی اعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تو حلال مال میں جس قدر فوائد وثمرات اور سکون وآرام میسر آتا ہے اس کا عُشر عشیر بھی حرام مال اور مشکوک مال سے نصیب نہیں ہوتا۔ حلال کمانے اور کھانے والے آرام کی نیند سوتے ہیں، جبکہ حرام مال کے ڈھیروں کے مالک ساری رات جاگتے اور پریشان رہتے ہیں۔ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جب ناجائز اور ظلم وتعدی سے وصول کئے ہوئے سرکاری ٹیکس لوگوں کو واپس کئے تو بیت المال کے دمشق سے لے کر کشمیر تک سارے خزانے خالی ہو گئے، ایک عامل گورنر نے جو کہ سرکاری خزانوں کا انچارج تھا، نہایت پریشانی کے عالم میں امیر المؤمنین رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا، اور فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اب مملکت کا نظام کیسے اور کس طرح چلے گا؟ (خضر علیہ السلام سے تعلیم پانے والے امیر المؤمنین رحمۃ اللہ علیہ نے جو

جواب لکھا وہ کتنا قیمتی ہے؟ اور آبِ زر سے لکھنے کے لائق وسزاوار ہے)۔

فرمایا: گورنر صاحب! تمہارے خزانے مسکینوں کے خون سے بھرے ہوئے تھے، جنہیں ہم نے صاف کردیا، اب تم عدل وانصاف سے انہیں بھردو، پھر دیکھو اسی کم مال طیب سے تمہارے ملک کے سارے مسائل حل ہوں گے، اور زکوٰۃ قبول کرنے والا کوئی فقیر تمہیں نہیں ملے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا سب نے دیکھا۔

ظاہر بین اور باطن بین کی نگاہوں کا فرق:

ایک ظاہر بین نگاہ تو ایک ہزار روپیہ کو جونا جائز اور حرام ہو اس سو (۱۰۰) روپیہ سے زیادہ سمجھے گی جو حلال ذریعہ سے حاصل کیا گیا ہو، مگر آیت کریمہ نے قدر و قیمت کا حقیقی اور بنیادی معیار یہ پیش فرمایا کہ ربّ العزّت جل شانہ کی نافرمانی سے حاصل کیا ہوا مال ناپاک اور خبیث ہے، وہ اگر پہاڑوں جتنا زیادہ ہو تو اس مختصر اور قلیل مال سے کم قیمت ہے جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے اصول سے حاصل کیا گیا ہو۔

یہ کم اور پاکیزہ مال اگرچہ مختصر ہو، غلاظت کے اس ڈھیر سے بہتر ہی ہوگا۔ دیکھیں! خالص عطر کی ایک چھوٹی شیشی پیشاب سے بھرے ہوئے ڈرم سے قیمتی ہے، پس ایک سچے متقی مسلمان کو چاہئے کہ وہ تھوڑے سے حلال مال پر قناعت کرکے اپنے ایمان کا تحفظ کرے، اور حرام بلکہ مشکوک مال سے اجتناب کرے جو کہ قبر میں خطرناک سانپ بن کر صاحبِ مال کو قیامِ قیامت تک ڈستا رہے گا۔

اسی طرح دیگر امور میں اور رائے شماری میں قلّت وکثرت، حق وصداقت کا ہرگز معیار نہیں بن سکتی، بلکہ دنیا کے ہر طبقہ کے احوال وکیفیات پر اگر نظر ڈال کر دیکھا جائے تو برائیوں اور خباثتوں کی کثرت نظر آئے گی۔ ایمان کے مقابلہ میں کفر، تقویٰ، طہارت، دیانت وامانت کے مقابلہ میں فسق وفجور، حق کے مقابلہ میں باطل، علم کے مقابلہ میں جہالت، انصاف کے مقابلہ میں بے انصافی، عدل کے مقابلہ میں ظلم، نیکیوں کے مقابلہ میں برائیاں، عقل کے مقابلہ میں حماقت، غرض یہ ہے کہ ہر اچھی چیز کے مقابلہ میں ردّی اشیاء اور برائیاں زیادہ ملیں گی۔

یہ سلسلہ محض دنیوی نہیں، بلکہ آخرت میں بھی اس کا ایسا ہی ظہور ہوگا، ہزار میں سے جنتی صرف ایک ہوگا، جبکہ ہزار میں ۹۹۹ سب جہنمی ہوں گے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ عددی طور پر قلت وکثرت کسی چیز کی اچھائی برائی جانچنے کا ہرگز معیار نہیں ہوسکتی، بلکہ چیز اور جماعت یا افراد کے ذاتی حالات وکیفیات اور خوبیاں اس کی بنیاد ہوتی ہیں، اور اسی پر ہر چیز کو پرکھا جائے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تم کو ناگوار ہوں، اور اگر تم ان کے بارے میں اس وقت سوال کرو گے جس وقت قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تمہارے لئے ظاہر کردی جائے گی، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں معافی دیدی، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے، حلم والا ہے﴿۱۰۱﴾ بلاشبہ تم سے پہلے لوگوں نے سوال کئے تھے پھر ان کے منکر ہو گئے﴿۱۰۲﴾

معارف ومنازل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصے کی حالت میں تھے، چہرہ انور سرخ ہو رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہو گئے، ایک شخص نے سوال کیا کہ میرا ٹھکانہ کہاں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دوزخ میں ہے۔ پھر ایک اور آدمی کھڑا ہوا، اس نے کہا میرا باپ کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرا باپ حذافہ ہے۔

یہ منظر دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ ٹھنڈا کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنے کیلئے) یہ پڑھنا شروع کیا: "رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَسُوْلًا وَبِالْقُرْاٰنِ اِمَامًا"۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت اور شرک میں تھے، نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ہمارے باپ کون ہیں، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اور یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ﴾ [ابن کثیر، ابن جریر]

صحیح بخاری جلد دوم میں ہے کہ کچھ لوگ سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بطورِ استہزاء اور تمسخر پوچھا کرتے تھے، کوئی کہتا تھا: میرا باپ کون ہے؟ اور کوئی کہتا تھا: میری اونٹنی کہاں ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی۔ اسی طرح بخاری جلد اول کتاب العلم میں یہی حدیث ایک ہی مقام پر دومرتبہ مذکور ہے، ان کا مطلب بعینہٖ

وہی ہے جو ابھی ذکر ہوا۔

چونکہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ایسے بے مقصد سوالات کو ناپسند فرماتے تھے جن کا دنیا و آخرت میں کوئی فائدہ نہ ہو، جس طرح ارشاد ہے: ”نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم عَنْ قِيْلٍ وَقَالٍ وَكَثْرَةِ السُّؤَالِ وَاِضَاعَةِ الْمَالِ“۔[بخاري] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیل وقال اور کثرت سوال اور اضاعتِ المال سے منع فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بامقصد سوالات سے کبھی ناراض نہیں ہوتے تھے، مگر بے مقصد سوالات سے کبھی خوش نہیں ہوئے، کیونکہ وہ لایعنی کے زمرے میں ہیں۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ جب آیت: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ [آل عمران:٩٧] (اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے، جو لوگ اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں) نازل ہوئی تو بعض لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہر سال حج فرض ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی۔ حاضرین نے دوبارہ سوال کیا، تو فرمایا: نہیں (ہر سال فرض نہیں ہے)، اور ارشاد فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا فرض ہوجاتا، اور اگر ہر سال حج فرض ہوجاتا تو تم اس کی طاقت نہ رکھتے (لہٰذا تمہیں سوال نہیں کرنا چاہئے تھا، اور میری خاموشی پر خاموش رہنا چاہئے تھا، مگر تم نے ایسا نہیں کیا اور دوبارہ سوال کیا) اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ﴾ [ابن كثير] کسی آیت کے اسبابِ نزول متعدد ہوسکتے ہیں، اس میں کوئی تعارض کی بات نہیں ہے۔

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ شانہ نے مسلمانوں کو اس بات کی ہدایت فرمائی کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی چیزوں کے بارے میں سوال نہ کیا کرو جن کی ضرورت نہیں ہے، اور جن کے ظاہر کرنے سے سوال کرنے والے کو کوئی ناگواری ہوگی، اور جواب اچھا نہ لگے گا۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ میرا ٹھکانہ کہاں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ دوزخ میں ہے، یہ بات معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، پھر جو جواب ملا وہ نہایت ناگوار اور پریشان کن ہے۔

دراصل یہ سائل منافق تھا، اور سوال استہزاء کے طور پر کیا تھا، مگر اس کو بڑی خفت اور شرمندگی ہوئی، ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو مخلصین کی جماعت تھی، وہ سب جنتی ہیں، جیسا کہ اس پر اجماع امت ہے۔

یوں تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مسائل واحکام کے بارے میں بڑے عالی دماغ اور سنجیدہ تھے، وہ

مجلسِ نبوی میں حاضر ہوکر بڑے غور وفکر سے مفید سوالات کرتے تھے، اور انہیں با مقصد سوالات کرنے کا باقاعدہ حکم بھی تھا، جیسے ارشاد ہے: ﴿فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۴۳، الأنبياء: ۷] (پس سوال کیا کرو اہلِ علم سے اگر تم نہیں جانتے) تو واضح ہے کہ آیت کریمہ میں مطلق سوال سے ممانعت نہیں، بلکہ بے مقصد سوالات سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں آیت بالا میں جن اشیاء کے بارے میں سوال کرنے کی ممانعت فرمائی ہے ان سے وہ سخت احکام مراد ہیں جن کی انہیں طاقت نہیں، اور وہ پوشیدہ بھید کی چیزیں مراد ہیں جن کے ظاہر کرنے میں بعض لوگوں کی رسوائی ہوسکتی ہے، کیونکہ جس طرح گزشتہ امور کے بارے میں سوال کرنے پر نتیجہ اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کو ظاہر کیا جائے۔ اسی طرح تکالیفِ شاقہ یعنی سخت احکام کے بارے میں سوال کرنا اس امر کو مستلزم ہے کہ حکماً ان احکام کو بطورِ سزا سوء ادبی کی پاداش میں واجب کردیا جائے، اور جو طریقہ اختیار کرنا چاہئے تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کو مان لینا، اور کیفیت اور کمیت کی بحث میں نہ پڑنا، اس کے ترک کرنے کی وجہ سے حکم میں سختی کردی جاتی ہے۔ [روح المعاني]

﴿قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ﴾ کہ تم سے پہلے لوگوں نے اپنے پیغمبروں سے بیجا بے مقصد سوالات کئے تھے، جب ان کے سوالات کے جوابات آگئے تو ان پر چلنے سے منکر ہوگئے، اور بجائے عمل کے نقصان میں پڑ گئے، چنانچہ ارشاد گرامی ہے کہ پچھلے لوگ اس لئے تباہ ہوگئے کہ انہوں نے پیغمبروں سے بیجا اور بے مقصد سوالات کئے، اور ان کے بتلائے ہوئے طریقہ پر چل نہیں چلے، اور خلاف ورزی کرکے ہلاک ہوئے۔

چنانچہ بنی اسرائیل کو ایک مقتول کے سلسلہ میں قاتل کا پتہ بتلانے کیلئے ایک گائے بیل ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، مگر انہوں نے بے موقع سوالات کرنے شروع کئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوالات کے ساتھ قیدیں بڑھتی گئیں، اور ان کے گلے میں پھندے پڑتے چلے گئے۔ حدیث شریف میں ہے: اگر وہ کسی بھی گائے بیل کو ذبح کرڈالتے، چون وچرا سے باز آجاتے، تو بآسانی اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، تو چند روپے قیمت کی گائے کے بدلے اس کی کھال بھر سونے کے بدلہ خریدنی پڑی، اور مقتول نے زندہ ہوکر قاتل کا پتہ ونام بتلادیا۔ [مظهري]

اسی طرح قوم ثمود نے پہاڑ سے اونٹنی برآمد کرنے کی حضرت صالح علیہ السلام سے درخواست کی تھی، اور ایمان نہ لائے، اونٹنی کو ہلاک کر ڈالا، اور عذاب میں تباہ ہوئے۔ اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا سوال کرنا کہ آسمان سے مائدہ نازل ہو، مائدہ نازل ہوا، تو ان لوگوں سے کہا گیا تھا کہ جتنا کھا سکتے ہو کھا لو، مگر ذخیرہ کر کے نہ رکھو، لیکن وہ لوگ نہ مانے اور گناہگار ہوئے۔

ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر فرمائے ہیں، تم انہیں ضائع نہ کرو، اور کچھ حدود مقرر فرمائی ہیں، تم ان سے آگے نہ بڑھو، اور کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے تم ان کا ارتکاب نہ کرو، اور تم پر مہربانی فرماتے ہوئے بہت سی چیزوں سے خاموشی اختیار فرمائی، اور یہ خاموشی کسی بھول ونسیان کی وجہ سے نہیں ہے (محض شفقت کی وجہ سے ہے) لہٰذا تم ان کے بارے میں سوال نہ کرو۔ [مظهري، دارقطني، نووي في الأربعين وغيرهم]

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بڑا مجرم وہ شخص ہے جس کے پوچھنے سے کوئی چیز حرام ہو جائے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ میں جو کچھ تم کو بتلا دیا کروں اس پر عمل کر لیا کرو، اور جس کام سے روک دیا کروں اس سے رک جایا کرو، اور کسی بات کو میں خود نہیں کہہ رہا ہوں تو تم کیوں کریدتے ہو؟ [أنوار القرآن]

خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو احکامِ شرع میں اس قدر لاپرواہی ہو کہ ضروری احکام بھی تساہل وتغافل کی نذر ہو کر رہ جائیں، کیونکہ یہ تفریط کا درجہ ہے، اور اتنا قیل وقال ہو جائے کہ فضول ومہمل اور بے مقصد سوالات کی بھرمار ہو، کیونکہ یہ اِفراط کا درجہ ہے۔ بعض لوگ فرائض واجبات اور ضروری احکام تک سے بے خبر ہوتے ہیں، لیکن اِدھر اُدھر کے بے مقصد سوالات کے عادی ہوتے ہیں، چاہئے کہ انہیں لگام لگائی جائے۔

عوام الناس کو چھوڑیں بعض علماء وطلباء بھی کبھی کبھی ایسے بے ڈھنگ بے مقصد سوالات کرتے ہیں جن کا کوئی خاص دینی اور شرعی مقصد نہیں ہوتا، ایسے لوگ گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے نہیں، خوب گرجتے ہیں برستے نہیں۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت اس طرح فرمائی کہ وہ سراپا عمل کے غازی بنے، اور ان کے اعمال پوری امت کیلئے نمونہ بنے۔ پورے قرآن کریم میں ان کے سوالات نہایت کم اور معدود ہیں، اس کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

لہٰذا سوالات کے معاملے میں اعتدال پر عمل ہو۔ فرمایا: "حسن السوال نصف العلم"۔ اسی طرح

فرمایا: "من حسن إسلام المرأ ترکه مالایعنیه"۔ افراط وتفریط یہود ونصاریٰ کا پیشہ رہا ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ زندگی کے تمام مراحل اور شعبوں میں اعتدال پر عمل کریں، اور ہر قسم کے افراط وتفریط سے اجتناب کریں۔ وباللہ التوفیق

....

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَحِيۡرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيۡلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰـكِنَّ
الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡـكَذِبَ‌ ؕ وَاَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے مقرر نہیں فرمایا نہ کوئی بحیرہ نہ کوئی سائبہ اور نہ کوئی وصیلہ اور نہ کوئی حام، لیکن جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں، اور ان میں اکثر وہ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے ﴿۱۰۳﴾

معارف ومنازل

دنیا میں شیطان نے انسانوں کی گمراہی پر بڑی محنت کی، اور مسلسل کر رہا ہے۔ شیطان کو انسان کے علاوہ کسی بھی مخلوق سے نہ محبت ہے، اور نہ عداوت، اور نہ کوئی سروکار، چور ہمیشہ وہاں چوری کرتا ہے جہاں کوئی سرمایہ ہو، چونکہ انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے کہ اس کی خلقت وپیدائش کا مقصد توحید اور معرفتِ الٰہی ہے، اور یہی اصل سرمایہ اور دولت ہے، تو شیطان نے تمام گمراہیوں کی جڑ جو شرک ہے، پھر حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے بعد اسی شرک وبت پرستی کی ترویج واشاعت پر سب سے زیادہ ابلیس نے محنت کی، اور شرک کو دنیا کے تمام اکناف واطراف میں پھیلا کر ابلیس نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔

ابھی گزشتہ آیات میں ان پر روشنی ڈالی گئی کہ خباثت اور خبیث بہ نسبت طہارت اور صفائی کے ہر زمانہ میں قیامِ قیامت تک بکثرت زیادہ ہوگی، اور ہزار میں جنتی کوئی ایک فرد ہوگا۔ اسی کے پیش نظر آیت بالا میں شرک کی ایک خاص قسم کا بیان ہو رہا ہے۔ شرک کی بہت سی اقسام ہیں، ان کی تفصیل سورۂ بقرہ میں بیان کر چکے ہیں۔

آیت بالا میں شرک کے چار ناموں کا بیان ہو رہا ہے: اول بحیرہ، دوئم سائبہ، سوئم وصیلہ، چہارم حام۔ یہ چاروں زمانہ جاہلیت کے کفر وشرک کے بڑے شعائر میں شمار ہوتے تھے۔

حضرات مفسرین نے حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت قتادہ، حضرت محمد بن اسحاق اور زجاج

رضی اللہ عنہم اور دیگر علماء کے اقوال نقل کئے ہیں، اور ان چاروں اقسام کے متعلق اچھے خاصے اختلافات بھی بیان فرمائے ہیں۔ مگر سب سے واضح اور بہتر تفسیر وہی ہے جسے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے جامع صحیح میں نقل کیا ہے، وہ یہ ہے:

''بحیرہ'' جس جانور کا دودھ بتوں کے نام پر وقف کر دیتے تھے، کوئی اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔ ''سائبہ'' جو جانور بتوں کے نام پر سانڈ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا، جیسے آج کل بھی مروج ہے۔ ''وصیلۃ'' جو اونٹنی مسلسل مادہ بچہ جنے درمیان میں نر بچہ نہ ہو، اسے بتوں کی نام پر کرتے۔ ''حام'' نر اونٹ جو جفتی کے مخصوص عدد پورے کر لے، اسے بھی بتوں کے نام چھوڑتے تھے۔

بتوں کے نام پر چھوڑنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس پر نہ سواری کرتے، اور نہ خدمت بار برداری کا کام لیتے، نہ اس کا دودھ نکالتے، نہ کسی پانی یا چراگاہ سے اسے روکتے، اس کے رخساروں، کانوں، رانوں پر مخصوص داغ اور نشان لگاتے وغیرہ۔

بڑے صدمے کی بات ہے کہ یہ چند رسوم جاہلانہ اور مراسمِ مشرکانہ ہمارے علاقوں کے مسلمانوں میں بھی موجود ہیں، خاص کر برصغیر کے مسلمانوں میں جو لوگ مالدار ہیں یا گائے بھینس کے کاروباری ہیں اس طرح کے شرکیہ رسوم ان میں مروج ہیں۔

﴿وَلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ لیکن جن لوگوں نے کفر کیا وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ تحلیل وتحریم کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے جو کہ تمام چیزوں کا خالق و مالک ہے، بندوں کو اپنے وجود پر ملکیت اور تصرف نہیں، انہیں یہ حق کس نے دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مملوکہ چیزوں میں تحلیل وتحریم کا فیصلہ کریں؟ تو کسی مخلوق کیلئے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ اپنے طریقہ سے کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دیدے۔

اول تو جانوروں کو خود حرام قرار دیدینا بہت بڑا جرم ہے، پھر اس تحریم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا، جبکہ اس نے ان کے حرام ہونے کی کوئی تصریح نہیں فرمائی، یہ گناہ در گناہ اور جرمِ عظیم ہے۔ یہ سب تحریم اور تحلیل اہلِ جاہلیت کی خود اپنی تراشیدہ تھی، اور اس کے احکام و مسائل سب ان لوگوں نے تراش رکھے تھے، اللہ تعالیٰ کے دین اور شریعت سے ان باتوں کا کوئی تعلق نہ تھا، لیکن وہ یوں جھوٹ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہم یوں کرتے ہیں،

شرک کرتے تھے پھر اس کی بھی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے تھے۔

قرآن کریم نے ان کے شرک اور شرکیہ مزعومات اور اللہ تعالیٰ کی طرف ان کی نسبت سب کی تردید فرماتے ہوئے ان کے جھوٹ اور افتراء کی قلعی کھول دی۔

شیطان کا طریقہ ہر موقع پر یہی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے شرک کرواتا ہے، اور پھر اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔

ایک مرتبہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج گرہن کی نماز پڑھائی، نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ مجھے اس مقام میں وہ سب چیزیں دکھائی گئیں جن کی تم کو خبر دی گئی ہے، میں نے یہاں جنت کو دیکھا اور دوزخ کو بھی دیکھا، اور میں نے دوزخ میں عمرو بن لحی خزاعی کو دیکھا، اور یہ وہ خبیث شخص تھا جس نے سائبہ جانوروں کا طریقہ جاری کیا، اور رفتہ رفتہ پورے عرب میں پھیلایا، اور ملّت ابراہیمی کے تمام طور و طریقے مٹا دیئے، حتیٰ کہ لوگوں نے کعبۃ اللہ شریف کو ۳۶۰ بتوں سے بھر دیا، جنہیں رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یومِ فتح مکہ میں ہمیشہ کیلئے مٹا کر عظمت و برکتوں والے بیت ربی کو بتوں کی نجاست و خباثتوں سے معطر کر کے پاک کر دیا۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ قَالُوۡا حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ شَيۡــًٔا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، اور رسول کی طرف، تو کہتے ہیں کہ ہمیں وہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، کیا باپ دادوں کے پیچھے چلیں گے اگرچہ ان کے باپ دادے کچھ بھی نہ جانتے ہوں، اور ہدایت پر نہ ہوں؟ ﴿۱۰۴﴾

معارف ومنازل

معیارِ تقلید:

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر انسان خود بخود اپنی عقلمندی و ہوشیاری کے ذریعہ صحیح طور پر اپنے مستقبل کیلئے فوز و فلاح کا تعین نہیں کرسکتا، پس لازماً اسے دوسرے لوگوں کی راہنمائی اور مشوروں کی احتیاج رہتی ہی ہے، اگر اسے

ایسے لوگوں کا واسطہ اور راہنمائی حاصل رہی جو ہر نشیب وفراز کے سمجھنے اور جاننے کے ساتھ مخلص بھی ہوں تو ایسے لوگوں کی تقلید واقتداء فائدہ مند رہے گی، کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ تجربہ کار وعقلمند اور بینا لوگ گم کردہ راہ نابینا کی راہنمائی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی خود عقل وبینائی کا گم کردہ کورا ہوگا، وہ دوسرے کورے نابینا کی کیا راہنمائی کر سکے گا؟ سوائے اس کے کہ اسے بھی اسی طرح تباہ کردے، جس طرح وہ خود تباہی کا شکار ہے۔

ع ۔ او خویشتن گم ست کرا رہبری کند

تفسیر درمنثور نے ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جاہلانہ رسوم اور تقلید آباء واجداد میں عرب کے لوگ اس قدر جکڑے ہوئے تھے کہ اگر ان میں سے کوئی خوش نصیب اسلام قبول کرتا تو لوگ اسے یہی طعنہ دیتے کہ یہ آباء واجداد کا دین چھوڑ کر صابی یعنی بے دین ہوگیا، یہی نہیں، بلکہ وہ سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہی ناپاک پروپیگنڈہ کرتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کہتے تھے۔

قرآن کریم کا یہ جملہ تقلید اور اقتداء کا معیار دو چیزوں کو قرار دے رہا ہے: ایک علم، دوسرے ہدایت کو۔ علم سے مراد منزلِ مقصود اور اس کے راستوں کا پوری طرح جاننا سمجھنا، اور اہتداء کا مطلب یہ ہے کہ اس راستے پر چلنا جس کا تعین علم سے ہوا، یعنی صحیح علم کے مطابق عمل کرنا، لہٰذا جس کو مقتدا اور پیشوا بنایا جائے اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ منزل آشنا بھی ہو، اور وہ اس راہ پر چل بھی رہا ہو، یعنی اس کا عمل صحیح عمل کے مطابق ہو، یہ اصلی اور صحیح کھرا معیار ہے، جسے قرآن کریم نے سراہا، اور اس پر راہنمائی فرمائی۔﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ﴾ [الأنعام: ۹۰] (یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے ہدایت کی تھی، لہٰذا تم بھی انہی کے راستے پر چلو)۔

لیکن محض باپ دادا ہونا، یا کسی کا ہم خیال وہم مذہب ہونا، یا اس کا جتھ بند ہونا، یا صاحب عزت واقتدار ہونا، یا قومی سردار ہونا، یہ کھوٹا معیار ہے، اور قابلِ التفات وتقلید ہرگز نہیں۔ یہاں انہی لوگوں پر تنقید اور ملامت کرتے ہوئے قرآن حکیم نے یہ نہیں فرمایا کہ تمہارے آباء واجداد جاہل تھے، اندھے نابینا اور گمراہ تھے، کیونکہ ایسا دلخراش جملہ اشتعال کا باعث بن سکتا تھا، جس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا، اور مخاطب ضد میں آکر ہدایت سے محروم ہوجاتا، بلکہ قرآن کریم نے استفہامیہ سوالیہ پیرایہ پر عنوان قائم کرکے پوچھا کہ بتلاؤ اگر باپ دادا بے عقل اور گمراہی پر ہوں تو کیا پھر بھی ان کی تابعداری اور تقلید معقول ہوگی؟

اس شائستہ سوال اور استفہام کا جو اثر ہوسکتا ہے وہ واضح اور ظاہر ہے، لہٰذا اس سے موثر ومفید تنقید کا طریقہ

بھی معلوم ہوگیا، اور یہی مطلب ہے آیت کریمہ: ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾[النحل:۱۲۵] (اوران سے بہترین طریقے سے بحث کرو) کا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ابولہب ابتداء میں اتنا گمراہ اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن نہ تھا جب ابوجہل نے دیکھا کہ ابوطالب کی طرح اگر یہ بھی اپنے بھتیجے کے حامی اور معاون رہے تو پھر ہمارے لئے مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں، ایک دن ابوجہل نے ابولہب کو ابوسفیان کے گھر بلایا، ابولہب کی بیوی ابوسفیان کی بہن تھی، تو ابوجہل نے ابولہب سے کہا کہ آج تمہارے بھتیجے نے فلاں فلاں کے سامنے تازہ انکشاف یہ کیا ہے کہ تمہارے باپ عبدالمطلب اوراس کے آباء واجداد سارے ناپاک اور جہنمی ہیں، بس اتنا ہی سننا تھا کہ ابولہب آگ بگولہ ہوکر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دشمن ہوگیا۔ واللہ اعلم

آیت کریمہ کے آخری جملہ میں قرآن کریم نے ایک صحیح اور بنیادی اصول کی طرف رہنمائی فرمائی کہ تقلید آباء واجدادا اچھی بات ہے، مگر یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ جن کا دامن ہم نے پکڑا ہے وہ خود بھی صحیح راہ پر ہیں، اگر وہی علم وعقل اور ہدایت کے معیار سے گم گشتہ ہٹے ہوئے ہیں تو پھران کی پیروی سے بجز گمراہی کے کیا حاصل ہوگا؟

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی ☆ کاین راہ کہ تو میروی بترکستان ست

(سعدیؒ)

جب مرید وشاگرد کا پیرومرشد جہنم کے راستہ پر گامزن ہوتو مرید کیسے جنت اور ہدایت کی دہلیز پر پہنچ جائے گا؟ پس محض یہ کافی نہیں کہ آنکھیں بند کرکے کسی کے پیچھے چل پڑے۔ ہاں! اگر مقتدااور پیشوا ایسا ہو کہ علم صحیح اور ہدایت وتقویٰ کے زیور سے آراستہ ہو جس کا ہر عمل کردار وگفتار اتباع سنت کا نمونہ ہو، جیسے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، علماء تابعین چاروں ائمہ مجتہدین اور ہمارے زمانہ کے علماء دیوبند ہیں، تو واقعی اقتداء وتقلید محض مفید نہیں، بلکہ واجب و لازم ہوگی۔ رزقنا اللہ اتباعھم۔ آمین

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی جانوں کی فکر کرو، جو شخص گمراہ ہوگا وہ تمہیں ضرر نہ دے گا، جب کہ تم ہدایت پر ہوگے، بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو ان سب کاموں سے باخبر کردے گا جو تم کیا کرتے تھے ﴿۱۰۵﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو صرف اپنے عمل اور اپنی اصلاح کی فکر ہونی چاہئے، دوسرے لوگ جانیں ان کے عمل وہ کچھ بھی کرتے رہیں، ان پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں، جیسے اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ چھوڑ دو، لوگوں کی فکر نہ کرو، ہر شخص اپنی قبر میں سوتا ہے، مگر یہ بات قطعاً غلط ہے، کیونکہ قرآن و حدیث کی تصریحات کی رُو سے ہر مسلمان پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر واجب ہے۔

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اس آیت کریمہ کو پڑھتے ہو، اور اس کا مطلب یہ نکالتے ہو کہ نہی عن المنکر ضروری نہیں، تمہارا یہ سمجھنا درست نہیں ہے، کیونکہ میں نے حضرت اقدس سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ لوگ جب منکر کو دیکھیں اور اس کی تغییر (تبدیلی کی کوشش) نہ کریں، اور اسے دور کر کے نہ مٹائیں، تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر عام عذاب بھیج دے گا۔ [ابن كثير بحواله مسند أحمد]

پھر علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ عبد الرزاق رحمۃ اللہ علیہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے اسی آیت کریمہ بالا کے بارے میں سوال کیا، تو فرمایا کہ یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ جس میں اپنی ذات کو لے کر بیٹھ جاؤ، اور نہی عن المنکر نہ کرو، آج وہ زمانہ نہیں، آج تو بات مانی جاتی ہے، یعنی تبلیغ کا اثر ہوتا رہتا ہے، اور لوگ قبول بھی کرتے رہتے ہیں۔ ہاں! عنقریب ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ تم امر بالمعروف کروگے، تو تمہارے ساتھ ایسا ایسا معاملہ کیا جائے گا، یا یہ فرمایا کہ اس وقت تمہاری بات قبول نہ کی جائے گی، اس وقت آیت پر عمل کرنے کا موقع ہوگا کہ اپنی اصلاح کرو، دوسروں کو چھوڑ دو۔

جب تک خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا دور تھا بقول حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بات مانی جاتی تھی، اور تبلیغ کا اثر بھی ہوتا تھا، پورا معاشرہ کتاب وسنت پر قائم تھا، جب یہ زرّین دور ختم ہوا تو بنوامیہ کے مشکوک ومشتبہ حکمرانوں کا زمانہ آگیا (باستثناء حضرت امیر معاویہ وحضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہما) یہ زمانہ باوجود اس کے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کا تھا، مگر فسق وفجور اور حکمرانوں کے کبر وغرور نے معاشرے کو یکساں تبدیل کیا، اور مدینۃ الرسول صلی

اللہ علیہ وسلم کی مبارک فضاؤں میں مروان جیسے حکمرانوں نے نماز عید کا خطبہ نماز سے پہلے پڑھ کر نہ صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، بلکہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آزاری کی۔ [بخاري]

پھر وہ بھیانک اور ظلم وستم کا تاریک دور شروع ہوا کہ الامان والحفیظ، جس کے تذکرہ سے قلم کانپتا ہے، اور دل گھبراتا ہے، اور آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں، کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ اگر کسی میں جرأت ہو تو تاریخ طبری اور البدایہ والنہایہ اور تاریخ الکامل کا مطالعہ کرے۔

سنن ترمذی میں حضرت ابوامیہ شعبانی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، اور میں نے اس آیت کے بارے میں ان سے دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ میں نے اس آیت کے بارے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ کنجوسی کا اتباع کیا جاتا ہے، اور خواہشات کا اتباع کیا جاتا ہے، اور صاحب رائے اپنی ہی رائے کو پسند کرتا ہے تو اس وقت اپنی جان کی حفاظت کرلینا، اور عوام کو چھوڑ دینا، کیونکہ تمہارے پیچھے ایسے دن آنے والے ہیں کہ ان میں دین پر جمنے والا ایسا ہوگا جیسے اس نے ہاتھ میں آگ کے انگارے پکڑے ہوں، ان دنوں میں عمل کرنے والے کو ایسے پچاس آدمیوں کا ثواب ملے گا جو تمہارا جیسا عمل کرے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حدیث حسن کہا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ ابھی سے اپنی جان کی اصلاح میں لگ کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرو، بلکہ ایسا کرنے کا وقت وہ ہوگا کہ جب یہ کام مشکل ہوگا، اور جان کا خطرہ ہوگا، اور کوئی دینی بات کو نہ سنے گا، اور نہ قبول کرے گا، اور امر بالمعروف کسی قسم کا جرم متصور ہوگا، اور نہی عن المنکر کرنے والے مصیبتوں اور تکلیفوں میں گرفتار ہوں گے، جیسے کوئی شخص ہاتھ میں چنگاری لے لے، تو ایسے وقت لوگوں اور حکام سے کنارہ کش رہو، اور اپنی فکر واصلاح میں وقت صرف کرو۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ
مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ
تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى

وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۞ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۞ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۞

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے جبکہ وصیت کا وقت ہو تو دو وصی ہوں جو دیندار ہوں، تم میں سے ہوں یا تمہارے علاوہ دوسری قوم سے ہوں، اگر تم سفر میں گئے ہوئے ہو، پھر تم کو موت کی مصیبت پہنچ جائے ۞ اگر تمہیں شک ہو تو ان دونوں کو نماز کے بعد روک لو، پھر وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھائیں کہ ہم اپنی قسم کے عوض کوئی قیمت نہیں لیتے، اگرچہ قربت دار ہو، اور ہم اللہ تعالیٰ کی گواہی کو نہیں چھپاتے، بلاشبہ ایسا کرنے کی صورت میں ہم گناہ گاروں میں شامل ہو جائیں گے ۞ پھر اگر اس کی اطلاع ملے کہ وہ دونوں گناہ کے مرتکب ہو گئے تو ان کی جگہ ایسے دو آدمی کھڑے ہوں، جو ان لوگوں میں سے ہوں جن کے بارے میں پہلے دو شخصوں نے گناہ کا ارتکاب کیا، یہ بعد والے دو شخص وہ ہوں جو قریب تر ہوں، سو یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی قسم کھائیں کہ واقعی ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی کے مقابلہ میں زیادہ درست ہے، اور ہم نے تجاوز نہیں کیا، اگر ہم ایسا کریں تو بیشک ہم ظلم کرنے والوں میں شمار ہوں گے ۞ یہ قریب تر ہے کہ وہ گواہی کو صحیح طریقے پر ادا کریں، یا اس بات سے ڈر جائیں کہ ان کی قسموں کے بعد ان پر پھر قسمیں لوٹا دی جائیں گی، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور سنو، اور اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا ۞

معارف ومنازل

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص جو قبیلہ بنی سہم (بدیل بن ورقاء) میں سے تھا، تمیم داری اور عدی بن بداء کے ساتھ سفر میں نکلا، جو شخص بنی سہم میں سے تھا اس کو موت نے آگھیرا، اس وقت وہاں کوئی مسلمان نہیں تھا، لہٰذا اس نے اپنے دونوں ساتھیوں، یعنی تمیم داری اور عدی بن بداء کو اپنے مال کی حفاظت اور ورثاء تک پہنچانے کیلئے وصی مقرر کیا، اس وقت یہ دونوں ساتھی نصرانی تھے، اس نے اپنے مال کی فہرست بنا کر سامان میں رکھ دی، اور اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ میرا یہ مال میرے وارثوں کو پہنچا دینا۔

ان دونوں نے مال تو پہنچا دیا، لیکن میت کے وارثوں نے جب فہرست سے مال کا موازنہ کیا تو اس میں ایک

چاندی کا جام غائب پایا، اس جام پر سونے کا کام بھی تھا، انہوں نے اس جام کا تقاضا کیا، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں معاملہ پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمیم داری اور عدی بن بداء کو قسم دلائی، ان دونوں نے قسم کھالی کہ اس جام کا نہ ہمیں پتہ ہے، اور نہ ہم نے چھپایا ہے۔

اس کے بعد وہ جام مکہ معظمہ میں کسی تاجر کے پاس مل گیا، تاجر سے پوچھا گیا کہ یہ جام تمہارے پاس کہاں سے آ گیا؟ تاجر نے بتایا کہ ہم نے یہ تمیم داری اور عدی بن بداء سے خریدا ہے، اس کے بعد قبیلہ بنی سہم والے آدمی کے دو اولیاء کھڑے ہوئے، اور انہوں نے قسم کھائی کہ اللہ تعالیٰ کی قسم ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی کی بہ نسبت درست ہے، اور یہ جام ہمارے آدمی کا ہے۔ آیت بالا ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ [رواه الترمذي في تفسير سورة المائدة]

بعض روایات میں یوں ہے کہ جب ملزمان یعنی تمیم داری اور عدی کو دوبارہ طلب کیا گیا، اور انہیں بتایا گیا کہ متنازعہ جام فلاں تاجر سے ملا ہے، جس کے پاس تم دونوں نے فروخت کیا ہے، تو ان دونوں نے اپنا بیان یوں بدل دیا کہ یہ پیالہ انہوں نے متوفی بدیل سے زر نقد کے عوض خرید لیا تھا، پھر اپنی مرضی سے آگے فروخت کیا، کہنے لگے: چونکہ اس خرید و فروخت پر کوئی گواہ نہیں تھا، اس لئے ہم نے پہلی مرتبہ اسے ظاہر کرنے سے احتراز کیا۔

معاملہ واضح ہو چکا تھا، اور خیانت کا راز کھل چکا تھا، بدیل کے ورثاء کا شک یقین میں بدل گیا تھا، اور ورثاء میں سے دو آدمیوں نے قسم اٹھا کر کہا کہ یہ پیالہ متوفی کے مال کی فہرست میں لکھا ہوا ہے، اور انہوں نے اسے فروخت ہی نہیں کیا ہے، یہ لوگ غلط بیانی کر رہے ہیں، پہلے کچھ کہتے رہے اب یہ کچھ کہہ رہے ہیں، لہٰذا پیالہ ہمارے ورثاء کا حق ہے، اور ہمیں ملنا چاہئے، اس پر فیصلہ ورثاء کے حق میں ہو گیا، اور اس طرح ایک شہادت کو رد کر کے دوسری شہادت کو قبول کرنے کا قانون بھی ثابت ہو گیا۔

گواہوں کے تقرر کے متعلق ایک عام قانون سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے، فرمایا: ﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ﴾ [البقرة: ۲۸۲] یعنی تم میں سے دو مرد گواہ بن جائیں، اور اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہونی چاہئیں، مگر چونکہ یہاں سفر کا معاملہ ہے اس لئے آسانی پیدا کی گئی کہ:

﴿ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ یعنی تم میں سے دو صاحب عدل ہوں۔

بعض فقہاء کرام فرماتے ہیں یہاں "مِنكُمْ" سے مراد اقرباء ہیں، جو مسلمان ہوں۔ "غَيْرِكُمْ" سے

مراد غیر رشتہ دار ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کسی مسلمان کے حق میں، یا اس کے خلاف کسی غیر مسلم کی گواہی معتبر نہیں ہوتی۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ سفر کے دوران مسلمان گواہوں کا ہونا لازم نہیں ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال ''غَيْرِكُمْ'' سے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے ہم مذہب نہ ہوں تب بھی ان کی شہادت پر مقدمہ کا فیصلہ ہوجاتا ہے، جیسے مذکورہ واقعہ میں ہوا، دونوں گواہ غیر مسلم تھے۔

﴿مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ﴾ یہاں ''صلوٰۃ'' سے مراد نماز عصر ہے، تغلیظ اور پختگی کی خاطر نماز عصر کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھائیں۔ [تفسیر کبیر، قرطبي، خازن وغیرہ]

﴿اِنِ ارْتَبْتُمْ﴾ اگر تمہیں شک ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر گواہوں کے بیان میں شک پڑ جائے کہ یہ جھوٹ کہہ رہے ہیں تو نماز عصر کے بعد ان سے حلفیہ بیان لو کہ وہ اس گواہی کے بدلے کوئی مالی مفاد نہیں حاصل کرنا چاہتے، بلکہ ہم صحیح صحیح حقیقت حال واضح کرنا چاہتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسے معاملے میں دوسری صورت بھی بیان فرمائی:

﴿فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا﴾ اگر یہ ظاہر ہوجائے کہ مذکورہ گواہ گناہ کے مستحق ہوئے ہیں، یعنی انہوں نے جھوٹی گواہی دی ہے، جیسا کہ شانِ نزول کے واقعہ میں گزر چکا ہے، متنازعہ پیالہ برآمد ہونے پر گواہوں کی شہادت جھوٹی ثابت ہوگئی۔

فرمایا: ''اگر وارثوں کو یقین ہوجائے کہ گواہوں نے جو جھوٹی گواہی دی ہے''۔

﴿فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا﴾ تو ان کی جگہ دوسرے دو آدمی کھڑے ہوجائیں۔

﴿مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ﴾ اور وہ ایسے آدمی ہونے چاہئیں کہ جن پر پہلے لوگوں نے گناہ کا استحقاق حاصل کیا ہے، یعنی متوفی کے وارثوں سے دو آدمی پہلی شہادت کے مقابلے دوسری شہادت پیش کریں۔

﴿فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ﴾ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا کر کہیں:

﴿لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا﴾ کہ ہماری شہادت پہلوں کی شہادت سے صحیح اور مبنی بر تحقیق ہے۔

﴿وَمَا اعْتَدَيْنَآ﴾ اور ہم نے اپنے بیان میں کوئی زیادتی نہیں کی، ہمارا مقصد کسی کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں ہے، اور اگر ہم کسی شخص کی حق تلفی کریں گے:

﴿اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ تو ہم ظالموں میں سے ہوجائیں گے، گویا کہ دوسرے گواہ بھی اپنی گواہی کا اسی

طرح یقین دلائیں جس طرح پہلوں نے دیا تھا۔

متبادل شہادت کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ﴾ یہ بات اس کے زیادہ قریب ہے کہ گواہ صحیح اور ٹھیک گواہی دیں۔ ﴿اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ﴾ یا پھر انہیں خوف ہوگا کہ ان کی قسمیں دوسرے آدمیوں کی قسموں کے بعد رد کردی جائیں گی، یعنی وہ اس خوف سے غلط بیانی نہیں کرسکیں گے کہ ان کی گواہی بھی غلط ثابت ہوسکتی ہے، اور اس کے بجائے متبادل شہادت پر فیصلہ ہوسکتا ہے، اس طرح وہ لوگوں کے سامنے رسوا ہوجائیں گے، اور معاشرے میں ہمیشہ کے لئے بدنام ہوجائیں گے، اور بے عزت رہیں گے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝١٠٩ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۫ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝١١٠

ترجمہ: جس دن اللہ تعالیٰ رسولوں کو جمع فرمائے گا، پھر ان سے سوال فرمائے گا: تمہیں کیا جواب ملا؟ وہ عرض کریں گے: ہمیں کچھ علم نہیں، بلاشبہ آپ غیبوں کو خوب جاننے والے ہیں ۝١٠٩ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے عیسیٰ بن مریم! یاد کر میری نعمت جو تجھ پر ہے، اور تیری والدہ پر، جب کہ میں نے روح القدس کے ذریعہ تیری تائید کی، تو باتیں کرتا تھا گہوارہ میں اور بڑی عمر میں، اور جبکہ میں نے تجھے تعلیم دی کتاب کی اور حکمت کی اور توریت کی اور انجیل کی، اور جبکہ تو بناتا تھا مٹی سے پرندہ جیسی صورت میرے حکم سے، پھر تو اس میں پھونک مارتا تھا، تو وہ صورت پرندہ بن جاتی تھی میرے حکم سے، اور تو اچھا کرتا تھا مادرزاد اندھے کو اور برص والے کو میرے حکم سے، اور جبکہ تو نکالتا تھا مُردوں کو میرے حکم سے، اور جبکہ میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روکے رکھا، جبکہ تو ان کے پاس دلیلیں لے کر آیا، ان لوگوں

نے کہا جو کافر تھے کہ نہیں ہے یہ مگر کھلا ہوا جادو ﴿۱۱۰﴾

معارف ومنازل

پہلی دفعہ ابتدائی خلقت کے ساتھ اللہ عزوجل تعالیٰ نے روزِ ازل تمام اولادِ آدم کو ایک میدان (وادی نعمان عرفات) میں جمع فرما کر اپنی اُلوہیت اور توحید کا ان سے عہد و میثاق لے لیا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ لوگ وہ عہد و میثاق بھول گئے، تو دنیا میں یاددہانی کی خاطر ہر زمانہ ہر علاقہ ہر قوم وقبیلہ میں یکے بعد دیگرے انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے رہے، انہوں نے اپنی امتوں کو اس عہد اُلست کی یاددہانی کرائی، اور انہیں توحید کا سبق پڑھایا، اب جب کہ دنیوی زندگی کے سارے مراحل گزر گئے، اور قیامت و میدانِ حشر کا مرحلہ آ پہنچا، تو ازلی اجتماع کے بعد یہ دوسرا بڑا اجتماع منعقد ہوا، جو کہ سابقہ تمام مراحل کا نتیجہ ہی کہلائے گا۔

پس یہ نہایت سخت ہولناک اجتماع ہوگا جس میں ہر شخص، ہر قوم، ہر جماعت سے اجتماعی اور انفرادی محاسبہ ہوگا۔ یہاں انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ سوال وجواب کا تذکرہ کر کے اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں کو بھی بات سمجھائی ہے، کہ ہر شخص کا، فرداً فرداً محاسبہ ہونے والا ہے۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہے: ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶﴾ [الأعراف] (ہم ان لوگوں سے بھی باز پرس کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے، اور خود رسولوں سے بھی پوچھ گچھ ہوگی)۔

بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ وہ وقت آرہا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ شانہ ہر شخص سے براہ راست سوال کرے گا، اور درمیان میں کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ سورۂ نحل میں ارشاد ہے: ﴿يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا﴾ [النحل:۱۱۱] یعنی ہر شخص خود آکر اپنے معاملات کا جواب دے گا، کوئی کسی کی طرف سے وکیل بن کر پیش نہیں ہوگا)۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میدان حساب میں کسی انسان کا قدم نہیں ہلنے پائے گا جب تک وہ ان چند باتوں کا جواب نہ دے:

(۱) انسان سے اس کے وجود کا سوال ہوگا کہ تجھے وجود جیسی نعمت دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا، تو نے اس کا کیا کیا؟ (۲) پھر عمر جیسی نعمت کے متعلق پوچھا جائے گا کہ اس قیمتی عمر کو کہاں اور کن چیزوں میں خرچ کیا؟ (۳) جوانی اور شباب جو کہ بہت بیش قیمت ہے اُسے کہاں خرچ کیا؟ (۴) مال کے متعلق سوال ہوگا کہ اسے کن ذرائع سے حاصل

کیااور کمایا اور کہاں کہاں اسے خرچ کیا؟ (۵) اسی طرح کم یا زیادہ جو علم حاصل کیا تھا اس پر کیا عمل کیا؟ [مشکوۃ براویۃ ابن مسعود رضی اللہ عنہ]

تو فرمایا: ﴿یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوۡلُ مَاذَاۤ اُجِبۡتُمۡ﴾ یاد کرو وہ ہولناک قیامت کا دن جب اللہ تعالیٰ تمام رسولوں علیہم السلام کو اکٹھا کرے گا، اور محاسبہ کا عمل شروع فرمائے گا، اور ان سے پوچھا جائے گا کہ تم کو کیا جواب دیا گیا؟ یعنی جن اقوام کی طرف تمہاری بعثت ہوئی تھی ان اقوام نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا؟

﴿قَالُوۡا لَا عِلۡمَ لَنَا﴾ رسول علیہم السلام جواب دیں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں۔

﴿اِنَّكَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ﴾ تمام پوشیدہ باتوں کو جاننے والا تو ہی ہے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہے: ﴿فَکَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِكَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیۡدًا﴾ [النساء: ۴۱] (پھر اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لے کر آئیں گے، اور ہم تم کو ان لوگوں کے خلاف گواہ کے طور پر پیش کریں گے؟)۔ یہاں اس آیت کریمہ میں کسی چیز کے علم سے مطلقاً انکار کر دیا گیا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ میدانِ محشر کی کارروائی بڑی وسیع ذو وجوہ ہوگی، اور اس کی کیفیتیں مختلف ہوں گی۔ وہاں پر ایک وقت ایسا بھی ہوگا جب ہر طرف دہشت طاری ہوگی، اور ربّ العزت سبحانہ کے جلال کا ظہور ہوگا، وہ ایک لمحہ ہوگا کہ مقرب فرشتے بھی گونگے بہرے ہو جائیں گے، اور انبیاء کرام علیہم السلام پر یہ کیفیت طاری ہوگی فرمایا:

"دَعۡوَی الرُّسُلِ یَوۡمَئِذٍ نَفۡسِیۡ نَفۡسِیۡ رَبِّ سَلِّمۡ" [متفق علیه]

اس آیت میں ﴿لَا عِلۡمَ لَنَا﴾ جو مذکورہ ہے وہ ایسے ہی موقع کی بات ہے کہ کسی کو کچھ معلوم نہ ہوگا، پھر دوسرے مرحلے میں جب کچھ سکون ہوگا تو ہوش ٹھکانے پر آکر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے متعلق گواہی دیں گے، اور سفارش بھی شروع فرمائیں گے۔

مفسرین کرام نے یہ بھی فرمایا کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام لاعلمی کا اظہار کریں گے، یعنی وہ یہ کہیں گے: اے اللہ! تیرے علم کے مقابلے میں ہمارا علم اتنا محدود ہے جو کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ جواب ادب پر محمول ہے، کبھی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مسئلہ کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت فرماتے، تو وہ جاننے کے باوجود ادباً عرض کرتے: اَللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَعۡلَمُ۔ اور یہی ادب کا مقام ہے۔

تیسری توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب تک ہم دنیا میں رہے ہمارا علم ظاہری چیزوں تک محدود تھا، پوشیدہ

باتوں تک ہماری رسائی نہ تھی، ہم بشر ہی تھے، کسی کے باطن وایمان اور سچی تصدیق تک ہمارا علمی احاطہ ممکن نہ تھا، اور نہ ہی ہم ان کے متعلق کچھ جانتے تھے۔

چوتھی توجیہ یہ ہے کہ جب تک ہم ان میں رہے تو کچھ معلوم کرتے گئے، جب ہم دنیا سے رخصت ہوئے تو پیچھے سے لوگوں نے جو اچھا یا برا کیا، وہ ہمارے علم میں نہیں ہے، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے فرمایا: ''قیامت کے دن فرشتے کچھ لوگوں کو پکڑ کر دوزخ کی طرف لے جائیں گے، میں پیچھے سے آواز لگا کر کہوں گا کہ یہ لوگ میرے ہیں، میری امت کے افراد ہیں، انہیں واپس کردو، تو فرشتے جواب میں کہیں گے: ''انک لاتدری مااحدثوا بعدک''۔ بلاشبہ آپ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے آپ کے بعد کون کونسی نئی باتیں (بدعتیں) دین میں نکال لی تھیں، انہوں نے شرک وبدعات ایجاد کر کے ان کی ترویج کی، اور نئے نئے مذہبی شوشے چھوڑے۔ اس پر فرماتے ہیں: ''سحقاً سحقاً لِمَنْ غَيَّرَ فِيْ دِيْنِيْ مِنْ بَعْدِيْ''۔ ان کو دور لے جاؤ، دفع کرو، جنہوں نے میرے دین میں تبدیلی کردی۔ [متفق علیہ]

اگلے رکوع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اسی طرح کا ارشاد بیان ہونے والا ہے۔ اس کے بعد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرمانے کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ: تم اور تمہاری والدہ کو جو میں نے نعمتیں عطا کیں انہیں یاد کرو۔ جو نعمتیں قرآن حکیم میں مذکور ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) ان کی والدہ پر یہ انعام فرمایا کہ جب وہ حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں تھیں تو غیب سے ان کے پاس پھل آتے تھے۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے ان کو طاہرہ عفیفہ پاکدامن رکھا۔ (۳) ان کو بغیر شوہر کے عظیم الشان فرزند عطا فرمایا۔ (۴) اس جلیل القدر فرزند نے گہوارہ میں ان کی طہارت وعفت پر گواہی دی، جو کہ ایک عظیم معجزہ کے ساتھ ساتھ حضرت مریم صدیقہ علیہا السلام کی کرامت تھی۔ (۵) ان کی والدہ کے نام قرآن کریم کی سورت (سورۂ مریم) کا نزول ہوا۔ (۶) قرآن کریم نے ان کی تعریف اور مدح وثناء بیان فرمائی، اور انہیں صدیقہ جیسے عظیم لقب سے یاد فرمایا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اول تو یہ نعمت فرمائی کہ انہیں حضرت مریم صدیقہ علیہا السلام کے بطن مبارک سے پیدا فرمایا، اور بنی اسرائیل کی شرارت سے آپ علیہ السلام کی حفاظت فرمائی، اور آپ علیہ السلام کو گہوارہ میں قوت گویائی عطا فرمائی۔ نیز نبوت سے نواز، اور آپ علیہ السلام پر کتاب مقدس انجیل نازل فرمائی، آپ علیہ السلام کو عظیم الشان معجزات عطا فرمائے، حضرت جبریل امین روح القدس علیہ السلام کے ذریعے آپ علیہ السلام پر انوار وبرکات کا نزول ہوتا رہا، آپ علیہ السلام

کو بڑی عزت واحترام کے ساتھ آسمانوں پر اٹھایا، وغیرہ۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے کھلے عظیم معجزات:

ایک عظیم معجزہ یہ تھا کہ آپ علیہ السلام مٹی کے گارے سے پرندے کی شکل کی ایک چیز بنالیتے تھے، پھر آپ علیہ السلام اس میں پھونک ماردیتے، وہ مٹی کی بنائی ہوئی تصویر سچ مچ کا پرندہ ہوکر اڑ جاتی تھی۔ اور ایک معجزہ یہ تھا کہ جو مادرزاد اندھے ہوتے تھے، یا جو برص کے مریض ہوتے تھے ان پر اپنا ہاتھ مبارک پھیر دیتے تھے، تو وہ فوراً تندرست ہوجاتے تھے۔ اور ایک معجزہ یہ ہوتا تھا کہ آپ علیہ السلام قبروں پر جاکر مردوں کو آواز دیتے تھے، تو مردے زندہ ہوکر باہر نکل آتے، اور بات چیت کرکے انہیں واپس لوٹادیتے، اور ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ لوگ جو گھروں میں کھاتے پیتے تھے، یا کوئی چیز ذخیرہ کرکے رکھتے تھے، آپ علیہ السلام بچوں کو اس کی خبر دیتے تھے کہ آج تمہارے گھر میں یہ کچھ ہوا، آپ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو دعوت دی اور یہ سارے معجزات ان کے سامنے ظاہر کردیئے، مگر اس نافرمان قوم پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور انہوں نے مسلسل آپ علیہ السلام کی تکذیب کی، اور آپ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ عفیفہ پر الزامات لگائے، اور آپ علیہ السلام کے جانی دشمن ہوگئے، یہاں تک کہ آپ علیہ السلام کے قتل کے منصوبے بنائے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو اپنی حفاظت میں لے کر آپ علیہ السلام کو اوپر آسمانوں پر اٹھالیا، اور دشمنوں کے منصوبے ناکام کردیئے۔

دوسری طرف آپ علیہ السلام کی قوم نے آپ علیہ السلام کے متعلق یہ غلط عقیدہ متعارف کرایا کہ آپ علیہ السلام عین خدا ہیں، یا ابن خدا ہیں، یا تین میں سے ایک ہیں، جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آیات سابقہ میں ہر معجزہ کے ساتھ ''بِاِذۡنِیۡ'' چار مرتبہ ذکر فرماکر ان کی مکمل تردید فرمائی، کہ یہ معجزات سارے کے سارے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ظاہر ہوتے رہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام براہ راست ان کے نہ خالق ہیں، اور نہ موجد، صرف یہی نہیں، بلکہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے تمام معجزات اللہ تعالیٰ کے حکم اور منشاء سے صادر ہوتے رہے ہیں، اور معجزہ براہ راست فعلِ خداوندی ہی ہوتا ہے، کسی اولوالعزم پیغمبر کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہے معجزہ صادر کرے، بلکہ سب کچھ ربّ العزت کے حکم کے تابع ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہتا تو کسی نبی سے کوئی بھی معجزہ ظاہر نہ ہوتا۔

إِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ﴿١١١﴾ إِذْ قَالَ
الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ قَالَ اتَّقُوا
اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١١٢﴾ قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا
وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿١١٣﴾ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ
السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿١١٤﴾ قَالَ اللَّهُ إِنِّي
مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿١١٥﴾

ترجمہ: اور جب میں نے وحی کے ذریعے حواریوں کو حکم دیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، انہوں نے کہا کہ: ہم ایمان لائے، اور آپ گواہ ہوجائیں کہ بلاشبہ ہم فرمانبردار ہیں ﴿١١١﴾ اور جب حواریوں نے کہا کہ: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا آپ کا ربّ یہ کرسکتا ہے کہ ہمارے اوپر آسمان سے خوان نازل فرمائے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو ﴿١١٢﴾ وہ کہنے لگے کہ ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں، اور ہمارے دل مطمئن ہوجائیں، اور ہم اس بات کو جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ کہا ہے، اور ہم اس پر گواہ ہوجائیں ﴿١١٣﴾ عیسیٰ بن مریم نے عرض کیا: اے اللہ تعالیٰ! تو ہمارا ربّ ہے، ہم پر آسمان سے خوان نازل فرمادے جو ہمارے موجودہ لوگوں کے لئے اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے عید ہوجائے، اور آپ کی طرف سے ایک نشانی ہوجائے، اور آپ ہمیں عطا فرمائیے! اور آپ تمام عطا کرنے والوں میں سب سے بہتر عطا فرمانے والے ہیں ﴿١١٤﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں بیشک تم پر خوان نازل کرنے والا ہوں، سو تم سے جو شخص اس کے بعد ناشکری کرے تو بیشک میں اس کو ایسا عذاب دوں گا کہ ایسا عذاب جہانوں میں سے کسی کو بھی نہ دوں گا ﴿١١٥﴾

معارف و منازل

''اَلْحَوَارِيُّون'' حواری کی جمع ہے، حَوَر سے مشتق ہے، جس کے معنی خالص سپیدی کے ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ چونکہ ان کے کپڑے سپید تھے اس لئے وہ حواری کہلائے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حواری اس کو کہتے ہیں جس میں خلافت اور حکومت کی صلاحیت ہو۔ نیز ان سے وزیر کے معنی بھی مروی ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ سے ناصر و مددگار کے معنی نقل کئے ہیں۔ حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موضح القرآن میں لکھتے ہیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ یار کا خطاب تھا حواری، اور حواری اصل میں کہتے ہیں دھوبی کو، ان میں سے پہلے دو شخص ان کے تابع ہوئے وہ دھوبی تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا کہ کپڑے کیا دھوتے صاف کرتے ہو، میں تمہیں دل دھونا صاف کرنا سکھا دوں، وہ ان کے ساتھ ہوئے، اس طرح سب کو یہ خطاب ٹھہر گیا۔ [لغات القرآن مع اختصار]

﴿اِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ﴾ لفظ ''اَوْحَیْتُ'' سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ وحی تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، پھر حواریوں پر کیسے وحی آئی جو نبی نہ تھے؟

اصل بات یہ ہے کہ وحی کے معنی ہیں: دل میں ڈال دینا، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ہوا، فرمایا: ﴿وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی﴾ [القصص:۷] (ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں ڈال دیا)۔ یا شہد کی مکھی کے لئے فرمایا: ﴿وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ﴾ [النحل:۶۸] (اور تمہارے ربّ نے شہد کی مکھی کے دل میں ڈال دیا)۔

پس ''اَوْحَیْتُ'' کے معنی اگر یہ لیے جائیں کہ اللہ تعالیٰ نے حواریوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ ایمان قبول کریں، اور ایمان پر جمے رہیں، تو یہ درست ہے، اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ اور اگر ''اَوْحَیْتُ'' کے یہ معنی لئے جائیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ انہیں حکم دیا تو یہ بھی صحیح ہے۔

آئندہ چار آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا ''مائدہ'' یعنی خوان اترنے کا سوال کرنا، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ان کو جواب دینا، اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اللہ تبارک تعالیٰ سے مائدہ کا سوال کرنا مذکور ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گزشتہ معجزات ایک سمجھدار آدمی کے لئے کافی تھے، لیکن حواریوں نے ان معجزات کے علاوہ مزید یہ سوال کیا، اور سوال بھی عجیب کیا، اور وہ یہ کہ آسمان سے خوان نازل ہوجائے، جس میں پکا پکایا کھانا ہو۔ طرزِ سوال بھی مناسب نہ تھا، انہوں نے یوں نہیں کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں کہ ہمارے لئے مائدہ نازل فرمائے، بلکہ یوں کہا کہ کیا تمہارا ربّ یوں کرسکتا ہے کہ آسمان سے خوان نازل فرمادے؟

عیسیٰ علیہ السلام کو ان کا سوال اور طرزِ سوال ناگوار ہوا، اس لئے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ شانہ سے ڈرو، اگر تم مؤمن ہو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: ﴿هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ﴾ کہنے سے ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کرنا نہیں تھا، بلکہ مطلب یہ تھا کہ آپ علیہ السلام اگر سوال کریں تو آپ علیہ السلام کا یہ سوال اللہ تعالیٰ شانہ پورا فرمادے گا، یا

نہیں۔ لیکن ان کے الفاظ نامناسب تھے، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مؤاخذہ میں شدت نہیں فرمائی، بلکہ:

﴿اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ فرما کر ناگواری کی طرف اشارہ فرمایا، اور یہ بھی فرمادیا کہ اپنی طرف سے معجزات کی فرمائشیں کرنا مؤمنوں کا کام نہیں، کیونکہ بعض سابقہ امتوں نے ایسی فرمائشیں کیں پھر ان کی فرمائشوں کے مطابق معجزہ ظاہر ہوا، پھر بھی ایمان نہ لائے اور تباہ ہو گئے۔

قوم ثمود نے مطالبہ کیا کہ پہاڑ سے اونٹنی پیدا ہو، تب اونٹنی پہاڑ سے نمودار ہو گئی، اور منکر ہو کر ایمان نہ لائے، بالآخر عذاب آیا اور انہیں ہمیشہ کے لئے تباہ کر کے ہلاک کیا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو، تو وہ کہنے لگے کہ ہمارا تو یہ مقصد ہے کہ اس خوان سے کھائیں، اور ہمارے دلوں کو اطمینان ہو جائے، اور علم الیقین سے ترقی کر کے عین الیقین تک پہنچ جائیں، اور ہمیں مشاہدہ سے معلوم ہو جائے کہ آپ علیہ السلام نے جو کچھ ہمیں فرمایا وہ سب سچ اور حقیقت ہے، اور یہ اطمینانِ قلبی ایسا ہی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے طلب کیا تھا: ﴿قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ﴾ [البقرة: ۲۶۰] (فرمایا: کیوں نہیں، لیکن تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے)۔

حواریوں نے یہ بھی کہا کہ اس مائدہ کے نازل ہونے کا یہ بھی فائدہ ہوگا کہ جن لوگوں نے اس کو نہیں دیکھا ہوگا ہم ان کے لئے گواہی دینے والے بن جائیں گے۔

مائدہ کے متعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے سوال اور اس کا جواب:

الحاصل! حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آسمان سے مائدہ اتارے جانے کی درخواست پیش کردی، اور عرض کیا کہ: اے اللہ پاک ذات! ہمارے لئے آسمان سے مائدہ نازل فرمادیجئے جو ہمارے اس زمانہ کے لوگوں کے لئے عید اور خوشی ہو، اور ہمارے بعد والے لوگوں کے لئے بھی۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے مطالبے پر تم پر دسترخوان اتارنے والا ہوں، اس کے اتر جانے کے بعد تم میں سے جو شخص ناشکری (ناقدرشناسی) کرے گا اس کو وہ عبرتناک عذاب دوں گا جو جہانوں میں سے کسی کو بھی نہ دوں گا، چنانچہ مائدہ نازل ہوا (جو لوگ نزول مائدہ کی نفی کرتے ہیں وہ سراسر غلطی پر ہیں)۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: آسمان سے مائدہ نازل کیا گیا تھا، اس میں روٹی اور گوشت تھا، ان کو حکم تھا کہ خیانت نہ کریں، اور چھپا کر کل کے لئے نہ رکھیں، لیکن

انہوں نے خیانت کی، اور ذخیرہ بھی بنا کر رکھا، لہٰذا وہ بندروں اور سوروں کی صورتوں میں مسخ کر دیئے گئے، اور تین روز کے بعد مر گئے۔ [قرطبي، درمنثور، ترمذي وغيره]

ان لوگوں سے پہلے بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ایسی حرکت کر چکے تھے کہ انہوں نے من وسلویٰ کی ذخیرہ اندوزی کی تھی، اور چھپا کر رکھا تھا۔ لہٰذا وہ گوشت سڑ گیا اور خراب ہوا، اس سے قبل گوشت کے خراب ہونے کا کوئی رواج ہی نہ تھا، چنانچہ یہ سلسلہ ان کی خیانت کی وجہ سے ہمیشہ کیلئے جاری ہو گیا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**لو لا بنو اسرائيل لم يخبث الطعام ولم يخنز اللحم ولو لا حواء لم تخن انثى زوجها الدهر**" [رواه مسلم] یعنی اگر بنواسرائیل نہ ہوتے تو کھانا خراب نہ ہوتا، اور گوشت سڑ کر بدبودار نہ ہوتا، اور اگر حضرت حواء نہ ہوتی تو کوئی عورت کبھی بھی اپنے شوہر کی خیانت نہ کرتی۔

بنی اسرائیل سے گوشت سڑنے کھانا خراب ہونے کی ابتداء ہوگئی اور حضرت حواء علیہا السلام سے شوہر کی خیانت کی ابتداء ہوگئی۔ شراح حدیث نے لکھا ہے کہ حضرت حواء علیہا السلام کی خیانت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے شوہر حضرت آدم علیہ السلام کو اس درخت کے کھانے پر آمادہ کیا جس کا کھانا ممنوع تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا کہ پہلے تیس (۳۰) روزے رکھو، پھر اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگو وہ تم کو عنایت فرمائے گا۔ حسب الحکم لوگوں نے روزے رکھے، اور روزوں سے فراغت کے بعد عرض کیا کہ ہم اگر کسی کا کام کرتے ہیں اور کام پورا کرنے کے بعد وہ کام کا مالک ہم کو کھانا کھلاتا ہے، اے اللہ تعالیٰ! ہم نے تیرا کام روزوں والا مکمل کیا، ابھی ہم کو کھانا کھلاؤ، اور انہوں نے دسترخوان آسمان سے اترنے کی درخواست کی، تو دعاء قبول ہوگئی، فرشتے خوان اٹھا کر نازل ہوئے، خوان میں سات روٹیاں، اور سات مچھلیاں تھیں، لوگوں کے سامنے لا کر رکھ دیا، اول سے آخر تک سب لوگوں نے کھایا، جس طرح کھانا شروع کرنے کے وقت وہ تھا ویسا ہی آخری آدمی کے کھانے کے بعد رہا۔ [مظهري]

فائدہ:

حواریین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بجائے کسی اور معجزہ کے دسترخوان کے نزول کا معجزہ کیوں طلب کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیلی لوگ "من وسلویٰ" کھانے کے عادی تھے، اور آسمانی خوراک کے دلدادہ اور خوگر

رہے تھے، اسی لئے انہوں نے آسمانی غذا کی درخواست کی واللہ اعلم

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ
سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ
وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ
عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾

ترجمہ: اور جب اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہوگا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ تم مجھے اور میری ماں کو اللہ تعالیٰ کے سوا معبود بنالو؟ وہ عرض کریں گے: میں آپ کی پاکی بیان کرتا ہوں، میرے لئے یہ بات زیبا نہیں ہے کہ ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں، اگر میں نے کہا ہوتا تو آپ کو معلوم ہوتا، آپ جانتے ہیں جو میرے جی میں ہے، اور میں وہ نہیں جانتا جو آپ کے علم میں ہے، بے شک آپ غیبوں کے جاننے والے ہیں ﴿۱۱۶﴾ میں نے ان سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جو آپ نے مجھے حکم فرمایا کہ عبادت کرو، اللہ تعالیٰ کی جو میرا ربّ ہے اور تمہارا ربّ ہے، اور میں ان کے بارے میں باخبر تھا جب تک میں ان میں موجود تھا، پھر جب آپ نے مجھے اٹھالیا تو آپ ہی ان کے نگراں تھے۔ اور آپ ہر چیز پر مطلع ہیں ﴿۱۱۷﴾ اور اگر آپ انہیں عذاب دیں تو بیشک وہ آپ کے بندے ہیں، اور اگر آپ ان کی مغفرت فرمادیں تو بلاشبہ آپ زبردست ہیں، حکمت والے ہیں ﴿۱۱۸﴾ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا: یہ وہ دن ہے جس میں سچے لوگوں کو ان کی سچائی نفع دے گی، ان کیلئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ تعالیٰ شانہ سے راضی ہوئے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۱۹﴾ اور اللہ تعالیٰ کیلئے ہے ملک آسمانوں کا اور زمین کا، اور جو ان کے درمیان ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ﴿۱۲۰﴾

معارف ومنازل

یہاں ''قَالَ'' کا صیغہ مستقبل کے معنی میں ہے، بمعنی ''یَقُوْلُ'' کے۔ قرآن کریم ہر آنے والی پختہ یقینی بات کو ماضی کے صیغہ میں استعمال کرتا ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ﴾ [الکہف: ۹۹] (اور صور میں پھونکا جائے گا)۔ ﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ﴾ [الزلزال: ۱] (جب زمین ہلائی جائے گی) وغیرہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام زمانے برابر ہیں، لہٰذا اگر کسی مستقبل کے واقعہ کو ماضی کے لفظ سے بیان فرمائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اس کیلئے تو ہر چیز حاضر ہے۔ سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ﴾ [سبأ: ۳] (غیب کا جاننے والا ہے، چھپتا نہیں اس سے ذرا برابر نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں)۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دنیا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرمایا، اسی طرح آخرت کی منزل میں بھی اسی نام سے خطاب فرمائے گا۔

واضح رہے کہ میدانِ محشر میں اوّلین وآخرین کے اجتماع میں یہ سوال وجواب ان لوگوں کے سامنے ہوگا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ ماجدہ کی پرستش کرتے تھے، اور انہیں الٰہ ومعبود کہتے تھے، یا عقیدۂ تثلیث پر جمے رہتے تھے، اور حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے، جیسے عیسائی، نصرانی، یسوعی، مسیحی وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال ہونے پر حضرت مسیح علیہ السلام پر جو کیفیت طاری ہوگی وہ نہایت سخت ناقابلِ برداشت ہی رہے گی۔ حضرات المفسرین مثلاً صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب واحد الجبار جل شانہ حضرت مسیح علیہ السلام سے براہ راست خطاب فرمائے گا: کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو معبود بنالو؟ تو آپ علیہ السلام پر کپکپی طاری ہوجائے گی، دہشت کی وجہ سے آپ علیہ السلام کے بال کھڑے ہوجائیں گے، اور ان کے نیچے سے خون جاری ہوجائے گا، اور یہ حالت پانچ سو سال تک طاری رہے گی، اور وہ زبان سے کچھ نہیں بول سکیں گے، اس کے بعد حق تعالیٰ شانہ ان کے دل میں القاء کریں گے تو وہ سوال کا جواب دیں گے، اور اپنی براءت کا اظہار کریں گے۔

بجائیکہ دہشت برند انبیاء ☆ تو عذر گناہ راچہ داری بیا

قیامت کا اجتماع نہایت جانگداز مشکل اور بے انتہا سخت ہے، بڑے بڑے مانے ہوئے پہلوان پگھل کر گھٹنوں کے بل تڑپتے ہوئے رو رہے ہوں گے، اور الویل کہتے ہوئے کفِ افسوس ملتے رہیں گے۔ سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ سارے انبیاء علیہم السلام اَللّٰهُمَّ سَلِّمْ يَارَبِّ سَلِّمْ نَفْسِي نَفْسِي پکاریں گے، اور پھر حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کا وظیفہ پڑھیں گے، جس کا ہر سختی اور پریشانی کے وقت اسے پڑھنے کا حکم ہے۔

صحیح بخاری میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس وقت آگ میں ڈالا جا رہا تھا تو آپ علیہ السلام کی زبان مبارک پر یہی برکت والا وظیفہ جاری تھا۔ قیامت کے مراحل بہت ہی مشکل ہیں، مؤمنوں کا وظیفہ ہر مرحلے پر یہی ہوگا، چاہیئے کہ دنیوی زندگی بھی اسی وظیفہ کے ساتھ درخشندہ اور روشن ہو، یہی ہر مقام پر متقین کا وظیفہ ہے، اور رہے گا اس کے فضائل پر علماء کرام نے مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دہشت کی کیفیت دور ہوگی تو نہایت انکساری وتواضع کے ساتھ اللہ تعالیٰ شانہ کے سوال کا جواب عرض کریں گے، اور سب سے پہلا کلمہ "سبحٰنک" عرض کر کے ربّ العزّت کی ہر عیب اور ہر نقصان اور ہر قسم کے شرک واشتراک سے تنزیہ وپاکی کا اقرار واظہار اور اعتراف کریں گے۔

﴿مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ﴾ تا ﴿عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ میرے لئے یہ زیبا نہیں یا لائق نہیں کہ میں ایسی بات کروں جس کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا، اور نہ مجھ میں ایسے کہنے کی ہمت ہے، میں تیرا بندہ اور رسول ہوں، میں تیرا شکر گزار بندہ اور مخلوق ہوں، کسی مخلوق میں یہ جرأت کہاں کہ وہ بندگی کا اقرار کرتے ہوئے معبود بننے کی جرأت کرے؟ اگر میں نے کوئی ایسی بات کی ہوگی تو آپ اسے جانتے ہیں، کیونکہ میرے جی کی بات تو جانتا ہے، اور تیرے جی (علم) کی بات میں نہیں جانتا۔

مطلب یہ ہے کہ تو ہر چیز کو جانتا ہے، کسی بندہ کا قول وکردار سب کچھ آپ کے علم میں ہے۔ آپ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو یہ آپ کو ضرور معلوم ہوتا، چونکہ یہ آپ کے علم میں نہیں، لہٰذا میں نے کہا بھی نہیں۔

یہاں پر اور دوسرے مقامات پر جیسے ﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ [الأنعام: ١٢] (اللہ نے رحمت کو اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے)۔ اللہ تعالیٰ پر لفظِ نفس کا جو اطلاق ہوا ہے اس سے مراد ذات ہے، جیسے: ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ [آل عمران: ٣٠] (اللہ تم کو اپنے سے ڈراتا ہے) مراد ہے ذاتِ باری تعالیٰ۔

بیشک تو تمام غیبوں کا جاننے والا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قدرتِ کاملہ کی طرح تمام غیبوں کے جاننے کا اثبات حق تعالیٰ کیلئے فرض ہے، اور تمام انبیاء علیہم السلام سے ان کی نفی لازم اور واجب ہے۔ اس کے ساتھ مزید معروضات کا بیان:

﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَآ أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي﴾ تا ﴿وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ میں نے اپنی قوم سے تیرے حکم کے سوا کچھ نہیں کہا، اور وہ یہ کہ اس اللہ پاک کی عبادت کرو جو میرا بھی ربّ ہے، اور تمہارا بھی ربّ ہے۔ قولی، فعلی اعتقادی، عملی، بدنی، مالی ہر قسم کی عبادت کے لائق صرف وہی ہے۔ اسی طرح نافع، ضار، حاجت روا مشکل کشا، قادر مطلق، تندرستی دینے والا، عزّت بخشنے والا صرف اسی کے ساتھ مخصوص ہے، اور اسی کی ذات پاک ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں نے تو انہیں ان ہی باتوں کی تلقین کی تھی جن کا تو نے مجھے حکم دیا، اور جب تک میں ان کے اندر رہا تو ان کی خبر رکھا، جب تو نے مجھے ان کے درمیان سے اٹھالیا تو تو ہی ان کا نگراں تھا، اور تو ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے، میرے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ یہ لوگ کیا کرتے رہے ہیں، میں انہیں پوری زندگی حق وتوحید کی دعوت دیتا رہا۔

قادیانی اور دیگر گمراہ فرقوں کی تردید:

یہ شیطانی گماشتے جو لفظ ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي'' سے اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگئی ہے، اور یہ لوگ رفع الی السماء کے منکر ہیں، اسی طرح یہ لوگ آیت قرآنیہ ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ﴾[النساء: ۱۵۸] (بلکہ اس کو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا ہے) کے، اور ستر (۷۰) کے قریب صحیح حدیثوں کے بھی منکر ہیں، جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قیامت سے پہلے آسمانوں سے اترنا، اور اس دنیا میں چالیس سال رہنا، اور دجال کو قتل کرنا، پھر طبعی موت سے وفات پانا، وغیرہ مذکور ہیں، ان سب باتوں کے منکر ہیں۔

اول تو لفظ ''تَوَفِّي'' ضروری نہیں کہ موت ہی کیلئے استعمال ہو۔ قرآن کریم میں نیند کیلئے بھی استعمال ہوا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ﴾ [الأنعام: ٦٠] (اور وہی ہے جو رات کے وقت تمہاری روح قبض کر لیتا ہے، اور دن بھر میں تم نے جو کچھ کیا ہوتا ہے اسے خوب جانتا ہے)۔ اور سورۂ زمر میں ہے: ﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا﴾

[الزمر: ۴۲] (اللہ تمام روحوں کو ان کی موت کے وقت قبض کر لیتا ہے، اور جن کو ابھی موت نہیں آئی ہوتی، ان کو بھی ان کی نیند کی حالت میں (قبض کر لیتا ہے)۔

ان دونوں آیتوں میں تَوَفّی کو منام یعنی نیند کیلئے استعمال فرمایا ہے، دراصل تَوَفّی کے معنی ہیں: کسی چیز کو پورا پورا لے لینا، یہ مفہوم زندہ اٹھا لینے اور سلا دینے اور موت دیدینے تینوں کو شامل ہے۔ دوسری آیت ﴿بَل رَّفَعَهُ اللهُ اِلَيۡهِ﴾ [النساء: ۱۵۸] (بلکہ اس کو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا ہے) اور ستر کے قریب احادیثِ صحیحہ متواترہ اس کی تعیین تشریح اور تفصیل ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ بات ''فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِيۡ'' قیامت کے میدان میں ہو رہی ہے، اور اس وقت سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام آسمان سے تشریف لا کر زمین میں رہ کر پھر طبعی موت پا کر دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں گے، لہٰذا تَوَفَّيۡتَنِيۡ کو موت کے معنی میں لیا جائے تو تب بھی ان ملحدوں کا استدلال صحیح نہیں، جو اپنے تراشیدہ عقیدہ کے مطابق غلط استدلال کرتے ہیں۔

قیامت کے دن سچائی نفع دے گی:

سچائی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، پھر سارے انبیاء کرام علیہم السلام اسی صفت کے ساتھ موصوف ہیں۔ عباد اللہ الصالحین کی اصلی علامت اور پہچان بھی یہی صفت ہے، قرآن کریم نے فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِيۡنَ ۝۱۱۹﴾ [التوبۃ] (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور تقویٰ اختیار کرو، اور اللہ تعالیٰ کے سچے بندوں کی رفاقت اختیار کرو) اسی کے پیش نظر ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوۡمُ يَنۡفَعُ الصّٰدِقِيۡنَ صِدۡقُهُمۡ﴾ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ یہ وہ دن ہے جس میں سچے لوگوں کو ان کی سچائی نفع دے گی، جو حضرات صَادِقٌ فِي الْإِيْمَانِ، صَادِقٌ فِي الْأَعْمَالِ، صَادِقٌ فِي الْأَقْوَالِ، صَادِقٌ فِي الْأَخْبَارِ تھے، جن میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان میں سے ہر ایک کی امت اجابت ہوگی، ان کا سچ ان کو نفع دے گا، جس کی وجہ سے وہ جنت اور جنتی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے، اور ان کیلئے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان باغوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے۔

یہ کتنی بڑی عظیم خوشخبری ہے؟ سارا جہاں ایک طرف ربّ العزّت کی ایک نظرِ عنایت و کرم دوسری طرف،

یہ پورے جہاں سے قیمتی ہے۔ کتنے خوش قسمت ہوں گے وہ سچے لوگ جنہیں یہ عظیم نعمت نصیب ہوگی؟ اسی لئے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ [التوبة: ۷۲] (اور اللہ کی طرف سے خوشنودی سب سے بڑی چیز ہے)۔ اللہ تعالیٰ خالق و مالک کی رضامندی ہر چیز سے بڑی قیمتی اور بلند ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنت سے فرمائیں گے: کہاں ہو جنت والو؟ وہ کہیں گے: اے ہمارے ربّ! ہم حاضر ہیں، اور تعمیلِ حکم کیلئے موجود ہیں، اور ہر خیر تمام تر آپ ہی کے قبضہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کیا تم راضی ہو؟ وہ عرض کریں گے: اے ہمارے ربّ! اس سے افضل کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ: میں تم پر اپنی رضامندی نازل کرتا ہوں، سو اس کے بعد کبھی بھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ [بخاري]

فائدہ:

ابھی بیان ہوا کہ سچائی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور اسی پر نجات اور رفعِ درجات کا مدار ہے۔ ایمان میں اگر سچائی نہ ہو تو منافقت بن جاتی ہے، اعمال میں سچائی نہ ہو تو ریاکاری آجاتی ہے، اگر اقوال میں سچائی نہ ہو تو جھوٹ صادر ہوتا رہتا ہے۔ مؤمن کو ایمان، اعمال، کردار، گفتار معاملات سب میں سچائی اختیار کرنا چاہئے، ورنہ یہ ساری حسنات سیات بن جاتی ہیں۔

سرورِ عالم (فِدَاهُ أَزْوَاجُنَا) صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میرے لئے اپنی طرف چھ چیزوں کے ضامن ہو جاؤ، میں تمہارے لئے جنت کا ضامن ہو جاؤں گا'': (۱) جب بات کرو سچ بولو۔ (۲) جب وعدہ کرو تو پورا کرو۔ (۳) جب امانت تمہارے پاس آجائے تو ادائیگی کرو۔ (۴) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو۔ (۵) اپنی نظروں کو پست رکھو۔ (۶) اپنے ہاتھوں کو ظلم و زیادتی سے روکے رکھو۔ [مشکوٰۃ]

چونکہ دنیوی معاشرہ خورد و نوش، رہائش، لباس، سواری، علاج اور دیگر ایسی ضروریاتِ زندگی پر قائم ہے جن کے حصول کا واحد ذریعہ کاروبار، تجارت اور لین دین ہے، اسی لئے خصوصیت کے ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (فِدَاهُ آبَاءُ نَا وَأُمَّهَاتُنَا وَأَوْلَادُنَا وَأَزْوَاجُنَا) نے ارشاد فرمایا: ''اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَ

الصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ"۔ سچائی اختیار کرنے والا امانتدار تاجر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ [مشکوٰۃ]

اللہ تعالیٰ اگر کسی سے راضی ہو، اور وہ خوفِ خدا اور تقویٰ سے سرشار ہو، تو پھر تجارت میں سچائی، دیانت اور صداقت پر کاربند رہنا بڑا آسان ہوگا۔ اگر کسی تاجر سے اللہ تعالیٰ راضی نہ ہو، اور وہ خوفِ خدا اور تقویٰ سے بے بہرہ ہو، تو پھر وہ تاجر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے محروم ہوگا، اور اس کا حشر قارون اور اُمیہ بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مؤمن کی اصلی پہچان معاملات کی صفائی کے ساتھ وابستہ ہے، جو لوگ صوم وصلوٰۃ اور چند دیگر عبادات کی ادائیگی تک اسلام کو محدود سمجھتے ہیں یہ ان کی سراسر غلطی اور ذہنی اختراع ہے، جب تک آدمی معاملات میں اول درجہ کا تقویٰ اور صفائی اختیار نہیں کرے گا اس کا ایمان کامل نہیں ہوگا، کیونکہ وہ قیامت کے دن پہاڑوں کے برابر طاعات وعبادات اور حسنات لے کر حاضر ہوگا، اور جبکہ وہ ہزاروں لوگوں کے حقوق کے نیچے دبا ہوا ہوگا تو اس کی تمام طاعات دوسرے لوگوں کو دی جائیں گی، ایک ایک درہم کے عوض سینکڑوں قبول شدہ نمازوں سے اسے ہاتھ دھونا پڑے گا، اور پانچ چھ درہم کے عوض اس کے قبول شدہ حج پر دوسروں کا قبضہ ہوگا، پہاڑوں کے برابر نیکیاں دوسروں کو ملیں گی۔

اگر حقداروں کے حقوق کی تلافی نہ ہوسکی، تو ان کے گناہ اور معاصی اس پر ڈالے جائیں گے، اور اسے جہنم کی طرف دھکیل کر عذاب میں ڈال دیا جائے گا، تو کیا کھویا، اور کیا پایا؟ بلکہ تباہ ہوا۔ آخر میں فرمایا:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے ملک آسمانوں اور زمینوں کا، اور جو کچھ ان کے اندر ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس آیت میں پوری سورت کے مضامین کی طرف اجمالی اشارہ ہے، چونکہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، اور سارا ملک اسی کا ہے، اس لئے اس کو اختیار ہے جس کو چاہے جو حکم دے، جس چیز کو چاہے حلال قرار دے، جس چیز کو چاہے حرام قرار دے، جس کو چاہے بخش دے، جس کو چاہے سزا دے، اس کو کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں، اور وہ ہر چیز پر قادر وتوانا ہے۔

الحمدللہ سورۃ المائدۃ تمام ہوئی۔